

HM

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِأُولِي الْأَبْصَارِ

وقارِ حیات

یعنے

نواب وقار الدولہ وقار الملک انتصار جنگ مولوی حاجی مشتاق حسین خاں بہادر سابق ریونیو سکرٹری

دولتِ آصفیہ و آنریری سکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ و آنریری سکرٹری ایم اے او کالج

کی

مفصّل سوانح عمری جس میں اُن کی سرکاری، ملکی اور قومی خدمات کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے اور اُن کے

محاسنِ اخلاق پر مفصّل تبصرہ ہے

مع مقدمہ

نوشتۂ عالیجناب نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی

آنریری سکرٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ و صدر الصدور امور مذہبی دولتِ آصفیہ

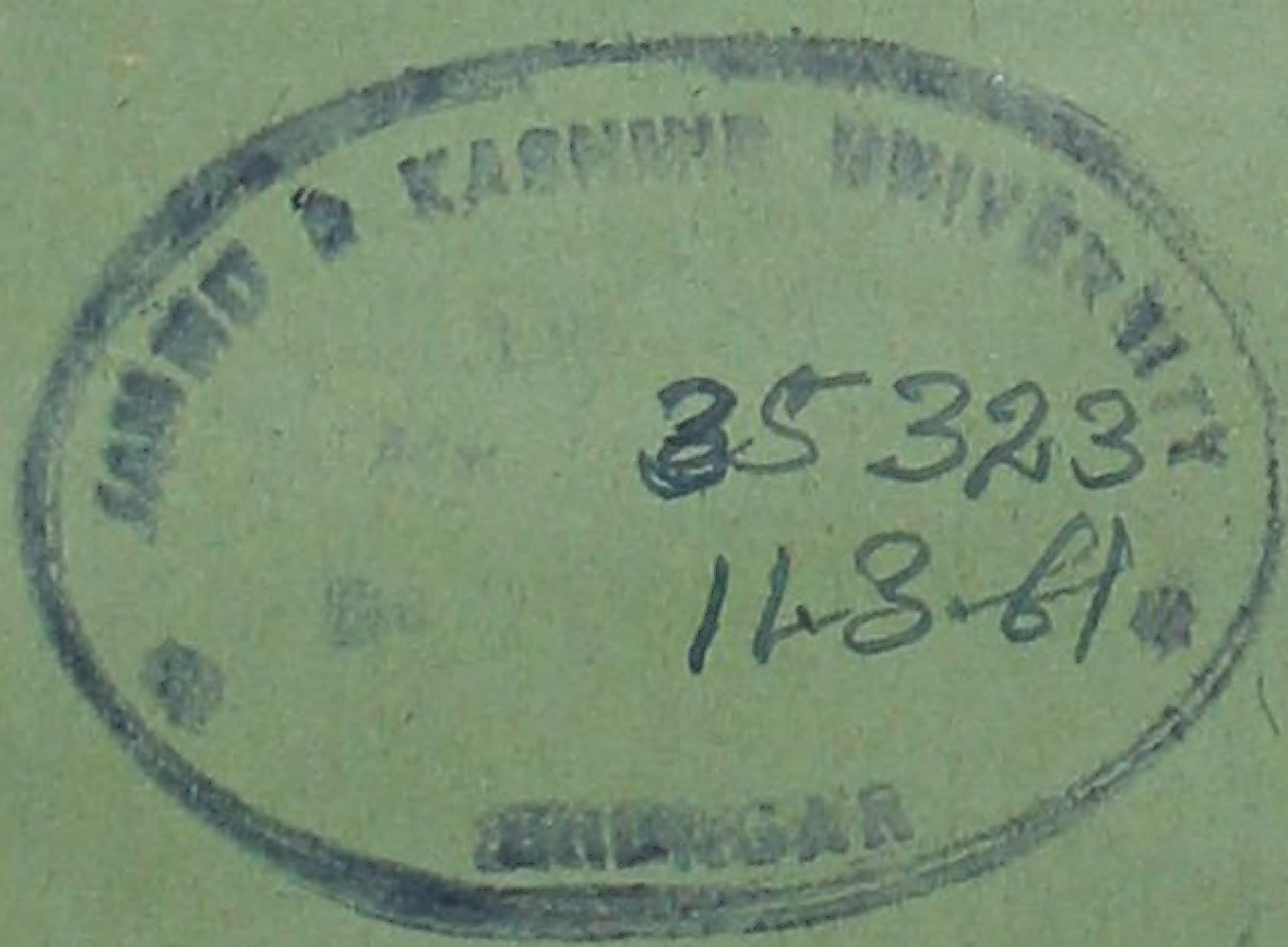
زیر نگرانی محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۱۹۲۵ء ۱۳۴۴ھ طبع ہوئی

مقام اشاعت

تعداد طبع اوّل ۱۰۰۰ جلد (صدر دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سلطان جہاں منزل علیگڈھ) قیمت پختہ فی جلد پانچ روپیہ

عنوان





Cat

فہرستِ مضامین

حصّۂ اوّل

حصۂ دوم



M. Shafi

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُقدّمہ

الحمدللہ دل کا ایک دیرینہ خیال عمل پزیر ہو کر آنکھوں کے سامنے ہے۔ دیر آید درست آید کا مصداق بنکر۔ نواب وقارالملک مرحوم زندہ تھے تو اُن کی زندگی ہر شعبۂ عمل میں وقار آفریں رہی۔ اُن کا ہر کام کارنامہ بنا۔ بعد وفات اُن کی "حیات" ادبِ اُردو کے واسطے روح تازہ ہے اور اُس کا وقار بڑھا رہی ہے اسی لیئے اُس کا نام "وقارِ حیات" رکھا گیا۔

مسلمانانِ ہند میں جدید خیالات کی عمومی اشاعت کا سہرا سرسید کے سر ہے۔ یہ صور علی گڑھ میں پھونکا گیا۔ میں نے جب ہوش سنبھالا سید احمد خاں کا نام سنا۔

کبھی تعریف سنی کبھی مذمت۔ بسا اوقات تکفیر۔ سر کا بِکنا اور مرنے کے بعد کاٹا جانا ایسا مسلّم واقعہ تھا جس میں چون و چرا کی مجال نہ تھی۔ میرا نشو و نما ایسے خاندان میں ہوا جو مخالف و موافق دونو خیالوں کا مرکز تھا۔ مذہبًا مخالف، تعلیمی مقاصد میں موافق بلکہ مویّد! اور یہ دونوں پہلو صاف صاف عیاں تھے۔ میرے محترم عم مولوی عبدالشکور خاں صاحب مرحوم سر سید کے تعلیمی خیالات کے مویّد تھے اور تا بزیست رہے۔ مذہبی خیالات کے علانیہ مخالف۔ مذہبی صداقت عجب شان رکھتی ہے۔ سر سید مرحوم کی رحلت کے بعد میں نے اُن کی نسبت چچا صاحب سے رائے پوچھی تو فرمایا "سید صاحب کی راستبازی میں کسی شبہ کی گنجایش نہیں۔ اسی کا اثر تھا کہ عدالتی فیصلوں میں انصاف کے مقابلے میں کبھی قانون کا لحاظ نہیں فرمایا"۔ تائید میں خود اپنا ایک تجربہ بیان فرمایا۔ دوسری جانب فیشن اور خود غرضی کی بے ثباتی دیکھو۔ ایک بڑے نام نہاد نیچری سے (جو غائبانہ بھی سر سید مرحوم کی دعا پر آمین جہری سے کہتے تھے) حیاتِ جاوید کی اشاعت پر جب میں نے سوال بالا کیا تو کہا "سید محمود بہت خوفناک آدمی ہیں ورنہ ریویو لکھ کر صداقت کا انکشاف کیا جاتا۔ سید احمد خاں نہایت خود غرض اور بدباطن شخص تھا"۔ میں اس رائے کو اُن کے منھ سے سنکر متحیر رہ گیا اور آج تک حیرت باقی ہے۔ جب اظہارِ عقیدت اور اس رائے کا تصور بندھتا ہے انسانی باطنی کیفیت کی ایک عجیب تصویر ذہن میں پھر جاتی ہے۔

خلاصۂ کلام، سر سید مرحوم کے ذکر کے ساتھ ساتھ اُن کے رفقا کا ذکر بھی ہوتا۔ علی گڑھ میں تو مولوی سمیع اللہ خاں مرحوم اور خواجہ محمد یوسف مرحوم کا بول بالا تھا۔

محسن الملک مرحوم اور وقار الملک مرحوم خود ہر چند دور تھے مگر اُن کا ذکر بھی زبانوں سے قریب تھا بلکہ زبانوں پر تھا۔ ٹرسٹیز بل کے پیش ہونے پر رفقا کا تذکرہ بہت زیادہ بلند آوازہ رہا۔ بعض شدید مخالف ہو گئے، بعض شدید موافق، بعض اعتدال پسند۔ اسی زمانے میں نواب وقار الملک مرحوم کی وہ مشہور رائے شائع ہوئی جس میں مخالفت کرتے ہوئے عمارت عدالت کی جانب اشارہ تھا۔ سر سید مرحوم نے باوجود مخالفت اس رائے کا بالاعلان احترام کیا اور صداقت پر آفریں فرمائی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وقار الملک مرحوم کی صداقت کا اثر دل نے محسوس کیا۔

سر سید مرحوم کی زندگی کے آخری دنوں میں جانشینی کا مسئلہ اکثر زبانوں پر رہتا تھا۔ اس سلسلے میں نامور رفقا کے کارنامے مذکور ہوتے۔ اُن پر اظہار رائے کیا جاتا۔ میں نے دیکھا کہ مخالف و موافق دونو رائیں اُن کی صداقت کی معترف تھیں، مخالفت تھی تو اُن کی رائے کی سختی کے خیال سے۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے ایک بار فرمایا تھا اور خوب فرمایا تھا، "محسن الملک تیل ہی تیل ہیں وقار الملک لوہا ہی لوہا جب تک دونوں نہ ملیں کالج کی مشین نہیں چل سکتی"۔

بالآخر حیدر آباد کے انقلابوں نے ان دونو کو بھی علی گڑھ پہونچا دیا۔

ایک بار سر سید مرحوم نے مجھ سے وقار الملک مرحوم کی دیانت کی تعریف فرمائی کہ سر آسمان جاہ کے ساتھ علی گڑھ آئے تو تکیوں میں پیوند لگے تھے۔ اِسی سلسلے میں اُن کے نامور رفیق کی نسبت فرمایا کہ جب کوٹھی بنائی تو ستّر ہزار روپیہ کا فرنیچر ولایت سے آیا۔ لمپ کی

چمنیوں پر مانو گرام منقوش ہو کر ولایت سے آتا تھا۔

خلاصہ قبل اس کے کہ وقار الملک مرحوم سے نیاز حاصل ہو اُن کی دیانت و صداقت دل پر نقش ہو چکی تھی۔ سب سے اوّل نواب محسن الملک مرحوم کے یہاں ملاقات ہوئی اور اُسی موقع پر نمازِ مغرب ساتھ ساتھ ادا کی۔ اس کے بعد نواب صاحب کو بہت کچھ دیکھا سکریٹر شپ کے زمانے میں تعلیمی و سیاسی دونو میدانوں میں ساتھ کام کرنے کی عزت حاصل ہوئی۔ پاس رہنے کا اتفاق ہوا۔ حیدرآباد آکر اُن کے متعلق اتنا سنا کہ اُس سے زیادہ ممکن نہیں۔ جتنا دیکھا جتنا سُنا اُسی قدر دیانت و صداقت کا نقش گہرا ہوتا گیا۔ یہ اوصاف خاص نتیجہ تھے مذہبی عقیدہ کی پختگی اور فرائض مذہبی کی پابندی کا۔

سید محمود مرحوم کی سکرٹری شپ کے زمانے میں اُن کے جانشین کا انتخاب شدید ضروری ہو گیا تھا۔ کالج کے ایک بنگلہ میں ایک بار جلسۂ شوریٰ ہوا بہت سے نامور ٹرسٹی شریک تھے۔ متوفی مسٹر بک کا اثر کام کر رہا تھا۔ دروازے بند کر کے مشورہ کیا گیا۔ سوال ہوا جدید آنریری سکرٹری کون ہو۔ کثرتِ رائے نواب محسن الملک مرحوم کے حق میں تھی۔ وقار الملک مرحوم نے مولوی سمیع اللہ خاں مرحوم کا نام لیا میں نے وقار الملک کا۔ اُس وقت کی محسن الملک مرحوم کی نگاہ غلط انداز اب تک مجھ کو یاد ہے۔

خلاصۂ کلام۔ تجربہ کی مضبوط بنیاد پر میرا یہ عقیدہ ہے کہ رفقائے سر سید مرحوم میں وقار الملک صداقت و دیانت میں پایۂ بلند رکھتے تھے۔

۱۹۱۷ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب انڈیا کونسل کے ممبر ہو کر انگلستان

تشریف لے گئے۔ اُن کی جگہ میں کانفرنس کا جنٹ سکرٹری مقرر ہوا۔ مجھ کو اب تک اقرار نہیں کہ یہ انتخاب بجا ہوا۔ اس انتخاب کے بعد میں نے کانفرنس کے مقاصد قواعد میں دیکھے ادبی پہلو میں ترقی کی گنجائش پائی۔ اہلِ علم وقلم کو متوجہ کیا۔ ذرائع محدود تھے۔ تاہم بعض نادر نمونے پیش نظر آگئے۔ مثلاً تاریخ گجرات پر مولوی سید عبدالحی صاحب مرحوم کا رسالہ "یادِ ایام"۔ اس کو تاریخی مضامین کا نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ یا مذہب وعقل کی بحث پر مولوی عبدالباری صاحب ندوی کا رسالہ "مذہب وعقلیات" اس نازک بحث میں قول فیصل کہ یہ رسالہ سنگ بنیاد ہی بلکہ بنیاد۔

کانفرنس کا ایک مقصد مشاہیر کی حیات لکھوانا بھی ہے۔ میں نے خیال کیا کہ رفقائے سرسید مرحوم سب سے اوّل (بلحاظ اپنی قومی خدمات کے) توجہ کے مستحق ہیں۔ یہ علمی خدمت بھی ہے اور ادائے شکر بھی۔

نواب وقار الملک مرحوم کے اسلامی خصائل ملک وملت کے واسطے کامل رہنما ہیں اس لئے میں نے رفقا میں سے اوّل حیات نگاری کے لئے منتخب کر کے کانفرنس کے سامنے پیش کیا۔ اس تجویز کو کانفرنس کے اجلاس نے بالاتفاق منظور فرمایا۔

اب سوال تھا سرمایہ، مواد تاریخی اور حیات نگاری کا سرمایہ تو واجبی ہی ملا۔ مواد دفتر دستیاب ہوا۔ اس کے لیے عزیز سعید مولوی مشتاق احمد صاحب سلمہ دلی سپاس بلکہ تحسین کے مستحق ہیں۔ جزاہ اللہ خیراً۔

مولوی محمد امین صاحب زبیری مہتمم دفتر تاریخ بھوپال کی مدد بھی لائق شکر ہی۔ ایک

معمر بزرگ ایسے ملے جنھوں نے وقار الملک مرحوم کا شباب دیکھا تھا۔ جن ابتدائی حالات سے کاغذ ساکت تھا اُن کی زبانی معلوم ہوئے۔ اُسی عرصہ میں اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ نے بکمال ذرہ نوازی اس ناچیز کو حیدر آباد طلب فرمالیا۔ یہاں کی حاضری گویا تکمیل وقار حیات کا مقدمہ تھی۔ یہاں دو صاحب ایسے ملے جنھوں نے سالہا سال وقار الملک مرحوم کی پیشی میں کام کیا تھا۔ ایک نواب عزیز جنگ دوسرے نواب لطیف یار جنگ بہادر۔ یہ دونو صاحب واقفیت کے ساتھ ساتھ صاحب نظر اور صاحب الرائے بھی تھے۔ گراں بہا مدد اُن کی رہنمائی اور بیان سے ملی۔ اول الذکر اب مرحوموں کی فہرست میں داخل ہو چکے غفرلہٗ۔ دوسرے زندہ ہیں۔ سلامت رہیں۔ دلی سپاس قبول فرمائیں۔ صوبہ ورنگل وقار الملک مرحوم کی انتظامی کوششوں کا دار العمل رہ چکا ہے۔ وہاں سے بھی مواد فراہم کیا گیا۔ ایک بوڑھے ہندو جو وقار الملک مرحوم کے زمانہ میں تحصیلدار رہ چکے تھے ملے۔ اُنھوں نے جب سُنا کہ وقار الملک کے حالات لکھے جاتے ہیں تو جوش عقیدت میں یہ کہہ کر سوانح نگار کے ہاتھ چومے کہ جو ہاتھ ایسے بزرگ کے حالات لکھیں وہ چومنے کے لائق ہیں اس کے بعد با چشم پرنم چشم دید حالات بیان کیے۔ غرض جس مواد تاریخی پر اس حیات کی بنیاد ہے وہ تمامتر تحریری اور مستند تحریری ہے یا خود نواب صاحب مرحوم کی یادداشتوں اور محفوظ خطوط سے لیا گیا ہے۔ یا سرکاری مثلوں اور کتابوں سے بہت سا حصہ معتمد اور واقف کار اصحاب کی زبانی شہادت ہے جو عینی شاہد ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جو مواد استعمال ہوا ہے وہ اتنا ہی معتمد ہے جو کسی سوانح عمری کا ہو سکتا ہے۔

کیسی خوش قسمتی تھی کہ حیات نگار مولوی محمد اکرام اللہ خاں صاحب ندوی ملے مولوی صاحب قدرتاً متین، صاحبِ فکر اور جفاکش واقع ہوئے ہیں۔ اسی کے ساتھ وقائع نگاری میں ملکہ رکھتے تھے۔ رسالہ الندوہ کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ عجب اتفاق ہے کہ جسماً بھی وہ اپنے ہیرو سے بہت مشابہ ہیں۔ نواب لطیف یار جنگ بہادر نے دیکھ کر فرمایا کہ ان کا تبسم بالکل نواب صاحب مرحوم کا تبسم ہے۔

مولوی صاحب نے نہایت انہماک اور محنت سے اس کام کو انجام دیا ہے۔ حیدرآباد پہنچ کر میں نے اُن کو بھی یہاں آجانے کی زحمت دی تاکہ مواد اطمینان سے فراہم ہو سکے اسی دوران میں رمضان المبارک کا مہینہ آگیا۔ موسم نہایت گرم مئی جون کا تھا۔ مولوی صاحب صبح سے تلاشِ مقصود میں نکل جاتے شام کو واپس آتے۔ اس اثنا میں کاغذات گھنٹوں پڑھتے۔ لوگوں سے ملتے۔ ضرورت ہوتی تو میلوں پیدل چلتے۔ شام کو یہ حالت ہوتی کہ دیکھنے والوں کو رحم آتا۔ میں نے اس اندیشہ سے کہ بیمار نہ پڑ جائیں محنت کم کرنے کی فرمایش کی۔ بے سود۔ ہدایت کی بیکار تاکید کی اب اثر ہوا اور مولوی صاحب نے سواری کی مدد لی۔ محنت و انہماک کے ساتھ مولوی صاحب کی نظر بالغ ہے تحریر بلیغ مورخانہ، واضح مسلسل، اور فضول نویسی سے پاک۔ اُن کو یہ ملکہ حاصل ہے کہ صدہا صفحے پڑھیں، نگاہ کو ثابت قدم رکھیں کارآمد باتیں اخذ کرلیں اور بیکار باتوں سے متاثر نہ ہوں۔ اس کے بعد صورتِ واقعہ و معاملہ مورخانہ لکھ دیں۔ ایک حیات نگار ایسا ہی ہونا چاہیے مولوی صاحب کا شکر جس قدر ادا ہو کم ہے بلکہ بہت کم، جزاہ اللہ عنا خیر الجزاء۔

غرض نہایت مستند مواد اور فاضل وقائع نگار کی کئی برس کی جانکاہ محنت کا ثمرہ وقار حیات کی شکل میں جلوہ فرما ہے۔ اہلِ خدمت اپنا کام کر چکے اب قدر اہلِ نظر کے ہاتھ ہے۔ وقار حیات کی شان بے تکلف یہ کہنے کی اجازت دیتی ہے کہ حیات جاوید کی بہترین رفیق ہے۔ یہی مرتبہ رفقا میں اُس کے ہیرو کا تھا۔ خدا کرے دوسرے رفقا کی حیات نگاری سے بزم معنوی ایسی ہی آباد ہو جیسی سرسید مرحوم کی جسمانی بزم معمور تھی۔ کانفرنس تجویز کر چکی ہے کہ وقار الملک مرحوم کے بعد نواب محسن الملک مرحوم کی حیات لکھی جائے حال میں یہ خبرِ خوش کان میں آئی ہے کہ ایک لائق اہلِ قلم کا نوشتہ قاضی رضا حسین مرحوم کی حیات کا مسودہ کانفرنس کو ملنے والا ہے۔ یاد ہوگا کہ قاضی صاحب احد نمایندے بہار کے سرسید مرحوم کی بزم عالی میں تھے کیا ادب اس کہنے کی اجازت دیگا کہ حیات جاوید اور وقار حیات قدیم تعلیم کے فرزندوں کی محنت کا ثمر ہیں۔ جدید اہل قلم بھی اپنا عالی دماغ اس جانب مائل فرمائینگے۔

بات میں بات پیدا ہوتی ہے۔ مسلم یونیورسٹی پر نظر ڈالو۔ مولوی سمیع اللہ خاں مرحوم نے چھپّر کے نیچے اسکول کا آغاز کیا۔ سرسید مرحوم کی کوشش نے پختہ عمارتوں میں کالج کا جلوہ دکھایا۔ محسن الملک مرحوم نے چاردانگ ہندوستان کو سرسید کے جھنڈے کے نیچے جمع کر دیا۔ وقار الملک مرحوم نے محسن الملکی فتوح کو عمیق کیا مضبوط کیا۔ سطح کو عمق بخشا۔ کالج کو اُس وقت چھوڑا جب وہ یونیورسٹی بن چکا تھا۔ تعلیم جدید کے جوہر دیکھنے کے لیے نگاہیں مشتاق ہیں۔ خدا وند تعالیٰ مبارک فرمائے۔ اس دور کی ترقیوں کی فہرست اس سے

بھی طویل ہو۔

خصائل وقار الملک

مشک عطار کے تعارف کا محتاج نہیں ہوتا۔ وقارِ حیات اپنی داستان خود ہی سنا رہی ہے تاہم مقدمہ نگاری خلاصہ نگاری کی متقاضی ہے

وقار الملک مرحوم معمولی حیثیت کے شریف گھر میں پیدا ہوئے۔ مکتب کی تعلیم پائی ابتدائی کاروبار بھی محض معمولی تھے۔ ملازمت دس روپیہ ماہوار سے شروع کی ترقی آہستگی سے کی تنخواہ میں بھی اور مراتب میں بھی۔ میدانِ عمل وسیع پایا۔ ایک وقت حیدرآباد کی سلطنت میں اصلی کارفرما اُن کی قوت تھی۔ زندگی کے کارنامے دفتر اور حکومت دونو میں عیاں ہوئے۔ حاکم بھی رہے محکوم بھی۔ ادنیٰ محکومی ایک کنارہ پر اور حاکمی دوسرے کنارہ پر اس میدانِ عمل کے ہے۔

مسلمانوں کی سیاسی خدمت بورڈنگ ہوس کی سپرڈنٹی سے کالج کی اور لیگ کی آنریری سکرٹری شپ تک کی۔ کالج کا سکرٹری ہونا مسلمانانِ ہند کا سردار ہونا تھا۔ یہ مرتبہ اس منصب کو سرسید مرحوم سے لے کر وقار الملک مرحوم کے عہد تک رہا۔ زمانے کی ترقی کے ساتھ نزاکتیں بڑھیں نزاکتوں کے ساتھ ذمہ داری۔ کراچی میں کانفرنس کا اجلاس نواب وقار الملک مرحوم کے اقبال کی شہادت تھا جب تمام ملک کے نمایندوں نے بالاتفاق اُن کو اپنا لیڈر (سالار) تسلیم کیا۔

انہی مصروفیتوں میں، فرصت ملی تو قلمی علمی خدمت بھی کی۔ نپولین کی سرگزشت اس کی یادگار ہے۔ تہذیب الاخلاق شاہد صادق ہے۔

ایک ممتاز پہلو اُن کی زندگی کا سر سید مرحوم کی رفاقت ہے۔ پہلو نہیں کارنامۂ اعظم خود مجھ سے بیان فرمایا تھا کہ پہلی بار سر سید مرحوم سے اُس وقت ربط حاصل ہوا جب ونو مراد آباد کے قحط کے اہتمام میں یکجا ہوئے۔ سر سید مرحوم اعلیٰ افسر تھے یہ اہلکار۔ ایک نے دوسرے کو دیکھا جانا، مانا، ایک نے رفیق، دوسرے نے سردار بلکہ پیر و مرشد۔ یہ عقیدت اور اعتقاد زندگی کے ساتھ رہا جان کے ساتھ گیا ے

باتو آں عہد کہ در وادیِ ایمن بستیم
ہمچو موسیٰ ارنی گوئے بمیقات بریم (حافظ)

اس رفاقت کا دَوران صدی کا ایک ثلث زمانہ ہے۔ اس دراز مدت میں ایک بار سے زیادہ اختلاف ہوا۔ شدید ہوا۔ اظہار اختلاف کا لہجہ بھی مریدانہ اور عقیدتمندانہ تھا۔ اختلاف پر اصرار کے وقت بھی تحریر سے تقریر سے حرکات سے سکنات سے جوش عقیدت ٹپکتا تھا۔ ہر ادا ثابت کرتی تھی کہ ایک عقیدتمند مرید اپنے مرشد کی خدمت میں عرض پرداز ہے۔ مثال۔ عروج حیدر آباد کے زمانے میں ایک مجمع اکابر نے یہ سماں دیکھا کہ وقار الملک کی ترکی ٹوپی اُن کے ہاتھ میں ہے گھٹا ہوا سر سر سید کے سامنے جھکا ہے زبان سے کہہ رہے ہیں "یہ سر حاضر ہے جوتیاں ماریئے مگر عرض یہی کرونگا کہ رائے آپ کی غلط تھی"۔

سر سید مرحوم کی وفات کے بعد قریباً بیس برس زندہ رہے۔ مرشد سے بہت زیادہ مرید کو ہندوستان کے عرض و طول میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ وفاداری کی داد دیجئے کبھی مرید سے زیادہ اپنے آپ کو نہیں سمجھا۔ مرشد کا سجادہ مرشد کی طرح واجب الادب ہا

بلکہ ادب آموز، جوہر فاداری میں وقار الملک منفرد نہ تھے محسن الملک مرحوم مولوی زین العابدین خاں مرحوم۔ برکت علی خاں مرحوم۔ خلاصہ باستثنائے قلیل سر سید مرحوم کے سارے رفیق اُن کی عقیدت و محبت جان کے ساتھ لے گئے۔ ہاں اس میں منفرد تھے کہ اختلاف کی جرارت کرتے تھے، جرارت کے بعد اظہار، اظہار پر اصرار، اصرار پر استحکام۔ اسی کے ساتھ عقیدت مستحکم۔

اِن چہار گانہ خصائل میں اُن کو جب اور جہاں دیکھو گے دلیر اور مستعد پاؤ گے۔ بُزدلی اور کاہلی یہ لفظ اُن کی لغاتِ زندگی میں لکھے ہی نہیں گئے۔ آخر عمر میں گٹھیا کا درد ہی گھٹنوں میں درد ہے۔ تاہم بلند زینہ پر چڑھتے اُترتے ہیں۔ جب عرض کی اس زحمت فرمانے کی کیا ضرورت تھی جواب دیا بلکہ دل پر لکھ دیا کہ انسان کو اتنی محنت کا خوگر رہنا چاہیئے۔

اُن کی زندگی کی کل جس طاقت سے چل رہی تھی اور چلتی رہی وہ اُن کی مذہبی زندگی تھی۔ بچپن میں نماز کے گھر میں پابند تھے۔ بڑے ہوئے تو نماز کے پیچھے انگریزی ملازمت چھوڑی۔ عروج حیدر آباد کے دور میں شاہی اسپیشل اُن کی نماز کے واسطے روکی گئی علیٰ ہذا القیاس۔ اس زندگی میں اُن کی اولیت [illegible] تھی کہ ان کے قلب نے قوت کے ساتھ صداقتِ ایمانی کو جذب کیا اور یہ انجذاب تہہ تک پہنچا۔ اِسی کا نام ہی قوتِ ایمانی قوتِ ایمانی کو لازم ہی پابندیِ ارکانِ اسلام۔ قوتِ ایمان اور پابندی ارکان کا نتیجہ تھی، وہ پُر عظمت زندگی جس کا کارنامہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہی۔ اس کارنامہ کا

طرۂ امتیاز صداقت وجانفشانی تھی۔ یہی سبق تم اس شاندار زندگی سے حاصل کر سکتے ہو مگر یاد رکھو ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ
(سعدی)

حیدرآباد
۱۲ر نومبر ۱۹۲۵ء

محمد حبیب الرحمن صدر یار جنگ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید و شکریہ

الحمد للہ کہ مدت کی سعی و کوشش کے بعد آج ہم کو یہ موقع حاصل ہوا ہے کہ نواب وقار الملک مرحوم مغفور کی مفصل سوانح عمری ملک کے سامنے پیش کر سکیں، حقیقت تو یہ ہے کہ نواب وقار الملک کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں، گزشتہ نصف صدی میں اُن کی شاندار قومی خدمات اس قدر روشن و درخشاں رہی ہیں اور آخر زمانہ میں اُن کی ذات تمام قومی تحریکوں پر اس طرح حاوی رہی ہے کہ آج بھی اُن کا نام بچّہ بچّہ کی زبان پر ہے، اگر اُن کی سوانح عمری نہ بھی لکھی جاتی جب بھی زمانہ اُن کو مدت تک یاد رکھتا، البتہ اس قوم کے لئے جس کی اُنھوں نے مسلسل پچاس سال تک خدمت کی یہ امر باعث شرم ہوتا کہ ایسے بلند پایہ رہ نما کی کوئی سوانح عمری نہ لکھی جائے۔

قومی خدمات کے سلسلہ میں نواب صاحب مرحوم نے سب سے زیادہ علی گڑھ تحریک کی خدمت کی ہے، اس لئے علی گڑھ کے ارباب حل و عقد کا یہ فرض تھا کہ وہ اس خدمت کو انجام دیتے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور علی گڑھ میں سب سے پہلے جناب مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی آنریری سکرٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی اور جناب ممدوح نے خاکسار کو اس خدمت پر مامور فرمایا

سوانح عمری کی تالیف و ترتیب سے پہلے مواد فراہم کرنے کی ضرورت تھی، خود نواب صاحب مرحوم کے پاس ملازمت حیدرآباد اور علی گڑھ تحریک کے متعلق معقول ذخیرہ مختلف کاغذات کا موجود تھا جو اگرچہ اُن کی وفات کے بعد کامل طور پر

محفوظ نہیں رہا، لیکن جو کچھ رہا وہ بھی کچھ کم نہ تھا۔ اس میں سے ایک کافی حصہ مولوی محمد امین صاحب مہتمم دفتر تاریخ بھوپال کے پاس چلا گیا جو خود بھی نواب صاحب کی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے، باقی امروہہ میں محفوظ رہا، جب مرحوم کے فرزند صاحبزادہ مشتاق احمد صاحب کو معلوم ہوا کہ جناب آنریری سکرٹری صاحب ایجوکیشنل کانفرنس نواب صاحب کی سوانح عمری تیار کرانا چاہتے ہیں، تو صاحبزادہ ممدوح نے یہ تمام مواد کانفرنس کو دینا منظور فرمایا۔ چنانچہ مولوی انوار احمد صاحب بار بروی امروہہ بھیجے گئے۔ جو تمام کاغذات فراہم کرکے لے آئے۔ اس کے بعد علی گڑھ میں مواد جمع کرنے کی پوری کوشش کی گئی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی قریباً پچاس برس کی جلدیں، ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی روددادیں، تہذیب الاخلاق و علی گڑھ میگزین کے پرچے اور ٹرسٹیوں کے اجلاس کی رپورٹیں، فراہم کی گئیں یا نظر سے گزریں، اس کے علاوہ گزشتہ چالیس پچاس سال میں علی گڑھ کے ارباب حل و عقد نے جو تعلیمی و سیاسی لٹریچر شائع کیا اس کا بڑا حصہ بھی مطالعہ میں آیا، بہت سے کانفڈنشل خطوط بھی حاصل ہوئے جن سے اکثر مخفی واقعات پر اطلاع ہوئی۔

جب علی گڑھ میں معتدبہ مواد فراہم ہوگیا تو حسب الارشاد جناب مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی صدر الصدور امور مذہبی دولت آصفیہ، حیدرآباد کا سفر کیا، ابتدا میں تو یہ سفر محض تعمیل ارشاد کے طور پر تھا لیکن وہاں قیام کے بعد تجربہ سے معلوم ہوا کہ یہ سفر ناگزیر تھا جس کے بغیر "وقار حیات" کی تکمیل ناممکن تھی، میں حیدرآباد کی عام حالت و سیاست سے قطعاً بیگانہ و ناآشنا تھا، اور خصوصیت کے ساتھ نواب وقار الملک کے عہد کی سیاست کو سمجھنا چاہتا تھا، موجودہ زمانہ میں اعلیٰ حضرت نظام الملک آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہ کے عہد میں حیدرآباد بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ہر طرف اصلاح، ترقی، بیداری، زندگی اور زندہ دلی کے آثار نمایاں ہیں، لیکن گزشتہ عہد کا

حیدر آباد کچھ اور تھا، اور جب تک اُس عہد کی حالت معلوم نہ ہو، نواب وقار الملک کی خدمات کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا،

غرض حیدر آباد میں حالات کی تلاش و جستجو میں مصروف ہونا پڑا، وقت کا بڑا حصہ کتب خانہ آصفیہ اور بعض سرکاری دفاتر میں گزرا، اور باقی اُن اصحاب کی ملاقاتوں میں جو نواب صاحب کا زمانہ دیکھ چکے یا اُن کے ساتھ کام کر چکے تھے، سب سے زیادہ مدد اس مقصد میں نواب عزیز جنگ (مرحوم) اور نواب لطیف یار جنگ بہادر سے ملی، ان بزرگوں نے صرف یہی مدد نہیں دی کہ بعض دلچسپ واقعات بتائے بلکہ اصلی مدد یہ تھی کہ اُنھوں نے اپنی واقفیت کی بنا پر مواد کی طرف رہ نمائی کی اور یہ بتایا کہ کون کون سی چیزیں کہاں کہاں سے دستیاب ہو سکتی ہیں؛

نواب لطیف یار جنگ بہادر کو نواب صاحب مرحوم سے خاص عقیدت ہے، اس لئے ممدوح باوجود مصروفیت خود بھی مواد تلاش کرنے میں مصروف رہے، نواب صدر یار جنگ بہادر مولٰنا محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کے کتب خانہ میں بھی حیدر آباد کے متعلق متعدد کتابیں تھیں وہ بھی مطالعہ سے گزریں، اس کے بعد نواب لطیف یار جنگ بہادر کے مشورہ سے حسب الارشاد نواب صدر یار جنگ بہادر صوبہ شرقی کا سفر کیا جہاں نواب وقار الملک نے چند سال تک صوبہ دار کی حیثیت سے کام کیا تھا، ہنمکنڈہ میں مختصر قیام کرنے کے بعد صوبہ کے صدر مقام ورنگل میں مقیم ہوا، جہاں تمام سرکاری دفاتر موجود ہیں، خوش نصیبی سے یہاں جناب میر ولایت علی صاحب مددگار صوبہ دار سے ملاقات ہوئی، جناب موصوف کے بزرگوں سے اور نواب صاحب مرحوم سے خاص تعلقات تھے، اس بنا پر اُنھوں نے اس کام میں بے حد مدد دی، اور میرے قیام و آسائش کا بھی معقول انتظام کر دیا، اگر میر صاحب ممدوح کی توجہ نہ ہوتی تو صوبہ شرقی سے مواد کا ملنا نہایت مشکل تھا۔

یہاں صوبہ داری کے دفتر میں نواب صاحب مرحوم کے عہد کے کاغذات کا کافی ذخیرہ تھا

ہزاروں صفحے تو مختلف مقدمات کے فیصلوں کے متعلق خود نواب صاحب مرحوم کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے، اس طومار کا پڑھنا اور سمجھنا اور ضروری مضامین کا انتخاب کرنا آسان کام نہ تھا، لیکن مسلسل مصروفیت نے اس دشواری کو حل کردیا، میں اس مواد کے مطالعہ اور تلخیص و انتخاب میں مصروف ہوگیا، اور دو شخص نقل و کتابت کے لئے مامور کئے، دفتر میں نواب وقار الملک کے زمانہ کے سرکاری جو کاغذات بھی محفوظ تھے وہ بھی بالاستیعاب نظر سے گزرے، اور اُن سے ضروری واقعات کا انتخاب کیا گیا غرض چند ہفتہ کی پیہم مصروفیت نے ایک کافی ذخیرہ معلومات کا فراہم کردیا (اگرچہ بخوف طوالت کتاب میں مشکل سے اس ذخیرہ کے ایک ربع حصہ سے کام لیا گیا ہی) حیدرآباد آنے پر نواب لطیف یار جنگ بہادر نے بعض رپورٹیں اور نواب عزیز جنگ نے نواب صاحب مرحوم کے بعض احکام اور تحریریں عنایت کیں اور میں یہ ذخیرہ اپنے ہمراہ لے کر علی گڑھ آیا اور مواد کی تلخیص و کتاب کی ترتیب و تالیف میں مشغول ہوگیا۔

اگرچہ اب علی گڑھ اور حیدرآباد کے متعلق معلومات کا کافی ذخیرہ میرے پیش نظر تھا، لیکن جو لوگ تحریر و تالیف میں مشغول رہتے ہیں وہ اندازہ کرسکتے ہیں کہ ہر سوانح نگار کی طبعاً یہ خواہش ہوتی ہی کہ اپنے ہیرو کے حالات کے متعلق جو کچھ وہ زیادہ سے زیادہ حاصل کرسکتا ہی اس کو حاصل کرے تاکہ تالیف ہر پہلو سے مکمل ہو، اس بنا پر یہ چیز بار بار میرے دل میں کھٹکتی تھی کہ جو مواد مولوی محمد امین صاحب نے امروہہ سے حاصل کیا ہی اور جو دوسرے ذرائع سے بڑی سعی و کوشش کے بعد چند سال میں جمع کیا ہی اگر وہ سب بھی پیشِ نظر ہو، تو یہ کتاب زیادہ مکمل ہوسکتی ہی۔ خود مولوی محمد امین صاحب کی بھی یہ خواہش تھی کہ نواب صاحب کی جو لائف تیار ہو وہ مواد کی حیثیت سے مکمل ہو، لیکن موجودہ صورت میں جب کہ مواد دو جگہ منقسم تھا، تکمیل دشوار تھی، باہمی گفتگو و مراسلت نے اس مشکل کو حل کردیا اور یہ طے پاگیا کہ یہ تمام مواد یکجا کرلیا جائے، چنانچہ اس غرض سے میں نے بھوپال کا سفر کیا

اور مولوی محمد امین صاحب نے وہ تمام ذخیرہ جو چار پانچ سال کی محنت و کوشش سے جمع کیا تھا میرے سامنے رکھ دیا۔

مولوی محمد امین صاحب نے نہ صرف مواد جمع کیا تھا، بلکہ اپنا مسودہ بھی تیار کر لیا تھا جو قریباً چار سو صفحہ کا تھا، اور مواد کا یہ ذخیرہ صرف نواب صاحب تک محدود نہ تھا بلکہ اس میں علی گڑھ تحریک کے دوسرے سربرآوردہ مشاہیر کے متعلق بھی معلومات کا خاصہ ذخیرہ تھا، میں نے اس میں سے وہ کاغذات یکجا کر لئے جو نواب وقار الملک کے ساتھ مخصوص تھے اور میرے پاس موجود نہ تھے۔ اکثر کاغذات نہایت مفید و کار آمد تھے، مثلاً انگریزی ملازمت کے حالات، حیدر آباد کے ابتدائی تعلق کے واقعات، سر سالار جنگ و سر آسمان جاہ کے متعدد خطوط و تحریریں، نواب صاحب کے بعض اہم خطوط و عرائض، مقدمہ معدنیات کے متعلق مفید معلومات۔ وغیرہ ذلک،

مولوی محمد امین صاحب نے یہ ذخیرہ مع جملہ مسودات کے میرے حوالہ کر دیا، اس ذخیرہ کے حاصل ہو جانے کے بعد تمام ممکن الحصول مواد یکجا ہو گیا، لیکن اس کے بعد بھی بغیر کسی مزید جد و جہد کے کچھ نہ کچھ مواد اور ملتا رہا، مثلاً نواب عزیز جنگ (مرحوم) نے محکمہ مال گزاری کے گشتیات کی ایک جلد بھیجی، اسی طرح نواب لطیف یار جنگ بہادر نے نواب صدر یار جنگ بہادر کے ذریعہ سے ایک ضخیم جلد نواب وقار الملک کے ہاتھ کی لکھی ہوئی رپورٹوں کی بھیجی، غرض کتاب کی تالیف و تحریر کے وقت یہ پورا ذخیرہ مع مولوی محمد امین صاحب کے کاغذات و مسودات کے مجتمع تھا، اور میں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔

یہ بالکل ممکن ہے کہ بوجہ امتداد زمانہ، بعض ضروری واقعات کے متعلق مواد نہ مل سکا ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ بعض واقعات کے متعلق جو مواد حاصل ہوا ہے وہ بہمہ وجوہ مکمل نہ ہو اور اس وجہ سے بیان واقعہ میں بعض جزئیات رہ گئی ہوں، لیکن با ایں ہمہ اس میں شبہ نہیں کہ جو کچھ جمع ہو گیا، مقدار کے لحاظ سے توقع سے زیادہ تھا، ہندوستان کے بہت سے ارباب کمال و مشاہیر ایسے ہیں کہ اگر آج ان کے حالات لکھنے کا قصد کیا جائے تو مشکل سے چند صفحہ کا مواد ہاتھ آتا ہے، لیکن یہ نواب صاحب مرحوم کی

خوش نصیبی ہے کہ مختلف مقامات پر متعدد اشخاص اُن کی سوانح مری کے لئے میٹریل جمع کرنے میں مصروف تھے، ایک طرف میں علی گڑھ، حیدر آباد اور صوبہ شرقی میں حالات کی تلاش و جستجو کر رہا تھا، دوسری طرف مولوی محمد امین صاحب پوری توجہ اور محنت سے اسی کام میں منہمک تھے، گویا قدرت خود اُن کی لائف کی تکمیل کا سامان کر رہی تھی، کیونکہ آخر کار یہ تمام مواد جو متعدد اشخاص نے مختلف مقامات و ذرائع سے حاصل کیا تھا علی گڑھ میں جمع ہو گیا

مواد جمع ہو جانے کے بعد کافی زمانہ اُس کے مطالعہ و انتخاب اور تلخیص و تہذیب میں صرف ہوا، اس کے بعد ترتیب و تالیف کی نوبت آئی، ابتدا سے یہ امر پیش نظر تھا کہ ضروری و اہم واقعات لکھنے سے رہ نہ جائیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی خیال تھا کہ کتاب کی ضخامت غیر معمولی نہ ہو اس لئے حتی الامکان ایجاز و اختصار کا لحاظ رکھا گیا اور اکثر طویل الذیل مضامین و یادداشتوں کی نہایت احتیاط کے ساتھ تلخیص کی گئی، مگر واقعات کی کثرت و تنوع کی وجہ سے باوجود اس احتیاط کے کتاب کی ضخامت کسی قدر بڑھ گئی، لیکن اس کے بغیر چارہ نہ تھا، کتاب کا پہلا حصہ جو حیدر آباد کی سرکاری خدمات کے متعلق ہے جب اندازہ سے کسی قدر بڑھ گیا تو دوسرے حصہ میں حتی الامکان اختصار سے کام لیا گیا، تاہم یہ امر پیش نظر رہا کہ تمام ضروری و اہم واقعات کتاب میں آ جائیں۔

غرض مدت کی تلاش و جستجو، کوشش و کاوش اور ریزہ چینی کے بعد پراگندہ کاغذات نے ایک مرتب لائف کی صورت اختیار کی جو اس وقت ناظرین کے ہاتھ میں ہے، اس لائف کے متعلق تکمیل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس میں ناظرین کو بہت سے ایسے دلچسپ، سبق آموز اور پُراسرار واقعات ملیں گے جو اب تک پردۂ خفا میں تھے، اس کے علاوہ انسانی زندگی کے متعلق بہت سے عجیب و غریب تجارب حاصل ہونگے جو بجائے خود گراں قیمت ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے

یہ بھی معلوم ہوگا کہ محنت، دیانت اور راستبازی کے ساتھ دنیا میں ترقی و کامیابی حاصل کرنے کے کیا طریقے ہیں، غرض مجموعی حیثیت سے یہ کتاب انشاء اللہ پڑھنے والوں کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگی اس سے زیادہ کتاب کے متعلق اور کچھ عرض کرنے کی حاجت نہیں، باوجود اپنی بے بضاعتی و ناقابلیت کے جو کچھ موجودہ حالت میں ہم سے بن سکا ہے وہ حاضر ہے۔

آخر میں مکرر اُن اصحاب کا دلی شکریہ ادا کیا جاتا ہے جن کی سعی و محنت کے نتائج سے ہم کو مستفید ہونے کا موقع ملا اور ایک مکمل لائف کے لکھنے کا سامان بہم پہنچا، واقعہ یہ ہے کہ نواب **عزیز جنگ** (مرحوم) نواب **لطیف یار جنگ** بہادر اور مولوی **محمد امین** صاحب کی امداد و اعانت کے بغیر یہ کتاب اس طور پر مرتب نہیں ہوسکتی تھی جیسی کہ وہ اب ہے۔

بطور اظہار واقعہ یہ بھی عرض کیا جاتا ہے کہ حیدرآباد میں مواد فراہم کرنے اور حالات جمع کرنے میں جو کچھ کامیابی ہوئی وہ محض نواب **صدر یار جنگ** بہادر کی بدولت ہوئی، میں حیدرآباد سے بالکل ناآشنا تھا، کسی سے تعارف تک نہ تھا، ایسے حالات میں دفاتر تک رسائی قطعاً ناممکن تھی، اور وہاں کے مخصوص حالات کے لحاظ سے بڑے بڑے اشخاص حالات بتانے پر بھی آمادہ نہیں ہوسکتے تھے، چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ ابتدا میں نواب **عزیز جنگ** مرحوم نے حالات بتانے میں تامل کیا بعد کو معلوم ہوا کہ اُن کو یہ شبہ پیدا ہوگیا تھا کہ سوانح عمری لکھنا محض ایک حیلہ ہے اور یہ کہ میں کسی خاص پولٹیکل مقصد سے حیدرآباد آیا ہوں، اور سلطنت کے اندرونی حالات معلوم کرنا چاہتا ہوں، ظاہر ہے کہ ان حالات کے اندر کس طرح کامیابی حاصل ہوسکتی تھی؟ **نواب صدر یار جنگ بہادر** نے ان تمام مشکلات کو حل کیا، اور میرے لئے آسانیاں بہم پہنچائیں، لوگوں سے تعارف کرایا، خطوط تحریر فرمائے۔ غرض کسی قسم کی مدد دینے میں تامل نہیں فرمایا۔ جب یہ مواد ہاتھ آیا، افسوس کہ علی گڑھ میں کسی صاحب سے مطلق کسی قسم کی مدد نہیں ملی۔ البتہ جناب مولوی

سید طفیل احمد صاحب نے مواد کی حیثیت سے مدد کی، یعنی سید صاحب ممدوح نے کالج کے متعلق مطبوعہ لٹریچر کا کافی ذخیرہ عنایت فرمایا، جس سے ہم نے جا بجا کتاب میں خاطرخواہ فائدہ اٹھایا سید صاحب ممدوح کی اس عنایت کا شکرگزاری کے ساتھ اعتراف کیا جاتا ہے۔

عجلت کے خیال سے کتاب کا دوسرا حصہ متعدد کاتبوں سے لکھوایا گیا ہے، اسی وجہ سے خط میں یکسانیت نہیں ہے، لیکن اگر ایسا نہ کیا جاتا تو کتاب پریس سے بہت دیر میں نکلتی، افسوس کہ سوءِ اتفاق سے وقت پر نواب صاحب کا کوئی اچھا فوٹو ہاتھ نہیں آیا اور بلاک کی تیاری کا بھی معقول انتظام نہیں ہوسکا، تاہم کتاب کے ساتھ جو تصویر دی گئی ہے اگر بہت بہتر نہیں ہے تو بُری بھی نہیں ہے، یہ تصویر اُس زمانہ کی ہے جب کہ وہ حیدرآباد سے واپس آ چکے تھے،

آخر میں ناظرین سے بادب درخواست ہے کہ اگر وہ کتاب میں کوئی غلطی پائیں تو اُس سے ازراہِ کرم خاکسار کو مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں شکرگزاری کے ساتھ اس کی اصلاح کردی جائے۔

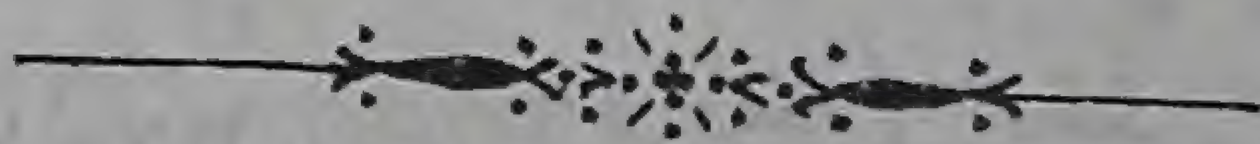
خاکسار

محمد اکرام اللہ خاں ندوی شاہجہانپوری
سلطان جہاں منزل
علی گڑھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وقارِ حیات

حصۂ اوّل



ولادت، نام و نسب مشتاق حسین ۲۹ محرم ۱۲۵۷ھ ۲ مارچ ۱۸۴۱ء کو موضع سراوہ (ضلع میرٹھ) میں پیدا ہوئے جہاں اُن کے والد ملازم تھے۔ تاریخی نام "چراغ احمد" ہے۔ اُن کے والد منشی فضل حسین سنبھل ضلع مرادآباد کے رہنے والے تھے، اور نسب کے لحاظ سے کنبوہ تھے۔ فارسی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اور عربی سے بھی واقف تھے۔ ان کا جدی سلسلہ دیوان عبدالمومن تک پہنچتا ہے جو سنبھل کے ایک امیر تھے اور عہد شاہ جہانی میں دیوانی تن کے منصب پر ممتاز تھے، شاہ جہاں کے مشہور وزیر سعداللہ خاں ابتدا میں انہی کے بچوں کی اتالیقی پر مقرر ہوئے تھے اور آخر انہی کی بدولت دربار شاہی میں رسائی

پائی۔

مشتاق حسین کی والدہ بتول النساء بیگم حکیم محمد منیر صاحب ساکن امروہہ کی پوتی تھیں، جو ایک قابل طبیب اور اپنے وطن و خاندان میں نہایت ممتاز تھے۔ یہ خاتون نیک نفس، پابند صوم و صلوٰۃ اور پرہیزگار تھیں۔ اگرچہ کتابی تعلیم سے محروم رہ گئی تھیں، لیکن اس زمانہ میں شرفاء کے خاندانوں میں خانگی تربیت اور مذہبی معاشرت عورتوں میں جو پاکیزہ عادات و اطوار پیدا کر دیتی تھی، اس سے مشتاق حسین کی والدہ کو بھی حظ وافر ملا تھا۔ موجودہ زمانہ کی تعلیم و تربیت اس قسم کے شریفانہ اوصاف اور مذہبی جذبات پیدا کرنے سے قاصر ہے، اس لیے اس طرز تربیت کا اندازہ لوگوں کو نہیں ہو سکتا۔

ابھی مشتاق حسین کی عمر پورے ۶ ماہ کی بھی نہ تھی کہ اُن کے والد نے ۹ رجب ۱۲۵۷ھ (۲۷ اگست ۱۸۴۱ء) کو انتقال کیا، اس لیئے اُن کی والدہ اس یتیم بچے کو اپنے والد مولوی انور علی صاحب کے مکان پر امروہہ لے آئیں۔

بچپن، تعلیم و تربیت

عموماً بچپن کے زمانہ میں بچے لاڈ پیار کی وجہ سے بے ادب و گستاخ ہو جاتے ہیں، اور والدین کی پوری اطاعت نہیں کرتے، خصوصاً جو بچے یتیم ہو جاتے ہیں اُن کی دلجوئی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ماں اور تمام عزیز خود اُن کی اطاعت کرنے لگتے ہیں۔ لیکن بتول النساء کی حالت اس کے برعکس تھی، وہ سچی محبت اور لاڈ پیار کی بے جا شفقت میں امتیاز رکھتی تھیں۔ اس لیئے اُنھوں نے اس یتیم بچے کی تربیت کا ابتدا ہی سے خیال رکھا۔ سب سے پہلے مشتاق حسین کو اطاعت و فرمانبرداری کی تعلیم دی، چنانچہ وہ ماں کے تمام احکام کی بلا چون و چرا تعمیل کرتے، اور ہمیشہ اُن کی ہدایات پر بلا تامل عمل پیرا ہوتے تھے، لہٰذا اُن کو کبھی سختی اور تشدد سے پیش آنے کی نوبت نہیں آئی۔ مشتاق حسین کا مزاج ضدی تھا مگر جب کسی بات پر ضد کرتے اور ماں نرمی اور شفقت سے سمجھا دیتیں تو پھر ضد چھوڑ دیتے۔

بچپن میں اُن کو مٹھائی کا خاص شوق تھا، ان کی والدہ بتاشے منگوا کر رکھ لیتیں۔ جب کم بتاشے اُن کو دیئے جاتے تو وہ اکثر ضد کرتے تھے کہ "بوا میں تو بیس لونگا"اگر اُس وقت اُن کی "بوا" کچھ کم بتاشے دینا چاہتیں تو اُنھی بتاشوں کو مکرر سہ کرر گن کر بیس کی گنتی پوری کر دیتیں، خواہ وہ کیسی ہی ضد کرتے ہوں جہاں بیس کی آواز سنتے فوراً راضی ہو جاتے۔

بچپن میں پتنگ اُڑانے کا بہت شوق تھا، شام کو مکتب سے آنے کے بعد ماں کی اجازت سے بالاخانہ پر پتنگ اُڑاتے تھے۔ چونکہ چھت پر چہار دیواری تھی اس لیے گرنے کا کوئی خطرہ نہ تھا۔

والدہ کبھی سبق سُن کر یا کسی اچھی بات پر خوش ہو کر انعام دیتیں تو یہ اُس کو جمع کرتے اور اس سے قلم روشنائی وغیرہ خرید لیتے، یا کسی اندھے، لولے، محتاج فقیر کو والدہ سے اجازت لے کر اس میں سے کچھ دیدیتے۔

کھیلنے کے لیے اُن کو باہر جانے کی ممانعت تھی اس لیئے گھر ہی میں کھیلا کرتے، اُن کا نہ کوئی حقیقی بھائی تھا نہ بہن، البتہ اعزہ کے بہت سے بچے تھے، یہ اُن سب سے نہایت محبّت سے پیش آتے، کبھی کسی سے لڑائی جھگڑا نہ کرتے، یہاں تک کہ اگر اُن کا کوئی بزرگ کوئی چیز دیتا تو اس میں بھی جو بچہ موجود ہوتا اُس کو شریک کر لیتے۔

زمانۂ طفولیت میں چند ماہ تک مارہرہ رہنے کا بھی اتفاق ہوا تھا، مارہرہ میں اُن کے بہت سے عزیز تھے، اور سب ایک ہی محلہ میں آباد تھے جس میں کوئی غیر نہیں رہتا تھا اس لیے یہاں زیادہ احتیاط کی ضرورت نہ تھی لہٰذا اُن کو باہر جا کر ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت تھی۔

حکیم ابوالحسن صاحب کا جو اُن کے ہم عمر ہیں بیان ہے کہ:۔

"اِس زمانہ میں اُن کا جسم نہایت پھرتیلا تھا، اور درخت پر نہایت تیزی
سے چڑھتے تھے، نہایت حلیم الطبع تھے کبھی کسی سے برائے نام بھی
جھگڑا نہیں ہوا، سب کے ساتھ نہایت محبت و ہمدردی سے پیش آتے اگر
کھیل میں کوئی بات بچپن کے تقاضے سے ناگوار ہوتی تو کھیل چھوڑ دیتے
لیکن جھگڑا فساد نہ کرتے ایحیاناً اگر کوئی بزرگ بلا وجہ خفا بھی ہو جاتا تو
خاموش رہتے۔ صوم و صلوٰۃ کے پورے پابند تھے، جب نماز کا وقت
آتا تو سب کام چھوڑ کر مسجد چلے جاتے۔"

جب چار سال اور ۴ ماہ کی عمر ہوئی تو حافظ غلام نبی صاحب قریشی نے رسم بسم اللہ خوانی ادا کی اور مشتاق حسین کی والدہ نے چاندی کی تختی اُستاد کو نذر کی اس کے بعد وہ مکتب میں بٹھائے گئے، اُس زمانہ میں باقاعدہ مدارس نہ تھے شرفا کے محلّوں میں مکتب ہوا کرتے تھے، جہاں میاںجی بچوں کو اُردو فارسی کی تعلیم دیتے۔ بعض مکتب کسی قدر بڑے پیمانہ پر بھی ہوتے تھے جہاں عربی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ چٹائی، ٹاٹ، یا زیادہ سے زیادہ ایک دو چوبی تخت کسی کمرہ یا دالان میں بچھے ہوتے تھے، بس اسی کا نام مکتب تھا۔ طلبہ عموماً علٰحدہ علٰحدہ پڑھتے تھے، درجہ بندی کا زیادہ رواج نہ تھا۔ بڑی عمر کے طالبِ علم میاںجی کی خدمت بھی کرتے تھے، طلبہ کو اُستاد کی کسی خدمت میں عار نہ تھا اطاعت و فرماں برداری اس زمانہ کی تعلیم کا اصلی جوہر تھا، طرزِ تعلیم اگرچہ نہایت سادہ تھا لیکن اخلاقی حیثیت سے اِس کے نتائج نہایت خوشگوار تھے اس تعلیم و تربیت اور ماحول سے طلبہ کے عادات و اطوار میں پختگی، طرزِ عمل میں اعتدال، اور امتیاز مدارج پیدا ہوتا تھا۔

غرض مشتاق حسین نے اس طرز کے مکتب میں تعلیم کی ابتدا کی، اور چھ سال کی عمر میں قرآنِ مجید ختم کر لیا، اس کے بعد اُردو اور فارسی کی درسی کتابیں شروع ہوئیں۔

وہ صبح کو ۷ بجے مکتب جاتے اور گیارہ بجے واپس آجاتے، اس کے بعد کھانا کھاکر تھوڑی دیر کھیلتے، پھر تختی دھوکر خشک ہونے کے لیئے رکھ دیتے، اب نماز ظہر کا وقت آجاتا، وضو کرکے ماں کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیئے کھڑے ہوجاتے، نماز سے فارغ ہوکر مکتب چلے جاتے اور نماز عصر پڑھ کر وہاں سے گھر آتے، اور کھڑے ہوکر ماں کو سبق سناتے، اور تختی دکھاتے (اگرچہ وہ پڑھی لکھی نہ تھیں مگر یہ اپنے بھولے پن کی وجہ سے اُن کو پڑھا لکھا سمجھتے تھے) موسم سرما میں بعد نماز مغرب چراغ کے سامنے بیٹھ کر آموختہ یاد کرتے۔

مکتب کی معمولی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد امروہہ کے ایک عالم جن کا نام مولوی سید رافت علی صاحب تھا خانگی طور پر کسیقدر عربی[1] بھی پڑھی، اِسی زمانہ میں ضلع مرادآباد میں تحصیلی مدارس قائم ہوئے تو مشتاق حسین بھی ۱۸۵۴ء یا ۱۸۵۵ء میں تحصیلی مدرسہ میں داخل ہوئے، اگرچہ درمیان میں کچھ مدت کے لیئے تعلیم کا سلسلہ منقطع بھی ہوگیا، تاہم اوائل ۱۸۵۹ء تک یہاں تعلیم پاتے رہے۔

انجنیری کی تعلیم

مکتب اور تحصیلی اسکول کی تعلیم سے فارغ ہوکر ۱۸۵۹ء کے کسی مہینہ میں رڑکی انجنیرنگ کالج میں داخل ہوئے۔ صحیح طور پر نہیں معلوم کہ اُنھوں نے یہاں کس زمانہ تک تعلیم پائی، البتہ مارچ ۱۸۶۰ء کے امتحان میں شریک تھے، لیکن چونکہ اس تعلیم سے اُن کو مناسبت نہ تھی، اس لیے کوئی نمایاں کامیابی نہ حاصل کرسکے، اور اس کے بعد اُن کا تعلیمی زمانہ ختم ہوگیا۔

---

[1] امروہہ کے مولوی سید احمد حسین صاحب زینبی بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ خود مولوی مشتاق حسین صاحب نے اُن سے فرمایا کہ:-

"میں نے عربی کتابیں تفسیر جلالین تک مولوی رافت علی صاحب سے پڑھی ہیں"

شادی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اپنے پھوپا منشی امام الدین صاحب[1] کے پاس کام سیکھنے کے لیئے بھیجدیئے گئے، جو اس زمانہ میں مراد آباد میں تحصیلدار تھے۔ یہاں پہنچکر اُنھوں نے کلکٹری میں اُمیدوارانہ طریقہ پر کام سیکھنا شروع کیا۔ اسی زمانہ میں منشی صاحب نے مراد آباد ہی میں اپنی منجھلی لڑکی سے ان کا عقد کردیا، بیوہ ماں کے بڑے حوصلے تھے اور وہ اپنے دل کے تمام ارمان کو نکالنا چاہتی تھیں، لیکن منشی امام الدین صاحب نے فضول مراسم کو ترک کرنے کا عزم کرلیا تھا۔ اس لیے کسی کا اثر کارگر نہوا، اور تقریب نہایت سادگی سے انجام پذیر ہوئی، یہاں تک کہ معمولی طریقہ پر برات بھی نہیں گئی، صرف دولہا اور دولہا کے چچا امروہہ سے مراد آباد چلے گئے اور نکاح ہوگیا۔ اگرچہ خاص اعزا اور اُن کی والدہ کو تقریب کے اس طرح سادہ طور پر عمل میں آنے سے نہایت رنج ہوا، تاہم برادری میں اس سادہ تقریب نے ایک قابل تقلید مثال قایم کردی۔

انگریزی ملازمت

اسلامی عہدِ حکومت میں اکثر شریف اور معزز خاندانوں کی کسب معاش کا ذریعہ شاہی ملازمت تھی، انقلاب حکومت کے بعد بھی یہ دستور اور شوق باقی رہا۔ ابتدائے عہد حکومت

---

[1] منشی امام الدین صاحب والد بریلی کے رہنے والے تھے لیکن چونکہ شادی امروہہ میں ہوئی تھی اس لیے زیادہ تر امروہہ میں قیام رہتا تھا اُنھوں نے انقلاب ۱۸۵۷ء سے پہلے کانسٹبلو میں بھرتی ہوکر سب انسپکٹری تک ترقی حاصل کرلی تھی انقلاب کے زمانہ میں اُنھوں نے گورنمنٹ کی جو خیر خواہی کی تھی اسکے صلہ میں پرگنہ حسنپور ضلع مرادآباد کے تین مواضع سرکار سے عنایت ہوئے اور تحصیلداری پر ترقی دیگئی اسکے بعد ۱۸۷۲ء میں ڈپٹی کلکٹر ہوکر بہاں تک مرادآباد میں کام کرتے رہے ابھی پنشن کی نوبت نہیں آئی تھی کہ ۱۸۷۹ء میں انتقال کیا۔ منشی امام الدین صاحب کو فارسی میں بڑی قابلیت تھی فارسی عبارت نہایت عمدہ لکھتے تھے نستعلیق خط بھی اچھا تھا زود نویس ایسے تھے کہ دو تین جزو لکھ لیتے تھے فارسی کے اشعار نہایت کثرت سے یاد تھے صحتِ جسمانی بھی اچھی تھی کئی کئی میل روزانہ بلا تکلف چلسکتے تھے، ساٹھ ساٹھ میل تک اکثر اُن کو گھوڑے پر سفر کرنیکا اتفاق ہوا ہے ڈنڑ، مگدر کی ورزش ابتدائے عمر سے شروع کی اور آخر عمر تک کرتے رہے اور یہ ورزش خاندان میں بھی جبریہ رائج کی گھوڑوں سے بہت شوق تھا، سرسید مرحوم سے خاص مراسم تھے، سائنٹفک سوسائٹی کے ابتدا سے ممبر تھے، ایم اے او کالج کے قیام میں معاون و مددگار تھے، سرسید کے ساتھ

برطانیہ میں جب انگریزی کی قید نہ تھی اکثر قدیم طرز کے تعلیم یافتہ شرفا سرکاری ملازمت اختیار کرتے تھے، اور عموماً معزز عہدوں پر مقرر ہوتے تھے۔ مشتاق حسین کے خاندان میں بھی ملازمت کا دستور زمانہ دراز سے چلا آتا تھا۔ اُن کے بزرگوں نے دربار شاہی میں ملازمت ہی کے ذریعہ سے رسوخ حاصل کیا تھا، اس لیئے اب تک سرکاری ملازمت ذریعہ عزت تصور کی جاتی تھی۔ چنانچہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد خود اُن کو یا اُن کے بزرگوں کو ملازمت کا خیال پیدا ہوا۔

ابتدائی ملازمت

ملازمت کی ابتدا سررشتہ تعلیم سے ہوئی، امروہہ کے جس سرکاری مدرسہ کے وہ طالب علم تھے، اُسی مدرسہ میں ۱۰ جون سنہ ۱۸۵۹ء کو دس روپیہ ماہوار پر قائم مقام نائب مدرّس مقرر ہوئے، لیکن یہ محض چند روزہ ملازمت تھی، یعنی صرف پندرہ روز کے لیئے اُن کا تقرر ہوا تھا۔ ابھی اُن کا تعلیمی زمانہ باقی تھا، کیونکہ اس کے بعد وہ سول انجنیرنگ ٹامسن کالج رڑکی میں داخل ہوئے جہاں وہ مارچ سنہ ۱۸۶۰ء تک موجود تھے۔ لیکن اس لحاظ سے کہ یہ اُن کی سب سے پہلی سرکاری ملازمت ہے۔ اس کا تذکرہ نظر انداز کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔

محرری

منشی مشتاق حسین کا باقاعدہ سلسلہ ملازمت ستمبر سنہ ۱۸۶۰ء سے شروع ہوا جب کہ وہ تحصیل مراد آباد میں بیس روپیہ ماہوار پر محرر انکم ٹیکس مقرر ہوئے مگر قریباً ۷ ماہ بعد آخر اپریل سنہ ۱۸۶۱ء میں بوجہ کام ختم ہوجانے کے تخفیف میں آگئے۔ لیکن کام ایسی خوش اسلوبی سے انجام دیا تھا کہ جان اسٹریچی صاحب کلکٹر نے فارسی کا ایک پروانہ عطا کیا جس میں اُن کی محنت اور کام جلد ختم کرنے پر اظہار خوشنودی کیا تھا۔

انتظام محتاج خانہ

سنہ ۶۱-۱۸۶۰ء میں شدید قحط تھا، اسٹریچی صاحب نے (جو اُس وقت کلکٹر تھے) مراد آباد میں ایک محتاج خانہ جاری کیا جس کا انتظام سید احمد خاں کے متعلق تھا اور اُنھوں نے اپنے ساتھ منشی امام الدین صاحب کو بھی انتظام میں شریک کر لیا تھا، منشی مشتاق حسین بھی موخر الذکر کے ساتھ محتاج خانہ کا کام کرتے تھے اسی زمانہ میں سرسید سے اُن کا تعارف

(بقیہ صلا) سنہ ۱۸۶۱ء کی قحط سالی میں بھی کام کیا تھا، پبلک کے ہمدرد اور گورنمنٹ کے وفادار تھے، اس سبب سے دونوں کی نظروں میں وقعت تھی۔

ہوا، اور محتاج خانہ کے کام میں سرسید کا انہماک دیکھ کر اُن سے حسنِ ظن پیدا ہوا۔
اِس کے بعد جب ضلع کے دوسرے مقامات پر بھی محتاج خانہ کھولے گئے تو امروہہ میں منشی مشتاق حسین نے بذاتِ خود ایک محتاج خانہ کا پورا انتظام کیا۔

قلیل تنخواہ کی ملازمتیں

۱۵ر مئی ۱۸۶۲ء سے دوبارہ سلسلہ ملازمت شروع ہوا، اور تحصیل امروہہ میں اطلاق نویسی کی جگہ پر پندرہ روپیہ ماہوار پر تقرر ہوا۔ لیکن چونکہ یہاں ان کی رشتہ داری تھی اس لئے فوراً ہی فروری ۶۲ء میں ضلع بجنور کو تبدیل کر دئیے گئے۔ یہاں مذکورۂ بالا تنخواہ پر دا اصلبباقی نویس مقرر ہوئے، ۱۶ر اپریل ۶۲ء تک اس جگہ پر کام کیا، ازاں بعد ۱۷ر اپریل سے اہلمد تحصیل سررشتہ بجنور مقرر ہوئے، تنخواہ بدستور پندرہ روپیہ رہی۔ یہاں قریباً ایک سال ۸ر اپریل ۱۸۶۳ء تک کام کرتے رہے۔ ۹ر اپریل سنہ مذکور کو بیس روپیہ ماہوار پر اہلمد نیلام کلکٹری ضلع بجنور مقرر ہوئے، یہاں انھوں نے ۸ر جنوری ۶۴ء تک کام کیا، ۹ر جنوری سے صاحب کلکٹر ضلع بجنور کے اجلاس پر قائم مقام روبکار نویس مقرر ہوئے یہاں اُن کو بیس روپیہ تنخواہ کے اور دس عوض خدمت کے ملتے تھے۔ ۱۶ر جولائی ۶۵ء تک اِس جگہ پر کام کرتے رہے۔ ۱۷ر جولائی سے پینتیس روپیہ ماہوار پر قائم مقام نائب سررشتہ دار کلکٹری ضلع بدایوں مقرر ہوئے۔ ۲۵ر اکتوبر ۶۵ء تک اُنھوں نے یہ خدمت انجام دی لیکن جب اصل نائب سررشتہ دار آگیا تو ۲۶ر اکتوبر سے اُن کو تیس روپیہ ماہوار پر محکمہ ڈپٹی کلکٹر بند و بست ضلع بدایوں کا سررشتہ دار مقرر کر دیا گیا۔ یہاں اُنھوں نے صرف چند روز ۲۱ر نومبر ۶۵ء تک کام کیا، لیکن ایسی خوش اسلوبی اور دیانت سے کام کیا کہ مولوی محمد کریم صاحب ڈپٹی کلکٹر بند و بست نے ان کو ایک عمدہ سارٹیفکیٹ دیا۔

سررشتہ داری محکمہ صدر الصدوری علی گڑھ

بدایوں سے منشی مشتاق حسین ترقی پا کر علی گڑھ آئے، اور پچاس روپیہ ماہوار پر محکمہ صدر الصدوری کے سررشتہ دار مقرر ہوئے، اور نہایت محنت و دیانت سے کام کیا۔ یہاں اُن کو سرسید کی ماتحتی میں رجو اس زمانہ میں

علی گڑھ کے صدر الصدور تھے) کام کرنے اور اُن کے خیالات سے مستفید ہونے کا پورا موقع ملا، جس نے اُن کی آئندہ زندگی میں ایک خاص تبدیلی پیدا کر دی، جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔

منصرم عدالت کے عہدہ پر ترقی

یکم جولائی ۱۸۶۹ء سے دس روپیہ ماہوار کے اضافہ پر جج ماتحت کی عدالت میں منصرم مقرر ہوئے، اور نہایت لیاقت اور خوش اسلوبی سے ۳۱ رمئی ۱۸۷۲ء تک اس عہدہ پر کام کرتے رہے۔

علی گڑھ کے زمانہ ملازمت میں سرسید کو منشی مشتاق حسین کے کام اور اُن کی قابلیت اور دیانت کا پورا تجربہ حاصل ہوا، چنانچہ جب سرسید علی گڑھ سے تبدیل ہو کر بنارس جانے لگے تو انھوں نے منشی مشتاق حسین کی سروس بک پر حسب ذیل ریمارک کیا۔

"منشی مشتاق حسین سررشتہ دار عدالت ہذا نہایت لائق، نہایت محنتی اور نہایت کارگزار اور نہایت فہیم، اور نہایت زود نویس و خوش خط یہ افسر ہے۔ اس افسر کی دیانت داری پر مجکو ایسا ہی یقین ہے جیسا کہ اپنی موت پر، حقیقت میں جناب مسٹر بریلے صاحب بہادر کا اس محکمہ پر بہت بڑا احسان ہے جو ایسے لایق اور دیانت دار شخص کو اس محکمہ کی افسری کے لیئے مقرر کیا جس عہدہ پر یہ شخص نوکر ہے اس سے بہت زیادہ بڑے عہدہ کی نہایت عمدہ لیاقت اس میں موجود ہے۔"

سید احمد خاں صدر الصدور ۱۰ راگست ۱۸۶۸ء

جو لوگ سرسید کے طرز عمل اور اُن کی محتاط طبیعت سے واقف ہیں، وہ اس ریمارک کی قدر و قیمت کو صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ سرسید کے علاوہ دوسرے افسروں نے بھی ان کی قابلیت و دیانت پر عمدہ ریمارک کیئے ہیں، جن کو بخوف طوالت نظر انداز کیا گیا۔

امتحان تحصیلداری

عہدۂ منصرمی کی حالت میں وہ تحصیلداری کے امتحان کی بھی تیاری کرتے رہے۔ چنانچہ اپریل ۱۸۷۲ء کے پہلے ہفتہ میں اُنھوں نے میرٹھ ڈویژن سے تحصیلداری کا امتحان دیا، اور شعبہ فوجداری میں کامیاب ہوئے۔ اسی زمانہ میں جب کہ وہ صیغۂ مال میں

جانا چاہتے تھے، مسٹر بریملے نے اُن کے متعلق حسب ذیل ریمارک کیا:-

"مشتاق حسین منصرم ججی ماتحت کا تین برس سے زیادہ مقرر ہی، اور یہ شخص محکمہ مال میں داخل ہونے کی خواہش کرتا ہی، جہاں ہم یقیناً کہتے ہیں کہ وہ اپنی لیاقت اور محنت سے ترقی حاصل کریگا۔ اور میری رائے میں یہ شخص کما حقہٗ تحصیلداری کے قابل ہی"

ڈبلو بریملے جج علی گڑھ ۱۰ / اپریل ۱۸۶۲ء

صیغۂ دیوانی سے تبادلہ

منشی مشتاق حسین امتحان کے بعد منصرمی سے صیغۂ مال میں آ گئے۔ وہاں اُن کو ترقی کی اُمید نہ تھی، صیغۂ دیوانی میں امتحان منصفی کے لیئے انگریزی دانی کی شرط ہو گئی تھی لیکن مال میں ہنوز ترقی کی اُمید تھی۔ چنانچہ وہ سررشتہ دار کلکٹری مقرر ہوئے، اور کچھ مدت پیشکار یعنی نائب تحصیلدار بھی رہے، اور اوائل ۱۸۷۴ء میں قایم مقام تحصیلدار کی حیثیت سے بھی کام کیا۔

میونسپل بورڈ کی ممبری

اوائل ۱۸۷۳ء میں حسب الحکم گورنمنٹ ممالک مغربی وشمالی میونسپلٹی کول (علی گڑھ) کی ممبری پر دو سال کے لیے اُن کا تقرر ہوا، اور حسب معمول گورنمنٹ گزٹ میں اس کا اعلان ہوا۔ اُنھوں نے اپنی عادت کے مطابق اس کام کو بھی نہایت توجہ اور انہماک سے کیا۔

مسٹر مارٹن جج سے جھگڑا

زمانہ منصرمی میں جج ماتحت خود یا فریقین مقدمہ کی استدعا پر منشی مشتاق حسین کو بطور اہل کمشن مقرر کرتے تھے اور جو کیفیت وہ لکھتے تھے عموماً اُسی کے مطابق جج ماتحت کا فیصلہ ہوتا تھا۔ یہ مسٹر بریملے کی ججی کا زمانہ تھا۔ لیکن جب اُن کا تبادلہ ہو گیا، تو اُن کی جگہ پر مسٹر مارٹن آئے جو کسی خاص سبب سے مسٹر بریملے کے ہر کام کو ناپسند کرتے اور جن اہلکاروں پر مسٹر بریملے کی نظر عنایت تھی اُن کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اُنھوں نے کمشن کے متعلق منشی مشتاق حسین کی گزشتہ کارگزاریوں پر اعتراض کیا اور ۵/ جنوری ۱۸۷۳ء کو سروس بک میں خراب ریمارک درج کر دیا۔ منشی مشتاق حسین اس زمانہ میں پیشکار تھے اور عہدہ منصرمی سے استعفا دے چکے تھے۔ جب اُن کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو اس ریمارک کے خلاف سخت احتجاج

کیا۔ پے درپے چند درخواستیں پیش کیں اور بہ اصرار یہ خواہش کی کہ صاحب جج اُن وجوہ کو ظاہر کریں جن کی بنا پر اُنھوں نے سخت ریمارک لکھا ہے، یا اس ریمارک کو واپس لیں لیکن جب جج نے اس پر بھی توجہ نہ کی تو آخر میں اُنھوں نے ۲۳ر جنوری ۱۸۷۳ء کو ایک مفصل درخواست دی جس میں واقعات پر مدلل بحث کرنے کے بعد آخر میں یہ خواہش کی کہ :-

"اب حضور ایک سخت سے سخت تحقیقات میری نسبت عمل میں لادیں، حضور کی عدالت کے تمام وکلا اور تمام عملہ وغیرہ حاضرین عدالت میرے حال سے بخوبی واقف ہیں یہ اُن سب سے میرا حال دریافت کیا جائے اور میری تمام کیفیتیں جو میں نے بحیثیت اہل کمیشن پیش کی ہیں اُن کو آپ خود ملاحظہ کریں، اور آپ کے مزید اطمینان کے واسطے میں یہاں تک بھی بخوشی اجازت دیتا ہوں کہ جن جن لوگوں کو میری کیفیتوں سے نقصان پہنچا ہے اُنھیں کا اظہار آپ میری صفائی چال چلن کی نسبت قلمبند کریں، حالانکہ یہ ایک ایسا خطرناک راستہ ہے کہ مشکل سے کوئی ملزم اس کے اختیار کرنے پر راضی ہو سکتا ہے لیکن میں اِس طریقہ تحقیقات پر بھی نہایت دل سے رضامند ہوں۔ پس حضور مہربانی سے جلد کوئی تاریخ اس تحقیقات کے واسطے مقرر فرمادیں، اور مجکو بھی اس میں حاضری کی اجازت دیں مجکو یقین ہے کہ اس تحقیقات کے بعد حضور خود مناسب سمجھ کر اس تحریر کو جو میری نسبت عمل میں آئی ہے، اپنے قلم سے کاٹ دینگے اور پھر جو سارٹیفکٹ آپ مجکو عنایت کرینگے وہ میرے حق میں نہایت مفید ہوگا"

مسٹر مارٹن نے یہ درخواست واپس کردی اور زبانی طور پر تحقیقات سے انکار کردیا، اس پر اُنھوں نے ۲۸ر جنوری کو پھر ایک درخواست دی جس کے آخر میں لکھا:

"نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ میں اس باب میں حتی الامکان کوشش کرونگا کہ حضور کی تحریر اور میری معروضات کے نسبت اس طریقہ کی تحقیقات عمل میں آوے جو میں نے اپنی درخواست واپس شدہ میں بیان کیا ہے یا اور جس طرح سے تحقیقات کرنے والے

حاکم مناسب سمجھیں لیکن حضور عنقریب تشریف لے جانے والے ہیں اس لیئے ایک تردد ہے کہ اگر حضور کے بعد کمیشن قایم ہوئی تو شاید اس کے کسی ممبر کو یہ خیال ہو کہ صاحب جج بہادر اگر تشریف رکھتے ہوتے تو وہ ذریعہ بتلا دیتے جن سے سائل کے برخلاف رائے قائم ہو سکتی۔ پس میں گزارش کرتا ہوں کہ اگر حضور ممبران کمیشن کی ہدایت و رہنمائی کے واسطے وہ ذریعہ تحریر فرماتے جاویں تو زیادہ مفید ہوگا۔"

مسٹر مارٹن نے ۲۹ جنوری کو اس درخواست کے داخل دفتر کرنے کا حکم دیا، لیکن منشی مشتاق حسین جن کو اپنے طریق عمل پر پورا اعتماد تھا خاموش کیوں کر رہ سکتے تھے۔ مسٹر مارٹن کے طرز عمل سے مایوس ہو کر اب انھوں نے ایک درخواست ۳۱ جنوری ۱۸۷۳ء کو صاحب کلکٹر کے سامنے (جن کے وہ اس زمانہ میں ماتحت تھے) پیش کی اور مسٹر مارٹن کے طرز عمل کو وضاحت سے بیان کرنے کے بعد لکھا کہ :۔

"اب میں ادب سے عرض کرتا ہوں کہ بار بار صاحب جج کے یہ احکام مشعر انکار تحقیقات کے میرے رویہ کی نسبت حقیقت میں مجبوریت بخشتے ہیں، اور صاحب ممدوح کی کیفیت کی ایسی صورت میں کچھ وقعت سمجھنی نہ چاہیئے، مگر میں اب بھی خواہشمند ہوں کہ یہ کیفیت کتاب اعمال نامہ ججی میں سے بھی خارج کی جاوے اس لیے میں اس عرضی کے ساتھ اپنی اُن دو ناکامیاب عرائض کی نقل جو صاحب جج بہادر کے حضور میں حسب متذکرہ بالا گزرانی تھیں حضور میں پیش کرتا ہوں اور ادب سے یہ تمنا کرتا ہوں کہ میری ان عرضیوں کی یہ نقلیں دفتر میں رکھی جاویں اور مسٹر مارٹن صاحب کے جانشین کی تشریف آوری کے وقت اُن سے یہ تحریک کی جاوے کہ اس معاملہ کے حالات کی نسبت تحقیقات کریں۔

چونکہ میں آپ کے دفتر کا ماتحت ہوں اس لیئے آپ کے التفات کا اُمیدوار ہو کر عرض کرتا ہوں کہ تحقیقات جس کے واسطے میں نے صاحب جج کی عدالت میں ناکامیابی سے کوشش کی وہ آپ کی تحریک سے ہو جاوے اور مجکو موقع رد کرنے صاحب جج کے

اتہام اور منسوخ کرانے اُن کی کیفیت کا ملنا چاہیئے "۔

معلوم نہیں اس جد وجہد کا کیا نتیجہ نکلا؟ لیکن اس واقعہ سے منشی مشتاق حسین کی اُس جرأت خود داری اور اعتماد علی النفس کا پتہ چل سکتا ہی جس نے اُن کو آئندہ زندگی میں کامیاب و ممتاز بنایا۔ آج سے پچاس برس پہلے جب کہ با اختیار حکام کا اثر و اقتدار حد سے زیادہ تھا اور ماتحت ملازمین عزت نفس اور خود داری سے نا آشنا تھے (جیسا کہ اکثر اب تک بھی نا آشنا ہیں) بلا لحاظ نتایج اس طرح کی آزادانہ روش اختیار کرنا تعجب خیز ہی۔

خدماتِ خاص بکار قحط

۱۸۷۴ء میں بنگال کے اکثر اضلاع میں قحط پڑا جس کا اثر ممالک مغربی و شمالی کے اضلاع گورکھپور اور بستی وغیرہ میں پہنچا، جو بنگال سے متصل ہیں تو سر جان اسٹریچی نے (جو اس زمانہ میں لفٹنٹ گورنر تھے) سر سید کی درخواست پر منشی مشتاق حسین (قایم مقام سر رشتہ دار) کو اُن کی امداد کے لیئے انتظام قحط پر مامور کیا۔ معمولی تنخواہ کے علاوہ سو روپیہ ماہوار الاؤنس بھی مقرر کیا، اور مقام مذکور تک بعجلت ممکنہ پہنچانے کا سرکاری مصارف سے انتظام کیا گیا یہاں پہنچکر اُنھوں نے اپنی عادت کے مطابق نہایت محنت اور انہماک سے اپنا کام انجام دیا۔

مسٹر کالون سے نماز پر مناقشہ

منشی مشتاق حسین ابتدائے عمر سے نماز کے سخت پابند تھے، ایام ملازمت میں بھی اُن کا یہی معمول رہا۔ جب نماز کا وقت آتا دفتر سے اُٹھ کر چلے جاتے، مسٹر کالون کلکٹر کو جو کسی دوسری جگہ سے تبدیل ہو کر آئے تھے، یہ طرق عمل ناگوار گزرا۔ اُنھوں نے ممانعت کی لیکن منشی مشتاق حسین نے اس حکم کی متابعت سے انکار کیا، جب اصرار حد سے بڑھا تو اُنھوں نے ۱۴ ر جنوری ۱۸۷۵ء کو رخصت کی درخواست دی لیکن مسٹر کالون نے درخواست لینے سے انکار کر دیا، اور حقیقتہً یا دھمکی کے طور پر استعفا دینے کی ہدایت کی۔ چنانچہ اُنھوں نے ۱۵ ر جنوری کو ایک دوسری درخواست پیش کی جس میں پہلے تو اُنھوں نے یہ لکھا کہ مذہباً میرے اوپر نماز فرض ہی اور میں اس کو چھوڑ نہیں سکتا، لہذا نماز کی وجہ سے جو تھوڑی سی غیر حاضری ہوا کرتی ہی اس کی مجکو اجازت دی جائے اور اگر یہ منظور نہ ہو تو چھ ماہ کی رخصت مرحمت فرمائی

جائے جس کا مجکو حق ہے۔ آخر میں درخواست کو ان الفاظ پر ختم کیا۔

"اگر یہ درخواست بھی منظور نہ ہو تو یہ استعفا منظور فرمایا جائے جو حسب ارشاد حضور میں پیش کیا جاتا ہے۔"

اس درخواست کے پیش ہونے پر کلکٹر نے چھ ماہ کی رخصت یکم مارچ ۱۸۷۵ء سے منظور کرلی

اس واقعہ کے متعلق سرسید کا ایک دلچسپ خط | جب سرسید کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے ۲۹ جنوری ۱۸۷۵ء کو ایک خط لکھا:۔

"بھائی مشتاق حسین! کل میں سارے دن متردد رہا کیونکہ تمھارا کوئی خط نہیں آیا تھا، آج خط آیا اور حال معلوم ہوا گو میں کسی وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا، اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا دو دو اکھٹی بھی پڑھ لیتا ہوں، ریل میں لمبا سفر ہو تو مجھ سے ادا نہیں ہوتی، یہ سب باتیں مجھ میں ہیں اور نالائقی و شامتِ اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے، مگر تم نے اس معاملہ میں جو پیش آیا نہایت لچر پنا کیا، نماز جو خدا کا فرض ہے اس کو ہم اپنی شامتِ اعمال سے جس طرح جی سے ہوا ادا کریں یا قضا کریں لیکن کوئی شخص اگر کہے کہ تم نماز نہ پڑھو، اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہوسکتا، یہ بات سنی بھی نہیں جاسکتی، میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے، اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی بخشا نہ جائیگا۔ تم کو پہلے ہی اپنی طرف سے ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی، اور جب ایسا طریقہ اختیا نہیں کیا تو پھر بلبلانا اور گڑگڑانا، اور حضور رخصت ہی دیں، تنخواہ کاٹ لیں کہنا واہیات تھا، تڑاق پڑاق استعفا دینا تھا، اور صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کرونگا، نہ کہ آپ کی۔ کیا ہوتا، نوکری نہ میسر ہوتی، فاقہ مرجاتے نہایت اچھا ہوتا۔ والسلام

خاکسار سید احمد از بنارس ۱۹ جنوری ۱۸۷۵ء"

حیدر آباد میں سفارش

اس زمانہ میں مشہور و نامور مدبّر سر سالار جنگ اوّل، دولتِ آصفیہ کے مدار المہام تھے۔ انھوں نے سر سید سے شمالی ہند کے چند قابل اور تجربہ کار اشخاص کو ریاست کے انتظام کے لیئے حیدر آباد بھیجنے کی خواہش کی تھی، مولوی مہدی علی اور مولوی نذیر احمد وغیرہ جا چکے تھے، اور منشی مشتاق حسین کے متعلق بھی ایک موقع پر سر سید تحریک کر چکے تھے اور اب از سرِ نو انھوں نے یاد دہانی کی۔ سب سے پہلے ۱۸۷۳ء میں انھوں نے سر سالار جنگ کو لکھا تھا۔

"میں خوشی کے ساتھ یہ کہونگا کہ مشتاق حسین ذہین، محنتی، ایماندار، اور قابل حاکم ہے جس کو تجربہ کافی ہو چکا ہے۔ مختصراً یہ شخص حضور والا کی ضرورت کے لیئے بالکل موزوں ہے یہ صرف فوجداری، دیوانی، اور حساب کے صیغوں ہی میں کام نہیں کر سکتے، بلکہ ہمیشہ اس کام کے کرنے کو آمادہ ہیں جس کے لیئے حکم دیا جائے۔ میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ ان کا تقرر ریاست کے لیے فائدہ کا باعث ہوگا، اور حضور والا کو اس وقت معلوم ہو جائیگا کہ مشتاق حسین کے متعلق میں نے جو کچھ کہا ہے، اس میں مبالغہ سے کام نہیں لیا۔"

غرض ادھر مسٹر کالون سے یہ مناقشہ ہوا، اور اُدھر یاوری قسمت نے اُن کے لیے حیدر آباد میں سر و سامان بہم پہنچایا۔

سر سالار جنگ نے کسی قدر مراسلت کے بعد اُن کو حیدر آباد طلب کیا، اور چار سو روپیہ ماہوار پر اُن کا تقرر منظور کر لیا۔ یہ اُن کی رخصت کا زمانہ تھا، اس لیئے بلا تامل حیدر آباد روانہ ہو گئے۔ جب وہ حیدر آباد جا رہے تھے، تو مسٹر ٹی ایل کالون کلکٹر نے ۴ر مارچ ۱۸۷۵ء کو حسب ذیل سارٹیفکیٹ اُن کو دیا۔

"مشتاق حسین اس ضلع کے سررشتہ دار چھ مہینہ کے لیئے حیدر آباد دکن جا رہے ہیں جہاں اُن کو یہاں سے زیادہ تنخواہ کی اُمید ہے۔ میں نے چار مہینہ سے اُن کا کام دیکھا ہے اور میں اُن کے کام سے بالکل مطمئن ہوں یہ فرائض میں چست اور ذہین ہیں۔ میں نے اُن کو نماز کے لیئے پابندی سے اُٹھتے ہوئے پایا جس سے مجھے سخت تکلیف تھی اور میں اجازت نہیں

دے سکتا، اور چونکہ وہ اپنے خیال کو تبدیل نہیں کرتے، اس لیئے خوش قسمتی ہے کہ دیسی ریاست میں اُن کو جگہ مل گئی۔"

گورنمنٹ انگریزی کی ملازمت سے استعفا

حیدرآباد میں جس تنخواہ پر اُن کا تقرر ہوا تھا، وہ سررشتہ داری سے بہت زیادہ تھی، وہاں کام کے لیئے وسیع میدان اور اُن کی دقیقہ رس نگاہ کے سامنے ایک شاندار مستقبل تھا۔ تاہم جب رخصت کے اختتام کا زمانہ قریب پہنچا، تو اُن کو اس معاملہ میں فی الجملہ تردد ہوا۔ اس زمانہ تک کسی خاص عہدہ پر اُن کو نامزد نہیں کیا گیا تھا، تاہم اُن کی آئندہ اُمیدیں حکومت آصفیہ کے دامن دولت سے وابستہ تھیں، اس لیئے اُنھوں نے سرسالار جنگ کی رائے سے انگریزی ملازمت سے استعفا دے دیا۔ جیسا کہ وہ ۲۲ اگست ۱۸۷۵ء کے ایک پرائیویٹ خط میں جو استعفے کے ساتھ مسٹر کالون کو بھیجا، لکھتے ہیں:۔

"میری کیفیت یہاں بدستور ہے، ابھی تک کوئی خاص عہدہ نامزد نہیں ہوا، پچھلے دورہ میں جو اضلاع باقی رہ گئے تھے، اُن کے دیکھنے کے واسطے اور حکم ملا ہے۔ چنانچہ غالباً ختم برسات پر دورہ شروع ہوجائیگا۔ میں نے جناب نواب سرسالار جنگ بہادر سے عرض کیا تھا کہ میری رخصت آخر اگست کو ختم ہوجاویگی اس پر اُنھوں نے ارشاد فرمایا کہ استعفا بھیجدو، چنانچہ استعفا حسب ضابطہ علیحدہ آج ہی حضور میں روانہ کیا ہے۔"

غرض یکم ستمبر ۱۸۷۵ء سے اُن کا استعفا منظور ہوگیا، اِسی زمانہ میں اُنھوں نے بوجہ قیام حیدرآباد میونسپلٹی کی ممبری سے بھی استعفا دیدیا۔ حیدرآباد جاتے وقت اُنھوں نے ۶ ماہ کے لیئے ایک تلوار اور ایک بندوق کا لائسنس بھی لیا تھا، اور یہ اسلحہ حیدرآباد لے گئے تھے، چونکہ وہاں لائسنس کی ضرورت نہ تھی، اس لیئے اُنھوں نے میعاد کے اندر ۲۲ اگست ۱۸۷۵ء کو لائسنس واپس کردیا۔

ایامِ حیدرآباد

گورنمنٹ نظام کی ملازمت

ہر شخص کی قابلیت اور جوہر فطری کا اظہار میدانِ عمل میں ہوتا ہے۔ اگر نامساعدت روزگار سے کسی کو کام کرنے کا موقع اور میدان میسر نہ آئے تو اُس کی دماغی قابلیت اور قوتِ عمل کا اظہار نہیں ہو سکتا، ہزاروں شخص ہیں جن کو بدنصیبی سے اس ہنگامۂ رستخیز میں کام کرنے اور دنیا کی کشمکش میں حصہ لینے کا موقع نہیں ملا اس لیئے عزلت و گمنامی کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ کس کو خبر ہے کہ اگر زمانہ اُن کی مساعدت کرتا تو وہ کیا انقلاب برپا کرتے اور اپنے نتائج فکر و عمل سے دنیا کو کسقدر فائدہ پہنچاتے۔

گورنمنٹ ہند کا انتظام حکومت ایک مخصوص نظام کے ماتحت ہے۔ عنانِ حکومت ایک ایسی اعلیٰ جماعت کے ہاتھ میں ہے جس کے اجزائے ترکیبی حکمراں قوم کے افراد ہیں جو اپنے مخصوص اغراض کے ماتحت انتظام مملکت کرتے ہیں اُن کے نزدیک قابلیت کا ایک خاص معیار ہے اور ماتحت اقوام کی ترقی اور حکومت میں مداخلت کی ایک حد ہے۔ جس سے تجاوز کرنا ممکن نہیں۔

رفارم اسکیم سے پہلے تو محکوم اقوام کے افراد کو انتظام مملکت میں حصہ لینے اور جوہر قابلیت کے نمایاں کرنے کا بالکل موقع نہ تھا خصوصاً غیر انگریزی داں تو اس کا خیال بھی نہیں کر سکتے تھے، زیادہ سے زیادہ اُن کا معراج کمال ڈپٹی کلکٹری یا سب ججی کا عہدہ تھا مگر روزافزوں قیود و شرائط نے غیر انگریزی دانوں کے لیئے یہ دروازہ بھی بند کر دیا تھا، ان حالات اور

مخصوص طرزِ حکومت کی وجہ سے اکثر اعلیٰ دماغی و عملی اوصاف رکھنے والے اشخاص کو اُبھرنے اور کام کرنے کا موقع نہیں ملا، اور ہندوستان اُن کی خدمات سے محروم رہ گیا۔

البتہ دیسی ریاستوں میں قابل اشخاص کے لیے میدان عمل موجود تھا اور ترقی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جہاں کبھی کبھی کسی خوش نصیب کو اپنی دماغی قوت اور انتظامی قابلیت ظاہر کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اگرچہ یہاں بھی مشکلات کا سامنا تھا اور آزادانہ طریقہ پر کام کرنا دشوار کیونکہ ایک طرف ایجنسی اور رزیڈنسی کی مداخلت، وائسرائے کا مشورہ اور کسی معاملہ کا پسند یا ناپسند کرنا، فرماں روائے ملک کی ناخوشنودی کا خیال مختلف الاغراض پارٹیوں اور گروہ بندیوں کا طوفان، اور حکام ریاست کی منافست، دوسری طرف ضمیر کی متابعت، قوت ایمانی اور قابلیت کا زور، ملک کی ترقی و اصلاح کا حوصلہ، اور مذہب و ملّت کی خدمت کا ولولہ، ایک حوصلہ مند شخص کو بھی کش مکش میں مبتلا کر دیتا ہے، یہی سبب ہے کہ مشکل سے کسی ہندوستانی ریاست کے اعلیٰ عہدہ دار کی زندگی اس کش مکش اور تصادم افکار و اغراض سے پاک نظر آتی ہے۔

مولوی مشتاق حسین نے گورنمنٹ انگریزی کی حکومت میں محرری سے قایم مقام تحصیلدار کے عہدے تک ترقی کی اور ان تمام مدارج میں محنت، دیانت، اور عزت نفس کے ساتھ کام کیا مگر اُن کو اپنی مخصوص قابلیت اور فطری خصوصیات کے نمایاں کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا۔ لیکن اِسی زمانہ میں ایک طرف تو انگریزی حکومت مضبوط و مستحکم بنیاد پر قایم ہو چکی تھی اور جدید آئین و قوانین جاری ہو رہے تھے، دوسری طرف ہندوستانی ریاستوں میں تحریک اصلاح کا آغاز تھا اور قدیم طرزِ حکومت میں تبدیلیاں ہو رہی تھیں، اور جدید اصلاحات کے عمل میں لانے کے لیئے ہندوستان کے قابل اشخاص کی ضرورت ہر ریاست میں محسوس کی جاتی تھی اس لیے مولوی مشتاق حسین جیسے قابل اور دیانت دار افسر کے لیئے کسی ہندوستانی ریاست میں کام کرنے کا عمدہ موقع حاصل ہونا ناممکن نہ تھا۔

ہندوستانی ریاستوں میں حیدر آباد کو اپنے رقبہ و آبادی، اور اعزاز و وقار کے لحاظ

سے ایک خاص رتبہ حاصل ہے، اور اس کی گزشتہ تاریخ بھی شاندار واقعات کا مرقع ہے۔ چنانچہ اس موقع پر بھی جب ہندوستان میں ہر طرف اصلاحات کا آغاز ہو رہا تھا۔ مملکت آصفیہ میں بھی ایک جنبش پیدا ہو رہی تھی۔ خوش قسمتی سے اس زمانہ میں ملک کی عنانِ حکومت سر سالار جنگ اعظم کے ہاتھ میں تھی جن کو اعلیٰ درجہ کی انتظامی قوت اور قابلیت حاصل تھی، اور جدید اصول پر ملک کی ترتیب و تنظیم کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیئے اُن کو قابل اور تجربہ کار اشخاص کی ضرورت تھی جو اصلاحات کی ترویج اور نظم و نسق مملکت میں اُن کے معین و مددگار ہوں، چنانچہ اُنھوں نے نہایت احتیاط و بیدار مغزی سے متعدد اشخاص کا انتخاب کیا جن کی خدمات سے دولتِ آصفیہ کو معتدبہ فائدہ پہنچا، اسی سلسلہ میں مولوی مشتاق حسین کا انتخاب بھی عمل میں آیا جو ایک تجربہ کار، متدین، پُر احتیاط، پابند مذہب اور راستباز شخص تھے، محنت و مستعدی اُن کی فطرت میں داخل تھی، اور مضبوطی کے ساتھ کام کو اپنے گرفت میں لینا اُن کی ایک نمایاں خصوصیت تھی، اور اس زمانہ میں حیدرآباد کو اسی قسم کے لوگوں کی ضرورت تھی جو استقلال و جراءت دیانت و امانت اور غیر متزلزل ارادہ کے ساتھ ملک کا انتظام کریں۔ چنانچہ واقعات مابعد نے بتادیا کہ اُن کا وجود حیدرآباد کے لیئے کس قدر مفید و قیمتی ثابت ہوا، اور اُن کو اپنے جوہر قابلیت اور قوتِ عمل کے نمایاں کرنے کا کیسا نادر موقع ہاتھ آیا۔

عہد سالار جنگ کا حیدرآباد

اِس زمانہ میں اعلیٰ حضرت نظام آصف جاہ سادس نوعمر تھے، حکومت کے اختیارات کونسل آف ریجنسی کو حاصل تھے، سر سالار جنگ ریجنٹ تھے، اہم معاملات میں گورنمنٹ آف انڈیا سے استصواب کیا جاتا تھا جس کو انتظام مملکت پر نگرانی کا اعلیٰ منصب حاصل تھا۔

سر سالار جنگ کا زمانہ حیدرآباد میں تاریخی شہرت رکھتا ہے۔ اِس خاندان کے متعدد افراد عہدہ وزارت اور مناصب جلیلہ پر مامور ہو چکے تھے سر سالار جنگ اپنے چچا نواب سراج الملک کی وفات کے بعد ۱۸۵۳ء میں نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع کے عہد حکومت میں عہدۂ مدار المہامی پر سرفراز ہوئے اور نواب افضل الدولہ آصف جاہ خامس کے زمانہ میں بھی اس منصب پر مامور رہے اور نہایت احتیاط و ہوشمندی کے ساتھ انتظام مملکت اور ترویج اصلاحات میں کوشش کرتے رہے۔

۱۸۵۷ء کے نازک زمانہ میں چند ماہ تک ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ نواب افضل الدولہ اور اُن کے وزیر اعظم سر سالار جنگ کی چشم و ابرو کے ایک اشارہ پر منحصر تھا لیکن اس نکتہ شناس اور عاقبت اندیش مدبر نے نہایت وفاداری اور استقلال کے ساتھ انگریزوں کا ساتھ دیا، اور جب کہ فوجی افسروں اور رزیڈنٹ کو یہ خطرہ تھا کہ

"اگر نظام باغیوں کے ساتھ مل گیا تو سب کچھ جاتا رہا"

تو نظام نے جاتے رہنے کے بجائے اپنی دوستانہ امداد اور استقامت سے سب کچھ انگریزوں کو دلا دیا، لیکن با ایں ہمہ سر سالار جنگ اپنے خود مختارانہ انداز اور صوبہ برار حاصل کرنے کی پیہم خواہش و ارادہ کی وجہ سے رزیڈنٹ یا گورنمنٹ ہند کے دل میں جگہ نہ حاصل کر سکے بلکہ بقول لارڈ لٹن

"گورنمنٹ کے لئے خطرہ بنے رہے"

چونکہ استرداد برار گورنمنٹ ہند کے اغراض کے خلاف تھا، اور دلائل کی قوت یا استحقاق سے بحث نہ تھی، اس لئے مختلف مواقع پر ہوشیاری کے ساتھ سر سالار جنگ کے اقتدار کو کمزور کیا گیا، اور اُن کو کامل اختیارات حاصل نہ ہو سکے۔ اگرچہ وہ ریجنٹ تھے، لیکن اُن کو پورے اختیارات نہ تھے، شمس الامراء نواب رفیع الدین خاں امیر کبیر ثانی اُن کے شریک کار رہتے، جن کے مشورہ سے سلطنت کا کام انجام پاتا تھا۔

بد قسمتی سے سر سالار جنگ اور امیر کبیر کے تعلقات شگفتہ نہ تھے، دونوں کے نصب العین اور اغراض میں بھی اختلاف تھا، اس لیئے سر سالار جنگ کو اپنے شریک کار کی تائید و رضامندی اور رزیڈنٹ کی موافقت و منظوری حاصل کرنے میں سخت دشواریاں پیش آتی تھیں مزید براں یہ کہ ملک اصلاحات کے لیے تیار نہ تھا، جن لوگوں کو اصلاحات سے نقصان پہنچنے اور ناجائز وسائل معاش کے بند ہونے کا احتمال تھا وہ انتظام میں مشکلات پیدا کرتے تھے، لیکن باوجود ان مشکلات کے سر سالار جنگ اپنی استقامت اور حسن تدبیر سے اکثر مشکلات پر غالب آئے، اور ملکی فلاح کی خاطر نہایت وفاداری اور استقلال سے اپنے مجوزہ پروگرام پر عمل کرتے رہے اور ایک حد تک کامیاب ہوئے۔

سر سالار جنگ کو سب سے زیادہ ایسے قابل اشخاص کی ضرورت تھی جو انگریزی حکومت میں انتظام کا تجربہ اور ہر صیغہ سے اعلیٰ واقفیت حاصل کر چکے ہوں اور مقامی اثرات اور حالات سے آزاد ہوں تاکہ اُن کے ارادہ اور تجویز کے مطابق آزادانہ طور پر کام کر سکیں بد قسمتی سے خود حیدر آباد میں اِس قسم کے اشخاص نہ تھے۔ اس لیئے خواہ مخواہ باہر سے تجربہ کار لوگوں کے بلانے کی ضرورت ہوئی۔ اور اس میں شک نہیں کہ جو لوگ مختلف خدمات پر مامور ہو کر حیدر آباد آ گئے، اُن میں سے اکثر نے اس خیال سے کہ حیدر آباد ایک اسلامی حکومت ہی، اپنی خدمت کو ایک مذہبی فرض کے طور پر انجام دیا، اور تمام ہندوستان میں دولتِ آصفیہ اور اُس کے فرماں رواکی عظمت و شوکت کی داستانیں پھیلا دیں، اگر سالار جنگ ملکی اصلاح کے کام کو اس زمانہ تک ملتوی رکھتے کہ خود ملک کے لوگ قابلیت اور تجربہ حاصل کر کے کام کرنے کے لیئے تیار ہو جائیں تو ملک کو نقصان پہنچتا اور سر سالار جنگ کو ناکامی ہوتی۔ اس لیئے اُنھوں نے نہایت فراخ حوصلگی سے اپنے گرد قابل لوگوں کو جمع کیا اور اُن کی قابلیت اور تجربہ سے فائدہ اُٹھایا اور یہی اُنکی کامیابی اور شہرت کا راز ہی۔

مولوی مشتاق حسین جب حیدر آباد پہنچے اُس وقت انتظام حکومت کی جو صورت تھی

اس کو خود اُنھوں نے اپنے ایک خط میں اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے اس زمانہ کے واقعات کسی قدر روشنی میں آتے ہیں اور طرزِ حکومت کے متعلق بھی اجمالاً اندازہ ہو سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:-

"جس روز آپ کا نوازش نامہ پٹن کے مقام پر پہنچا، اُسی روز مولوی سید مہدی علی صاحب وہاں آگئے اور جو کام چند روز کے لیے میرے سپرد ہوا تھا وہ میں نے اُن کو سپرد کر دیا اور اب میں خاص اورنگ آباد چلا آیا ہوں جہاں جناب صدر المہام عدالت کے ایما سے اس قسمت کے اضلاع میں دیوانی و فوجداری عدالتوں اور جیل خانوں کا کام محکول دیکھ کر ایک رپورٹ کرنا ہے۔ پس میں اپنے اس جدید کام میں مصروف ہوں اور کل ہی یہاں آیا ہوں لیکن اس کام کو بالفعل شروع کرتا ہوں اور کچھ مختصر سی کارروائی کے بعد ارادہ ہے کہ ہفتہ عشرہ میں رخصت پر روانہ ہوں، اس موقع پر انشاءاللہ حصول ملازمت کے لیے حتی الامکان کوشش کرونگا۔

اوپر میں نے صدر المہام عدالت کا ایک عہدہ بیان کیا ہے اس لیے یہ تبلا دینا ضرور ہے کہ جناب نواب مختار الملک سرسالار جنگ بہادر کل ریاست کے منتظم اعلےٰ ہیں، جن کا لقب ہے مدار المہام، اُن کے ماتحت چار صدر المہام ہیں ایک صیغہ مال گزاری، دوم صیغہ عدالت، (جس میں دیوانی فوجداری دونوں شامل ہیں اور جیل خانہ جات) سوم کوتوالی (یعنی پولیس) چہارم متفرقات (اس میں تعلیم اور تعمیرات، اور طبابت، اور صفائی وغیرہ مراتب شامل ہیں) پھر ہر ایک صدر المہام کے متعلق کافی تعداد کے اور افسر ہیں؛ اور اسی طرح درجہ بدرجہ سب قسم کے عہدہ دار موجود ہیں۔ مثلاً صدر المہام مال گزاری کے ماتحت جو انتظام ہے وہ حسب ذیل ہے۔

کل ریاست چھ قسمتوں پر منحصر ہے اور ہر ایک قسمت میں کم سے کم تین ضلع ہیں ہر ایک قسمت میں ایک صدر تعلقہ دار گویا کمشنر اور ہر ایک ضلع میں ایک تعلقہ دار اول ہے یعنی

کلکٹر، اور اس کے ماتحت ایک دوم تعلقہ دار (گویا اسسٹنٹ) ہی۔ سوم تعلقہ دار مہتمم خزانہ بھی ہوتا ہی۔ پھر ان ضلع کے ہر سہ حاکموں کے ماتحت ایک ایک دو دو بلکہ تین تین تحصیلیں سپرد ہیں جن میں تحصیلدار اور پیشکار وغیرہ ضروری عملہ شامل ہی۔

بعض اور محکمہ جات ہیں جو کسی صدر المہام کے ماتحت نہیں ہیں بلکہ صرف مدار المہام سے علاقہ رکھتے ہیں ان میں سے ایک محکمہ تنقیح ہی اس کا کام ہی تمام حسابوں کا جانچنا گو کسی صیغہ کے ہوں اور جب تک وہ کسی خرچ کو اور اس کے حساب کو درستی سے جانچ کر اور رسیدوں سے مقابلہ کر کر منظور نہیں کر لیتا، تب تک وہ خرچ پکا خرچ نہیں کہا جاتا، اور محکمہ خرچ کنندہ اس کا ذمہ دار رہتا ہی۔ یہ محکمہ اس بات کو بھی دیکھتا ہی کہ جس محکمہ نے جو خرچ کیا اُس کو ایسا اختیار بھی تھا یا نہیں؟۔

خلاصہ یہ ہی کہ ہر ایک صیغہ نہایت عمدہ ترتیب کے ساتھ قایم کیا گیا ہی اور اس سے جناب مدار المہام کی لیاقت کا اندازہ نہایت آسانی سے ہو سکتا ہی، کیونکہ یہ انھیں کا کام تھا۔ مگر جس قدر کمی اس انتظام میں ہی، وہ عمدہ آدمیوں کی کمی ہی۔ جس کا تدارک مدار المہام دفعتہً نہیں کر سکتے، اور جو ایک ایسی بات ہی کہ ہر جگہ کم و بیش اُس کی شکایت رہتی ہی، تاہم ہمارے جناب مدار المہام اس خرابی کو بھی حتی الامکان دور کرتے جاتے ہیں؛ اور اس وقت جس قدر عمدہ اور اعلے تنخواہیں اس ریاست کے عہدہ داروں کی ہیں ایسی کسی اور ہندوستانی ریاست میں نہیں ہیں لیکن جناب مدار المہام اس کو بھی کافی نہیں سمجھتے اور بتدریج اس میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تاکہ لائق لائق آدمیوں کو جمع کر سکیں اور اب سب سے زیادہ اُن کو اس بات کا خیال ہی کہ خود اپنی ہی ریاست میں سے عمدہ آدمی پیدا کریں اور اس لیے تھوڑے عرصہ میں یہاں کے سررشتہ تعلیم میں شاید ایک بڑی تبدیلی ہونے والی ہی۔

مولوی مہدی علی صاحب کو ایک ہزار تنخواہ ملتی ہی، اور ابھی کوئی مستقل خدمت

اُن کو بھی سپرد نہیں ہوئی اُن کا کام بالفعل تمام اضلاع میں صیغہ مال کا دیکھنا ہی، لیکن چند روز
بعد اُن کو ایک بہت عمدہ خدمت ملنے والی ہی میں سب طرح خوش ہوں اور خدا کا شکر کرتا
ہوں، کوئی کام بھی مجکو سپرد ہو میں اس میں راضی ہوں"

یہ اس زمانہ کی انتظامی حالت کا مختصر خاکہ ہی جب کہ مولوی مہدی علی خاں اور مولوی مشتاق حسین کا ابتدائی دور تھا، زمانہ ماقبل کے لحاظ سے یہ عہد ایک حد تک غنیمت تھا لیکن ابھی بہت کچھ کرنے کے لیے باقی تھا، ریاست میں اگرچہ مختلف محکمے اور صیغے قایم ہو چکے تھے لیکن کسی محکمہ کی حالت قابل اطمینان نہ تھی ہر صیغہ کا طریق عمل اسقدر پیچیدہ اور ناقص تھا کہ روزمرہ انتظامی دشواریاں پیش آتی تھیں اِمرا کا اقتدار اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اُن کے برخلاف انصاف کا حاصل کرنا ناممکن تھا، اضلاع میں انتظامی حالت اور بھی زیادہ ابتر تھی، عدالتیں خارجی اثرات سے آزاد نہ تھیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ملک کی مالی حالت نازک تھی، ریاست پر قرضہ کا بار تھا، تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہ تھا، آبپاشی کے ذرایع محدود تھے، ملک کی صنعت وحرفت مردہ ہو چکی تھی، رشوت خواری اور سازش کا بازار گرم تھا اور ملک ایسے اشخاص سے خالی تھا جو کسی قسم کی انتظامی صلاحیت اور قابلیت رکھتے ہوں۔

نواب مختار الملک سر سالار جنگ نے اپنی وفات سے چند ماہ پہلے جو غیر معمولی اعلان آخر سنہ ۱۲۹۹ھ میں شائع کر کے اصلاحات کی جدید اسکیم پیش کی اُس سے بھی معلوم ہوتا ہی کہ سر سالار جنگ کے ابتدائی زمانہ میں ملک کی انتظامی حالت کسقدر قابل اصلاح تھی اور باوجود اُن کی سی سالہ جد وجہد کے اصلاح کی مزید ضرورت وگنجائش اُن کے آخر عہد میں بھی موجود تھی۔ سر سالار جنگ فرماتے ہیں:

"ازانجا کہ سرکار عالی راہمیشہ خواہش آں بودہ است کہ در صلاح وفلاح رعایا انتظام
محکمہ جات وعدالت ہا کہ ازاں سود وبہبود رعایا، وآبادی وسرسبزی مملکت وترقی
مکاسب وتجارت متصور است ترقی روز افزوں کردہ آید نظر برآں تاحال بواد یدلات

مملکت وقتاً فوقتاً در ہر شعبہ و ہر محکمہ ترقیات نمایاں و انتظامات ضروری بعمل آمد کہ اگر حالات چند سالہائے گزشتہ را با انتظام موجودہ (حالانکہ آں ہم بلحاظ حالات ایں ماں قابل اصلاح و ترقی بنظر می آید) مقابلہ کردہ شود تواں دریافت کہ درہمیں چند سالہائے گزشتہ آں قدر اصلاح و ترقی بعمل آمدہ است کہ گزشتہ را با موجودہ، ہیچ نسبتے نتواں داد۔"

سر سالار جنگ نے جن "چند سالہائے گزشتہ" کی ترقی کے متعلق اپنے اعلان میں اشارہ کیا ہے۔ یہ درحقیقت وہ زمانہ ہے جب کہ قابل اور تجربہ کار ہندوستانی سر سالار جنگ کے ظلِّ عاطفت میں ملک کی اصلاح میں جوش و سرگرمی سے مصروف تھے، لیکن جیسا کہ مولوی مشتاق حسین نے اپنے مندرجۂ بالا خط میں لکھا ہے اسی زمانہ میں سر سالار جنگ کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اپنے ملک میں لائق آدمی سرکاری خدمات کے لیئے پیدا کیئے جائیں چنانچہ خود سر سالار جنگ لکھتے ہیں:۔

"امرے کہ سرکار عالی از ہمہ اہم تر متصور ست و بارہا غور و لحاظ درآں رفتہ تعلیم و تربیت اہل ایں ملک زادلاد معززین ایں ریاست بودہ است، سرکار عالی را ہمیشہ بدل منظور ست کہ رعایا و باشندگان ایں ملک عموماً و معززین ایں ریاست خصوصاً آں چناں تعلیم و تربیت یابند کہ بر عہدہ ہائے سرکاری مقرر تواند شد۔"

غرض سر سالار جنگ کے عہد مدار المہامی کا آخری عشرہ اور اصلاحات و بیداری کا زمانہ تھا جب کہ مولوی مشتاق حسین حیدرآباد پہنچے، اور ان کا تعلق صیغہ عدالت سے ہوا۔ آیندہ مطالب کے سمجھنے اور اس زمانہ کے حالات کا صحیح اندازہ کرنے کے لیئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بالاختصار ریاست حیدرآباد کے انتظام عدالت پر ایک تاریخی تبصرہ کر دیا جائے۔

ریاست حیدرآباد کا انتظامِ عدالت

سنہ ۱۲۳۷ھ سے پہلے حیدرآباد میں عدالت کا انتظام ناقص اور ابتر تھا بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ درحقیقت کوئی انتظام نہ تھا اور جو ناقص انتظام تھا بھی وہ صرف بلدہ (دارالریاست) میں تھا، اضلاع میں کوئی محکمہ عدالت کے نام سے نہ تھا۔ نہ انصاف حاصل کرنے کا کوئی معقول ذریعہ تھا۔

بلدہ میں اکثر اشخاص بلا لحاظ اس امر کے کہ اُن کا معاملہ کس صیغہ سے تعلّق رکھتا ہے اپنے مقدمات خاص مدار المہام کے یہاں پیش کرتے تھے لیکن مقدمات کے تصفیہ کے لئے کوئی واجب العمل دستور یا ضابطہ نہ تھا، مدار المہام اپنے طور پر مناسب فیصلہ کر دیتے تھے، بڑے بڑے اضلاع میں اکثر اوقات قاضی مقدمات کا تصفیہ کرتے تھے، معمولی اضلاع اور قصبات میں پنچایت یا پٹیل اور پٹواری کے ذریعہ سے مقدمات کا فیصلہ ہوتا تھا۔

تاجر اور بیوپاری اپنا مال دو چند و سہ چند قیمت پر بطور قرض فروخت کر کے سودی دستاویز لکھوا لیتے، یہ لوگ اپنی حفاظت کے لیے عربوں اور روہیلوں کو ملازم رکھتے اور اُنہی ملازموں کے ذریعہ سے نہایت سخت گیری اور تنگ طلبی سے اپنا قرضہ وصول کرتے تھے، یہاں تک کہ بر وقت ضرورت اپنے قرضداروں کو طرح طرح کی جسمانی تکلیفیں پہنچاتے تھے، بلکہ اُن کا اقتدار یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ بہ اختیار خود قرضداروں کا سامان خانہ داری اور ہتیار وغیرہ ضبط کر لیتے تھے، اور اس پر مزید ظلم یہ کہ ان ملازموں کی تنخواہیں بھی اپنے قرضداروں سے وصول کرتے تھے جن کو وہ تقاضا کرنے یا اپنی ذات کی حفاظت کے لئے ملازم رکھتے تھے۔

عرب بھی لوگوں کو سنگین شرح سود پر قرض دیا کرتے تھے، اُن کے مظالم اور بھی حیرت انگیز تھے، وہ اپنے قرضداروں کو اذیت پہنچانے میں نہایت دلیر تھے، یہاں تک کہ قرضداروں کے جسم کو جابجا داغ دینے میں بھی اُن کو تامل نہ ہوتا تھا، اُن کی دغابازی کی انتہا یہ تھی کہ بعض اوقات کسی دیسمکھ یا زمیندار سے ناراض ہو کر اس کو بے آب و دانہ کسی حجرہ میں بند کر دیتے، اور بغیر

کسی داد وستد کے اس سے قرضہ کی فرضی دستاویز تحریر کرا لیتے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قانون اور عدالت کی اُس وقت کیا حالت تھی۔

حسنِ انتظام کی یہ کیفیت تھی کہ قتل و غارت گری کے مقدمات میں جو مجرم یا مشتبہ اشخاص گرفتار ہوتے تھے، وہ سالہا سال تک حوالات میں پڑے رہتے تھے اور کوئی اُن کا پُرسانِ حال نہ ہوتا تھا اور جو لوگ سزایاب ہوتے تھے وہ مدّتِ معیّنہ پر رہائی نہیں پاتے تھے، دفتری انتظام کی یہ حالت تھی کہ مقدمہ کے متعلق اہم اور ضروری کاغذات بھی دفتر میں موجود نہیں رہتے تھے، اصل فیصلہ اکثر اوقات اہلِ مقدمہ کے حوالہ کر دیا جاتا یا زبانی فیصلہ سنا دیا جاتا تھا، اس لیے یہ معلوم کرنا قریبًا ناممکن تھا کہ کس عدالت میں کسقدر مقدمات ایک سال کے اندر پیش ہوئے۔

ہم نے ان حالات کو حتی الامکان اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ تاہم اس سے ایک حد تک حیدرآباد کی حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

عدالت دیوانی ۱۲۳۷ھ سنہ ۱۲۳۷ھ سے انتظامِ عدالت میں آہستہ آہستہ تبدیلیاں شروع ہوئیں، یعنی اس سنہ میں دولتِ آصفیہ کے مشہور مدار المہام مہاراجہ چندو لال نے بلدہ کی پرانی عدالتوں کے علاوہ ایک جدید عدالت بنام "عدالت دیوانی" قائم کی، اسی عدالت کا نام بعد کو "عدالتِ بزرگ" بھی مشہور رہا، یہ عدالت خود مہاراجہ کی ڈیوڑھی میں تھی اور اس کا طریقِ عمل یہ تھا کہ جو لوگ کوئی استغاثہ مہاراجہ کے پاس لے جاتے متعدد داروغہ جو وہاں متعین تھے اُن کے عرایض لے لیتے اور کیفیتِ معاملہ مہاراجہ سے عرض کرتے اور جو کچھ ایما مہاراجہ کا ہوتا اس کے مطابق حکم دیتے، تمام مقدمات دیوانی اور فوجداری اور دار القضا کے بغیر کسی ضابطہ اور امتیاز کے اس محکمہ میں فیصل ہوتے تھے۔

عدالت فوجداری ۱۲۵۴ھ مہاراجہ چندو لال کی پیشکاری کے زمانہ میں ایک اور عدالت (بلدہ میں) بنام عدالت فوجداری، ۲۷ رمضان سنہ ۱۲۵۴ھ کو قایم ہوئی جس کا نام بعد کو "عدالت العالیہ فوجداری"، اور "فوجداری عالیہ بلدہ" بھی مشہور ہوا اس عدالت کے حاکم کو ناظم کہتے تھے، اسی

زمانہ میں سب سے پہلے عدالت کا ایک دستور العمل بھی بنایا گیا جو اس زمانہ کے لحاظ سے موزوں تھا۔ اس زمانہ تک حکام عدالت کو کسی قسم کا اختیار یا اقتدار نہ تھا، نہ وہ کسی مقدمہ کا فیصلہ مدار المہام کی مرضی کے خلاف کر سکتے تھے بلکہ ہر معاملہ میں مدار المہام کی طرف رجوع کرتے تھے۔

عہد نواب سراج الملک اور انتظام عدالت سنہ ۱۲۶۲ھ

ذیقعدہ سنہ ۱۲۶۲ھ میں نواب سراج الملک بہادر عہدہ مدار المہامی پر فائز ہوئے، اُنھوں نے صیغہ عدالت کی طرف زیادہ توجہ کی۔ یعنی

(۱) بلدہ (دار الحکومت) کی عدالتوں کے اختیارات میں اضافہ کیا۔

(۲) عدالتوں کو ممانعت کردی کہ ایک روپیہ سینکڑہ سے زیادہ سود نہ دلائیں۔

(۳) قطع ید کو موقوف کرکے اس کے بجائے سزائے قید جاری کی۔

سنہ ۱۲۶۳ھ میں اُنھوں نے اضلاع کے انتظام عدالت کی اصلاح پر توجہ کی یعنی اضلاع میں جن کو اس وقت "تعلقہ" کہتے تھے "منصف" اور "میر عدل" مقرر کیے جو حتی الامکان اضلاع کے لائق قاضیوں کی جماعت میں سے منتخب کیے گئے تھے، اس وقت تعلقات (اضلاع) کے انتظام کی یہ صورت تھی کہ مقتدر اشخاص تعلقات (اضلاع) کا ٹھیکہ لے لیتے تھے، اور تعلقہ دار کے نام سے موسوم ہوتے تھے، دستور یہ تھا کہ زرِ مشخصہ میں سے حسب قرارداد ایک رقم خرچ ملازمین کے نام سے وضع کر لیتے تھے، زیادہ تر فی روپیہ ۲ر اس غرض سے وضع کیا جاتا اور ۱۴ر داخلِ سرکار ہوتے البتہ فوجی ملازمین کی تنخواہ جو اضلاع میں متعین ہوتے تھے، سرکاری رقم ۱۴ر میں سے وضع ہوتی تھی۔ اسی طرح ہر ضلع کے "منصف" اور "میر عدل" کی تنخواہ اسی ۱۴ر میں سے وضع ہو کر بنام اخراجات سرکاری لکھی جاتی تھی، جس کے یہ معنے تھے کہ یہ عہدہ دار سرکاری حیثیت رکھتے ہیں، تعلقہ داروں کے ملازم نہیں۔

اِن عہدہ داروں کو دیوانی اور فوجداری کے غیر محدود اختیارات حاصل تھے، اور کوئی قاعدہ ان کے فیصل کردہ مقدمات کی اپیل کا نہ تھا منصف اور میر عدل کے عہدے مساوی حیثیت رکھتے تھے، اُن کے مابین افسری یا ماتحتی کا تعلق نہ تھا، نہ دونوں کے اختیارات میں کوئی فرق

تھا، جو لوگ چھوٹے اضلاع میں مقرر ہوتے تھے اُن کو منصف، اور جن کا تقرر بڑے اضلاع میں ہوتا تھا اُن کو میر عدل کہتے تھے، اِن تمام حکام کا اقتدار پورے ضلع پر ہوتا تھا، ۱۹ اضلاع میں منصف مقرر تھے اور ۴ اضلاع میں میر عدل۔

تصحیح تعلقات | چند روز بعد یہ قرار پایا کہ منصف اور میر عدل اپنے تمام فیصلوں کو عام اس سے کہ دیوانی ہوں یا فوجداری، بغرض "تصحیح" عدالت فوجداری بلدہ میں بھیجا کریں چنانچہ تمام فیصلے بذریعہ عرائض، "دار الانشاء" میں جاتے تھے، وہاں سے عدالت فوجداری میں بھیجے جاتے تھے، اور بعد "تصحیح" تعلقہ داروں کے پاس واپس کیئے جاتے تھے جو ان کی تعمیل کرتے تھے۔

عدالت دیوان خانہ یا عدالت خورد ۱۲۶۷ھ | اس زمانہ میں عموماً عدالت میں جانا معیوب سمجھا جاتا تھا، ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ اپنا معاملہ براہِ راست مدار المہام کے سامنے پیش کرے اس بنا پر نواب تاج الملک نے ایک سررشتہ عرائض لینے کے لیئے اپنے مکان پر قایم کیا (تاکہ لوگوں کو اس خیال سے اس پر زیادہ اعتماد ہو کہ تمام مقدمات کا فیصلہ خود مدار المہام کرتے ہیں) اور اس پر ایک عہدہ دار کو بلقب ناظم مامور کیا، دیوانی اور فوجداری کے متعلق ہزاروں عرضیاں یہاں پیش ہونے لگیں، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس سررشتہ عرائض نے ایک مستقل محکمہ عدالت کی صورت اختیار کر لی اور اکثر مقدمات جو دیوانی فوجداری یا دار القضا وغیرہ کے متعلق ہوتے تھے، اِسی محکمہ میں پیش ہونے لگے۔

اِس عدالت کا "ناظم" بااختیار نہ تھا، مقدمات کا فیصلہ یا تو خود مدار المہام کرتے تھے، یا جن محکموں سے اُن مقدمات کا تعلق ہوتا تھا وہاں بھیجدیتے تھے، لیکن چونکہ یہ محکمہ خاص مدار المہام کے محل ہی میں تھا اس لیئے اُس کا رعب و اقتدار زیادہ تھا، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس محکمہ میں قابل اعتماد فیصلہ ہوتا ہے۔ اس محکمہ کا نام بعد کو "عدالتِ دیوانی بلدہ" اور "عدالت خورد" بھی قرار پایا۔ ۱۲۷۰ھ میں نواب مختار الملک سر سالار جنگ نے اس عدالت کو عمارت چینی خانہ میں منتقل کر دیا۔ اس زمانہ سے عوام میں اس کا نام "عدالت چینی خانہ" مشہور ہو گیا

۱۲۷۹ھ سنہ میں اس عدالت کو ایک ہزار کی مالیت تک کے دیوانی مقدمات کا اختیار دیا گیا۔

نواب مختار الملک سر سالار جنگ اور اصلاحِ عدالت سنہ ۱۲۶۹ھ

سر سالار جنگ کی مدار المہامی کا آغاز شعبان سنہ ۱۲۶۹ھ سے ہوتا ہی، اس زمانہ تک ملک میں بدنظمی اور ابتری موجود تھی رسوخ یافتہ لوگوں نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا نہ عدالتوں کا کوئی احترام تھا نہ اُن کے فیصلوں کی کوئی وقعت تھی

نواب سر سالار جنگ نے ابتداہی سے اس حالت کو محسوس کیا، اور خاص حیدرآباد میں ایک با اقتدار عدالت بنام "عدالت بادشاہی" قایم کی عدالت کا ایک افسر اعلیٰ ناظم اور چار عہدہ دار بطور نائب ناظم مقرر کیے اور بلحاظ ضرورت وحالات اس عدالت کو کافی اختیارات دیوانی اور فوجداری کے عطا کیے گئے، البتہ قتل اور حبس دوام کے احکام مدار المہام نافذ کرتے تھے، اس محکمہ کے نائب ناظم جو تجویز کسی مقدمہ کے متعلق کرتے پہلے اس کا مسوّدہ ناظم عدالت کی سامنے پیش کرتے، اور آخری فیصلہ ناظم کے حکم سے عمل میں آتا۔

سنہ ۱۲۷۲ف میں نواب سر سالار جنگ نے صیغہ عدالت کی مزید نگرانی کی غرض سے ایک عہدہ معتمد عدالت کا اضافہ کیا، اس کے بعد سنہ ۱۲۷۹ف م سنہ ۱۸۶۹ء میں صیغہ عدالت پر مزید توجّہ کی، اور اُمرائے پائیگاہ میں سے نواب بشیر الدولہ بہادر کو صیغہ عدالت کا صدر المہام مقرر کیا گیا، اور اُن کے ماتحت ایک عہدہ معتمد صدر المہام عدالت کے نام سے تجویز کیا گیا۔

یہ عجیب بات ہی کہ باوجود اصلاحات چند در چند اس زمانہ تک بھی عدالت کے احکام کی زیادہ وقعت نہ تھی، نہ لوگ ان احکام کی تعمیل ضروری سمجھتے تھے اس لیئے سر سالار جنگ نے عدالت اور سرکاری محکمہ جات کا اقتدار بڑہانے کے لیئے امرائے حیدرآباد کو مختلف ذمّہ داریوں کے کام پر مامور کیا جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں:۔

"ازیں انتظام و تقرر محکمہ جات جدید کہ محتاج نگرانی بودند کثرت کار در دفتر مدار المہام سرکار عالی افزودہ بود۔ لہٰذا مناسب نمود کہ چند اُمرا از امرائے ذی وقعت و اعتبار ایں ریاست کہ عظم شان و رعب و داب شان در قلوب رعایائے ایں ملک جا داشتہ باشد

دہرکہ دمہ برضاے قلبی در قبول تجاویز احکام شامل باشند بجہت نگرانی کارروائی محکمہ جات وتجویز وانفصال امور انتظامی کہ ازاں محکمہ جات تعلق داشتہ باشند مقرر شوند، بہ اُمید ایں کہ نگرانی جملہ امور باحسن وجوہ انجام یابد۔ چنانچہ در سنہ ۱۲۸۶ھ چہار صدر المہامان مع معتمد مال و دیگر عملہ ضروری مقرر شدند۔"

صدر عدالت اضلاع مستردہ اور مجلس مرافعہ

شورا پور کی ریاست جو بجرم بغاوت سنہ ۱۲۷۴ھ میں ضبط ہو کر گورنمنٹ انگریزی کے علاقہ میں شامل ہو گئی تھی سنہ ۱۲۷۷ھ میں نظام کو واپس کی گئی اس کے علاوہ سنہ ۱۲۷۸ھ میں چند اضلاع رائچور و نلدرگ وغیرہ مملوکہ نظام جو گورنمنٹ انگریزی کے قبضہ میں تھے دوبارہ علاقہ نظام میں شامل ہوئے، اس وقت ایک علیحدہ محکمہ "صدر عدالت اضلاع مستردہ" کے نام سے قایم کیا گیا، سنہ ۱۲۸۰ھ میں تصحیح تعلقات کا کام بھی اس محکمہ کے متعلق کیا گیا اور اس کا نام "صدر عدالت مستردہ و تصحیح تعلقات" قرار پایا۔ بعد ازاں نام کی چند تبدیلیوں کے بعد سنہ ۱۲۸۲ھ میں اس کا نام "محکمہ مرافعہ اضلاع" رکھا گیا، اس کے علاوہ "مجلس مرافعہ" کے نام سے ایک مجلس قائم ہوئی اور محکمہ مرافعہ بھی اس میں شامل ہو گیا، مجلس مرافعہ کا ایک میر مجلس اور چار رکن ہوتے تھے، لیکن یہ مجلس بھی صدر المہام کے ماتحت تھی، اس میں ہر قسم کے مقدمات پیش ہوتے تھے اور وہ ان کا فیصلہ کرتی تھی لیکن درحقیقت وہ مکمل طور پر آزاد نہ تھی، جب کسی مقدمہ کا فیصلہ صدر المہام یا مدار المہام کو ناپسند آتا تو مجلس کو نظر ثانی کا حکم دیتے۔ اگر اس پر بھی مجلس اپنا فیصلہ نہ بدلتی تو مکرر غور کا حکم دیتے اور جب تک فیصلہ تبدیل نہ ہو جاتا برابر نظر ثانی کے لیئے احکام آتے رہتے، آخر میں اس مجلس کا نام "مجلس عالیہ عدالت" قرار پایا اور رفتہ رفتہ اختیارات میں اضافہ ہوا۔

یہ حیدرآباد کے اصلاح یافتہ انتظام عدالت کا مختصر خاکہ ہے، لیکن باوجود اس کے اصلاح کی مزید حاجت تھی کیونکہ ناتجربہ کار حکام صحیح طرز عمل سے ناواقف تھے، ہر محکمہ خصوصاً صیغہ عدالت میں ایک عام عیب یہ تھا کہ ناموزوں طریق عمل کی وجہ سے ہر معاملہ میں غیر ضروری طوالت اور ناگوار تاخیر ہوتی تھی اور بلا ضرورت عدالت اور اہل مقدمہ کا وقت ضائع جاتا تھا، عدالت کے

اہلِ کار اس سے بالکل ناواقف تھے کہ عدالت کی کارروائی کو کیونکر انجام دینا چاہیئے، اس لئے اکثر اوقات عدالت کا طرز عمل نہایت مضحکہ انگیز ہوجاتا تھا لیکن ان جزئیات کا اس موقع پر بیان کرنا دشوار ہے البتہ ایک دلچسپ تحریر شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی کی (جو اُس زمانہ میں ناظم بند وبست تھے) درج کی جاتی ہے جس سے کسی قدر اس زمانہ کے طرز عمل کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

"در ضمن تنقیح دفاتر بسیارے را از اظہار دیدم و شنیدم ہر اظہار بطوالت مثلے ست کہ ملامت افزاید و خاطر پریشان کند پس لازم آمد طریقہ تحریر اظہار را کہ دریں ممالک جاری ست اظہار کردن اصل آنست کہ اظہار حکایت واقعہ یا واقعات بیش نیست پس باید کہ ہمچو محکی عنہ ترتیب و تسلسل داشتہ باشد و از حشو و زوائد خالی بود، و دریں ممالک چوں برائے قلمبندی اظہار نشینند ہر واقعہ را اجزائے بسیار قرار دادہ فرداً فرداً از ہر جزو پرسش آغاز کنند و برائے ہر جزو سوالے و جوابے جداگانہ ترتیب دہند کہ دریں صورت تکرار مضمون و تطویل تحریر ناگزیر می باشد و نہ بر ہمیں قناعت کنند بلکہ بر ایراد اعتراضات و الزام مظہر بستہ ورقہا سیاہ نمایند، دگیرندہ و نویسندہ اظہار چنداں کہ معاملہ شناس ست ایں گونہ اعتراضات کثیر تر، پس ہر اظہار رسالہ مناظرہ است کہ در میان حاکم و مظہر بوقوع آمدہ ساعتے چند پیشتر ازیں بمقدمہ تغلب اظہار ہا دیدم و بسیار خندیدم، اولاً از شخص ملزم پرسیدند کہ تو ازیں خیانت کہ ایں قدر رہست و حسب بیان فلانے فلانے بتواریخ مختلفہ (عبارت سوال متضمن تفصیل و تصریح می باشد) خیانت کردند چہ قدر گرفتی وچہ کردی وچرا ایں گونہ جرأت بکار بردی، ملزم گوید کہ من آگاہ نیستم و ہیچ نیافتم، بار بار می پرسیدند کہ تو شریک بودی و مبلغہا در ربودی پس چگونہ انکار داری او باز می گوید کہ فلاں فلاں کہ بریں گواہی دادند دروغ می گویند، باز پرسند کہ اتفاق چندیں کس بر دروغ چہ گونہ باور داریم، الغرض معلوم می شود کہ ساعتے

چنداں گونہ مناظرہ لاطائل میاں حاکم وملزم بود تاآں کہ باز رنگے دیگر برائے
سوالات پیدا آورد ند کہ اگر دستخط تو برفلاں کاغذ یافتہ شود پس سزائے توچیست
او جواب داد کہ ہرچہ مقتضائے انصاف باشد، باز پرسند کہ تو چندیں کساں را
بدروغ نسبت دہی د معقول و شرمندہ نہ شوی بر انصاف تک کس چگونہ اعتماد
توانی کرد۔

ایں کہ گفتم نہ از مبالغہ می باشد بہ ہر اظہار کہ کیف ما اتفق پرد ازند بر ہمیں منوال
پابند حیرت ہا دارم کہ ازیں انبار لامعنی حرف مطلب چگونہ استنباط کنند و چہ طور
بر ضبط آں قدرت یابند، نتیجہ ایں تطویل لاحاصل جز ایں نیست کہ وقت مشغول، کاغذ
ضائع، ذہن منتشر، اصل مطلب فوت، ایں طریق نہ مخصوص بعدالت ست، بل فی سائر
محکمات ہمیں طرز واحد شائع می باید کہ بہ اجرائے گشتی ہدایت فرمایند کہ اظہار ہر
کس بطور بیان مسلسل و حکایت واقعہ نوشتہ باشند و بسوالات جرح والزام
نہ پردازند و ہموارہ نظر بر ایجاز غیر مخل دارند، البتہ اگر ضرورت بینند سوالے ضرورے
کردن ممنوع نیست، مدعا آں ست کہ طریق تطویل لاحاصل کہ در اظہار شائع شدہ است
اصلاح یابد۔"

غرض یہ حالات تھے جب مولوی مشتاق حسین حیدر آباد پہنچے، اُنھوں نے وہاں پہنچ کر
جو کچھ کیا اس کا حال آئندہ صفحات سے معلوم ہوگا۔

صیغۂ عدالت میں تقرر

ناظم عدالت ابتدا میں چند ماہ تک مولوی مشتاق حسین کسی خاص عہدہ پر نامزد نہیں کیے گئے
بلکہ مختلف اضلاع میں عدالتوں اور جیل خانوں کے معائنہ پر مامور کیے گئے اس دورہ میں اُنھوں نے
نہایت عمیق نظر سے انتظامی نقائص کا معائنہ کیا، اور محنت شاقہ سے اپنا کام انجام دیا۔ اس کے

بعد اُن کو چار سو روپیہ ماہوار پر عدالت خورد (عدالت دیوان خانہ یا چینی خانہ) کا ناظم مقرر کیا گیا، اس وقت تک ناظم عدالت کے متعلق صرف دیوانی مقدمات کا تصفیہ تھا، اس خدمت پر وہ چند ماہ تک مامور رہے۔

معتمد صدر المہام عدالت مولوی مشتاق حسین کے حیدر آباد جانے سے پہلے جو انتظامی تغیرات عمل میں آئے تھے، اسی سلسلہ میں حیدر آباد کے مشہور امیر نواب بشیر الدولہ بہادر ۱۲۸۶ھ میں صدر المہام عدالت (گویا وزیر عدالت) مقرر ہو چکے تھے، اُن کے ماتحت ایک معتمد (سکرٹری) کا عہدہ تھا جو صدر المہام کے بعد اس محکمہ کا سب سے بڑا افسر ہوتا تھا، حیدر آباد پہنچنے کے ایک سال بعد ربیع الاول ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) میں سابق معتمد مولوی سید محمد مودودی کے برخاست ہونے پر مولوی مشتاق حسین بطور قایم مقام اس عہدہ پر مقرر ہوئے، اُن کے تقرر کے بعد نہ صرف صدر المہام عدالت کے عہدہ بلکہ معتمد کے عہدہ نے بھی رفتہ رفتہ ایک خاص حیثیت و شہرت حاصل کر لی۔

خوش نصیبی سے نواب بشیر الدولہ ایک نیک نفس اور پاکیزہ سیرت امیر تھے، اور اُن کو اپنے مشیر و معتمد پر پورا اعتماد تھا، دوسری طرف مولوی مشتاق حسین ایک متدین اور پرجوش جوان تھے اور ایک اسلامی حکومت کی خدمت کو اپنا مذہبی فرض خیال کرتے تھے اس باہمی اعتماد اور اخلاص نے نہایت عمدہ نتائج پیدا کیے اور مولوی مشتاق حسین نے ایک مذہبی جوش کے ساتھ ملک کی اصلاح و فلاح کا کام شروع کیا، اور نواب بشیر الدولہ کے ذریعہ سے شعبہ عدالت میں مفید اصلاحات کا آغاز کیا۔

اصلاحات اس زمانہ میں بد انتظامی کی یہ حالت تھی کہ اکثر مجرم سالہا سال سے حوالات میں مقید تھے لیکن اُن کا مقدمہ پیش ہونے اور حکم اخیر صادر ہونے کی نوبت نہیں آتی تھی، اِس کے علاوہ اکثر مقدمات مدتِ دراز سے زیر تجویز تھے مگر اُن کا فیصلہ نہیں ہوتا تھا اِس سے عام طور پر ریاست کے انتظام کی بدنامی ہوتی تھی اور بجائے خود بھی یہ طریقہ انصاف و معدلت کے

خلاف تھا اس لیے اپنے جدید عہدہ پر آنے کے بعد بلا تاخیر انھوں نے اس طرف توجہ کی اور صدرالمہام کی طرف سے ایک عام حکم تمام ممالک محروسہ نظام کی عدالتوں میں بھیجا گیا جس میں اس طریقہ پر اظہار نارضامندی کے بعد ضروری احکام صادر کیے جن کا ماحصل حسب ذیل ہے:-

(۱) تمام حکام جن کو فوجداری کے اختیارات حاصل ہیں، اس حکم کے پہنچنے پر ایک ہفتہ کے اندر اُن تمام قیدیوں کی فہرست جن کے مقدمات زیر تجویز ہیں منسلکہ نقشہ کے مطابق صدرالمہام عدالت کے محکمہ میں روانہ کریں۔

(۲) جو ملزم حوالات میں نہیں ہیں بلکہ ضمانت پر رہا ہیں، یا سزاے قید کے علاوہ اور کسی سزا کے مستحق ہیں، اُن کے مقدمات کا لازمی طور پر دو ماہ کے اندر تصفیہ کر دیا جائے۔

(۳) جس قیدی کا مقدمہ زیر تجویز ہے لیکن بلحاظِ نوعیت جرم جتنی میعاد سزا کا وہ مستحق ہے، اس سے زیادہ زمانہ حوالات میں گزر چکا ہے، تو فوراً اس کا مقدمہ ختم کر کے اس کو رہا کر دیا جائے۔

(۴) جو قیدی بلحاظ نوعیتِ جرم زیادہ میعاد کی سزا کا مستحق ہے لیکن حوالات میں ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا ہے تو جس تاریخ سے وہ حوالات میں داخل ہوا ہے اُس تاریخ سے اُس کی قید کا زمانہ سمجھا جائے، اور باقی ایام پورے ہونے پر اُس کو فوراً رہا کر دیا جائے۔

(۵) جن قیدیوں کا مقدمہ عدالت مرافعہ میں زیر تجویز ہے، تو سزا کی میعاد تجویز کرنے پر عدالت ماتحت کے ابتدائی حکم کے زمانہ سے اُن کی میعاد قید شروع سمجھی جائے۔

(۶) اضلاع اور بلدہ کے ارباب کوتوالی جس قدر عجلت اور سرگرمی مقدمات کی ترتیب و تکمیل میں کرینگے سزاوار تحسین و آفریں ہونگے۔

(۷) پولس کا فرض ہے کہ جن قیدیوں کا مقدمہ زیر تجویز ہے بلا توقف اُن کے متعلق جملہ ضروری معلومات یعنی گواہ اور وجہ ثبوت وغیرہ فراہم کر کے اُن کو محکمہ مجاز کے سپرد کر دیں۔ درصورتِ غفلت سخت باز پرس کی جائے گی، بلکہ دوسروں کی عبرت کے لئے مناسب تجاویز عمل میں لائی جائینگی۔

(۸) ملزموں کا مدت تک مقید اور مقدمات کا زیر تجویز رہنا عہدہ داروں کی غفلت کا نتیجہ ہے امید ہے کہ آیندہ تمام عہدہ دار جن کو فوجداری اختیارات حاصل ہیں کوتوالی سے مقدمہ پہنچنے پر تحقیق و ترتیب کے بعد ایک ہفتہ کے اندر فیصل کر دیا کرینگے، لیکن اگر کسی مقدمہ میں خاص وجوہ سے التوا کی ضرورت ہو تو فوراً صدر المہام عدالت کو ان وجوہ سے مطلع کریں گے۔

(۹) جملہ حکام ضلاع و بلدہ بعد اختتام ماہ اردی بہشت ۱۲۸۶ف ایک خاص نقشہ ان مقدمات کی متعلق مرتب کر کے بھیجدیں تاکہ مقدمات فیصل شدہ اور زیر تجویز کا حال و ضاحت سے معلوم ہو جائے۔

(۱۰) جو حکام حرفاً حرفاً ان احکام کی تعمیل نہ کریں گے، اُن کے لیئے کوئی مناسب تجویز کی جائے گی۔

مندرجۂ بالا احکام نے ہزاروں قیدیوں اور ناکردہ گناہ لوگوں کو جو زمانہ دراز سے عالم کس مپرسی میں پڑے ہوئے تھے، آزاد کر دیا، اور غفلت شعار حکام کو اپنے فرائض میں مستعد بنا کر اصلاح کی مستقل بنیاد رکھ دی، اور جب چند روز بعد بعض حکام کی مستعدی اور مقدمات کو جلد فیصل کرنے کا حال صدر المہام کو معلوم ہوا تو اُنھوں نے سرکاری اخبار (جریدۂ اعلامیہ) میں علی الاعلان خوشنودی کا اظہار کیا۔

اسی زمانہ میں مولوی مشتاق حسین نے وہ یادداشت پیش کی جو اُنھوں نے ضلع اورنگ آباد کی چند عدالتوں کا معائنہ کرنے کے بعد تیار کی تھی اس میں اُن تمام نقائص کو بیان کیا ہے جو اس زمانہ میں عدالتوں کے طرزِ عمل میں موجود تھے۔ اور جن کی اصلاح نہایت ضروری تھی، اس یادداشت کا ضروری ملخص حسب ذیل ہے:-

(۱) مقدمات بر تاریخ معینہ پیش نمی شوند و فریقین را از تاریخ معینہ بدرستی اطلاع نمی شود

لهذا بسا اوقات فریقین بروقت واحد حاضر عدالت نمی شوند و بسا اوقات تاریخ خاص مقرر نمی شود۔

(۲) شهود و بینه یک فریق بغیر حاضری فریق ثانی و اطلاع دہی تاریخ معینه بفریق ثانی گرفته می شود، فریق ثانی را موقع جرح حاصل نمی شود، وقت التوائے مقدمه بدرخواست یک فریق اکثر ست که بفریق ثانی اطلاع نه داده اند۔

(۳) مقدمات را تا مدت ہائے دراز به انتظار حاضری مدعی مدعیٰ علیه یا گواه یا کدامی ثبوت ملتوی داشته اند، مگر بلا تعین تاریخ و بغیر از صدور حکم حاضری یا در پیشی ثبوت بفریق متعلقه، لهذا کارروائی مقدمات تا مدت ہائے دراز معطل مانده است۔

(۴) اظهارات گواهاں بروقت نمی شوند، گاہے قبل از تاریخ معینه و اکثر بعد از تاریخ شده اند، و بسا اوقات گواهان را تا دیر حاضر داشته اند، چنانچه در بعض مقدمات تا ہفته ہفته۔

(۵) دستور رہانیدن بهته گواهاں در بعض عدالت ہا جاری نیست۔

(۶) خلاصه اظهارات بقلم مجوزین شامل مثل نمی شود۔

(۷) بغیر از قرارداد امور تنقیح طلب ثبوت از فریقین طلب می کنند۔ ذمه داری ثبوت بدرستی عائد نمی کنند، مثلاً مدعیٰ علیه بگرفتن زر مدعیٰ بها مقبل شد و عذر کرد که رقم مذکوره ادا کرده ام، دریں حالت بار ادخال ثبوت ادائے قرضه بذمه مدعیٰ علیه بود، مگر عدالت ثبوت از مدعی طلب کرد و مقدمات را تا عرصه دراز ناحق ملتوی داشت۔

(۸) بروقت داخله عرضی دعویٰ اظهار مدعی تحریر می شود بلا حاضری مدعیٰ علیه بعد از اں اطلاع نامه بنام مدعیٰ علیه جاری میشود، ایں غیر ضروری است و باعث طوالت کار،

(۹) طریقه تحریر اظهارات علی العموم بطور سوال و جواب فضول ست و لائق موقوفی، البته بجالت خاص تحریر سوال مضائقه ندارد، و ہم چنیں اگر مدعی یا مدعیٰ علیه سوال کند ایں قدر نوشتن کافی ست که بجواب مدعی یا مدعیٰ علیه بیان کرد، تا حاضری مدعی یا مدعیٰ علیه بروقت اظهار ظاہر شود لیکن اگر بجواب بعض سوالات معلوم گردد

جواب سوالات بدرستی وصفائی نمی دہد و سخن پیچیدہ می گوید البتہ ضرورست کہ اوّل سوال بجنسہ تحریر نمائید و جواب آں نویسند کہ مدعا علیہ سکوت کرد یا جواب برابر نداد۔

(۱۰) بعض اوقات عرائض بر کاغذ سادہ پیش شدہ قبول می شوند، و حکم بغرض وصول قیمت کاغذ مہور از عرضی گزاراں صادر می شود، ایں کارروائی محض غلط ست اگر عرائض سادہ لائق پذیرائی نہ باشند گرفتہ نہ شوند، وجہ استعمال کاغذات مہور سادہ موجب خرابیہاست و ازیں ہم سخت لائق اعتراض ست کارروائی صدر عدالت کہ عرائض بر کاغذ سادہ گرفتہ حکم وصول کاغذ مہور بر عدالت ضلع میشود۔

اس یادداشت کے مطابق صدر المہام عدالت نے تہدیدی احکام جاری کیئے، اور مروجہ طریق عمل پر جس سے عدالت کی کارروائی میں بلاضرورت طوالت ہوتی ہے حسب ذیل الفاظ میں اعتراض کیا:۔

"صدر المہام را معلوم شدہ است کہ ایں وقت کثرت و طوالت موصولہ و مجاریہ در عدالتہائے سرکار عالی باں درجہ رسیدہ است کہ بسیار وقت عزیز نظماء در تحریرات فضول ضایع و برباد رفتہ مہلت کافی از برائے فیصلہ مقدمات و تکمیل فیصلہ جات حاصل نمی شود و ایں سخت موجب افسوس ست، نظما کہ ذمہ دار تصفیہ خصومات و تکمیل فیصلہ نامجات بودہ اند حیف ست کہ اوقات شاں بایں فضولیات ضائع رود، ازیں ہم زیادہ تر موجب افسوس ایں ست کہ عدالتہا ایں کثرت موصولہ و مجاریہ را یکے از عمدہ ترین کارروائی ہائے خویش تصور نمودہ اند، در کیفیت ہائے نظم و نسق سالانہ، فخریہ ذکر آں میشود کہ دریں سال نشان موصولہ تا باین جا و نشان مجاریہ تا بہ آں جا رسیدہ و از سال گزشتہ ایں قدر ترقی یافتہ است، مگر صدر المہام صاف صاف ظاہر مینماید کہ ایں زعم، زعم باطل متصور خواہد شد صدر المہام کار آں عدالت پسند خواہند کرد کہ فیصلہ مقدمات و تکمیل فیصلہ نامجات زیادہ داشتہ باشد، و موصولہ و مجاریہ کم و آں

عدالت را ہمیشہ بہ نظرِ تحقیر خواہند دید کہ در تعداد فیصلہ قاصر باشد و موصولہ و مجاریہ افزاید"۔

صیغہ عدالت کا مداخلت سے آزاد کرنا

عدالت بلدہ اور اضلاع کے مقدمات کا مرافعہ مجلس مرافعہ میں ہوتا تھا لیکن باوجود کافی عمدہ داروں کے بعض مقدمات قابلِ اطمینان طور پر طے نہیں ہوتے تھے، یا باوجود طے ہو جانے کے صدر المہام یا مدار المہام کے یہاں اُن کا مرافعہ ہوتا یا اُن میں مداخلت کی جاتی، اس سے عدالت کے وقار میں فرق آتا تھا، اور فصل مقدمات میں تاخیر ہوتی تھی۔ مولوی مشتاق حسین کی معتمدی کے زمانہ میں اس کی اصلاح بھی کی گئی، صدر المہام کے یہاں مرافعہ بند ہوا، اور مدار المہام کی طرف سے جو مداخلت ہوتی تھی اُس میں تخفیف ہوئی مولوی مشتاق حسین کا طریق عمل یہ تھا کہ وہ ہر چیز کو اعتدال پر رکھنا چاہتے تھے، اگر ایک طرف وہ حکام عدالت کے طریق عمل پر حرف گیری کرتے تھے تو دوسری طرف اپنے منصب سے کسی قدر تجاوز کر کے نواب بشیر الدولہ، اور سر سالار جنگ کے خود مختارانہ یا خلاف قانون طرزِ عمل پر بھی بہ آئین شائستہ نکتہ چینی کرتے تھے، اور ادب کے ساتھ اُن کو آئین انصاف اور اُصول معدلت کی طرف توجہ دلاتے تھے چونکہ اُن کا یہ طرزِ عمل ہمیشہ نیک نیتی، اخلاص اور سلطنت کی وفاداری پر مبنی ہوتا تھا، اس لیے کبھی اُن پر بدگمانی نہیں کی گئی۔ بلکہ اکثر اوقات اُن کے مشوروں پر تحمل و اعتماد کے ساتھ غور کیا گیا، اور انھوں نے بھی اس اعتماد سے فائدہ اُٹھا کر نواب بشیر الدولہ اور مدار المہام کو ہمیشہ بہت نیک نیتی اور آزادی کے ساتھ مفید مشورے دیئے، چنانچہ ایک معاملہ کے متعلق اپنے محکمہ سے لکھتے ہیں:۔

"وقتیکہ وضع آئین و قوانین و کارروائی آں از محکمۂ واحد متعلق باشد حوالہ و داخلہ نشان و تاریخ ہیچ دستور العمل سابق منتج ہیچ نتیجہ مفید نتواند شد، چہ محکمہ موصوفہ (مراد از محکمہ مدار المہام، مولف) ہر وقت مجاز ست کہ مجرد از رائے واحد خود ہر وقت ہر دستور العمل کہ خواہد تصنیف فرماید و ہر کہ را کہ خواہد منسوخ کند چنانکہ از چند روز

دیدہ میشود کہ دستور العمل کہ یک وقت بطور دستور العمل مبسوط و مکمل جاری شدہ در جریدہ ہم مشتہر شدہ اند بعد ازاں بذریعہ روبکارات متفرق درآں ترمیم و تنسیخ بہ عمل آمدہ است۔

چند روز قبل ازیں مجلس مرافعہ در یکے از مقدمات تحریر نمود کہ فلاں روبکار مدار المہام سرکار عالی مخالف فلاں دستور العمل می باشد، ازیں محکمہ ہمیں جواب داشد کہ "محکمہ کہ اقتدار اجرائے دستور العمل دارد ازہماں محکمہ ایں روبکار جاری شدہ است لہٰذا وقعت مضمون دستور العمل برابر ست و حکم مابعد واجب العمل ست"۔ الغرض ایں قسم وقتہا اکثر پیش می آیند و تدارک ایں نقصانہائے موجودہ بغیر ازیں نتواند شد کہ مجلس واضع آئین و قوانین از محکمہ مدار المہام سرکار عالی علٰحدہ باشد گو منظوری و عدم منظوری یا ترمیم مسودات قوانین مرتبہ مجلس بلحاظ حالات وقت، و مصالح ملکیہ باختیار مدار المہام سرکار عالی باشد، و دریں قوانین، اقتدار ہر یک محکمہ صاف صاف بیان کردہ شوند، تا آیندہ مدار المہام سرکار عالی ہم ازاں تجاوز نہ فرمایند، و اگر ضرورت اصلاح کدامی قاعدہ پیش آید، بغیر از مشورہ مجلس مجرد از رائے آں محکمہ تنسیخ و ترمیم آں شدن نتواند کہ بغیر از کارروائی مذکورہ، محکمہ جات ماتحت را گاہے آزادی نخواہد شد۔

و نہایت ضرورست کہ کارروائی صیغہ عدالت از حکومت کارفرمایان وقت آزاد باشد بریں موقع بازہماں سوال پیدا خواہد شد کہ اراکین ایں چنیں مجلس از کجا آیند! و جواب صدر المہام ہماں ست کہ زمانہ ہنوز از کار آگاہاں خالی نیست و زر کہ بر اکثر مواقع غیر ضروری صرف آں دیدہ میشود کفالت ایں امر ضروری ہم بخوبی کردن میتواند"۔

اِس تحریر میں جس خوش اسلوبی سے مدار المہام کے محکمہ پر نکتہ چینی کی گئی ہے اور جیسے مفید اشارات انتظام و اصلاح کے متعلق کیے گئے ہیں اُن کی ضرورت و اہمیت محتاج بیان نہیں، اس قسم کی تحریرات کا سلسلہ برابر جاری رہا جس کا نتیجہ مفید اصلاحات اور انتظامی تغیرات کی

کی صورت میں ظاہر ہوتا رہا۔

عام اصلاحات

مولوی مشتاق حسین نے مختلف اوقات میں مفصل و مدلل رپورٹیں عدالت کی اصلاح و انتظامی جزئیات کے متعلق پیش کیں اور صدر المہام و مدار المہام کو بار بار اصلاح پر متوجہ کیا۔ ان کی یہ سعی و محنت ضائع نہیں گئی بلکہ جیسا کہ زمانہ مابعد کے حالات سے معلوم ہوتا ہے ان کی مساعی جمیلہ کے نہایت عمدہ نتائج برآمد ہوئے، مثلاً

(۱) عدالتوں کا مقررہ طرزِ عمل بالکل بدل گیا، مقدمات میں جو طوالت ہوتی تھی اس کی بھی بہت کچھ اصلاح ہو گئی۔

(۲) کاغذ ممہور (اسٹامپ) کے متعلق مفید اصلاحات عمل میں آئیں۔

(۳) بڑے بڑے اُمراء و جاگیرداروں کا عدالت کے حکام پر جو اثر تھا (جس سے معمولی لوگوں کے لیے انصاف کا حاصل کرنا دشوار ہو گیا تھا) وہ کلیتہً زائل ہو گیا۔

(۴) جیل خانوں میں بہت سی مادی و انتظامی اصلاحات عمل میں آئیں۔

(۵) خاص اُن کی کوشش سے قیدیوں کو مذہبی فرائض ادا کرنے کی اجازت دی گئی اور اُن کی اخلاقی اصلاح پر بھی توجہ کی گئی۔

(۶) عام اہلکاروں اور عہدہ داروں کے اضافہ تنخواہ پر اُنھوں نے بار بار زور دیا تاکہ ریاست کو لائق اشخاص کام کرنے کے لیے مل سکیں۔

(۷) رشوت خواری کے انسداد کے متعلق خاص کوشش کی گئی۔

چونکہ ناظرین کو ان اصلاحات سے جو زیادہ تر مقامی حیثیت رکھتی ہیں چنداں دلچسپی نہیں ہو سکتی اس لیے جزئیات کو نظر انداز کیا جاتا ہے اُن کی مساعی اصلاح اس قدر مشہور اور ضرب المثل ہیں کہ آج بھی حیدرآباد میں ہر واقف کار شخص اُن کا معترف ہے، اور خاص کر صیغۂ عدالت میں اُنھوں نے جو اصلاح کی ہے اُس کا بار ہا حیدرآباد کی پبلک اور گورنمنٹ نے اعتراف کیا ہے چنانچہ حیدرآباد کی جوڈیشل رپورٹ سنہ ۱۲۹۴ف مرتبہ مجلس عالیہ عدالت کے حسب ذیل الفاظ اس کے شاہد ہیں:۔

"نواب صاحب مرحوم (سر سالار جنگ اول) نے اپنے قدیم اصول پر کہ لئیق عہدہ دار اور عہدہ داران غیر متعہد گورنمنٹ انگریزی سے پسند کر کر سرکار میں مقرر کریں پیروی کر کے مولوی مشتاق حسین صاحب کو معتمد صدر المہام مقرر فرمایا اُن کے زمانہ میں صیغۂ عدالت کی اصلاح اور رفارم کی تاریخ کی ایک نئی بنیاد پڑی اپنی بے انتہا محنت، اور فطرتی لیاقت سے اُنھوں نے ملک میں بہت سی ضروری اصلاحیں کیں، اُن کی جانفشانی سے عدالتوں کی طرز کارروائی بالکل بدل گئی، اور اُن کی تحریرات سے عدالتوں کو اپنی کارروائی میں آزادی حاصل ہوئی جو اس وقت تک اُنھیں میسّر نہ تھی۔

اُن ہی کی سفارش پر مدار المہام نے مقدمات کی نسبت اپنی مداخلت کو روکا، اور حکام عدالت کی تنخواہوں میں اضافہ کیا، اِس کے قبل یہ بے ضابطگی تھی کہ بعض حکام جنکی تنخواہ سو کے اندر تھی بہت بھاری اقتدارات دیوانی و فوجداری رکھتے تھے۔

اُنھوں نے عدالتہائے تحت کی نگرانی کے لیئے ایک کامل انتظام جاری کیا اُن کی کامیابی کی وجہ اُن کی ذاتی اخلاقی خوبیاں تھیں جن کا حیدرآبادیوں کے دل پر بہت ہی عمدہ اثر پڑا ہوا تھا، اور جن کی وجہ سے اُنھوں نے وہ کارروائیاں کیں، جن کے جاری کرنے میں کسی دوسرے آدمی کو بہت ہی سخت مشکلات لاحق ہوتیں"۔

مندرجہ بالا الفاظ پر کسی اضافہ کی ضرورت نہیں، ہر شخص واقعات کے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ اُن کا زمانہ معتمدی کس قدر کامیاب و شاندار رہا۔

خدماتِ خاص

تقرر کے کچھ زمانہ بعد ۱۸۷۸ء میں جب کہ مولوی مشتاق حسین معتمد صدر المہام کے عہدہ پر مامور تھے اُن کو ایک خاص خدمت کے لیئے تجویز کیا گیا جو اگرچہ عارضی تھی لیکن اس کے

انجام دینے کے لیے اعلیٰ درجہ کی انتظامی قابلیت، دل سوزی، اور جذبۂ ہمدردی کی ضرورت تھی۔

صدر مجلس انتظام قحط کی رکنیت

۱۸۷۶ء م ۱۲۸۶ف میں ممالک محروسہ کے اضلاع جنوبی و غربی میں ایک سخت قحط رونما ہوا، گورنمنٹ نظام نے بلا تاخیر اس کی طرف توجہ کی اور قحط کے انتظام کے لیے بلدہ میں ایک مجلس بنام صدر مجلس انتظام قحط قایم کی۔ مولوی مشتاق حسین بھی اس مجلس کے ایک رکن قرار دیے گئے، چونکہ اُن کو انگریزی ملازمت کے زمانہ میں دو دفعہ قحط کے انتظام کے متعلق تجربہ ہو چکا تھا، اس لیے ایک تجربہ کار رکن کے لحاظ سے اُن کی رائے عزت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔

قیام محتاج خانہ جات کی تجویز

مارچ ۱۸۷۷ء میں اُنھوں نے صدر مجلس کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ معذور لوگوں کے لیے ممالک محروسہ میں مختلف مقامات پر محتاج خانے قایم کیے جائیں اس تجویز میں اُنھوں نے تفصیل کے ساتھ اس طریق عمل کو بھی بیان کیا جس سے اس مقصد میں کامیابی ہو سکتی ہے، چنانچہ ایک کمیٹی ان کی تجویز پر غور کرنے کے لیے قایم کی گئی۔

ناظم محتاج خانہ جات

کمیٹی نے اس کو منظور کیا اور بلحاظ تجربہ اور غربا کے ساتھ ہمدردی رکھنے کے خود مولوی مشتاق حسین کو ناظم محتاج خانہ جات بنایا بلکہ درحقیقت خود اُنھوں نے اپنے جذبۂ مذہبی سے متاثر ہو کر اس خدمت کے لیے اصرار کیا تاکہ خدا کے درماندہ اور معذور بندوں کی خدمت کا موقع اُن کو حاصل ہو۔ چنانچہ اُنھوں نے جس محنت، اخلاص، اور خوش اسلوبی سے اس خدمت کو انجام دیا، دوسرے سے قریباً ناممکن تھا۔ اُن کا یہ کارنامہ حیدرآباد میں مدت تک یادگار رہیگا۔

جب محتاج خانے کھل گئے اور انتظام مکمل ہو گیا تو اُنھوں نے ایک مفصل رپورٹ صدر مجلس انتظام قحط کے سامنے پیش کی جس میں نہایت وضاحت سے محتاج خانوں کے طریق انتظام کو بیان کیا ہے یہ رپورٹ چھپ گئی ہے اس کے بعد ایک دوسری طویل رپورٹ اُنھوں نے کام

ختم ہونے اور محتاج خانوں کے بند ہونے پر بحث کی ہے جس میں نہایت تفصیل سے تمام جزئیات کو بیان کرکے محتاج خانوں کے کاروبار پر مفصّل تبصرہ کیا ہے۔ یہ رپورٹ قلمی ہے دونوں رپورٹوں کی مجموعی ضخامت فلسکیپ سائز پر ۱۱۰۰ صفحے ہے رپورٹیں فارسی زبان میں ہیں اور نہایت دلچسپ ہیں، اُن کا ماحصل لکھنے کے لیئے بھی کافی جگہ درکار ہے، اس لیئے تمام رپورٹوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد غیر ضروری امور اور جزئیات کو چھوڑ کر اُن کا ملخص و ماحصل اپنے الفاظ میں لکھا جاتا ہے۔

کیفیت انتظام محتاج خانہ جات

اُصولِ انتظام | سب سے پہلے انھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ ہمارا انتظام کس اُصول پر ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

(۱) ہر عاقل، بالغ، اور آزاد بمقتضائے فطرت اس کا ذمّہ دار ہے کہ اپنی روزی خود پیدا کرے، کسی گورنمنٹ کا یہ فرض نہیں کہ وہ رعایا کے خورونوش اور خانگی ضروریات کا انتظام کرے، اگرچہ بظاہر اس قسم کا انتظام ترحم و نیک نیتی کی علامت ہے لیکن درحقیقت یہ صحیح نہیں، روپیہ کا بغیر معقول وجہ کے ضائع کرنا اور رعایا کو کاہل بنانا کوئی پسندیدہ امر نہیں، لہٰذا صرف اُن صورتوں میں رعایا کی امداد کرنا چاہیئے جب کہ لوگوں کے لئے حصول معاش کا دروازہ بند ہوجائے اور وہ اپنی قوت و بازو سے روزی نہ پیدا کرسکیں۔

(۲) کسی شخص کو بلا معاوضہ امداد نہ دی جائے بلکہ اس کی قابلیت اور قوت کے مطابق اس سے کام بھی لیا جائے۔

(۳) حتی الامکان لوگوں کو اس پر مجبور کیا جائے کہ جب تک وہ سرکاری امداد سے مستفید ہوتے ہیں کسی دوسرے ذریعہ سے روزی نہ پیدا کریں۔

محتاجوں کے اقسام محتاج تین قسم کے ہیں (۱) توانا (۲) ناتواں (۳) معذور۔ اوّل الذکر کے لیئے محتاج خانوں کا انتظام نہیں ہونا چاہیئے بلکہ امدادی کام (مثلاً سڑکوں اور تالابوں وغیرہ کی مرمّت) جاری کرنا چاہیئے، قسم دوم کے لیئے محتاج خانہ کا انتظام ہونا چاہیئے، لیکن اُن سے بقدر طاقت کام لیا جائے، اور اُن کو خوراک کی کافی مقدار دی جائے تاکہ وہ توانا ہو کر اوّل الذکر جماعت میں داخل ہو سکیں (اصطلاح کے اعتبار سے قسم اوّل کو کارگزار، قسم دوم کو نیم کارگزار کہا جاتا ہی) قسم سوم یعنی معذور لوگوں کی امداد بلا معاوضہ کارہونا چاہیئے، چنانچہ ممالک محروسہ میں اسی اُصول پر انتظام کیا گیا، یعنی قسم اوّل کے محتاجوں کے لیئے امدادی کام جاری کیئے گیئے، اور قسم دوم وسوم کے لیئے محتاج خانے کھولے گئے۔

محتاج خانہ کا کام اور مقصد محتاج خانوں میں قسم دوم سے خواہ مرد ہوں یا عورت بقدر استطاعت کام لیا گیا، عورتوں کے متعلق زیادہ تر چرخہ چلانے کا کام کیا گیا اور مردوں کے متعلق پارچہ بافی وغیرہ کا۔ عام اشخاص اس کو معیوب سمجھتے تھے کہ خیرات اور امداد کے معاوضہ میں کام لیا جائے لیکن یہ خیال ہمارے اُصول سے ناواقفیت پر مبنی تھا، ابتدا ہی میں صدر مجلس اور مدار المہام پر تمام واضح کر دیا گیا کہ کام لینے سے یہ مقصد نہیں کہ سرکاری خزانہ کو فائدہ پہنچایا جائے یا محتاج خانہ کے مصارف میں امداد حاصل ہو، بلکہ مقصود یہ تھا کہ ہر شخص یہ باور کرے کہ بغیر مشقت و محنت کے محتاج خانہ میں بھی روزی حاصل نہیں ہو سکتی، اس لیئے وہ آزادانہ طور پر روزی پیدا کرنے کی کوشش کرے، اور بلا ضرورت محتاج خانہ کے قواعد اور پابندیوں میں مبتلا نہ ہو۔ اس کے علاوہ یہ مقصد بھی تھا کہ سرکار جو رقم دیتی ہی وہ خیرات کے نام سے موسوم نہ ہو کیونکہ اکثر شرفا جو اگرچہ قحط و افلاس کے ہاتھوں عاجز ہو گیئے ہیں باوجود اس زبوں حالت کے یہ گوارا نہیں کرتے کہ خیرات قبول کریں۔

انتظام کی نوعیت متعدد اضلاع مثلاً رائچور اور گلبرگہ وغیرہ میں محتاج خانے جاری کیئے گئے ہر ضلع میں وہاں کے عمائد اور عہدہ داروں کی ایک مجلس ترتیب دی گئی، تمام محتاج خانوں کا

انتظام ارکان مجلس کی صلاح و مشورہ سے عمل میں آیا، ارکان انجمن نے معقول خدمات انجام دیں، منجملہ ارکان کے روزانہ دو شخص محتاج خانہ جاکر مفصلۂ ذیل خدمات انجام دیتے تھے۔

(۱) جو لوگ محتاج خانہ میں داخل ہونے کے لئے آتے تھے اُن کو اپنے اُصول کے لحاظ سے مشورۂ مہتمم محتاج خانہ داخل کرنا۔

(۲) جو کھانا محتاجوں کے لئے پکتا تھا تقسیم ہونے سے پہلے اس کا معائنہ کرنا۔

(۳) اپنے سامنے محتاجوں کو کھانا تقسیم کرانا، اور اس کا اطمینان کر لینا کہ خوراک مقدار معیّن کے مُطابق ہے۔

(۴) جو محتاج تقسیم طعام کے وقت غیر حاضر ہوں اُن کا نام درج رجسٹر کرانا۔

(۵) محتاجوں کی حاضری کے گوشوارہ پر بعد تقسیم طعام دستخط کرنا۔

(۶) غلّہ و اجناس کے گودام کا معائنہ کرنا اس غرض سے کہ وہ عمدہ اور لائق استعمال ہے یا نہیں؟

(۷) نیم کارگزار محتاجوں کے کام کا معائنہ۔

(۸) صفائی کا انتظام اور نگرانی۔

(۹) بیمار محتاجوں کا معائنہ اور خبر گیری۔

(۱۰) اصلاح طلب اُمور پر مہتمم محتاج خانہ کو توجّہ دلانا۔

ارکان کے علاوہ مستقل انتظامات کے لئے علٰحدہ علٰحدہ اشخاص موجود تھے جن کی تفصیل بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔

محتاج خانہ کے مکانات | مختلف ضروریات کے لحاظ سے محتاج خانہ کے متعلق علاوہ کارخانوں کے پندرہ قسم کے مختلف مکانات یا جداگانہ حصّوں کا انتظام کیا گیا۔ مثلاً

(۱) دفتر

(۲) گودام اجناس

(۳) دواخانہ

(۴) باورچی خانہ

(۵) عام بیماریوں اور متعدی اور وبائی امراض کے مریضوں کے لیئے علٰحدہ علٰحدہ مکانات

(۶) نعش خانہ

(۷) لاوارث بچّوں اور زچّہ عورتوں کے لیئے علٰحدہ علٰحدہ مکانات

عورتوں اور مردوں کے رہنے کے علٰحدہ علٰحدہ مکانات تھے اور اس کی شدید نگرانی رکھی جاتی تھی کہ اُن میں باہم آمیزش نہ ہو۔

خوراک کا انتظام

وقت معین پر پختہ کھانا محتاجوں کو تقسیم ہوتا، اُن کو اختیار تھا، کھائیں یا لیجائیں کھانا کافی مقدار میں دیا جاتا تھا، مردوں کے لیئے غلّہ کا وزن تین پاؤ روزانہ مقرر تھا، مذہب کے لحاظ سے تین قسم کے محتاج تھے (۱) مسلمان (۲) ہندو (۳) ادنیٰ اقوام یعنی چمار وغیرہ۔ لہٰذا اس کی خاص احتیاط کی جاتی تھی کہ مذہبی حیثیت سے کوئی قابل اعتراض امر پیش نہ آئے، اس بنا پر ہندوؤں کے لیئے جداگانہ انتظام تھا۔ اُن کا کھانا ہندو پکاتے تھے اور وہی تقسیم کرتے تھے۔

ہر مذہب کے محتاج علٰحدہ علٰحدہ وقت معینہ پر صف بندی کی صورت میں بیٹھ جاتے تھے، ہر محتاج کے پاس ایک ٹکٹ ہوتا تھا جس کے دکھانے پر کھانا دیا جاتا، نیم کارگزار لوگوں کے ٹکٹ بیضوی تھے اور معذوروں کے مدوّر، ہر ٹکٹ پر محتاج کا نام، نمبر، قسم، اور مذہب لکھا ہوتا تھا، اور جو کام اس کے متعلق ہوتا اُس کی تفصیل بھی ٹکٹ میں درج ہوتی رجسٹر میں ٹکٹ کے نمبروں کی ترتیب کے لحاظ سے محتاجوں کے نام درج تھے حسن انتظام کی یہ حالت تھی کہ تمام محتاج کھانا لینے کے لیئے اپنے نمبروں کی ترتیب کے لحاظ سے بیٹھ جاتے تھے، ہر شخص کو اپنی جگہ معلوم تھی، اس سے یہ فائدہ تھا کہ وقت کم صرف ہوتا تھا، اور محرر کو رجسٹر میں ترتیب وار حاضری لینے میں سہولت ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ جب بعض حکام نے ایک ضلع کے محتاج خانہ کا معائنہ کیا تو اُس وقت قریبًا چار ہزار

محتاج صف بستہ اپنے منبروں کی ترتیب سے بیٹھے تھے۔

چونکہ کسی محتاج پر یہ لازم نہ تھا کہ وہ شبانہ روز محتاج خانہ میں قیام کرے اس لئے کافی تعداد ایسے محتاجوں کی بھی تھی جن کا نام محتاج خانہ کے رجسٹر میں درج تھا اور وہ باقاعدہ کام کرتے تھے، مگر کھانا گھر لے جاتے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ محتاجوں کو گھر کھانا لے جانے کی اجازت نہ دی جائے، لیکن مولوی مشتاق حسین نے اس کو پسند نہ کیا کیونکہ جب انھوں نے بطور خود اس کی تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ اکثر لوگ جو گھر کھانا لے جاتے ہیں مصیبت زدہ شرفا اور صاحب اہل وعیال ہیں۔ جو کھانا وہ لے جاتے ہیں باہم مل جلکر کھاتے ہیں، اُن کی غیرت گوارا نہیں کرتی کہ اپنے بچوں یا عورتوں کا نام محتاج خانہ میں درج کرائیں۔

لباس و دیگر ضروریات کا انتظام

بروقت ضرورت محتاجوں کو کپڑا بھی دیا جاتا تھا اور ہر جمعہ کو کپڑے دھونے اور دوسری ضروریات کے لیئے تعطیل دی جاتی تھی، عورتوں کو سر کے بالوں میں ڈالنے کے لیئے تیل ملتا تھا، علاج و دوا کا بندوبست کیا جاتا تھا۔

بچوں کی پرورش کا طریقہ

جب بچہ کی ماں کا دودھ خشک ہوجاتا تھا تو محتاج خانہ کی طرف سے دودھ کا باقاعدہ انتظام کردیا جاتا تھا، گلبرگہ کے محتاج خانہ میں دودھ پلانے کی شیشیاں خرید کی گئی تھیں جن سے دودھ پلایا جاتا تھا، لاوارث بچوں کا بھی خاص انتظام تھا ہر بچہ پر ایک دایہ مامور تھی جو بچے ذرا بڑے تھے وہ ایک دایہ کے متعلق دو دو کردیئے گئے تھے۔

اس موقع پر بچوں کی عام حالت کے متعلق خود مولوی مشتاق حسین کے چند الفاظ نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

"لباسِ اطفال لاوارث در ہر محتاج خانہ قریب قریب یکساں بود، وکلاہ ہمہ ہا سرخ، این جماعت کہ بلحاظ کیفیت وبلحاظ لباس ہم حالت بود، وقتے کہ باین ہیئت مجموعی صبح وشام در صحنہائے محتاج خانہ جات تفرجگاہ سیر وگشت می کردند، یک قدرتِ خدا یاد می آید کہ واللہ اعلم بالصواب اینہا کجا پیدا شدند وکجا پرورش یافتند، واکنوں مادر وپدر اینہا دریں مصیبت عام چگونہ ازینہا

جدا شدند و در محتاج خانہ گلبرگہ بمکانے کہ ایں اطفال اقامت می داشتند صحن مکاں را از سبزہ زار و درختاں خوبصورت آراستہ بودند آں وقت کلاہ ہائے سرخ شاں دراں سبزہ زار آں قدر خوش معلوم می شد کہ از دیدن تعلّق داشت۔"

پردہ نشین عورتوں کی اعانت

شریف اور پردہ نشین عورتیں محتاج خانہ میں نہیں آسکتی تھیں لیکن حاجتمند اور لائق اعانت تھیں، اس لیئے بصورت نقد اُن کا ماہانہ وظیفہ مقرر کیا گیا اور نہایت معتبر و متدیّن لوگوں کے ہاتھ میں یہ کام رکھا گیا، ہر وظیفہ کی تقسیم پر کم از کم تین شخصوں کی تحریری شہادت لی جاتی تھی کہ وظیفہ ہمارے سامنے دیا گیا۔

ایک دلچسپ معاملہ

ایک ضلع کی مجلس انتظام قحط میں یہ تحریک بھی پیش کی گئی کہ محتاجوں کے سلسلہ میں ایک اور مد کا اضافہ کر کے مشائخ کرام کو بھی اس جماعت میں داخل کیا جائے لیکن یہ تحریک مسترد ہو گئی۔ مولوی مشتاق حسین نے اس واقعہ کو نہایت دلچسپ طریقہ سے حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"از طرف بعض شرکائے مجلس ایں ہم کوشش نمودہ شد کہ علاوہ ایں اقسام چارگانہ اشخاص قحط زدہ قسم پنجم ہم قائم شود و دراں داخل شوند مشائخ کرام کہ گذران شاں محض بر امداد مریداں منحصر بود و بہ سبب قحط سالی مریداں مددے کردن نمی توانند و مشائخ موصوف رحمۃ اللہ علیہم اجمعین بہ سبب غائت شرافت و علو مرتبت نہ در محتاج خانہ آمدن می توانند و نہ گدامی پیشہ اختیار کردن مناسب می دانند و اگر بمقتضائے وقت اختیار ہم کنند موجب بدعقیدگی مریداں شدہ آئندہ سدِ باب رزق میشود، پس چناں کہ برائے عورات پردہ نشیں بلحاظ شرافت آنہا از مجلس تجویز شدہ است برائے ایں گروہ معزز نیز تجویزے بعمل آید، لاکن مجلس از ایں تحریک اتفاق نہ کرد و تجویز شد کہ از صیغہ محتاج خانہ ہیچ امداد بحق ایں حضرات کہ شیخوخیت را کاسہ گدائی قرار دادہ نمی تواند شد۔"

نتیجہ

جب فصل و موسم میں خوشگوار تبدیلی پیدا ہوئی اور غلہ کا نرخ کسی قدر ارزاں ہو گیا،

تو رفتہ رفتہ یہ محتاج خانے بند کردیئے گئے اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہوگئے، جن بچوں کے والدین کا پتہ چل گیا تو بچے اُن کے حوالہ کیئے گئے، لاوارث بچے اُن لوگوں کے سپرد کیئے گئے جنھوں نے اُن کی پرورش کی خواہش کی، لیکن یہ تحریری شرط کرلی گئی کہ اگر اُن کے مفقود الخبر والدین کسی موقع پر اپنے بچوں کی تلاش میں آئیں اور اُن کا مطالبہ کریں تو بچے اُن کے حوالہ کردیئے جائینگے اور اُن کی پرورش وغیرہ کے مصارف کا کوئی مطالبہ والدین سے نہ کیا جائیگا، نیز یہ کہ بچے جوان ہونے پر آزاد ہونگے اور جہاں اُن کا دل چاہیگا، رہینگے۔ ان کے علاوہ جو بچے باقی رہ گئے اُن کی پرورش کا انتظام سرکاری طور پر کیا گیا اُن محتاج خانوں میں کچھ بچے انگریزی علاقہ کے بھی تھے، جن کو رزیڈنٹ کی تحریک واصرار سے بحکم مدارالمہام بادل ناخواستہ اُن پادریوں کے حوالہ کیا گیا جو اسی غرض سے آئے تھے۔

غرض قریبًا ۹ ماہ تک یہ انتظام قایم رہا، اور ۶۳۰۰۹ محتاجوں نے ان محتاج خانوں سے فائدہ اُٹھایا جن میں ۴۸۰۷۷ معذور محض تھے منجملہ کل محتاجوں کے ۱۲۵۱۳ انگریزی علاقہ کے تھے۔

رپورٹ کے آخر میں مولوی مشتاق حسین نے جملہ انتظامات پر ایک مفصل تبصرہ لکھا ہے، اور نہایت تفصیل سے تمام جزئیات کو بیان کیا ہے۔ مثلاً آمدنی اور مصارف کی تفصیل، چندہ کی مقدار، نیم کارگزاروں کے کام کا منافع اور اُس کی نوعیت، مصارف کا فی کس اوسط، محتاجوں کی تعداد مذہب، پیشہ اور عمر کے لحاظ سے، پردہ نشین عورتوں کے وظائف کی تعداد، غرض تمام جزئیات پر نہایت مفصل بحث کی ہے۔ آخر میں اپنے ساتھ کام کرنے والوں کا شکریہ ادا کیا ہے اور لکھا ہے:۔

"الغرض این نازک ترین کارے کہ از مشکلات چند درچند مرکب بود و لشوق خود بلکہ باصرار خود نیز ذمہ خود گرفتہ بودم باحسن وجوہ بہ اختتام رسید فالحمد للہ علیٰ ذٰلک"

سالار جنگ کی رائے

جب کام ختم ہونے کے بعد یہ رپورٹ صدر مجلس میں پیش ہوئی تو مجلس نے

مولوی مشتاق حسین کا شکریہ ادا کیا اور سر سالار جنگ نے فرمایا:-

"مولوی مشتاق حسین مسکین خانوں کے قایم کرنے میں تکلیف اُٹھانے کے باعث حکومت کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں، اور ابتدا ہی سے مسکین خانون کے عمدہ انتظام کا سبب اُن کی ذات ہی ہے۔"

کمیشن انسداد قحط میں شہادت

اِسی سلسلہ میں یہ بیان کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہی کہ ۱۸۷۸ء کے آخر میں کمیشن انسداد قحط کے روبرو جس کو گورنمنٹ آف انڈیا نے مقرر کیا تھا مولوی مشتاق حسین نے تحریری شہادت دی، اس میں جس جامعیت و وضاحت سے انسداد قحط کی تدابیر پر بحث کی ہے وہ اُن ہی کا حصہ ہی، اس شہادت کے ساتھ حیدرآباد کے انتظام قحط کی رپورٹ بھی پیش کی گئی جس کی اس زمانہ میں خاص شہرت تھی، اور حیدرآباد میں جابجا اُن کی خدمات اور کارگزاری کا بھی چرچا تھا۔

حیدرآباد کی مُلازمت سے برخاست ہونا

۲۱ ربیع الاول ۱۲۹۴ھ (اپریل ۱۸۷۷ء) کو شمس الامرا، نواب رفیع الدین خاں امیر کبیر ثانی (شریک مدار المہام) کا انتقال ہوگیا، اس زمانہ تک اعلیٰ حضرت نظام نے بوجہ کمسنی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں نہیں لی تھی، اس لیئے گورنمنٹ ہند کی تجویز سے شمس الامرا، اقتدار الملک نواب رشید الدین خان امیر کبیر ثالث جو نواب رفیع الدین خاں مرحوم کے برادر خرد تھے شریک مدار المہام تجویز کیئے گئے۔ گورنمنٹ ہند نے جو مراسلہ رزیڈنٹ کے نام بھیجا اُس میں سر سالار جنگ کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا تھا کہ وہ ہر اہم معاملہ میں اپنے شریک کار سے مشورہ لیا کریں، مراسلہ کے خاص الفاظ یہ ہیں:-

"بہر حال در ہمگی احکامات و مقدمات سترگ اتفاق رائے مشارک منتظم ممدوح (نواب امیر کبیر)

ضرور خواہد بود۔"

نواب امیر کبیر کی مشارکت اور تقرر سر سالار جنگ کی مرضی کے خلاف تھا، لیکن سر رچرڈ میڈ نے جو اس زمانہ میں حیدرآباد کے رزیڈنٹ تھے، سر سالار جنگ کی مخالفت ہی کے ارادہ سے نواب امیر کبیر کو مقرر کرایا تھا اس لئے بقول سر اسٹوارٹ بیلی :-

"سر رچرڈ میڈ کا سر سالار جنگ کے خلاف امیر کبیر سے مل جانا بہت ہی افسوس ناک ہوا اور انڈین گورنمنٹ کو اس وجہ سے بہت سے ناگفتہ بہ کام کرنے پڑے۔"

اور ہم اس جملہ پر اس قدر اور اضافہ کرتے ہیں کہ سر سالار جنگ کو بھی شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

نواب بشیر الدولہ بہادر اس زمانہ میں صدر المہام عدالت تھے اور مولوی مشتاق حسین ان کے معتمد (سکرٹری) تھے، وہ صرف عہدہ کی حیثیت سے معتمد نہ تھے بلکہ نواب بشیر الدولہ کو پرائیویٹ طور پر بھی ان پر کامل اعتماد تھا اور باہمی تعلقات اس قدر شگفتہ تھے کہ حیدرآباد میں آج تک لوگ اس سے واقف ہیں۔

نواب امیر کبیر شریک مدار المہام جو نائب حضور کے نام سے مشہور تھے، نواب بشیر الدولہ کے چچا تھے، لیکن باہمی تعلقات اچھے نہ تھے، خاندانی حقوق و اعزاز کے متعلق باہم جھگڑے پیدا ہو گئے تھے، اور اس مخالفت نے نہایت خطرناک صورت اختیار کر لی تھی، ان جھگڑوں کا ابھی تک کوئی تصفیہ نہیں ہوا تھا، سر سالار جنگ فریقین کے اعزاز و اقتدار کی وجہ سے اس معاملہ میں مداخلت سے پہلو بچاتے تھے اور بظاہر غیر جانبدار تھے، لیکن در پردہ نواب بشیر الدولہ سے ہمدردی رکھتے تھے۔

اسی زمانہ میں نواب امیر کبیر کو لوگوں نے یہ باور کرایا کہ مولوی مشتاق حسین ان جھگڑوں میں نواب بشیر الدولہ کے معین و مددگار ہیں اور اندرونی طور پر تمام معاملات میں حصہ لیتے ہیں اس بنا پر امیر کبیر ان سے سخت ناراض تھے، اس میں شک نہیں کہ یہ خیال ایک حد تک صحیح

تھا۔ مولوی مشتاق حسین بلاشبہ نواب بشیرالدولہ کے ہوا خواہ تھے، اور جائز حد تک اخلاقی اعانت اور مفید مشورے دینے میں بھی تامل نہیں کرتے تھے، لیکن اس سے زیادہ اُن کی مداخلت اس معاملہ میں نہ تھی۔

غرض حیدرآباد کے یہ حالات تھے کہ ۲ ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) کو مولوی مشتاق حسین دو ماہ کی رخصت لے کر حیدرآباد سے وطن آئے، اس کے بعد گوالیار جاکر نواب بشیرالدولہ کا کوئی پیغام کرنل ٹیوڈی رزیڈنٹ گوالیار کو پہنچایا جو اس سے پہلے حیدرآباد میں فرسٹ اسسٹنٹ (رزیڈنٹ کے) رہ چکے تھے، اس واقعہ کے چند روز بعد اُن کو اطلاع ملی کہ اُن کی تنخواہ میں معقول اضافہ مدارالمہام نے منظور کیا اور آئندہ ۱۲۹۶ھ سے اُن کو ایک ہزار ماہوار تنخواہ ملیگی۔ اس کے بعد یہ سُنا کہ نواب امیر کبیر اس اضافہ پر برہم اور اُن سے ناراض ہیں یہ سُن کر اُن کو فی الجملہ تردد ہوا لیکن وہ بالطبع استقلال کے ساتھ ہر مُصیبت کو برداشت کرنے کے لیئے ہمیشہ تیار رہتے تھے، اس لیئے اُنھوں نے اس موقع پر بھی استقلال اور خودداری سے کام لے کر ایک مفصّل خط مدارالمہام کی اطلاع کے لیئے مولوی سید مہدی علی خاں کو لکھا، جس میں اُنھوں نے صاف صاف لکھ دیا کہ :۔

"ناراضمندی خاطر جناب امیر کبیر بہادر مناسب نیست و نمی خواہم کہ در معاملہ من ہیچ میرز اختلافے درمیان ہمچو دو حکام افتد کہ فلاح و صلاح ملک بر اتفاق شاں منوط و مربوط باشد، نواب امیر کبیر بہادر اگر بر سقوط اضافہ ام مصر باشند بلا تامل اضافہ موقوف کردہ شود، و اگر رضامندی خاطر جناب ممدوح بر تبدیلی عہدہ ام باشد بلا لحاظ صدر و مفصل ہر جا کہ مناسب باشد تبدیل کردہ شوم، تا ایں کہ اگر رضامندی خاطر حضرت ممدوح بر برخاستگی ام موقوف باشد بلا توقف حکم برخاستگی ام صادر فرمودہ آید۔"

اِسی سلسلہ میں اُنھوں نے یہاں تک لکھ دیا۔

"و ایں برخاستگی مرا از ہزار گونہ ترقیات عزیز تر و باعث افتخار خواہد بود کہ ہر چہ

از من مور ضعیف دریں وقت ممکن بود بجا آوردم و منفعتِ خاص را بر منفعت عام قربان کردم۔"

مولوی مشتاق حسین اس خط کے جواب کا انتظار کر رہے تھے کہ اُن کے پاس ۱۲ر جنوری ۱۸۷۹ء کو مولوی مہدی علی خاں کا یہ تار پہنچا:۔

"ہز اکسلنسی نے آج آپ کو موقوف کر دیا کیوں کہ آپ مرار گئے تھے۔"

معزولی کا سبب

اس کے بعد سر سالار جنگ مدار المہام کے دفتر معتمد خانگی سے حسب ذیل مراسلہ ۱۷ر محرم ۱۲۹۶ھ کا لکھا ہوا اُن کو موصول ہوا۔

"حسب الحکم مدار المہام سرکار عالی اطلاع دادہ می شود کہ بہ نواب امیر کبیر بہادر معلوم گردید کہ آں مہرباں کہ ازیں جا بر رخصت کار خانگی رفتہ بودند برائے پیروی مقدمہ نواب محتشم الدولہ و نواب بشیر الدولہ بہادر نزدیک کرنل ٹودی صاحب بہادر بہ گوالیار رفتند و نواب ممدوح بہ مدار المہام سرکار عالی ازیں امر اطلاع دادند۔"

"چونکہ آں مہرباں قبل از روانگی بر رخصت تذکرہ ایں امر اشارۃً وکنایۃً ہم نکردند و نہ قبل از روانگی نزدیک کرنل صاحب بہادر ازیں اطلاع دادند با وجود بودن ملازم سرکار در چنیں معاملات سترگ و سنگیں مداخلت غیر متعلق از عہدہ خود نمودند، پس بہ افسوس تمام علیحدگی آں مہرباں از ملازمت سرکار عالی ضرور اُفتاد، لہٰذا آں مہرباں از تاریخ رسیدن تحریر ہٰذا خود را از ملازمت ایں سرکار خارج تصور سازند۔"

تحقیقات کی استدعا اور سر سالار جنگ کا جواب

مولوی مشتاق حسین کو جب یہ حکم پہنچا تو سخت متحیّر ہوئے کیونکہ جو الزام مقدمہ کی پیروی کا اُن پر لگایا گیا تھا وہ صحیح نہ تھا، تاہم اُنھوں نے چند روز تک انتظار کیا کہ شاید نواب سر سالار جنگ اُن کو پرائیویٹ طور پر برخاستگی کے وجوہ و اسباب سے مفصّل طور پر اطلاع دینگے لیکن جب سر سالار جنگ نے خاموشی اختیار کی تو اُنھوں نے سر سید کے مشورہ سے اس واقعہ کے چار مہینہ کے بعد ایک درخواست بھیجکر باضابطہ طریقہ سے تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ سر سید نے بھی اس درخواست کی ایک نقل خانگی طور پر مولوی سید مہدی علی خاں

کو بھیجدی اور ایک خط بھی لکھا ۔

مولوی مشتاق حسین نے درخواست میں اس غلطی کا اعتراف کیا تھا کہ انھوں نے خلاف عادت مدار المہام کو اس واقعہ سے اطلاع نہیں دی کہ وہ گوالیار میں کرنل ٹیوڈی سے ملاقات کرینگے لیکن اس واقعہ سے انکار کیا کہ اس ملاقات کا تعلق نواب بشیر الدولہ کے مقدمہ سے تھا، اور اس بنا پر یہ خواہش ظاہر کی کہ تحقیقات کی جائے اور اُس کا سہل طریقہ یہ بتایا کہ خود کرنل ٹیوڈی سے دریافت کیا جائے کہ یہ ملاقات مقدمہ کی پیروی کے سلسلہ میں تھی یا کسی اور معاملہ کے متعلق[۱]۔

مولوی سید مہدی علی خاں نے درخواست اور سر سید کا خط سر سالار جنگ کی خدمت میں پیش کر دیا، اور خود بھی نہایت پرزور الفاظ میں تحقیقات کی ضرورت ظاہر کی اور آخر میں لکھا کہ :۔

"ہمہ ملازمان عدالت و اہل معاملہ را تاسف است کہ مثل مشتاق حسین آدم کارگزار و دیانتدار بلاجرم و طلب جواب موقوف کردہ شود اگرچہ ایں موقوفی برائے ذاتِ خاص مولوی مشتاق حسین مضرت نگر ضررِ آں زیادہ تر بہ عدالت و سرکار رسیدہ و غالباً مثل مولوی مشتاق حسین مردے محنتی و متدین و راست باز بمشکل بہم رسد"۔

نواب سر سالار جنگ نے خاص اپنے قلم سے خانگی طور پر اس درخواست کا مفصل جواب دیتے ہوئے لکھا :۔

"مولوی مشتاق حسین اگر دریں جا بودند و بذاتِ خود بر حالات ایں جا واقف می شدند شکے ندارم کہ از کارروائی ایں جانب بکلی اتفاق می نمودند چنانکہ مولوی صاحب شائق بہتری تمام قوم ہستند دریں امر خلاف نخواہند نمود کہ حفاظت فوائد عام را بر فائدہ و با فوائد خاص ترجیح است"۔

---

[۱] کرنل ٹیوڈی نے اپنی چٹھی میں جو نواب بشیر الدولہ کے نام تھی یہ ظاہر کر دیا تھا کہ مشتاق حسین نے مقدمہ کے متعلق اُن سے گفتگو نہیں کی ۔

سر سالار جنگ کی اس پرائیویٹ تحریر سے مولوی مشتاق حسین نہایت متاثر ہوئے اور اظہار شکر گزاری کے طور پر ایک طویل خط لکھا جو تمام تر نہایت دلچسپ ہی لیکن بخوف طوالت اس کا ایک حصہ نقل کیا جاتا ہی جو حسب ذیل ہی:-

"چوں پس از مدتے تحریرے بقلم خاص سرکار موسومہ خود دیدم از ایام گزشتہ یاد آوردہ چشم پر آب شدم و دست دعاے ترقی عمر و دولت و اقبال روز افزوں سرکار بدرگاہ مجیب الدعوات برافراشتم غیر از یک لفظ "تسلیم" لفظے دیگر نزد خود ندارم و یک سطر مختصر برائے اظہار تمامی خیالات گزشتہ و آئندہ و عرض جمیع مطالب و مقاصدام کفایت می کند یعنی با ایں ہمہ کہ گزشت در خلوص عقیدت باطنی ام کہ با ولی نعمت خود داشتم یک نقطہ ہم گاہے کم نہ شدہ است و آئندہ ہم تا زندہ ام بندہ ام و مطیع فرمان"

اس سے اندازہ ہو سکتا ہی کہ ہندوستان کے اس مدبر اعظم سے مولوی مشتاق حسین کے کیا تعلقات تھے، اور ایک کو دوسرے پر کس قدر اعتماد تھا۔

سر سالار جنگ کی مجبوری سر سالار جنگ کو مولوی مشتاق حسین کی محنت، قابلیت، اور راستبازی کا پورا تجربہ ہو چکا تھا، اور ان کے مضبوط کیرکٹر نے سر سالار جنگ کے دل میں ان کی خاص عزت اور عظمت پیدا کر دی تھی، اس لئے بحالتِ مجبوری جب سر سالار جنگ کو یہ خلاف انصاف حکم دینا پڑا تو نہایت رنج ہوا۔ چنانچہ میر افضل حسین صاحب (ممبر مجلس عدالت العالیہ) جو اس زمانہ میں نواب بشیر الدولہ کی سرکار سے تعلق رکھتے تھے، اس کے متعلق ایک خط میں مولوی مشتاق حسین کو لکھتے ہیں:-

"میں اور آپ اور تمام دنیا کے لوگ اس بات کو جانتے ہیں کہ مدار المہام صاحب کا وہ فعل اختیاری نہ تھا اور جس کو خدا نے اتنی بھی قوت مدرکہ دی ہی کہ وہ انسان اور حیوان میں تمیز کر سکتا ہی وہ بھی بے تامل یہ بیان کریگا کہ اس ریاست میں مثل آپکے نہ کوئی پہلے سے موجود تھا اور نہ کوئی اور ملک سے آیا تو پھر کیا وجہ ہی کہ مدار المہام کو اس معاملہ کا

قلق نہ ہو، اور وہ اپنے نازیبا فعل پر پشیمان یا اس کی برائی کے قائل نہ ہوں۔"

اِس کے بعد اپنی اور مدار المہام کی ملاقات، اور ان معاملات پر گفتگو کا تذکرہ کر کے لکھتے ہیں

"جب ملاقات ہوئی تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود نادم ہیں، بنفسہ مدار المہام کا منشا اس امر کے کرنے کا نہ تھا جو اُن سے مجبورانہ ہوا اور میں جانتا ہوں کہ جب تک . . . . اپنی قوت پر باقی ہے اس وقت تک مدار المہام کی مجبوری رفع نہ ہوگی۔"

نواب بشیر الدولہ کی امداد اور مولوی مشتاق حسین کا انکار

نواب بشیر الدولہ بہادر نے اس امیرانہ غیرت سے کہ مولوی مشتاق حسین ایک ایسے بے بنیاد الزام پر برخاست کر دیئے گئے جس میں اُن کا نام بھی شامل تھا یہ ارادہ کیا کہ اُن کو پوری تنخواہ پر (جو زمانہ معتمدی صدر المہامی میں ملتی تھی) اپنی سرکار میں ملازم رکھ لیں، تاکہ جو نقصان قطع ملازمت سے اُن کو پہنچا ہے اس کی کسی قدر تلافی ہو سکے، لیکن باوجود نواب ممدوح کے پیہم اصرار کے مولوی مشتاق حسین نے اس کو منظور نہیں کیا، اور صاف صاف لکھ دیا کہ:۔

"اگر نواب سالار جنگ بہادر کے سوا کوئی اور حاکم مجکو موقوف کرتا تو میں ایسا کر سکتا تھا لیکن جبکہ اُن ہی کی وجہ سے مجکو نوکری کا اتفاق ہوا اور اب اُنھوں نے ہی موقوف کیا ہے، تو میری حمیت خود اس بات کی مقتضی نہیں ہے کہ میں دوسری جگہ حیدر آباد میں اپنا تعلق اختیار کروں۔"

اِس جواب پر نواب بشیر الدولہ بہادر کی طرف سے اُن کے ایک ازدار عہدہ دار نے لکھا:۔

"نواب بشیر الدولہ بہادر دام اقبالہٗ مدار المہام کے رقیب نہیں ہیں کہ اگر مدار المہام آپ کو موقوف کریں تو آپ نواب بشیر الدولہ بہادر کی ملازمت سے انکار کر دیں، اور ملازمت کا تو صرف میں نام لیتا ہوں وہ تو فرماتے ہیں کہ یہ میری طرف سے ایک دعوت ہے جس کا رد کرنا نہایت معیوب اور معصیت ہے۔"

غرض نواب بشیر الدولہ کی طرف سے متواتر اصرار کیا گیا کہ اگر آپ حیدر آباد آنا مناسب

نہیں سمجھتے، تو گھر بیٹھے پانسو روپیہ ماہوار لیجئے مگر انھوں نے اس کو بھی قبول نہیں کیا اور اسکی وجہ یہ بیان کی کہ میں نے نواب ممدوح کی کوئی ایسی بڑی خدمت نہیں کی تھی جس کے معاوضہ میں اُن کے اسقدر نقصان کو جائز رکھوں اِس صاف انکار کے بعد بھی نواب بشیر الدولہ کا اصرار جاری رہا۔ مگر وہ کسی طرح امداد قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

نواب بشیر الدولہ بہادر ایک خاندانی امیر تھے، اور قدیم طرز کے اُمرا میں جو شرافت و وضعداری، اور قدر شناسی ہوتی ہے، اُس سے خالی نہ تھے۔ جب مولوی مشتاق حسین کسی طرح راضی نہ ہوئے تو انھوں نے امداد کا ایک دوسرا طریقہ تجویز کیا۔ اسی زمانہ میں مولوی مشتاق حسین کی ایک لڑکی کی شادی ہونے والی تھی۔ نواب بشیر الدولہ نے چار ہزار روپیہ بطور نیوتہ کے بھیجا اب اُن کو تردد ہوا کہ کیا کریں۔ معاملہ کی اہمیت کے لحاظ سے اُنھوں نے سر سالار جنگ سے مشورہ لینا مناسب سمجھا۔ نواب ممدوح نے رائے دی کہ روپیہ واپس کردو۔ چنانچہ اسی مشورہ پر عمل کیا گیا۔

سر سالار جنگ کا ریمارک

جب ان تمام واقعات کی مفصل اطلاع نواب سر سالار جنگ کو پہنچی، تو نواب ممدوح نے مولوی مشتاق حسین کے شریفانہ طرزِ عمل اور وفاداری سے متاثر ہوکر ۹ رجب ۱۲۹۶ھ کو خاص اپنے قلم سے حسب ذیل ریمارک فرمایا۔

"ہمہ را دیدم و خوش شدم کہ از شرفا غیر از آنچہ از مولوی مشتاق حسین عمل شدہ عمل دیگر نمی تواند شد و اُمید ست کہ روزے باید کہ ایشاں نتیجہ عمل نیک خود را حاصل کنند۔"

اِن الفاظ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُنیسویں صدی کے اس مدبر اعظم کے دل میں مولوی مشتاق حسین کی کس قدر عزت تھی، اور آخر کار (جیسا کہ واقعات مابعد سے معلوم ہوگا) نواب ممدوح کی پیشین گوئی کے مطابق وہ زمانہ بھی آیا، جب کہ مولوی مشتاق نے اپنے "عمل نیک" کا کافی صلہ حاصل کیا۔

معاملہ کی اہمیت اور سر سالار جنگ کا آمادہ اعانت ہونا

اِس وقت معاملات کی حالت سر سالار جنگ کے لئے

تردد افزا تھی۔ نواب امیر کبیر سے اُن کے تعلقات پہلے ہی سے شگفتہ نہ تھے، مولوی مشتاق حسین کے واقعہ نے نواب بشیر الدولہ کو بھی رنج پہنچایا اور جیسا کہ بعض پرائیویٹ تحریروں سے معلوم ہوتا ہے اُن کو سالار جنگ کے ساتھ پہلا سا حسن ظن باقی نہیں رہا۔ اُن کے نزدیک یہ علیٰحدگی ایک ناجائز کارروائی تھی چنانچہ انھوں نے باضابطہ طور پر نواب مدار المہام سے استفسار کیا کہ مولوی مشتاق حسین پر جو الزام لگایا گیا ہے کیا اس کی پوری تحقیقات کرلی گئی ہے کہ وہ الزام صحیح ہے؟ اور کیا مولوی مشتاق حسین سے اس کے متعلق جواب حاصل کرلیا گیا ہے، یا بغیر جواب حاصل کیئے اُن کو برخاست کردیا گیا؟

اِس کے علاوہ نواب امیر کبیر بھی ہوشیاری کے ساتھ معاملات کی رفتار کو دیکھ رہے تھے، اور رزیڈنٹ سے اُن کے تعلقات بڑھے ہوئے تھے، اور اُن کے احباب نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ نواب بشیر الدولہ مشتاق حسین کو مقدمہ کی پیروی کے لیئے روپیہ پر روپیہ بھیج رہے ہیں، بلکہ لوگوں نے یہاں تک شہرت دیدی تھی کہ نواب بشیر الدولہ نے اُن کو مقدمہ کی پیروی کے سلسلہ میں حیدرآباد بلایا ہے۔ مولوی مشتاق حسین کی شخصیت ایسی تھی کہ ایکطرف تو نواب امیر کبیر کو اُن کے آنے کی خبر نے متوحش کردیا تھا، دوسری طرف سر سالار جنگ کو بھی اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر وہ آگئے تو معاملات پیچیدہ صورت اختیار کرلینگے، حالانکہ یہ خبر قطعاً غلط تھی لیکن نواب بشیر الدولہ اور مولوی مشتاق حسین کے تعلقات کے لحاظ سے قرین قیاس بھی تھی؛ اس بنا پر سر سالار جنگ نے چاہا کہ مولوی مشتاق حسین کو اس ارادہ سے باز رکھیں چنانچہ انھوں نے "صیغہ راز" میں اپنے ہاتھ سے اُن کو ایک خط لکھا یہ خط حسب دستور فارسی میں ہے اردو میں اس کا ماحصل حسب ذیل ہے:۔

"اگرچہ کرنل ٹیوڈی سے ملاقات کرنے میں آپ نے غلطی کی لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ ضروری تھا کہ آخری حکم سے پہلے اس کی تحقیقات کرلی جاتی لیکن آپ کو معلوم ہے کہ بمقتضائے مصلحت کارروائی کی گئی اور یہی مصلحت اس وقت بھی مزید کارروائی اور تحقیقات سے

مانع ہے۔ اگر اُس وقت کوئی کارروائی کی گئی تو مجکو یقین ہے کہ اس سے فساد پیدا ہوگا اور نقصان آپ کی ذات تک محدود نہیں رہیگا، بلکہ معلوم نہیں کہاں تک ترقی کریگا۔ بالفعل یہ سنا جاتا ہے کہ آپ یہاں آنے والے ہیں اس ارادہ کو ملتوی کیجئے جن لوگوں کے فائدہ کے لیئے آپ آنا چاہتے ہیں اُن کو اس سے لاعلاج نقصان پہنچے گا۔"

اِس میں شک نہیں کہ آپ بغیر مدد خرچ گزر نہیں کرسکتے، اس لیئے آپ کی دوبارہ طلبی تک چار سو روپیہ سکۂ انگریزی اس جانب ماہ بماہ آپ کو بھیجتے رہینگے، آپ خاطر جمع رکھیں اُمید ہے کہ زیادہ زمانہ نہیں گزریگا کہ حالات تبدیل ہو جائینگے، اختلافات مٹ جائینگے، اور جو لوگ آپ سے رنجش رکھتے ہیں وہ باقی نہیں رہیگی اور آپ کو نعم البدل و اطمینان حاصل ہوگا اِس مدد خرچ کو "صیغۂ راز" میں رکھیئے۔"

امداد کا قلت کے ساتھ بطور قرض قبول کرنا

یہ واقعہ ہے کہ مولوی مشتاق حسین نے سر سالار جنگ کی رائے سے انگریزی ملازمت سے استعفا دے دیا تھا۔ اور یہاں کے تمام تعلقات منقطع ہو چکے، اب حیدرآباد سے بھی ایک غلط الزام کی بنا پر اُن کا تعلق منقطع ہو گیا، اور زمانہ قریب میں کسی تحقیقات کی بھی اُمید نہیں رہی اس لیئے اب درحقیقت اُن کو مشکلات کا سامنا تھا۔ یہ محض اُن کی شرافت اور خودداری تھی کہ اُنھوں نے نواب بشیر الدولہ کی ملازمت اور امداد سے انکار کر دیا تھا، لہذا یہ ضروری تھا کہ اُن کی معاش کا کوئی وسیلہ ہو۔ اِس بنا پر جب سالار جنگ نے امداد کا ارادہ ظاہر کیا تو اُنھوں نے پُرجوش الفاظ میں اس قدر شناسی اور فیاضی کا شکریہ ادا کیا، اور اِسی سلسلہ میں لکھا:۔

"سرکار (مدار المہام) کے مداخل و مخارج کا مجکو ذاتی علم ہے لیکن بغیر سرکار کی دست گیری کے فصلِ بہار کا انتظار بھی اگرچہ ناممکن نہیں لیکن دشوار ضرور ہے میں ایک شبانہ روز اس پر غور کرتا رہا، اور بغیر اس کے چارہ کار نہ دیکھا کہ عطیہ سرکار کو ہزار ہزار شکریہ کے ساتھ قبول کروں لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ سرکار کو زحمت دیکر خود فارغ البالی حاصل کروں لہذا

جو رقم سرکار نے تجویز کی اُس میں تخفیف فرمادی جاسے کیوں کہ کفایت شعاری اور جزرسی سے بھی گزر ممکن ہی اس کے علاوہ نہایت ادب سے یہ عرض ہی کہ اس طریقہ سے سرکار مجکو جو عطا فرمائیں وہ قرض متصور ہو آیندہ اگر زمانہ میری مساعدت کریگا، تو میں یہ قرض ادا کردونگا"

دستورالعمل کی ترتیب

اس زمانہ میں مولوی مشتاق حسین کا قیام زیادہ تر علی گڑھ میں رہا۔ حیدرآباد میں دفاتر کی اصلاح کا سلسلہ جاری تھا سررشتہ مال کے قواعد مرتب ہو رہے تھے۔ سرسالار جنگ نے اس مقصد کی تکمیل کے لیئے اُن کو گشتیات اور احکام مرتب کرنے کا حکم دیا۔ اور مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی اور مولوی اکرام اللہ خاں (نواب یار جنگ) نے اصلاح دفاتر کے متعلق جو دستورالعمل مرتب کیا تھا وہ بھی اصلاح و نظر ثانی کے لیئے بھیجا۔

علی گڑھ ہی میں بیٹھ کر اُنھوں نے ایک نہایت مکمل دستورالعمل مال گزاری کا مرتب کیا جو تمام اُمور پر حاوی ہی اور اس میں تمام عہدہ داروں کے فرائض و اختیارات کو بھی نہایت عمدہ طریقہ سے بیان کیا ہی۔ اس دستورالعمل سے اُن کی وسعت نظر اور دقیقہ رسی کا اندازہ ہوتا ہی کہ حیدرآباد کے صرف سہ سالہ قیام میں اُنھوں نے وہاں کے متعلق کیسی صحیح واقفیت بہم پہنچائی تھی تاہم بعض مواقع پر اُن کو مشکلات پیش آتی تھیں جن کے متعلق وہ مولوی مہدی علی خاں سے مراسلت کیا کرتے۔ اکثر اوقات سرسید بھی ان مسودات کو دیکھتے اور جہاں ضرورت سمجھتے اصلاح و ترمیم کرتے۔

الاؤنس یا تنخواہ کا مقرر ہونا

مولوی مشتاق حسین نے سرسالار جنگ کی امداد بطور قرض منظور کی تھی۔ لیکن جب یہ خدمت اُن کے متعلق کی گئی تو دوسری صورت پیدا ہو گئی یعنی سرسالار جنگ نے سکرٹریٹ سروس فنڈ سے اُن کی تنخواہ چارسو ماہوار سکہ قیصری مقرر کردی جس کی ابتدا تاریخ علنحدگی سے کی گئی ہی لہذا اب اُن کو کسی شخص کی امداد قبول کرنے کی حاجت نہیں رہی۔

اِس کے علاوہ اُن کو حیدرآباد سے پچھلی تنخواہ کا روپیہ بھی مل گیا۔ جب اُنھوں نے حیدرآباد چھوڑا تو تنخواہ کا جو روپیہ واجب الادا تھا اُس کی مقدار تاریخ علیحدگی تک چار ہزار چھتیس روپیہ دو آنہ تھی جو نواب بشیرالدولہ نے باضابطہ برآمد کرا کر اُن کو بھیجدی، اور وہ باطمینان اُس سرکاری کام کے انجام دینے میں مصروف ہو گئے جو اُن کے متعلق کیا گیا تھا۔

اِس زمانہ میں انھوں نے محمدن کالج کے دارالاقامت کی نگرانی کا کام بھی اپنے ذمہ لیا اور نہایت خوش اسلوبی سے اس کو انجام دیا جس کی تفصیل اپنے موقع پر آئیگی۔

سرسالارجنگ کی طلب پر حیدرآباد کا دوسرا سفر و ملازمت

مولوی مشتاق حسین اگرچہ سرسالارجنگ کی بدولت فکرِ معاش سے مستغنی ہو کر اپنے کام میں مصروف تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ "عہدِ گزشتہ" کی یاد نے اُن کو ایک کشاکش پنہاں میں مبتلا کر رکھا تھا۔ سرسالارجنگ جیسے مدبرِ اعظم کی صحبت، نواب بشیرالدولہ کی امیرانہ شفقت اور سب سے بڑھ کر ایک اسلامی سلطنت کی خدمت کی سعادت ایسی چیزیں نہ تھیں جن کو وہ بھول جاتے۔ (اور جیسا کہ اُن کی بعض پرائیویٹ تحریروں سے معلوم ہوتا ہے جن کو ہم اپنے موقع پر نقل کرینگے) اُن کو مذہبی حیثیت سے یقین کامل تھا کہ خدا کے یہاں ناانصافی نہیں اس لئے ایک زمانہ آئیگا جبکہ اُن کو اپنی محنت اور دیانت کا کافی صلہ ملیگا۔ چنانچہ وہ اس زمانۂ ابتلا میں ۳ سال سے زیادہ مدت تک اُس صُبحِ اُمید کا انتظار کرتے رہے جب کہ سرسالارجنگ کا ایک مسرت آمیز پیام اُن کی قسمت کو دوبارہ دولتِ آصفیہ سے وابستہ کر دے، دوسری طرف اُن کے احباب حیدرآباد میں چشم براہ تھے اور اُن کو وہاں کی ذرا ذرا سی خبریں پہنچاتے تھے۔

آخرکار اُن کی یاوری قسمت سے حیدرآباد کے حالات میں انقلاب ہوا۔ سر رچرڈ میڈ (رزیڈنٹ) جو اُن سے حُسنِ ظن نہیں رکھتے تھے تبدیل ہو گئے اور سر اسٹوارٹ بیلی کا تقرر ہوا، نواب بشیرالدولہ کے مقدمہ کا فیصلہ ہو گیا اور سرسالارجنگ کے حریف نواب امیرکبیر جو مولوی

مشتاق حسین کی بربادی کا باعث ہوئے تھے اس جہان فانی سے ہمیشہ کے لیئے رخصت ہوگئے، غرض میدان صاف ہوگیا۔

چونکہ مولوی مشتاق حسین کی برخاستگی میں اندرونی طور پر سر رچرڈ میڈ کا ہاتھ بھی کام کر چکا تھا اس لیئے سر سالار جنگ نے مصلحتاً موجودہ رزیڈنٹ سر اسٹوارٹ بیلی سے بھی اس معاملہ میں مشورہ کیا اور جب اُن کو رضامند پایا تو اب سر سالار جنگ کے لیئے اپنی غلطی کی تلافی کرنے میں کوئی امر مانع نہ رہا۔

سر سالار جنگ کو اس موقع کے حاصل ہونے سے اس قدر مسرت ہوئی اور اُن کو مولوی مشتاق حسین کے جلد حیدرآباد پہنچنے کا اتنا خیال تھا کہ طلبی کا باضابطہ حکم جاری ہونے سے پہلے ۷، جمادی الاول سنہ ۱۲۹۹ھ (۲۸ مارچ سنہ ۱۸۸۲ء) کو اُنھوں نے اپنے ہاتھ سے ایک خط مولوی مشتاق حسین کو لکھا۔

سر سالار جنگ کا خط

"بوجوہ و اسبابے کہ رسیدن آں مہرباں برائے چندے مناسب نہ بود، بسبب شدن فیصلہ نواب بشیر الدولہ بہادر مرفوع شدہ و انتظام جدید درپیش ست و آں مہربان رکن مجلس عدالت کہ بطرز انتظام جدید عنقریب مقرر خواہد شد قرار خواہند یافت، نظر براں بہ خوشنودی تمام نوشتہ شود کہ بمجرد رسیدن حکم ہذا دریں جا برسند، در بندوبست حالیہ ازاں عدالت پناہ بہ سبب تجربہ سابقہ فائدہ حاصل خواہد شد زیادہ چہ تعلم آید۔"

روانگی اور تقرر

اِس خط کے موصول ہونے پر مولوی مشتاق حسین حیدرآباد روانہ ہوگئے، اور پہلے اپنے پُرانے عہدہ پر (جس کا گزشتہ ۴ ماہ سے سر سالار جنگ نے قصداً کوئی انتظام نہیں کیا تھا) بحال کیئے گئے اور صدر المہام عدالت کو اطلاع دی گئی کہ تا انتظام جدید مولوی مشتاق حسین بدستور معتمدی کے عہدہ پر کام کرینگے۔ نواب بشیر الدولہ بہادر کو مولوی مشتاق حسین کے دوبارہ حیدرآباد پہنچنے اور اُن کے محکمہ کے معتمد مقرر ہونے سے نہایت مسرت ہوئی۔

---

[۱] یہ حال مولوی مشتاق حسین کو دوبارہ حیدرآباد پہنچنے پر معلوم ہوا۔

اِس عہدہ کے علاوہ مولوی مشتاق حسین مجلس صفائی بلدہ کے نائب میرمجلس بھی

مقرر ہوئے۔

صدر تعلقہ داری گلبرگہ

ابھی معتمدی عدالت کے عہدے پر کام کرتے اُن کو چند ماہ سے زیادہ نہیں گزرے تھے کہ نواب سر سالار جنگ نے اُن کو بارہ سو روپیہ ماہوار پر سمت جنوبی کا صدر تعلقہ دار مقرر کیا، اور اُنھوں نے ۱۳ محرم سنہ ۱۳۰۰ھ کو اپنے جدید عہدہ کا جائزہ لیا۔

جب مولوی مشتاق حسین اس جدید عہدہ کی سرفرازی پر حسب دستور سر سالار جنگ کی خدمت میں نذر پیش کرنے حاضر ہوئے تو اُنھوں نے فرمایا۔

"خیر اس وقت تو یہ نذر لیتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہو کہ میں تم کو حیدرآباد سے باہر نہیں بھیج سکتا، تمھارے گلبرگہ شریف جانے کی خبر سُن کر اس قدر لوگوں نے مُجھ سے تمھاری نسبت کہا ہو کہ میں بلدہ ہی میں تمھارے لیئے کچھ اور فکر کرتا ہوں، اور میں زیادہ تر اس سے خوش ہوا ہوں کہ زیادہ تر غریب لوگ تمھارے باہر جانے سے ناخوش ہیں۔ خیر اب تم جاؤ اور صدر تعلقہ داری کا جائزہ لو اور ایک دن کام کرکے پھر بلدہ کو واپس چلے آؤ۔"

صدر تعلقہ دار مقرر ہونے کے بعد اُنھوں نے نیابت میرمجلسی صفائی بلدہ کے عہدہ سے استعفا دیدیا۔ مجلس نے ۱۲ صفر سنہ ۱۳۰۰ھ کے اجلاس میں استعفا منظور کیا اور اُن کی حسن کارگزاری کا شکریہ ادا کیا۔

اِس جدید عہدہ پر تقرر کے وقت مدار المہام نے ظاہر کردیا تھا کہ یہ عارضی جگہ ہی چنانچہ اُن کو صرف دو ماہ کام کرنے کا موقع ملا یہ ایسا قلیل زمانہ ہی کہ اس میں کوئی نمایاں کام انجام نہیں دیا جاسکتا، لیکن اُنھوں نے اس ناکافی مدت میں بھی صوبہ کو فائدہ پہنچایا۔

دفتر کی اِصلاح و تہذیب کے علاوہ ایک بڑا کام اُنھوں نے یہ کیا کہ ضلع لنگسگور میں مفسد اور بدمعاش لوگوں نے جو غارت گری برپا کر رکھی تھی اس کے استیصال کا انتظام کیا[1]،

---

[1] چنانچہ اس زمانہ کے تین برس بعد ایک گشتی میں جو حکام پولس کے نام جاری کی گئی ہو وہ لکھتے ہیں:

(صفحہ آیندہ)

کمزور طبع اور ناقابل عہدہ داروں کو ہٹایا اور صدر المہام کو توالی کو لکھا۔

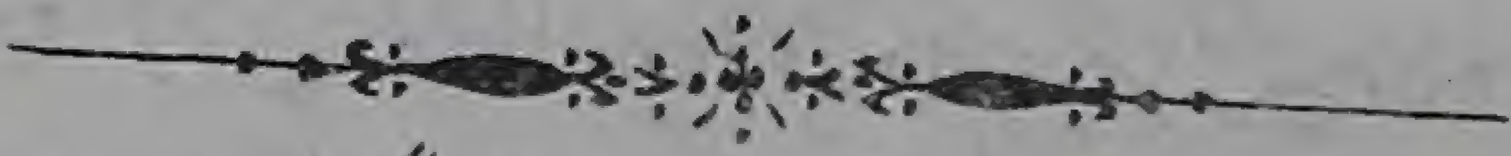
"حقیقت نفس لامر این ست کہ بے احتیاطی یا ناقابلیت و عدم ادائے فرائض عہدہ داران کوتوالی ضلع، حالت ضلع را باین نوبت رسانیدہ است۔"

غرض اس قلیل مدت میں جو کچھ اصلاح وہ کر سکتے تھے اس میں تامل نہیں کیا۔

معتمد عدالت اور کوتوالی

گلبرگہ کی صدر تعلقہ داری پر صرف دو ماہ کا زمانہ گزرا تھا کہ سر سالار جنگ نے جو اس وقت اعلیٰ حضرت کے ہمرکاب اورنگ آباد کے دورہ پر تھے اپنا ارادہ جو مولوی مشتاق حسین کو خاص حیدر آباد میں رکھنے کے متعلق تھا پورا کیا، یعنی جنوری ۱۸۸۳ء؁ ربیع الاول ۱۳۰۰ھ؁ میں اُن کو خاص اپنی ماتحت معتمد عدالت و کوتوالی کے عہدہ پر سرافراز کیا، اور یہ حکم بذریعہ تار بھیجا کہ وہ مدار المہام کی واپسی تک صدر تعلقہ داری گلبرگہ کی خدمت بھی انجام دیتے رہیں۔

چنانچہ مولوی مشتاق حسین نے اس عہدہ کا چارج لیا، اور اب اُن کو اصلاح کا ایک قیمتی موقع ہاتھ آیا، لیکن ابھی اُن کو کام کرنے کے لئے پندرہ روز کا بھی موقع نہیں ملا تھا کہ حیدر آباد کی تاریخ میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہوا، جس نے تمام ملک کو متزلزل کر دیا۔



(بقیہ نوٹ ص ۶۴) تین برس کے قریب عرصہ ہوتا ہے جب کہ ضلع لنگسگور کے پہاڑوں میں ان بدمعاشوں نے زیادہ شورش کی تھی جو کہ رائچور کے محبس سے فرار ہو گئے تھے، اور اس بات کا شک تھا کہ دیہات کے لوگ ان کو کچھ مدد دیتے ہیں یا اُن کو پکڑوا دینے میں کوئی خوف کرتے ہیں اس وقت میں سمت جنوبی کا صدر تعلقہ دار تھا اور میں نے تمام وہاں کے زمینداروں کو اپنے مالی اختیارات سے ایک اشتہار کے ذریعہ اطلاع دی کہ اگر کسی طرف سے بھی اس میں غفلت ہوئی یا ثابت ہوا کہ کسی نے مجرموں کو کچھ مدد دی ہے یا پولیس کو مدد نہیں دی تو اس کی تمام رسوم ضبط کی جاویں گی۔ نتیجہ یہ تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں جسکی گرفتاری منظور تھی ہر ایک متنفس گرفتار ہو گیا۔"

سر سالار جنگ کی وفات

ایک نازک زمانہ

اب وہ زمانہ آگیا تھا کہ نواب مختار الملک سر سالار جنگ کی ۳۰ سالہ جدوجہد کے خوشگوار نتائج ظاہر ہوں اور ملک اُن کی مساعی اصلاح کے ثمرہ سے متمتع ہو۔ اس وقت نواب موصوف پورے جوش اور آزادی کے ساتھ ملک کی خدمت میں مصروف تھے، اور وہ پُر اُمید زمانہ قریب آرہا تھا جب کہ اعلیٰ حضرت زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے صائب الرائے اور وفادار مدار المہام کی ۳۰ سالہ خدمات کا صلہ عطا فرمائیں، اور ملک میں مزید اصلاحات کا آغاز ہو، لیکن کارکنانِ قضا و قدر دوسرے کام میں مصروف تھے۔

۸ فروری ۱۸۸۳ء (۲۹ ربیع الاول ۱۳۰۰ھ) کی شام کو ہندوستان کے اس نامور مدبر نے صرف ۵۶ سال کی عمر میں دفعتاً وفات پائی، موت کا سبب ہیضہ قرار دیا گیا۔ لیکن اصلی سبب آج تک معلوم نہ ہو سکا، لوگوں نے مختلف خیالات ظاہر کئے، لیکن معاملہ بدستور تاریکی میں رہا۔

سر سالار جنگ کی حسرت ناک وفات نے حیدر آباد میں جو انقلاب پیدا کیا، ارکانِ مجلس مال گزاری نے اپنی ایک یادداشت میں اُس کو حسب ذیل الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔

"ہر ایک چیز ترقی کی طرف مائل تھی اور ہر ایک کام کرنے والا یہی چاہتا تھا کہ اپنے فرائض کو اس پیمانہ سے جو سرکار نے اس کے لیے مقرر کیا ہے بہت زیادہ وسعت کے ساتھ بجالاوے کہ دفعتاً ۲۹ ربیع الاول ۱۳۰۰ھ کی شام کی تاریکی نے ہر ایک کارگزار کو اپنے کام سے روک دیا، نواب مدار المہام مرحوم کی نہایت افسوسناک اور بے وقت اور ناگہاں موت نے

حیدر آباد میں دفعتاً ایک نئی دنیا قائم کردی چند روز کی عام حریت اور سکوت کے بعد جب لوگ چونکے تو اُن کو معلوم ہوا کہ وہ آفتاب جس کی روشنی میں ہر ایک شخص اپنا اپنا کام اطمینان کے ساتھ انجام دیتا تھا، وہ غروب ہو چکا ہے، اور زمانہ جو چند روز پہلے تک برابر ترقی کر رہا تھا اب بے نظیر سرعت اور تیزی کے ساتھ پچھلے پاؤں لوٹ رہا ہے، اور اس لیول پر قرار پکڑتا جاتا ہے جو مہاراجہ چندو لال کے عہد میں اپنے واسطے پسند کی تھی۔ بہت ہی قلیل عرصہ میں ہوا کا رُخ اِدھر سے اُدھر ہو گیا، تمام انتظامی خوبیاں جن پر چند روز پیشتر تک فخر کیا جاتا تھا اُن کا کوئی پرسانِ حال نہ رہا۔"

غرض ایک مدار المہام کی موت اگرچہ بظاہر کوئی اہم واقعہ نہیں، لیکن حیدر آباد کے مخصوص حالات اور سر سالار جنگ کی شخصیت کے لحاظ سے یہ واقعہ نہایت اہم تھا، اور اس کی اہمیت کو محسوس بھی کیا گیا، اور اس تابناک اور زرّیں عہد کے بعد حیدر آباد کی پولیٹکل تاریخ نے ایک دوسرا رنگ بدلا۔ ایک طرف تو رزیڈنسی کے ارکان سیاست "خاص تدابیر" پر غور و خوض کر رہے تھے دوسری طرف اُمرائے سلطنت پارٹی فیلنگ کے اثر سے واقعات کا رُخ بدلنے میں مصروف تھے۔ ہر صاحب قوت ہستی کے دماغ میں حصول اقتدار یا وزارت کا سودا تھا، جس کے لئے رقیبانہ کشمکش کی ابتداء ہو چکی تھی۔ عام عہدہ داروں اور ارکان دولت بھی غافل نہ تھے، شخصی اغراض و مقاصد اور حُبِّ جاہ نے ہر شخص میں ایک جنبش پیدا کر دی تھی، چونکہ اعلیٰ حضرت آصف جاہ سادس کے حصول اختیارات کا زمانہ قریب تھا اس لئے ہر بوالہوس کی یہ کوشش تھی کہ نوجوان فرماں روا کے دربار میں رسوخ و اقتدار حاصل کرے۔

لیکن با ایں ہمہ ملک بہی خواہان حکومت سے خالی نہ تھا، ایک مختصر مگر سنجیدہ جماعت ایسی بھی موجود تھی جو فکر و تردد سے واقعات کا مطالعہ کر رہی تھی اس کو اندیشہ تھا کہ سر سالار جنگ نے جن اصلاحات کا آغاز کیا تھا کہیں اُن کا خاتمہ نہ ہو جائے، اور یہ اندیشہ کچھ بیجا نہ تھا کیوں کہ شخصی سلطنتوں میں جہاں صرف وزیر اعظم یا بادشاہ کا اقتدار ہوتا ہے، انقلاب حکومت سے ہمیشہ

حالات میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے کون کہہ سکتا تھا کہ انتظام مملکت آئندہ جن لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا وہ کس خیال کے ہونگے۔ اس کے علاوہ اس جماعت کو یہ تردد بھی تھا کہ اعلیٰ حضرت ابھی نوجوان ہیں اس لیئے ایک صائب الرائے اور مستقل مزاج وزیر کی ضرورت ہے، جو نوجوان فرمانروا کا وفادار مشیر اور اصلاحات کا حامی ہو۔ لیکن تمام ملک میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو مجموعی حیثیت کے ان اوصاف سے ممتاز ہو۔

مولوی مشتاق حسین بھی سلطنت کی ہوا خواہ جماعت سے تعلق رکھتے تھے، ان کے دل میں اس اسلامی سلطنت کی خدمت کا ولولہ تھا لیکن سر سالار جنگ کی حوصلہ شکن وفات نے ان کو امید و یاس کی کشمکش میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ برابر غور کرتے تھے کہ اس نازک موقع پر وہ سلطنت کی کیا خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

ابھی تک مولوی مشتاق حسین کو سیاسیات کا عمیق تجربہ نہ تھا۔ حیدرآباد میں ان کا تعلق زیادہ تر صیغہ عدالت سے رہا تھا، ہندوستان میں بھی ان کو کوئی پولیٹکل تجربہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے ملک کو عام طور پر مرعوب اور قناعت پسند بنا دیا تھا، اور شخصی سلطنت کے دیرینہ اثر سے اہل ملک جدید قسم کی سیاسی جدّوجہد سے ناآشنا اور رموز سیاست سے بیگانہ تھے، ہندوستانی والیان ملک پر برطانیہ کا جو پولیٹکل اقتدار تھا، اس کو مربیانہ شفقت اور مداخلت کو ہمدردی سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ مولوی مشتاق حسین بھی بربنائے فطرت سلیمہ برطانوی ڈپلومیسی سے ناآشنا تھے، لہذا اس نازک موقع پر ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے سامنے ایک یادداشت انتظام مملکت کے متعلق پیش کریں چنانچہ اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد انھوں نے ۱۶ر فروری ۱۸۸۳ء کو ایک یادداشت مرتب کی۔

یادداشت متعلّق انتظامِ ریاست

اس یادداشت میں سب سے پہلے سر سالار جنگ کی وفات پر اظہار افسوس کے بعد انتظامات

کی تکمیل اور اصلاحات کی ضرورت پر زور دیا ہے، جیسا کہ وہ لکھتے ہیں :-

"نواب صاحب کی وفات جو ہر ایک آئندہ وقت میں بھی ریاست کے لئے نہایت افسوس ناک ہوتی، اس وقت میں اور بھی بے انتہا حسرت اور رنج کے قابل ہے جب کہ ایک طرف حضرت بندگان عالی متعالی عنقریب عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کو تھے، جو دنیاوی مقاصد میں سے مرحوم کا سب سے اعلیٰ مقصد تھا اور دوسری طرف ہر ایک صیغہ اور سر رشتہ کے وہ ملکی انتظامات اپنی اخیر اصلاح کے ذریعہ سے مکمل ہوا چاہتے تھے جن کو تیس برس کی متصل اور بے تکان اور نہایت پر استقلال اور عاشقانہ محنت کے ذریعہ سے مرحوم نے اس حالت تک پہنچا دیا تھا۔

ملکی انتظامات کی یہ اخیر اصلاح اگر شروع نہ ہوئی ہوتی تو آئندہ کی گورنمنٹ کا کام شاید صرف اسقدر رہ جاتا تھا کہ وہ اس وقت تک جب تک کہ حضرت بندگان عالی انتظامات کو اپنے ہاتھ میں لیں مرحوم کے نقش قدم پر چلتی رہے لیکن چونکہ اب وہ انتظامات شروع ہو چکے ہیں وہ آسانی باقی نہیں رہی ہے، اور اب ضرور ایک ایسی گورنمنٹ کی حاجت ہے جو ان انتظامات کو جو کہ ملک کے فائدہ کے لئے اختیار کئے جاتے تھے مکمل کرے اور یہ خیال کہ ایسے بڑے انتظام آیندہ کسی فرصت کے وقت کے لئے اٹھا رکھے جاویں اس ترقی کی ایک بڑی روک کا باعث ہوگا جس میں سے ملک گزر رہا ہے، اور اگر ایک دفعہ وہ ترقی روک دی گئی تو ملک کو سخت نقصان پہنچیگا اور ترقی و تنزل کے درمیان کوئی ایسا فاصلہ نہیں ہے جس کو ایک ٹھہری ہوئی حالت سے تعبیر کر سکیں کوئی ترقی جب رک جاوے تو اسی وقت سے تنزل کا آغاز سمجھا جاتا ہے اور تنزل جب کہ روک دیا جاتا ہے تو وہ آئندہ ترقیوں کی ایک علامت ہوتی ہے، پس اگر اس وقت میں کوئی ایسی علامت ظاہر کی جاوے جس سے عارضی طور پر ترقیات کی روک ہوتی ہو تو واقع میں وہ کوئی عارضی روک نہ ہوگی، بلکہ درحقیقت وہ ایک علامت ملک کے تنزل کی سمجھنی چاہیئے۔"

اس تمہید کے بعد اُنھوں نے اصلاح طلب امور پر تفصیل سے بحث کی ہے جس کا ماحصل نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

(۱) چونکہ اب مجلس مالگزاری (بورڈ آف ریونیو) قایم ہو چکی ہے اور صدر المہام مال گزاری کے اکثر اختیارات اس کو منتقل ہو چکے ہیں لہذا صدر المہام کے اختیارات، طریق عمل، اور مدار المہام سے اُس کے تعلقات کی نوعیت کے متعلق فیصلہ کیا جائے، نیز اس دستور العمل کو مکمل کیا جائے جس کی ترتیب ہر صیغہ کے صدر المہام اور مدار المہام کے تعلقات کو متعین کرنے کی غرض سے شروع ہو چکی تھی۔

(۲) مجلس عالیہ عدالت کو ایک مکمل ہائی کورٹ کی قوت دینے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا اور چند قابل اشخاص نے جن میں صدر المہام عدالت اور بعض اراکین مجلس عالیہ بھی شامل تھے اس کا دستور العمل مرتب کر لیا تھا لہذا صدر المہام عدالت کے اختیارات کا فیصلہ بھی ضروری ہے جن کے اختیارات کا اکثر حصہ مجلس عالیہ کو منتقل ہو چکا ہے۔

(۳) اِس کے بعد اسی سلسلہ میں عدالت کے موجودہ طریق انتظام پر مفصل بحث کر کے مجلس عالیہ (ہائی کورٹ) کے محدود الاختیار ہونے کی مضرت بیان کی ہے، مثلاً مجلس کو یہ اختیار نہیں ہے کہ کسی مقدمہ کو ایک ماتحت محکمہ سے دوسرے ماتحت محکمہ میں منتقل کر سکے، اس کے بعد اضافہ اختیارات کی ضرورت پر بحث کر کے یہ صلاح دی ہے کہ علاوہ جوڈیشل اختیارات کے اگزیکٹیو حصہ بھی جس قدر کہ ایک ہائی کورٹ کی شان کے مناسب ہے، مجلس سے متعلق کر دیا جائے۔

(۴) بعد ازاں اُنھوں نے مجلس عالیہ کے عہدہ میر مجلس اور ارکان کی تعداد اور تنخواہوں کی مقدار پر بحث کی ہے، اور اعلیٰ عہدہ داروں کو مقرر کر کے مجلس کی حیثیت کو ترقی دینے کا مشورہ دیا ہے۔

(۵) انتظام عدالت کے سلسلہ میں اُنھوں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ مال اور فوجداری کے

حکام سے دیوانی کا کام علیحدہ کرلیا جائے۔

(۶) پولیس کے انتظام پر بحث کرکے انتظام کا جدید طریقہ بیان کیا ہے۔

(۷) اس کے بعد اُنھوں نے ایک ایسی تجویز پیش کی ہے، جو اُن کی انصاف طبیعت کا خاص حصہ اور فراخ حوصلگی کا ثبوت ہے، یعنی ریاست کی رعایا کو ملکی خدمات کے لیئے تیار کرنا، اور کام کا تجربہ حاصل کرنے کے لیئے اُمیدواروں کو سرکاری مصارف پر انگریزی علاقہ میں بھیجنا۔ اس تجویز کے آخر میں وہ نہایت حسرت وافسوس کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ اُمیدواروں کے انتخاب کے لیئے مرحوم نے ایک مجلس قایم کی تھی جس کی رکنیت کا اعزاز مجکو بھی حاصل تھا لیکن جس جمعہ کو مرحوم کے آئینہ خانہ میں اس مجلس کا پہلا اجلاس منعقد ہونے کو تھا ملک کی بدقسمتی سے اُسی روز مرحوم کا جنازہ اُٹھایا گیا۔

مذکورۂ بالا اصلاحات پر بحث کرنے کے بعد اُنھوں نے نہایت مدلل اور پرزور طریقہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ حیدرآباد میں آئندہ جو گورنمنٹ قایم ہو وہ ایسی گورنمنٹ ہونی چاہیئے جو گزشتہ گورنمنٹ کے ساتھ پوری ہمدردی رکھتی ہو، اور ملک کو بھی اس پر پورا اعتبار ہو اور اس اُصول کی ماتحت اُنھوں نے یہ صلاح دی ہے کہ مدارالمہام مرحوم کے فرزند اس گورنمنٹ میں شریک کیئے جائیں جو اپنی قابلیت موروثی استحقاق، اور حیدرآباد کی پبلک کے اعتماد اور اُمید کے مطابق بخوبی اسکے اہل ہیں اس بنا پر اُنھوں نے یہ تجویز کی ہے کہ نواب مرحوم کے فرزند اکبر نواب میر لایق علی خاں بہادر قایم مقام مدارالمہام مقرر کیئے جائیں اور چند اُمرائے سلطنت جو اپنے مرتبہ اور تجربہ کے لحاظ سے اس بڑی ذمہ داری کے لایق ہوں، اور گزشتہ گورنمنٹ کے کام اور انتظام سے ہمدردی رکھتے ہوں مدارالمہام کے ساتھ اُس زمانہ تک کے لیئے شریک کیئے جائیں جب کہ اعلیٰ حضرت عنانِ حکومت خود اپنے ہاتھ میں لیں، اس تجویز کے سلسلہ میں اُنھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ جدید مدارالمہام کے کام کا طریقہ اور اختیارات کی نوعیت کیا ہوگی تاکہ اُن کی کمسنی اور ناتجربہ کاری سے کوئی دشواری نہ واقع ہو۔

نواب مرحوم کے دوسرے فرزند نواب سعادت علی خاں کے لیئے اُنھوں نے یہ تجویز کیا ہی کہ اُن کو نواب مکرم الدولہ کے بجائے (جو اپنی طویل علالت کی وجہ سے کام کرنے سے قاصر ہیں) صدر المہام مال گزاری کے عہدہ پر مقرر کیا جائے، اس موقع پر وہ اس بدگمانی کا بھی رد کرتے ہیں کہ ایک خاندان کو سلطنت کے اس قدر اختیارات دے دینا کہاں تک مناسب ہوگا؟ وہ کہتے ہیں کہ جس حالت میں پریم منسٹر کی ایک پوری اور آزاد قوت اور صدر المہام مال گزاری کی پوری قوت مع بہت سے وسیع اقتدارات کے مرحوم کے خاندان میں تھی تو مجوزہ صورت میں ان عہدوں کا نہایت محدود حالت اور بہت سی شرکتوں اور نگرانیوں میں ایک خاندان میں رہنا کسی طرح قابل توجہ امر نہیں ہی، اس کے ساتھ ہی اُنھوں نے یہ اُمید بھی ظاہر کی ہی کہ کچھ مدت بعد نواب مرحوم کے دونوں فرزند نہایت قابل اور ہوشیار ثابت ہونگے، آخر میں وہ اپنی یادداشت کو ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں :-

"میں پھر اس بات کو بیان کرنے کی جرارت کرتا ہوں کہ نواب مدارالمہام کے فرزندوں کی یہ سرافرازی علی العموم ملک کے لیئے خوشی اور اطمینان کا موجب ہوگی اور تمام ملک برٹش گورنمنٹ کا بدل ممنون اور اس کے انصاف کا بدل معترف ہوگا، اور اس کے ذریعہ سے برٹش گورنمنٹ ایک ایسی گورنمنٹ قایم کرنے پر قادر ہوسکیگی جو خواہ بلحاظ اس ریاست کے قدیم آئین اور رواج خواہ بلحاظ ملک کی موجودہ حالت اور اہلِ ملک کی عام طبایع کے، اور خواہ بلحاظ ان ضرورتوں کے جن کا آیندہ گورنمنٹ کو انجام دینا ناگزیر ہی، ہر ایک گورنمنٹ سے جس پر اس وقت خیال اور ذہن منتقل ہوسکتا ہی بہتر ہوگی"۔

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس یادداشت کا کیا انجام ہوا؟ البتہ سر سالار جنگ کے بعد جو جدید انتظامات ہوئے اُن کی تفصیل واقعات کے سلسلہ سے معلوم ہوگی۔

جدید انتظام | چونکہ ابھی تک عنانِ حکومت اعلیحضرت کے ہاتھ میں نہ تھی، اس لیئے گورنمنٹ ہند کو سر سالار جنگ کی وفات کے بعد از سر نو کسی خاص انتظام کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ لارڈ رپن نے سر اسٹوارٹ

بیلی ممبر سپریم کونسل گورنمنٹ ہند کو جو اس سے پہلے حیدر آباد کے رزیڈنٹ رہ چکے تھے حیدر آباد روانہ کیا تاکہ وہ رزیڈنٹ سے مشورہ کر کے موجودہ حالت کے مطابق کوئی مناسب انتظام کریں چنانچہ اُنھوں نے حیدر آباد آکر تمام معاملات پر غور کیا، اور اُن کی تجویز کے مطابق لارڈ رپن کی گورنمنٹ نے اعلیٰحضرت کی تخت نشینی کے زمانہ تک کے لئے ایک کونسل آف ریجنسی قایم کی، جس کے صدر خود اعلیٰ حضرت اور اراکین، نواب لائق علی خاں بہادر (فرزند اکبر سر سالار جنگ) راجہ نرندر پرشاد، نواب شمس الامرا خورشید جاہ اور نواب بشیر الدولہ مقرر کیے گئے۔ اوّل الذکر دو رکن بطور مدار المہام تجویز ہوئے جن کی رائے اور تجویز سے احکام جاری ہونگے۔ کوئی ایک شخص کامل الاختیار مدار المہام نہیں تھا۔ مگر سر اسٹوارٹ نے یہ اُمید ظاہر کی کہ میر لایق علی خاں اس زمانہ میں اپنے کو مدار المہامی کے عہدہ کے لائق ثابت کرینگے، تاکہ اعلیٰ حضرت بر وقت مسند نشینی اُن کی کارگزاری اور اُن کے پدر بزرگوار کی قیمتی خدمات کے صلہ میں اُن کو خلعتِ وزارت مرحمت فرمائیں۔ اس تجویز میں یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ ارکان اپنی مجموعی رائے سے اعلیٰ حضرت اور رزیڈنٹ کو مطلع کیا کریں، نیز یہ ہدایت کی گئی کہ اگر نواب بشیر الدولہ بہادر کونسل کی رکنیت قبول کریں تو عہدۂ صدر المہامی سے استعفا دے دیں۔ غرض ۲۲ فروری ۱۸۸۳ء سے اس انتظام کا اعلان کیا گیا۔

مندرجۂ بالا تجویز کے مطابق کونسل قایم ہوگئی، لیکن یہ انتظام کامیاب نہ رہا۔ ملک میں عام طور پر ابتری پھیلی ہوئی تھی، اراکین کونسل میں اتحاد عمل نہ تھا، راجہ نرندر پرشاد (پیشکار) کا اثر زیادہ تھا اور نواب لائق علی خاں حتی الامکان علیحدہ رکھے جاتے تھے۔ رزیڈنٹ کی مداخلت روز افزوں اور غیر محدود تھی، اور اس کا کوئی علاج نہ تھا، باہمی ناچاقی اور شخصی اغراض کا جذبہ ہمیشہ بیرونی مداخلت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ غرض ایک سال تک یہ بدنظمی قایم رہی اور مولوی مشتاق حسین جن اصلاحات کے متمنی تھے اُن کا نفاذ نہ ہوسکا۔ البتہ یہ امر قریباً متیقن ہوچکا تھا کہ اعلیٰحضرت کی مسند نشینی کے موقع پر نواب لائق علی خاں خدمت مدار المہامی پر سرافراز ہونگے۔

مولوی مشتاق حسین اس انقلاب کے زمانہ میں بھی بدستور اپنے معزز عہدے معتمدی عدالت

اور کوتوالی پر کام کرتے رہے، البتہ رجب ۱۳۰۰ھ میں سر سالار جنگ مرحوم کی ایک پرانی تجویز کے مطابق صیغہ کوتوالی ان سے علٰحدہ کر کے سردار دلیر جنگ کے متعلق کیا گیا، اس لیئے اب اُن کے عہد کا نام معتمد علاقہ عدالت قرار پایا، چند روز بعد ۱۳۰۰ھ میں نواب بشیر الدولہ نے بوجہ رکنیت کونسل عہدہ صدر المہامی سے استعفا دیدیا تو ان کا محکمہ بھی ٹوٹ کر معتمد علاقہ عدالت کے محکمہ میں ضم ہو گیا۔

ایک دوسری تجویز

جدید حالات اور مستقبل میں پیش آنے والے خطرات سے متاثر ہو کر مولوی مشتاق حسین نے اِسی زمانہ میں ایک دوسری تجویز پیش کی کہ دو کونسلیں ایک حضوری اور دوسری دیوانی کے نام سے قایم کی جائیں اوّل الذکر اُمرائے بلدہ سے مرکب ہو، اور دوسری معتمدین اور اعلیٰ عہدہ داروں سے، اس تجویز کا مقصد اُن کے الفاظ میں یہ تھا کہ:۔

"پہلی کونسل اس بات کی ضمانت ہوگی کہ حضور کی کم عمری ملک کے لیئے کچھ مضر نہ ہوگی اور دوسری ایک ضمانت اِس بات کی ہوگی کہ مدار المہام کی کمسنی انتظام کے لیئے مُضر نہ ہوگی۔"

اُنھوں نے اس تجویز کا تذکرہ بعض بہی خواہ عہدہ داران ریاست سے بھی کیا تھا، جن میں اعلیٰحضرت کے لائق اُستاد کپتان کلارک بھی شامل ہیں، اِن کا خیال تھا کہ جب اعلیٰحضرت اور نواب میر لائق علی خاں، لارڈ رپن کی ملاقات کے لیئے کلکتہ جائیں تو اپنی طرف سے آیندہ انتظامات کے متعلق ایک مختصر اسکیم اس اُصول کے مطابق پیش کریں لیکن یہ تجویز بعض ارکان ریاست کی مخالفت کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی، بلکہ اس کی وجہ سے بعض اقتدار پسند عہدہ داران سے ناراض ہو گئے، جس کا تذکرہ مناسب موقع پر آئیگا۔

حیدر آباد کا دور جدید

حیدرآباد کا دورِ جدید

اعلیٰ حضرت کا سفر کلکتہ اور تخت نشینی، سالار جنگ ثانی کا دورِ حکومت، انتظامی تغیرات

آخر دسمبر ۱۸۸۳ء میں اعلیٰ حضرت نے کلکتہ کا سفر کیا۔ علاوہ نواب میر لائق علی خاں کے متعدد اُمرا، و اعیان سلطنت ہم رکاب تھے۔ لارڈ رپن سے ملاقات ہوئی اور کلکتہ میں عام طور پر نہایت گرم جوشی کا اظہار کیا گیا، اور تخت نشینی کے متعلق جملہ مراتب طے ہو گئے، جس کی اطلاع رزیڈنٹ نے کلکتہ سے بذریعہ تار نواب بشیر الدولہ کو دی، اور اُنھوں نے ۲۰ صفر ۱۳۰۱ھ کو جریدہ اعلامیہ کے ذریعہ سے تمام ملک میں اعلان شائع کر دیا۔

یہ طے ہو گیا تھا کہ لارڈ رپن خود حیدرآباد آکر اس مبارک رسم کو ادا کریں گے، چنانچہ لارڈ رپن سب سے پہلے وائسرائے ہیں جو حیدرآباد آئے، جہاں شاندار طریقہ پر آپ کا استقبال کیا گیا، اور ۵ فروری ۱۸۸۴ء (۷ ربیع الثانی ۱۳۰۱ھ) کو نہایت تزک و احتشام کے ساتھ دربار منعقد ہوا اور لارڈ رپن کی ایک پُر معنیٰ اور حوصلہ افزا تقریر کے بعد اعلیٰ حضرت کی تخت نشینی کا اعلان کیا گیا، اور دربار بخیر و خوبی ختم ہوا۔

تقرر مدار المہام جدید اسی روز سہ پہر کو اعلیٰ حضرت نے نواب میر لائق علی خاں کو خلعت خاصہ ہفت رقم اور منصب وزارت سے سرفراز فرمایا اور سالار جنگ، منیر الدولہ کا خطاب عطا کیا، اور اُنھوں نے ۱۲ ربیع الثانی کو اپنے جلیل القدر عہدہ کا جائزہ لیا، نیز اعلیٰ حضرت نظام اور مدار المہام نے غیر معمولی اعلانات کے ذریعہ سے رعایا اور حکام کو آئندہ طرز حکومت کی عمدگی کے متعلق اطمینان دلایا۔ نوجوان مدار المہام پورے اختیارات کے ساتھ مہمات سلطنت میں مشغول ہو گئے اور مولوی مہدی علی خاں کو اُنھوں نے اپنا مشیر بنایا۔ نیز ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۰۱ھ کو ایک اعلان کے ذریعہ سے آئندہ

انتظامات کے متعلق ایک مفصل اسکیم شائع کی۔

رکنیت مجلس مال گزاری

سالار جنگ ثانی کے عہد مدار المہامی پر ابھی صرف تین ہفتہ کا زمانہ گزرا تھا کہ مولوی مشتاق حسین بجائے مولوی نذیر احمد دہلوی کے رکن مجلس مال گزاری (بورڈ آف ریونیو) مقرر کیے گئے اور ۲ رجمادی الاول ۱۳۰۱ھ کو انھوں نے اپنے جدید عہدہ کا جائزہ مولوی نذیر احمد سے لیا۔ علاوہ مولوی مشتاق حسین کے اس مجلس کے دو رکن اور بھی تھے۔

مجلس مال گزاری ذی الحجہ ۱۲۹۹ھ میں سر سالار جنگ کی وفات سے چند ماہ قبل قائم ہو چکی تھی سر سالار جنگ اوّل نے اس کے قیام کا حسب ذیل الفاظ میں اعلان کیا تھا۔

"بجہت انتظام امورات مال گزاری مجلسے جداگانہ کہ از چند ارکان مرکب و از تمام محکمہ جات مال بالاتر خواہد بود بلقب مجلس مال گزاری سرکار عالی مقرر شد و انتظام امور مال گزاری و نگرانی محکمہ جات مال و تقرر و تبدل و انتخاب بعض افسران بحیطۂ اختیار آں مجلس دادہ شود۔"

غرض اس مجلس کے ماتحت مختلف صیغے اور محکمے تھے، لیکن مجلس کا بڑا کام، تمام ممالک محروسہ کا انتظام اراضی، انضباط قواعد مال گزاری و آبکاری اور متعلقات مال تھا، چنانچہ پہلی سہ ماہی میں مجلس کی توجہ مال گزاری کی ترقی رعایا کی فلاح اور جدید تجاویز و اصلاحات پر مبذول تھی مگر مدار المہام کی وفات کے بعد راجہ نرندر پرشاد کے عہد میں مجلس کا کام ابتر ہو گیا، جیسا کہ خود ارکان مجلس نے اپنی ایک یادداشت موسومہ سالار جنگ ثانی میں لکھا ہے۔ لیکن جدید مدار المہام نے سب سے پہلے اس طرف توجہ کی اور غالباً مولوی مہدی علی خاں کی تحریک سے (جو بعض مصالح کے لحاظ سے مولوی مشتاق حسین کو مجلس میں داخل کرانا چاہتے تھے) ان کو رکن مال گزاری کے عہدہ پر مقرر کیا۔ اگرچہ آخر میں اس مجلس کے معاملات کے سلسلہ میں ان سے سخت اختلاف پیدا ہو گیا جس کا ذکر مناسب موقع پر آئیگا۔

مولوی مشتاق حسین کا دورہ

مجلس مال گزاری کا رکن مقرر ہونے کے بعد مولوی مشتاق حسین نے ملک

کی عام حالت کا بچشم خود معائنہ کرنے اور صحیح واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے تلنگانہ کے دورہ کا عزم کیا۔ اگرچہ موسم دورہ کے لیئے ناموزوں اور تکلیف دہ تھا لیکن اُنھوں نے مشکلات کا مطلق لحاظ نہ کیا اور دورہ کے لیئے تیار ہوگئے۔

۹ رجب ۱۳۰۱ھ (۲۹ خورداد ۱۲۹۳ف) کو دورہ پر روانہ ہوئے اور ۸ رمضان (۲۳۔امرداد) کو واپس آئے اس ۵۸ دن (قریباً دوماہ) کے دورہ میں اُنھوں نے ۵۵ دن اضلاع ناگر کرنول اور نلگنڈہ میں اور ۳ دن ضلع اطراف بلدہ کے علاقہ میں صرف کیئے اس دورہ میں اُن کو ۳۱ مقام اور ۲۷ کوچ کرنے پڑے، کل مسافت دورہ کی ۳۵۸ میل ہوئی گویا ۱۳ میل یومیہ کا اوسط رہا، اس میں وہ مسافت شامل نہیں جو قیام کی حالت میں مختلف تالابوں وغیرہ کے دیکھنے میں طے ہوئی۔

۹ تعلقات کے مستقر پر اُن کا گزر ہوا جہاں اُنھوں نے مختلف کارروائیوں اور بعض دفاتر کو دیکھا، بعض اضلاع میں حسابات سررشتہ انعام اور آبپاشی کے کاموں کا معائنہ کیا، ۱۷ دیہات کے کاغذات ملاحظہ کیئے اور ۳۳۶ اسامیوں کے کاغذات دیکھ کر اُن کے ذمہ جو مطالبہ تھا اُسکی اور وصول باقی کی تصدیق کی۔ اکثر حالتوں میں حسابات کو صحیح اور قابل اطمینان پایا، جہاں کوئی بے ضابطہ کارروائی اُن کی نظر سے گزری اُس پر فوراً توجہ کر کے معقول تدارک کیا، اور جرمانہ یا موقوفی کی سزائیں دیں، دوماہ کے دورہ اور تحقیقات کے بعد اُن کو اس کا اطمینان ہوگیا کہ جس حصہ ملک میں اُنھوں نے دورہ کیا ہے، وہاں مال گزاری کا انتظام اس امر خاص میں کہ جسقدر روپیہ اسامیوں سے وصول ہوتا ہے وہ سرکار میں داخل ہوجاتا ہے۔ قابل اطمینان ہے۔

دورہ میں زیادہ تر کونسے اُمور پر توجہ کی گئی

مولوی مشتاق حسین کو دورہ کے لیے بہت کم وقت ملا تھا اور کام زیادہ تھا، لہذا اُنھوں نے دفتری تنقیحات اور خفیف امور میں بہت کم اپنا وقت صرف کیا اور یہ کام زیادہ تر اپنے عملہ پر چھوڑ دیا اور اُن کی کیفیت کے ملاحظہ کے بعد مناسب احکام جاری کیئے جس کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ میں اس میں اپنی کوئی خاص کارگزاری نہیں سمجھتا۔ لیکن

حقیقت یہ ہی کہ انھوں نے ان خفیف اُمور کو بھی بالکل نظر انداز نہیں کیا بلکہ دفاتر کے معائنہ کے سلسلہ میں اکثر کاغذات دیکھے اور اُن پر طویل یادداشتیں اور احکام اپنے قلم سے لکھے مگر جیسا کہ خود وہ لکھتے ہیں، دورہ میں اُن کی توجّہ زیادہ تر حسب ذیل اُمور کی طرف تھی۔

(۱) اوّل وہ اُمور جو رعایا کے حق میں تکلیف دہ تھے۔

(۲) دوم جو سرکار کے لیئے نقصان رساں تھے۔

(۳) سوم سرکاری عہدہ دار اپنی خدمات کے انجام دینے کی کہاں تک قابلیت رکھتے ہیں؟ اُن کو اپنے کام میں کیا کیا مشکلات اور دشواریاں لاحق ہوتی ہیں؟ اُن کی عام طور کی نیک نامی یا بدنامی اور اُن کا حُسن سُلوک رعایا کے ساتھ۔

رعایا سے ملاقات اور تحقیقات کا طریقہ

مذکورہ بالا اُمور کی تحقیقات اور تمام مطالب پر حاوی ہونے کے لیئے اُنھوں نے جو طریقہ اختیار کیا اُس کا بیان انھی کے الفاظ میں مناسب ہوگا وہ لکھتے ہیں:۔

"جہاں میں گیا میں نے وہاں کی رعایا سے دو گروہوں میں ملاقات کی ایک گروہ میں مزارعین، دیسمکھیوں، دیسپانڈیوں، اور پٹیل اور پٹواریوں اور دوسرے تمام وطن داروں اور ایسے لوگوں کو شامل کرتا تھا جو زمین سے تعلق رکھتے تھے اور دوسرے گروہ میں وہاں کے عام باشندوں کو جن میں اشخاص تجارت پیشہ اور مہاجن و ساہوکار اور دیگر پیشہ ور اور وہاں کے معززین شامل ہوتے تھے کسی سرکاری ملازم کو یہاں تک کہ ایک چپراسی کو بھی میں نے یہ موقع نہیں دیا کہ اُن جلسوں میں حاضر رہ سکے۔"

مترجم کی جب ضرورت پڑی انھی لوگوں میں سے کوئی ترجمان کا کام دیتا تھا میں نے ہر ایک شخص کو یہ موقع دیا تھا کہ جو کچھ وہ مجھ سے تخلیہ میں کہنا چاہے بے تکلّف کہہ سکے شروع شروع میں میں نے دیکھا کہ لوگ بہت متوحش اور محتاط ہیں اور جب اُن سے دریافت

کیا کہ تم کو کسی قسم کی تکلیف یا کوئی شکایت ہے؟ تو علی العموم اُن کا جواب یہی ہوتا تھا کہ ہم سب خوش ہیں، سب راضی ہیں، سرکار کا انتظام بہت درست ہے، ہم کو کسی قسم کی کوئی تکلیف اور کوئی شکایت نہیں ہے۔ لیکن جب اُن کے ساتھ زیادہ خلا ملا اور اُن کی بعض قسم کی تکلیفوں کا خود اپنی طرف سے ذکر اور اُس پر افسوس کیا گیا اور اُن کے ذہن نشین کردیا گیا کہ نواب مدار المہام سرکار عالی نے مجکو خاص اسی لیے بھیجا ہے کہ جو کچھ دُکھ درد رعایا کو ہے، اُس کو رفع کرنے کا بندوبست کیا جائے تو پھر تو اُنھوں نے اپنی تکلیفوں اور شکایتوں کے اسقدر دفتر کے دفتر کھول دیئے کہ اُن کی یادداشتیں لکھنا اور اُن پر غور کرنا اور اُن کی حقیقت اور علت کو دریافت کرنا اور اُن کے رفع کرنے کی تجویزیں سوچنا خود ایک بہت بڑا کام ہوگیا جس کو میں نے بھی اپنے دورہ کا سب سے اعلیٰ مقصد قرار دیا، اور چونکہ جابجا اسی قسم کی صحبتیں واقع ہوئیں اور اسی قسم کی گفتگوئیں پیش آئیں، اور ہر جگہ تکلیفوں اور شکایتوں کی اکثر ایک سی شان پائی گئی اور ایک ہی سی آواز کان میں آئی تو جن باتوں کی طرف سے اول اول ظن پیدا ہوتا تھا، آخر آخر وہ یقین کے درجہ کو پہونچنے لگیں، اور میں اس قابل ہوا کہ اطمینان کے ساتھ اُن اُمور پر رائے قایم کرسکوں جو رعایا کی راحت اور تکلیف سے متعلق ہیں"۔

مندرجہ بالا الفاظ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مولوی مشتاق حسین کو رعایا کے مصائب و مشکلات کا کس قدر خیال تھا اور وہ اپنے فرائض کو کیسے صحیح طریقہ سے ادا کرنا چاہتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ سرکاری ملازمین کے خیالات اور اُن کی مشکلات سے بھی واقف ہونا چاہتے تھے، اور کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا پسند نہیں کرتے تھے جس سے اُن کی مشکلات میں اضافہ ہو یا اُن کے وقار کو صدمہ پہونچے۔

سرکاری ملازمین کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کیا

"دوسری طرف میں نے اپنے طرز کارروائی

سے سرکاری عہدہ داران اور ملازموں پر یہ بات ثابت کردی کہ میرا یہ دورہ سرکاری ملازموں کے لیے کوئی مہلک یا خطرناک وبا نہیں، بلکہ اس کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ جن مشکلات میں وہ مبتلا ہیں جہاں تک ممکن ہو اُن کو رفع کیا جاوے یا کم سے کم یہ کہ جہاں تک ہوسکیگا اُن کو کم کیا جاویگا اُن کے عہدوں کی عزت کی حفاظت ہوگی اور اُن کے واجبی حقوق محفوظ رکھے جاوینگے، جن پر میں نے دیکھا کہ اکثر صدمہ پہنچ جاتا ہے، بالخصوص جب کہ ہماری تمام تر توجہ اس طرف مصروف ہے کہ سب لوگ اپنا کام محنت اور دیانت سے انجام دیں تو میں نے اُن حقوق پر اور خدمات کے اُن معاوضوں پر سیر چشمی سے نظر رکھی جن پر سرکاری عہدہ داروں کی فلاح اور اُن کی راحت اور اُن کا اطمینان بہت کچھ منحصر ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ تھا کہ اگر سب نہیں تو ایک بڑا حصہ کاموں کی مشکلات اور ابتریوں اور اُن کے خراب نتائج کا خود اُن عہدہ داروں نے بغیر اندیشہ کسی مواخذہ کے میرے سامنے پیش کردیا جو اطلاعیں اس طرح پر مجکو حاصل ہوئیں اُن سے رعایا کی اکثر شکایتوں کی تصدیق ہوئی اور اس میں سرکاری عہدہ داروں کی کارروائی کو زیادہ دخل نہ تھا کیونکہ بعض قواعد وضوابط موجودہ خود ایسے تھے جن سے رعایا کو خواہ مخواہ تکلیف پہنچتی ہے۔"

حصول تعلقات اور تحقیقات کا صحیح طریقہ یہی تھا جو مولوی مشتاق حسین نے اختیار کیا۔ اِس طرز عمل سے اُن کو یہ فائدہ حاصل ہوا کہ وہ اپنے دورہ کے زمانہ میں تمام جزئیات پر حاوی ہوسکے اور اندرونی خرابیوں سے واقف ہوکر اُن کی اصلاح کے لیے سعی کرسکے۔

تلنگانہ کے طریقہ مالگزاری پر بحث

سب سے پہلے اُنھوں نے اپنی رپورٹ میں تلنگانہ کے طریقہ تشخیص محاصل پر بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ سرکار جو کاشتکاروں سے زمین کا محصول لیتی ہے وہ نہ تو قابل اطمینان حالت میں ہے اور نہ کسی صحیح اصول پر مبنی ہے۔ اِس کے بعد اُن اصلاحات کو پیش کیا ہے جن سے رعایا کی خوشحالی، ملک کی سرسبزی، زراعت کی توفیر اور آبادی کی ترقی متصور ہے۔

اس سلسلہ میں اُنھوں نے سب سے پہلے انتظام مال گزاری پر تاریخی حیثیت سے تبصرہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ۱۲۶۴ف سے پہلے نقد محصول لینے کا رواج نہ تھا، سر سالار جنگ نے اپنے زمانہ میں دیگر اصلاحات کے سلسلہ میں اس طرف بھی توجہ کی اور بٹائی کے طریقہ کو موقوف کرکے یہ حکم دیا کہ رعیت سے بلحاظ حیثیت پیداوار اراضی مزروعہ کے نقد محصول لیا جائے، نیز یہ کہ اراضی کی حیثیت دریافت کرنے اور اُس کے مطابق جمع تشخیص کرنے کے واسطے گزشتہ دس سال کی پیداوار سے ایک صحیح اندازہ کیا جائے، لیکن مختلف اسباب سے (جن کو رپورٹ میں بیان کیا گیا ہے) گزشتہ دس سال کی پیداوار کے معلوم کرنے کے متعلق کوئی صحیح اور قابل اعتماد ذریعہ نہ تھا، اِس کے علاوہ چونکہ اس کام میں خاص طور پر عجلت کی گئی تھی یعنی عہدہ داروں نے ۱۲۷۳ف سے ۱۲۷۵ف (اسی سنہ میں ضلع بندی ہوئی تھی) تک تمام ممالک محروسہ میں اس کارروائی کو مکمل کردیا تھا اس لیئے متعدد خرابیاں باقی رہ گئیں۔

تشخیص جمع کی خرابیاں اس عاجلانہ طریق عمل نے جو خرابیاں پیدا کردیں وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) جو عہدے دار تشخیص جمع کے لیے مامور ہوئے تھے اُنھوں نے یہ کام زیادہ تر پٹیلوں اور پٹواریوں پر چھوڑ دیا۔ ان لوگوں نے سربستہ داریوں اور اجاروں کے علاقوں میں اپنے تخمینہ سے جمع کو موضع وار تقسیم کیا اور جہاں غلہ وصول کرنے کا طریقہ تھا، وہاں جس قدر غلہ وصول ہوتا تھا اس کی قیمت تجویز کرکے ایک دہ سالہ اوسط سالم موضع کے لیئے نکال کر اُس کو بلحاظ قسم اور تعداد اراضی مزروعہ اسامی وار تقسیم کردیا، اور اُس کے بعد اسامی کے ہر ایک کھیت پر علیٰ قدر کمیت وکیفیت پھیلا کر فی بگھہ محصول قایم کردیا، ہر ایک مقبوضہ زمین کی نہ تو پیمایش ہوئی نہ بلحاظ حیثیت زمین کے مدارج قایم کیئے گئے۔

(۲) اکثر پٹیلوں اور پٹواریوں کے ذاتی اغراض اس انتظام سے متعلق تھے، اس لیئے یہ امر مشتبہ ہے کہ جو انتظام اس زمانہ میں کیا گیا، وہ کہاں تک ان اثرات سے پاک تھا۔

(۳) جب مذکورۂ بالا محصول تجویز کیا گیا اُس وقت غلّہ کا نرخ گراں تھا، واجب الوصول

غلہ کی قیمت اسی گراں نرخ کے لحاظ سے تجویز کر کے نقد محصول مقرر کر دیا گیا لیکن جب غلہ ارزاں ہو گیا، تو اس تشخیص پر نظر ثانی نہیں کی گئی اور مزارعین اسی سنگین اور غیر معتدل محصول میں مبتلا رہے۔

(۴) مختلف اوقات میں جریب اور گز مختلف قسم کے تھے اس لئے پیمایش کی صحت کے متعلق اطمینان نہیں کیا جا سکتا لیکن عمال نے اپنی حسن کارگزاری کے طور پر دوبارہ زمین کی پیمایش کر کے اضافہ ثابت کیا اور محصول بڑھایا مثلاً ایک موضع میں ۱۶ ہاتھ کی جریب مستعمل تھی جس سے زمین کی پیمایش ہوئی تھی، دوبارہ ۱۲۸۱ھ میں ۱۲ ہاتھ کی جریب سے پیمایش کر کے زمین کا اضافہ ثابت کیا گیا اور محصول بڑھایا گیا اس طریقہ سے جابجا اضافہ پیمایش کے نام سے جمع میں جو اضافہ ہوا وہ ظلم پر مبنی تھا جو رعایا کی تباہی کا باعث ہوا۔

(۵) ۱۲۸۴ف دستہ ۱۲۹۲ھ میں صدرالمہام مال گزاری نے بذریعہ ایک حکم کے اضافہ پیمایش کو روکا اور یہ تجویز کیا کہ تاوقتے کہ پختہ پیمایش نہ ہو کھیتوں کی سالانہ پیمایش کا طریقہ موقوف کر دیا جائے لیکن اس سے بھی رعایا کو کچھ فائدہ نہیں ہوا، کیونکہ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں

"امتناع پیمایش کی اس مضبوط دیوار میں جس سے رعایا کے جان و مال کی بہت کچھ حفاظت ہو سکتی تھی غلطی سے ایک دریچہ باقی رہ گیا، یعنی گشتی میں ایک اجازت یہ بھی تھی کہ "اگر کسی سبب سے کسی کھیت میں زیادتی بگھاوں کا گمان پایا جاوے تو البتہ پیمایش مناسب ہے" یہ ایک ایسا فراخ دریچہ تھا کہ ہر سال اس میں سے جمع بندی کے دنوں میں چوروں اور لٹیروں کے گروہ کے گروہ داخل ہوئے اور رعایا کو لوٹ کھسوٹ کر چلتے ہوئے"

ان کا بیان ہے کہ جہاں جہاں دوبارہ پیمایش ہوئی دو چند سہ چند چہار چند بلکہ اس سے بھی زیادہ اضافہ نکلا اور بعض دیہات میں برابر نکلتا چلا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔

"جب یہ حال ہے تو ایک چالاک کارکن جمع بندی اور ایک طماع پٹواری اور ایک ناراض پٹیل یہ کہہ کر کہ ہم کو کھیت میں زیادتی بگھاوں کا گمان ہے ایک غریب رعیت کو

ہر طرح ستایا اور اُس کو لوٹ سکتا ہے۔ مجکو اپنے دورہ میں اچھی طرح یقین ہو گیا کہ اس دھمکی سے ہمیشہ رعایا لوٹی جاتی ہے اگر دھمکی کے ساتھ نذرانہ داخل نہیں ہوتا تو پیمایش کے بعد جمع کا اضافہ ایک یقینی امر ہے"۔

جدید بندوبست کی ضرورت | مذکورۂ بالا مشکلات کو نہایت تفصیل و وضاحت سے بیان کرنے کے بعد انھوں نے یہ رائے دی ہے کہ جدید بندوبست ہونا چاہیئے لیکن اُن کا خیال ہے کہ:۔

(۱) تلنگانہ میں ابھی علمی پیمایش اور لاکھوں پونڈ صرف کر کے بال کی کھال نکالنے کا وقت نہیں آیا، آج تو اس بات کی ضرورت ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو ایک سرسری بندوبست کسی معتدل میعاد کے واسطے بالکل سادہ اور آسان اصولوں پر کر دیا جائے، زمین کی پیمایش زنجیر کے ذریعہ سے بصحت عمل میں آجائے ہر ایک کھیت کا نظری نقشہ کھینچ کر اس سے تمام موضع کا ایک نقشہ کشتوار بنا لیا جائے، نقشہ اور رجسٹر پیمایش میں کھیتوں کے سلسلہ وار نشان قایم ہو جائیں۔

(۲) زمین کی حیثیت پیداوار مختلف قابل اعتماد طریقوں سے دریافت کر کے اس کے لحاظ سے زمین کو مختلف درجوں میں اِس طرح تقسیم کر دیا جائے کہ باہم اُن درجوں میں ایک معین نسبت پائی جائے، اس کے بعد بلحاظ زمین کی حیثیت کے ایک معتدل محصول تجویز کر دیا جائے۔

(۳) اگر پورا اہتمام کیا جائے تو سرسری بندوبست تلنگانہ میں پانچ برس کے عرصہ میں ختم ہو سکتا ہے برخلاف اس کے اگر پختہ بندوبست کا انتظار کیا جائے تو جو چند صورتیں کاشتکاروں کی اس وقت تلنگانہ میں دکھلائی دیتی ہیں اُن میں سے اکثر اس وقت تک دنیا سے رخصت ہو چکی ہونگی

اس کے علاوہ اُنھوں نے یہ بھی بدلائل ثابت کیا ہے کہ پختہ بندوبست جس طرح مرہٹواڑی میں ممکن ہے، تلنگانہ میں باوجود کثیر مصارف بہ آسانی ممکن نہیں اس بنا پر اُنھوں نے اپنی رپورٹ میں اُن تدابیر کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا ہے جن سے بغیر انتظار پختہ بندوبست

کے اکثر خرابیاں رفع ہو سکتی ہیں۔

رعایا کا ایک خاص گروہ

مذکورۂ بالا امور پر بحث کرنے کے بعد اُنھوں نے زراعت پیشہ طبقہ کی عام حالت اور مشکلات پر ایک نظر ڈالی ہے اور تمام جزئیات کا استقصا کر کے اُن کی مشکلات کو ایک ایک کر کے بیان کیا ہے اور اُن کو دور کرنے کی شدید ضرورت ظاہر کی ہے۔ رعایا کی مشکلات کا اُن کو اس قدر لحاظ تھا کہ دورہ کی باقاعدہ رپورٹ مرتب کرنے سے پہلے ہی اُنھوں نے مفصّل یادداشتیں اُن اُمور کے متعلق مدار المہام کو روانہ کیں اور صاف طور پر لکھا کہ :-

"سب سے مقدم کام اس وقت ہمارا یہ ہے کہ ہم اپنی رعایا کی حالت کو درست کریں۔"

مزارعین کی مشکلات بیان کرنے کے بعد اُنھوں نے اس طبقۂ رعایا کی حالت کا تذکرہ کیا ہے جو مزارعین سے فروتر ہے۔ اور جس میں مختلف خدمت پیشہ لوگ شامل ہیں، جن کو فصل کے تیار ہونے پر اپنی خدمات کے معاوضہ میں کاشتکاروں سے غلّہ ملتا تھا اسی طرح پٹیل اور پٹواری بھی کاشتکاروں سے پیداوار میں سے اپنا حصّہ پاتے تھے۔ حکومت نے اس دستور کو موقوف کر کے یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ خود مال گزاری پر ایک آنہ فی روپیہ وصول کر کے ان لوگوں کو علیٰ قدر مناسب نقد رقم اُن کی خدمات کے معاوضہ میں تقسیم کرے۔

اس طریقہ سے جو خرابیاں پیدا ہوئیں اور رعایا و خدمت پیشہ طبقہ کو جن دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑا اور حسابات اور موازنہ (بجٹ) میں جو پیچیدگیاں واقع ہوئیں ان سب کو مدلّل طریقہ سے بیان کر کے آخر کار اُنھوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس طریقہ کو موقوف کر دیا جائے اور مقامی حالت کو ملحوظ رکھ کر اُنھوں نے یہ بھی بتایا کہ اس طریقہ سے عام طور پر جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں کن تدابیر سے اُن کی اصلاح اور تلافی ہو سکتی ہے۔

رعایا کی عام حالت

اس کے بعد اُنھوں نے نہایت مؤثر الفاظ میں رعایا کی عام حالت کی تصویر کھینچی ہے اور بتایا ہے کہ وہ کس طرح ساہوکاروں کے پنجہ میں گرفتار ہے، جس سے بغیر سرکار کی اعانت کے نجات حاصل ہونا ناممکن ہے۔ باایں ہمہ وہ رعایا کی سادہ مزاجی، خوش اطواری، اور کفایت شعاری

کی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیہات کی زندگی اس قدر سادہ ہے کہ جو لوگ ہزاروں سال کے مال گزار ہیں وہ بھی فضول خرچی کی طرف مائل نہیں، اُن کو تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ:۔

"دیہات کا طرزِ زندگی اور طرزِ معاشرت خود ایسا واقع ہوا ہے جو محنتی رعایا کو ہر ایک ضروری کفایت شعاری کی تعلیم کرتا ہے مع ہذا اکثر پٹواریوں اور کسی قدر پٹیلوں کو خارج کرکے میں یہ بھی بغیر کسی مبالغہ کے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے مزارعین کے اس تمام محنتی گروہ کو معاملہ میں راستباز پایا، نہ اُن میں بے ایمانی ہے نہ شر ہے، نہ فساد ہے، جو بات کہتے ہیں بہت سیدھی، بہت سچی، اور اگر پٹیل و پٹواری وغیرہ چالاک فرقہ کی طرف سے کہیں اُن کو کچھ تعلیم بھی ہوتی ہے تو اُس کو لیاقت کے ساتھ عمل میں لانے کے بہت کم قابل ہیں مجھ سے جس قدر باتیں اُن لوگوں نے کہیں سب میں وہ سچے ثابت ہوئے اُن کی ہر ایک شکایت دریافت کے بعد صحیح ثابت ہوئی اور اُن کی ہر ایک درخواست کے مطابق مجکو حکم دینا پڑا اور اگر کسی سے انکار بھی ہوا تو وہ انکار قواعد و ضوابط موجودہ وقت کی پابندی کی وجہ سے تھا نہ کہ بوجہ ناواجبیت اُن کی شکایت کے۔

اس محنتی اور راستباز اور کفایت شعار گروہ کو اگر آسودہ حال ہوجانے کے مواقع مل جاویں تو اس کا بھی بخوبی یقین ہے کہ بہت کم مدت میں اُن کی حالت درست ہوجاوے گی تلنگانہ کا ایک تعلقہ جہاں سرسری بندوبست ہوجاوے اپنی رعایا کی حالت کو پانچ برس کے اندر اس قدر درست کرسکتا ہے کہ وہ ساہوکاروں کے پھندے سے نجات پاسکتے ہیں۔ بندوبست سرسری کے علاوہ اور بھی بعض امور مؤثر حالت رعایا جو اس کیفیت میں سرکار عالی کی توجہ کے لیے پیش کیے گئے ہیں، اُن میں سے ہر ایک کی غرض اور غایت یہی ہے کہ رعیت کی حالت ترقی کرے۔"

گورنمنٹ کا رعایا کے ساتھ کیا تعلق ہونا چاہیئے؟

مولوی مشتاق حسین اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے کہ ملک کے امن و امان، گورنمنٹ کی قوت و شوکت، اور رعایا کی فارغ البالی اور

خوش حالی کا تمام دارمدار گورنمنٹ اور رعایا کے باہمی اعتماد پر مبنی ہے، اس لیئے ایک عادل گورنمنٹ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ رعایا کی فلاح و بہبودی کے لیے سعی کرے چنانچہ وہ اپنی رپورٹ میں اس معاملہ پر بھی بحث کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ :-

"سرکاری مقاصد پر جہاں تک مجکو اپنے اس دورہ میں غور کرنے کا موقع ملا، اُن میں سے بڑا مقصد یہی تھا یعنی زراعت پیشہ گروہ کی حالت کو درست کرنا سرکاری مقاصد اور رعایائے زراعت پیشہ کے مقاصد اس قدر باہم مخلوط ہیں کہ اُن میں باہم تفریق کرنا ناممکن ہے۔ اسی واسطے میں نے اس کیفیت میں اس بات کا ارادہ نہیں کیا کہ ان دو قسم کے مقاصد کی نسبت علیحدہ علیحدہ بحث کروں، ان دونوں مقاصد کی نسبت یہ خیال کرنا کہ ایک کا نفع دوسرے کے نقصان کا باعث ہے، بہت بڑی غلطی ہے، اور جو کچھ صدمات رعایا کو اس وقت تک پہونچے اُن کی اصل وجہ یہی تھی کہ عاملان وقت نے سرکاری مقاصد اور رعایا کے مقاصد کو جدا جدا نگاہ سے دیکھا اور اُن میں جس نے سرکاری خیرخواہی کو زیادہ دخل دیا رعایا کو نہایت بیدردی کے ساتھ پیس دیا، حالانکہ یہ دونوں حقوق ترازو کے دو پلڑوں کی طرح انصاف کی ایک ڈنڈی میں تلکے ہوئے ہیں، اور میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سرکار عالی نے جان بوجھ کر اور رعایا کی سرسبزی اور مرفہ حالی کو اپنی حکومت کی رونق اور مضبوطی کے لیئے ایک ضروری آلہ خیال کرکے فیاضی کے ساتھ رعایا کے پلڑے میں اپنے رحم کا بوجھ کسی قدر زیادہ رکھ دیا ہے۔ سرکار عالی کی ہمیشہ خواہش ہے کہ رعایا کا پلڑا جھکا رہے یہی انصاف اور رحم کی پالیسی ہے جس کو مجلس مالگزاری نے سرکار عالی کے ایما کے مطابق گروہ مزارعین کے معاملہ میں اختیار کیا ہے۔"

وسائل آب پاشی پر بحث

ملک کی سرسبزی اور زراعت کی ترقی ذرائع آب پاشی کی وسعت اور خوبی پر منحصر ہے، اس بنا پر انھوں نے اپنے دورہ میں وسائل آب پاشی کے دریافت

کرنے اور معائنہ کرنے پر بھی خاص توجہ کی اور مقامی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر رپورٹ میں اس پر مفصل بحث کی ہے اور مفید تجویزیں حکومت کے سامنے پیش کی ہیں جس کو ہم بالاختصار بیان کرتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ موجودہ صورت یہ ہے کہ بعض مستثنے صورتوں کو چھوڑ کر عام طور پر آب پاشی کے سلسلہ میں مرمت و تعمیر کے جملہ مصارف سرکار کے ذمہ ہیں جو دو طریقہ سے سرانجام پاتے ہیں۔

(۱) تمام بڑے بڑے کام جن کی کوئی خاص حد مقرر نہیں لیکن عموماً دو ڈھائی ہزار سے زیادہ کے ہوتے ہیں، عموماً سررشتہ تعمیرات عامہ کے ذریعہ سے سرانجام پاتے ہیں۔

(۲) معمولی مرمت اور ترمیم کے لیئے صیغۂ مال میں ایک خاص سررشتہ آبپاشی علیحدہ قایم ہے۔

تلنگانہ کے بڑے اضلاع میں ایک خاص مددگار تعلقدار آبپاشی کے صیغہ سے مقرر ہوتا ہے، اس کے علاوہ ناظم و مہتمم محکمہ صفائی سے بھی اس کام میں مدد لی جاتی ہے اور جہاں مددگار کا تقرر نہیں ہوتا وہاں صرف ناظم و مہتمم محکمہ صفائی یہ کام انجام دیتے ہیں، تلنگانہ کے دونوں صوبوں میں ایک ایک (خاص) مددگار صدر تعلقداروں کے ماتحت اور ایک جداگانہ مددگار معتمد خاص مجلس مال گزاری میں اسی ضرورت سے مقرر ہے۔ یہ سب لوگ انجنیرنگ اسکول اور کالج کے تعلیم یافتہ ہیں۔ دو لاکھ روپیہ ہر سال اس کام کے لیئے منظور ہوتا ہے جو مناسب طریقہ سے اضلاع تلنگانہ میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

آبپاشی کے سلسلہ میں معمولی کام اضلاع کے تعلقدار اپنے مددگار آبپاشی وغیرہ کے ذریعہ سے باختیار خود انجام دیتے ہیں، بشرطیکہ ہر ایک کام دوسو روپیہ سے زیادہ کا نہ ہو اور مجموعی رقم اِس سے زیادہ نہو جو ہر سال بقدار مناسب اُن کے اختیار میں دیجاتی ہے، زیادہ مصارف کے کام جن کی لاگت ایک ہزار سے زیادہ نہ ہو صدر تعلقدار اپنے اختیار سے انجام دیتے ہیں، اس سے زیادہ رقم کے لیئے مجلس مال گزاری کی منظوری لیجاتی

ہے۔ البتہ جب یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کام اپنی مشکلات اور لاگت کے لحاظ سے سررشتہ تعمیرات سے ہونا چاہیئے تو سررشتہ تعمیرات کو لکھا جاتا ہے، اور اسی سررشتہ سے کام انجام پاتا ہے، سررشتہ مال کو پھر کوئی علاقہ اس سے نہیں رہتا۔

مولوی مشتاق حسین نے مندرجہ بالا طریق عمل کو ناقص اور ناکافی خیال کر کے جدید تجاویز پیش کی ہیں، اور اُن کو مدلل اور مفصل طریقہ سے بیان کیا ہے لیکن ہم ان تمام تفصیلات کو نظر انداز کر کے بالاختصار بیان کرتے ہیں۔ اُن کی رائے ہے کہ

(۱) آبپاشی کے کاموں کا موازنہ (بجٹ) مجلس مالگزاری کے موازنہ میں شامل ہونا چاہیئے سررشتہ تعمیرات سے اس کا تعلق نہ ہو، اور تمام کام مرمت و تعمیر کے (بجز بڑے بڑے کاموں کے) مجلس مالگزاری کے ماتحت انجام پائیں۔ اُنھوں نے جزئیات پر بحث کر کے ثابت کیا ہے کہ اس سے سرکاری محاصل میں ترقی ہوگی۔

(۲) مجموعی قوت کے ساتھ ملک کے ایک حصہ سے کام شروع کیا جائے اور رفتہ رفتہ اس کو تمام ملک میں وسعت دی جائے۔

(۳) اسی سلسلہ میں اُنھوں نے مملکتِ آصفیہ کے ذرائع آبپاشی کو تفصیلاً بیان کر کے اصلاح و ترقی کی مختلف تدابیر بتائی ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ دکن میں ذرائع آبپاشی حسب ذیل ہیں:

(۱) باولیاں (۲) تالاب (۳) ندی نالے۔ اِن میں اوّل الذکر کی تعداد بہت زیادہ ہے، جن کا بڑا حصہ منہدم یا مرمت طلب ہے جس کے بغیر اُن سے آبپاشی کا کام نہیں لیا جا سکتا لیکن اُن کی تعداد اِس قدر زیادہ ہے کہ سرکاری خرچ سے اُن کا تعمیر کرنا نہایت دشوار بلکہ قریباً ناممکن ہے۔ اِس کے علاوہ اِس سے زیادہ منفعت کی اُمید نہیں، برخلاف اس کے اگر تالابوں اور نالوں کی مرمت و درستی میں روپیہ صرف کیا جائے، تو اس سے محاصل میں خاص اضافہ ہو سکتا ہے جیسا کہ اُنھوں نے مقامی حالات پر بحث کر کے بوضاحت بیان کیا ہے۔

(۴) جن باولیوں کا پٹواری کے کاغذات میں اندراج ہے اور اُن کی متعلقہ زمین اور لگان بھی درج ہے اور اب وہ مرمت طلب ہو کر بیکار ہو گئی ہیں، موجودہ قواعد کے مُطابق اضلاع کے تعلقہ دار چونکہ لگان میں کسی ترمیم کے مجاز نہیں، اِس لیئے یہ نہیں کر سکتے کہ اس اراضی کو خشکی کی فصل کے واسطے کسی کاشتکار کو دے سکیں کیونکہ اس طریقہ سے زمین کے سابق لگان میں جو زیر باولی زمین کا ہے ترمیم لازم آتی ہے، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہزارہا بیگھہ زمین بیکار پڑی ہے، اور ان خراب شکستہ باولیوں کی مرمت کسی محدود زمانہ میں سرکار کی طرف سے ممکن بھی نہیں۔ اس لیئے ضرورت ہے کہ کسی مناسب تدبیر سے ان اُفتادہ زمینوں کو کارآمد بنایا جائے تاکہ زمین کے بیکار رہنے سے جو نقصان سرکار کو پہونچتا ہے اُس کی تلافی ہو سکے۔

(۵) باولیوں کے متعلق اُن کا خیال ہے کہ جب گورنمنٹ اُن کی مرمت و نگہداشت نہیں کر سکتی تو اِن ہزارہا باولیوں کی ملکیت سے دست بردار ہو جائے اور ان کو رعایا پر منتقل کر دے جو بقول اُن کے

"اپنی اولاد کی طرح اُن کی حفاظت کرینگے اور اُن کو اسی کام میں لائینگے جو اُن کی ملکیت کا اصل مقصد ہے۔"

مولوی مشتاق حسین کی رائے ہے کہ انتقال ملکیت کے لیے ایسی مناسب تدبیر اختیار کرنا چاہیئے جو گورنمنٹ اور رعایا دونوں کے لیے مفید اور دونوں کی حالت کے لیے موزوں ہو رعایا اس قدر دولتمند نہیں جو قیمتاً اُن کو خرید سکے نہ مفت تقسیم کرنا مناسب ہے، اس طریقہ سے اُن کی قدر و قیمت گھٹ جائیگی اِس کے علاوہ یہ تجویز کرنا دشوار ہوگا کہ کون اُن کا اصلی مستحق ہے، بلکہ یہ اندیشہ ہے کہ وہ اصلی مستحقین پر منتقل نہ ہو سکیں گی لہٰذا ان دونوں صورتوں کو چھوڑ کر ایک خاص معیار تجویز کرنا چاہیئے اور وہ معیار یہ ہو سکتا ہے کہ رعایا میں سے جو یہ ثابت کر سکے کہ وہ کسی باولی کی نگہداشت اور اُس کو اسی مقصد میں استعمال کرنے کے لیئے اپنا سرمایہ صرف کریگا اُسی قدر اُس اسامی کا استحقاق مرجح سمجھا جائیگا۔

اس معیار کے ذکر کرنے کے بعد انھوں نے تفصیل و وضاحت سے یہ بیان کیا ہے کہ باؤلیاں کس طریقہ سے رعایا کو دیجائیں۔ ہم بخوف طوالت ان تمام تفصیلات کو نظر انداز کرتے ہیں البتہ اُن کے بیان کا ایک حصہ جس میں انھوں نے مثال دے کر اپنے مطلب کو سمجھایا ہے۔ نقل کرتے ہیں:۔

"ایک باولی فرض کرو جو اس وقت مرمت طلب اور ویران ہے، چار سو روپیہ اس میں صرف ہوں تب وہ کام کے قابل ہو سکتی ہے، اور اس باولی کے نیچے پانچ بگھیہ زمین ہے، جس کا دہارہ آبپاشی کی حالت میں فی بگھیہ دس روپیہ کا ہے۔ یعنی کل پچاس روپیہ محاصل کی زمین ہے، ایک رعیت آمادہ ہے کہ چار سو روپیہ اپنے پاس سے لگا کر باولی کی مرمت کرے، ایسا ہونے پر ہم اس کو چھ روپیہ سینکڑہ سالانہ کے حساب سے چوبیس روپیہ سال اس کے سرمایہ کا سود مستقل طور سے مجرا دینگے، اور مزید برآں ایک روپیہ فی بگھیہ زمین زیر باؤلی کے حساب سے، یعنی پانچ روپیہ سال ہمیشہ اس بات کے واسطے مجرا دیا کرینگے کہ وہ باولی کو آیندہ سالانہ مرمت کے ذریعے سے درست کر سکے، اس طرح پر پچاس جمع زمین زیر باؤلی میں سے انتیس مجرا ہونے کے بعد اکیس باقی رہینگے اس اکیس سالانہ پر ہم رعیت کے ساتھ ایک دوامی قول اس طرح پر کرینگے کہ بندوبست کے ختم ہونے پر جس کی میعاد تیس سال کے قریب ہوگی، زمین کی جمع ازسرِ نو مشخص کی جاویگی اور اس میں سے ~~وہ~~ متذکرہ صدر مجرا ہونے کے بعد جو کچھ باقی رہے وہی آئندہ بندوبست کے لئے سرکاری جمع ہوگی۔"

"باولیوں کی حالت مختلف ہے لیکن جو طریقہ معاوضہ کی تجویز کا اوپر بیان کیا گیا وہ تمام اختلافات کو یکساں آسانی کے ساتھ حل کر کے ہر ایک معاملہ کو ایک اسکیل میں لے آئیگا۔"

اس کے بعد انھوں نے بتایا ہے کہ جو طریقہ میں نے تجویز کیا ہے رعایا عام طور پر اس کو مفید سمجھتی ہے، البتہ اکثر سرکاری ملازمین اس کو سرکار کے لئے خطرناک خیال کر کے اس تدبیر پر مختلف اعتراضات کرتے ہیں۔ انھوں نے ان تمام اعتراضات کو نقل کر کے اُن کا جواب دیا ہے اور اس تجویز کو بہمہ وجوہ

مفید ثابت کرنے کے بعد آخر میں لکھا ہے:۔

"اب میں چاہتا ہوں کہ اس کارروائی کے نتیجوں پر ایک دوسرے طور سے غور کیجاوے اس وقت ایسے تجربہ کار عہدہ دار جن کو سرکار عالی کے مداخل و مخارج کے ساتھ ہر طرح کی ہمدردی ہے، بالاتفاق اس بات کو مناسب خیال کرتے ہیں کہ سرکار عالی آبپاشی کے کاموں کو ترقی دینے کے لیئے جس سے ملک کا محاصل ترقی کرتا ہے سودی روپیہ قرض لے اور اُس کو آب پاشی کے کاموں میں لگا دے، اب دیکھو کہ استقراض کے اس طریقہ میں اور اس طریق کارروائی میں جس کی میں سفارش کرتا ہوں کیا فرق ہے؟

اوّل چھ روپیہ سینکڑہ سالانہ سود کی شرح وہ شرح ہے جس پر ملک کے اندر روپیہ قرض ملنے کی کوئی توقع نہیں ہے، البتہ باہر سے مل سکیگا، اور جب باہر سے کوئی سرمایہ قرض لیا گیا تو لامحالہ ملک کی دولت اس کے سود میں ملک سے باہر جاویگی، اور یہ اُس حکمتِ عملی کے خلاف ہے جس سے کوئی ملک آزاد اور سرسبز رہ سکتا ہے۔ شاید میری قلتِ معلومات کی وجہ ہو گی جو مجکو کوئی ایسی نظیر تاریخ میں یاد نہیں آتی جو کوئی ملک باہر سے روپیہ قرض لے کر سرسبز اور اخیر وقت تک کامیاب ہوا ہو، انگریزی گورنمنٹ کروڑوں روپیہ ایسے مفید کاموں کے واسطے قرض لیتی ہے، لیکن دیکھ لو کہ وہ سب سرمایہ خود اس کے اپنے ملک کا سرمایہ ہوتا ہے اور جو سود اس پر دینا پڑتا ہے وہ خود اس کے اپنے ملک کی دولت کو بڑھاتا ہے، ہزارہا باولیوں کی مرمت میں جو روپیہ سرکار کی طرف سے صرف کیا جائیگا اُس کی نسبت یہ اطمینان کہ تمام کام واجبی کفایت شعاری اور صحیح تخمینہ اور دیانت کے ساتھ انجام پہنچائے جائینگے بہت ہی دشوار امر ہے، کچھ روپیہ بے موقع اور بے ضرورت برباد ہوا تو اس کو ایسے لوگ ہضم کرینگے جن سے زراعت کو کوئی مدد پہنچنے کی توقع نہیں ہے اور اس کا سود سرکار کے ذمہ واجب ہو گا۔"

"برخلاف ان تمام خطرات کے ہماری تجویز کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ سود کی شرح بڑھانے کی کچھ حاجت ہے نہ اپنے ملک کی دولت دوسرے ملکوں میں جاتی ہے اور نہ اس بھاری و یقینی

ذمہ داری سود کے مقابلہ میں جو سرکار عالی پر عاید ہوگی ہماری منفعت ظنی ہوگی بلکہ ہم اُن لوگوں کے مدیون ہونگے جو خود ہمارے مدیون بن جاوینگے اُن کا مطالبہ ہمارے اوپر اُس وقت واجب ہوگا جب کہ اول ہمارا مطالبہ اُس سے زیادہ تعداد میں اُن پر واجب ہولے گا اور بدون اس کے کہ خزانہ پر کسی سود کا نقد بار پڑے یا دائنوں کو خزانہ سے اپنے نقد سود کے وصول کرنے میں دشواریاں پیش آویں اس آسانی سے وہ سود ادا ہوتا رہیگا کہ کسی کو خبر تک بھی نہ ہوگی اور باوجود اتنے بڑے حساب کے نہ ایک متصدی اُس کے لیے درکار ہوگا اور نہ ایک سطر حساب لکھنے کی کچھ ضرورت پڑیگی ‘‘

آخر میں وہ اُمید ظاہر کرتے ہیں کہ اگر اُن کی تجویز پر عمل کیا گیا تو ملک کو سرسبزی اور فارغ البالی نصیب ہوگی اور خوش حالی میں اضافہ ہوگا۔

دفاتر کی زبان کا مسئلہ | اپنے دورہ میں اُنھوں نے اُن دفتری مشکلات کو بھی محسوس کیا جو مرہٹی اور تلنگی کے رواج کی وجہ سے پیش آتی تھیں اُن کے خیالات کا ماحصل حسب ذیل ہے:۔

(۱) اکثر افسروں میں اسقدر قابلیت نہیں کہ وہ مرہٹی اور تلنگی زبان میں نوشت وخواند کر سکیں اِس لیے وہ اُن اپنے ماتحت اہلکاروں کے کام کی تنقیح نہیں کر سکتے جن کے دفاتر کی زبان اُردو نہیں ہے، اس کا اثر مقدمات پر پڑتا ہے اور اہلکاروں کو معاملات کے دبا رکھنے اور دوسری ناجائز کارروائیوں کا موقع ملتا ہے۔

(۲) اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ماتحت اہلکار جو تجاویز ان زبانوں میں لکھ کر لاتے ہیں افسر اس پر دستخط کر دیتے ہیں اُن کو خود غور کرنے کا موقع نہیں ملتا۔

(۳) تعلقداران اضلاع کے پاس کام اس قدر زیادہ ہے کہ اُن کو اسقدر مہلت نہیں کہ وہ دوسری زبانوں کے کاغذات پر لفظاً غور کر کے دستخط کریں۔

(۴) جو احکام ان زبانوں میں تحصیلداروں وغیرہ کے نام لکھے جاتے ہیں، چونکہ اُن کے لکھنے والے عموماً ادنیٰ درجہ کے اہلکار ہوتے ہیں (جو ان زبانوں کو جانتے ہیں) اس لیے اُن کی

تحریریں مکتوب الیہم کے درجہ اور شان کے خلاف ہوتی ہیں، جن سے لوگوں کو شکایت پیدا ہوتی ہے حالاں کہ یہی احکام جب اُردو میں لکھے جاتے ہیں تو ایسا نہیں ہوتا۔

(۵) فرماں روائے وقت اور دکن کے اُمرا و شرفا اور اکثر عہدہ داروں کی مادری زبان اُردو ہے، اُن کو دوسری زبانوں کے سیکھنے میں دقت پیش آتی ہے، اور پھر بھی عمدہ طریقہ سے نہیں سیکھ سکتے۔ اس کے علاوہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ مرہٹی جانتے ہیں وہ تلنگانہ میں بھیج دیے جاتے ہیں یا اس کے برعکس، قطع نظر اس کے بعض اضلاع میں تھوڑے فاصلہ سے زبان مختلف ہو گئی ہے، یا بعض مقامات پر کنڑی بولی جاتی ہے لہٰذا یہ کسی طرح موزوں نہیں کہ مختلف مقامات کے دفاتر مختلف زبانوں میں قائم کیے جائیں۔

ان تمام مشکلات کو بیان کرنے کے بعد اُنھوں نے چند خاص صورتوں کو مستثنےٰ کر کے عام طور پر اُردو زبان کو رائج کرنے کی رائے دی ہے، اور اس کو نہایت ضروری قرار دیا ہے۔

اِصلاح متعلق ملازمین ریاست اس کے بعد اُنھوں نے مختلف عہدہ داروں کے کام، اختیارات تعداد اور تنخواہوں کے مسئلہ پر بحث کی ہے اور ان سب اُمور کو بدلائل بیان کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ:-

(۱) دوم و سوم تعلقہ داروں کے اختیارات میں اضافہ کیا جائے، تاکہ اوّل تعلقہ داروں کے کام میں تخفیف ہو، جن کے پاس بہت زیادہ کام رہتا ہے۔

(۲) دوم و سوم تعلقہ داروں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے، کیونکہ اکثر اضلاع کے حدود وسیع ہیں، اور عہدہ داروں کی تعداد قلیل ہے، اس وجہ سے کام میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔

(۳) تحصیلداروں کے پاس بھی کام کی اس قدر کثرت ہے کہ وہ اس کو انجام نہیں دے سکتے حالانکہ رات کو بھی کئی کئی گھنٹہ کام ہوتا ہے۔

(۴) پیش کاروں کی تعداد میں اضافہ ہونا چاہیئے۔

(۵) تحصیلداروں اور پیشکاروں کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے اور پیشکاروں کو بھتّہ بھی دیا جائے

تحصیلداروں کے صرف تین درجہ رکھے جائیں درجہ چہارم و پنجم موقوف کردیا جائے۔

(۶) پیشکاروں کو بحالت غیر حاضری تحصیلدار سرسری جرمانہ کا اختیار دیا جائے۔

(۷) تلنگانہ کے تعلقداروں کی تنخواہ اور بھتّہ میں اضافہ کی ضرورت ہے۔

سرکاری ملازمین کی حالت پر تبصرہ

اسی سلسلہ میں انھوں نے سرکاری ملازمین کی خدمات اور دیانت پر نہایت مفصّل تبصرہ کیا ہے جو عام ناظرین کے لیئے زیادہ دلچسپ نہیں ہوسکتا تاہم اُن کے بعض خیالات و آرار کا بیان بے موقع نہ ہوگا۔ عہدہ داروں کی دیانت کے متعلق وہ لکھتے ہیں:۔

"دیانت کی بحث ایک مشکل بحث ہے اور اس کی نسبت سرسری طور پر کسی رائے کا قایم کرنا مشکل تر اور ایک ایسے راستہ کا اختیار کرنا ہے جس میں ممکن ہے کہ رائے قایم کرنے والا شخص بہت سی غلطیاں کرجاوے۔ مع ہذا جب تک ہم کو کسی عہدہ دار کی بددیانتی کا کوئی ثبوت نہ ہو، ہمارا کام ہے اور حقیقت میں اس کے سوا ہم کو گریز نہیں ہے کہ ہم ہر ایک کی نسبت نیک گمان رکھیں البتہ ایک افسر جب کہ خاص اُن کے علاقوں میں دورہ کررہا ہے اور جس کو وہاں کی رعایا اور اہل مقدمات، اور ملازموں وغیرہ کے خیالات پر مختلف ذریعوں سے مطلع ہونے کا موقع ملتا ہے، اور جب کہ وہ افسر اس قدر عقل بھی رکھتا ہو کہ چالاکیوں اور فریبوں کے جال جو کبھی کبھی ایسے موقع پر اُس کے لیئے بچھائے جاتے ہیں اُن میں اپنے آپ کو پھنسنے نہ دے، تو وہ کسی بددیانت عہدہ دار کی بددیانتی کا اگر کوئی عدالتی ثبوت حاصل نہیں کرسکتا تو ایک ایسی عام رائے تو اس عہدہ دار کی نسبت قایم کرسکتا ہے جو عہدہ دار مذکور کے چال چلن سے متعلق ہو اور یہ نہ صرف ممکن الوقوع بلکہ کثیر الوقوع ہے کہ جو رائے اس طرح پر احتیاط کے ساتھ قایم کی گئی ہو وہ غلط نہ ہو۔

اسی بحث کے سلسلہ میں وہ اس طریقہ کی مخالفت کرتے ہیں کہ مشتبہ عہدہ داروں کو تبدیل کردیا جائے وہ کہتے ہیں کہ:۔

"ایسی حالت میں کسی عہدہ دار کا ایک جگہ سے تبدیل کردینا، اس کو صفائی کا صداقت نامہ

دیدینا اور نیا دروازہ اس کی بداعمالیوں کے لیئے کھول دینا ہی کہ وہ پھر ایک مدت تک رعایا کو ستایا کرے"۔

"جب کوئی عہدہ دار ایک جگہ سے تبدیل ہوجاتا ہی، تو پھر وہ لوگ بھی جن کو اس سے مضرتیں پہنچی ہوتی ہیں صرف اس کے دفع ہوجانے کو غنیمت جانتے ہیں اور آیندہ اس کے درپے نہیں ہوتے۔ پس میری رائے یہ ہی کہ جب اس قسم کی بدگمانی کسی مقام پر کسی عہدہ دار کی نسبت پیدا ہو تو اُس کو ایک مزید نگرانی کی حالت میں وہیں رکھ کر ڈھیل دینی چاہیئے تاکہ وہیں قبر کھودی جاوے اور اس کی بداعمالیاں وہیں مدفون ہوں اور آیندہ خلق اللہ اور سرکار ایسے موذیوں سے نجات پاوے لہذا میں نے کسی تبدیل کی کارروائی نہیں کی، مگر اس کے ساتھ ہی ہر ایسے شخص نے غالباً جان لیا ہی کہ وہ کس نگاہ سے دیکھا جاتا ہی اور اب وہ کس خطرناک حالت میں ہی، اور اُن میں سے بعض پر میں نے اپنے خیالات کو بقدر مناسب اور بقدر ضرورت ظاہر بھی کردیا ہی لہذا یا تو وہ اپنی عادتوں کو ترک کرکے بھلے آدمیوں کی طرح کام کرنے پر مجبور ہونگے اور یا چندروز کے بعد لامحالہ اُن کو اپنی جگہیں خالی کرنی پڑینگی"۔

اہلِ عملہ کی باہمی قرابت

اِس کے بعد اُنھوں نے اس طریقِ عمل پر بحث کی ہی کہ اہلِ عملہ کی باہمی رشتہ داری رعایا کے لیئے باعثِ مضرت اور انصاف کا خون کرنے والی ہی۔ وہ کہتے ہیں:۔

"تحصیلدار کے عملہ میں جب کوئی اہلکار تعلقہ دار ضلع کے کسی متقدر بلکہ اوسط درجہ کے اہلکاروں کا قرابت مند ہی تو اب اس کی وجہ سے تحصیلدار کی جان عذاب میں ہے جب وہ اپنے عملہ کو تنبیہ کرتا ہی اس کی صدائے بازگشت تعلقہ دار ضلع کی کچہری سے اس کے کانوں میں پہنچ جاتی ہی، اور ہوشیار پٹواری اور زمیندار تک جان جاتے ہیں کہ تحصیلدار کو جو فلاں تنبیہ صدر سے ہوئی یہ تحصیلدار کی فلاں تنبیہ کا معاوضہ ہی"

اس کے بعد لکھتے ہیں:۔

"اس ملک میں میں دیکھتا ہوں کہ ایک محکمہ کے عملے اپنا یہ استحقاق سمجھتے ہیں کہ جب وہ کسی محکمہ میں ہیں تو اس محکمہ کے افسر سے اپنے اُن ذاتی مقدمات میں مدد لیں جو کہ دوسرے محکمہ میں دائر ہوں۔ خاص کر جب کہ وہ مقدمات اُن کے محکمہ جات ماتحت میں دائر ہوتے ہیں تب تو ان افسروں کی یہ مداخلت اس قدر افسوسناک ہوتی ہے جس کا بیان نہیں ہو سکتا، وہ نہیں جانتے کہ اس کا اثر مفصل میں رعایا پر کیا پڑتا ہے، رعایا انصاف سے بالکل مایوس ہو جاتی ہے، اور کوئی ذریعہ اپنی کامیابی کا اس کے سوا نہیں سمجھتی کہ یا رشوت دیکر کام نکالنا چاہیئے، یا زبردست، زبردست، سفارشیں بہم پہنچائے تاکہ صدر کے قابو یافتہ عملوں کے اقتدارات کا مقابلہ کر سکے۔"

اسی سلسلہ میں وہ اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:۔

"ابھی چند روز کا ذکر ہے کہ میرے سامنے ایک محکمہ کے ایک معتمد عملہ نے میری اس سوال کے جواب میں کہ جب یہ مقدمہ ضلع میں دائر ہے تو تمہارے افسر جن کو اس سے کچھ تعلق نہیں کیوں اس میں دخل دیتے ہیں؟ بر سر کچہری بہت ہی سادگی کے ساتھ مجکو یہ جواب دیا کہ افسروں کی یہ پرورشی ہے، ہم اُن کے خدمت گزار ہیں اور اُن کے محکمہ سے تعلق رکھتے ہیں، میں اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔"

اس کے بعد وہ اپنا طریق عمل بیان کرتے ہیں:۔

"میرا اپنا برتاؤ ان تمام محکمہ جات سرکار عالی میں، جن میں ایک افسر ہونے کی عزت مجکو حاصل رہی ہے یہ رہا ہے کہ جہاں میرے کسی عملہ کا ذاتی مقدمہ کسی محکمہ ماتحت میں دائر ہوا اور میں نے دیکھا کہ یہ اُس میں اپنی صدریت کا اثر ڈالنا چاہتا ہے، فوراً اُس کو اپنے محکمہ سے تبدیل کر دیا، نتیجہ یہ ہو گیا تھا کہ میرے عملہ جب کہ اتفاق سے اُن کا کوئی مقدمہ کسی محکمہ ماتحت میں دائر ہوتا تھا ہر طرح احتیاط کرتے تھے کہ مجھ تک اُس کی اطلاع بھی نہ ہو، عرضیاں پیش کرنا اور روبکاریاں جاری کرنا تو درکنار، اپنے ماتحت

محکموں کی نسبت اس خرابی کا علاج ہم سرکار سے نہیں چاہتے، مجلس کو خود اسقدر قوت اور اقتدار حاصل ہے کہ عنقریب ہم ان سب باتوں کا تدارک کر دینگے۔"

سرکاری ملازمت میں ایک خاص گروہ کا اقتدار | انھوں نے اپنے دورہ میں یہ بھی محسوس کیا کہ سرکاری دفاتر میں کسی ایک گروہ کا غلبہ کس قدر مضر ہے وہ کہتے ہیں کہ :-

"ایک گروہ اور ایک قوم کا دفاتر میں کثرت سے داخل ہونا اس کی اصلی علت دفاتر میں مرہٹی اور تلنگی زبان کا استعمال ہے۔ مسلمان ان زبانوں میں دفتری کارروائی کے لایق مادہ نہیں رکھتے لامحالہ دوسرے وہی لوگ خدمتوں پر قایم ہوتے ہیں جو کہ اسی قسم کی قابلیت رکھتے ہیں اور یہ اکثر برہمنوں کا گروہ ہے۔ اسباب چاہے کچھ ہی ہوں اور کیسے ہی واجب کیوں نہ ہوں لیکن اس کے نتائج تو بے شبہ خراب ہیں مفصلات میں مسلمانوں کے لیئے سرکاری خدمات کا دروازہ گویا بند سا ہو رہا ہے اور اس سے صرف اُن کی مفلسی ہی کو ترقی نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات اُن کو مختلف قسم کی توہینیں اور دوسری پولیٹکل دشواریاں برداشت کرنی پڑتی ہیں اور بہر حال اس ہیئت اجتماعی سے بد دیانتی کو بھی ترقی ہوتی ہے اور لائق افسروں کی قوت بھی اس کے مغلوب کرنے میں اکثر عاجز ہو جاتی ہے۔"

اُن کا خیال ہے کہ اُردو زبان کے رواج سے اس خرابی کا ایک حد تک سدِّ باب ہو جائیگا۔

اصلاح طلب اُمور | اس کے بعد اُنھوں نے حسب ذیل اُمور پر مفصّل بحث کی ہے۔

(۱) بارش کی مقدار معلوم کرنے کے لیئے جابجا تالابوں پر پیمانے لگائے جائیں۔

(۲) مجلس مال گزاری کے دستور العمل میں ترمیم کی جاوے جس کی تفصیل اُنھوں نے رپورٹ میں بیان کی ہے۔

(۳) مجلس مال گزاری کے دو رکن ایک وقت میں دورہ کریں اس کی ضرورت اُنھوں نے مدلّل

طریقہ سے ثابت کی ہے اور بتایا ہے کہ بغیر اس کے ملک کی عام اصلاح نہیں ہوسکتی۔

(۴) تمام صدر تعلقہ دار (صوبہ دار) سال میں دو مہینہ کے لیے بلدہ (دار الریاست) میں جمع ہوا کریں۔ اس موقع پر سرکاری طور پر مجلسیں منعقد ہوں، جن میں مختلف عہدہ دار، اراکین مجلس مال گزاری وغیرہ جمع ہو کر اپنے تجربات اور مشکلات بیان کریں اور جدید اصلاحات اور انتظامات کے متعلق تجاویز پیش ہوں۔

(۵) صدر تعلقہ داروں (صوبہ داروں) کے ساتھ دورہ میں سرکاری طبیب رہنا چاہیئے اس ضرورت پر اُنھوں نے دلچسپ طریقہ سے بحث کی ہے اور جو دشواریاں طبیب نہ ہونے سے پیش آتی ہیں اُن کو مؤثر طریقہ سے بیان کیا ہے۔ بعض فقرات یہاں نقل کیئے جاتے ہیں۔

"ہمارا بلاشبہ یہ فرض ہے کہ ضرورت کے وقت ہم سرکاری مقاصد کے لیئے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دیں، لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارا یہ حق بھی ہے اور شاید کہ سرکار پر فرض ہے کہ جہاں تک اس کے امکان میں ہے فیاضی کے ساتھ اُن خطرات کا تدارک فرمائے جو ہماری جان سے متعلق ہیں"

اسی سلسلہ میں وہ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ "ایک موقع پر تحصیلدار نے یہ اطلاع دی کہ فلاں مقام پر ہیضہ پھیلا ہوا ہے چونکہ میرے ساتھ سرکاری طبیب موجود تھا میں نے شکریہ ادا کرنے کے بعد جواب دیا کہ:۔

"میرے دورہ کے مقاصد میں سے یہ بھی ایک اہم مقصد ہے کہ جب کسی علاقہ کی رعایا ایک عام مصیبت میں مبتلا ہو تو عین اُن کی مصیبت کے وقت میں اُن کی حالت کو دیکھوں تاکہ جو کچھ مجھ سے اُن کی ہمدردی ممکن ہے میں کروں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر میرے ساتھ طبیب نہ ہوتے تو بھی میں ایسا پر اخلاق جواب تحصیلدار کو دیتا یا نہیں"

اس کے بعد وہ بیان کرتے ہیں کہ:۔

"ایک مہینہ ۲۸ دن کے سفر میں طبیب صاحب نے، ۵۵ شخصوں کو دوا دی جن میں سے ۳۱۹ میں، میں اور میرے ہمراہی ملازمان سرکاری و ذاتی شامل ہیں اور ۵۹ شخص تعلقہ دار و صدر تعلقہ دار و تحصیل وغیرہ کے علاقہ میں سے ہیں جو کہ دورہ میں کبھی کبھی میرے ساتھ رہے ۱۷۹ اُن دیہات کے باشندے ہیں جہاں ہو کر ہمارا گزر ہوا۔"

(۶) بلدہ" اور "ہنم کنڈہ" کی سڑکوں پر مسافر بنگلوں کی تعمیر کی ضرورت بھی اُنھوں نے ثابت کی ہے۔

(۷) مفصلات میں عہدہ داروں کے لیئے سرکاری مکانات تعمیر کرنے کی ضرورت ظاہر کی ہی جو بکرایہ اُن کو دیئے جائیں۔

(۸) چند مقامات کے متعلق یہ تجویز کیا ہی کہ وہاں کچہری اور دفتر کے لیئے سرکاری مکانات تعمیر کیئے جائیں، اِسی سلسلہ میں وہ بیان کرتے ہیں کہ :-

"ضلع ناگر کرنول میں میں کچھ مثلیں دیکھ رہا تھا، مجکو معلوم ہوا کہ مثلوں کے فیصل ہو جانے کے بعد شاید اُن کی نسبت عمدہ طور سے کارروائی نہیں ہوتی، لیکن جب میں نے محافظ خانہ کو دیکھا تو تمام اصلاح و درستی کے خیالات کو بالائے طاق رکھ دیا اور لوٹ کر اپنی جگہ پر آ بیٹھا، مکان تنگ اور اُس پر کمزور، دفتر بالکل غیر محفوظ حالت میں، ایک بڑا حصہ کاغذات دیہی کے بستوں کا گنجِ شہیداں کی طرح اوپر تلے بغیر کسی ترتیب کے بطور ایک انبار کے لگا ہوا ہی، ہم بلدہ میں بیٹھے ہوئے دفتر کی ترتیب کے لیئے دستور العمل تصنیف کرتے ہیں، یہاں دفتر خانہ کا خود یہ حال ہی تو ممکن نہیں کہ کوئی ترتیب عمل میں آسکے۔"

(۹) اس کے بعد وہ بیگاریوں کے معاملہ پر بحث کرتے ہیں جن پر حکام کے دورہ کے زمانہ میں مصیبت نازل ہوتی ہی یہاں تک کہ سرکار نے از راہ ترحم و انصاف جو اُجرت اُن کے لیے تجویز کی ہی

وہ بھی اُن کو نہیں دی جاتی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان مُصیبت زدہ لوگوں کو مختلف طور پر ستایا جاتا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ:۔

"خود میں نے اپنے دورہ میں ایک جگہ دیکھا کہ ایک عورت بیگار کے واسطے پکڑ لائے تھے جس کی پنڈلی میں پھوڑا تھا اور اُس میں سے خون جاری تھا۔ یہ عورت مجکو اُس وقت راستہ میں ملی جب کہ اپنا اسباب پہونچا کر لوٹی جاتی تھی۔ عورت کے ساتھ اگرچہ میں نے اور بعض رعایتیں کیں جس سے وہ اپنی تکلیف کو بھول گئی ہوگی، لیکن مجکو بہت افسوس رہا کہ وہ موقع میرے ہاتھ سے جاتا رہا تھا کہ اُس کے پکڑنے والوں کو میں سزا دے سکتا۔ جب یہ واقعہ میری موجودگی میں ہوا جب کہ لوگوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ میری طبیعت ایسے اُمور میں کیسی ہے تو اس سے بآسانی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ کس قسم کا برتاؤ ایسے مواقع پر غریب رعایا کے ساتھ ہوجاتا ہوگا۔"

وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"ایک بے زبان خلقت جب کہ مدتوں سے اپنے حقوق کی پامالی پر صبر کرچکی ہے، تو بہت ہی مشکل سے اب اُن میں ایسی روح پھونکی جاسکتی ہے جس سے زندہ دلی کے ساتھ وہ اپنی حق تلفیوں کی شکایت کی آواز بلند کرسکیں اور کوئی فریادرس اُن کی فریاد کو پہنچے۔"

(۱۰) رعایا کی تکالیف کے سلسلہ میں اُنھوں نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ حکام کے دورہ کے وقت گھانس لکڑی، اور مٹی کے برتن وغیرہ جو فراہم کیے جاتے ہیں اُن کی قیمت نہیں دی جاتی بلکہ رعایا سے جبریہ طور پر یہ چیزیں وصول کی جاتی ہیں، اُن کا بیان ہے کہ:۔

"مرغیوں کی قیمت اکثر جگہ میں نے چار پیسہ فی مرغی پائی اور معلوم ہوا کہ تلنگانہ بھر میں یہی حال ہے۔ چند روز تک تو مجکو کچھ خیال نہیں ہوا، لیکن اس کے بعد

متحقق ہوا کہ یہ شرح بھی جبریہ شرح ہے جو ہم لوگوں نے خود مقرر کر رکھی ہے۔
تب میں نے چاہا کہ اصل مالکوں سے معاملہ کیا جائے، اُس وقت دریافت ہوا
کہ جو ایک جبریہ شرح قیمت کی ٹھیری ہوئی ہے وہ بھی شاذ و نادر ہی اصل مالکوں
کو پہونچتی ہے ورنہ مرغیاں بھی اسی طرح اکثر دیہات متصلہ سے جمع کر کے حاضر
کی جاتی ہیں"۔

(۱۱) اصلاحات کے سلسلہ میں وہ یہ رائے بھی دیتے ہیں کہ ضلع ناگر کرنول کا نام اعلیٰ حضرت کے
مبارک نام پر محبوب نگر رکھا جائے۔

(۱۲) محبوب نگر اور بلدہ کے مابین تار برقی کا سلسلہ قایم کیا جائے۔

شکریہ آخر میں اُنھوں نے مختلف صیغوں کے عہدہ داروں اور عام ملازمین و پولیس کا شکریہ ادا کیا ہے جنھوں نے دورہ میں اُن کی مدد کی اور سہولتیں بہم پہونچائیں۔ اس کے بعد مدار المہام کا شکریہ ادا کیا ہے کہ اس سے پہلے کہ مکمل رپورٹ جناب ممدوح کے سامنے پیش ہو رپورٹ کی زیر تحریر اجزا پر غور فرما کر اکثر تجاویز کو منظور فرمایا اور اُس کے متعلق باضابطہ احکام[۱] جاری فرمائے۔

---

[۱] مولوی مشتاق حسین کے اس دورہ کے پانچ سال بعد جب نواب بشیر الدولہ سر آسمان جاہ بہادر مدار المہام صوبہ شرقی کے دورہ پر گئے تو رزیڈنٹ بھی ہمراہ تھے اور نواب محسن الملک بھی موقع پر موجود تھے۔ معائنہ دفاتر کے وقت رزیڈنٹ نے مولوی مشتاق حسین کی اس رپورٹ کا ذکر کیا۔ اس واقعہ کو ہم خود نواب سر آسمان جاہ مدار المہام کے الفاظ میں لکھتے ہیں۔ جناب ممدوح سرکاری جریدہ میں اپنے دورہ کے حالات کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔
"صاحب عالی شان بہادر (رزیڈنٹ) کے اس استفسار پر کہ جو نقص نواب انتصار جنگ نے اپنے دورہ کی رپورٹ میں ظاہر کئے ہیں اُن میں کچھ اصلاح ہوئی ہے یا نہیں؟ بیان کیا گیا کہ وہ نقصانات تمام تر دور کر دیے گئے ہیں اور اُن شکایتوں میں سے کوئی بھی اب باقی نہیں ہے، بلکہ اس کے بعد بھی جو نقصانات وقتاً فوقتاً دریافت ہوئے اکثر اُن کو رفع کیا گیا ہے۔ مثلاً:۔
(۱) پیمایش کا طریقہ جس سے پٹواریوں کو ناواجب جمع بڑھانے اور کاشتکاروں کو ستانے کا موقع

(باقی بر صفحہ آیندہ)

سر سالار جنگ ثانی کا ریمارک

یہ زمانہ سر سالار جنگ ثانی کی مدار المہامی کا تھا اور اگرچہ دربارِ وزارت میں رسوخ و اقتدار کے لحاظ سے مولوی مہدی علی خاں اس زمانہ میں سب سے زیادہ نمایاں تھے، لیکن مولوی مشتاق حسین بھی اپنے مخصوص اوصاف کی بنا پر سر سالار جنگ ثانی کی نظر میں خاص وقعت رکھتے تھے، اور اپنی محنت، دیانت اور راستبازی کے لحاظ سے اپنے ہمعصروں میں ممتاز تھے۔ ان وجوہ سے مدار المہام اُن کے دورہ کی اہمیت کو خاص طور پر محسوس کرتے تھے

(بقیہ نوٹ ص ۱۰۱) ملتا تھا جاتا رہا، اور بجز صوبہ دار کی منظوری کے اختیار نہیں ہے کہ کوئی کسی کھیت کو جو کہ سالم مزروعہ ہوا ہو پیمایش کرلے اور جس قدر رقبہ زیادہ نکلے اس پر سابق کے دھارہ سے جمع بڑھا دے۔

(۲) جس طرح سالم کھیت کے اُفتادہ رہنے پر جمع معاف ہو جاتی ہے اسی طور پر کسی جزو کے فرو دہ نہونے پر اس حصہ کے موافق جمع معاف کی جاتی ہے وہ قاعدہ کہ جب تک ایک چوتھائی کھیت اُفتادہ نہ ہو جمع معاف نہ ہو منسوخ کردیا گیا۔

(۳) رعایا کو راضی نامہ دینے میں اور جو کھیت منجملہ اپنے مقبوضہ کھیتوں کے وہ چھوڑنا چاہیے چھوڑنے میں آزادی نہ تھی اس خیال سے کہ نرم جمع کے کھیت رکھ کر سخت جمع کے کھیت وہ چھوڑتے ہیں راضی نامہ منظور نہ کیا جاتا تھا اب اُن کو پوری آزادی دیگئی ہر کاشتکار کو اختیار ہے کہ کوئی بھی کھیت خواہ جمع اسکی نرم ہو یا سنگین وہ چھوڑنا چاہے، چھوڑ سکتا ہے۔ اور راضی نامہ اس کا منظور کیا جاتا ہے۔

(۴) قسطیں مال گزاری کے وصول کرنے کے جو ایسے وقت پر تھیں کہ کاشتکار اپنا مال فروخت نہ کر سکتے تھے، اور اس سے وہ بجائے سود پر رقم ساہوکاروں سے لینے پر مجبور ہوتے تھے تبدیل کردی گئیں، اور انکا وہ وقت مقرر کیا گیا جب کہ مال کھیتوں میں تیار ہو جائے، اور کاشتکار فروخت کرسکیں۔

(۵) کاشتکاروں کے اُفتادہ کھیتوں کی گھانس جو ہراج (نیلام) ہوا کرتی تھی اور جس سے تحصیلداروں کو فرضی خریدار بنانے اور رعیت سے زبردستی اس کی رقم وصول کرنے کا موقع ملتا تھا وہ قاعدہ موقوف کردیا۔ وغیرہ ذالک۔

مندرجہ بالا اصلاحات ۱۲۹۳ و ۱۲۹۴ ف کی رپورٹوں کے مطابق عمل میں آئیں۔

اور جو اطلاعیں اور یادداشتیں وہ مختلف اوقات میں بھیجتے رہتے اس پر خاص توجہ کرتے اور مزید حالات کے منتظر رہتے، یہاں تک کہ جب رپورٹ مکمل ہو کر اُن کی خدمت میں پیش ہوئی تو اُنھوں نے اس کو بالاستیعاب پڑھ کر مفصل تبصرہ لکھا۔

مولوی مشتاق حسین نے جو تجویزیں پیش کی تھیں اُن میں سے اکثر کو مدار المہام نے منظور کیا۔[لہ] گویا اس دورہ کی وجہ سے ملک میں بہت سی اصلاحات عمل میں آئیں چند تجاویز سے اُنھوں نے اختلاف کیا اور اختلاف کے وجوہ لکھے۔ غرض اُنھوں نے گہری نظر سے رپورٹ کا مطالعہ کر کے تمام جزئیات پر مفصل بحث کی، اور مولوی مشتاق حسین کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اُن کا شکریہ ادا کیا، ہم اس تبصرہ کا صرف پہلا اور آخری فقرہ یہاں نقل کرتے ہیں۔

"کیفیت دورہ مولوی مشتاق حسین صاحب بابتہ ۱۲۹۳ ف بملاحظہ مدار المہام سرکار عالی درآمد و بہ غور تمام بر جملہ مراتب مندرجہ اش نظر کردہ شد، ہمانا ایں اولیں کیفیت ست کہ رو بروئے سرکار بہ ایں خوبی و جامعیت پیش شدہ

لہ مولوی مشتاق حسین نے ۱۲۹۴ ف کے دورہ کی رپورٹ میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ نواب مدار المہام کی توجہ سے ۱۲۹۳ ف کے دورہ سے رعایا کو بہت فائدہ پہونچا، چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"رعایا ان مشکلات سے بہت کچھ آزاد ہو گئی جس میں وہ صدر المہام مال گزاری کی گشتی نشان ۱۱ سنہ ۱۲۹۲ھ اور بعض دوسرے تکلیف دہ احکام کی وجہ سے سالہا سال سے مبتلا چلی آتی تھی اُن کی مزروعہ زمینوں کی سالانہ پیمایش اور اُس پیمایش کے اضافہ کی وجہ سے سالانہ جمع کا اضافہ جو اُن کے حق میں بہت ہی مہلک تھا، یک قلم موقوف ہو گیا۔ تری حال خشکی کے دہاروں سے اُس کو نجات ملی، اور وہ اس قابل ہوئے کہ بدہنگامی کے وقت میں، اطمینان کے ساتھ ایک ہلکے سے خشکی کے دہارہ کے ساتھ، تری زمینوں میں خشکی کی سیر حاصل پیداوار سے اپنی اور اپنے بال بچوں کی پرورش کریں، اُن کے قطعات اُفتادہ کی گھانس کا ہراج (نیلام) جس سے زمین باوجود اپنی اس فراخی کے اُن پر

(باقی بر صفحہ آیندہ)

وچنانچہ مقصود سرکار از دورہ عہدہ داران بالادست ست کماحقہ ازیں
کیفیت حاصل شدہ لہذا مدارالمہام سرکار عالی بکمال خوشنودی خود از محنت
وسرگرمی مولوی مشتاق حسین ظاہر نمودہ بنسبت مراتب ضروری احکام ذیل
صادر می فرمایند۔"

آخر میں لکھتے ہیں :-

"مدارالمہام سرکار عالی بکمال تحسین کارگزاری مولوی مشتاق حسین صاحب
می نمایند۔ درحقیقت مولوی صاحب موصوف نہ صرف فرائض منصبی خود را
ادا نمودند و لیاقت خود را ظاہر کردند بلکہ بکمال غور و تحمل بر تمام کاروائیہائے
اضلاع نظر نمودند تا بامکان کار کثیر در مدت قلیل نمودند۔ بخاتمہ کلام مدارالمہام
سرکار عالی از تہ دل اظہار شکریہ محنت مولوی مشتاق حسین صاحب می نمایند۔"

تخفیف مجلس مال گزاری دورہ کی رپورٹ اور سر سالار جنگ کے ریمارک سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بحیثیت
رکن مجلس مولوی مشتاق حسین کا کام کس قدر شاندار قابل ستایش تھا اور انھوں نے اپنے دورہ
میں کیسی عمیق نظر سے ملنگانہ کی عام حالت کا معائنہ کر کے مفید اصلاحات پیش کی تھیں، لیکن ابھی ان
اصلاحات پر پورے طور پر عملدرآمد بھی نہیں ہوا تھا کہ انتظامی تغیرات کے سلسلہ میں مولوی مشتاق حسین
کے دورہ کے ۶ ماہ بعد خود مجلس مالگزاری تخفیف کر دی گئی، چنانچہ ۱۶ ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ کو انتظامی
اصلاحات کے متعلق سالار جنگ ثانی کا جو اعلان شائع ہوا، اُس میں مجلس مالگزاری کے متعلق
حسب ذیل الفاظ میں اظہار خیالات کیا گیا۔

(بقیہ نوٹ ص ۱۰۳) بالکل تنگ ہو گئی تھی موقوف کر دیا گیا، اس کے سوا اور بھی کتنی ہی
سہولتیں رعایا کو حاصل ہوئیں جن کا ذکر اپنے اپنے مقام پر کیا گیا ہے، اور جن کے لیئے وہ
رعایا اور میں دونوں سرکار عالی کے مراحم خسروانہ کے شکر گزار ہیں۔"

"از تجربہ بخوبی ثابت شدہ کہ من جملہ دفاتر صدر تعلقہ داران و مجلس مالگزاری بہ نظر آسانی کارے کہ لائق تخفیف ست لہذا بریں امر ضروری کماحقہ غور نمودہ شد، چونکہ ہر دو دفاتر برائے نگرانی انتظام ہستند فرق ہمین ست کہ قیام صدر تعلقہ داران در اضلاع می باشد و نگرانی ایشاں مقامی ست و ارکان مجلس در مرکز ریاست می باشند و رسیدن اہل مقدمات تابلدہ از مقامات بعیدہ دشوار ست و نگرانی تمامی اضلاع و تعلقات ازیں جا مشکل ست،

و بہ نظر وسعت آبادی ایں ریاست و بلحاظ کارہائے مختلفہ و علاقہ جات متعددہ کہ نگرانی و انتظام در اضلاع بدست یک عہدہ دار اعلیٰ ضرور ست و بہ حیثیت داشتن وقعت و عزت او ہم بر جمیع ملازمین و رعایا ہم چنیاں باشد کہ برائے اغراض سرکاری و انتظام ہر علاقہ و دادرسی رعایا مفید بود لہذا بعد استشارہ صاحب عالی شان بہادر کہ در ہمچو امور تجربہ کامل دارند و برائے درستی انتظام علاقہ سرکاری ہمیشہ اعانت دوستانہ می دہند، قرار یافت کہ مجلس مال گزاری تخفیف کردہ شود و درجہ صدر تعلقہ داران را از حالت موجودہ ترقی دادہ شود تا نقصانے کہ از تخفیف مجلس مال گزاری میشود تلافی آں گردد، و در انتظام کارہائے سرکاری سہولت و آسانی شود لہذا ہر سمت موسوم بہ صوبہ و صدر تعلقہ دار را لقب ناظم صوبہ دادہ میشود و افسری علاقہ سرکاری بہ ایں ناظم متعلق خواہد بود، و اختیاراتے کہ مجلس مال گزاری را حاصل بودند بہ اصلاح ضروری بہ اینہا حاصل خواہند بود و دستور العمل کہ در آں تشریح اقتدارات و طریقہ کارروائی بہ تفصیل مذکور ست عن قریب جاری و مشتہر کردہ میشود۔

دریں مقام سرکار را اظہار ایں امر ضرور ست کہ مجلس مال گزاری فرض منصبی

خود را بکمال محنت و استقلال امانت انجام داد و بعد وفات مدار المہام مرحوم
نگرانی و انتظام دفاتر ماتحت کماحقہ نمود چونکہ صاحب عالی شان بہادر نیز از
اظہار خوشنودی خود از کار مجلس و تصدیق لیاقت ہر رکن مجلس در تحریر خود
می فرمایند و بسرکار امیدست کہ از انتظام فائدہ بسیار بسرکار و رعایا
خواہد شد"

نظامتِ صوبہ — غرض اس اعلان کے بعد ربیع الاول ۱۳۰۲ھ (جنوری ۱۸۸۵ء) کو مجلس مال گزاری تخفیف کردی گئی اور مجلس کے ہر سہ ارکان ایک ایک صوبہ کے ناظم بنا کر بھیجدیئے گئے چنانچہ مولوی مشتاق حسین کو صوبہ شرقی کا ناظم بنایا گیا مجلس کے دوسرے عہدہ دار بھی مختلف محکموں میں بھیجدیئے گئے، اس عہدہ پر آنے کے بعد مولوی مشتاق حسین کی تنخواہ ایکہزار سات سو قرار پائی۔

خطاب بہادری و جنگی — جدید عہدہ پر سرفراز ہونے کے چندروز بعد ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۵ء) میں اعلیٰ حضرت کے دربار سال گرہ کے موقع پر نواب مختار الملک سالار جنگ ثانی کی سفارش سے مولوی مشتاق حسین کو خان بہادر انتصار جنگ کا خطاب بارگاہِ خسروی سے عطا ہوا گویا اس طریقہ سے نواب مدار المہام اور اعلیٰ حضرت آصف جاہ سادس نے ایک وفادار اور کارگزار افسر کے متعلق باقاعدہ طور پر اپنی خوشنودی اور قدر شناسی کا اظہار فرمایا۔

مولوی مشتاق حسین کو یہ خطاب بلاسعی وطلب ملا تھا، جیسا کہ وہ خود ایک موقع پر سر آسماں جاہ کو لکھتے ہیں:۔

"جنگی کا خطاب بھی جب مجکو ملا ہے تو میری کوئی درخواست اس کی نسبت
نہیں تھی بلکہ مجکو اس وقت اس قدر مہلت بھی نہ ملی کہ میں اپنا کوئی عذر بھی
اس کی نسبت اطمینان سے پیش کرتا، صبح کو دربار تھا رات کو حکم پہونچا کہ

لے غرّہ اسفندار ماہ الٰہی ۱۲۹۴ف

کل دربار میں خطاب ہوگا دو نذریں لے کر حاضر ہو، یہ بھی اُس وقت تک معلوم
نہ ہوا کہ کیا خطاب ہوگا، خطاب کا لفظ بھی نواب مختار الملک مرحوم ثانی نے
خود تجویز فرمایا تھا، دربار کے وقت کے قریب تک مجکو اس کی صحیح اطلاع
نہ تھی۔"

اِس زمانہ تک جن لوگوں کو "جنگی" خطاب حاصل ہوتا تھا اُن کے نام کے ساتھ نواب کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا تھا، لیکن چند روز بعد کرنل مارشل پرائیوٹ سکرٹری اعلیٰ حضرت کے زمانہ میں سرکاری طور پر خطاب یافتہ اشخاص کو لفظ نواب کے استعمال کی اجازت دے دی گئی اس بنا پر مولوی مشتاق حسین بھی اس زمانہ سے "نواب انتصار جنگ بہادر" کے نام سے مشہور ہوئے اور اپنے تمام زمانہ صوبہ داری میں اسی خطاب سے شہرت پائی۔

صوبہ داری | ۲۵ ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ کو ناظم صوبہ کا لفظ بدل کر صوبہ دار کا لفظ تجویز کیا گیا۔ اِس بنا پر نواب انتصار جنگ بھی صوبہ دار قرار پائے اور اُن کا احاطہ حکومت "صوبہ شرقی" اور زمانہ مابعد میں صوبہ ورنگل کے نام سے مشہور ہوا۔

ناظم یا صوبہ دار مقرر ہونے پر وہ فوراً اپنے دار الحکومت کو روانہ نہیں ہوئے بلکہ بلدہ میں رہ کر بعض سرکاری خدمات انجام دیتے رہے، چنانچہ، ۱۸ رجمادی الاخریٰ ۱۳۰۲ھ اُردی بہشت ۱۲۹۴ف کو وہ معتمد مال گزاری کے ذریعہ سے نواب مدار المہام کو لکھتے ہیں:-

"بعد از شکست مجلس ہر قدر مدت کہ در بلدہ بودم اوقات کارگزاری و حاضر باشی
محکمہ در ابتدا، ابتدا، خود بضروریات سرکاری و در آخر آخر بوجہ علالت بعضے
از عزیزاں آں قدر مختل بودند کہ بالالتزام تعمیل حاضر باشی محکمہ از ساعت
یازدہ تا ساعت پنج کہ کم از کم درکار بود صورت نہ بست، گو کہ بہ یقین گفتن میتوانم
کہ اگر تمام اوقات کہ در آں بکارہائے سرکاری مشغول ماندم جمع نمودہ شود،
روزانہ آں از نصاب خاص بدرجہ زائد خواہد شد۔"

یہ تحریر اُنھوں نے مارکیٹ پلی سے لکھی ہے غرہ اردی بہشت کو وہ اپنے مستقر حکومت کو روانہ ہو چکے تھے اور وہاں ۱۲ روز قیام کرکے ۲۸ اُردی بہشت کو صوبہ کے دورہ کے لیئے نکلے تھے اس زمانہ میں صوبہ کا مستقر بھونگیر تھا، انھوں نے اپنے زمانہ صوبہ داری کی پہلی سہ ماہی میں ۱۰۸ روز دورہ کیا جس کی کل مسافت ۶۴۶ میل تھی۔

صوبہ شرقی نواب انتصار جنگ جس حصہ ملک کے صوبہ دار تھے وہ صوبہ شرقی کے نام سے موسوم تھا، حیدرآباد میں صوبوں کے رقبہ اور حدود میں برابر تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے، چنانچہ نواب انتصار جنگ کے عہد صوبہ داری کے بعد بھی چند اہم تبدیلیاں ہو چکی ہیں یعنی بعض اضلاع ایک صوبہ سے علیحدہ کرکے دوسرے میں شامل کردیئے گئے۔ اس کے علاوہ انتظامی تغیرات اور ترقی کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا، نواب انتصار جنگ کے زمانہ میں صوبہ داروں کے اختیارات نہایت وسیع تھے، اُن کو صوبہ کے قریباً ہر محکمہ پر اقتدار حاصل تھا، صوبہ دار اپنے مقام پر نہایت جاہ و حشم سے رہتے اور بڑی شان و شوکت سے ملک کا دورہ کرتے تھے۔ گویا اس عہد تک قدیم مشرقی انداز باقی تھا اور دولتِ مغلیہ کی برباد شدہ عظمت کے آثار حیدرآباد میں جابجا نظر آتے تھے لیکن زمانہ مابعد میں تمام حالات بدل گئے۔

اب کشمکش اور بدانتظامی کے دور کا خاتمہ ہو چکا ہے اور اکثر اصلاحات جن کا اُس زمانہ میں آغاز ہوا تھا مکمل ہو گئی ہیں اس لیئے آج ہم اُس عہد کی حالت کا اندازہ نہیں کر سکتے اور نہ اُن مشکلات کو صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں جن کا آغاز اصلاح کے موقع پر کام کرنے والوں کو مقابلہ کرنا پڑا، اور اسی سبب سے ہم اُن کے کام کی اہمیت کو بھی پورے طور پر محسوس نہیں کر سکتے، لیکن واقعات کے سرسری مطالعہ سے ناظرین کو ایک حد تک اس امر کا اندازہ ہوگا کہ اس زمانہ میں ملک انتظامی حیثیت سے بالکل ابتدائی حالت میں تھا، اور اصلاحات و احکام کا نفاذ اس قدر سہل نہ تھا جس قدر ہم آج خیال کر سکتے ہیں، سرسالار جنگ اور ہندوستان کے دوسرے نامور اور مُدبر عہدہ داروں نے اپنی طویل اور پُرمشقت زندگی اس مقصد کے لیئے صرف کی جب حیدرآباد اپنے سفر کے دشوار گزار

ابتدائی منازل طے کرکے اس مرتبہ پر پہونچا جہاں آج ہم اس کو دیکھ رہے ہیں۔

صوبہ شرقی کی وسعت اور آبادی

جس زمانہ میں نواب انتصار جنگ صوبہ شرقی کے صوبہ دار بنائے گئے اُس زمانہ میں صوبہ[1] شرقی کے رقبہ و آبادی وغیرہ کی کیفیت حسب ذیل تھی:۔

رقبہ ۲۰۴۰۷ مربع میل، اس صوبہ کے حدود یہ ہیں، شمال میں صوبہ شمالی، جنوب میں دریائے کرشنا، مشرق میں دریائے گوداوری، اور احاطہ مدراس کے اضلاع کرنول و گنتور و مچھلی بندر اور مغرب میں ضلع اطراف بلدہ اور صوبہ جنوبی، منجملہ اس رقبہ کے ۱۹۴۵۹ مربع خالصہ رعیتواری زیادہ سے زیادہ عرض شرقاً و غرباً ۲۵۲ میل، اور طول شمالاً و جنوباً ۱۵۷ میل۔

آبادی ۱۷۱۷۶۳۰، ۱۷ لاکھ، ۱۷ ہزار ۶ سو تیس۔

اس صوبہ میں حسب ذیل ۳ ضلع تھے۔

---

[1] ملک کی تقسیم قومی آبادی کے لحاظ سے تین طبقوں میں ہے۔ مرہٹواری، تلنگانہ، کرناٹک، شمالی مغربی ملک میں چونکہ مرہٹے رہتے ہیں اس وجہ سے وہ مرہٹواری کہلاتا ہے، تلنگانہ مشرقی کہلاتا ہے۔ اس میں تلنگی قومیں آباد ہیں، جنوب مغربی طبقہ کرناٹک ہے، اس میں کنڑے آباد ہیں ان اقوام کی آبادی ان طبقوں سے مخصوص ہے۔

انتظام کے لحاظ سے ملک چار صوبوں اور ۱۶ ضلعوں پر منقسم ہے اور ہر ضلع میں کئی تعلقات اور مواضعات ہیں۔

زمانہ قدیم میں ملک کی تقسیم صوبہ سرکار اور محال پر تھی ۱۲۷۵ف میں سر سالار جنگ اول مرحوم نے اسمات اضلاع تعلقات، تحصیل پر تمام ملک کو تقسیم کیا بعد انتظام ضلع بندی کے جب نواب سر سالار جنگ اعظم مرحوم کو اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ تعلقہ داران اضلاع کی نگرانی کے لیے چند افسروں کا تقرر کیا جائے۔ تو مرحوم ممدوح نے ممالک محروسہ سرکار عالی کو پانچ اسمات میں تقسیم فرمایا، اور ہر ایک سمت کے لیئے ایک ایک محکمہ صدر تعلقہ داری قایم کیا گیا،

(ماخوذ از بستان آصفیہ)

(۱) کھمم (اس ضلع کا نام اب ورنگل رکھا گیا ہے)

(۲) نلگنڈہ

(۳) ناگر کرنول (اس ضلع کو اب محبوب نگر کہتے ہیں)

اوّل الذکر ضلع کا رقبہ ۹،۷،۹ مربع میل اور آبادی ۶،۷،۵،۷،۲۶ تھی یہ ضلع ۹ تعلقات اور ۱۶۱۴ دیہات رعیتواری پر مشتمل تھا، اس ضلع کا عرض بجانب مشرق و مغرب ۱۵۰ میل اور طول بجانب شمال و جنوب ۱۳۴ میل تھا، اس کے شمال میں ضلع ایلگنڈل جنوب میں دریائے کرشنا و ضلع گنتور احاطہ مدراس، مشرق میں دریائے گوداوری اور احاطہ مدراس کا ضلع مچھلی بندر اور مغرب میں اضلاع ایلگنڈل و نلگنڈہ واقع ہیں، اسی ضلع میں مشہور تعلقہ ورنگل بھی تھا جس کا رقبہ ۸۴۴ مربع میل اور آبادی ۱۳۱۸۰۰ تھی، اور ضلع کی آبادی ۵۸۰۶۹۵،۷ نفوس پر مشتمل تھی۔

ثانی الذکر ضلع کا رقبہ ۱۳۱۴ مربع میل ہے، اس کے شمال میں ضلع کھمم جنوب میں دریائے کرشنا جو اس ضلع کو احاطہ مدراس کے اضلاع کرنول اور گنٹور سے جدا کرتا ہے مشرق میں ضلع ناگر کرنول اور تعلقات صرف خاص، مغرب میں اضلاع اطراف بلدہ اور ناگر کرنول واقع ہیں، اس ضلع کا زیادہ سے زیادہ عرض بجانب مشرق و مغرب ۷۷ میل اور طول بجانب شمال و جنوب ۸۶ میل تھا، ضلع ۵ تعلقہ پر مشتمل ہے اور دیہات رعیتواری کی تعداد ۱۰۷ ہے۔ ضلع کی مجموعی آبادی ۳۶۷،۸۱۹ تھی۔

آخر الذکر ضلع ۷،۹۴۶[1] مربع میل ہے، اس کے شمال میں ضلع اطراف بلدہ۔ جنوب میں دریائے

---

[1] نواب انتصار جنگ نے ۱۲۹۴ف کی سالانہ رپورٹ میں اس ضلع کا رقبہ ۵۵۴۹ مربع لکھا ہے اسی طرح اضلاع کی آبادی اور دیہات کی تعداد میں بھی کسی قدر اختلاف ہے، مثلاً انھوں نے ۱۲۹۴ف میں ضلع کھمم کے دیہات خالصہ کی تعداد ۱۶۰۳ نلگنڈہ کے دیہات کی تعداد ۱۳۱۸ اور ضلع ناگر کرنول کے دیہات کی تعداد ۱۲۹ بیان کی ہے۔ چونکہ وہاں کے اضلاع میں جلد جلد تغیر ہوتا رہا ہے اس لیے مختلف سنین کے جغرافیہ میں اس قسم کا اختلاف ناگزیر ہے۔

کرشنا ہی جو اس ضلع کو احاطہ مدراس کے ضلع کرنول سے علیحدہ کرتا ہی، مشرق میں ضلع نلگنڈہ اور مغرب میں صوبہ جنوبی واقع ہی، عرض بجانب مشرق و مغرب ۱۰۲ میل اور طول شمال سے جنوب تک ۸۵ میل ہی، ضلع آٹھ تعلقہ پر منقسم ہی، دیہات کی تعداد ۸۰۴ ہی۔

مندرجہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ نواب انتصار جنگ جس صوبہ پر حکمرانی کرتے تھے، وہ رقبہ و آبادی کے لحاظ سے ہندوستان کی اکثر مشہور اور نامور ریاستوں سے زیادہ وسیع و آباد تھا بلکہ اپنی وسعت کے لحاظ سے یورپ کی بعض خود مختار سلطنتوں کے ہم پایہ تھا۔

اِصلاحات

اب نواب انتصار جنگ ایک وسیع صوبہ کے گویا مطلق العنان حکمراں تھے، اس زمانہ میں عام رعایا پر حکومت کی اس قدر ہیبت تھی اور صوبہ دار اپنے حدود صوبہ کے اندر اس قدر با اختیار ہوتے تھے کہ جو چاہتے تھے کرتے تھے کسی کو شکوہ و شکایت کی جرارت نہیں ہوتی تھی، صوبہ دار کی شخصیت تو بہت بلند تھی، تعلقہ دار اور تحصیلدار بھی رعایا پر گوناگوں مظالم کرتے تھے، اور رعایا صبر کے ساتھ برداشت کرتی تھی، حکام کے اس طرز عمل کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ شخصی حکومت کے طریقہ اور پیہم انقلابات کی وجہ سے کوئی سرکاری عہدہ دار اپنی حالت پر مطمئن نہ تھا، سازشوں کا ایک طوفان برپا تھا جس کا انجام عموماً یہ ہوتا تھا کہ جو لوگ آج صاحب اقتدار ہیں، کل پابہ جولاں نظر آتے تھے، یا کم سے کم ملازمت سے دستکش ہونے پر مجبور ہو جاتے تھے ۔ اس بنا پر ہر عہدہ دار یہ چاہتا تھا کہ اس چند روزہ اقتدار میں جو کچھ وہ حاصل کر سکتا ہی حاصل کر لے، اس کے علاوہ یوں بھی ریاست کے حکام مطلق العنانی کے خوگر ہوتے تھے، لہذا حکومت کا یہ طریقہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔

دورہ

نواب انتصار جنگ کی حالت عام عہدہ داروں سے مختلف تھی، وہ اپنے اقتدار سے رعایا کو فائدہ پہونچانا اور ماتحت عہدہ داروں کے مظالم کو روکنا چاہتے تھے، اُن کی یہ عادت تھی کہ وہ جو کام کرتے تھے، اُس پر پورا قابو حاصل کر لیتے تھے، اور اپنی کام کی تمام جزئیات سے واقف ہونا ضروری سمجھتے تھے، اس لیئے صوبہ دار مقرر ہونے کے بعد انھوں نے یہ ارادہ کیا کہ تمام صوبہ کا دَورہ کرکے رعایا کی عام حالت کا بچشم خود مشاہدہ کریں۔ لیکن ابتدا میں سرکاری کاموں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ دورہ کے لیئے مناسب موسم باقی نہیں رہا۔ تاہم اُنھوں نے کام سے فراغت پاتے ہی ۲۰ جمادی الاولی ۱۳۰۲ھ (۸ مارچ ۱۸۸۵ء) کو دورہ شروع کر دیا جو ۲۵ رمضان (۱۰ جولائی ۱۸۸۵ء) تک جاری رہا، اس چار ماہ کی مدت میں اُنھوں نے ۱۱ روز بھونگیر میں قیام کرکے اپنے محکمہ کے دفاتر کی اصلاح میں وقت صرف کیا، یعنی عملہ میں کام کو از سرِ نو تقسیم کیا، منشی خانہ کی ترتیب دی، اور رجسٹروں کے نمونوں کو از سرِ نو درست کیا، ان ضروری اصلاحوں سے فارغ ہو کر اپنے دورہ کا بقیہ زمانہ نلگنڈہ اور کھمم کے اضلاع میں صرف کیا۔

دورہ کی کل مسافت ۵۳۳ میل تھی، اس سلسلہ سفر میں اُنھوں نے ۴۱ کوچ اور ۷۲ مقام کئے ۳۵ یوم تک اُنھوں نے دو ضلعوں کے صدر مقام پر اور ۲۱ یوم تک تحصیلوں کے مستقر پر قیام کیا، ۱۶ یوم دیہات میں قیام رہا، وہ اپنے دورہ کی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ اضلاع کے صدر مقام پر طویل قیام کی خاص خاص وجوہ حسب ذیل تھیں۔

اوّل۔ تصفیہ بابد داد کے لیئے زیادہ قیام کی ضرورت پڑی۔

دُوم۔ ضلع کھمم کے مستقر پر دو خاص کام بہت جھگڑے کے پیش آئے ایک حدود تعلقات کی اصلاح جو کہ بہت ابتر حالت میں تھی دوم اضلاع اور تعلقات کے عملوں کا تقرر از سرِ نو تجویز کرنا جو ایک بہت سنجیدہ کام تھا۔

سوم۔ مستقر پر علی العموم بھی بہ سبب اور کسی مقام کے کام زیادہ تھا، مختلف صیغوں

اور مختلف دفاتر کو دیکھنا پڑا۔

اِس کے بعد ہی اسی سلسلہ میں انھوں نے انتظامی جزئیات کی تفصیل بیان کی ہے، جن میں ان کو مصروف و منہمک رہنا پڑا، لیکن چونکہ ان جزئیات کا تعلق زیادہ تر دفتر کی اندرونی اصلاح و ترتیب اور مختلف اضلاع کے قدیم رقبہ اور حدود کے تغیر و تبدل سے ہے، جس سے عام ناظرین کو دلچسپی نہیں ہوسکتی اس لیے ان انتظامات کی تفصیلی کیفیت نظر انداز کی جاتی ہے، اگرچہ یہ تمام کام جو انھوں نے انجام دیا بجائے خود ریاست کے لیے نہایت مفید و سودمند تھا۔

حکام کا طرز عمل

غرض اس دورہ میں انھوں نے اپنے صوبہ کے متعلق ہر قسم کی واقفیت حاصل کرلی اور ان کو یہ بھی معلوم ہوگیا کہ حکام کا طرز عمل رعایا کے ساتھ کس قسم کا ہے چنانچہ ان کو یہ واقعات بھی معلوم ہوئے کہ جب ریاست کے حکام کسی حصہ ملک کا دورہ کرتے ہیں۔ تو جہاں جہاں ان کا گزر ہوتا ہے رعایا مصیبت میں مبتلا ہوجاتی ہے ان حالات کا نواب انتصار جنگ کے دل پر نہایت گہرا اثر پڑا چنانچہ انھوں نے نیم کنڈہ آکر وہاں سے صوبہ کے تمام تعلقہ داروں کے نام ایک خاص حکم جاری کیا بلکہ رعایا کی اطلاع کی غرض سے اس کو شائع بھی کردیا، اِس اعلان کے خاص خاص حصے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

نواب انتصار جنگ اس اعلان کو اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

"جو ذاتی واقفیت مجکو اس صوبہ کے دورہ کے بعد رعایا کی حالت کی طرف سے حاصل ہوئی ہے وہ نہایت ہی پرافسوس واقعات پر شامل ہے، سرکاری ملازموں کے گروہ کے ہاتھ سے جس میں کسی صیغہ اور سررشتہ کے ملازموں کو مستثنےٰ نہیں کرسکتا رعایا کی جو حالت ہو رہی ہے اُس کو بغیر کسی مبالغہ کے مختصر طور سے ان لفظوں میں بیان کیا جاسکتا ہے کہ دیہات میں نہ مزدور کو اس کی مزدوری ملتی ہے، اور نہ اشیاء کے مالکوں کو ان کی چیز کی پوری قیمت، اِلّا ماشاءاللہ اور جو شخص یا جو گروہ رعایا میں زیادہ مفلس اور زیادہ واجب الرحم ہے وہی سب سے زیادہ

فیض ملا

پسیا جاتا ہی، کوئی آبادی اور کوئی بستی ایسی نہیں ہی۔ جہاں ایک پیشہ کے چند لوگ آباد ہوں اور اُن کے باہم سرکاری لوگوں کے ہاتھ معاملت کرنے کے لیئے باری مقرر نہ ہو، وہ دوکاندار کو مٹی جو عین بارش اور سخت سردی کے دنوں میں راتوں سے اُٹھ کر اپنی دوکان کوسوں دور کسی بازار یا میلہ یا جاترا میں لے جاتے ہیں اور بھیگی زمین پر کچھ سہارا تجویز کر کے اپنی دوکان لگاتے ہیں جو موسم کی ہر ایک گرمی اور سردی اپنے پیشہ کے جاری رکھنے میں خوشی سے برداشت کرتے ہیں، جب کہ اُن کے خاص گھر کے نزدیک سرکاری ملازموں کا گروہ پہونچتا ہی اور ایک ذریعہ اس بات کا موجود ہو جاتا ہی کہ دوکانداروں کی ہر ایک شئی اُن کے گھروں کے قریب میں فروخت ہو تو پھر یہ کیا بات ہی کہ کوئی اُن میں سے بستی کے باہر اپنی دوکان لانے کی جراُت نہیں کرتا، اور تحصیل کا چپراسی اور گاؤں کا پٹیل اس شخص کو تلاش کرتا ہی جس کی اس موقع پر باری ہوتی ہی، وہ اپنی دوکان لے کر باہر آتا ہی، مگر ایسی حالت میں کہ گویا اُس کو موت کے سامنے لیئے جاتے ہیں، میں اپنے لائق تعلقہ دار صاحبان اضلاع سے جن کو خود بھی اب ان باتوں پر غور کرنے کا معمولی موقع ملا ہی سوال کرتا ہوں کہ آخر یہ کیسی باری ہی اور یہ حالت مخلوق پر کیوں طاری ہی؟ کوئی جواب اس کے سوا نہیں کہ چیز کی پوری قیمت نہیں دی جاتی۔

دھنگروں کا جو کہ بکروں کے گلے رکھتے ہیں یہ حال ہی کہ جہاں اُنھوں نے سنا کہ کوئی سرکاری افسر گاؤں میں آنے والا ہی اپنی منڈی لیے وہاں سے چل دیئے، دھیڑ اور گونڈ اور دوسرے ادنی درجہ کی رعایا جو کہ پوٹلی ڈھوتے ہیں اُن کے لیئے پہلے ایک پیسہ کوس اُن کے کام کی مزدوری مقرر تھی اور اب چند عرصہ سے سرکار عالی نے اس کی شرح دو پیسہ کوس مقرر کر دی ہی، اور بلاشبہ

یہ ایک ایسی شرح ہی جس سے زیادہ اس جفاکش گروہ کو دیہات میں اور کوئی مزدوری نہیں ملتی مگر میں نے دیکھا ہی کہ جہاں اُنھوں نے سنا کہ اُن کے اطراف میں کسی سرکاری افسر کی بیگار چلی ہی گاؤں کے گاؤں خالی کرکے چل دیتے ہیں، اور جنگلوں اور جھاڑیوں میں جاکر پناہ لیتے ہیں، اور جب وہ شیطانی طوفان اُن کے گاؤں پر سے گزر جاتا ہی، تب پھر اپنے گھروں میں واپس آجاتے ہیں، میں پوچھتا ہوں کہ یہ حالت کیوں ہی! صرف اس لیئے کہ خوب تحقیق ہو گیا کہ شخصوں میں سے جو اُن سے بیگار لیتے ہیں، پانچ شاید اُن کو مزدوری دیتے ہوں تو دیتے ہوں، اور پچانوے فی صدی اُن سے مفت بیگار لیتے ہیں، اور دہنگروں سے تو خنگی ملت ہی اُن میں سو میں شاید کوئی ایک ہی ایسا خدا کا بندہ ہوتا ہوگا جو اس شرح پر اُن سے سودا کرتا ہو جو کہ بستی میں عام طور سے رائج ہوا اور باقی سب کے سب اُن کے ساتھ ناانصافی سے پیش آتے ہیں، انہیں بڑا رحم دل اور خداترس وہ شخص ہی جو اس نرخ کے مطابق بھی اُن کو دام دیتا ہو، جو کہ نہایت بے رحم اور سفاک اور کمینہ خصلت لوگوں نے بطور خود ٹھیرا رکھا ہی، اس ظالمانہ نرخنامہ میں مرغی کی قیمت چار پیسہ بلکہ دو پیسہ تک پہنچ گئی ہی، اور بکرے کی قیمت چھ آنہ اور اکثر آٹھ آنہ اور بہت ہی شاذ ہی کہ بارہ آنہ بھی۔ اور بعض جگہ تو مجکو معلوم ہوا ہی کہ روپیہ کے تین بکرے بھی لیئے گئے تھے غرض کہ چہارم قیمت بھی مرغیوں اور بکریوں کے مالکوں کو نہیں ملتی، مگر جب کہ سرکاری خدمت رکھنے والے لوگوں کو یہ چیزیں ایسی ارزاں ملتی ہیں تو ہر چھوٹے سے چھوٹا شخص بھی جب کہ کام پر باہر جاتا ہی تو مرغی اور بکرا ہی تلاش کرتا ہی، گاؤں والے روتے ہیں کہ صاحب ہم ایک مرغی تک نہیں پال سکتے سرکاری ملازم جہاں دیکھ لیتے ہیں گھروں میں سے گھُس کر لے جاتے ہیں۔

یہ سب کو معلوم ہے اور بیان کی حاجت نہیں ہے کہ گھانس اور لکڑی اور مٹی کے برتن اور مرغیں اور گھڑونچیاں ان چیزوں کی کچھ قیمت ہی نہیں ہے، یہ ایسی ہی ہر ایک سرکاری ملازم کے لئے مفت ہیں، جیسے خدا کی بنائی ہوئی عام مخلوق کے لئے، حالانکہ ان میں سے ہر ایک چیز ایک کافی قیمت رکھتی ہے اسی موسم تابستاں میں جب کہ میرا دورہ نلگنڈہ کے ضلع میں تھا تو بعض مقامات پر پیال اور لکڑی مشکل سے ملی اور گھانس اسقدر گراں ملی کہ حیدرآباد کی بہ نسبت ہم کو چار چند قیمت دینی پڑی، مٹی کے برتن ایسے قیمتی ہو گئے کہ ساتھ کے لوگ جو ان کو ہر جگہ چھوڑ دینے کے خوگر ہوتے ہیں ایک دفعہ خرید لینے کے بعد پھر آئندہ کی منزلوں میں بھی اُن کو ساتھ رکھنے کی کوشش کرتے تھے

مجھ سے بڑے بڑے مباحثے لوگوں سے اس باب میں رہے ہیں، بہت جگہ لائق لائق لوگوں نے مجھ کو اس باب میں قائل کرنا چاہا کہ ان چیزوں کے مفت لینے کا ایک قدیمی رواج رہا ہے اور جس طرح وہ بہم پہنچائے جاتے ہیں اس کے لحاظ سے ممکن نہیں کہ ہم اُن کے مالکوں کو اُن کی قیمت دے سکیں وہ کہتے ہیں کہ یہ چیزیں بقدر ما یحتاج اس گاؤں میں ہم نہیں پہنچتیں جہاں ہمارا قیام ہوتا ہے لامحالہ وہاں کے پٹیل و پٹواری وغیرہ دوسرے دیہات قرب و جوار سے منگا کر پہلے سے جمع کر لیتے ہیں اور اُن دوسرے دیہات والوں کا یہ حال ہے کہ چیز لائے اور پھینک کر چلتے ہوئے، کتنا ہی اُن کو ٹھہراؤ نہیں ٹھہرتے پھر دام دئیے جائیں تو کس کو دئیے جائیں اگر فرودگاہ کے گاؤں میں دئیے جائیں تو غیر مستحق لوگ کھا جائینگے اور اصلی مالکوں کو نہ پہنچینگے میں نے اُن کو سمجھایا کہ یہ تمام خرابیاں اور خلجان صرف اس لئے پیدا ہوئے ہیں کہ تم نے ان چیزوں کی قیمت دینی چھوڑ دی اگر تم ہر ایک چیز کی واجبی قیمت

وقت پر دو تو اسی گاؤں سے جہاں تم ٹھہرے ہوتے ہو تمھارے مایحتاج سی
وہی چیز دو چند سہ چند میسر آسکیگی، اگر وہاں نہ ہوگی تو وہاں کے لوگ دوڑ کر
دوسری کسی جگہ سے لے آوینگے اور تم کو خبر بھی نہو گی، دوسرے گاؤں کے
لوگ جو چیز لیکر آتے ہیں وہ اس لیے بھاگتے ہیں کہ چیز تو گئی سو گئی اب کہیں
وہ خود بیگار میں نہ پکڑے جاویں، اگر اُن کو یقین ہو کہ اس چیز کی قیمت ملنے والی
ہی تو اگر کوئی اُن کو ٹالنا بھی چاہے تو وہ ہرگز نہ سرکینگے، اور اگر کسی جگہ کوئی
شخص کوئی چیز تم کو دیتا ہی تو تم اُس کی قیمت ادا کرنے میں یہ تامل نہ کرو کہ
یہ چیز اسی کا مال ہی، یا اُس نے کہیں سے جمع کی ہی اور یہ قیمت اصل مالکوں کو
پہنچیگی یا نہیں تم اپنا فرض ادا کرو جو تمھارے اوپر ہی، اور جو اُس کا فرض ہی اُسکی
ذمہ داری اُس پر چھوڑ دو۔"

اِس کے بعد وہ اس امر پر بحث کرتے ہیں کہ اگر دورہ کرنے والے حکام ہر چیز کی قیمت بازاری نرخ کے مطابق احتیاط سے ادا کردیں تو اُن کو ہر جگہ ہر چیز کافی مقدار میں حاصل ہو سکیگی۔ چنانچہ اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

"گزشتہ سال بی بی نگر کے مقام پر میرے ساتھ والوں کو کسی چیز کی ضرورت
تھی چنے مطلوب تھے یا کہ بھوسہ گاؤں والوں نے جواب دیا کہ ہمارے ہاں تو اتنا ہی
تھا جتنا ہم دے چکے اور نہیں ہی، فلاں گاؤں میں ہی، میں نے حکم دیا کہ نقد روپیہ
بھیجکر اُس گاؤں سے چیز منگائی جائے، ایک بنڈی جاوے اور لے آوے روپیہ کا
نام سُن کر اُن لوگوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ نرخ کیا ہوگا، میں نے کہا جو بستی کا
نرخ ہو، انھوں نے کہا کہ بستی میں تو یہ نرخ ہی، میں نے کہا کہ اسی نرخ سے لینگے
اس پر ایک نے دوسرے کی طرف دیکھا وہ لوگ اُٹھے انھوں نے کہا کہ چیز حاضر ہی
کس قدر مطلوب ہی، چنانچہ جس قدر مطلوب تھی انھوں نے حاضر کردی اور معذرت

کی کہ نرخ کے خوف سے ہم نے عذر کیا تھا! در معلوم ہوا کہ جس قدر ہم کو احتیاج تھی اُس سے سو حصہ زیادہ وہ چیز وہاں موجود تھی، میں نے اُن کا اطمینان کر دیا کہ اُن کی اس حرکت سے میں نے کچھ بُرا نہیں مانا اور ایسے تجربے حاصل کرنے کا خود مجھکو اشتیاق ہی۔"

اِس کے بعد اُنھوں نے سرکاری ملازمین کو یہ بتایا ہی کہ دورہ کی حالت میں کس قسم کا کام وہ خدمت پیشہ رعایا سے بلا معاوضہ اپنے پاس سے ادا کرنا چاہیئے، اِسی سلسلہ میں اُنھوں نے اپنے ایک دوسرے اعلان کا حوالہ دے کر (جو بیگار وغیرہ کی اصلاح کے متعلق ہی) اس کے مطالب کی توضیح کی ہی، اور سرکاری ملازمین کو آگاہ کیا ہی کہ وہ ان احکام پر عمل کریں۔

بیگار اور دوسرے مظالم کی اِصلاح | چونکہ یہ احکام ضروری اصلاحات پر مشتمل ہیں اس لیے ان کا ماحصل بیان کیا جاتا ہی جو حسب ذیل ہی:۔

(۱) بیگار کی اُجرت جس کا شرح دو پیسہ فی کوس ہی پیشگی ادا کی جائے۔

(۲) ایک بیگار کا بوجھ ۱۲ سیر پختہ سے زیادہ نہو، اور اس طرح احتیاط سے باندھا جائے کہ بیگاری کو اس کے لے چلنے میں کوئی غیر معمولی تکلیف نہو نیز یہ کہ اس کا ایک ہاتھ کھلا رہے ایسا نہو کہ دونوں ہاتھ گھر جائیں۔

(۳) کسی مریض کو بیگار لے جانے پر مجبور نہ کیا جائے اور تندرست کو بھی ایک بیگار پہنچانے اور دوسری بیگار اُٹھانے کے درمیان اس قدر آرام کی مہلت ملنی چاہیئے جس قدر کوس کہ وہ پہلے طے کر چکا ہی، مثلاً اگر ایک کوس گیا اور آیا تو دو گھنٹہ کی مہلت اور دو کوس گیا اور آیا ہی تو دو گھنٹہ کی۔

(۴) حمالی یا رہ نمائی کے علاوہ جب دوسرے خانگی کاموں کے لیے فرودگاہ پر کسی بیگار سے کام لینا ہو، تو اس کی اُجرت کا اوّل فیصلہ کر کے پیشگی ادا کرنا ضروری ہی۔

(۵) عورتیں بیگار کے لیئے مجبور نہ کی جائیں۔ لیکن جب کہ وہ خود اُجرت کی طرح سے بخوشی

جانا منظور کریں۔

(۶) بار برداری کے لئے زراعت کے بیل نہ پکڑے جائیں۔

(۷) جب تک تعلقہ دار یا تحصیلدار یا پیشکار تعلقہ کا خاص حکم نہ آئے کوئی دوکاندار بستی سے باہر دوکان لانے پر مجبور نہ کیا جائے اور جب کسی ایسے حکم کی بنا پر دوکان بستی کے باہر لائی جائے تو تحصیل سے دوکاندار کو ایک نرخ نامہ دیا جائیگا، جس کے مطابق اجناس کی خرید و فروخت ہوگی، اس نرخنامہ میں اس کا خیال رکھا جائیگا کہ بلحاظ دوکاندار کے ہرجہ کے بستی کے نرخ کے مقابلہ میں اس کے ساتھ خفیف رعایت کی جائے۔ نیز تحصیلدار اس کا ذمہ دار ہوگا کہ مسافروں کی فرودگاہ پر دوکان دار پر کوئی ظلم نہ کیا جائے، اور اُن کو ہر چیز کی قیمت بروقت مل جائے۔

(۸) دوکان بستی کے اندر ہو یا باہر دام فوراً بر وقت خرید ادا کئے جائیں اور چیزوں کی خرید و فروخت جس طرح بازار میں ہوتی ہے، عام اس سے کہ از قسم غلّہ کوئی چیز خریدی جائے، یا مرغی، بکری، لکڑی وغیرہ، وہ سابق کا طریقہ کہ چلتے وقت دام دیئے جائینگے یا حساب کیا جائیگا۔ قطعاً ممنوع قرار دیا جاتا ہے۔

(۹) سرکاری ملازمین اور عام لوگوں کے نرخ کے درمیان کوئی فرق نہو گا، اور سرکاری ملازمین یا دوسرے مقتدر لوگوں نے جو جبریہ نرخ بکری اور مرغی وغیرہ کا مقرر کر رکھا ہے وہ قطعاً منسوخ کیا جاتا ہے۔

(۱۰) اشیائے کمیاب اور نایاب کی فرمایش نہ کی جائے، دیہات سے پلنگ منگانے میں احتیاط کی جائے۔ اس سے گاؤں والوں اور اُن کے بال بچوں کے آرام میں بہت خلل پڑتا ہے، اور ایسی چیزیں دیہات میں ضرورت سے زیادہ نہیں ہوتیں، لیکن اگر کبھی اتفاق سے کوئی شدید ضرورت پیش آجائے تو اوّل اُس کا کرایہ برضامندی طے کر کے پیشگی ادا کر دیا جائے۔

اعلان کے آخر میں ملازمین پولیس کو ہدایت کی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص ان احکام کی خلاف ورزی کرے تو وہ مزاحمت کریں اور اپنے گاؤں کی رعیت پر ظلم نہ ہونے دیں، خواہ وہ

ظلم کرنے والا فوج کا سپاہی اور سرکاری ملازم ہو یا اور کوئی مقتدر شخص ہو۔

اسی سلسلہ میں نواب انتصار جنگ نے اس اعلان کی بعض دفعات کی توضیح کی ہے، اور نہایت مؤثر الفاظ میں اپنے ذاتی مشاہدات اور اُن واقعات کو بیان کیا ہے، جو رعایا کی حالت سے تعلق رکھتے ہیں، اُن کے بیان سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کو رعایا کی بہبودی اور اصلاح حالت کا کس قدر خیال ہے۔ چنانچہ وہ دفعہ ۳ کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"نہایت افسوس کے لائق ہوتی ہے بیگار کی وہ حالت جب کہ وہ ابھی بوجھ پہونچا کر آیا ہے، اس کا پسینہ بھی خشک نہیں ہوا ہے کہ دوسرے کسی موذی نے اُس کو آن دبایا اور اب موت کی طرح وہ اُس کے سر پر سوار ہے، اور زبردستی وہ اُس کو اپنے سامنے دھر لیتا ہے، مریضوں کو بھی میں نے مبتلائے مصیبت ہوتے دیکھا ہے، گزشتہ سال کے دورہ میں خود میرے ساتھ کے بیگاروں میں ایک عورت تھی جس کی پنڈلی میں سے خون بہا جاتا تھا اور کپڑا بندھا ہوا تھا اور بے دردی کے ساتھ اُس کو لے گئے تھے میں نے واپسی کے وقت اُس کو دیکھا، اور اُس وقت مجھکو سخت ہی افسوس ہوا، اور جو کچھ اُس وقت مناسب تھا میں نے اُس عورت کی استمالت کی، میں کہتا ہوں کہ ہماری ہزار ضرورتوں کا خون ہو جانا ایک طرف تھا (جس کا ہم سو طرح پر دوسرا بند و بست کر سکتے ہیں) اور اس طرح پر ایک عاجز اور ناتوان رعایا کا ستایا جانا ایک طرف ہے"۔

دفعہ ۴ کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

"مجھکو اس قسم کی اطلاعیں بھی ہوئی ہیں، کہ بعض بدمعاش لوگ اصرار کر کے عورتوں کو بیگار میں ساتھ لے جاتے ہیں، اور تنہا پا کر اُن پر ناجائز حملہ کرتے ہیں، اسی سال کے میرے دورہ میں ایک اسی قسم کا واقعہ ہو گیا، میں مقام ڈنڈم پلی تعلقہ نلگنڈہ میں مقیم تھا۔ جہاں مجھکو اطلاع ملی کہ ایک ہاتھی کا چارہ لانے والا ملازم اس گاؤں سے ایک دھیڑ کی عورت کو راستہ بتانے کی ضرورت سے ساتھ لے گیا اور جنگل میں اس پر ناجائز حملہ

گیا وہ عورت اور اُس کا خاوند دونوں میرے سامنے پیش ہوئے، اور وہ مجرم وہاں سے نلگنڈہ کو چل دیا تھا عورت کا بیان یہ تھا کہ اُس ہاتھی والے نے میرے ساتھ بد ارادہ کیا تھا مگر کچھ کرنے نہیں پایا کہ میں بھاگ گئی اُس کے خاوند کا اُس وقت غصہ کے مارے یہ حال تھا کہ کانپ رہا تھا، اور بار بار کہتا تھا کہ میرے پیٹ میں آگ لگ گئی ہے، اور ضرور کچھ ہوا ہے اور یہ عورت چھپاتی ہے اُس وقت مجکو یہ خطرہ ہوا کہ بعید نہیں جو یہ اپنی عورت کو ہلاک کردے بڑی مشکل کے ساتھ میں نے اُس ڈھیڑ کا غصہ فرو کیا، اور اُس کے ذہن نشین کیا کہ تیری عورت کی عصمت بدستور باقی ہے، اور جو یہ کہتی ہے وہی سچ ہے، اور اگر اس کی کوئی برائی ہوتی تو وہ اس بات کا بھی اظہار کیوں کرتی، بالآخر میں نے اُس مقدمہ کو عدالت فوجداری ضلع میں دائر کرایا اور وہاں سے بہ اثبات جرم حملہ مجرمانہ چھ مہینہ قید سخت کی سزا ملزم کو ہوئی اور وہ میاں اور بی بی خوش خوش عدالت سے اپنے گھر کو روانہ ہوئے"۔

اسی سلسلہ میں دفعہ ۹ پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے صاف لکھ دیا ہے کہ :-

"اب اس چار پیسہ کی مرغی اور چھ آنے آٹھ آنے کے بکرے کو چاہیئے کہ اس صوبہ سے رخصت دی جائے آئندہ نہ سرکاری لوگوں کے لیئے گھی چھ روپیہ من (ایک من =۱۲ سیر کے - فی روپیہ دو سیر) بالالتزام خریدا جائے نہ گھانس و لکڑی و برتن مفت لیئے جائیں اور نہ دوسری کوئی چیز، اور کوئی فرق نہ رہے، سرکاری لوگوں کی خرید فروخت اور عام لوگوں کی خرید و فروخت میں"۔

نواب انتصار جنگ نے صرف احکام ہی جاری نہیں کیئے بلکہ ان احکام کی تکمیل بھی کرائی وہ اس نکتہ سے بے خبر نہ تھے کہ صرف احکام جاری کردینا کافی نہیں، تا وقتیکہ اس کی نگرانی نہ کی جائے کہ ان احکام پر عمل بھی ہوتا ہے یا نہیں، جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں :-

"میں نے پورا پورا اور حتمی ارادہ کرلیا ہے کہ اس عام مصیبت کو رعایائے صوبہ

پر سے دفع کر دیا جاوے پس تمام لوگوں کو بالیقین معلوم کر لینا چاہیے کہ جو کچھ مال
اور عدالت اور کوتوالی اور متفرقات کی نسبت مجھ کو اختیارات حاصل ہیں میں
اپنی پوری قوت اس میں صرف کر دونگا، نیز میں یہ بھی خوب جانتا ہوں کہ تعمیل
صرف حکم دینے سے نہیں ہو جاتی تا وقتیکہ اس کی نگرانی عملی طور سے نہو، میں اس
سے بھی بخوبی واقف ہوں کہ جس عادت کو میں لوگوں سے چھڑانا چاہتا ہوں
وہ اکثروں کی اب ایک طبیعت ہو گئی ہے، لہذا میں نے بھی ارادہ کر لیا ہے کہ
ایسوں کے قصور کو معاف کرنا اس اُمید پر کہ وہ پھر ایسا نہ کرینگے ایک
فضول توقع ہے"۔

چنانچہ نواب انتصار جنگ نے ان احکام کے جاری کرنے کے بعد اُن کی پوری نگرانی
کی، اور جن لوگوں نے خلاف ورزی کی اُن کو سزائیں دیں یہاں تک کہ بعض تحصیلداروں کو
موقوف و معطل کر دیا، اور جو لوگ اُن کی نظروں میں مشتبہ تھے اُن کو صاف طور پر متنبہ کر دیا کہ
وہ اپنے نتائج اعمال سے بے خبر نہ رہیں۔ چنانچہ انھوں نے صاف طور پر لکھ دیا کہ:۔

"حال کے انتظام کی تمام تر کامیابی تحصیلداروں ہی پر منحصر ہے اگر تحصیلدار
دل و جان سے سعی و توجہ کرینگے تو سب انتظام ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔ اور اس
کے ساتھ ہی اُن کو یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اُن کا قیام بھی پھر تحصیلداریوں
کے عہدہ پر ممکن نہیں۔ اگر کسی تعلقہ میں اس قسم کا اندھیر آئندہ بھی باقی رہے
اور یہی شکایت پھر بھی سُننے میں آوے تو یقیناً ہم ایسے تحصیلدار کو تحصیلداری
عہدہ کے بالکل ناقابل سمجھینگے"۔

نواب انتصار جنگ کو اپنے مضبوط ارادے اور اعتماد علی النفس کی بنا پر اس کا پورا یقین
تھا کہ وہ جبر و ظلم کا خاتمہ کر کے رعایا کی امن و عافیت کا انتظام کر سکینگے۔ چنانچہ وہ خود لکھتے
ہیں کہ:۔

"یہ نہایت سخت وبا ہی جو کہ مدت سے ملک کو تباہ کر رہی ہی اور اس کا تدارک بھی جبتک ایسا ہی سخت نہو گا، کسی اصلاح کی اُمید نہیں ہی، مگر میں ہرگز مایوس نہیں ہوں اور پوری توقع ہی کہ کچھ عرصہ کے بعد ایک ایسا دن بھی آویگا کہ ہم ایک گاؤں میں جاکر ٹھیرینگے جہاں کی رعایا اپنے بادشاہ کو دعا دیتی ہوگی اور کوئی شکایت ایسی اُن کی زبان سے نہ سنی جاویگی جس کے سننے سے اب جان عذاب میں ہی"

اِن احکام کے نافذ کرنے کے کچھ مدّت بعد وہ نواب مدار المہام کو لکھتے ہیں :-

"ایک بڑی مُصیبت جس میں رعایا مبتلا تھی رسد اور بیگار کے متعلق تھی نہ چیز کی پوری قیمت وقت پر مالکوں کو ملتی تھی، اور نہ بیگاریوں کو پوری اُجرت، بہت سی چیزیں مفت اور بہت بیگاریں بلا اُجرت لی جاتی تھیں، اور جب اس سال کے دورہ اور گزشتہ دورہ کے لحاظ سے میں رعایا کی ان مُصیبتوں اور اُن کے وجوہ و اسباب پر پورا پورا مطلع ہوا، تو میں آمادہ ہوا کہ آیندہ کے لئے ان دردناک کارروائیوں کا، اچھی طرح تدارک کیا جاے چنانچہ جو سخت انتظام اس باب میں میں نے کیا اُس کو میں سرکار میں علیحدہ پیش کر چکا ہوں۔

اِس انتظام کو نواب مدار المہام سرکار عالی نے پسند فرما کر تمام ممالک محروسہ سرکار عالی میں جاری فرما دیا ہی۔ اور آیندہ میرا اُس کے متعلق یہ کام باقی ہی، اور ابھی کئی برس تک باقی رہیگا کہ جس دلی درد کے ساتھ میں نے اس کو شروع کیا ہی، اور اسی دلی درد کے ساتھ آیندہ اُس کی تعمیل کی بھی نگرانی کرونگا"

غرض نواب انتصار جنگ کی سعی بارآور ہوئی، اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے عہدہ کو چھوڑیں

صوبہ کی حالت بدل گئی اور اُن کا عدل و انصاف تمام صوبہ میں ضرب المثل ہو گیا، یہاں تک کہ دوسرے صوبوں میں بھی یہ احکام نافذ ہوئے اور رعایا کو ایک حد تک آزادی نصیب ہوئی۔

اصلاح حدود

ایک کام اس دورہ میں یہ انجام پایا کہ اُنھوں نے (اضلاع کے) تعلقات کے حدود کو درست کیا چنانچہ ضلع ناگر کرنول اور نلگنڈہ میں اس سال صرف دو تین ایسے مواضع کو جو تعلقات کے مستقر سے بہت ہی فاصلہ پر واقع ہوئے تھے، دوسرے متصل کے تعلقات میں شامل کیا اور باقی ضروری اصلاحیں جدید بندوبست پر جو عنقریب ہونے والا تھا موقوف رکھیں، لیکن ضلع کھمم کی اصلاح پر جہاں ابھی بندوبست میں عرصہ تھا اور تعلقات کی حالت ابتر تھی زیادہ انتظار نامناسب سمجھ کر اُنھوں نے فوراً توجہ کی اور اس ضلع کے تعلقات کے حدود کو اسی دورہ کے زمانہ میں درست کر دیا۔

اس اصلاح میں دیہات کا شمول وخروج بکثرت عمل میں آیا، ان سب تعلقات کی حالت یہ تھی کہ نہ کسی ایک حلقہ میں تھے اور نہ مناسب و موزوں علاقہ کسی تعلقہ میں تھا، اکثر دیہات ایسے منتشر واقع ہوئے تھے کہ کئی کئی منزل دوسرے تعلقہ میں سفر کرنے کے بعد مختلف تعلقات کے منتشر دیہات ملتے تھے، اور اکثر علاقے تحصیل کے مستقر سے اس قدر دور فاصلوں پر واقع ہوئے تھے کہ دوسرے افسروں کا تو کیا ذکر خود تحصیلدار تعلقہ کا بھی وہاں مشکل سے گزر ہوتا تھا، یہ ایسی خرابیاں تھیں جن کا اثر مال گزاری کے انتظام پر بہت خراب پڑتا تھا، اس لئے نواب انتصار جنگ نے ضلع کے مستقر پر پہنچکر تعلقہ دار ضلع اور متعدد تحصیلداروں اور دوسرے عمدہ داروں کے مشورہ سے ہر ایک تعلقہ کے حدود کو از سرِ نو قایم کیا، اور بہت کچھ ردو بدل دیہات کے اس انتظام سے عمل میں آیا، جس سے رعایا اور سرکاری ملازمین دونوں کو سہولت حاصل ہوئی۔

قسط بندی کے اوقات کی اصلاح

اسی دورہ میں نواب انتصار جنگ نے یہ ضرورت محسوس کی کہ تلنگانہ میں قسط بندی کے جو چار اوقات مقرر ہیں وہ ملکی حالت کے لحاظ سے

ناموزوں ہیں، اس لیے کبھی اس پر عمل بھی نہیں ہوتا، یعنی مقررہ رقم سے بہت کم روپیہ وقت پر وصول ہوتا ہے اور جو کچھ ہوتا ہے وہ بھی رعایا کے لیے باعثِ تکلیف ہے، لہٰذا اگر اس کے وصول کرنے میں اور زیادہ اہتمام کیا جائے تو رعایا کے لیے یقیناً تباہی کا باعث ہوگا۔ اس بنا پر انھوں نے متعدد تجربہ کار عہدہ داروں سے مشورہ کر کے ان کی رائیں حاصل کیں، قسط بندی کی موجودہ ناموزونیت کو سب نے تسلیم کیا اور جدید تجویزیں پیش کیں لیکن نواب انتصار جنگ نے ان تجاویز پر یہ اعتراض کیا کہ:۔

"جب تک اس بات کا اطمینان نہ ہو کہ جس مہینہ میں ہم جس قدر حصہ کل محاصل سالتمام میں سے بطور قسط کے قرار دیتے ہیں اس کی مناسبت سے رعیت کے پیداوار بھی موجود ہے، تب تک اس قسم کی کوئی اصلاح کیونکر مفید ہوگی، میں اپنے دو گزشتہ برسوں کے دورہ میں اس بات کو اچھی طرح دیکھ چکا ہوں کہ ہر ایک جگہ اراضیات مزروعہ کی تقسیم چارگانہ فصلوں میں کسی ایک اندازہ سے نہیں ہوتی کسی علاقہ میں کوئی فصل زیادہ ہوتی ہے اور کسی میں کوئی، پھر یہ اختلاف ایک ضلع کی حالت میں دوسرے ضلع ہی کی حالت کے مقابلہ میں نہیں ہے، بلکہ ایک ضلع میں کسی تعلقہ کی کچھ حالت ہے اور کسی کی کچھ۔"

اسی سلسلہ میں ان اختلافات کو بیان کرنے کے بعد جو مختلف "تعلقات" کی حالت میں پائے جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"یہ تمام اختلافات جو اراضی مزروعہ مقبوضہ رعایا کے اقسام اور مقدار اور ذرائع آب پاشی اور اقوام زراعت پیشہ کی تمدنی حالت اور ان کے مذاق طبیعت اور ان کے افلاس یا استطاعت اور سامان ہائے زراعت پر مبنی ہیں، اس قدر قوی اثر کے ساتھ ہر ایک جگہ قایم ہو گئے ہیں کہ ان پر غالب آنا ہمارے امکان سے خارج ہے، اور کوئی چارہ نہیں ہے بجز اس کے کہ ہم اپنے انتظامات مال گزاری کو ان

اختلافات کے تابع کریں"۔

اس کے بعد اُنھوں نے موجودہ انتظام اور جدید تجاویز پر نکتہ چینی کی ہے کہ اُن میں اختلاف حالات کا لحاظ نہیں رکھا گیا اُن کا خیال ہے کہ :۔

"ہمارا انتظام جب کہ رعیت داری ہے، تو ہمارا کام ہے کہ ہر ایک رعیت کے ساتھ ہم ایسا بندوبست رکھیں جس سے وہ آسایش کے ساتھ اپنے ذمہ کا مطالبہ ادا کر سکے بدون اس کے کہ کسی ساہوکار یا مہاجن کے ہاتھ میں اپنے آپ کو گرو کر دے جس میں ایک دفعہ مبتلا ہو جانے کے بعد پھر نجات پا جانا بہت بڑے خوش قسمت کاشتکاروں کا کام ہے"۔

غرض اُنھوں نے اپنے دورہ کا ایک بڑا حصّہ ختم کر کے "نہمکنڈہ" کے مقام پر اس اہم مسئلہ کے تصفیہ کے لیئے ایک مجلس منعقد کی جس میں تعلقہ دار ضلع، چار لائق اور تجربہ کار تحصیلدار اور متعدد دلیسمکھ، دلیس پانڈے، پٹیل، پٹواری اور دیگر زراعت پیشہ لوگ شامل تھے۔ نواب انتصار جنگ نے صورتِ واقعہ سب کے سامنے پیش کی۔ کامل دو روز مباحثہ جاری رہا۔ مفصلۂ ذیل اُمور پر بحث ہوئی :۔

(۱) بارش کے اوقات۔

(۲) ہر ایک فصل میں کیا کیا اجناس کاشت ہوتی ہیں۔

(۳) تخم ریزی کا وقت۔

(۴) مختلف فصلوں کی تیاری کا وقت۔

(۵) کس قدر وقت فصل کے درود ہونے کے بعد سے اس وقت تک صرف ہوتا ہے جب کہ مال بازار میں جا کر فروخت ہو سکے۔

ان اُمور کے طے ہو جانے کے بعد قسط وصول کرنے کے لیئے چار اوقات جو مناسب موزوں تھے تجویز کیئے گئے یہ درحقیقت ایک بڑی اِصلاح تھی جو عمل میں آئی اور جس سے رعایا کو بہت فائدہ

پہنچا جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں:۔

"تلنگانہ کے کاشتکاروں کی حالت آج بہت سقیم ہے، بہت کم کوئی ہے جو کسی ساہوکار کا مقروض نہ ہو، اور منجملہ اُن تدبیرات کے جن سے رعایائے زراعت پیشہ کی حالت کو ترقی دی جاسکتی ہے اقساط کے اوقات کو ٹھیک کر دینا سب سے زیادہ اہم اور ضروری امر ہے۔ دیہات کی اکثر رعایا ہمارے دے، و اسفندار اور اُردی بہشت و امرداد کو نہیں سمجھتی، اور پٹیل و پٹواری کی غلام بنی رہتی ہے، لہذا یہ ضرور ہے کہ ایک ایسا وقت اُن کو بتایا جائے جس کو وہ خود بھی سمجھ سکیں اور پٹیل و پٹواری کی بے جا حکومت کی پروا نہ کریں، اُن کی عورتیں اور بچے تک یہ سمجھ لیں کہ سرکاری مطالبہ ہم کو کس وقت ادا کرنا ہے۔"

اس سلسلہ بحث میں اُنھوں نے جدید انتظامات کی تفصیل بیان کی ہے اور جو نکتہ چینیاں اس انتظام پر ہو سکتی ہیں اُن کا مدلل جواب دیا ہے اس کے علاوہ بعض اور جزئیات پر جن کا رعایا کی آسائش و سہولت سے تعلق ہے بحث کی ہے، لیکن یہ مقامی حالات عام ناظرین کے لیئے زیادہ مفید و دلچسپ نہیں ہو سکتے۔

صوبہ کی آبادی اور اندرونی اصلاح پر توجہ

تلنگانہ میں بکثرت دیہات ویران و بے چراغ تھے، اگرچہ ریاست کی طرف سے ان مقامات کی آبادی کے لیئے خاص قواعد موجود تھے، لیکن باوجود طویل زمانہ گزر جانے کے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلا تھا، نواب انتصار جنگ کی ہمہ گیر طبیعت سے یہ ناممکن تھا کہ وہ اس کو محسوس نہ کرتے چنانچہ اُنھوں نے دورہ کے زمانہ میں اس معاملہ پر بھی توجہ کی اور یکے بعد دیگرے دو مفصل یادداشتیں مدار المہام کی خدمت میں بھیج کر ان ویران مقامات کی آبادی کے متعلق نہایت مفید و جدید تجاویز پیش کیں، اور بہ تفصیل بتایا کہ موجودہ قواعد سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی پہلی یادداشت میں لکھتے ہیں۔

"۱۲۹۴ف کے دورہ میں میرا گزر ضلع کھمم کے اکثر ایسے جنگلوں اور جھاڑیوں میں ہوا

جہاں منزلوں تک کسی آبادی یا زراعت کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ بنڈی کے راستے جو کہیں کہیں جنگلوں میں پائے جاتے تھے وہ صرف ان بنڈیوں کے راستے تھے جن میں جنگلوں سے لکڑیاں کاٹ کر تجارت کے واسطے لے جاتے ہیں اُس تمام مدت میں جس میں ان جنگلوں میں ہو کر گزرا اور جہاں مجکو اپنے دورہ کے متعلق کوئی اور کام کرنے کو نہیں تھا وہاں برابر میرا خیال اس طرف مصروف رہا کہ کیا تدبیر ہوسکتی ہے جس سے یہ جنگل آباد ہوں اور وہ عمدہ کالی زمینیں جو تلنگانہ میں نہایت اعلیٰ درجہ کی زمینیں کہلائی جاتی ہیں، اور جو اکثر جھاڑیوں میں چھپی ہوئی ہیں، مزروعہ ہوں اور انسان اُن دولت کے سرچشموں سے متمتع ہوں جو ان زمینوں میں بالشت دو بالشت ہی نیچے اُن کے واسطے امانت ہیں"۔

اِس کے بعد اُنھوں نے موجودہ قواعد انتظام اراضی کے ناقص ہونے پر بحث کر کے یہ بتایا ہے کہ سرکاری عہدہ داروں کا طرز عمل انتظام اراضی کے متعلق کیا تھا چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"میں پہلے عہدہ داروں پر جن میں سے اکثر اب اپنے عہدوں پر موجود بھی نہیں ہیں اور بعض اس دنیا سے بھی سدھار چکے ہیں کوئی حملہ کرنا نہیں چاہتا لہذا میں اس موقع پر اُن صاحبوں کے نام اور اُن کی اس محض فرضی اور نمایشی کارروائیوں کو جو اُنھوں نے اس انتظام کے متعلق سرکار کو سبز باغ دکھلانے میں برتیں اور جن پر اس دو برس کے پچھلے دورہ میں مطلع ہونے کا موقع ملا تفصیل کے ساتھ نام بنام بیان نہ کرونگا۔ اِلّا صرف اس قدر کہ نمایش کی کوئی حد باقی نہیں رہی اور جن تخنوں میں کبھی غیر معمولی طور سے اس رقبہ نو مزروع کی تعداد زیادہ دکھلائی گئی ہے قریباً قریباً وہ کل فرضی انتظام تھے، جنھوں نے آخر کار رعایا کو رہا سہا تباہ کیا، ایک ایک تعلقہ دار ضلع کی اُس تعریف پر رشک کر کے جو سرکار عالی سے بصلہ اُسی قسم کی نمایشی کارروائی انتظام اضیات بنجر کے ہوئی تھی ایک دن مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ اپنے ضلع میں اس دوسرے ضلع سے

بھی زیادہ زمینوں کا انتظام کرینگے، بڑے بڑے پٹیل اور پٹواری اور دیسمکھ اور دوسرے سربرآوردہ لوگ اور تحصیلدار اور کارکُن صبح سے اس مہم کے سر کرنے پر متوجہ ہوئے اور چھ سات گھنٹہ کے فصل سے ظہر کے وقت تعلقہ دار صاحب کو اطلاع دی گئی کہ قلعہ فتح ہوگیا، اور ایک بہت لمبی تعداد اراضیات بنجر کی اُن کے سامنے پیش کی گئی کہ اس قدر زمین کا انتظام ہوگیا، وہ بے چارے اُٹھے اور دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اُس نے یہ مشکل آسان کردی جس کا انجام اُن سے مورضعیف کے امکان سے خارج تھا۔"

ان واقعات کے بیان کرنے کے بعد اُنھوں نے یہ ثابت کیا ہو کہ ایسے جنگلوں میں جہاں کوسوں تک آبادی نہ ہو بلکہ آدمی کا گزر بھی خطرہ سے خالی نہ ہو، رعیت داری بندوبست کا جاری رکھنا انتظام مال گزاری کی ایک صریح غلطی ہو، اور اس طریقہ سے ویران جنگلوں کی آبادی ممکن نہیں لہٰذا تاوقتیکہ ایسا بندوبست نہ کیا جائے جس سے ملک کے لوگوں کو اپنا سرمایہ اور محنت ان ویران جنگلوں کی آبادی میں صرف کرنے کی ہمت ہو، کوئی کامیابی نہوگی۔

حق زمینداری کا قیام اس بنا پر اُنھوں نے ایک جدید تجویز نہایت تفصیل و وضاحت کے ساتھ پیش کی ہو جس کا ماحصل یہ ہو کہ کم آباد علاقوں میں اُن لوگوں کے واسطے جو اس کو آباد کرنا چاہیں ایک نیا حق زمینداری کا قایم کیا جائے اور بجائے عارضی اور میعادی اجاروں کے دوامی اور مستقل بندوبست اُن کے ساتھ کیا جائے، اور اس کو یہاں تک وسعت ہو کہ جو لوگ اس جدید حق زمینداری کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوں وہ اپنی حقیت زمینداری کے اِسی طرح مالک سمجھے جائیں، جس طرح وہ اپنی دوسری جائداد منقولہ وغیر منقولہ کے مالک ہوتے ہیں اور اُن کی وہ حقیت بذریعہ ہبہ و بیع و رہن و جائداد و دیگر انتقالات خانگی کے منتقل ہوسکے، اسی تجویز کے سلسلہ میں اُنھوں نے اس اسکیم کے تمام شرائط اور جزئیات پر بحث کی ہو، مثلاً تشخیص جمع، بندوبست کی مدت، کاشتکاروں کے حقوق اور دیہات کے انتظام حکومت وغیرہ کے متعلق، ہم ان سب جزئیات کو نظرانداز کرتے

ہیں، نواب انتصار جنگ نے اس تجویز کے خاتمہ پر یہ رائے بھی ظاہر کی کہ پہلے صرف ایک مقام (امرآباد) میں تجربتاً اُن کی تجویز پر عمل کیا جائے اور درصورت کامیابی عام طور سے یہ انتظام صوبہ شرقی کے اُن تمام تعلقات میں جاری کیا جائے جہاں قابل زراعت اراضی بہ نسبت اراضی مزروعہ کے زیادہ ہو۔ اور ایک دفعہ سرکار کی مرضی معلوم ہونے کے بعد یہ امر آسان ہوگا کہ جس تعلقہ میں اس قسم کے انتظاموں کا جاری کرنا مناسب معلوم ہو اُس کی منظوری سرکار سے حاصل کرلی جائے۔

یادداشت کے خاتمہ پر اُنھوں نے واضح طور پر یہ بتایا ہے کہ اس تجویز سے اُن کا مقصد یہ ہے کہ ملک کی دولت اور سرمایہ میں اضافہ ہو، اور اس کی صورت یہ ہے کہ غیر آباد اور جنگلی مواضع میں زمینداریاں قایم کی جائیں اور زمیندارانہ بندوبست کیا جائے، اور یہ کوشش کی جائے کہ ملک کے بڑے بڑے راجہ، نواب، جاگیردار اور ساہوکار نیز دوسرے دولتمند لوگ اپنا سرمایہ ان ویران مواضع اور جنگلوں کی آبادی میں لگائیں۔

اِس کے بعد دوسرے سال اُنھوں نے اِسی مسئلہ کے متعلق ایک اور مفصل یادداشت پیش کی جس میں مدلل و مفصل طریقہ سے اس معاملہ کے تمام جزئیات پر بحث کی ہے۔ مروجہ قواعد کے نقایص کو بتایا ہے، اور لوگوں کے اُن اعتراضات کا تفصیلی جواب دینے کے بعد جو اس تجویز پر کیے جاتے ہیں، یہ ثابت کیا ہے کہ اگر اُن کی تجویز پر عمل کیا گیا تو گورنمنٹ نظام اور رعایا دونوں کو فائدہ پہنچیگا۔

نواب انتصار جنگ کی اسکیم پر بعض سرکاری عہدہ داروں نے یہ خطرہ ظاہر کیا تھا کہ اگر رعیت داری بندوبست کے سوا کوئی دوسرا ایسا انتظام کیا گیا جس سے ایک شخص بہت بڑے بڑے قطعات اراضی کا مالک بن جائے تو اس سے سرکاری انتظام مشکل ہو جائیگا، پولیس کی دقتیں بڑھ جائینگی، لہذا مفصلات میں زمینداروں کی قوت کا بڑھنا سرکاری مصالح کے لحاظ سے مناسب نہیں۔

نواب انتصار جنگ اس کے جواب میں کہتے ہیں:۔

"میں اس قسم کے خیالات کو بہت حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ اگر اسی پالیسی پر بحث ہونے لگے تو میں موجودہ انتظام رعیت داری کی جگہ بھی زمینداری بند وبست کے قایم ہونے کو ترجیح دونگا کبھی اُن کمبل پوشوں سے جن سے رعیت داری بند وبست مراد ہی کوئی ملک رونق نہیں پا سکتا، نہ تجارت کو ترقی ہو سکتی ہی نہ زراعت کو۔

کاشتکاروں کی متفرق قوت نہ کسی سرمایہ کو پیدا کر سکتی ہی۔ ایک بد ہنگامی اُن کے منتشر کرنے کو ایک قحط اُن کو کامل تباہ کر دینے کو کافی ہوتا ہی۔"

اس کے بعد زمینداری انتظام کے فائدہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اگر میرے صوبہ میں ایک زمیندار اپنے سرمایہ اور اپنی لیاقت و محنت سے اپنے واسطے ایک ایسا بڑا علاقہ پیدا کرے جو بمنزلہ ایک سمستان کے ہو جائے تو میں اس کو سرکار عالی کے انتظام کی بہت بڑی کامیابی سمجھونگا اور سرکار میں سفارش کرونگا کہ وہ بمنزلہ ایک راجہ یا نواب کے (جیسی حالت ہو) تسلیم کیا جائے، اور سرکار سے اس کو خطاب، علم، نقارہ اور نوبت اور عماری سے سرفرازی ہو تاکہ ملک کے ہر ایک حصہ میں جا بجا چہل پہل اور ایک رونق اور شان پیدا ہو جائے۔"

"جو حالت اضلاع میں آج طاری ہی کہ منزلوں چلے جاؤ اور کوئی آسودہ گھر دیکھنے میں نہ آئے وہ کوئی عمدہ حالت نہیں ہی، کہیں کہیں شاذ طور پر اگر اب بھی اس شان و شوکت کا جلوہ نظر آجاتا ہی تو یہ اُنھیں لوگوں کی وجہ سے ہی جو اس ملک کے قدیم زمیندار کہلاتے ہیں اور جن کا ادب اب تک رعایا

کے دلوں میں ہے۔"

رعایا کی قوت بعد اس کے کہ بادشاہ کی طرف سے اُن کے ساتھ رعایت، انصاف اور مہربانی کا برتاؤ ہو عین سلطنت کی قوت ہے، اس قوت کے حاصل کرنے کے لیئے ہر ایک ذریعہ کو اختیار کرنا چاہیئے۔

زمینداری انتظام کی تائید میں یہ دو بہت بڑی لاجواب دلیلیں ہیں ایک یہ کہ اس سے ذی وجاہت لوگوں کا گروہ ملک میں جابجا پیدا ہو جاتا ہے، اور دوسرے یہ کہ سرکار کو بہت بے فکری ہو جاتی ہے اور سرکار کا محاصل آسانی سے وصول ہوتا ہے۔

آخر میں لکھتے ہیں :-

"اب اخیر سوال یہ ہے کہ زمینداروں کا یہ گروہ کن لوگوں میں سے پیدا ہوگا اور سرمایہ جو زمینداروں کو انتظام قایم کرنے کے لیئے درکار ہے کہاں سے بہم پہنچے گا؟ میرے نزدیک اس کی مفصلۂ ذیل صورتیں ہیں۔"

(۱) سرکار جن لوگوں کو نقد رسوم دیتی ہے اور جو اب بھی زمیندار کہلاتے ہیں، ان میں سے اکثر لوگ اس جدید انتظام کے بموجب دیہات زمینداری لینے کے لیئے آمادہ ہو جائینگے۔

(۲) بڑے بڑے جاگیردار اور مقطعہ دار اور سمستانوں کے لوگ اس طرف رغبت کرینگے۔

(۳) جن علاقوں میں سے ریل گزری ہے وہاں ور دوسرے مقامات کے دولتمند اور ذی ہمت لوگ پہنچیں گے۔ ذی ہمت دولتمند کے لیئے اس وقت حیدرآباد میں اس سے زیادہ کوئی مفید تجارت نہیں ہے کہ وہ تلنگانہ میں زمین حاصل کرے اور اپنا سرمایہ زراعت کی ترقی میں صرف کرے۔

سرحدی علاقوں میں سرکار عظمت مدار کے علاقے کے رہنے والے وہ بڑے بڑے لوگ جو زراعت کا شغل رکھتے ہیں اور جن کے علاقہ میں اس قسم کے ویران جنگل نہیں رہے جن میں وہ اپنا سرمایہ صرف کر سکیں بہت اشتیاق کے ساتھ آگے بڑھینگے اور اپنا سرمایہ اس مفید کام میں صرف کرینگے اور سرمایہ کے ساتھ کچھ آدمیوں کو بھی لائینگے، اور اسی چیز کی سرکار عالی کے علاقوں میں اور خاص کر تلنگانہ میں سخت ضرورت ہے۔ بہت سی مفرور رعایا ان حالات کو سنکر اپنے وطن کی خوشی میں زمینداروں کے

ساتھ پھر اپنے موروثی بادشاہ کے زیر حکومت آبسے گی۔

اِس کے بعد نتیجہ کلام کے طور پر لکھتے ہیں :۔

"میری پیش کی ہوئی تجویز کا مطلب یہ نہیں ہے کہ موجودہ رعیت داری بندوبست کو برباد کر کے اس کی جگہ زمینداری انتظام قایم کیا جاوے، بلکہ صرف مطلب یہ ہے کہ وہ ذریعے بہم پہنچائے جائیں جن سے زراعت کی ترقی کے لیے ملک کی طرف سے سرمایہ کام میں لایا جائے۔ اور اگر ایک ایسے وقت جب کہ بہت بڑے سرمایہ کے صرف کے بعد تلنگانہ کی ریل جاری ہوئی ہے اور ایک موقع اس بات کا ہاتھ آیا ہے کہ لوگ اس قسم کی اولوالعزمیوں کے کام کریں اس قسم کی تدبیریں اختیار نہ کی جائینگی، تو درحقیقت ہم ان تمام فوائد کو ہاتھ سے جانے دینگے جو ریلوے کے ایسے بڑے سرمایہ سے ہم اپنے تلنگانہ کے ویران ملک کو پہنچا سکتے ہیں۔

کوئی ایسی چیز جو ہمیشہ اپنے حال پر قایم رہے کیا ترقی کر سکتی ہے، قیام میں خود ترقی کا پتہ نہیں ہے زمانہ کبھی ایک جگہ قایم نہیں رہتا، کیونکہ اس میں ترقی اور تنزل مدوجزر کی طرح ہوتا رہتا ہے اور وہ ملک جو اپنی پرانی لکیر کو پیٹا کرتا ہے، کبھی ترقی نہیں کرتا"۔

نواب انتصار جنگ کی مندرجہ بالا اسکیم سے ناظرین کو اندازہ ہوگا کہ اُن کی تمام تجویزیں ایسی ہوتی ہیں جن کا فائدہ گورنمنٹ اور رعایا دونوں کو یکساں پہنچتا تھا، وہ تمام یادداشتیں جو اُنھوں نے مختلف اوقات میں ملک کی اصلاح و ترقی کے سلسلہ میں لکھیں اُن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف اپنا فرض ادا کرنا نہیں چاہتے ہیں بلکہ کوئی دوسرا جذبہ ہے جو اُن کے اندر کام کر رہا ہے۔

مرمت و ترقی ذرائع آب پاشی

نواب انتصار جنگ نے ۱۲۹۳ف میں بحیثیت رکن مال گزاری تلنگانہ کا جو دورہ کیا تھا، اس کے سلسلہ میں باولیوں کی مرمت کے متعلق ایک مفید تجویز پیش کی تھی جس کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے، چونکہ یہ معاملہ نہایت اہم تھا اس لیے مدار المہام نے حکم دیا کہ

اس پر مال کے تمام عہدہ داروں کی رائے لی جائے، جب یہ حکم دیا جا رہا تھا، اس وقت نواب انتصار جنگ نے باصرار مدار المہام سے یہ منظوری حاصل کر لی کہ کسی ایک تعلقہ میں عملی طور سے ان کی تجویز کا امتحان کیا جائے۔ چنانچہ تعلقہ نارائن پیٹھ ضلع ناگر کرنول میں، اس تجویز کا امتحان کیا گیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۲۹۴ف کی ششماہی میں ۲۱۲ مرمت طلب باولیوں کی مرمت رعایا نے مجوزہ شرائط پر منظور کی، اور جیسا کہ نواب انتصار جنگ نے اپنی ایک مابعد کی یادداشت میں اعداد و واقعات سے ثابت کیا ہے، اس سے گورنمنٹ اور رعایا دونوں کو فائدہ پہنچا۔

صوبہ دار مقرر ہونے پر نواب انتصار جنگ نے تلنگانہ کے ذرائع آبپاشی پر از سر نو بحث کی اور ایک معرکۃ الآرا یادداشت اس کے متعلق لکھی، جس میں علاوہ باولیوں کی آبپاشی کے ان تمام ذرائع و وسائل پر اپنے خیالات ظاہر کیے جن کا تلنگانہ میں رواج ہے۔ یہ یادداشت ان کی غیر معمولی قابلیت اور عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہے، لیکن ہم طوالت کے خیال سے اس کو کلیۃً نظر انداز کرتے ہیں، البتہ اس کا ایک فقرہ نقل کرینگے جس سے یہ معلوم ہوگا کہ اس کد و کاوش سے نواب انتصار جنگ کا کیا مقصد تھا وہ لکھتے ہیں:۔

"ان تجویزوں کے مطابق چھوٹی سی چھوٹی باولی سے لے کر متوسط درجہ کے تالاب تک ایسے ہزارہا کام ہر ایک ضلع میں موجود ہو جائینگے جن میں مختلف حیثیت اور مقدرت کی رعایا اپنے اپنے مقدور کے مطابق اپنا سرمایہ صرف کرنے کے لیے آگے بڑھیگی اور ان سرمایہ کا یہ مصرف جو کہ بالکل ان کے مذاق طبیعت اور فطری خواہش اور جوش کے مناسب ہوگا، ان کو ایک نہایت مفید سبق کفایت شعاری کا بھی تعلیم کریگا، ہر ایک زراعت پیشہ شخص کو اس بات کی خواہش ہوگی کہ اپنے موجودہ سرمایہ کو اور جو کچھ کہ اس سے اور بچایا جاسکے اس کو بچا کر ان کاموں میں صرف کریں اور بیشک جب کہ چند سال کے بعد یہ باولیاں اور تالاب اور کنٹے ان کے لیے دولت کے سرچشمہ ثابت ہونگے، اور اس محنتی اور جفاکش گروہ کے ہاتھ میں پیسہ

ہوگا، تو روز بروز ایسے کاموں کی طرف لوگوں کی خواہش ترقی کرگئی، اُن کی دولت اُن کے سامان زراعت کو ترقی دی گی۔ اُفتادہ اور ویران زمینیں مزروعہ ہونگی، تری زمینوں کی تعداد میں روزافزوں اضافہ ہوگا سرکاری محاصل کو ترقی ہوگی، اور کوئی گاؤں ایسا باقی نہ رہیگا، جہاں ایک معقول گروہ اس قسم کی ملکیتوں کا مالک نہ پایا جائے، اور جس کے گھر میں چلتی ہوئی باؤلیوں اور لبالب تالابوں اور کنٹوں کی برکت اُن کی ہر ایک در و دیوار سے نہ ٹپکتی ہو، یہ کام اُن کو قحط اور خشک سالی کی مصیبتوں کے وقت عزت اور حرمت کے ساتھ اُن کی جگہوں میں قایم رکھ سکیں گے اور یہ آفت جو آج طاری ہے کہ ذراسی مصیبت کو بھی دیہات کی رعایا برداشت نہیں کرسکتی اور دیہات کو ویران کرکے چل دیتی ہے، اور ایک سال کی خشک سالی کا اثر برسوں تک باقی رہتا ہے، وہ باقی نہ رہیگی۔"

خود نواب انتصار جنگ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں اُنھوں نے یہ یادداشت پیش کی تلنگانہ کے وسائل آب پاشی کی حالت نہایت تباہ تھی، جہاں پہلے کھیت لہلہاتے تھے وہاں اب ببولوں کے بن کھڑے تھے، سینکڑوں تالاب برباد ہوچکے تھے جن کی مرمت کے لئے لاکھوں روپیہ درکار تھا۔

نواب انتصار جنگ کی یادداشتیں ایسی مدلل و پرزور تھیں کہ ارکان حکومت نے ان پر توجہ کرنے کی ضرورت محسوس کی، اسی زمانہ میں مسٹر ڈنلاپ انسپکٹر جنرل مال نے بھی ۱۷ اپریل ۱۸۹۷ء کو ایک مفصل یادداشت، مسئلہ آب پاشی کے متعلق پیش کی، جس پر نواب انتصار جنگ نے ایک مدلل تبصرہ لکھا، جس میں اُنھوں نے کہیں مسٹر ڈنلاپ کی تائید کی اور کہیں اختلاف کیا، چنانچہ ایک جگہ اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"میں ایسی ہر ایک تجویز سے جس میں سرکار کو نقد سود کی ذمہ داری کے ساتھ روپیہ قرض لینا پڑے اختلاف کرنے پر مجبور رہوں سرکار عالی کو صرف اپنے ملک کا اندرونی

انتظام قایم رکھنا ہے اُس کو بیرونی حملوں یا بیرونی دشمنوں کا کوئی خوف نہیں ہے، ایسی ایک سرکار کے لیے یہ ہتک نہیں ہے کہ وہ اُن سلطنتوں کی تقلید کرے جو دوسرے سنگین اخراجات کے تحمل کی وجہ سے اُن مفید کاموں کے لیے اپنے موازنہ میں کافی گنجایش نہیں نکال سکتیں، سرکار عالی کو یہ ضرور ہے کہ مناسب جز رسی اور کفایت شعاری کو کام میں لائے اور ان کاموں کے لیے مناسب رقم جو حال کی رقم سے سہ چند چہار چند سے کم نہو اپنے موازنہ میں پیدا کرے برخلاف اس کے قرضہ لینے کی طرف اگر سرکار عالی کا قدم بڑھ گیا تو کفایت شعاری کی ترغیب میں لامحالہ کمی ہوگی "

مجلس کا قیام غرض ان تجاویز کے بعد ذرائع آب پاشی کی اصلاح اور تعمیر کی ضرورت تسلیم کی گئی اور یہ طے پایا کہ ۱۲۹۷ف میں ایک مناسب اور مستحکم اصول پر یہ کام جاری کر دیا جائے، چنانچہ اس مقصد کے لیے ایک مجلس مقرر کی گئی جس میں نواب محسن الملک بہادر، اے جی ڈنلاپ مولوی چراغ علی صاحب معتمد مال، جی پامر صاحب معتمد تعمیرات عامّہ، اور خود نواب انتصار جنگ بہادر صوبہ دار شرقی اور چند دوسرے عہدہ دار شریک کیئے گئے اس مجلس نے ۱۱ صفر ۱۳۰۵ھ کو ایک یادداشت مدار المہام کی خدمت میں پیش کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ سال حال سے ذرایع آب پاشی کی مرمت کا کام بہ نگرانی ایک مجلس شروع کیا جائے، اور منجملہ ان تجاویز کے جو مرمت کے مختلف طریقوں کے متعلق صوبہ دار شرقی نواب انتصار جنگ نے پیش کی ہیں جو تجویز مفید ہو اُس کے مطابق مرمت کی اجازت دی جائے۔

نواب مدار المہام نے اس تجویز سے اتفاق کر کے اس کی منظوری کے لیئے اعلیٰ حضرت سے سفارش کی اور حضور ممدوح نے مجلس کا قیام منظور فرمایا۔ چنانچہ ایک مجلس بنام "مجلس آبپاشی ممالک محروسہ سرکار عالی" قایم کی گئی جس کے میر مجلس نواب وقار الامرا بہادر تجویز کیئے گئے اور انسپکٹر جنرل صیغہ مال، چیف انجنیر، اور نواب انتصار جنگ اور بعض دوسرے عہدہ دار بھی

اس میں شامل کیئے گئے، اس مجلس کو اختیار دیا گیا کہ وہ کنوؤں کے علاوہ آب سانی کے تمام ذرائع اپنے ہاتھ میں لے لے، اس کے علاوہ مجلس کو کام کرنے کے متعلق مفصل ہدایتیں دی گئیں اور سال حال کے خرچ کے لیئے دس لاکھ روپیہ دیا گیا کہ وہ جس طور پر مناسب سمجھے اپنے اختیار سے اس رقم کو تقسیم و صرف کرے۔

اس زمانہ سے ذرائع آب پاشی کی مرمت و اصلاح کا وہ دور شروع ہوا جو آئندہ چل کر گورنمنٹ اور رعایا دونوں کے لیئے مفید ثابت ہوا۔

نواب انتصار جنگ کے اصلاحی احکام

۱۹۰۲ء میں صوبہ دار اور اُن کے ماتحت تعلقہ داروں کے اقتدار میں اضافہ کیا گیا، اور محکمہ پولیس اور بعض دوسرے صیغے صوبہ دار کے ماتحت کیئے گئے ان جدید تغیرات کے موقع پر نواب انتصار جنگ نے تفصیلی احکام اپنے ماتحت عہدہ داروں کے نام جاری کئے اور اُن کو بتایا کہ جدید تغیرات سے کیا مقصد ہے اور یہ کہ آیندہ ان کا طرز عمل سرکاری معاملات کے سلسلہ میں اپنے ماتحت افسروں کے ساتھ کیا ہوگا؟ ان احکام کے سلسلہ میں اُنھوں نے مختلف دفاتر کی جزئیات پر بھی توجہ کی ہے، اور دفاتر کے عام طرز عمل کے متعلق اصلاحات و ہدایت جاری کی ہیں ہم ان تمام جزئیات کو نظر انداز کر کے چند عام ہدایات کا ذکر کرتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ انتظامی امور میں اُن کا عام طرزِ عمل کیا تھا اور وہ سرکاری ملازمین اور عہدہ داروں سے کن چیزوں کے متوقع رہتے تھے

وہ ایک مختصر تمہید کے بعد سررشتہ پولیس کے جدید انتظام کے بارہ میں لکھتے ہیں:-

"صوبہ دار کو جہاں تک کوتوالی سے اب تعلق ہے میں اس کو صاف طور سے ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کوئی فرق نہیں سمجھتا مال اور عدالت کو توالی کے کام میں بجز اس کے کوتوالی کا کام ایک ایسا کام ہے کہ جس پر نہایت مستعدی اور چستی سے اور بلا تعویق ہر ایک افسر کو متوجہ ہونا ضرور ہے۔ اور میں اپنا ہر ایک قسم کا اقتدار اس سررشتہ کو پُر رعب اور کامیاب بنانے میں صرف کرونگا اور بہت زیادہ اس تعلق پر نظر رکھونگا جو کہ عدالت کو کوتوالی کے ساتھ ہے، تاکہ کوتوالی کو عدالت کی طرف سے ہر ایک

واجبی آسانی کے ساتھ مدد مل سکے۔"

کوئی شخص ضلع میں ایسا نہیں ہے اور خصوصاً وہ جن کو زمین سے کسی قسم کا تعلق ہے (اور بوجہ اپنے اس تعلق کے اپنے علاقہ میں بہت کچھ قابو رکھتے ہیں) جوکہ صوبہ دار اور تعلقہ داران اضلاع سے اپنے تعلقات نہ رکھتے ہوں، پس ان تمام لوگوں کے ہر طرح ذہن نشین کردیا جائے کہ آیندہ ہم اُن کے ان طرز کارروائی پر بخوبی غور کرینگے جوکہ وہ کوتوالی کے ساتھ وارداتوں کے انسداد اور برآمد اور مجرمین کی گرفتاری میں برتینگے، تعلقہ دار صاحبان اضلاع اور تحصیلدار صاحبان کا دیہات پر بخوبی قابو ہے اور میں تو نہیں سمجھتا کہ گاؤں میں کوئی واردات ہو، اور پٹیل پٹواری اور دیگر اہالی دیہہ اس سے بے خبر رہیں اور اگر وہ عین وقت پر کوشش کریں تو شاید ہے کہ کوئی ایسی واردات برآمد ہونے سے رہ جائے، بس جس چیز کی اب ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ عہدہ داران موصوف ان سب اپنے ماتحت لوگوں پر اپنی عملی کارروائی سے ثابت کردیں کہ آیندہ اگر اُن کی طرف سے کوتوالی کے کاروبار میں کوئی اغماض ہوگا تو ہم اُن کے ساتھ بہت ہی سخت طرح سے پیش آئینگے۔"

اس کے بعد نواب انتصار جنگ خود پولیس کے عہدہ داروں کو متنبہ کرتے ہیں۔

"ہم اس سے بخوبی واقف ہیں کہ پولیس کا سررشتہ ایک ایسا سررشتہ ہے کہ کتنا ہی کچھ وہ اپنا کام ایمانداری سے انجام دے تاہم مخلوق کی زبان سے اُس کو نجات نہیں مل سکتی لہذا جو آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچتی ہیں اس کو سچ باور کرنے سے پہلے نہایت درجہ ہم کو احتیاط کرنی چاہیئے اور خصوصاً اُن کارروائیوں سے جن سے عام لوگوں کی نگاہ میں پولیس کی بے وقعتی ہوتی ہو، ہر طرح احتیاط درکار ہے۔

بااین ہمہ کچھ شک نہیں ہے اور مجھ کو اپنے دورہ کے زمانہ میں ذاتی تجربہ سے

اس پر کافی وثوق حاصل ہو گیا ہی کہ شکایتوں کی اس فہرست میں بہت سی واقعی شکایتیں بھی شامل ہیں، جن کا انسداد آئندہ ہمارا ایک ضروری فرض ہونا چاہیئے، اور اس مقصد کے لیئے ہم کو ہر وقت تیار رہنا ہی کہ جب کبھی ایسی واجبی شکایت حسب اطمینان ثابت ہو جائے تو ملازموں کو قرار واقعی سزا دیں۔

کوئی فعل جس سے کسی شخص کو ناواجبی تکلیف یا نقصان پہنچے ہمیشہ مرتکب کو سزا کا مستوجب کرتا ہی اور جب ان افعال کا ارتکاب خود اُن لوگوں (ملازمین پولیس) کی طرف سے ہو جو کہ رعایا کے حفظ امن اور راحت کے ذمہ دار ہیں تو سزا کی تجویز کے وقت بے شبہ زیادہ سختی برتنے کا موقع ہو گا"

غرض یہ ہی کہ کوتوالی کے ملازموں پر بھی آئندہ یہ بات بخوبی معلوم رہنی چاہیئے کہ تعلقہ داران ضلع سے اُن کا کوئی فعل مخفی نہ رہ سکیگا۔ اور جب کہ اُن کا کوئی قصور یا جرم ثابت ہو جائیگا تو کافی سزا اُن کو دی جائے گی"

سزا کی سختی کے ذکر میں مجکو اس قدر اور کہہ دینا ضرور ہی کہ جب ملازم کو آئندہ خدمت سے جدا کرنا منظور نہو، اُس کو بپاداش اس کے کسی فعل کے ایسی کوئی سزا نہ دیجائے جس سے اُس کی غیر معمولی توہین ہوتی ہو اور خصوصاً افسروں کی نسبت یہ احتیاط اور بھی زیادہ ضروری ہی کیونکہ ایسی توہینوں کے برداشت کرنے کے بعد نہ اُس کی منزلت عام میں باقی رہتی ہی اور نہ خود اس شخص سزا یافتہ میں غیرت اور حمیت باقی رہتی ہی، اور کوئی شخص جو اپنے عہدہ کے مناسب عزت نہ رکھتا ہو، وہ اس عہدہ کے قابل متصور نہیں ہو سکتا، گو کہ دوسری قابلیتیں اُس میں کیسی ہی کیوں نہ موجود ہوں"

ریاستوں کے متعلق گزشتہ زمانہ میں یہ عام شکایت تھی اور کسی قدر اب بھی موجود ہی کہ وہاں ترقی کا مدار حسن کارگزاری یا قابلیت پر نہیں ہوتا بلکہ سفارش پر ہوتا ہی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ ناقابل لوگ ہر محکمہ اور ہر صیغہ میں داخل ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے کام میں ابتری پھیل جاتی ہی، اور لایق

لوگ یا تو دل شکستہ ہو کر ترک تعلق کر لیتے ہیں یا ناقدرشناسی کی وجہ سے اپنا فرض منصبی بددلی سے ادا کرتے ہیں، نواب انتصار جنگ ان حالات سے بے خبر نہ تھے، اس لیے خود اُن کا طرز عمل یہ تھا کہ وہ حُسن کارگزاری پر اپنے ماتحت ملازمین کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، برخلاف اس کے نالائق و ناکارہ لوگوں کے متعلق وہ کسی کی سفارش نہیں سنتے تھے، چنانچہ ان احکام کے سلسلہ میں بھی وہ ملازمین پولیس کو تنبیہ کرنے کے بعد اُن کے حقوق کی حفاظت کے متعلق حسب ذیل الفاظ میں اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں:۔

"تمام ہمارے ماتحت اِس بات پر بخوبی مطمئن ہو جائیں کہ جب وہ ہماری مرضی کے مطابق اپنا مفوضہ کام عمدگی سے انجام دینگے تو اُن کے حقوق کی حفاظت میں ہماری طرف سے کوئی بھی دقیقہ فروگزاشت نہو گا اور اُس کے ساتھ ہر ایک شخص کے ذہن نشین ہو جانا چاہیے کہ ایک دفعہ نوکر ہو جانے کے بعد پھر ترقی صرف اپنی کارگزاری اور اپنے رویہ سے حاصل ہو سکیگی، نہ خاندان یا سفارش کے لحاظ سے۔

اپنے استحقاق پر جو کہ ہر ایک کے درجہ اور نمبر اور کارگزاری اور رویّہ سے مرکب ہوگا، لوگوں کو ایسا وثوق ہو جانا چاہیئے کہ اپنی کامیابی کے لیے اُن کو خارجی سفارشیں تلاش کرنے کی خود ضرورت نہ رہے جس کی تلاش پر وہ اس وقت مجبور ہو جاتے ہیں جب کہ اُن کے واجبی حقوق سے چشم پوشی کی جاتی ہے اور جو چشم پوشی نہایت نفرت سے دیکھنے کے قابل ہے۔"

مذکورۂ بالا اُصول پر جس قدر اہتمام سے کارروائی کی جائیگی، اُسی قدر کارگزار ملازموں کو اپنی خدمات کی انجام دہی کی طرف زیادہ توجہ ہوگی، اور ناکارگزار لوگ جو صرف سفارش اور مروتوں پر اپنی زندگی بسر کرنے کے خوگر ہیں، اس سررشتہ کو چھوڑتے چلے جائینگے، اور ایک دو برس کے اندر اندر کوتوالی کا سررشتہ پورے اطمینان کی حالت میں آجائیگا۔"

نواب انتصار جنگ کی تمام تجویزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رعایا کی خوش حالی اور فارغ البالی ہمیشہ اُن کے پیش نظر رہتی تھی۔ اگرچہ وہ قانون کے پورے پابند تھے لیکن باایں ہمہ سخت گیری کو پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے جہاں تک اُن سے ممکن ہوتا تھا قانون کے حدود کے اندر رہ کر رعایا کے لئے آسانیاں بہم پہنچانے میں تامل نہیں کرتے تھے، اور اسی طریق عمل کے وہ اپنے ماتحت عہدہ داروں سے متوقع رہتے تھے۔ چنانچہ انہی احکام کے سلسلہ میں پولیس کے علاوہ اُنھوں نے تعلقہ داروں کو بھی متنبہ کیا ہے، جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:۔

"دوم سوم تعلقہ داروں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ مزارعین کو اُن کی باقی کی علت میں بے دخل کرسکیں اس کے ساتھ اس ضابطہ کا بیان نہیں ہوا ہے جو ایسے موقع پر برتنا چاہیئے اور یقین ہے کہ آیندہ وہ ضروری ضوابط بھی جاری ہونگے بالفعل اس قدر واضح رہے کہ اراضی سے کسی مزارع کی بیدخلی سرکاری بقایا کی علت میں صرف اُس وقت ہونی جائز سمجھی جائیگی جب کہ باقی کسی آفت ارضی وسماوی کی وجہ سے نہیں بلکہ باقی دار کی شرارت اور بدچلنی وغیرہ کی وجہ سے پڑی ہے، اور دوسرا کوئی جائز ذریعہ اس باقی کے وصول کے لئے موجود نہ ہو، اور اشتہار جو اس باب میں دیا گیا ہے، اُس کی مدت منقضی ہوگئی ہو، اور حجت باقی دار کے مقابلہ میں باقی نہ رہی ہو۔

اِن احکام کے آخر میں جو حکام کے توسیع اقتدار کے بارہ میں ہیں لکھتے ہیں:۔

"حال کے اقتدار نامہ سے سرکار نے اپنے ماتحت عہدہ داروں پر اس سے زیادہ اعتماد کیا ہے جس قدر کہ درحقیقت معتدل طور سے کرنا چاہیئے تھا اس اعتماد اور اطمینان کی اصلی شکرگزاری اب یہی ہے کہ عہدہ داران موصوف اپنی طرز کارروائی سے ثابت کردیں کہ جس قسم کا ان پر اعتماد کیا گیا ہے وہ ہر طرح اس کے لائق تھے اور ایسا موقع نہ آنے دینگے جس سے سرکار کو اپنے فیاض طریقہ عطائے اقتدار

افسوس کرنا اور اُس کو بدلنا پڑے۔"

سکندرآباد سے ورنگل تک جدید ریلوے لائن

مملکت آصفیہ میں ریلوے کا آغاز یکم فروری ۱۸۷۰ء سے ہوا جب کہ گلبرگہ سے سکندرآباد تک ریلوے لائن کی تعمیر شروع ہوئی لیکن ہم اس وقت جس ریلوے لائن کا تذکرہ کر رہے ہیں یہ ۱۸۸۹ء میں نواب انتصار جنگ کے عہد میں سکندرآباد سے ورنگل تک تعمیر ہوئی، اس سلسلہ میں نواب انتصار جنگ کو بھی بہت کچھ کام کرنا پڑا، خصوصاً زمین اور باغات وغیرہ کے معاوضہ کا مسئلہ (جو ریلوے لائن میں آ گئے تھے) ایسا پیچیدہ تھا جس نے اُن کو اور اُن کے ماتحت عہدہ داروں کو مدت تک مصروف رکھا، ہم جزئیات کو چھوڑ کر اس موقع پر نواب انتصار جنگ کی ایک یادداشت سے جو اس ریلوے کے متعلق ہے، بعض حصے نقل کرتے ہیں۔ وہ مدار المہام کو صوبہ کی سالانہ رپورٹ کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

"اسی سال صوبہ ہذا میں ایک جدید ریلوے لائن کی کارروائی شروع ہوئی جو ابتدا میں چاندا ریلوے کے نام سے موسوم ہوئی تھی اور اب آخر میں اُس کا نام نظام گارنٹیڈ اسٹیٹ ریلوے ہے، ہمارا کام اس کارروائی کے متعلق یہ تھا کہ جو زمین ریلوے کمپنی کو مطلوب تھی وہ اُس کو سپرد کر دیں اور زمین و دیگر اشیاء موقوعہ زمین درآمدہ ریلوے کا معاوضہ اس کے مستحقین کو دیں، یہ اس سال کام سکندرآباد سے لے کر ورنگل تک ۱۰۴ میل کی مسافت میں پھیلا ہوا تھا۔"

"معاوضہ کی تجویز کا اصول وہی قرار دیا گیا ہے جو سرکار عظمت مدار کے علاقہ میں ہے، ان تعدد لحاظات اور خصوصیات کے ساتھ جو اس ملک کی حالت کے مناسب تھیں، اور جن میں سے ایک بڑا اصول یہ تھا کہ اراضیات اور درختوں کا معاوضہ اُن کے محاصل اور منافع کے لحاظ سے حتی الامکان اراضیات اور درختوں میں دیا جائے، اور چونکہ سرکار کے قبضہ میں ہر جگہ ہر قسم کی زمین کافی تعداد سے موجود ہے، اور معاوضہ چاہنے والے بھی اسی کو زیادہ پسند کرتے ہیں تو یہ اصول اس ملک کی حالت کے لحاظ سے بہت

عمدہ تھا، اور اس ذریعہ سے اکثر موقعوں پر ایک بہت بڑا صریح بار خزانہ پر سے کم ہو گیا، با ایں ہمہ نقدی معاوضہ کی ضرورت باقی ہے۔"

" لیکن ایک دوسری اہم بحث ہنوز تصفیہ طلب باقی ہے کہ ریلوے کمپنی نے جن زمینوں پر چند روزہ کے نام سے قبضہ حاصل کیا ہے ان کا معاوضہ ہنگامی طور سے تجویز کیا جائیگا یا دوامی طور سے۔ ریلوے کمپنی کے ایجنٹ صاحب نے اس بات کو قبول کر لیا ہے کہ وہ نہیں بتلا سکتے کہ جس وقت وہ اس زمین کو چھوڑینگے اس کی کیا حالت ہو گی، یعنی اس میں غار ہونگے یا اس میں اور ایسی کوئی چیز ہو گی جو زراعت کے لیے حارج ہو نہ وہ یہ بتلا سکتے ہیں کہ ٹھیک وہ کس وقت پر اس کو چھوڑینگے، تو ایسی حالت میں میری رائے یہ ہے اور یہی رائے میں نے سرکار میں پیش کی ہے کہ ان زمینوں کا معاوضہ بھی مستقل طور سے دیدیا جائے، آیندہ اگر وہ زمینیں ریلوے کے قبضہ سے چھوٹینگی تو جس حالت میں بھی ہونگی سرکار کی ملکیت متصور رہونگی۔"

" اگر ایسا نہ کیا جائے تو مالکان وقابضان اراضی کی حق تلفی کا باعث ہو گا وہ ان زمینوں میں جو عارضی طور سے ان کو معاوضہ میں سپرد کی جائیں، اپنا سرمایہ مستقل طور سے صرف کر کے زراعت کو ترقی نہ دے سکینگے، اور اگر اس عرصہ تک ان کو سال بہ سال سرکار کی طرف سے کوئی رقم بطور محاصل سالانہ دی جائے تو قطع نظر اس کے کہ خزانہ پر بے راہ راست ایسا بار قایم رکھنا سرکار کے لیے خود مفید نہیں ہے، مالکان وقابضان اراضی کے حق میں جن کا مستقل قبضہ زمین پر سے اٹھایا گیا ہے وہ کوئی معقول مراعات نہ ہو گی اور بہر حال وہ اس قدر مدت تک جس کی کوئی حد معین نہیں ہے اپنی محنت اور اپنے انتظام کو اپنے وسائل آمدنی کے بڑھانے میں صرف کرنے سے بالکل قاصر رہینگے، اور ان منافع سے محروم رہینگے جن کا حق ہر ایک مالک کو علم انتظام مدن کی رو سے حاصل ہے۔"

" ایک خاص امر ہے جس کا ذکر کرنا ریلوے کے متعلق اس موقع پر ضرور ہے۔ یہ ایک ظاہر

امر ہی کہ جس وقت ریلوے کے اس جدید سلسلہ کی کارروائی ملک میں شروع ہوئی تو بعض وجوہ سے گو کہ وہ واقعی ہتیں یا غیر واقعی ملک میں ایک قسم کی ناراضی اور بدگمانی پائی جاتی تھی یہ نارضامندی کی علامتیں خاص بلدہ سے شروع ہوئی تھیں اور مختلف ذرائع سے اُن کا اثر اضلاع میں بھی پہنچا تھا، اور اگرچہ کچھ شک نہیں ہے کہ نواب مدار المہام سرکار عالی کے اُن پر اطمینان اظہارات سے جو کہ عام طور پر جناب ممدوح نے اس انتظام کی نسبت فرمائے جو ریلوے کمپنی کے ساتھ ہوا تھا اور حضرت بندگان عالی متعالی کی منظوریوں سے وہ نارضامندی یا بدگمانی بہت کچھ فرو ہوئی تھی تاہم اُس وقت تک کہ میں نے دورہ شروع کیا مجکو اُس کی علامتیں اضلاع میں دکھلائی دیتی تھیں "

" میں نے دیکھا کہ ہر ایک جگہ ہمارے عہدہ داروں اور ریلوے کمپنی کے افسروں کے باہم کسی قدر کشش ہو رہی ہی، اور ہمارے افسر ریلوے کمپنی کے کاروبار کو اس ہمدردی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے جس نگاہ سے اُن کو اس وجہ سے دیکھنا چاہیئے کہ وہ ایک ایسا کام ہی جس پر آیندہ اُس حصہ ملک کی تمام ترقیاں منحصر ہیں جن میں کہ وہ ریلوی گزرنے والی تھی، پس میرا پہلا کام یہ تھا کہ میں نے سرکار عالی اور ریلوے کمپنی کے افسروں کے باہمی تعلقات میں سے کدورتوں کو یک قلم دور کردیا میں نے اپنے افسروں کو سمجھادیا کہ اگر اس وقت میں ہم ریلوے افسروں کو پوری مدد نہ دیں جہاں تک ہم سے متعلق ہی تو اس کا نتیجہ خود سرکار عالی کے لیئے مضر ہوگا، اگر ریلوے کمپنی کو مزدوروں کے بہم پہنچنے میں دقت ہوگی تو بالضرور وہ اُن کی اُجرت کے نرخ کو بڑھائینگے اور اسی طرح اور ہر ایک مشکل پر غالب آنے کے لیئے وہ ضرورت سے زیادہ روپیہ خرچ کرنے پر مجبور ہونگے اور ہر ایک پیسہ جو اس طرح پر ضرورت سے زیادہ خرچ ہوگا وہ سرکار عالی پر اُس

ذمہ داری کو بڑھائیگا جو کہ بیس برس تک کمپنی کے سرمایہ کے سود کے متعلق سرکار عالی
سے متعلق ہے، یہ ایک ایسا صریح مضمون تھا کہ ہمارے سب افسروں نے آسانی سے
اُس کو سمجھ لیا اور اپنے اُن پہلے خیالات کو دل سے نکال ڈالا، اور مجکو بہت
ہی خوشی ہوئی جب میں نے دیکھا کہ اس قدر جلد دونوں علاقوں کے افسر بطور دو
دلی دوستوں کے آپس میں ملنے لگے اور ایک کو دوسرے کے ذاتی آرام وراحت
کا خیال مثل اپنی ذاتِ خاص کے آرام وراحت کے رہنے لگا"

"مجکو ابتداء سے یہ خیال تھا کہ اسٹیشن ایسے مقامات پر بنائے جائیں جہاں
عام آرام اور تجارت کے لئے وہ زیادہ مفید ہوں لیکن دو اسٹیشن جو ریلوے کمپنی نے
ایک بمقام یم نم پیٹ اور دوم ہیم برتی میں تجویز کیے تھے، اُن کا موقع عمدہ نہیں
تھا مہتمم صاحب پیمایش ومجوّزہ معاوضہ اراضیات درآمدہ بکار سرکار اور
بعض دوسرے ہمارے عہدہ داروں کو خیال تھا کہ ہرگاہ ریلوے کمپنی کے
افسر موقع تجویز کر چکے ہیں اور نقشہ بن گیا ہے، زمین بھی لے لی ہے اور کام بھی
شروع کر دیا ہے، تو اب اُن میں ترمیم کی کوئی اُمید نہیں ہے لیکن ریلوے کمپنی
کے افسروں کی اُسی خوش اخلاقی اور عمدگی کا نتیجہ ہے کہ جب میں نے بالمشافہ
مسٹر مولنس ورتھ سے اُن دقتوں کو بیان کیا جو یم نم پیٹ اور ہیم برتی اسٹیشن قائم
ہونے سے متصور تھیں اور ترمیم کے فوائد کو تبلایا تو باوجود اس کے کہ اُس وقت
اُن کو بہت تکلیف ہوئی لیکن وہ بدل اور بخوشی آمادہ ہو گئے اور مسٹر فرینول
چیف انجنیر اور ایجنٹ ریلوے کمپنی نے مقامات کی تبدیلی کی اجازت دیدی اب
وہ اسٹیشن جو یم نم پیٹ میں تجویز ہوتا تھا خاص گھٹ کیسرہ میں ہے اور ہیم برتی والا
اسٹیشن خاص جنگاؤں میں"

ان واقعات کی اطلاع دینے کے بعد نواب انتصار جنگ نے ریلوے کے متعلق دوسرے

معاملات و انتظامات پر تفصیلی بحث کی ہے اور معاوضہ کی جو کارروائی عمل میں آئی ہے اُس سے مدار المہام کو آگاہ کیا ہے، اِسی سلسلہ میں اُنھوں نے یہ واقعہ بھی لکھا ہے کہ :-

"۵ دیول اور ۸ قبرستان جو ریلوے میں آئے یہ ریلوے کی خاص سٹرک میں نہیں ہیں بلکہ اُس زمین میں جہاں سے ریلوے نے مٹی کھودی ہے، اُنھوں نے مٹی کے کھودتے وقت اُن مواقع کو بچا دیا ہے۔ لہٰذا ہم کو کسی خاص کارروائی کی ضرورت نہیں پڑی، ایک دیول کی مورت بمقام رنگاپلی دیہ راجہ بھوانی داس ریلوے سٹرک سے زیادہ قریب ہو گئی ہے، اور اُس پر سُرخ رنگت رہنے کی وجہ سے، ریلوے کے گارڈ اور ڈریور کو دقت رہتی تھی۔ لہٰذا اس کی نسبت برضامندی پوجاریان یہ تجویز ہوئی ہے کہ اُس موقع پر سے اُس کو مذہبی مراسم کے ساتھ دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے، اور اس تقریب کے مراسم ادا کرنے کے لئے سرکار نے دو سو روپیہ کی علے الحساب منظوری دی ہے۔"

اس یادداشت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نواب انتصار جنگ کس طرح ہر موقع سے ریاست کے لئے مناسب فائدہ اٹھانا جانتے تھے، اور ایک واقعہ کے تمام جزئیات پر کس طرح حاوی ہو جاتے تھے، اور ہر واقعہ کے تمام پہلوؤں کا ایک عاقبت اندیش مدبّر کی طرح عمیق نظر سے مطالعہ کرتے تھے۔

صوبہ کے صدر مقام کی تبدیلی اور جدید تعمیرات

جب نواب انتصار جنگ صوبہ مشرقی کے صوبہ دار مقرر ہوئے اُس وقت صوبہ کا صدر مقام بھونگیر تھا جو حیدرآباد سے مشرق کی جانب ۳۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، یہ مقام ایک معمولی قصبہ کی حیثیت رکھتا تھا، نواب انتصار جنگ کی حوصلہ مند طبیعت نے چاہا کہ ورنگل کو جو اس صوبہ کا ایک مشہور تاریخی مقام ہے اور اب حوادث زمانہ نے اس کو مٹا دیا ہے، اس صوبہ کا مستقر اور صدر مقام بنائیں، چونکہ حُسن اتفاق سے اسی زمانہ میں اعلیحضرت بھی اس صوبہ میں ریلوے کے افتتاح کے لئے تشریف لا چکے تھے، اس لئے نواب انتصار جنگ نے

اس مبارک موقع سے فائدہ اٹھا کر نواب سالار جنگ ثانی کی خدمت میں یہ تجویز پیش کردی کہ بلحاظ ان تمام ترقیات کے جو اس شہر کی آبادی میں ہوئی ہیں اور ہوتی جاتی ہیں اس کا نام پھر اپنے قدیم نام اور مشہور قلعہ پر ورنگل رکھا جائے اور ہنمکنڈہ اور مٹھوارہ وغیرہ مقامات اپنے معروف ناموں کے ساتھ اس بڑے شہر کے محلے قرار دیئے جائیں اور ضلع کا نام بھی بجائے کھمم کے ورنگل کا ضلع رکھا جائے، نیز صوبہ کا نام بھی جب کہ اپنے مستقر کے نام سے پکارا جائے صوبہ ورنگل ہو، نواب سر سالار جنگ پہلے سے اس تجویز کے حامی تھے بلکہ غالباً سب سے پہلے انہی کو یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ اعلیٰ حضرت کی تشریف آوری کی یادگار میں ورنگل کو زندہ کیا جائے، غرض اعلیٰ حضرت سے اس کی منظوری حاصل کرلی گئی لیکن اس کا باقاعدہ اجراء و اعلان نواب بشیر الدولہ آسمان جاہ کے عہد وزارت میں ہوا، اگرچہ عمارات کی تعمیر اور تمام انتظامات کی پہلے سے ابتدا ہوچکی تھی

نواب انتصار جنگ نے صوبہ داری کی کچہری اور دوسرے سرکاری مکانات کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیئے ایک شاندار جلسہ اس وسیع و مرتفع میدان میں منعقد کیا جو قاضی پیٹھ ریلوے اسٹیشن سے ساڑھے تین میل اور ہنمکنڈہ سے ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر سڑک سے جانب شرق واقع ہے یہ جلسہ بڑی شان و شوکت سے منعقد ہوا، ضلع کے تمام حکام اور بہت سے یورپین جنٹلمین اور لیڈیاں بڑے بڑے جاگیردار و منصبدار اور ساہوکار اور مختلف پیشہ کے لوگ اور عام تماشائی بڑی کثرت سے شریک تھے فوج اور پولیس کا معقول انتظام تھا، جہاں سنگ بنیاد کا پتھر رکھا جانے والا تھا، وہاں خیموں کی ایک قطار قایم کی گئی تھی، اور اس خیال سے کہ شاید بارش شروع ہوجائے اس میدان میں سرا پردوں کے ذریعے سے ایک بہت وسیع اور محفوظ جگہ بنادی گئی تھی، تمام میدان خوب صورت جھنڈیوں سے آراستہ تھا۔

ایک نامہ نگار کا بیان ہے کہ جلسہ میں ایک نجومی پنڈت بھی تشریف رکھتے تھے جنہوں نے کاغذ پر کچھ لکیریں اور ہندسے بنا کر اور کچھ بچار کر اپنے معتقدین کو یقین دلایا کہ سوا سات بجے ستارے ایسے عمدہ موقع پر آگئے ہیں جس سے بہتر وقت اس تقریب کے لیئے دوسرا ہو نہیں سکتا اور آٹھ بجے تک

ستاروں کی یہی حالت رہنگی، اس کی اطلاع جب صوبہ دار صاحب (نواب انتصار جنگ) کو دی گئی تو وہ مسکرائے اور انھوں نے پنڈت صاحب کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ خدا کو جب کوئی کام اچھا کرنا منظور ہوتا ہے تو وہ خود اس کے سب سامان اسی قسم کے جمع کر دیتا ہے، اور اپنے دوستوں سے جو وہاں موجود تھے تیمور کی وہ حکایت بیان کی جس میں تیمور اور ہندو پنڈتوں کی ملاقات کا ذکر خود تیمور نے اپنے قلم سے لکھا ہے جب کہ وہ ابتدائی فتوحات کے بعد ہندوستان پر مسلط ہوا تو منجم پنڈتوں نے اس کی گزشتہ مہمات کی وہ ٹھیک ٹھیک مبارک ساعتیں بتا دیں جن میں کہ حسن اتفاق سے خود اس نے لڑائیاں شروع کی تھیں اور آخر کو ان میں کامیاب ہوا تھا۔

غرض ۹ ذیقعدہ ۱۳۰۳ھ (۱۰ اگست ۱۸۸۶ء) کو ساڑھے سات بجے جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی قاضی سرور میاں جو حضرت قاضی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے فرزند ہیں اور نہایت صالح و متقی ہیں اور تمام لوگ ان کی بزرگی کے قائل اور ان کے معترف ہیں بنیاد کے موقع پر تشریف لائے اور قبلہ رخ ہو کر پہلے اعلیٰ حضرت اور سر سالار جنگ ثانی کے لیے ترقی عمر و اقبال کی دعا مانگی اس کے بعد خدائے تعالیٰ سے خلوص و خضوع کے ساتھ التجا کی کہ :-

"الٰہی یہ گھر جس کی آج بنیاد رکھی جاتی ہے اس لیئے تعمیر ہوتا ہے کہ تیری مخلوق کا اس میں انصاف ہو، اور ان کی حاجتیں اس سے بر آئیں تو اپنے فضل و کرم سے ہمیشہ اس گھر کو جو ایسے عمدہ مطلب کے لیئے بنایا جاتا ہے قایم و آباد رکھ"

سلہ[1] ان ہی قاضی صاحب مرحوم کے نام سے قاضی پیٹھ کی آبادی قایم ہوئی ہے اور انہی کا وہ مزار ہے جو قاضی پیٹھ اور ورنگل کے درمیان واقع ہے اور جن کو یہاں کا شاہ ولایت مانا جاتا ہے، ان قاضی صاحب کی نسبت یہ لطیفہ مشہور ہے کہ جب اعلیٰ حضرت ریلوے کے افتتاح کی غرض سے ورنگل کو تشریف لیئے جاتے تھے، تو حضرت شاہ ولایت نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ ہمارے نام کے مقام کو چھوڑ کر یہ رسم دوسری جگہ ادا ہو، غرض حضرت کے تصرف سے سڑک دھنس گئی اور ٹرین رک گئی اور یہ مجبوری تمام لوگوں کو قاضی پیٹھ میں اترنا پڑا اور اسی جگہ ریلوے کے افتتاح کی رسم اعلیٰ حضرت نے ادا فرمائی۔

اِس کے بعد صوبہ دار صاحب نے عمارت کے نقشے حاضرین کو دکھائے اور اُن کا مختصر حال بیان کیا، اس کے بعد بنیاد کا پتھر موقع پر رکھا گیا، ہر طرف سے مُبارک و سلامت کا غلغلہ بلند ہوا، فوج نے تین دفعہ شلک کے ذریعہ سے سلامی کی رسم ادا کی جس سے تمام میدان گونج اُٹھا۔

اس موقع پر نواب انتصار جنگ نے بعض مقامی معاملات پر بحث کرتے ہوئے جو مفصل تقریر کی اس کے بعض حصوں کا نقل کرنا ناموزوں نہ ہوگا اُنھوں نے فرمایا:۔

"نہایت خوشی کی بات ہے کہ تاریخی سندوں اور اُن کی روایتوں سے جو یہاں کے باشندے نسلاً بعد نسلٍ محفوظ رکھتے چلے آتے ہیں وہ اس بات کو اب تک نہیں بھولے اور اُن کو یاد ہے کہ اُن کی یہ بستی جہاں کے وہ رہنے والے ہیں دنیا میں اُس کو کیا افتخار حاصل تھا۔ ورنگل جس وقت ورنگل تھا اُس وقت وہ اپنی آبادی اور دولت اور عظمت اور شان و شوکت و فوجی قدرت میں دور دور تک اپنا نظیر نہ رکھتا تھا مگر انقلاب زمانہ سے نہ آج دنیا کے پردہ پر ورنگل کا شہر باقی ہے نہ اُس کی وہ شان و شوکت صرف ایک قلعہ اس لیے باقی رہ گیا ہے کہ اُس پرانے تلنگانہ کے دار الخلافت کا نام اُس کی وجہ سے لوگوں کو زبان پر آتا رہے اور اُس میں بھی بجز اُن چند خراب و شکستہ یادگاروں کے جن سے اُن پہلے زمانوں کی سرسبزی و شادابی کا نشان ملے اور کچھ باقی نہیں ہے، مگر وہ خدائے قادر مطلق جس کی شان میں وارد ہے۔ تولج اللیل فی النہار و تولج النہار فی اللیل، و تخرج الحي من المیت و تخرج المیت من الحي جس کی قدرت کے بے انتہا کرشمے ہر وقت اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ مری ہوئی چیزیں کس طرح زندہ ہو جاتی ہیں اور خشک چٹیل اور خاک سیاہ میدان جہاں ایک پرکاہ تک نظر نہیں آتا اُس کے ایک ابر کرم سے لہلہاتے ہوئے سبزہ زار بن جاتے ہیں، ضرور اس پر قادر ہے کہ پھر ایک دفعہ ورنگل کے شہر کو دنیا کے پردہ پر قایم کر دے اور میں تو دیکھتا ہوں کہ اس کے

سب سامان جمع ہوتے جاتے ہیں جو اس عالم اسباب میں ضروری خیال کیئے گئے ہیں۔"

"ریلوے انجن کی سیٹی کی آواز جو دونوں وقت اب تمھارے کانوں میں آتی ہے اس بات کا علانیہ ثبوت ہے کہ وہ بڑی سے بڑی قوت جو کسی ملک یا شہر کے آباد کرنے کے لیئے کام میں لائی جا سکتی ہے، وہ اب اپنا کام کرنے کے لیئے موجود ہو گئی ہے اور جس قدر اُس کا سلسلہ وسیع ہوتا جائیگا، تجارت اور دولت کی ترقی کے وسائل ترقی کرتے جائینگے ـــــــــ"

"آپ نے ابھی دیکھا کہ صوبہ دار کی کچہری کی بنیاد قایم ہوئی، ان عمارت میں سرکار عالی کا ایک لاکھ روپیہ کے قریب صرف ہوگا، یہ بھی صرف اس لیئے ہے کہ رعایائے صوبہ کو اور خصوصاً آپ لوگوں کو جو اب مستقر صوبہ کے باشندے کہلائے جانے کے مستحق ہوگئے ہیں، امن و انصاف کی تلاش میں دور جانا نہ پڑے اور آپ کی پوری حفاظت ہو۔"

"گزشتہ سال کے دورہ میں مجھ سے آپ میں سے اکثر ذی وجاہت اور معتبر لوگوں نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر صوبہ دار کا مستقر یہاں قرار پائے اور ہنمکنڈہ و متھوارہ کے درمیان نالہ کا پل بن کر عمدہ سڑک بن جائے تو آبادی کو نہایت درجہ ترقی ہو جائیگی، میں نے آپ سے اُس وقت اس کا وعدہ کر لیا تھا اور مجکو نہایت خوشی ہے کہ آج میں اپنے اُس وعدہ کو پورا کر سکا۔ صوبہ داری کی کچہری اور مکانات کی بنیاد بھی قایم ہوئی، نالہ کا پل بھی تعمیر ہو رہا ہے، ہنمکنڈہ اور متھوارہ کی سڑک آبادی اور بیرونی آبادی عمدہ حالت میں ہو گئی ہے ـــــ"

سلسلۂ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے آخر میں کہا:۔

"میرے بعض دوستوں نے بعض اوقات کہا ہے کہ ہنمکنڈہ کو اب دوسرا گلبرگہ

بنانا چاہیئے، میں اپنے دوستوں کا جنھوں نے محبت کی راہ سے اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے دلی شکریہ ادا کرتا ہوں مگر میں تو اس سے خوش ہونگا کہ جس شہر کا نام ورنگل ہو وہ آج کے گلبرگہ کے مقابلہ میں دوسرا گلبرگہ بنے، میرے دوستو تم ورنگل کو ورنگل ہی بنانے میں سعی کرو، اور اب میں دعا کرتا ہوں کہ جن عمدہ اور توقعات کے بھرے ہوئے خیالات کے ساتھ یہ کام شروع کیا جاتا ہے خداوند کریم اُن مقاصد کو بحسن وخوبی برلاوے اور روز بروز تمھارے اس شہر کو ترقی نصیب ہو"

غرض سنگِ بنیاد کا جلسہ نہایت کامیاب ہوا، ایک نامہ نگار کا بیان ہے کہ :-

"دن کا جلسہ اس چہل پہل کے ساتھ ختم ہوا، رات کو صوبہ دار صاحب کی طرف سے تمام یورپین افسروں اور لیڈیوں کی جو اس موقع پر تشریف رکھتے تھے اور جن میں مسٹر بالر اور مسس بالر صاحبہ بھی شامل تھے اور دوسرے سرکاری عہدہ داران موجودہ مستقر ضلع کی دعوت تھی ۱۲ بجے تک نہایت لطف وخوشی کے ساتھ وہ صحبت قایم رہی اور اُس کے بعد سب لوگ خوشی خوشی رخصت ہوئے"

تھوڑی مدت میں یہ تمام عمارتیں مکمل ہوگئیں، عدالت اور دفاتر کی عمارتوں کے علاوہ اسی سلسلہ میں ایک وسیع وشان دار ایوانِ شاہی یا گورنمنٹ ہاؤس بھی بن گیا جو دُور سے نظروں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے، اعلیٰ حضرت جب کبھی اس صوبہ میں تشریف لاتے ہیں تو یہاں قیام فرماتے ہیں، اس کے علاوہ مختلف بنگلے، مسجد، کنوئیں، کلب بن کر تیار ہوگئے ہیں، اور یہ ویران مقام اب اس علاقہ کا سب سے زیادہ پررونق حصہ بن گیا ہے، یہ سب عمارتیں اس سڑک کے دورویہ کھلے میدان میں واقع ہیں جو قاضی پیٹھ اسٹیشن سے آتی ہے۔

صوبہ دار کے عمارات سے آگے بڑھ کر سڑک کے داہنی طرف ایک باغ ہے جس کو محبوب باغ کہتے ہیں۔ اِس سے آگے چوراہہ پر ایک بلند کمان تین محراب کی نواب انصار جنگ کی یادگار میں کسی دیسمکھ نے تعمیر کرائی ہے جس پر یہ کتبہ نصب ہے:-

بفرمانِ شہ محبوب علی خاں ہوا جب انتظام سمتِ شرقی
وقارالملک نے کی سعی و کوشش ورنگل میں نئی بستی بسائی
کماں ہے یادگاری میں اسی کے ہے شگل رام چندر نے بنائی
کہا ہاتف نے، اس کی سالِ تعمیر فلک شوکت کماں ہے بادشاہی

نواب انتصار جنگ کو صوبہ کے صدر مقام کی آبادی و ترقی میں اس قدر انہماک تھا کہ جب یہ کام شروع ہوا تو برابر ترقی ہی کرتا چلا گیا، اور انھوں نے اپنے ماتحت افسروں میں بھی یہ ذوق پیدا کر دیا، ایک پارسی جنٹلمین فرامجی جمشیدجی جو نواب انتصار جنگ کے عہد میں ضلع کھمم کے اول تعلقہ دار تھے، اور بعد کو حسن کارگزاری کے صلہ میں نواب فرامرز جنگ کے خطاب سے ممتاز ہوئے۔ صوبہ کی ترقی کے وسائل اختیار کرنے میں خاص طور پر نواب انتصار جنگ کے ساتھ شریک تھے۔

نواب انتصار جنگ کا عہد صوبہ داری ختم ہونے کے بعد جب نواب اعظم یار جنگ صوبہ شرقی کے صوبہ دار مقرر ہوئے تو فرامجی جمشیدجی نے ۱۲۹۹ف میں ورنگل کی آبادی و ترقی کے متعلق ایک مطول رپورٹ اُن کی خدمت میں پیش کی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دو تین سال کے قلیل مدت میں کئی لاکھ روپیہ کی سرکاری و خانگی عمارتیں نواب انتصار جنگ کی سعی و تحریک سے ورنگل میں بن گئیں اور تجارت، کاروبار اور آبادی میں معقول اضافہ ہوا۔

فرامجی لکھتے ہیں:۔

"قلیل میعاد دو سال میں شہر ورنگل کی آبادی میں کسقدر کثیر ترقی ہوئی، اور رعایائے عامہ نے کس قدر ہمت کے ساتھ ایک کثیر رقم آبادی کے لیے صرف کی، ہے، میں جناب عالی کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کارروائی میں میرا کوئی ذاتی دخل نہیں ہے جو کچھ میں نے کیا ہے وہ اپنا فرض منصبی ادا کیا ہے بلکہ یہ کل ترقی آبادی صرف اُس عملی ہمدردی نواب انتصار جنگ بہادر کا نتیجہ ہے، جو انھوں نے اپنے انصاف و معدلت سے اپنے عہد صوبہ داری میں رعایائے ورنگل کے

کے ساتھ برتی ہی، اور اُس کے عوض میں رعایائے ورنگل اپنی آبادی کو ہمیشہ ایک عمدہ یادگار نواب صاحب ممدوح کا سمجھتی ہی۔"

اِس کے بعد فرامجی جمشید جی نے نام بنام اُن تمام سرکاری اور پبلک عمارات کی فہرست مع اُس رقم کے تفصیل کے پیش کی ہی جو ان عمارات پر خرچ ہوئی۔ اِن صدہا عمارات میں سے صرف ایک دو کا حال تمثیلاً بیان کیا جاتا ہی۔

بازار رامنا پیٹھہ فرامجی جمشید جی لکھتے ہیں کہ یہ ایک نہایت قدیم بازار اندرون شہر ورنگل واقع ہی اس بازار کے قدیم مکانات مٹی سے بنے ہوئے بہت پست تھے اس بازار میں نہایت مالدار بیوپاری تجارت کرتے ہیں، میں نے دو سال قبل کل بیوپاریوں کو فہمایش کی اور اُن کو ترغیب دی کہ وہ عمدہ عمدہ مکانات اپنی قدیم جائے پر تیار کریں اور بالکل آزادی کے ساتھ تجارت کریں، اس موقع پر یہ کیفیت بے موقع نہوگی کہ میری ترغیب کے زمانہ میں بیوپاری لوگ بہتر مکانن کی تیاری کرنے بلکہ عمدہ لباس پوشی سے ہمیشہ خائف رہتے تھے ——" سابق میں ایسی حالت تھی کہ نہ صرف عہدہ دار بلکہ ایک ایک کوتوالی کا سپاہی اور ایک تحصیل کا چپراسی ایک لکھ پتی بیوپاری کو ہر طرح ذلیل کر سکتا تھا، نواب انتصار جنگ بہادر کے عہد صوبہ داری سے بیوپاریوں اور رعایائے عامہ کو اس مظلمہ سے آزادی حاصل ہوئی اور نواب صاحب ممدوح کی ہدایات کے موافق میں نے تجار اور رعایا کو آزادانہ اپنی بود و باش کرنے پر اور بلا خوف اہلکاران و عہدداران سرکار اپنی طرز معاشرت کو بہتر حالت میں رکھنے کے لیئے آمادہ کیا، اور وقت بوقت ترغیب ہوتی رہی جس کا نتیجہ قلیل عرصہ دو سال میں یہ برآمد ہوا ہی کہ رامنا پیٹھہ کا بازار جو صرف مٹی کے مکانات سے بنا ہوا تھا وہ آج دو منزلہ چھوٹی بڑی حویلیوں سے بھرا ہوا ہی تجار و رعایا مع اپنے اہل و عیال خوشی کے ساتھ بسر کر رہے ہیں، اور علاوہ قدیم بازار رامنا پیٹھہ کے ایک عمدہ جدید بازار موسوم بہ انتصار گنج ان ہی بیوپاریوں نے آباد کیا ہی جہاں لاکھوں روپیہ کی تجارت ہوتی ہی۔

انتصار گنج | انتصار گنج جدید بازار متصل اسٹیشن ورنگل کی تعمیر حسب ہدایت نواب انتصار جنگ بہادر صوبہ دار وقت میں نے آغاز کی یہ وہ مقام ہے کہ جہاں دو سال قبل زراعت ہوتی تھی اور سڑک کی عدم موجودگی کی وجہ سے مٹھوارہ سے ورنگل اسٹیشن تک ہنڈیوں کا گزر نہایت مشکل کے ساتھ ہوتا تھا میں نے کریم آباد اور رامنا پیٹھ اور مٹھوارہ کے ساہوکاروں کو اس جدید بازار کی تیاری کے لیے ترغیب دی اور آمادہ کیا کہ وہ جدید بازار کی تیاری شروع کریں اس بازار کا دو طرفہ طول ۲۵۲۰ گز ہے ۱۲۹۷ف میں انتصار گنج کی آبادی کے لیئے جو زمین دی گئی اس کی جملہ ۹۳۳۸۰ گز مکسر ہے۔

آبادی کی ترقی | نواب انتصار جنگ کے عہد میں جس طرح امن وامان اور تجارت وزراعت نے اس صوبہ میں ترقی کی اسی طرح آبادی میں بھی اضافہ ہوا، چنانچہ ایک سرکاری نقشہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تین تعلقوں میں جو سرحد انگریزی سے ملے ہوئے ہیں پانچ سال کے اندر ۲۰۲۸ اشخاص نے انگریزی علاقہ سے آکر یہاں مستقل سکونت اختیار کی اور کاشتکاری کا کام شروع کیا۔

شفاخانہ | شفاخانہ کی ایک مختصر عمارت یہاں موجود تھی، نواب انتصار جنگ کی تحریک سے نواب سر آسماں جاہ نے مزید عمارات کی توسیع منظور کی اور متعدد عمارتیں تیار ہوئیں۔ بیمار مرد اور عورتوں کے لیئے علیحدہ علیحدہ مکانات تعمیر ہوئے، جن میں بیمار بہت اچھی حالت میں رکھے جاتے تھے، سرکاری عہدہ داروں وغیرہ کے لیئے ایک علیحدہ مکان تھا جہاں وہ کرایہ دے کر رہ سکتے تھے۔

لاوارث بچوں کا مدرسہ اور دار الاقامہ | نواب انتصار جنگ نے زمانہ صوبہ داری میں رفاہ عام کے لیے جو مفید کام انجام دیئے ہیں اُن میں ایک قابل ذکر کام لاوارث بچوں کے لیئے مدرسہ اور دار الاقامہ کا قایم کرنا بھی ہے۔ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مدرسہ کے حالات نواب سر آسماں جاہ مدار المہام کے الفاظ میں بیان کیئے جائیں۔ نواب ممدوح نے

۱۲۹۹ھ میں صوبہ شرقی کے بعض اضلاع کا معائنہ کیا اور اسی سلسلہ میں لاوارث بچوں کا مدرسہ بھی دیکھا، نواب انتصار جنگ اس زمانہ میں صوبہ داری سے واپس آچکے تھے اور دوسرے عہدہ پر ممتاز تھے اگرچہ اس موقع پر مدار المہام کے ساتھ شریک سفر تھے۔

نواب سر آسماں جاہ لکھتے ہیں:۔

مدرسہ کا معائنہ ہوا اس میں ۴۰ نابالغ اطفال لاوارث تعلیم پاتے ہیں اور سرکار کے خرچ سے اُن کی پرورش ہوتی ہے، قدیم طریقہ کے بموجب لاوارث بچے اُن لوگوں کو دیدیئے جاتے تھے جو اُن کو پرورش کے لیئے لینا چاہتے تھے، اور اگرچہ اُن لوگوں سے بچوں کے حق میں بہت مفید شرایط حاصل کی جاتی تھیں مگر اس میں شک نہیں کہ بالآخر اُن میں سے اکثروں کی حالت لونڈی اور غلاموں کی سی ہوجاتی تھی، نواب انتصار جنگ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنے زمانہ صوبہ داری شرقی میں سرکار کی توجہ اس طرف مصروف کی کہ پرانا طریقہ موقوف کیا جائے، اور سرکار چونکہ اُن کی فطری ولی ہوتی ہے اپنے صرف سے ان بچوں کو پرورش اور اُن کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے چنانچہ اُنھوں نے بہ اُمید منظوری سرکار اسی صوبہ میں جہاں وہ صوبہ دار تھے اُس پرانے طریقہ کو قطعًا بند کر دیا، اور اپنے ذاتی صرف سے اُن بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا، جو اُس وقت اُن کو اس صوبہ سے دستیاب ہوئے تھے، اُنھوں نے نہایت زور سے سرکار میں اس مسئلہ کو پیش کیا کہ سرکار جب لاوارث مال کی مالک بنتی ہے تو لاوارث بچوں کی تعلیم اور پرورش کا ذمہ بھی سرکار پر ہونا چاہیئے، اور وہ پرورش اس طرح ہونی چاہیئے کہ جہاں تک کسی بچہ کا مذہب تحقیق ہوسکے وہاں تک وہ اُسی مذہب میں رکھا جائے اور اُسی احتیاط مذہبی کے ساتھ اُس کی خورونوش کا بندوبست کیا جائے۔

یہ مسئلہ عرصہ تک یوں ہی زیر تجویز چلا آتا تھا لیکن میں نے اپنے ابتدائی عہد مدار المہامی میں اُن سب تجویزوں کو منظور کرلیا، اور نواب انتصار جنگ کی درخواست پر یہ حکم بھی دیدیا کہ تمام ممالک محروسہ کے لاوارث بچے اسی جگہ رکھے جائیں چنانچہ انہی اصولوں پر یہ مدرسہ قایم ہوا

ہے جو اسکول اور بورڈنگ ہاؤس پر شامل ہے اور ایک عیسائی لیڈی اس کی ہیڈ ماسٹرس اور منیجرس ہے اُردو، انگریزی و تلنگی کی تعلیم ہوتی ہے اور حرفہ کے لحاظ سے لڑکوں کو نجاری کا کام سکھایا جاتا ہے اور لڑکیوں کو علی العموم اس ایک خیال کے ساتھ تعلیم دی جاتی ہے کہ آخرالامر اُن سب کو ڈاکٹری کی تعلیم دی جائیگی۔

بچوں میں ہندو اور مسلمان دونوں قسم کے بچے ہیں اور سب اپنے اپنے مذہب پر رکھے گئے ہیں مسلمان بچوں کے لیے اس قدر اہتمام زیادہ کیا گیا ہے کہ ایک پیر مرد آخوں اُن کو نماز اور روزہ وغیرہ کے احکام کی تعلیم دیتے ہیں، مدرسہ کا مکان بہت عمدہ اور فرحت بخش موقع پر ہے تمام بچوں کی صحت اور تندرستی عمدہ حالت میں تھی، لباس بھی درست تھا، اُن کے رہنے کا مکان بھی اور سب چیزیں صاف تھیں، لڑکیوں نے جو ریشم اور اون سے مختلف قسم کی چیزیں بنائی تھیں اور لڑکوں کے بنائے ہوئے چوبینہ کے نمونے سب اچھے تھے، اور معلوم ہوتا تھا کہ تعلیم کی ترقی کے ساتھ حرفت کو بھی ترقی ہو رہی ہے، جو ایک ضروری امر ہے۔

جو نتیجہ کہ اس انتظام سے حاصل ہو چکا ہے، اور جس کے حاصل ہونے کی اُمید ہے وہ نہایت ہی قابل قدر ہے، خصوصًا جب کہ خیال کیا جاتا ہے کہ بالفعل ہر بچہ کی پرورش میں کل مبلغ ۱۶۰۰ روپیہ سالانہ خرچ ہوتے ہیں جو بلحاظ اُن مفید نتایج کے جن کی کہ توقع ہے ایک نہایت ہی قلیل رقم ہے گورنمنٹ کو نواب انتصار جنگ کا مشکور ہونا چاہیے کہ اُنھوں نے اتنے تھوڑے خرچ میں رعایا کے اس واجب الرحم گروہ کے لیئے ایسا عمدہ اور مفید انتظام کر دیا۔

ملکی صنعت و پیداوار کی نمائش

صوبہ شرقی میں ایک موضع جڑ کل ہے جس کا قدیم نام "ویرا چلم" ہے، یہ موضع ورنگل ریلوے لائن کے اسٹیشن آکیر سے ۸ میل اور اسٹیشن جن گاؤں سے ۹ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، موضع کے قریب مشرقی جانب ایک ٹیلہ پر دیول ہے، جو بہت مقدس سمجھا جاتا ہے یہاں ہر سال ہزاروں جاتری جمع ہوتے ہیں، اور نہاتے ہیں، یہ مجمع کئی روز تک رہتا ہے لیکن تین دن زیادہ متبرک خیال کیے جاتے ہیں، ان دنوں میں لوگوں کا بڑا اژدحام ہوتا ہے

اس معبد (دیول) کے اطراف میں متعدد دھرم سالے ہیں اور ایک کمان ہے جس کو راجہ گردھاری پرشاد عرف بنسی راجہ نے تیار کرایا ہے، کمان کے بالائی حصہ پر نوبت خانہ بھی ہے یہ اعزاز اعلیٰ حضرت کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ اور اس کے مصارف کے لیئے چھ سو سالانہ گورنمنٹ نظام سے ملتا ہے، ۴۲ سپاہی اس معبد کے محافظ ہیں جو ریاست سے یومیہ پاتے ہیں۔

اس جاترا میں نہ صرف ممالک محروسہ نظام بلکہ دوسرے مقامات سے بھی لوگ آتے تھے بازار قایم ہوجاتا تھا اور خرید و فروخت ہوتی تھی، ان دوکانوں سے محصول بھی لیا جاتا تھا، جب اس صوبہ میں نواب انتصار جنگ بہادر صوبہ دار ہوکر آئے تو حسب عادت اُنھوں نے اس جاترا کی طرف بھی توجہ کی، حسن اتفاق سے اسی سال صوبہ میں ریل بھی جاری ہوگئی تھی، لہٰذا اُنھوں نے عام اعلان کے ذریعہ سے لوگوں کو آمادہ کیا کہ وہ ملکی مصنوعات اور پیداوار اس موقع پر لائیں، اِسی اعلان کے ذریعہ سے اُنھوں نے لوگوں کو بتایا کہ :۔

"یہ بھی بند و بست کیا گیا ہے کہ اس صوبہ کی عمدہ مصنوعات اور پیداوار وغیرہ پر انعامات بھی دیئے جائیں اور آیندہ رفتہ رفتہ اسی جاترا کو صوبہ شرقی کی سالانہ نمایش گاہ قرار دیا جائے زراعت کے کاروبار اور آلات اور پیداوار کی ترقی اور عمدہ نسل کے مویشی پر جو کہ صوبۂ شرقی میں پیدا ہوئی ہو اور یہیں اُس نے پرورش پائی ہو، خاص انعامات دیئے جائینگے۔"

اِس اعلان کا مفید نتیجہ نکلا، مختلف قسم کا سامان نمائش گاہ میں آیا، مثلاً میز، کرسی، اسلحہ، قالین برتن، مختلف قسم کے کپڑے، گائے، بیل اور پیداوار کے نمونے، یہ تمام سامان قریب قریب اسی صوبہ سے آیا تھا، نمایش کے اختتام پر کمیٹی کی تجویز سے انعام تقسیم کیا گیا، اور نواب انتصار جنگ نے ایک زبردست تقریر کی جس میں نمایش کی ضرورت پر زور دیا اور سامان جو آیا تھا اُس کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی، اُنھوں نے ہر ہر چیز کے متعلق صحیح ریمارک کیئے اور حسن و قبح کو بیان کیا، اُن کے خاص خاص ریمارک اس موقع پر نقل کیئے جاتے ہیں، منتھوارہ کی قالین بافی کے متعلق وہ اپنی رائے اس طرح ظاہر

کرتے ہیں :-

"مٹھوارے کے قالین بافوں نے حقیقت میں کام کیا ہے، یہ چھوٹا سا ریشمی قالین جس کی قیمت ڈیڑھ سو روپیہ گز بیان کی گئی ہے اس ملک بلکہ جہاں تک مجکو علم ہے تمام ہندوستان میں مٹھوارہ کے سوا دوسری جگہ اپنی نظیر نہیں رکھتا، دوسرے اونی و سوتی قالینوں کی ساخت بھی کس قدر نفیس اور اُن کے جال بوٹے کس قدر خوبصورت ہیں۔"

اسی طرح ہر ہر چیز پر رائے دیتے ہوئے ایک آتشباز کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

"آتشباز نے جو نمونہ رات اپنی صنعت کا دکھلایا بہت اچھا تھا اُس کے تار امنڈل اور انار سب اچھے تھے اور سب کام ایسا ہے کہ اگر ہم کو کسی وقت چند لمحہ کی عارضی خوشی حاصل کرنے کے لیئے روپیہ کو آگ دینے کی کوئی ضرورت پیش آئی تو اس کے لیئے ہم کو حیدرآباد سے مدد لینے کی ضرورت نہ پڑیگی۔"

اس کے بعد اُنھوں نے قالین بافوں کو ملامت کی ہے کہ وہ خام رنگ استعمال کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اسی وجہ سے سال حال (۱۸۸۶ء) میں لندن کی نمایش میں اُن کی یہ صنعت نظروں سے گر گئی جس سے سخت نقصان پہنچا، مزید برآں دو لاکھ روپیہ کی ایک فرمایش اسی رنگ کی خامی کی وجہ سے واپس لے لی گئی، اگر یہ دو لاکھ ان کاریگروں کے گھروں میں آتا تو اُن کی خوش حالی میں ترقی ہوتی اسی سلسلہ میں اُنھوں نے اعلان کیا کہ اس سال رنگ کا لحاظ کیئے بغیر محض عمدہ صنعت پر انعام دیا گیا ہے لیکن آیندہ سال خام رنگ پر کوئی انعام نہیں دیا جائیگا۔

اس کے بعد وہ اس صوبہ کے کاریگروں کی صناعی کی تعریف کرتے ہیں کہ اُن میں یہ استعداد اچھی ہے کہ وہ ہر چیز کی بہت عمدہ نقل اُتار لیتے ہیں لہذا آیندہ اُن کو سب اور عمدہ نمونے دیئے جائیں اور اسی کے مُطابق کام بنوایا جائے، اسی بناء پر وہ تجویز کرتے ہیں کہ صوبہ کے صدر مقام پر ایک دار النمو اور قایم کیا جائے، جس میں عمدہ عمدہ نمونے مہیا رہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ابھی مدت تک صرف

اسی قدر کافی ہے کہ ہمارے کاریگر نمونے کے مطابق عمدہ چیزیں تیار کرلیں جو قیمت کے لحاظ سے بھی ارزاں ہوں، اس کے بعد اُنھوں نے صوبہ کی پیداوار پر تبصرہ کرتے ہوئے اس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ لوگ عام طور پر ادنیٰ اور متوسط درجے کے اجناس کی کاشت کرتے ہیں، اعلیٰ درجہ کی کاشت پر مطلق توجہ نہیں ہے، وہ یہ خواہش ظاہر کرتے ہیں کہ لوگ پھل، پھول، ترکاریوں کی طرف توجہ کریں اور گیہوں اور نیشکر وغیرہ کی کاشت کو ترقی دیں، لیکن اُن کا خیال ہے کہ :-

"عمدہ عمدہ تخم اور عمدہ عمدہ نمونوں کا بہم پہنچانا یہ بھی بے شک ابتدا ابتدا میں ہمارا کام ہے کیونکہ معلوم ہے کہ باستثنائے معدودے چند اکثر لوگ اس مشکل پر بدون ایسی امداد کے غالب نہیں آسکتے۔"

غرض نمایش کا یہ پہلا تجربہ بہت کامیاب ثابت ہوا ۹۵ اشخاص نے انعام حاصل کیا، اس موقع پر پہلی دفعہ لوگوں کی آسایش کے لیے عارضی شفاخانہ اور ڈاکخانہ کا بھی انتظام کیا گیا تھا، جس کو لوگوں نے بہت پسند کیا، اُنھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ دوکانداروں سے جو محصول لیا جاتا ہے یہ خاص نمایش کے انتظام مثلاً روشنی اور صفائی وغیرہ میں صرف ہوگا اور اسی رقم میں سے انعامات بھی تقسیم کیے جائینگے۔

دوسرے سال نواب انتصار جنگ نے اس نمایش کے لیے اور زیادہ اہتمام کیا، وہ اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے کہ رعایا ان چیزوں پر کیونکر متوجہ ہوگی لہٰذا دوسرے سال اُنھوں نے نمایش کا افتتاح کرنے اور تقسیم انعام کے لیئے نواب منیر الملک بہادر معین المہام (فرزند ثانی سر سالار جنگ اول) کو مدعو کیا، اس موقع پر نواب انتصار جنگ نے جو رپورٹ نمایش کے متعلق معین المہام کے سامنے پیش کی ہے وہ نہایت مفید معلومات پر مشتمل ہے۔

اس رپورٹ میں اُنھوں نے سب سے پہلے یہ بتایا ہے کہ اس نمایش کے قایم کرنے کا خیال اُن کو کیونکر پیدا ہوا۔ نیز یہ کہ اس سے ملکی تجارت اور صنعت و حرفت کو کس قدر فائدہ پہنچیگا، اس کے بعد اعلیٰ حضرت نظام کی شاہانہ نوازش اور بے تعصبی کا ذکر کیا ہے کہ حضور ممدوح نے اس سال اس دیول کو نوبت عطا فرما کر لاکھوں ہندو رعایا کو مسرور کیا، اسی سلسلہ میں اُنھوں نے سلاطین آصفیہ

کی بے تعصبی اور رعایا پروری کی مثالیں بیان کر کے بجا طور پر یہ اُمید ظاہر کی ہے کہ :-

"وقت ہے کہ سرکار عالی کی ہندو رعایا آصف جاہی سلسلہ کے بادشاہوں کا نام
اپنے قدیم ہندو راجاؤں کی تاریخ میں بطور ہندو راجاؤں کے بلا فصل داخل کرے"

اس کے بعد انھوں نے نواب منیر الملک بہادر کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ پہلی دفعہ سرکاری طور پر آپ کی رونق افروزی سے ہندوؤں کے اس مقدس مذہبی مقام کو کیسا افتخار حاصل ہوا۔

اِن تمہیدی مطالب کے بعد انھوں نے نمایش گاہ کے متعلق ضروری حالات بیان کیے اور جو جدید چیزیں اس سال نمایش میں آئی تھیں اُن کا تذکرہ کیا، انھوں نے بتایا کہ اسٹیشن آلیر سے جڑ چرل تک ایک وسیع سڑک تیار ہو رہی ہے جو آئندہ سال بہت کار آمد ثابت ہوگی، سڑک کے دونوں جانب چبوترے بنا دیئے گئے ہیں جن کا طول دو ہزار گز ہے، نمایشی اشیاء کے رکھنے کے لیے اس سال ایک چھوٹا سا مکان تیار کر دیا گیا ہے جس کا طول ۴۰ فٹ ہے، اور چونکہ میلہ کی حفاظت کے لیے پولیس کی خاص طور پر ضرورت ہوتی ہے اس لیے میلہ کے وسط میں پولیس کے لیے بھی ایک مکان تعمیر کر دیا گیا ہے۔

نمایش گاہ کے سامان پر نواب صاحب کا تبصرہ نہایت مفصل اور دلچسپ ہے لیکن طوالت کے خیال سے یہاں اس کے بعض حصے نقل کیے جاتے ہیں جس سے فی الجملہ دکن کی مصنوعات کا اندازہ ہوگا۔ وہ اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں۔

(۱) نارائن پیٹھ ضلع ناگر کرنول کا ریشمی زردوزی، سوتی پارچہ، اس سال بالکل نیا آیا ہے، نارائن پیٹھ کے تاجر اس سال ایک غلطی کر گئے وہ معمولی اور متوسط قسم کا مال اپنے ساتھ لائے ہے، نہایت اعلیٰ درجہ کا مال جس میں دو دو سو اور اڑھائی سو روپیہ کی ایک ایک ساڑی ہوتی ہے اس خیال سے نہ لائے کہ دیہات کی رعایا ایسے قیمتی مال کی خریدار نہیں ہوتی لیکن جڑ چرل پہنچکر اُن کو اپنی غلطی پر افسوس ہوا۔

(۲) ہنمکنڈہ کے کاموں میں اس سال لیڈیز ہینڈ بیگ، میز کی چھریاں، کانٹے، چمچے، ٹھسر کا پارچہ طلائی زیور اور رشاک بالکل نئی چیزیں ہیں جو گزشتہ سال کی نمایش میں نہ تھیں۔

(۳) متھوارہ سے جو سلک کا کپڑا آیا ہی وہ بالکل نیا ہی، سابق میں کم عرض کا سفید ریشمی کپڑا وہاں تیار ہوتا تھا لیکن گزشتہ سال کی نمایش کے بعد سے ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ آیندہ اپنی کامیابی کے لیئے ان کو کیا کرنا چاہیئے لہذا اس سال اُنھوں نے بڑے عرض کے سفید تھان بھی نئے بنائے اور اُن سفید ریشمی تھانوں میں سیاہ ریشمی تاگہ دیکر ایسا خوبصورت چارخانہ بنادیا ہی جو بہت خواہش کے ساتھ اب بہت سے کاموں میں آسکیگا۔ متھوارہ کے شامیانہ بنانے والوں نے بھی امسال شامیانہ کا ایک نیا نمونہ پیش کیا۔

(۴) بھونگیر کے زرگر نے جو قمیص اور کوٹ کے طلائی بٹن اور گھنڈیاں اس سال تیار کی ہیں بہت ہی خوبصورت اور ولائتی کام کا بہت ہی ٹھیک نمونہ ہی اور چونکہ اس میں خالص سونا ہی، لہذا یہ بہت عمدہ چیز سمجھی جاتی ہی۔

(۵) چیریال ضلع کھمم کی ساخت بندوق، وردناپیٹھ کا حقہ، چلم اور چاندی کا بکلوس اور سکن ویر تعلقہ مدہیرہ ضلع کھمم کی زریں کا دھوتیاں، پیرتی تعلقہ چیریال کا چائے کا خوبصورت سٹ، اور پوچا کا خوشنما شمعدان، وال کو دا اڑ تعلقہ کھمم کا طپنچہ اور گپتی یہ سب سامان اس سال کی نمایش میں بالکل نیا ہی۔

(۶) ومسیور تعلقہ مدہیرہ ضلع کے ایک کاریگر نے امسال عینکوں کا نمونہ پیش کیا ہی، جس پتھر کی بنائی ہوئی عینک ہی، یہ پتھر بھی اسی علاقہ میں پیدا ہوتا ہی اور خوردبین پتھر ہی اس پر اگر کوشش ہوگی تو آیندہ سال تصویریں وغیرہ دیکھنے کی بڑی بڑی چیزیں یہیں کی ساخت کی پیش ہو سکیں گی۔

(۷) محمد دلاور حسین صاحب باشندہ ہنمکنڈہ نے ایک تقویم پیش کی ہی جس میں سو سال سے زیادہ کا حساب ہی، بیشک اُنھوں نے بہت محنت کی ہی، میری دلی تمنا ہی کہ یہ سلسلہ ترقی کرتے کرتے اس درجہ تک پہنچے کہ صوبہ میں مصنف لوگ پیدا ہوں اور اس سالانہ نمایش گاہ میں اُن کی تصنیفات پر انعام

تجویز کیا جایا کرے۔

ان سب چیزوں کے بیان کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں:-

متھوارہ کے مشہور قالین، ریشمی اور زردوزی ساڑھیاں، ننگنڈہ کے لوہے کے ہتھیار اور لکڑی کے صندوق و صندوقچیاں اور گاڑی اور طلائی و نقرئی زیور اور بھونگیر کی دوخت شیر دانیاں اور متفرق مقامات کے چاندی و سونے کے زیور اور بھونگیر کے مٹی کے برتن اور نقاشوں کی کاریگری سے امسال بھی نمایش کا کمرہ جگمگا رہا ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے غلہ کی مختلف اجناس اور پھلوں پر ریویو کیا ہے، اور اسی سلسلہ میں انھوں نے اس امر پر افسوس کیا ہے کہ چونکہ یہ مختلف قسم کے پھلوں کا موسم نہیں ہے اس لیے ہر قسم کے پھل نمایش گاہ میں نہیں آسکتے لہذا آیندہ سے میں قاعدہ جاری کرنا چاہتا ہوں کہ تازہ میوے اور دوسری چیزیں جو رکھی نہیں جاسکتیں، اپنی تیاری کے وقت تعلقدار ضلع کے پاس بھیجدی جایا کریں جو نمایش گاہ کی انتظامی کمیٹی کے پریسیڈنٹ ہیں تعلقہ دار باتفاق رائے چند ممبروں کے اس کی نسبت یادداشت لکھ لیا کریں گے جس کی بنیاد پر سالانہ نمایش گاہ میں انعام تجویز ہو سکیگا۔

اس سال ۷۱۱ اشخاص نے انعام حاصل کیا، نواب منیر الملک بہادر اور کرنل مارشل پرائیویٹ سکرٹری اعلیٰ حضرت نے بھی معقول رقم انعام کی مد میں عطا کی، اور نمایش بخیر و خوبی اختتام کو پہونچی۔

نمایش گاہ کے موقع پر نواب منیر الملک کو رعایا و حکام کی طرف سے متعدد ایڈریس دئیے گئے جن کا نواب ممدوح نے فرداً فرداً جواب دیا، ان جوابات کے سلسلہ میں انھوں نے نواب افتخار جنگ کے خدمات کا خاص طور پر اعتراف کیا ہے، وہ دیول کے پجاریوں اور عام رعایا کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

"میں آپ لوگوں کو تعین دلاتا ہوں کہ جو کچھ آسانیاں اور سامان آسائش آپ

لوگوں کے واسطے مہیا ہوئے ہیں اُس میں بہت بڑا حصہ نواب انتصار جنگ بہادر
صوبہ دار اور دیگر افسران ضلع کی عمدہ کوششوں کا ہے"

ایک دوسرے ایڈریس کے جواب میں کہتے ہیں :-

"میں اپنی تقریر کو ختم نہیں کرسکتا جب تک کہ نواب انتصار جنگ بہادر کا شکریہ
نہ ادا کروں جنھوں نے اپنی بے انتہا کوشش اور مدبرانہ انتظام سے ایک ایسے
کوروںیہ کو ایسا مشہور کردیا"

مندرجہ بالا حالات پڑھنے سے یہ اندازہ ہوگا کہ ان تمام انتظامات سے نواب انتصار جنگ کا
بڑا مقصد ہمیشہ یہ رہا ہے کہ :-

(۱) رعایا اور گورنمنٹ کے مابین خوشگوار تعلقات اور باہمی اعتماد پیدا ہو۔

(۲) ملک کی آبادی اور زراعت میں ترقی ہو، بڑے بڑے زمیندار، جاگیردار اور اہل
وجاہت پیدا ہوں، جس سے ریاست کے وقار اور قوت میں اضافہ ہو۔

(۳) ملک کی مردہ صنعتیں زندہ ہوں اور ترقی کریں، لوگوں میں تجارتی حوصلہ مندی اور
کاروبار کی رغبت پیدا ہو، تاکہ قومی دولت میں اضافہ ہو اور بڑے بڑے تاجر اور سرمایہ دار
ملک میں پیدا ہو کر حکومت کے اعزاز و وقار کو بڑھائیں، وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ لوگ معاشرت و تمدن
کی حیثیت سے بھی ترقی کریں اور جائز حدود کے اندر آزادی کی برکتوں سے فائدہ اٹھائیں، وہ ہمیشہ
کہا کرتے تھے کہ "کوئی ملک ان کمبل پوشوں سے ترقی نہیں کرسکتا" اس سے اُن کا مقصد یہی تھا کہ
جب تک دولت و سرمایہ اور تہذیب و معاشرت کے لحاظ سے ملک ترقی نہیں کریگا ترقی یافتہ نہیں سمجھا جائیگا۔

گزشتہ ۳۰-۴۰ سال کے زمانہ میں حیدرآباد تہذیب و تمدن اور آئین و اُصول کے لحاظ
سے بہت ترقی کر گیا ہے اس لیے ممکن ہے کہ اُس عہد کی بہت سی باتیں خصوصاً نظم مملکت کے اُصول
آج ہماری نظروں میں معمولی معلوم ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ نواب انتصار جنگ جس زمانہ میں دکن کے پہاڑ
اور غیر آباد جنگلوں میں حیدرآباد کے شاندار مستقبل کی بنیاد رکھ رہے تھے وہ زمانہ ہمارے زمانہ سے

مختلف تھا، اس وقت حیدرآباد ترقی کے موجودہ اسباب و وسائل سے ناآشنا تھا، اور ابھی اس نے ترقی کے ابتدائی مراحل بھی طے نہیں کیے تھے، اور جب کوئی قوم اس درجہ میں ہو تو سب باتیں اس کو بچوں کی طرح سکھائی جاتی ہیں، اور معمولی معمولی باتوں پر اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے تاکہ اس میں اور زیادہ ولولۂ عمل پیدا ہو، آج حیدرآباد خواہ ترقی کے کسی درجہ پر ہو، لیکن کسی حالت میں ان لوگوں کی خدمات نظر انداز نہیں کی جاسکتیں جنھوں نے مشکلات کے ہجوم میں جب کہ باہمی رشک و حسد کی وجہ سے ہر کام کرنے والے کے خلاف ایک طوفان برپا تھا بغیر کسی لغزش یا کمزوری کے استقلال و راستبازی کے ساتھ اپنا فرض ادا کیا، نواب انتصار جنگ بھی انھیں لوگوں میں ہیں جنھوں نے اپنے دماغ کی بہترین طاقت اور شباب کی پُر ولولہ زندگی کا بہترین حصہ دولت آصفیہ کی خدمت میں صرف کر دیا۔ لہٰذا ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم ان کے کارناموں کو پڑھتے وقت اس زمانہ کے حیدرآباد کو بھی پیش نظر رکھیں، صرف اسی طریقہ سے ہم اس زمانہ کے کام کرنے والوں کی اہمیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

ایک عدالت کا افتتاح نواب انتصار جنگ کی تحریک سے جدید عدالتی انتظامات کے سلسلہ میں نارائن پیٹھ ضلع ناگر کرنول میں ایک عدالت منصفی قایم کی گئی جس کے افتتاح کی رسم کے موقع پر خود نواب انتصار جنگ بھی موجود تھے اور اُنھوں نے ایک پُرمغز افتتاحی تقریر بھی کی، اگرچہ کسی عدالت کا افتتاح بظاہر ایک معمولی واقعہ ہے لیکن جس ملک میں جدید انتظامات کا آغاز ہو وہاں بعض معمولی واقعات بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ۱۶ شعبان ۱۳۰۴ھ کو ایک شاندار مجمع میں یہ رسم عمل میں آئی۔

تعلقہ دار ضلع کی مختصر تقریر کے بعد نواب انتصار جنگ نے مجمع کو مخاطب کیا۔ اُنھوں نے بتایا کہ میرے ۱۲۹۳ف کے دورہ کے موقع پر ایک عدالت منصفی کے قیام کی جو خواہش کی گئی تھی وہ مجکو یاد تھی جب موقع ملا میں نے اس کی تحریک کی جو منظور ہوتی، اور خوشی کی بات ہے کہ آج وہ منصفی کھولی جاتی ہے، جس سے آپ کو دیوانی کے مقدمات میں بہت آسانی ہوگی۔ اسی سلسلہ میں اُنھوں نے اپنے مقتضائے طبیعت کے مطابق یہ بھی کہا:۔

"لیکن میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ ان تمام کامیابیوں سے متمتع ہو کر زیادہ

تو اس طرف رغبت مت کرنا کہ مقدمات زیادہ دائر ہوں، اسٹامپ کی آمدنی زیادہ ہو، یہ ہو وہ ہو، مگر میری خواہش اس کے بالکل برخلاف ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب تک تم دوسرے طور سے اپنے مدیونوں سے معاملہ کر سکو مقدمے دائر کرنے کا خیال نہ کرنا اور خصوصاً کاشتکاروں کے ساتھ بہت نرمی کرنا اگر ان کے ساتھ سختی ہوئی اور یہ تباہ ہو گئے تو اس سے خود تمہارا نقصان ہے۔

——— تجربہ سے اگر ہم کو معلوم ہوگا کہ آپ لوگ کاشتکاروں کے ساتھ سختی کرتے ہیں تو ہم حفاظتی تجویزوں میں سختی کرینگے اور اگر معلوم ہوگا کہ آپ لوگ کاشتکاروں کے ساتھ خود نرم برتاؤ کرتے ہیں تو ہم کارروائی کو اپنی حالت پر چلنے دینگے۔"

اس کے بعد انھوں نے وکلا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

"مجکو یہ دیکھ کر بھی خوشی ہوئی کہ آج جس قدر وکلا اور مختاریہاں موجود ہیں وہ ایک منصفی کی ضرورتوں کے لیے بہت کچھ کافی ہیں۔ آپ صاحبوں سے بھی مجکو یہ کہنا ضرور ہے کہ میں وکلا کے وجود کو عدالت اور رعایا دونوں کے لیے بہت کارآمد اور مفید سمجھتا ہوں بشرطیکہ آپ اپنا کام اچھی طرح کریں، آپ کا یہ کام نہ ہونا چاہیے کہ آپ لوگوں کو رغبت دلا کر خواہ مخواہ مقدمات کی تعداد بڑھائیں اور لوگوں میں باہم جھگڑے پیدا کرائیں، آپ کا کام صرف یہ ہے کہ جب کوئی اپنا معاملہ آپ تک لائے تو آپ اس کو نیک صلاح اور قانونی مدد دیں۔"

کتاب کے ابتدائی حصہ میں کسی جگہ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اس زمانہ تک حیدرآباد میں عدالتوں کا پورا پورا احترام قایم نہیں ہوا تھا خصوصاً بڑے بڑے امرا و جاگیردار عدالت کے احکام کی زیادہ پروا نہیں کرتے تھے، اسی وجہ سے نواب انتصار جنگ کو اپنی تقریر میں یہ بھی کہنا پڑا:۔

"یہ امر بالکل ناقابل برداشت ہوگا کہ منصف صاحب کے احکام کی تعمیل میں کوئی

عدول یا تساہل برتا جائے۔ تمام سررشتوں پر اور تمام لوگوں پر ان احکام کی تعمیل واجب ہے جو منصفی کے محکمہ سے صادر ہوں میں اس وقت نارائن پیٹھ میں موجود ہوں اگر منصف صاحب کا حکم میرے پاس پہنچے کہ اپنے فلاں عملہ کو ادائے شہادت کے لیے بھیج دیجیے مجکو کوئی چارہ کار نہ ہوگا بجز اس کے کہ اس کی تعمیل کروں خود مجکو منصف صاحب اگر کسی وقت اپنے محکمہ میں شہادت کے واسطے طلب فرمائیں میں بسر و چشم حاضر ہونگا اور عدالت میں اپنی حاضری کو اپنا فخر سمجھونگا"

نواب انتصار جنگ کی تقریر کے بعد جدید منصف صاحب نے مختصر الفاظ میں ان عمدہ نصایح پر نواب صاحب ممدوح کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد رعایا کے ہر طبقہ کے قایم مقاموں کی طرف سے ایک ایڈریس نواب انتصار جنگ کی خدمت میں پیش کیا گیا، جس میں ان گوناگوں احسانات اور جدید انتظامات کا شکریہ ادا کیا گیا تھا جن کا تعلق نواب صاحب ممدوح کی حکومت سے تھا، یہ ایڈریس ایک مکلف خریطہ میں رکھ کر پیش کیا گیا۔

اس کے بعد نواب انتصار جنگ مع حکام و رعایا کی جماعت کے منصف صاحب کو عدالت کے خیمہ کی طرف لے گئے اور بسم اللہ کہہ کر ان کو اجلاس کی کرسی پر بٹھایا اور مبارکباد دی۔ اس کے بعد نواب ممدوح نے اعلان کیا کہ منصفی کی عدالت کھل گئی۔ چنانچہ اسی روز تین عرضی دعوی منصف صاحب کے اجلاس میں پیش ہوئے۔

عام اصلاحات اور مفید احکام

نواب انتصار جنگ نے اپنے زمانہ صوبہ داری میں سینکڑوں مفید احکام جاری کیے جو زیادہ تر رعایا کی فلاح و آسایش، ملکی ترقی، اور سرکاری دفاتر کی اصلاح و تہذیب کے متعلق ہیں، ہر حکم کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی ہمہ گیر طبیعت کسی چیز کو اصلاح بغیر چھوڑنا نہیں چاہتی، وہ خود بھی جوش و ولولہ کے ساتھ کام کرتے ہیں، اور ماتحت عہدہ داروں سے بھی کام لیتے اور اُن کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں تاکہ اُن میں اور زیادہ کام کرنے کا جوش پیدا ہو۔ مثلاً ایک حکم کے آخر میں لکھتے ہیں:۔

"میں خود دورہ کو اُٹھ چکا ہوں اور اپنے صوبہ کے ہر ایک ضلع میں مجکو جانا اور ہر ایک تحصیلدار اور ناظم جمعبندی کے کام کو اسی سال مجکو دیکھنا ہے، میں اُمید کرتا ہوں کہ ہر ایک عہدہ دار افسر جن سے ان ہدایات کی تعمیل متعلق ہو ایسی احتیاط اور مستعدی کے ساتھ ہدایات کے بموجب عمل پیرا ہونگے کہ اُن کے کاموں کے دیکھنے کے بعد میرا کام صرف اُن کا شکریہ ادا کرنا اور اُن کی عمدہ خدمات کی اطلاع عالی جناب مدارالمہام سرکار عالی کی خدمت میں پیش کرنے کا رہ جائے"

ایک دوسرے حکم کو جو ایک تعلقہ دار کے نام ہے ان الفاظ میں ختم کرتے ہیں:۔

"اور میں بدل مشکور ہوں آپ کی اُس عمدہ سالانہ مکمل رپورٹ کا جو ۱۲۹۳ف کے ختم کے بعد آپ نے روانہ کی تھی اور توقع ہے کہ آیندہ ان کیفیتوں میں اور بھی عمدگی پیدا ہوتی جائیگی تعلقہ دار صاحبان کی یہ کیفیتیں برابر نواب مدارالمہام سرکار عالی کے ملاحظہ کے واسطے گزرانی جائینگی اور جب کہ مجکو اپنے صدر تختہ جات صوبہ کے ساتھ اپنی کیفیت شامل کرنی پڑیگی اور ہر ایک کا مقابلہ دوسرے اضلاع صوبہ سے کیا جائیگا تو مجکو دیکھنا ہے کہ کون سا ضلع اس کیفیت میں بلحاظ ان عمدہ نتائج کے

اوّل درجہ حاصل کرتا ہے"۔

صوبہ کی حالت ایسی اصلاح طلب تھی کہ مختلف معاملات کے متعلق لازمی طور پر روزانہ احکام صادر کرنے کی نوبت آتی تھی اور ہر حکم کسی نہ کسی لحاظ سے مفید و ضروری ہوتا تھا۔ چنانچہ رعایا نے جو اڈریس عدالت منصفی کے افتتاح کے وقت نواب انتصار جنگ کو دیا تھا اُس میں ان احکام کی کثرت کی طرف بھی اشارہ تھا، یعنی :-

"بلا مبالغہ ہر روز ایک نیا انتظام ہماری آسایش کے لیئے کیا مال میں کیا عدالت میں، کیا کوتوالی میں برابر قایم ہوتا جاتا ہے۔ ہر روز ایک نئی گشتی ہمارے محسن اور افسر اعلیٰ صوبہ، عالی جناب نواب انتصار جنگ بہادر دام اقبالہم کی ہماری رفاہ عام کے لیئے جاری ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہم اپنی تمدنی حالت کو نہایت سہولت کے ساتھ درست کرتے چلے جاتے ہیں، اور سرکار عالی کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ہم پر سرکار عالی نے ایک ایسے روشن خیال رعایا پرور، محنتی، دلسوز حاکم کو مقرر فرمایا ہے کہ جس کے عہد حکومت اور زمانہ معدلت میں ہم ایسی آسایش اور آزادی کے ساتھ بسر کرتے ہیں"۔

اِس سے اندازہ ہوگا کہ اس زمانہ میں احکام کی کسقدر کثرت تھی، اور تمام صوبہ میں کیسی سرگرمی سے کام ہو رہا تھا کم و بیش چار سال تک یہی حالت رہی، اور اس تھوڑی سی مدت میں صوبہ میں عجیب انقلاب پیدا ہو گیا، ان احکام کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہمارے سامنے ہے، لیکن کتاب اُن کی متحمل نہیں ہو سکتی اس لیئے تمثیلاً اختصار کے ساتھ چند مفید احکام کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مفید احکام کی عام اشاعت

اسی زمانہ میں رعایا کی فلاح و بہبودی کے متعلق جو احکام مدار المہام اور دوسرے اعلیٰ حکام کی طرف سے جاری ہوتے اور سرکاری جریدہ میں بھی شائع ہو جاتے تھے، صوبہ کے اہلکار اور پٹواری وغیرہ رعایا کو اُن سے ناواقف رکھتے تھے تاکہ لوگ اپنے حقوق سے واقف نہوں اور بدستور تاریکی میں مبتلا رہیں اور اہلکار ناجائز فائدہ اُٹھاتے رہیں، جب نواب انتصار جنگ

دورہ پر گئے تو اُن کو ان حالات کی اطلاع ہوئی اور معلوم ہوا کہ غریب رعایا بہت سے مفید احکام سے بے خبر ہے تو انھوں نے تہدیدی احکام تعلقہ داروں کے نام جاری کیے کہ وہ تحصیلداروں وغیرہ کو متنبہ کر دیں کہ :۔

"جب اُن کو کسی موضع میں جانے کا اتفاق ہو، تو وہ رعایا کو جمع کر کے اُن تمام احکام سے اطلاع کر دیا کریں، میں نے دیکھا ہے کہ رعیت کو جب اُن حکموں کی اطلاع دی گئی تو سب خوش ہو گئے، اور اُن کو سرکار عالی کی مہربانی کی وجہ سے ایک اطمینان حاصل ہوا۔"

اس کے بعد نواب انتصار جنگ نے اُن احکام کی تفصیل بھی بیان کی ہے جن سے رعایا کو بے خبر رکھا گیا ہے اور تاکید کی ہے کہ یہ سب احکام رعایا تک پہونچا دیئے جائیں۔

بے ضابطہ عرائض کے ساتھ سلوک

اس زمانہ میں یہ عام رواج تھا کہ لوگ بے ضابطہ طور اعلیٰ حکام کے پاس ماتحت عہدہ داروں کے متعلق عرضیاں بھیجدیتے تھے جس میں کسی معاملہ کے متعلق شکایت ہوتی تھی اعلیٰ حکام ماتحت محکمہ جات سے ان عرائض پر کیفیت طلب کرتے تھے، اور مراسلات کا ایک باقاعدہ سلسلہ شروع ہو جاتا تھا، نواب انتصار جنگ نے اس طریقہ کو موقوف کر دیا، کیونکہ اُن کے نزدیک :

"علاوہ اس کے کہ اس سے محکمہ جات ماتحت میں کام کی زیادہ کثرت ہو، ایک نامناسب مداخلت اضلاع کے حکام کے اقتدارات میں بھی ہے حکام اضلاع آزاد رہنے چاہئیں کہ وہ اخیر وقت تک اپنی ذمہ داری سے کام کریں فریق ناراض کو صرف یہ حق ہے کہ جب اُن کے حکم سے ناراض ہو تو اس کا مرافعہ پیش کرے جس کے ساتھ تجویز کی مصدقہ نقل شامل ہوگی، . . . . البتہ ایک حصہ ان عرضیوں کا ایسا بھی ہوتا ہے جس میں یہ شکایت ہوتی ہے کہ مقدمہ ضلع میں دیر سے دائر ہے اور فیصل نہیں ہوتا، اس پر ہم کو اس نگرانی کے لحاظ سے جو محکمہ جات ماتحت کی کارروائی کی نسبت

ہم سے متعلق ہے کیفیت طلب کرنی پڑتی ہے..... مگر یہ کیفیت صرف وجہ توقف انفصال کے متعلق ہوتی ہے مقدمات کے واقعات سے اُس میں کچھ بحث نہیں ہوتی"۔

عہدہ داروں اور ملازموں کی شکایت کے متعلق جو عرضیاں آتی ہیں اُن کے متعلق لکھتے ہیں:-

"اُن میں ایک حصہ تو اس قابل ہوتا ہے کہ فوراً چاک کر دیا جائے اور چاک کر دیا جاتا ہے اور کچھ ایسی ہوتی ہیں جن پر تعلقہ دار صاحبان اضلاع کا مطلع رہنا مناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ سرکاری طور سے تعلقہ دار صاحبان کی خدمت میں مُرسل ہوتی ہیں یہ حصہ کارروائی کا بالکل ایک راز کا دفتر ہوتا ہے اور چاہیئے کہ عام طور پر اہل سررشتہ بھی اُس پر مطلع نہ ہونے پائیں"۔

اِسی سلسلہ میں لکھتے ہیں:-

"اب ایک قسم عرائض کی وہ رہتی ہے جو کہ مقدمات سے متعلق ہوتی ہے، اور ہم اس پر کوئی کیفیت بھی اضلاع سے طلب کرنا ضرور نہیں سمجھتے ان میں سے کچھ داخل دفتر کر دی جاتی ہیں، اور کچھ کی نسبت ہم سمجھتے ہیں کہ تعلقہ دار صاحبان اضلاع اُن پر مطلع ہوں اور وہ جو کچھ مناسب سمجھیں اُن پر کارروائی کریں، یہ عرائض تجویز مناسب کیلئے اضلاع کو بھیجی جاتی ہیں اُن سے یہ مقصود نہیں ہوتا کہ نتیجہ اخیر سے پھر صوبہ داری کے محکمہ کو اطلاع دیجائے"۔

اِن احکام سے اندازہ ہوتا ہے کہ حدود سے تجاوز کرنا یا ناجائز اقتدار حاصل کرنا جس طرح وہ دوسروں کے لئے جائز نہیں رکھتے اپنے لئے بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

ممانعت معاملت قرضہ و خرید فروخت ملازمین سرکار

اُس زمانہ میں یہ رواج تھا کہ سرکاری ملازمین اپنے علاقہ میں لوگوں سے قرض لیا کرتے تھے اور خرید و فروخت کا معاملہ بھی کرتے تھے، اِس طریقہ کا اثر سرکاری معاملات پر جو کچھ پڑ سکتا ہے وہ محتاج بیان نہیں، چنانچہ جب نواب انتصار جنگ کو بحالتِ دورہ ان واقعات پر اطلاع ہوئی تو اُنھوں نے تعلقہ داروں کے نام یہ حکم بھیجا کہ مجھے معتبر ذریعے سے معلوم ہوا ہے

کہ بعض سرکاری اہلکار ضلع کے پٹیل اور پٹواری وغیرہ سے یا اُن کی ضمانت پر ساہوکاروں سے قرض لیتے ہیں، اور اُن کے ہاتھ اپنے گھوڑے اور بیل وغیرہ فروخت کرتے ہیں، اسی طرح بعض اہلکار زمیندار سے تحائف وغیرہ بھی لیا کرتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ اس مذموم اور ناجائز طریقہ کو کامل طور پر روک دوں، چنانچہ احکام ذیل صادر کیئے جاتے ہیں۔

(۱) کوئی اہلکار اپنے علاقہ میں بغیر اجازت اپنے محکمہ بالادست کے کسی کاشتکار، زمیندار مستاجر، یا پٹیل پٹواری سے یا اُن کی ضمانت پر کسی دوسرے سے قرض نہ لے۔

(۲) کوئی عہدہ دار یعنی افسر محکمہ اپنے عملہ ماتحت کے کسی اہلکار سے یا اُس کی ضمانت پر قرض نہ لے۔

(۳) اہلکار و عہدہ دار کو جس طرح قرض لینے کی ممانعت ہے اسی طرح قرض دینے اور دلانے کی بھی ممانعت کی جاتی ہے۔

(۴) اگر احکام ممانعت سے پہلے اس قسم کا کوئی معاملہ ہو چکا ہے تو تین مہینے کے اندر اس کا تصفیہ ہو جائے، اور اس مدت کے بعد ہر ضلع سے ایک کیفیت آنی چاہیئے کہ ان احکام کی تعمیل ہو گئی یا نہیں اور اگر کوئی پرانا معاملہ باقی رہ گیا ہے تو کیوں رہ گیا۔

(۵) کوئی ملازم سرکار کسی کاشتکار، مستاجر، یا پٹیل اور پٹواری کے ہاتھ نہ کوئی چیز فروخت کرے نہ اُن سے خریدے، نہ کوئی تحفہ یا نذرانہ قبول کرے۔

آخر میں یہ بتایا گیا تھا کہ جو ملازمین سرکار اس کے خلاف ورزی کرینگے اُن کو جرمانہ سے لے کر موقوفی تک کی سزا دی جاسکتی ہے۔

سرکاری محکموں اور دفاتر میں مسلح داخل ہونے کی ممانعت

یہ ایک عام حکم ہے جو اُنھوں نے اپنے صوبہ کے ہر محکمہ اور دفتر میں بھیجا، اور اپنے بالادست محکموں میں بھی اس کی ایک ایک نقل روانہ کی۔ وہ لکھتے ہیں:-

"میرے سامنے حال میں ایک مقدمہ پیش ہوا ہے جس میں ایک شخص مسلح

حالت میں ایک سرکاری دفتر میں اپنے مقدمہ کی پیروی کے لیئے داخل ہوا اور عملہ کو جس نے اس کو جواب دیا کہ ابھی تمھارا مقدمہ تیار نہیں ہے، اپنے طپنچہ سے دھمکایا ..... عدالت نے شخص مذکور کو ایک سال قید کی سزا دی ہے، اس ایک مقدمہ سے جو نتیجہ نکلتا ہے اس کے لحاظ سے اب یہ امر لازم ہے کہ عام طور سے ایسا انتظام کیا جائے کہ آیندہ پھر ایسے خطرات پیش نہ آئیں یہ بالکل ایک سرکاری محکمہ کی وقعت اور عظمت اور آداب کے خلاف ہے کہ اہل مقدمات مُسلح حالت میں محکموں میں آئیں ان مُسلح لوگوں سے اس عہدہ دار یا اہلکار کے لیئے ہمیشہ خطرہ ہے جو اُن کے برخلاف کوئی کارروائی کرے یا حکم دے، اور اُس سے ایک بہت بڑا خلل سرکاری ملازمین کی آزادی میں بھی واقع ہوتا ہے لہذا حسب ذیل حکم دیا جاتا ہے۔"

(۱) سوائے ملازمان کوتوالی یا دوسری جمعیتوں کے جو کسی محکمہ میں اس لیئے حاضر ہوں کہ اُس محکمہ کے انتظام اور رعب کو قایم رکھیں، یا جن کی حفاظت میں کوئی مجرم ہو، اور سوائے افسر محکمہ کے اگر وہ اجلاس میں اپنے پاس کوئی ہتھیار رکھنا چاہیئے کوئی شخص مجاز نہیں ہے کہ وہ مُسلح حالت میں کسی عہدہ دار کے اجلاس میں یا عملہ کی نشست یا کسی سرکاری دفتر یا گودام میں داخل ہو۔"

(۲) جو لوگ مُسلح حالت میں محکمہ تک آئیں اُن کو لازم ہوگا کہ اپنے ہتھیار پہرہ میں رکھ کر اندر آئیں، اگر وہ ہتھیار رکھنے سے انکار کریں تو پہرہ والے کو یا کسی دوسرے ملازم محکمہ کو اختیار ہوگا کہ شخص مذکور کو اندر آنے سے روکے، اس پر بھی اگر وہ اس حکم کی تعمیل نہ کرے اور زبردستی مسلح حالت میں محکمہ میں آنا چاہے تو گرفتار کرکے کوتوالی کے سپرد کردیا جائے، جہاں سے بلا توقف غیر ضروری مقدمہ عدالت فوجداری میں چالان کیا جائیگا۔

نواب انتصار جنگ اس حکم کو یہاں تک ضروری خیال کرتے تھے کہ ان کی خواہش کے موافق مدار المہام نے اعلیٰحضرت سے اجازت لیکر یہ قاعدہ تمام ملک محروسہ میں جاری کردیا صرف صوبہ

شرقی کے ساتھ مخصوص نہیں رہا، یہ صورت اور احکام میں بھی پیش آئی جو ابتدا میں تو نواب انتصار جنگ نے اپنے صوبہ میں جاری کیئے اس کے بعد مفید سمجھ کر تمام صوبوں میں جاری کردیئے گئے۔

ریشم کے کیڑوں کے متعلق رعایا کو آزادی

صوبۂ شرقی کے بعض اضلاع میں ریشم کے کیڑے پیدا ہوتے تھے لیکن ان کی پرورش پر پابندیاں تھیں، نواب انتصار جنگ نے مدار المہام سے اجازت لے کر عام حکم دیا کہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ آزادی سے اُن کیڑوں کی پرورش کرے اور جس حد تک چاہے ترقی دے کسی قسم کا محصول اس سے نہیں لیا جائیگا، اُنھوں نے صرف اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ تعلقہ داروں کو لکھا کہ وہ لوگوں کو اس کام کی ترغیب دیں تاکہ دولت مند اپنا سرمایہ اس مفید کام میں لگائیں، اُن کا خیال ہے کہ :-

"اگر اس ملک میں جہاں ریشمی کپڑے عمدہ عمدہ تیار ہوتے ہیں کافی تعداد میں عمدہ قسم کا ریشم تیار ہونے لگے تو ملک کی دولت کی ترقی کا باعث ہوگا، درآمد کی تجارت کو ترقی ہوگی۔"

ترقیِ زراعت

نواب انتصار جنگ کو اپنے صوبہ میں زراعت کی ترقی کا خاص خیال تھا جس کے لیئے وہ ہمیشہ مختلف تدبیریں کرتے رہے، اعلیٰ اجناس کی کاشت کے متعلق اُنھوں نے رعایا کو خاص طور پر ترغیب دی اور مناسب سہولتیں بہم پہنچائیں، گیہوں، روئی اور نیشکر کی طرف اُنھوں نے خاص توجّہ کی، اسی سلسلہ میں اُنھوں نے یہ کوشش بھی کی کہ کوئی زمین اُفتادہ نہ رہے، چنانچہ یہ حکم جاری کیا کہ جن زمینوں کو رعایا نے بلاوجہ اُفتادہ رکھا ہے اُن کے معاوضہ میں رعایا سے کچھ نہ کچھ جمع لی جائے ۱۳۰۴ھ میں اور زیادہ اس کا اہتمام کیا چنانچہ ایک تعلقہ دار کے نام یہ حکم جاری کیا کہ :-

(۱) اپنے ناظمان جمعبندی کو حکم دیجئے کہ جن زمینوں کو رعایا نے بغیر کسی قوی مجبوری کے اُفتادہ رکھا ہے اس کی سالم جمع رعایا پر باندھیں۔ مثلاً اگر پانی موجود تھا اور اُنھوں نے تری کی کاشت نہیں کی یا خشکی کے کسی کھیت کو بغیر کسی معقول عذر کے اُفتادہ رکھا تو اس کی جمع رعایا سے لینی چاہیئے۔۔۔۔۔۔۔" ناداری کا عذر بھی قابل سماعت نہ ہوگا مگر یہ کہ خدانخواستہ

کوئی اتفاقی صدمہ عین اس سال کی زراعت کے وقت اُس کو پیش آگیا کہ مویشی مر گئے یا آگ لگ گئی، یا اور کوئی ایسا ہی قوی سبب ہوا ہو، ایسی حالت میں البتہ بعذر ناداری اس سال رقم کا معاف کرنا ضرور ہوگا۔

(۲) لیکن اسی کے ساتھ رعایا کو کامل آزادی دینی چاہیئے کہ وہ اگر کسی زمین کو اپنی طاقت سے زیادہ سمجھتی ہے اُس کا راضی نامہ دے اور جب ایسا راضی نامہ پیش ہو بلا عذر اور بلا توقف اس کو منظور ہونا چاہیئے، × × × × × × × × سب سے بد الزام یہ ہے کہ نادار لوگوں کے ہاتھ میں زمینیں رہیں جو نہ خود کاشت کر سکیں نہ دوسروں کو کاشت کرنے دیں گے۔

اِسی طرح کے متعدد احکام ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ ملک زراعت کی حیثیت سے ترقی کرے۔

جانوروں کو زہر سے بچانے کی تدبیر

اِس زمانہ میں زراعت پیشہ لوگوں کے جانور نامعلوم طور پر زہر سے ہلاک کر دیئے جاتے تھے جس سے یہ غریب لوگ مصیبت میں مبتلا ہو جاتے تھے اور باوجود تلاش مجرموں کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ آخر کار نواب انتصار جنگ نے اس معاملہ پر توجہ کی اور تعلقہ دارو کو لکھا کہ اس بات پر یقین کیا گیا ہے کہ چمڑے کے کارخانے رکھنے والے جو ترغیب ڈھیروں کو دیتے ہیں وہ جانوروں کی زہر خورانی کا بہت بڑا باعث ہے۔ کارخانے والے ڈھیروں کو جو پیشگی روپیہ تقسیم کرتے ہیں وہ ایک علانیہ ترغیب اس قسم کے مجرمانہ افعال کے واسطے ہے۔ پس فوراً اِس ترغیب کو روکنا چاہیئے۔ جس قدر کارخانے آپکے علاقہ میں ہیں اُن لوگوں سے اقرار نامے لیئے جائیں کہ وہ آیندہ کبھی کسی شخص کو چمڑوں کے بہم پہنچانے کے لیئے پیشگی روپیہ نہ دینگے، اور جو رقم اُن کی ڈھیروں وغیرہ پر اس وقت پیشگی ہو اس کی ایک فہرست موضع وار اور نام وار داخل کریں، اور اس کا تصفیہ چند مہینے کے اندر کر لیں۔ تعلقہ دار اس تصفیہ میں کارخانے والوں کو کچھ مدد بھی دیں تاکہ اس مدت کے اندر ہی جس قدر جلد ممکن ہو اُس کا تصفیہ ہو جائے، اگر کارخانے والوں سے ان احکام کی بجا آوری میں کوئی خلاف ورزی ہو تو کارخانہ کو بند کر دیا جائے، اور اگر کسی قسم کا ثبوت اُن کے خلاف مہیا ہو سکتا ہو تو اُس کے ساتھ اُن کو فوجداری سپرد کرنا چاہیئے، اِسی سلسلہ میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ جابجا ڈھیروں کی پنچایت کر کے اُن کو

متنبہ کیا جائے اور اقرار نامہ لیا جائے کہ وہ آیندہ اِس قسم کے جرائم کا ارتکاب نہ کرینگے۔

پھل لانیوالے درختوں کو رعایا کے لیئے خاص کرنا

دیہات میں یہ قاعدہ جاری تھا کہ جو پھل لانے والے درخت رعایا کی باؤلیوں پر یا گھروں ہیں ہوتے تھے، اُن کا محصول معاف تھا، دَورہ کے زمانہ میں رعایا نے نواب انتصار جنگ سے یہ شکایت کی کہ اس قسم کے درخت جو احاطہ ہائے مکان کے اندر نہیں ہوتے مگر مکانات کے باہر، مختلف حقوق اور خدمتوں کے لحاظ سے وہ بھی درحقیقت رعایا کے ہی سمجھے جاتے ہیں، وہ برابر ہراج میں شامل ہو جاتے اور اس سے رعایا پر بہت سختی گزرتی ہے۔ نواب ممدوح نے مؤثر طریقہ سے رعایا کی یہ شکایت مدار المہام کو لکھی اور یہ خواہش کی کہ بستی کے اندر جس قدر درخت ہیں اُن سے رعایا کو متمتع ہونے کا موقع دیا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔

"اب جب کہ اُن پر سرکاری مستاجر دخیل ہو جاتا ہے تو یہ غریب رعیت ایک املی تک کو محتاج ہو جاتی ہے اور اُن کی اس نہایت قابلِ ترحم تکلیف کے مقابلہ میں سرکار کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ نہایت خفیف ہے۔ اور کبھی سرکار کی یہ مرضی نہیں ہے کہ رعایا کو اس قدر تنگ کر کے ایسی خفیف خفیف رقوم جمع کرے"۔

مدار المہام نے نواب انتصار جنگ کی خواہش کے مطابق رعایا کو یہ حقوق عطا کیئے۔

ہنود کے مذہبی معاملات کا تعلق صدالصدور سے منقطع ہونا

۱۳۰۵ھ میں نواب انتصار جنگ نے مدار المہام کی خدمت میں یہ تحریک کی کہ ہنود کے مندروں اور اوقاف کا نیز ہر قسم کی امداد و انتظام کا تعلق صدر الصدور امورِ مذہبی سے ہے لیکن یہ مناسب نہیں کیونکہ صدر الصدور کا عہدہ اہلِ اسلام کا ایک مذہبی عہدہ ہے اور ایک گروہ کے عہدہ کے ماتحت دوسرے گروہ کے مذہبی معاملات کا رکھنا مصلحت عامّہ کے خلاف ہے، لیکن صوبہ دار اور تعلقہ دار بلالحاظ و امتیاز مذہب مقرر ہوتے ہیں، اور اُن کا عہدہ کوئی مذہبی نہیں بلکہ عام قسم کا عہدہ ہے اور وہ ہر ملت و مذہب کی رعایا سے یکساں تعلق رکھتے ہیں، لہذا ہنود کے مذہبی معاملات کا تعلق صوبہ داروں اور تعلقہ داروں سے ہونا چاہیئے۔

نواب مدار المہام نے اس تحریک کو منظور کیا اور نواب محسن الملک نے ایک مراسلہ کے ذریعہ سے

اطلاع دی کہ :-

"نواب مدار المہام سرکار عالی اس تحریک کو نہایت واجب اور قرین انصاف سمجھ کر منظور فرماتے ہیں کہ معاملات مذہبی اہلِ ہنود کا تعلق تعلقہ داروں اور صوبہ داروں سے کیا جائے جو عام طور پر ہر ایک مذہب و ملت کی رعایا سے یکساں تعلق رکھتے ہیں۔"

ایک مجلس کا تقرر

اس زمانہ میں کسی ضلع میں حفظِ صحت، صفائی اور اندرون آبادی کی سڑکوں کی تعمیر و مرمت کا کوئی معقول انتظام نہ تھا، نہ ریاست کے بجٹ میں اس قدر گنجایش تھی کہ یہ سب کام انجام دیئے جا سکیں، لیکن یہ کیونکر ممکن تھا کہ نواب انتصار جنگ اس ضروری معاملہ کو نظر انداز کر دیں، اس لیے انھوں نے یہ چاہا کہ یہ سب کام رعایا کے صرفہ سے انجام پائیں چنانچہ اُن کے حکم سے تعلقہ داروں نے مختلف اوقات میں ایک مجلس منعقد کر کے رعایا سے مشورہ کیا اور چند تجاویز طے کیں، اس کے بعد خود نواب انتصار جنگ نے اس موقع پر جب کہ صوبہ داری کی عمارات کا سنگِ بنیاد رکھا جا رہا تھا ایک عام جلسہ کر کے رعایا کو ان امور کے متعلق مخاطب کیا، اور نہایت دل نشیں طریقہ سے ایک مجلس صفائی کے قیام کی ضرورت ظاہر کی جو سرکاری اور غیر سرکاری اراکین پر مشتمل ہو اور خود رعایا کے روپیہ سے آبادی کی اصلاح و فلاح کا انتظام کرے۔ انھوں نے مختلف سرکاری انتظامات کا تذکرہ کرنے کے بعد کہا :-

"جب یہ سب کچھ خدا کی عنایت سے موجود ہے تو اب جو چیز کرنی باقی ہے وہ یہ ہے کہ اپنے آرام و آرایش کے لیئے جو کچھ ہم خود کر سکتے ہیں اُس کے لیے سب لوگ مل کر کمر ہمت چست باندھیں خدا بھی انہی لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔"

اس کے بعد اُنھوں نے بتایا کہ عام رائے کے مطابق یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ جو اجناس بستی کی ضرورتوں کے لحاظ سے بازاروں میں آتی ہیں اُن پر خفیف سا کوئی محصول قایم کر لیا جائے

جو ایسے آسان طریقہ سے وصول ہوگا کہ کسی شخص کو اس کا ادا کرنا ناگوار نہ گزرے گا۔ میں نے بحیثیت صوبہ دار بشرط منظوری نواب مدار المہام اس طریقہ کو منظور کر لیا ہے"۔ اسی سلسلۂ بیان میں اُنھوں نے مجلس کے تقرر کا اعلان کیا جس کے میر مجلس تو اوّل تعلقہ دار ہونگے اور ارکان سرکاری اور غیر سرکاری دونوں قسم کے ہونگے، لیکن غیر سرکاری ارکان کی تعداد زیادہ ہوگی، محصول کی شرح اور خرچ کا طریقہ بھی یہی مجلس تجویز کریگی۔

چونکہ یہ بالکل ایک نیا کام اور نیا انتظام تھا اور لوگوں کو طرح طرح کے شکوک پیدا ہو سکتے تھے اس لیئے نواب انتصار جنگ نے رعایا کو صاف طور پر یہ بتا دیا کہ:-

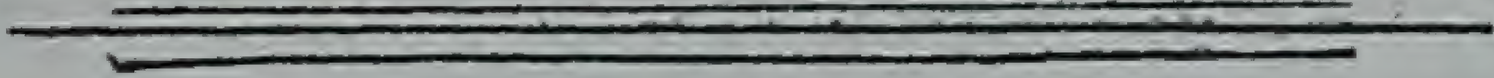
"جو روپیہ اس طور پر وصول ہوگا وہ سب آپ ہی کے مفید کاموں میں صرف ہوگا، سرکار سے اس کے سوا اور کچھ تعلق نہیں کہ سرکار کے خزانہ ضلع میں اس وقت تک وہ روپیہ حفاظت سے رکھا ہے جب تک کہ آپ کی مجلس منتظمہ وقتاً فوقتاً اس کو صرف کرے ایک پیسہ اس میں سے سرکار کو اپنے کاموں کے لیئے لینا منظور نہیں ہے"۔

ہندوستان میں ہم آج بھی دیکھتے ہیں کہ آبادی کے جس حصہ میں سرکاری دفاتر ہوتے ہیں یا حکام رہا کرتے ہیں وہاں صفائی وغیرہ کا بہ نسبت شہر کے دوسرے حصّوں کے زیادہ اہتمام ہوتا ہے اب نواب انتصار جنگ کا خیال اس کے متعلق سُنئیے وہ اُس رعایا کو جو ابھی اپنے حقوق سے واقف بھی نہیں یہ بتاتے ہیں:

"مجکو اپنی مدت العمر کے تجربوں سے اُن مقامات پر جہاں صفائی کا اس قسم کا انتظام ہے ایسی شکایتوں پر مطلع ہونے کا اکثر موقع ملا ہے کہ روپیہ جو رعیت سے وصول کیا جاتا ہے، وہ اکثر ایسے مواقع کی آرایش اور درستی وغیرہ میں صرف ہوتا ہے جہاں معزز سرکاری عہدہ دار رہتے ہیں، مگر میں ہمیشہ ایسے مصارف کو نہایت سخت نگاہ سے دیکھونگا اور مجکو اُمید ہے کہ سرکاری عہدہ دار جن کا ابھی مدتوں تک بہت کچھ قابو غیر سرکاری ممبروں کی رائے پر رہیگا، خود انصاف کو مد نظر رکھینگے، اور

جن لوگوں سے محصول کی کثیر التعداد رقم وصول ہوگی اُنھیں کی عام آسایش اور ضروریات، اور مواقع کے خوبصورت کرنے میں جہاں تک گنجایش ہو اُس کو زیادہ صرف کرینگے۔ ایک طرف رائے کی آزادی، اور دوسری طرف مصارف میں اس قسم کی مراعات سب لوگوں کو بہت جلد مطمئن کر دیگی کہ جو کام اس طرح پر شروع کیا گیا ہے وہ درحقیقت اُن کے لیے ایک آیت رحمت ہے، نہ موجب زحمت۔"

اس تقریر کے بعد اُنھوں نے مجلس کے متعلق دوسری جزئیات پر گفتگو کی، اور رعایا کے ایک قائم مقام نے نواب انتصار جنگ کا شکریہ ادا کیا۔



نواب انتصار جنگ کی سعی و عمل کے نتائج اور سرکاری طور پر اعتراف خدمات

نواب انتصار جنگ کی مسلسل جدّ و جہد اور سعی و عمل کے نہایت عمدہ نتائج ظاہر ہوئے، صوبۂ شرقی نے آبادی، زراعت، تجارت، امن و امان، اور عمدہ قوانین کے لحاظ سے غیر معمولی ترقی کی، رعایا کو رائے و عمل کی آزادی نصیب ہوئی، اور حکام میں وفاداری و انصاف کا جذبہ پیدا ہوا، اور ان سب خصوصیات کے لحاظ سے یہ صوبہ اس قدر ممتاز ہو گیا کہ دوسرے صوبوں میں اس کی تقلید کی کوشش کی جاتی تھی، حسن انتظام کی یہ شہرت تھی کہ انگریزی سرحدی علاقوں سے لوگ بھاگ بھاگ کر صوبہ شرقی میں آباد ہونے کے لیئے آتے تھے، رعایا کی یہ حالت تھی کہ وہ نواب انتصار جنگ کو اپنا آزادی دہندہ سمجھتی تھی، اور عدل و انصاف کے لیے اُن کا نام تمام حیدرآباد میں ضرب المثل تھا۔

دوسری طرف مدار المہام اور اعلیٰ حضرت بھی اُن کی خدمت کے معترف تھے اور اُن کی وفاداری پر اعتماد کرتے تھے، درحقیقت یہ اُن کی عجیب خوش نصیبی تھی کہ رعایا اور فرماں روا دونوں کا اعتماد اُن کو حاصل تھا جس کا قولاً و عملاً بارہا اعتراف کیا گیا، چنانچہ جب ۱۳۰۳ھ میں نواب مختار الملک سالار جنگ ثانی بہ سلسلہ دورہ اس صوبہ میں تشریف لے گئے اور جدید انتظامات کا بچشم خود مشاہدہ کیا تو اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنے ہاتھ سے نواب انتصار جنگ کو حسب ذیل خط لکھا:-

کیا مپ انگر
۷ رشوال ۱۳۰۳ھ

انتصار جنگ
صوبہ دار شرقی

نتائجیکہ در سمت آں مہربان متعلق تعمیل احکام ایں جانب بہ ظہور آمدہ بدرجہ غایت قابل اطمینان و عمدہ، و آں را بر لیاقت و دیانت و حسن کارگزاری و شفقت آں مہربان منسوب می نمائم۔

بالآخر اظہار این معنے ضروری می شمارم کہ درین دورہ قلیل المدت اینچہ واقفیت
از انتظام و کارگزاری آں مہرباں حاصل نمودن ازاں بے انتہا خورسند شدم، و امید
بلکہ اطمینانِ کامل دارم کہ سمت شرقی در ایام نگرانی و حکومت آں مہربان رشکِ دیگر
اسمات سرکار عالی خواہد شد۔"

(دستخط)

مختار الملک

مدار المہام سرکار عالی

اِس کے علاوہ ایک عام دربار میں بھی نواب انتصار جنگ کی قابلیت اور حسن کارگزاری کا اعتراف
کیا، اس موقع پر یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ نواب مختار الملک نے جس زمانہ میں یہ دورہ کیا اُس وقت تک
نواب انتصار جنگ کی صوبہ داری پر صرف ڈیڑھ سال کا زمانہ گزرا تھا، اور اسی قلیل مدت میں صوبہ کی
حالت میں نمایاں انقلاب پیدا ہو گیا تھا۔

۱۸۸۸ء میں نواب بشیر الدولہ سر آسمان جاہ نے جو اس زمانہ میں مدار المہام تھے، ۴ راگست
سنہ مذکور کو ایک خط وائسرائے کے سکرٹری کو نواب انتصار جنگ کے تعارف اور وائسرائے سے
ملاقات کے متعلق لکھا اُس میں بھی ان اُمور کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ لکھتے ہیں:۔

چار سال تک اُنھوں نے مفصلات میں بیش قیمت خدمات انجام دیں اور رعایا
کی خستہ حالت کو دُور کرنے میں کوشش کی اور اُن کی اصل تکالیف کو بہت جلد دور
کرایا۔ جب ہم جودہ سالار جنگ نے مشتاق حسین کے صوبہ میں دورہ کیا تو اُنھوں نے
صوبہ دار کے اس عمدہ کام کا جو اُنھوں نے اس صوبہ میں جاری کیا تھا نہایت ہی
تعریفی الفاظ میں ایک عام[۱] دربار میں اعتراف کیا۔ میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں

---

[۱] نواب مختار الملک لار جنگ ثانی نے ۱۸۸۸ء میں صوبہ شرقی کے دورہ کے موقع پر ایک ایڈریس کے جواب
میں رعایا کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

کہ شرقی صوبہ کی رعایا مشتاق حسین کے نام کو احسانمندی کے جذبات کے ساتھ ہمیشہ یاد رکھے گی"

سالار جنگ، نواب انتصار الملک کو اپنا ریونیو سکرٹری بنانا چاہتے تھے جو بڑی ذمہ داری کا عہدہ ہے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۸۰) "قبل اس کے کہ میں اپنی اسپیچ کو ختم کروں آپ سب لوگوں کے یہ امر ذہن نشین کر دینا چاہتا ہوں کہ مولوی مشتاق حسین انتصار جنگ بہادر، صوبہ دار، اس صوبہ کو ایک ایسے افسر مل گئے ہیں کہ جو اپنے منصبی فرائض کو بجان و دل ادا کرتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہے وہ اپنے صوبہ کی رعایا کی فلاح کو ترقی دینے پر کوشش کرنے سے نہیں تھکتے وہ رعایا کے حق میں جیسا کہ ان کو ہونا چاہیئے، بہت بڑے پکے دوست اور ان کے حقوق کی حفاظت میں ان کے وکیل ہیں، وہ ان جاگیرداروں اور مقطعہ داروں اور ان سب صاحبوں کے بھی دوست اور معاون ہیں جو رعایا کی بہبود کو مد نظر رکھتے ہیں وہ اس بات میں بھی بے انتہا سعی کرتے ہیں کہ بیادگار ذرہ افزائی حضرت بندگان عالی متعالی مدظلہ العالی بہ تقریب افتتاح ورنگل ریلوے کے جہاں تک ہو سکے ورنگل کو اس کی اگلی عظمت و شان حاصل ہو جائے۔

حاصل مطلب یہ ہے کہ وہ وہ ذریعے اختیار کئے جائیں جن سے رعایا آرام و چین حاصل کرے اور سرکار کے عدل و انصاف کو گویا ہر شخص اپنے دروازہ پر تلاش کر سکے بہادر موصوف فی الواقع ایک بہت اہم اور عمدہ کام میں مصروف ہیں اور میں صدق دل سے یہ امید کرتا ہوں کہ ان کی سعی اور کوشش کو جو تعریف کے قابل ہے کامیابی ہو اور میں یقینی جانتا ہوں کہ وہ اپنے نام کو ان اضلاع میں اس خوبی کے ساتھ چھوڑ جاوینگے کہ لوگ سالہا سال تک ان کو نیکی کے ساتھ یاد کرتے رہینگے، سرکار عالی کو انتصار جنگ بہادر پر کامل اعتماد ہے، اور ان کی قابل تحسین کوششوں میں ان کی اعانت اور حمایت کرنے پر میں ہمیشہ مستعد رہونگا۔"

سنہ ۱۳۰۷ھ میں نواب بشیر الدولہ سر آسمان جاہ نے صوبہ شرقی کے بعض حصوں کا دورہ کیا اور صدر مقام کے جملہ دفاتر دیکھے، اس دورہ میں سر ڈینس فٹز پیٹرک رزیڈنٹ بھی نواب ممدوح کے ساتھ تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ نواب انتصار جنگ اپنی صوبہ داری کا زمانہ ختم کرکے دوسرے عہدہ پر ممتاز ہو چکے تھے۔ نواب سر آسمان جاہ نے دورہ سے واپس آکر اپنا تفصیلی معائنہ ہر صیغہ کا سرکاری طور پر شائع کیا۔ چونکہ یہ گورنمنٹ نظام کے سب سے زیادہ ذمہ دار شخص کی تحریر ہے، اس لیئے ہم اس کے بعض ضروری حصے جو نواب انتصار جنگ سے تعلق رکھتے ہیں پیش کرتے ہیں۔ نواب ممدوح لکھتے ہیں :۔

"اس پچھلے پانچ برس میں بہ نسبت اُس سے پہلے کے پانچ برس کے، سولہ لاکھ پندرہ ہزار چھ سو آٹھ زیادہ وصول ہوئے، اور اسی آخر کے پانچ برس میں کے ایک سال یعنی سنہ ۱۲۹۶ف میں تعداد رقم وصولی اکیس لاکھ باسٹھ ہزار پانسو اکیس تھی جو کہ پندرہ برس کے کسی اور سال میں یہ تعداد نہیں ہوئی اور بلا مبالغہ کہا جاتا ہے کہ یہ نتیجہ عمدہ انتظام اور نگرانی کا ہے جو کہ اس صوبہ میں نواب انتصار جنگ بہادر کے زمانہ صوبہ داری میں ہوئی۔"

اسی طرح ہر چیز کی تفصیل بیان کرنے کے بعد وہ آخر میں اس صوبہ کی حالت پر ایک عام تبصرہ کرتے ہیں جو اگرچہ کسی قدر طویل ہے لیکن مختلف وجوہ سے اس کا اکثر حصہ یہاں نقل کرنا مناسب ہے۔

نواب سر آسمان جاہ کا ریمارک

"اب خاتمہ پر میں اپنی رائے نسبت عام انتظام اور اصلاحات اور عہدہ داروں کے ظاہر کرنا مناسب جانتا ہوں۔ انتظام کی کیفیت یہ ہے کہ یہ ضلع تلنگانہ کے ان اضلاع میں سے ہے جو کہ انتظامی حالت کے لحاظ سے چند سال ہوئے کہ سب سے پیچھے پڑا ہوا سمجھا جاتا تھا اور باوجود سرکار کی خاص توجہ اور عہدہ داروں کی کوشش کے اب تک بہت سے نقص موجود ہیں، اور بہت کچھ کرنے کو باقی ہیں۔ مگر اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ جو کچھ ہوا اور ہر صیغہ میں جو کچھ ترقی ہوئی

اور آیندہ انتظام کی تکمیل کے لئے جو عملی کوششیں ہو رہی ہیں اور جو کام جاری ہیں اُن کے لحاظ سے میں اپنی دلی خوشی ظاہر کرتا ہوں اور جو کچھ میں نے دیکھا اور جانچا اس کی نسبت بلحاظ زمانہ گزشتہ کے حالات کے بہت کچھ اپنا اطمینان ظاہر کرتا ہوں۔

بیس برس ہوئے جب کہ میں ماہ ذیقعدہ ۱۲۹۸ھ میں مرحوم سر سالار جنگ اول کے ساتھ ملک کے دورہ کو نکلا تھا اور چونکہ ایک بڑے صیغہ کی نگرانی میرے ذمہ تھی میں نے بہت دل لگا کر اضلاع کی انتظامی حالت کو دیکھا تھا جو فرق اس وقت کی حالت سے اب میں دیکھتا ہوں اس کی نسبت مجھ سے زیادہ کوئی اپنی خوشی اور حیرت ظاہر نہیں کر سکتا، اس وقت مجھے اور مرحوم مدار المہام کو ملک کے حالات دیکھنے سے نہایت رنج ہوا تھا۔ نہ عہدہ دار لائق تھے نہ کوئی اپنے فرایض منصبی کو اچھی طرح انجام دیتا تھا، نہ رشوت اور تغلّب کی چنداں احتیاط تھی، نہ کوئی ضابطہ تھا نہ قاعدہ نہ حکموں کی تعمیل برابر ہوتی تھی، عدالتوں کا تو ذکر ہی نہ تھا جو کچھ تھا وہ برائے نام مالگزاری میں جمع کا لگانا اور وصول کرنا گویا پٹیل پٹواریوں اور تحصیل کے عملہ کے ہاتھ میں تھا، برسوں تک حسابات داخل نہ ہوتے تھے مطالبہ اور وصول کی مقدار سے بھی سالہا سال تک سرکار کو اطلاع نہ ہوتی تھی دورہ پر جانا نام کے لئے تھا، رعایا کی شکایتیں سننے اور اُن کے ساتھ ہمدردی کرنے اور بعض خرابیوں کے دیکھنے اور اُس کی اِصلاح کرنے کا کیا ذکر تھا۔

حقیقت میں اس وقت جاگیرداروں کے انتظام سے کچھ ہی بہتر حالت ملک کی تھی اور یہ درد انگیز حالت مرحوم کے ساتھ میں نے خود میدک، بیدر، اور اورنگ آباد کی دیکھی تھی جب میں اس حالت کو اس وقت سے ملاتا ہوں اور جو کچھ میں نے اب ضلع کھمم میں دیکھا اُس پر خیال کرتا ہوں تو مجھے بے انتہا خوشی اور اطمینان ہوتا ہے، چاروں طرف ترقی نظر آتی ہے، ہر جانب اصلاح کے آثار اور تہذیب کے نتیجے دکھائی دیتے ہیں، عمارتیں بنتی چلی جاتی ہیں، تجارت بڑھ رہی ہے۔ باہر کے لوگ اپنا سرمایہ پورے اطمینان سے سرکار کے ملک میں لگا رہے ہیں، کاشتکار زراعت کی ترقی میں مشغول ہیں، دیہات کے ملازمین سے لیکر صوبہ دار تک اپنے اپنے کاموں میں مصروف اور اپنے فرایض کے انجام دینے میں سرگرم ہیں، ہر چیز

کی تحقیق اور تنقیح بخوبی ہوتی ہے، ہر عہدہ دار کے کام کی نگرانی اس کے افسر کرتے ہیں، کوتوالی اور عدالت کا انتظام اوّل کی بہ نسبت نہایت بہتر اور عمدہ ہے، مالگزاری کے انتظام کی تکمیل جو پیمائش و بند و بست پر منحصر ہے نہایت نرمی سے ہو رہی ہے۔ عہدہ دار اکثر لایق اور ہوشیار اور متدین اور اپنے اپنے کام سے واقف اور اپنے فرایض کے انجام میں مستعد ہیں، احکام کی تعمیل بھی بہت اچھی ہوتی ہے، سرکاری خوف بھی لوگوں کے دلوں پر ہے، غرض کہ ۲۰ برس گزشتہ کی بہ نسبت حیرت انگیز ترقی ہے جن عہدہ داروں کا کام میں نے دیکھا اُن کی نسبت میں کہہ سکتا ہوں کہ جو ترقی اور درستی ضلع کھمم میں نظر آتی ہے، وہ نتیجہ نواب انتصار جنگ بہادر کی اُن عمدہ کوششوں اور بے نظیر کارروائیوں کا ہے جو کہ انھوں نے اپنے زمانہ صوبہ داری میں کیں درحقیقت اگر وہ اپنے آپ کو اس صوبہ کی درستی اور اصلاحات میں فنا نہ کر دیتے تو وہ عمدہ حالت جو میں نے اس صوبہ کی پائی اس وقت نظر نہ آتی مرحوم سالار جنگ جب کہ شوال ۱۳۰۳ھ میں صوبہ شرقی میں گئے تھے اور انھوں نے جو حالت مختلف ضلعوں کی دیکھی تھی اور اس کی نسبت اپنی یادداشت لکھی، اور بذریعہ عرضداشت مورخہ ۲۱ شوال ۱۳۰۳ھ کے حضرت بندگانِ عالی متعالی مدظلہ العالی کے ملاحظہ میں پیش کی تھی انھوں نے نواب انتصار جنگ بہادر کی نسبت جو کہ اس وقت صوبہ دار تھے یہ لکھا تھا کہ :۔

"انتصار جنگ جو صوبہ دار شرق کی کارگزاری کی نسبت خانہ زاد کو اس موقع پر اس قدر کہنا ہے کہ جو خیالات اُن کی محنت اور لیاقت اور مستعدی اور دیانت و انتظام کی نسبت فدوی کے تھے، اور جن کی نسبت اُن کے دورہ کی رپورٹ میں اپنی رائے ظاہر کر چکا ہوں اس کی اور بھی تصدیق ہوئی فدوی براستی عرض کرتا ہے کہ جس محنت ولیاقت و دلسوزی سے وہ اپنے فرایض منصبی انجام دیتے ہیں وہ قابل اس کے ہیں کہ حضرت خاص طور پر ان کی قدردانی فرمائیں"۔

میں مرحوم کی اس رائے سے ساتھ اتفاق کرتا ہوں، اور نواب انتصار جنگ بہادر کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ہر طرح سے سرکار کے شکریہ اور قدردانی کے مستحق ہیں کچھ ضرور نہیں ہے۔ ایک افسر جو اپنا کام اس طرح انجام دیتا ہے اُس کو خود اس کے کام سے اسقدر خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے شکریوں سے اُس کو مستغنی کر دیتی ہے۔

انقلاب وزارت اور نواب انتصار جنگ کا معتمد مالگزاری کے عہدہ پر تبادلہ

نواب انتصار جنگ چار سال تک صوبہ داری کے فرائض کمال خوش اسلوبی اور انہماک سے ادا کرتے رہے لیکن اسی زمانہ میں حیدر آباد میں وزارت کا انقلاب ہو گیا اور نواب ممدوح حیدر آباد طلب کر لئے گئے اور اس طرح گویا حیدر آباد میں ان کی ملازمت کا یہ تیسرا دور شروع ہوا۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم اُن کی ملازمت کے اس دور جدید کے حالات بیان کریں یہ مناسب معلوم ہوتا ہی کہ اس وقت کی سیاسی حالت اور انقلاب وزارت کے اسباب و علل کو اختصار کے ساتھ بیان کر دیں تاکہ ناظرین کو ان واقعات کی روشنی میں نواب انتصار جنگ کے جدید عہدے کی مشکلات کے اندازہ کرنے کا موقع ملے۔

جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس زمانے میں اعلیٰ حضرت آصف جاہ سادس کو حکمرانی کے کامل اختیارات حاصل ہو چکے تھے اور بظاہر ملک میں کوئی بالاتر طاقت ایسی نہ تھی جس کو مداخلت یا مزاحمت کا حق حاصل ہو، لیکن حقیقت یہ ہی کہ رزیڈنٹ کا غیر باضابطہ اقتدار، خفیہ و علانیہ برابر اپنا کام کر رہا تھا۔ اگرچہ ہندوستان کی دیسی ریاستوں کے اندرونی معاملات کے متعلق مدت سے گورنمنٹ برطانیہ کی پالیسی عدم مداخلت کے اصول پر مبنی ہی، لیکن واقعہ یہ ہی کہ اس پالیسی پر عمل کرنا زیادہ تر وایسرائے اور رزیڈنٹ کی مرضی اور انداز طبع پر منحصر ہی۔ ہر وایسرائے جو ہندوستان آتا ہی ایک جدید پالیسی کا حامی ہوتا ہی یعنی بعض کا طرزِ عمل والیانِ ملک کے ساتھ پسندیدہ اور خوشگوار ہوتا ہی اور بعض کا اس کے برعکس۔ پولیٹیکل ایجنٹ اور رزیڈنٹ کا تعلق چونکہ مقامی ہوتا ہی اس لئے اُن کے طرزِ عمل کا اثر ریاستوں میں زیادہ محسوس کیا جاتا ہی اور کبھی کبھی اُن کے گرد و پیش اس قسم کے واقعات بھی جمع ہو جاتے ہیں جو اُن کو مداخلت پر یا کسی خاص پالیسی کے اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

عموماً یہ دیکھا جاتا ہی کہ جب کوئی نیا فرماں روا مسند نشین ہوتا ہی خصوصاً جب کہ وہ نوجوان ہو تو مداخلت کا سلسلہ کچھ مدت تک ضرور قائم رہتا ہی کبھی ایسا ہوتا ہی کہ نئے فرماں روا کے

مسند نشیں ہوتے ہی مختلف پارٹیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن میں حصول اقتدار کے لئے باہم کش مکش شروع ہو جاتی ہے یا کوئی شخص ذاتی اثرات کی بنا پر غیر معمولی اقتدار اور اختیارات حاصل کر لیتا ہے اور دوسرے اُس کی مخالفت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں، ایسے موقعے پر قدرتاً رزیڈنٹ کو مداخلت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور آخر کار وہ کسی ایک پارٹی کی مخالفت یا حمایت پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ رزیڈنٹ محض امپیریل گورنمنٹ کا اقتدار اور اثر قائم رکھنے کے لئے معاملات میں دخل دیتا ہے تاکہ اہل ملک کو یہ محسوس ہو کہ ایک بالاتر طاقت اور بھی ہے، جس کو روک ٹوک کا منصب حاصل ہے۔

بے شبہ اگر یہ مداخلت اپنے حدود کے اندر رہے تو نہایت مفید ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ بعض اوقات والیان ملک کا طرز عمل اور ریاست کا انتظام قابل اطمینان نہیں ہوتا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فرماں روائے ملک کا ہم مذہب گروہ رعایا کے دوسرے طبقے کو ستاتا ہے، ایسی حالت میں مفاد عامہ کی خاطر مداخلت ناگزیر ہو جاتی ہے۔ غرض اگر پولیٹیکل ایجنٹ یا رزیڈنٹ اپنے حدود کے اندر رہ کر اپنے مفید مشورہ سے والیان ملک اور دیسی حکام کی رہ نمائی کریں تو یہ امر قابل اعتراض نہیں۔ لیکن افسوس کہ بعض اوقات ان مشوروں میں تحکم کی شان پیدا ہو جاتی ہے اور اگر فرماں روا کو اپنی شخصیت کا احساس ہے تو کش مکش شروع ہو جاتی ہے۔ ورنہ یہ بیرونی اقتدار و تسلط مستحکم ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں طاقت و اقتدار کے دو علیحدہ علیحدہ مرکز قائم ہو جاتے ہیں اور ریاست کے جلیل القدر عہدہ دار اور بلند رتبہ حکام اپنی پوزیشن کو مضبوط رکھنے کے لئے ایوان رزیڈنسی میں آمد و رفت شروع کر دیتے اور رزیڈنٹ کے اشارہ چشم و ابرو پر کام کرنے لگتے ہیں، بلکہ بعض اوقات یہ دیسی عہدہ دار ان بیرونی تعلقات کی بدولت فرماں روائے ملک پر دباؤ ڈال کر ناجائز فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ حالت والیانِ ملک کے لئے نہایت تلخ ہوتی ہے۔ لیکن اُن کو چار و ناچار صبر کرنا پڑتا ہے یا در پردہ کسی دوسری پارٹی کی حوصلہ افزائی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جو ذاتی اغراض یا وفاداری کی بنا پر فرماں روائے ملک کے اغراض و مقاصد کی حمایت کرتی ہے۔

جب ریاستوں میں اس قسم کی کش مکش شروع ہو جاتی ہی تو آخر کار کوئی نہ کوئی پارٹی مغلوب ہو کر مخالفت کا شکار ہو جاتی ہی، یہاں تک کہ بعض اوقات نہایت نیک نفس، وفادار اور ملک کے خیر خواہ عہدے دار بھی مصائب میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ملک اُن کی خدمات سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتا ہی، یہ ایک نہایت اجمالی خاکہ ہی اُن حالات کا جو ریاستوں میں پیش آتے ہیں اور اب سے ۳۰، ۴۰ برس پہلے حیدر آباد میں خصوصیت کے ساتھ پیش آتے تھے اور جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں حیدر آباد اسی قسم کے مشکلات میں مبتلا تھا۔

اعلیٰ حضرت اور سر سالار جنگ ثانی کے ناخوشگوار تعلقات

سر سالار جنگ ثانی کو ابھی عہدۂ مدار المہامی پر فائز ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ اعلیٰ حضرت نظام سے اُن کے تعلقات ناخوشگوار ہو گئے اور جو اعتماد مدار المہام پر ہونا چاہیئے وہ باقی نہ رہا۔ جو لوگ اس قسم کے اختلافات سے فائدہ اُٹھانے اور ذاتی اغراض حاصل کرنے کے خوگر ہیں اُنھوں نے ان اختلافات کو بڑھانے میں اس حد تک کوشش کی کہ مصالحت کی اُمیدیں منقطع ہو گئیں۔ نواب سر سالار جنگ کا یہ خیال تھا کہ مولوی سید حسین بلگرامی (نواب عماد الملک) اعلیٰ حضرت کے مزاج میں میری طرف سے برہمی پیدا کرتے ہیں چونکہ نواب عماد الملک نے ایک کونسل کے قیام کی بھی تجویز کی تھی جس سے سر سالار جنگ کے اختیارات خواہ مخواہ محدود ہو جاتے اس لئے عماد الملک کے متعلق اُن کی بدگمانیاں اور زیادہ مستحکم ہو گئی تھیں۔

سردار دلیر جنگ (عبد الحق) جن کی شخصیت اُس زمانے میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھی مدار المہام کے ہوا خواہ تھے اور یہ کہا جاتا ہی کہ رزیڈنسی میں مدار المہام کی طرف سے سفارت کی خدمت انجام دیتے تھے۔ غرض ایک طرف تو اعلیٰ حضرت کو اپنے حقیقی و واقعی شاہانہ اختیارات پر اعتماد تھا دوسری طرف سر سالار جنگ کو رزیڈنٹ کی حمایت اور مہربانی حاصل تھی اور یہ کوئی راز نہیں ہی کہ اس زمانے میں حیدر آباد میں منصب وزارت پر پہنچنا یا اس سے معزول ہونا زیادہ تر رزیڈنٹ اور وائسرائے کی مرضی اور مشورے سے ہوتا تھا اور ان مشوروں کی جو اہمیت تھی وہ محتاج

بیان نہیں۔ سر سالار جنگ اس حقیقت سے ناواقف نہ تھے۔ لہٰذا اسی قوت کے اعتماد پر انھوں نے اپنے حدود سے بےباکانہ تجاوز کیا اور بعض مواقع پر اعلیٰ حضرت کے احکام کو نظر انداز کر دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ حالت ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت نے مدار المہام کے اس طرز عمل کو محسوس کر کے سخت برہمی کا اظہار فرمایا، لیکن بااین ہمہ مدار المہام نے اپنے طریقِ عمل میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔

رزیڈنٹ کی اندرونی مداخلت میں ترقی

مدار المہام کے طرزِ عمل سے، رزیڈنٹ کو انتظامی امور میں مداخلت کا کافی موقع مل گیا اور صرف یہی نہیں کہ اہم معاملات میں بلکہ روزمرہ کے معمولی انتظامات اور مقدمات میں بھی رزیڈنٹ سے استصواب کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ عہدہ داروں کے تقرر، برطرفی اور تبادلہ میں بھی رزیڈنٹ کا ہاتھ کام کرتا تھا اندرونی انتظامات کے سلسلہ میں اگر کوئی اسکیم تیار ہوتی تھی یا کوئی بڑا عہدہ دار انتظامی امور کے متعلق کوئی یادداشت یا رپورٹ مدار المہام کے ملاحظہ کے لئے پیش کرتا تھا تو وہ بھی "بڑے صاحب" یا "صاحب عالی شان" (رزیڈنٹ) کی خدمت میں بھیجی جاتی تھی۔ اسی طرح گویا ریاست کے ہر شعبہ اور ہر صیغہ پر رزیڈنٹ کا غیر قانونی اقتدار قائم ہوگیا تھا۔ مدار المہام کا طریقہ یہ تھا کہ ان کو جو کچھ اعلیٰ حضرت سے منظور کرانا ہوتا تھا رزیڈنٹ کی مدد سے منظور کرا لیتے تھے اور جن امور کے متعلق ان کو یہ شبہ ہوتا تھا کہ اعلیٰ حضرت منظور نہیں فرمائیں گے تو ان کے متعلق پہلے رزیڈنٹ کا اتفاق حاصل کر کے اعلیٰ حضرت کے سامنے پیش کرتے تھے۔ ان حالات کی وجہ سے اعلیٰ حضرت کے شاہانہ اقتدار پر گویا ایک پردہ پڑا ہوا تھا اور رزیڈنٹ کی شخصیت نمایاں ہوگئی تھی۔ ان وجوہ سے اعلیٰ حضرت اپنے اختیارات کو آزادی اور مسرت کے ساتھ عمل میں نہیں لاسکتے تھے۔ حالانکہ تمام معاہدات جو گورنمنٹ ہند اور گورنمنٹ نظام کے مابین ہو چکے تھے، اُن میں یہ طے پا گیا تھا کہ سرکار انگریزی ریاست کے اندرونی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرے گی۔ چنانچہ اس عہد کے بعد بھی ایک موقعے پر سر جان گورسٹ انڈر سکرٹری آف اسٹیٹ نے پارلیمنٹ میں کیبنٹ یا مجلس وزرائے حیدرآباد کے مسئلہ کی نسبت گفتگو کرتے ہوئے صاف صاف اس بات کو تسلیم کیا کہ اس قسم کی تجویزیں حیدرآباد کے اندرونی انتظام سے متعلق

ہیں اور وہاں کے اندرونی انتظامی معاملات میں انگریزی گورنمنٹ کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے لیکن یہاں حیدرآباد میں معاملہ برعکس تھا حقیقت تو یہ ہے کہ خود ریاست کے اعلیٰ حکام نے اپنی کمزوری اور غلط کاری سے رزیڈنٹ کو مداخلت کا موقع دیدیا تھا۔

جو پارٹی رزیڈنٹ کو خوش رکھنا ضروری سمجھتی تھی وہ سر سالار جنگ کی بھی ہوا خواہ تھی کیونکہ یہ سب کو معلوم تھا کہ مسٹر کارڈری (رزیڈنٹ) سر سالار جنگ کے طرفدار ہیں۔ اعلیٰ حضرت اور مدار المہام کے مابین اختلافات کا قائم رہنا اس پارٹی کے مقاصد کے مطابق تھا۔

غرض جب کش مکش کی انتہا ہوگئی تو اعلیٰ حضرت نے مدار المہام کی معزولی کا عزم کیا اور جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے نوبت یہاں تک پہنچی کہ اعلیٰ حضرت خود رزیڈنٹ کے پاس تشریف لے گئے اور یہ ظاہر کیا کہ وہ ایک خط اُردو زبان میں والیسرائے کے نام لکھیں گے اور وہ براہ راست ولیسرائے کو بھیجدیا جائے۔ چنانچہ یہ خط بھیجا گیا اور مسٹر کارڈری کو اعلیٰ حضرت نظام کی اس خواہش کو مسترد کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

لارڈ ڈفرن کی آمد اور عام خیالات

اسی زمانے میں جب کہ عام طور پر یہ مشہور ہو چکا تھا کہ اعلیٰ حضرت مدار المہام کو علٰحدہ کرنا چاہتے ہیں لارڈ ڈفرن (والیسرائے) نے حیدرآباد آنے کا ارادہ ظاہر کیا، چنانچہ ۲۸ صفر ۱۳۰۴ھ م ۲۴ نومبر ۱۸۸۶ء کو وہ آئے اور مناسب طریقے سے اُن کا خیر مقدم کیا گیا، لوگوں کا عام طور پر یہ خیال تھا کہ وہ اس غرض سے آتے ہیں کہ ہز ہائنس نظام کو مدار المہام کے برقرار رکھنے کی ترغیب دیں۔ لیکن والیسرائے نے پبلک طور پر اس معاملہ کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ چنانچہ پاینیر مورخہ ۲ دسمبر ۱۸۸۶ء نے لارڈ ڈفرن کی آمد کے متعلق حسب ذیل ریمارک کیا:۔

> "جن لوگوں کو حضور والیسرائے کے حیدرآباد جانے پر بہت سے امور کے ظاہر ہونے کی توقع تھی وہ ضرور اپنی اس اُمید میں اپنے کو ناکامیاب سمجھتے ہونگے بعض اوقات لارڈ ڈفرن صاف اظہار کر دیتے ہیں لیکن

حیدر آباد میں وہ بالکل ہی خاموش رہے، اُن کی دعوت کا جلسہ جو حضور نظام کی طرف سے ہوا تھا اُس میں اُمید تھی کہ لارڈ ڈفرن کچھ ظاہر کریں لیکن وہ بھی چپ چاپ گزر گیا،

حضور والسرائے نے ہز ہائنس نظام کے جام تندرستی کی تحریک کرتے وقت معمولی باتوں کی نسبت عام طور پر ذکر کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کہا، اور حضور نظام نے اس کے جواب میں کچھ بھی ذکر نہیں کیا، غرض کہ حضور والسرائے نے علاوہ اور امور کے لحاظ کے ہز ہائنس کی طبیعت کا ٹھیک اندازہ کیا، اور سمجھا کہ اس معاملہ میں عام طور سے زور ڈالنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا اور جو اصلی مقصد تھا اس کو اُنھوں نے پرائیویٹ ملاقات کے لئے ملتوی رکھا۔ جو رخصت ہونے سے پیشتر اُنھوں نے حضور نظام سے کی۔

ہر طرح پر اُمید کی جاتی ہے کہ اس ملاقات کا نتیجہ اچھا ہوا، اور جس خاموشی و برخلافی سے سر اسٹوارٹ بیلی کو ناکامیابی رہی تھی وہ حضور والسرائے کے زور اور تقریر کے سامنے جاتی رہی۔ غرض کہ نتیجہ یہ ہے کہ حضور نظام نواب سالار جنگ بہادر کو وزارت پر بحال رکھنے پر راضی ہو گئے اور اصل مقصد بھی یہی تھا۔''

آئندہ واقعات سے معلوم ہوگا کہ پانیر کا قیاس کہاں تک صحیح تھا۔

اعلیٰ حضرت کا انگریز پرائیویٹ سکرٹری

اسی زمانے میں یہ تحریک نشو و نما حاصل کر رہی تھی کہ اعلیٰ حضرت کا پرائیوٹ سکرٹری کوئی انگریز مقرر کیا جائے۔ ریاست کے اندرونی مناقشات سے یقیناً آزاد ہوگا اور ذاتیات کی کش مکش سے دُور رہے گا۔ کہا جاتا ہی کہ نواب محسن الملک اس تجویز کے سب سے پہلے محرک تھے۔ ممکن ہی کہ مدار المہام نے بھی اس تجویز کو بنظر استحسان دیکھا ہو۔ کیوں کہ وہ مولوی سید حسین (عماد الملک) کی طرف سے مطمئن نہ تھے، جن کو آج کل ایک گونہ رسوخ حاصل تھا۔ رزیڈنٹ نے بھی

قدرتاً ایک انگریز کے تقرر کو پسند کیا ہوگا۔ غرض جو اسباب بھی ہوں یہ تجویز کامیاب رہی اور والیسرائے کے جانے کے قریباً دو ماہ بعد ۲۷ ربیع الثانی سنہ ۱۳۰۴ھ کو کرنل مارشل کا تقرر ۳ ہزار روپیہ ماہوار پر عمل میں آیا اور وہ اعلیٰحضرت کے معتمد پیشی قرار پائے۔ وہ اس سے پہلے ریاست چمبا میں کام کر چکے تھے اور شمالی ہند میں کلکٹر رہ چکے تھے۔ علاوہ پرائیوٹ سکرٹری کے فرائض کے صرفِ خاص کی نگرانی بھی اُن کے ذمہ کی گئی اور جیسا کہ ایک انگریز سے توقع کی جاسکتی ہے انھوں نے تھوڑی مدت میں کافی اقتدار حاصل کر لیا۔

سر سالار جنگ کا استعفا اور سر آسمان جاہ کا منصب وزارت پر فائز ہونا

لارڈ ڈفرن کی آمد اور کرنل مارشل کے تقرر سے جو امیدیں قائم کی گئی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں اور والیسرائے کی آمد کے قریباً پانچ ماہ بعد دفعتاً اعلیٰحضرت کا یہ فرمان ۲۴ رجب سنہ ۱۳۰۴ھ کو شائع ہوا۔ کہ

"ہز اکسیلنسی نواب عماد السلطنت بہادر نے بوجہ علالت مزاج مدار المہامی سے استعفا دیدیا ہے اور تا تقرر مدار المہام دیگر خود اعلیٰحضرت بذات مبارک ریاست کا کام ملاحظہ فرمائیں گے۔"

چنانچہ چند روز تک اعلیٰحضرت بذاتِ خاص مہمات سلطنت کو انجام دیتے رہے اور پیشی کے امور میں کرنل مارشل دخیل کار رہے۔ بعد ازاں اعلیٰحضرت نے نواب بشیر الدولہ (سر آسمان جاہ) کو عہدہ جلیلہ مدار المہامی پر سرفراز فرمایا، نواب ممدوح اُس وقت انگلستان میں تھے جہاں وہ ملکہ وکٹوریہ قیصرۂ ہند کے پنجاہ سالہ جشن جوبلی شرکت کے لئے من جانب ریاست تشریف لے گئے تھے۔ بذریعہ تار اُن کو اعلیٰحضرت کی اس نوازش شاہانہ سے اطلاع دی گئی۔ ۱۴ ذیقعدہ سنہ ۱۳۰۴ھ (م جولائی سنہ ۱۸۸۷ع) کو وہ انگلستان سے واپس آئے اور اعلیٰحضرت کے حضور میں نذر پیش کی۔ اور باقاعدہ طور پر اپنے عہدۂ جلیلہ کا کام ۳۰ جولائی سنہ ۱۸۸۷ء سے شروع کر دیا۔

چند ماہ بعد ۲۵ جون سنہ ۱۸۸۸ء م ۱۴ شوال سنہ ۱۳۰۵ھ کو ایک عظیم الشان دربار خلعت مبارک میں منعقد ہوا اور اعلیٰحضرت نے نواب سر آسمان جاہ کو خلعت دیوانی عطا فرما کر عہدۂ مدار المہامی پر

مستقل فرمایا۔

نواب انتصار جنگ کا معتمد مال گزاری مقرر ہونا

انقلاب وزارت کے کچھ زمانے بعد اعلیٰ حضرت نظام نے دوسرے احکامات کے سلسلے میں مدارالمہام کو لکھا کہ :۔

"مشتاق حسین صاحب معتمد مال بنائے جائیں تو نہایت مناسب امر ہے اور اس کا آپ حکم جاری کردیں۔"

چنانچہ ۱۸ فروری ۱۸۸۸ء (م ۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۰۵ھ) کو یہ حکم جاری کردیا گیا اور نواب لبشیر الدولہ سر آسمان جاہ نے اپنے طور پر نواب انتصار جنگ کو لکھا :

"میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ حضرت بندگانِ عالی نے آپ کو معتمد مال گزاری مقرر فرمایا ہے میں نے ہنوز اپنی درخواست پیش نہیں کی تھی۔ آپ کل مجھ سے سرور نگر میں آکر ملیں۔"

معتمدی کا عہدہ، درجہ اور تنخواہ میں صوبہ داری سے کم تھا، اس لئے نواب محسن الملک معتمد پولیٹیکل و فنانس نے اس مراسلہ کو حسب ذیل الفاظ میں جاری کیا :

"حسب الحکم مدارالمہام سرکار عالی۔ حضرت بندگان عالی متعالی مدظلہ العالی نے بہ فرط مراحم خسروانہ آپ کو معتمد مال گزاری پر سرفراز فرمایا اور آپ کی جگہ نواب اعظم یار جنگ بہادر معتمد مال، صوبہ داری شرقی پر مقرر ہوئے۔ اگرچہ آپ کا موجودہ عہدہ صوبہ داری کا درجہ اور تنخواہ میں معتمد مال سے بڑھ کر ہے مگر چونکہ یہ انتخاب حضرت اقدس و اعلیٰ نے فرمایا ہے اس لئے آپ کا موجودہ درجہ اور مشاہرہ حالیہ بحال اور برقرار رہے گا اور امید ہے کہ خود حضرت اقدس و اعلیٰ کے تقرر سے اس تبدیلی کو آپ باعثِ عزت و افتخار سمجھیں گے۔"

غرض، ۶ جمادی الاولیٰ ۱۳۰۵ھ کو اعظم یار جنگ (مولوی چراغ علی) نے نواب انتصار جنگ سے صوبہ داری کا جائزہ لے لیا۔ نواب لبشیر الدولہ کو قدرتاً اعلیٰ حضرت کے

اس حکم سے مسرت ہوئی کیوں کہ اُن کو نواب انتصار جنگ کی قابلیت، حسن کارگزاری اور وفاداری پر کامل اعتماد تھا اور اپنی صدر المہامی کے زمانے میں وہ اس کا پورا تجربہ کر چکے تھے۔

پولٹیکل پیچیدگیاں اور مشکلات

انقلاب وزارت سے مشکلات کا خاتمہ نہیں ہوا۔ سالار جنگی خاندان اپنی قابلیت اور حسن کارگزاری کی بنا پر مدت سے وزارت پر قابض تھا۔ لہٰذا وزارت کا بظاہر ہمیشہ کے لئے اس خاندان سے نکل کر امیر کبیر کے خاندان میں چلا جانا ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ سر سالار جنگ کے خاندان اور اُن کی پارٹی نے اس انقلاب کی اہمیت کو پورے طور پر محسوس کیا۔ خود نواب عماد السلطنت (سالار جنگ ثانی) پر تو اس قدر اثر ہوا کہ اُن کو رنج و صدمہ کی وجہ سے حیدرآباد میں رہنا مشکل ہو گیا۔ اس لئے وہ کچھ مدت کے لئے یورپ کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

اب ملک میں دو پارٹیاں پیدا ہو گئیں، ایک جماعت جدید مدار المہام کے راستے میں مشکلات پیدا کرنا اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اُن پر حاوی ہونا چاہتی تھی۔ دوسری جماعت ملک کے فائدے کی غرض سے موجودہ دور کو کامیاب بنانا اور مشکلات کا خاتمہ کرنا چاہتی تھی لیکن راستہ پر خطر تھا اس لئے بغیر کافی جد و جہد اور مقابلہ کے کامیابی ممکن نہ تھی ان حالات کی وجہ سے جدید مدار المہام کو اس وقت قدرتاً ایک صائب الرائے مشیر کی ضرورت تھی۔ نواب محسن الملک کو موجودہ عہد سے پہلے سالار جنگی دربار میں بڑا رسوخ حاصل تھا۔ اس لئے وہ دوسری پارٹی کے آدمی سمجھے جاتے تھے سردار دلیر جنگ کی بھی یہ ہی حالت تھی۔ صرف نواب انتصار جنگ ایک ایسے شخص تھے جو اپنے مضبوط کیرکٹر، بے لوث عادات اور اپنے آقا کی وفاداری کی وجہ سے نواب سر آسمان جاہ کے نزدیک قابل اعتماد تھے۔ ان کو کسی خاص پارٹی سے تعلق نہ تھا، نہ ذاتی رسوخ حاصل کرنے کا خیال تھا۔ عہدہ کے لحاظ سے وہ معتمد مال گزاری تھے لیکن ان حالات کی وجہ سے عملاً مدار المہام کے مشیر خاص و معتمد قرار پائے اور چار و ناچار ان کو اس پولٹیکل طوفان کا مقابلہ کرنا پڑا جو اُن کے چاروں طرف برپا تھا۔ انھوں نے سلطنت کے مفاد کی خاطر نواب

سر آسماں جاہ کی وزارت کو قائم رکھنے کے لئے اپنی پوری قوت صرف کردی اور وہ اس مقصد میں کامیاب ہوئے۔ چنانچہ آج بھی حیدرآباد میں ہر شخص اس امر سے واقف ہے کہ نواب سر آسماں جاہ کے عہد وزارت کی کامیابی درحقیقت بہت کچھ نواب انتصار جنگ کے تدبر اور حسن تدبیر پر مبنی تھی۔

سر آسماں جاہ کی مخالف پارٹی براہ راست اعلیٰ حضرت سے تعلق پیدا کرنا اور مدار المہام کے اختیارات کو محدود کرنا چاہتی تھی، کرنل مارشل بھی غافل نہ تھے وہ یہ غور کر رہے تھے کہ ایک مستحکم وزارت کے قائم ہو جانے پر آیا اُن کا پہلا اقتدار باقی رہ سکتا ہے یا نہیں۔ اگرچہ سر آسماں جاہ کی وزارت کا اعلان ہونے پر اُن کے انگلستان آنے سے پہلے کرنل مارشل نے ایک دعوت کے جلسے میں پبلک طور پر وزیر ممدوح کے تقرر پر اظہار مسرت کیا تھا لیکن یورپ کی سیاست میں اس قسم کی تقریریں جو ڈنر وغیرہ کے موقعے پر کی جاتی ہیں ہمیشہ حقیقت پر مبنی نہیں ہوتیں۔

کیبنٹ اسکیم | اسی زمانے میں سید عبدالحق المخاطب بہ سردار دلیر جنگ نے ایک کیبنٹ اسکیم تیار کی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی تیاری میں درپردہ اور لوگ بھی شامل تھے۔ اس تجویز کا یہ مقصد تھا کہ مدار المہام کے اختیارات محدود کر دیئے جائیں اور کیبنٹ میں دو چیف سکرٹری وسیع اختیارات کے ساتھ کام کریں۔ یہاں تک طے کر لیا گیا کہ چیف سکرٹری کے عہدوں پر نواب محسن الملک اور سردار دلیر جنگ مقرر ہونگے۔ اعلیٰ حضرت کو لوگوں نے اسکیم کی منظوری پر راضی کر لیا تھا اور اخبارات میں بھی اس کے متعلق پروپگنڈا جاری تھا۔

نواب انتصار جنگ اور سر آسماں جاہ اس تحریک کو ملک کے لئے مفید نہیں سمجھتے تھے چنانچہ وزیر ممدوح نے نواب انتصار جنگ کے مشورے سے اس معاملے کے متعلق ایک معروضہ اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ جس میں اُنھوں نے لکھا کہ :

"دو چیف سکرٹریوں کے تقرر کی نسبت خانہ زاد قبل اس کے اپنی ناچیز رائے حضرت میں گزارش کر چکا ہے اور اس تقرر سے جن جن خرابیوں کا احتمال ہے ان کو خانہ زاد نے بہت مختصر طور سے ظاہر کر دیا تھا اس لئے

بعد انگریزی اخباروں میں اس مضمون پر بہت سے مضامین تحریر
ہو چکے ہیں اور ان مضامین کا سلسلہ اُس وقت سے شروع ہوا ہے
جب سے سید عبدالحق سردار دلیر الملک بہادر انگلستان سے روانہ ہوئے
مضامین کا طرز صاف اس بات کو بتلاتا ہے کہ وہ کسی کے خاص اشارہ
سے لکھے گئے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں اور چیف سکرٹریوں کے تقرر
کی تجویز نے ترقی کر کے کبینٹ کی صورت پکڑی ہے، یعنی ایک مجلس وزرا
جس میں دو چیف سکرٹری بطور وزرا کے کافی اور وسیع اقتدارات
کے ساتھ مہمات ریاست کو انجام دیں اور بحالت اختلاف مدارالمہام
بھی اپنا ایک ووٹ شامل کریں اور آخر کو ہر ایک اختلافی معاملہ
حضرت کے معتمد کے ذریعے سے حضرت کے تصفیہ کے واسطے پیش
کیا جایا کرے۔

....

اخبارات نے معاملات کی حالت ایسی پیدا کر دی ہے کہ اگر
اس کے برخلاف کچھ لکھا نہ جائے تو اس کا اثر ملک کے عام طبائع پر
بہت برا پہنچتا ہے۔ لہذا میں حضرت سے دو باتوں کی اجازت چاہتا
ہوں ایک یہ کہ خانہ زاد کے خیالات سے جو کچھ کہ اس باب میں ہیں،
صاحب عالی شان بہادر اور حضور والیسرائے کو اطلاع دی جائے،
دوم یہ کہ اخباروں کو بھی اس قدر اطلاع دے دی جائے کہ
دیوان وقت کو "کبینٹ" کی اس تجویز پر عذر رہا اور اس نے اس
معاملہ کو حضرت کی توجہ کے واسطے پیش کیا ہے۔ ذیل میں خانہ زاد "کبینٹ"
کی اس تجویز کی نسبت اپنے خیالات عرض کرتا ہے۔

(۱)۔ کیبنٹ کی ایسی کوئی تجویز ملک کے مناسب حال نہیں ہے، دیوان (وزیر) کا عہدہ اس کے بعد صرف برائے نام رہ جاتا ہے کوئی خاص شخص مہمات ریاست کا ذمہ دار نہ رہے گا۔

۲ - موجودہ معتمدوں میں دو کا اقتدار بڑھا دینے سے خود غرضیوں کو ترقی ہوگی، ذاتی مباحثے بڑھ جائیں گے، کام رُکے گا، سازشیں پیدا ہونگی، ہر ایک کو اپنے فریق اور قوت بڑہانے کی فکر ہوگی۔ ملک اور ملک کی غریب رعایا کی فلاح اور بہبودی کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی کسی کو فرصت نہ ہوگی۔ اس پژمردگی اور افسردگی کی حالت میں خانہ زاد سے اس بڑے عہدہ کے فرائض اور ذمہ داری کسی طرح بجا نہ لائی جاسکے گی جس پر حضرت نے خاوندی سے مقرر فرمایا ہے۔

۳ - ایک اور اعتراض جو اس تجویز پر وارد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایسی کسی تجویز کے بعد اُن امرائے دولت کا درجہ انتظام میں کیا ہو جائے گا جو اس وقت معین المہاموں کے نام سے انتظام ملک میں شریک ہیں اور جو بلحاظ اپنے درجۂ امارت اور بلحاظ اپنے عہدہ کے صحیح طور سے وزارت میں شریک ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں اور درحقیقت شریک ہیں۔

کیا وہ دو معتمد جو اب تک ان امیروں کے سامنے بطور اُن کے معتمد کے کام کرتے رہے ہیں۔ آیندہ اُن پر حکومت کریں گے اور اگر ایسا ہو تو کیا وہ امیر اور نیز تمام ملک اس کارروائی کو حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھے گا۔"

۴ - اخباروں میں بہت زور دے کر اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ زمانے کی ترقی یافتہ حالت اب اس بات کی مقتضی نہیں

ہو کہ ملک کا انتظام نہایت لائق شخصوں کے ہاتھ میں نہ ہو۔ اس دلیل پر زور دینے والے حقیقت میں اُس پالیسی کے خلاف کرتے ہیں جس سے حضرت نے اس بات کو مناسب خیال فرمایا ہو کہ مدار المہامی کا عہدہ حضرت کے امرا میں سے کسی کے ہاتھ میں رہے اور چونکہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہو جس کو حضور فیصل فرما چکے ہیں تو اب جو لوگ اس بات کے ساعی ہیں کہ مدار المہام اور اس کے اقتدارات اور عزتوں کو امیروں کے گروہ سے چھین کر ملازموں کے گروہ پر منتقل کریں وہ اپنا وقت ایک بے کار کوشش میں صرف کرتے ہیں کم سے کم ان کو بھی ایک کافی وقت اس انتظار میں بسر کرنا چاہیئے تھا کہ وزارت کا جو انتخاب حضرت نے فرمایا اُس کا نتیجہ ملک کے حق میں کیا نکلتا ہو۔ اس کے بعد اگر کسی تبدیلی کی درحقیقت ضرورت ہو تو مجھ سے زیادہ دوسرا کوئی شخص تبدیلی کا خواہشمند نہ ہو گا۔ لیکن کسی حالت میں بھی یہ رائے کبھی نہ ہو گی کہ عنان حکومت ایسے دو معتمدوں کے ہاتھ میں چھوڑ دی جائے جن کا نہ مزاج ایک ہو نہ اخلاق ایک ہو اور جن میں سے ایک کی نسبت کوئی تجربہ کام اور انتظام کی نسبت بھی نہیں ہوا ہو + + + + ایسے دو معتمدوں کو آزاد اختیارات دینے سے بجز فساد اور تکلیف کے کسی وقت بھی سلطنت کے لئے راحت کا زمانہ پیدا نہ ہو گا۔

....

۵ - کمیٹی اور کیبنٹ اور کونسل نہ آج ملک کے لئے مفید ہو نہ ابھی اور پچاس برس تک اس کی توقع ہو سکتی ہو پھر بھی یہ ضرور ہو گا کہ باہر کا منتظم جو نقشہ انتظام کا قائم کرے گا وہ موجودہ نقشے سے بالکل متغایر ہو۔

آج جو باغ جس وضع و قطع پر قائم ہی کل یہ اس وضع اور قطع پر قائم نہ رہے گا۔ بہت سے پھول اور چمن اور خوب صورت روشیں اور شاندار عمارتیں اور زرق برق کے سامان جن جن مواقع پر دکھلائی دیتے ہیں اس باہر کے باغبان کی نگاہ میں یہ سب بدقطع اور بدنما معلوم ہوں گے وہ ان سب شان و شوکت کی چیزوں کو یک قلم دور کرے گا اور اُن کی جگہ کہیں صرف سادہ سادہ سبزہ گھاس کا تختا لگا دے گا کہیں صرف ناہموار میدان چھوڑ دے گا، کہیں حوض اور کہیں روشیں قائم کرے گا پھولوں کی جگہ کانٹے لگائے گا اور کہیں کانٹوں کی جگہ پھول۔ مہذب دنیا کی نگاہ میں تو وہ نقشہ بہت اچھا ہوگا مگر سوال یہ ہی کہ آیا یہ تبدیلی ملک کے عام طبائع کے مناسب ہوگی! اور اس کا جواب نہایت صاف ہی کہ ہرگز نہیں!

زمانہ بے شک ترقی کرتا چلا جاتا ہی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم بھی اپنے انتظام میں اور اپنے منتظموں کی حالت میں ترقی نہ کریں تو ہم اپنے درجے کو بہت پست کر دیں گے لیکن یہ ایک نہایت ضروری بات ہی کہ ہر ایک ترقی ملک کی طبیعت کے مناسب ہونی چاہیئے۔ نواب سر سالار جنگ مرحوم کا زمانہ اسی وجہ سے نہایت عزت کے ساتھ یاد رکھنے کے لائق ہی کہ اُنھوں نے ترقی کے ہر ایک زینہ پر قدم رکھتے وقت ملک کے لوگوں کی طبیعت کا بہت پورا پورا خیال رکھا ہے!

سر آسمان جاہ کے علاوہ عام رائے بھی اس اسکیم کے موافق نہ تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ اعلیٰ حضرت کی طرف سے رزیڈنٹ کو خط بھجوا دیا گیا اور معاملہ بغرض فیصلہ والیسرائے تک پہنچ گیا تھا اور پارلیمنٹ میں بھی اس کے متعلق سوالات ہو چکے تھے۔ اس لئے اس تجویز کے مسترد کرنے میں

دشواری پیش آئی لیکن اعلیٰ حضرت کی توجہ اور استقلال کی وجہ سے یہ مصیبت ملک پر سے ٹل گئی۔

مہمات ملکی اور نواب سر آسمان جاہ

اگرچہ نواب سر آسمان جاہ کی تحدید اختیارات کا معاملہ اس وقت ٹل گیا تھا اور اُن کو بحیثیت ایک مدار المہام کے پورے اختیارات حاصل تھے، لیکن بااین ہمہ جو اہم ملکی معاملات اس وقت درپیش تھے اُن سے عہدہ برآ ہونا سہل نہ تھا۔ چنانچہ تمثیلاً ان معاملات کے متعلق بالاختصار لکھا جاتا ہے۔ تفصیل مناسب موقع پر آئے گی۔

سب سے اہم معاملہ ایک پیش کش کا تھا۔ پنجدہ پر روس اور برطانیہ کے مابین جنگ چھڑ جانے کا خطرہ تھا۔ اعلیٰ حضرت نے اس موقعے پر ہندوستان کی حفاظت اور گورنمنٹ کی اعانت کے لئے ۲۰ لاکھ روپیہ نقد عطا کرنے کا وعدہ کرلیا۔ اس پیش کش کی تجویز کرنل مارشل او عبدالحق (سردار دلیر جنگ) نے کی تھی اور اعلیٰ حضرت نے اس کے خط پر اپنے دستخط کئے تھے جس کو کرنل مارشل نے وائسرائے کے سامنے پیش کیا، عجیب بات یہ ہے کہ مدار المہام کو اس واقعہ کی مطلق خبر نہ تھی، اُن کو اُس وقت معلوم ہوا جب اعلیٰ حضرت اقرار کر چکے تھے۔ گویا معاملہ قابو سے باہر ہو چکا تھا۔ سر آسمان جاہ کے لئے یہ موقع نہایت نازک تھا، ایک طرف تو اعلیٰ حضرت یہ گراں قدر رقم پیش کر چکے تھے۔ دوسری طرف ریاست کی مالی حالت ناقابلِ اطمینان تھی اور احتیاط و کفایت شعاری کی سخت ضرورت تھی۔ اسی سلسلہ میں یہ تحریک زیر بحث تھی کہ بجائے نقد روپیہ کے ریاست کی طرف سے امپریئل گورنمنٹ کے لئے ایک فوج مرتب کی جائے جو ضرورت کے وقت کام آیا کرے، دوستانہ تعلقات کے لحاظ سے ریاست کو بر وقت ضرورت فوجی امداد دینے میں تامل نہ تھا لیکن اس وقت درحقیقت کسی فوجی مدد کی ضرورت نہ تھی اور نہ خزانہ اس بار کا متحمل ہو سکتا تھا۔

کرنل مارشل کا اس معاملہ میں جو رویہ تھا وہ کچھ تعجب خیز نہیں۔ اُن کی نیک نامی اور کارگزاری اسی میں تھی کہ وہ بغیر توسط مدار المہام کے اعلیٰ حضرت اور رزیڈنٹ (یا وائسرائے) کے مابین سلسلۂ مراسلت و معاملت قائم کر دیں۔ دوسرے یورپین حکام بھی علیٰ قدر مراتب

ان معاملات میں حصہ لیتے تھے۔

حیدرآباد کی یہ حالت اب باہر کے لوگوں پر بھی مخفی نہ تھی اور مختلف حلقوں میں یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ موجودہ حالت قابل توجہ اور اصلاح ہے۔ چنانچہ ہم ایک شریف طینت انگریز مسٹر رابرٹ نائٹ کے ایک خط کا ضروری حصہ نقل کرتے ہیں۔ یہ صاحب اس زمانے میں اخبار اسٹیٹمین کلکتہ کے اڈیٹر تھے اور ہندوستانی والیان ملک کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے، ریاست حیدرآباد کے متعلق بھی بعض خدمات انھوں نے انجام دی تھیں۔ وہ لکھتے ہیں :-

"میں صاف طور سے دیکھ رہا ہوں کہ وہ وقت آگیا ہے کہ ہم ایک کاری ضرب اس طریق عمل پر لگا سکیں جس سے یہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ ہندوستانی رؤسا اپنی ریاستوں پر خود مختارانہ حکومت کر رہے ہیں حالانکہ تمام حکومت رزیڈنٹ اور پولٹیکل ایجنٹ کے ہاتھ میں ہے اس واسطے میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ میرے پیارے دوست آپ مجھے امداد دیجئے تاکہ ہم یہ سخت جوا اُن کی گردنوں پر سے اُٹھا کر پھینک دیں۔

وائسرائے کو تو اس انتہائی مداخلت کا گمان بھی نہیں جو یہ ایجنسیاں ریاست کے معاملات میں کرتی رہتی ہیں آپ مجھے اس ظلم اور بُرائی کے انسداد کرنے میں نہ صرف حضور نظام کی وجہ سے ملکہ اور دوسرے ہندوستانی رئیسوں کی آزادی حاصل کرنے کے واسطے امداد دیجئے۔ جو ایک بے بسی کے عالم میں اس ظلم اور استبداد کو برداشت کئے ہوئے ہیں اور اس کے رفع کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کر سکتے۔

آپ کی رہائی اور آزادی کا وقت قریب ہے، لیکن اگر اس کے بعد بھی آپ کمزوری کے ساتھ کرنل مارشل اور نیول اور کا ڈری (ڈنڈ نیٹلم) کو ڈھیل دیتے جائیں گے تو پھر یہ باتیں بالکل قبضہ اقتدار سے باہر ہو جائینگی"۔

ان سیاسی مشکلات کے علاوہ دو پیچیدہ اور مہتم بالشان مسئلے ریلوے اور معدنیات کے اجارہ کے متعلق تھے۔ ان معاملات کا تعلق درحقیقت سر سالار جنگ اعظم کے زمانے سے تھا عبدالحق (سردار دلیر جنگ) نے جو ریلوے اور معدنیات کے ڈائرکٹر تھے، ان معاملات کے متعلق ابتدائی کارروائیاں اور معاہدات کئے تھے اور ایک خاص اسکیم تیار کی تھی۔ سرکاری اور کاروباری حلقوں میں اُن کا خاص اثر تھا اور مالیات میں وہ بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے۔

نواب انتصار جنگ نے ریلوے کی اسکیم پر زبردست نکتہ چینیاں کی تھیں۔ نیز معدنیات کے اجارہ میں جو پُرفریب کارروائیاں گورنمنٹ نظام کو نقصان پہنچانے والی عمل میں آئی تھیں اُن کو معلوم کرلیا تھا۔ اب معاملات منظر عام پر آگئے تھے اور ہندوستان و انگلستان میں ضابطہ کی کارروائیاں شروع ہو چکی تھیں، گورنمنٹ نظام کے بعض اعلیٰ عہدہ دار اس مقصد کے لئے انگلستان روانہ کردیئے گئے تھے اور حیدرآباد میں نواب انتصار جنگ بڑی سرگرمی سے کام کر رہے تھے اور انگلستان کے کام کرنے والوں کو ہدایات روانہ کرتے تھے، ان معاملات نے نواب سرآسمان جاہ کی مشکلات میں اضافہ کردیا تھا اور سردار دلیر جنگ اور ان کی پارٹی وزیر ممدوح اور اُن کے منشیر نواب انتصار جنگ کی پوری مخالف ہو چکی تھی۔

شملہ کا سفر اور لارڈ ڈفرن سے ملاقات

یہ حالات تھے جب کہ ان معاملات اور دوسرے اہم امور پر والیسرائے سے گفتگو کرنے کے لئے جولائی ۱۸۸۸ء میں نواب سرآسمان جاہ نے شملہ کا سفر کیا۔ نواب انتصار جنگ اور متعدد عہدہ دار ہمراہ تھے، تمام معاملات پر عمدہ طریقے سے گفتگو ہوئی، چونکہ سردار دلیر جنگ نے مخالفت کی وجہ سے نواب انتصار جنگ کو بہت بدنام کیا تھا اور گورنمنٹ ہند کے اعلیٰ عہدہ داروں کو اُن سے بدگمان کرانا چاہا تھا اس لئے نواب سرآسمان جاہ نے یہ مناسب سمجھا کہ اس موقعے پر ان واقعات کی تردید کردی جائے چنانچہ انھوں نے مسٹر ڈیورینڈ فارن سکرٹری کو ایک خط لکھا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ لارڈ ڈفرن، نواب انتصار جنگ کو شرف باریابی عطا کریں۔ چونکہ اس خط سے یہ پتا چلتا ہے کہ سرآسمان جاہ کے تعلقات نواب انتصار جنگ

کے ساتھ کس قسم کے تھے۔ لہذا اُس کا نقل کرنا بے موقع نہ ہوگا، نواب ممدوح لکھتے ہیں :-

"مائی ڈیر مسٹر ڈیورنڈ،

بعد ان بے شمار عنایتوں کے جو گورنمنٹ ہند کی طرف سے ریاست حیدر آباد اور میری ذات خاص کی نسبت مرعی ہوئی ہیں میرے خیال میں اس امر کی ضرورت نہیں ہے کہ میں کوئی درخواست کروں۔ مگر چوں کہ میری خواہش ہے کہ ریاست کے اعلیٰ عہدہ دار بھی جو ذمہ داری کے عہدوں پر مامور ہیں گورنمنٹ ہند کے اعتبار میں حصہ حاصل کریں، اس لئے مجکو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے سکرٹری مولوی مشتاق حسین نواب انتصار جنگ بہادر کے متعلق بعض واقعات آپ کے گوش گزار کروں بالتخصیص اس واسطے کہ مجکو اس امر کے باور کرنے کی وجہ ہے کہ جس زمانے میں کہ سردار عبدالحق با اقتدار تھے اس وقت اُنھوں نے مسٹر کاڈری (رزیڈنٹ) کے خیال کو نواب صاحب موصوف کی طرف سے ضرور خراب کر دیا ہوگا۔

مولوی مشتاق حسین ممالک مغربی و شمالی کے باشندہ ہیں بارہ برس سے زیادہ عرصہ ہوا کہ سر سالار جنگ مرحوم نے آنریبل سر سید احمد خاں بہادر سے استصواب کے بعد مولوی صاحب کو علی گڑھ سے طلب کیا جہاں وہ گورنمنٹ انگریزی کے ملازم تھے اور گورنمنٹ موصوف کی ملازمت چودہ برس تک مختلف عہدوں پر بہت ناموری کے ساتھ کی تھی اور جب کہ میں صدر المہام عدالت کا عہدہ رکھتا تھا وہ میرے معتمد مقرر کئے گئے تھے سر سالار جنگ مرحوم کے آخر زمانے میں اُن کی ترقی خود اُن کی معتمدی عدالت کوتوالی تک ہوگئی تھی اور پیشکار صاحب کی چند روزہ مدار المہامی تک بھی وہ اس عہدہ پر قائم رہے

مدار المہام مستعفی (سر سالار جنگ حال) نے، اُن کی ترقی
بورڈ آف ریونیو (مجلس مال گزاری) کی ممبری پر کر دی جس کے باعث
اُن کی تنخواہ میں ۵۰۰ کا اضافہ ہوا یعنی اب تنخواہ سترہ سو ۱۷۰۰ روپیہ ماہوار
ہو گئی۔ بعد شکستگی محکمہ بورڈ ریونیو کے مولوی مشتاق حسین سمت مشرقی
کے صوبہ دار چار برس تک رہے جس میں کل ریاست کا چہارم حصہ شامل
ہے اور اس عہدہ پر اپنے فرائض کو قابل نظیر ناموری اور محنت کے ساتھ
انجام دیا کہ اس صوبہ کے لوگوں کو بہت عرصہ تک ان کو یاد کرنے کے
واسطے وجہ ہے۔ بالفعل میری گورنمنٹ میں معتمد مال ہیں جس جگہ کے واسطے
اُن کو مدار المہام مستعفی اور اُن کی علیحدگی کے بعد حضور پرنور نے منتخب
فرمایا اور جو ایک بڑی ذمہ داری کا عہدہ ہے۔ علاوہ اپنے فرائض معتمدی
مال کے وہ معتمدی پولٹیکل اور فنانس کا کام بھی کرتے ہیں جب سے کہ
نواب محسن الملک انگلستان کو بھیجے گئے ہیں۔

بلحاظ اس نہایت عمدہ رائے کے جب سے کہ مجکو اُن سے واقفیت
ہوئی ہے میں نے اہم کاروبار کا نفڈنشل معاملات میں ہمیشہ اُن کی صلاح
سے فائدہ حاصل کیا ہے۔ جب سے کہ میں مدار المہامی پر مامور ہوا ہوں
نواب انتصار جنگ بہادر نے علاوہ اپنے فرائض مختص کے عام طور پر
میرے پرسنل اسسٹنٹ اور مشیر معتمد علیہ کے کام کیا ہے اور چونکہ
لوگوں کو بھی اُن کی قابلیت اور ایمان داری پر ایسا ہی اعتبار ہے
جیسا کہ مجکو ہے لہذا معاملات سرکاری میں اُن کی عام مداخلت بالعموم
رعایا کی مزید طمانیت کا باعث ہوئی ہے وہ اپنے کام کو سچی ایمانداری
سے اور بغیر نمائش کے کرتے ہیں، وہ انگریزی نہیں جانتے مگر ایسا

دماغ قدرتی رکھتے ہیں جو صرف لبرل تعلیم ہی سے مرتب ہوتا ہے،
سرکار عالی کو جو کامیابی عبدالحق کے مقابل میں ہوئی، اس کا ایک بڑا
حصہ نواب موصوف ہی کی خیرخواہانہ اور بے غرضانہ کوششوں کا
نتیجہ ہے۔

رزیڈنٹ صاحب کو جو موقع پر موجود ہیں ان سب واقعات کے
جاننے کا کافی موقع ہے مگر بوجہ اس کے کہ میں حسب اتفاق گورنمنٹ ہند
کے ہیڈ کوارٹر میں موجود ہوں، میں نے ان واقعات کو آپ کے
گوش گزار کرنا مناسب خیال کیا اور مجھکو امید ہے کہ آپ براہ مہربانی
میرے ان خیالات سے ہز اکسیلنسی وایسرائے بہادر کو بھی مطلع کرنے
سے مجھکو ممنون کرینگے۔ میں بلاشک نہایت مشکور ہوتا اگر ہز اکسیلنسی
میرے اس چند روزہ قیام کے عرصہ میں نواب صاحب موصوف کو
چند منٹ کی باریابی کی عزت بخشتے اور اس طرح پر وہ خود اس عہدہ دار
کو جس کی نسبت میں ایسی عمدہ رائے رکھتا ہوں دیکھ لیتے"[۱]

اس خط کے پہنچنے کے بعد، ۷ اگست ۱۸۸۸ء کو لارڈ ڈفرن نے نواب انتصار جنگ سے
پرائیویٹ ملاقات کی اور عمدہ طور پر پیش آئے۔

---

[۱] نواب سر آسمان جاہ نے ۹ اگست ۱۸۸۸ء کو حسب ذیل چھٹی مسٹر ہاول رزیڈنٹ کو بھیجی۔
"مائی ماڈیر مسٹر ہاول، میں آپ کی اطلاع کے واسطے ایک چھٹی کی نقل ملفوف کرتا ہوں، جو مسٹر ڈیورنڈ کو بمقام شملہ مولوی مشتاق حسین نواب انتصار جنگ کی بابت بھیجی گئی تھی میں نہایت خوشی سے بیان کرتا ہوں کہ ہز اکسیلنسی وایسرائے بہادر نے میری درخواست کو منظور فرمایا۔ اس لئے نواب صاحب موصوف کو، ۷ تاریخ کو ایک خانگی ملاقات کا اعزاز حاصل ہوا، اور لارڈ ڈفرن نے ان سے بہت مہربانی سے ملاقات اور گفتگو کی۔ واضح ہو کہ جب کہ مسٹر فریدوں جی نے بذات خود یہ چھٹی مسٹر ڈیورنڈ کو دی تو انھوں نے صاحب موصوف سے ان حالات کو بھی بیان کر دیا کہ نواب صاحب موصوف کس طرح چند سال پہلے ملازمت سرکار عالی سے علیحدہ کئے گئے تھے اور ان کو حیدرآباد سے باہر رہنے کی ہدایت ہوئی تھی میں سمجھتا ہوں کہ مسٹر ڈیورنڈ نے اس مقدمہ کی مثل کو معائنہ کرنے کے بعد مجھکو لکھا کہ جناب وایسرائے، مشتاق حسین سے ۷ تاریخ کو سہ پہر کے وقت ملیں گے۔ آپ کا مخلص
آسمان جاہ

انتظام مال گزاری اور مفید اصلاحات

نواب انتصار جنگ نے اپنے جدید عہدے کا کام ایسی حالت میں شروع کیا جب کہ مختلف پارٹیاں اپنی ذاتی اغراض وحصول اقتدار کے لئے مصروف کش مکش تھیں۔ اس لئے نہایت حزم و احتیاط سے کام کرنے کی ضرورت تھی، ایک مخصوص دشواری اُن کے لئے یہ تھی کہ دوسرے اعلیٰ عہدہ داروں کی طرح اُن کی کوئی پارٹی نہ تھی جو کسی نازک موقعے پر جا و بے جا اُن کی حمایت کے لئے مستعد ہو جاتی، پارٹیاں بنا کر اقتدار حاصل کرنے سے اُن کو ہمیشہ سے نفرت تھی ان حالات کے لحاظ سے وہ گویا اپنے چالاک حریفوں کے مقابلے میں بالکل یکہ و تنہا تھے، اُن کو جو کچھ کامیابی ہوئی وہ محض اخلاص استقامت، راست بازی اور اعتماد علی النفس کی بنا پر تھی۔

اس عہدے پر آنے کے بعد اُن کو ایک طرف تو بحیثیت معتمد مال گزاری جدید انتظامات و اصلاحات میں مصروف ہونا پڑا۔ دوسری طرف بحیثیت مشیر مدار المہام وہ ملک کی اندرونی اور بیرونی سیاست میں کبھی خفیہ اور بے ضابطہ اور کبھی باقاعدہ وعلانیہ حصہ لینے پر مجبور ہوئے، اُن کی زندگی کا یہ دور اگرچہ مختصر ہی لیکن نہایت دل چسپ و پراسرار ہے۔ حیدر آباد کا یہ زمانہ بھی ایک خاص زمانہ تھا، جب کہ یورپ اور ہندوستان کے بڑے بڑے نامور۔ پولیٹیکل شاطر وہاں جمع تھے اور ہر شخص اپنے مخصوص اغراض کے مطابق جوڑ توڑ اور سازش میں مصروف تھا بڑی بڑی شان دار ہستیاں پس پردہ عجیب و غریب حرکات میں مشغول نظر آتی تھیں۔ نواب انتصار جنگ کی دقیقہ رس اور راز شناس نگاہیں دور سے یہ سب تماشا دیکھتی تھیں۔ لیکن وہ عموماً مداخلت سے احتراز کرتے تھے۔ البتہ جب یہ دیکھتے تھے کہ یہ حرکات اب اس حد تک پہنچ گئی ہیں کہ سلطنت کے لئے مضر ہیں تو اچانک اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے تھے اور دفعتہً یہ سارا طلسم ٹوٹ جاتا تھا۔ اور لوگ حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتے تھے۔ آخر زمانے میں تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اُن کے مخالفین مرعوب اور خوف زدہ ہو گئے تھے اور

ہر لمحہ یہ محسوس کرتے تھے کہ نواب انتصار جنگ کی بیدار اور خوف ناک نگاہیں اُن کے دلوں کے بھید ٹٹول رہی ہیں۔

اس عہد کے واقعات اگر منظرِ عام پر آئیں تو لوگ اُن سے بہت کچھ عبرت وبصیرت حاصل کر سکتے ہیں لیکن افسوس کہ یہ ممکن نہیں، اکثر واقعات سلطنت کے "صیغۂ راز" سے تعلق رکھتے ہیں اور اگرچہ باہر والے بھی اُن کے متعلق کچھ نہ کچھ واقفیت رکھتے ہیں تاہم جب تک اصلی کاغذات پر دسترس نہ ہو اُن کا لکھنا کسی طرح مناسب نہیں۔ بعض واقعات ایسے ہیں کہ جن لوگوں سے متعلق تھے اُن کے ساتھ دفن ہوگئے اور اب دنیا کبھی اُن سے واقف نہ ہوگی، کچھ واقعات ایسے بھی ہیں جو اُن لوگوں سے متعلق ہیں جو ان سیاسی کھیلوں میں حصہ لے چکے ہیں، لیکن ان میں سے بعض اشخاص جو جنگی وملکی خطابات سے ممتاز ہیں آج بھی زندہ ہیں۔ اگرچہ امتداد زمانے نے اُن کے اعمال نامے پر پردہ ڈال دیا ہے مصلحت کا یہ تقاضا ہے کہ ابھی یہ پردہ کچھ مدت اور پڑا رہے۔

ان حالات ومصالح کے بعد صرف چند واقعات یا انتظامی معاملات ایسے رہ جاتے ہیں جو بیان کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان واقعات سے بھی بخوبی اُن کی ملازمت کے اس دور کی شائستہ خدمات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

انعامات کا انتظام

حیدرآباد میں جاگیر کی ایک قسم کا نام التمغہ یا انعام ہے۔ یہ موروثی اور دوامی ہوتی ہے جو سلطنت کی طرف سے رعایا کو کسی خاص خدمت یا کارِ خیر کے لئے یا بطور مددِ معاش دی جاتی ہے۔ جن لوگوں کو یہ جاگیریں ملتی ہیں وہ انعام دار کہلاتے ہیں اور اُن سے عموماً زمین کا کچھ محصول نہیں لیا جاتا، اس قسم کے ہزاروں انعام دار ریاست میں موجود تھے۔

سنہ ۱۲۷۵ف میں نواب مختار الملک سر سالار جنگ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس امر کی تحقیقات کرنا چاہیے کہ انعام کے نام سے اراضی پر لوگوں کا جو قبضہ ہے وہ جائز ہے یا غاصبانہ۔ چنانچہ یہ کام تعلقہ داران اضلاع کے متعلق کیا گیا، لیکن جب یہ کام زیادہ بڑھ گیا تو سنہ ۱۲۸۵ف میں

ایک خاص محکمہ اس مقصد سے قائم کیا گیا اور ایک انگریز مسٹر چارلس اس محکمہ دریافت انعام کے مہتمم مقرر ہوئے۔ یہ انتظام ۱۲۹۱ف تک جاری رہا لیکن چونکہ ایک عہدہ دار کام کو بوجوہ انجام نہیں دے سکتا تھا اس لئے ایک مجلس انعام قائم کی گئی جو ۳ ارکان پر مشتمل تھی۔ یہ مجلس اردی بہشت ۱۲۹۴ف تک قائم رہی۔ طریقہ کار یہ تھا کہ انعامات کے متعلق اسناد طلب کر کے اُن کی جانچ کی جاتی تھی۔ اگر سند موجود ہوتی تھی تو جاگیر بحال رکھی جاتی تھی ورنہ ضبط کر لی جاتی تھی۔ نیز یہ کہ جن اشخاص کے قبضے کا ثبوت ہوتا تھا لیکن قبضے کی مدت ۴۰ سال سے کم ہوتی تھی اُن کی زندگی میں صرف دو پشت کے لئے بحال رکھی جاتی تھی۔ اسی سال جب انسپکٹر جنرل مال نے بہت سی فریبانہ کارروائیوں اور جعل سازیوں کا انکشاف کیا تو آخر کار اُن کو ہنگامی طور پر کمشنر انعام مقرر کیا گیا اور اُن کو دو مددگار دیئے گئے تاکہ ان مقدمات پر نظر ثانی کی جائے جن میں جعل سازی کا احتمال ہے۔ اس کے بعد مستقل طور پر اس سررشتہ کا انتظام کیا گیا۔ خاص حیدرآباد میں ایک کمشنر اور ہر صوبے میں ایک ڈپٹی کمشنر انعام مقرر کیا گیا اور ان عہدہ داروں کو مناسب اختیارات عطا کئے گئے۔

اس تحقیقات کا یہ نتیجہ نکلا کہ بہت سے لوگ اپنے ذریعہ معاش سے محروم ہو گئے کیوں کہ ثبوت نہ دے سکنے کی وجہ سے اُن کی اراضی ضبط ہو گئی۔ تحقیقات میں خاص طور پر سختی کی جاتی تھی اور جن لوگوں کا قبضہ زمانہ دراز سے ثابت ہو جاتا اُن کی زمین بھی دواماً بحال نہیں کی جاتی تھی، آخر کار نواب انتصار جنگ نے اس حالت کو محسوس کیا اور نواب سر آسمان جاہ کو بتایا کہ اس طریقے سے رعایا کی کس قدر حق تلفی ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک خاص حکم ۱۷ شوال ۱۳۰۵ھ کو جاری کیا گیا جو گشتی نمبر ۲۰ کے نام سے شہرت پزیر ہوا، اس حکم میں یہ بتایا گیا کہ :-

> "مدار المہام سرکار عالی بعد کافی غور و خوض کے خیال فرماتے ہیں کہ یہ کارروائی جس سے صدہا سال کے قابض بے دخل ہوئے جاتے ہیں۔ انعام داروں کے حق میں سخت مضر ہے اور سرکار عالی کا کبھی

یہ منشا نہیں ہوا کہ اپنی رعایا کے اُن بڑے گروہوں کو جو مدت ہائے دراز سے اور نسلاً بعد نسلٍ چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی پر قابض چلے آتے ہیں اور وہی اُن کا ذریعۂ معیشت ہی اُن کے اراضیات مقبوضہ سے بے دخل کر کر اُن کو ایک سخت تکلیف میں مبتلا کر دے پس نواب مدار المہام سرکار عالی صاف طور سے ارشاد فرماتے ہیں کہ جب کوئی زمین انعام ماقبل ۱۲۶۴ف؁ زائد از چالیس سال انعامداروں کے قبضے میں رہے تو اس کو دواماً بحال کرنا چاہیئے نہ کہ ایک پشت یا دو پشت کی قید سے ''

نیز سرکار کو معلوم ہوا ہی کہ انعام کمیشن کے افسر قبضہ کی مدت کا تصفیہ کرنے میں کبھی غلطی کرتے ہیں اُن کا خیال ہوتا ہی کہ جس سال سے سرکاری دیہی دفاتر میں قبضہ کا داخلہ برآمد ہو اسی سال سے قبضہ کو تسلیم کرنا چاہیئے ۔ وہ صرف شہادت کو معتبر نہیں سمجھتے لیکن اس عام پابندی کو بھی سرکار عالی رعایا کے حق میں بہت سخت اور بسا اوقات ناانصافی کا موجب سمجھتی ہی ۔ بے شک وہ شہادت جس کی تائید دفتری داخلوں سے ہوتی ہی زیادہ مستحکم خیال کی جاتی ہی لیکن کبھی یہ بھی ممکن اور اکثر ممکن الوقوع ہی کہ انعامداروں کا قبضہ جس مدت سے ہی اس مدت کے سرکاری کاغذات موجود نہیں ہیں پس خواہ مخواہ سرکاری دفتر کے داخلہ پر تجویز کی بنیاد قائم کرنی ضرور نہیں ہی ۔

انعام کمیشن کے افسروں کا کام آیندہ شہادت لینے کی نسبت بہت اہم ہو گیا ہی اور مدار المہام سرکار عالی امید کرتے ہیں کہ ہر ایک شہادت جو آیندہ پیش ہو گی بہت ہی احتیاط سے قلمبند

کی جائے گی اور صرف اسی قدر شہادت پر اکتفا نہ ہوگا جو انعام داروں کی طرف سے پیش ہو بلکہ انصاف کا حق ادا کرنے کے لئے جس میں سرکار اور انعام داروں دونوں کا مساوی لحاظ کرنا چاہیئے اگر افسرانِ مجوزہ کے نزدیک کسی مزید شہادت کے بہم پہنچانے کی ضرورت ہو تو اس کو بہم پہنچانے کے لئے بطور فرائض اپنے عہدے کے سعی عمل میں لائیں۔

انعام کمیشن کی جن تجویزوں کا ذکر ہوا ہو اُن کی ناراضی سے جو مقدمات بصیغہ مرافعہ سرکار کے محکمہ مال گزاری میں پیش ہوئے ہیں اُن میں سرکار سے بہ تنسیخ فیصلہ جات ماتحت مناسب احکام جاری کئے گئے ہیں اور جاری کئے جاتے ہیں تاکہ انعام داروں کے حق میں انصاف ہو سکے، لیکن ممکن ہو کہ بہت لوگ اب بھی مرافعہ پیش کرنے سے قاصر رہ گئے ہوں لہذا کمشنر صاحب انعام کو ایما کیا جاتا ہو کہ وہ ایسے مقدمات کی مثلوں کو طلب کر کے تجویز ثانی کا حکم دیں اور تین مہینے کے اندر ایک فہرست ایسے مقدمات کی سرکار کے محکمے میں بھیج دیں۔"

ان احکام کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگوں کے قطعات زمین جو ضبط ہو گئے تھے از سر نو واپس کئے گئے اور جو ہل چل اور بد دلی انعام داروں کے طبقے میں پیدا ہو گئی تھی وہ دور ہو گئی

آبکاری کا جدید انتظام

حیدر آباد میں سیکڑوں چھوٹے بڑے جاگیر دار ہیں، جن کو اُس زمانے میں خاص حقوق وامتیازات حاصل تھے اور اُن میں سے بعض بہت سی قانونی قیود سے بھی مستثنیٰ تھے، ان کو آبکاری کے حقوق بھی حاصل تھے، ان کی جاگیروں میں گل مہوہ وغیرہ پیدا ہوتا تھا اور یہ لوگ اپنے طور پر شراب کشید کر کے فروخت کرتے اور معقول فائدہ اُٹھاتے تھے مگر اصولاً یہ ایک ناموزوں طریقہ تھا اور اس سے بدنظمی پیدا ہوتی تھی۔ اس لئے نواب انتصار جنگ نے یہ چاہا کہ چند خاص شرائط پر آبکاری کے جملہ حقوق جاگیرداروں سے لے لئے جائیں

اور آبکاری کا انتظام بہمہ وجوہ سرکار کی نگرانی میں آجائے۔ چنانچہ انھوں نے ۱۳۱۰ف میں خاص احکام جاری کئے، ان احکام کا شائع ہونا تھا کہ مخالفت کا ایک طوفان برپا ہوگیا اور جاگیرداروں نے اس شدت سے مخالفت کی کہ حیدرآباد میں اس سے پہلے اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، اس قانون کا ماحصل یہ تھا کہ :

جاگیرداروں کو حقوق آبکاری کے معاوضہ میں صرف ایک نقد رقم دے دی جائے اور یہ رقم جاگیرداروں کے اوسط سالانہ آمدنی آبکاری کی پنج گونہ قرار پائی تھی، اور یہ بھی شرط رکھی گئی تھی کہ اس رقم کی ادائگی سے جاگیرداروں کے حقوق کا دوامی تصفیہ ہوجائے گا، مثلاً اگر جاگیردار کو ایک ہزار روپیہ سالانہ آمدنی آبکاری سے حاصل ہوتی ہو تو یہ تجویز تھی کہ اس کو یک مشت پانچ ہزار روپئے دے کر اس کے حقوق آبکاری دواماً لے لئے جائیں۔

اگرچہ حسن انتظام اور گورنمنٹ کے فائدہ کے لحاظ سے یہ تجویز نہایت مناسب تھی لیکن چونکہ بظاہر جاگیرداروں کا اس میں نقصان تھا انھوں نے سخت اختلاف کیا۔ اور اجتماعی طاقت سے کام لے کر فوراً ایک باقاعدہ انجمن قائم کرلی جس میں بڑے بڑے امرا و جاگیردار شریک تھے اور اس کے میر مجلس ایک معمر نواب، اشرف الدولہ رکن الملک خان دوران خاں بہادر تہور جنگ تھے۔ ان لوگوں نے اس تجویز کے خلاف اعلیٰ حضرت کی خدمت میں اڈریس پیش کیا، جلسے منعقد کئے، مضامین چھاپے، غرض ہر طریقے سے مخالفت کی۔

جاگیرداروں کی مخالفت بے اثر نہیں رہی حکومت نے اس معاملہ پر بحث و گفتگو کرنے کے لئے ایک مجلس قائم کی، جس کے میر مجلس نواب وقارالامرا بہادر مقرر ہوئے اور معتمد (سکرٹری) راجہ مرلی منوہر بہادر، ۲۷ صفر ۱۳۱۱ھ کو نواب وقارالامرا کے محل میں اس کا اجلاس منعقد ہوا، جس میں جاگیرداروں کے قائم مقام بھی شریک تھے۔

نواب انتصار جنگ نے بہ حیثیت معتمد مجلس مال گزاری کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے بیان کیا کہ سرکار کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ آپ صاحبوں کے واجبی حقوق میں کوئی دست اندازی کی جائے، اور نقصان پہنچایا جائے، بلکہ منشا صرف اس قدر ہے کہ ممالک محروسہ میں آبکاری کے انتظامات کی تفریق اور تعدد سے اور ایک جگہ انتظام نہ ہونے سے جو خلجان اور بدنظمی ہو رہی ہے وہ دفع کی جائے اور اس غرض کے لئے تجویزات مندرجہ اشتہار کے علاوہ جو تجویز آپ صاحبوں کے خیال میں آئے تو سرکار بخوشی اس پر غور کرنے کے لئے آمادہ ہے۔

انھوں نے یہ بھی کہا کہ مدار المہام سرکار عالی کو آپ کے جن عذرات سے اس وقت تک اطلاع ہوئی ہے، ان کے لحاظ سے سرکار نے اپنی دو تجویزوں میں ترمیم فرما دی ہے۔ ایک یہ کہ منافع آبکاری کا معاوضہ جاگیر داروں کو بجائے پنج سالہ کے دہ سالہ دیا جائے، دوسرے یہ کہ کوئی تفریق قسم اول و دوم مستثنیٰ اور غیر مستثنیٰ نہ کی جائے۔

نواب سلیمان یار جنگ علی یاور الدولہ نے نواب انتصار جنگ سے واجبی حقوق کی توضیح چاہی۔ نواب انتصار جنگ نے جواب دیا کہ جاگیرات کے حقوق آبکاری، تابع ہیں حقوق جاگیرات کے اور جاگیرات کے حقوق کا تصفیہ سررشتہ دریافت انعامات و جاگیرات کے تصفیہ پر منحصر ہے لیکن جب تک ایسی دریافت و تجویز کی نوبت آئے اس وقت تک سرکار کا منشا ہے کہ جس طرح جاگیر دار حقوق آبکاری پر قابض رہے ہیں آیندہ بھی قابض رہیں اور بالفعل صرف ایسا انتظام کرنا منظور ہے جس سے کل ممالک محروسہ کی آبکاری کا انتظام ایک جگہ ہو جائے۔

اس کے بعد جاگیر داروں نے اس معاملہ پر غور کرنے کے لئے دو ماہ کی مہلت طلب کی جو ان کو دی گئی۔

یہ معاملہ نواب انتصار جنگ کے زمانے میں طے نہ ہو سکا، ان کے بعد اس معاملہ کی تنقیح مسٹر اے جے ڈنلاپ صاحب کے متعلق کی گئی اور انھوں نے اپنی معتمدی مال گزاری کے زمانے میں چند تغیرات کے بعد ایک جدید اسکیم مرتب کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ تمام ممالک محروسہ کی آبکاری

کا انتظام تو یک جا ایک نظام کے ماتحت ہو، لیکن گورنمنٹ جاگیرداروں کے حقوق کو بطور اجارہ دوامی حاصل کرلے اور اُن کو ایک معین سالانہ رقم دی جائے (جس کی نوعیت و کیفیت اسکیم میں بیان کی گئی ہے) اُنھوں نے یہ بھی تجویز کیا کہ علاقہ صرف خاص کی آبکاری بھی دیوانی میں ضم کردی جائے غرض مختلف تغیرات اور جاگیرداروں کی منظوری کے بعد ۱۳۲۴ھ م ۱۳۱۵ف میں جملہ جاگیرات و پائگاہ و سمستان وغیرہ کی آبکاری علاقہ دیوانی میں شامل ہوگئی اور جاگیرداروں کو مستقل معاوضہ دینا طے پایا۔

چونکہ آبکاری کے یکجائی انتظام کی تحریک و تجویز سب سے پہلے نواب انتصار جنگ نے پیش کی تھی اس لئے جاگیرداروں کی جماعت میں وہ غیر ہر دل عزیز ہوگئے اور بدنام کئے گئے کہ وہ جاگیرداروں کے دشمن ہیں اور اُن کے حقوق پامال کرنا چاہتے ہیں۔ اس بنا پر ان واقعات کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے تاکہ معاملہ کی حقیقت اچھی طرح واضح ہوجائے، حیدرآباد میں عام لوگ آج تک اس معاملہ کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی تجویز ملک کے لئے مضر تھی۔ حالانکہ اس تجویز کی خوبی اس سے ظاہر ہے کہ معمولی تغیر و تبدیلی کے بعد آخر کار اس پر عمل کرنا پڑا۔

بندوبست | حیدرآباد میں بندوبست کا باقاعدہ کام مولوی سید مہدی علی خاں (نواب محسن الملک) نے شروع کیا، جو سر سالار جنگ اعظم کے عہد میں ناظم بندوبست مقرر ہوئے تھے۔ اُن کے علاوہ نواب انتصار جنگ نے بھی مختلف اوقات میں تلنگانہ کے بندوبست کے متعلق مفید تجویزیں پیش کیں۔ جس زمانہ میں وہ معتمد مال گزاری تھے تو مسٹر اے جے ڈنلاپ ناظم بندوبست تھے۔ مسٹر ڈنلاپ نے تلنگانہ کے بعض "تعلقات" کے بندوبست کا کام انجام دیا۔ اور اس کی مفصل رپورٹ بغرض منظوری نواب سر آسمان جاہ کی خدمت میں پیش کی، نواب ممدوح نے اس رپورٹ پر غور کرنے کے لئے ایک جنرل کمیٹی تجویز کی جس میں بڑے بڑے واقف کار اور معاملہ فہم عہدہ دار مثل نواب محسن الملک بہادر اور مسٹر فریدوں جی جمشید جی وغیرہ کے بطور ارکان شریک تھے۔ نواب

انتصار جنگ اس کمیٹی کے معتمد (سکریٹری) مقرر ہوئے۔

تلنگانہ کے متعدد زمیندار، پٹیل اور پٹواری بھی اس غرض سے طلب کئے گئے اور متعدد مرتبہ کمیٹی نے ان کو اپنے سامنے بلا کر زیر بحث مسائل کے متعلق اُن سے گفتگو کی۔ بقول نواب انتصار جنگ یہ ایسے لوگ تھے

"جن کے ہر رگ و پے میں تلنگانہ کی کاشت اور اس کے مصارف اور منافع کا تجربہ بچپن سے سرایت کئے ہوئے تھا اور جن پر خود اس انتظام کا جو آیندہ ہونے والا تھا اثر پہنچتا تھا۔"

اس کمیٹی نے ۱۱ اجلاس مختلف اوقات میں کئے اور بعد غور و مباحثہ تشخیص جمع وغیرہ کے متعلق بہت سے امور طے کئے جو ریاست کے لئے درحقیقت نہایت مفید ہیں اور اصلاحات کے سلسلہ میں داخل ہیں۔ نواب انتصار جنگ نے ان تمام فیصل شدہ معاملات کو ایک سرکاری مراسلہ کے طور پر مسٹر ڈنلاپ کے پاس بھیجا۔ چونکہ اس طویل مراسلہ میں مقامی معاملات اور بندوبست کی غیر دلچسپ جزئیات سے بحث کی گئی ہے اور جا بجا مخصوص اصطلاحات کا استعمال کیا گیا ہے اس لئے ہم اس کو نظر انداز کرتے ہیں۔ البتہ اس مراسلہ کے آخری حصے کا ایک ٹکڑا نقل کرتے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ رعایا کے متعلق اُن کے جذبات کیسے معتدل اور شریفانہ تھے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"آخر میں اس قدر اور کہنا ضرور ہے کہ تلنگانہ علاقہ میں یہ پہلا بندوبست ہے اور گو کہ کیسی ہی احتیاط سے اس کو کیوں نہ اختیار کیا جائے، اور گو کہ بڑے بڑے تجربہ کار افسروں نے اس وقت اس کی منظوری کے لئے سفارش کی ہے لیکن تاہم ابھی یہ صرف ایک امتحان ہے اور اس لئے اگر کسی خاص موقع اور خاص مقدمہ میں مقامی عہدہ داروں کو یہ معلوم ہو کہ مجوزہ دھاروں کے لحاظ سے وہاں سختی ہو گئی ہے تو

ان کو لازم ہوگا کہ اس کی رپورٹ سلسلہ بہ سلسلہ سرکار تک بھیجیں اور اگرچہ تری میں غالباً ایسا کوئی موقع کمتر ہی پیش آئے گا لیکن خشکی کے اضلاعات کی نسبت ممکن ہو کہ ایسے مواقع پیش آئیں۔ یہ صدائے شکایت ہمارے سررشتہ بندوبست کی نسبت ابتدا سے کانوں میں چلی آتی ہو کہ بندوبست سے اعلیٰ زمینوں کے دہاروں میں جس طرح نرمی ہو جاتی ہو اسی طرح ادنیٰ درجہ کی زمینوں کے دہاروں میں سختی ہو جاتی ہو۔ پس سرکار کو تیار رہنا چاہیے کہ اگر کسی موقع پر کوئی ناقابل برداشت سختی رعایا کے حق میں ہوگئی ہو تو وہ رفع کردی جائے۔ لیکن اگر معلوم ہو کہ سختی جو ہوگئی ہو وہ رعایا کے حق میں مفید ہو تو اس میں کسی ترمیم کا موقع نہ ہوگا۔ کیونکہ سرکار کو جہاں تک اپنے نقصان سے تعلق ہو اپنے معاہدہ پر قائم رہنا بلالحاظ ایسے کسی نقصان کے ضرور ہو اور اگرچہ عام قاعدہ کے بموجب رعایا بھی میعاد بندوبست تک معاہدہ کی اسی طرح پابند ہو جس طرح سرکار، لیکن مالگزاری کا انتظام جس کی تمام تر کامیابی صرف رعایا کی مرفہ الحالی پر منحصر ہو ایک خاص قسم کا انتظام ہو اور اس لئے رعایا کے حق میں سرکار کی طرف سے کسی خاص رعایت کی پالیسی ہمیشہ ایک عمدہ سے عمدہ پالیسی سمجھی جاتی ہو اور نواب سر آسمان جاہ بہادر مدارالمہام سرکار عالی کو ہر طرح اُمید ہو کہ سرکار عالی کے تمام عہدہ داران صیغہ مالگزاری سرکار کے اس عمدہ پالیسی کو ہمیشہ مدنظر رکھیں گے۔"

کورٹ آف وارڈس کی اصلاح

نواب انتصار جنگ کی نظر ہمیشہ سے ایسے معاملات پر رہتی تھی جن سے رعایا کے آرام و آسائش میں ترقی ہو اور اُن میں حکومت کے متعلق وفاداری کے جذبات پیدا ہوں۔ وہ ریاست کے معمولی مالی فائدہ کے مقابلہ میں رعایا کی وفاداری کو حکومت کے لئے زیادہ سودمند اور قیمتی سمجھتے تھے اور جب کوئی ایسا موقع ہاتھ آتا تھا تو اس کو ضائع

نہیں کرتے تھے، چنانچہ انھوں نے اپنے زمانہ معتمدی میں نواب مدار المہام کو مشورہ دے کر حسب ذیل حکم جاری کرایا۔

"قدیم وقتوں سے یہ طریقہ چلا آتا ہے کہ جو جاگیرات وغیرہ اہل معاش کی نابالغی یا فاترالعقلی کی وجہ سے سرکار کے زیر اہتمام ہیں اُن کے محاصل سے فی روپیہ ایک آنہ و نیم آنہ سرکار میں جمع ہوتا ہے اور یہ رقم مدات آمدنی مالگزاری کے ساتھ ایک مد شاہی آمدنی کی سمجھی جاتی ہے، لیکن چونکہ اس قسم کے نابالغوں وغیرہ کی حفاظت اور اُن کی جائدادوں کا انتظام حقیقت میں خلیفہ کا خود ایک فرض ہے، اور خصوصاً جب کہ حضرت بندگانِ عالی متعالی مدظلہ العالی کو اپنے ملک کے ہر ایک یتیم و نابالغ اور لاوارث و فاترالعقل اشخاص کی نسبت پدرانہ اور مادرانہ اور شاہانہ شفقت مبذول ہے تو اب اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی خبر رسی سے سرکار عالی اپنے خزانہ کو ترقی دے۔ لہٰذا مدارالمہام سرکار عالی نے مذکورۂ بالا آمدنی کو شاہی آمدنی کی مد سے بالکل خارج کر دیا ہے اور ہوم سکرٹری کو جن کے دفتر سے کورٹ آف وارڈس کا انتظام متعلق ہے۔ ایما فرمایا ہے کہ جائداد ہائے تحت کورٹ آف وارڈس سے صرف اس قدر روپیہ لیا جائے جس قدر کہ فی نفسہٖ اُن جائدادوں اور اُن علاقوں کے انتظام اور اُن نابالغوں وغیرہ کی تعلیم و تربیت و حفظ صحت اور اُن کے کارخانوں کی درستی اور ترقی کے لئے درکار ہے اور سرکاری موجودہ عہدہ داران مال گزاری کا وقت جو اُن جائدادوں کے انتظام اور تحصیل محاصل وغیرہ میں صرف ہوگا جس کے معاوضہ میں ایک و نیم آنہ کی رقم سرکار میں جمع ہوتی تھی اُس کا مطلق کوئی معاوضہ سرکار میں نہ لیا جائے گا، مال گزاری کے عہدہ داروں اور سرکار کے دیگر افسروں کی محنت اور توجہ سے

نابالغ وغیرہ کی جائدادہائے زیر اہتمام سرکار کی نسبت اگر کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو تو وہ خود سرکار کے لئے سب سے اعلیٰ معاوضہ اپنے افسروں کی اس محنت اور اور صرف زر کا ہوگا ــــــ"

درخت نصب کرنے کے متعلق مفید احکام

ریاست میں یہ قاعدہ تھا کہ رعایا جو درخت باغ کے سلسلہ میں نصب کرتی تھی۔ دس برس بعد اس پر سرکاری محصول قائم ہو جاتا تھا۔ اس وجہ سے رعایا کو درختوں کے لگانے اور باغ تیار کرنے کے متعلق کوئی رغبت نہ تھی، نواب انتصار جنگ نے اس قاعدہ کو منسوخ کرایا اور حسب ذیل احکام جاری کئے۔

(۱) جملہ پٹہ داران اراضی کو جو سرکار کو محصول ادا کرتے ہیں اور جملہ انعام داروں کو جن کی معاش بحال کی گئی ہو اختیار رہو گا کہ بلا مزاحمت احدی ہر قسم کے درخت بہ استثنائے سیندہی و تاڑ و گل مہوہ اپنی اراضی میں بعد حاصل کرنے کسی خاص منظوری کے لگائیں۔

(۲) جملہ درخت جو قابضان اراضی نے لگائے ہیں اُس کا ثمرہ اُن کی ملک ہوگا اور بجز معمولی محصول اراضی کے کوئی محصول درخت ہائے مذکور پر نہیں لیا جائے گا۔

(۳) جو لوگ اراضی بنجر میں درخت لگانا چاہیں اُن کو لازم ہوگا کہ بموجب دستورالعمل بنجر، عطائے زمین کے لئے درخواست کریں۔ اس وقت ان کو بموجب قواعد زمین اس طور پر عطا کی جائے گی گویا کہ وہ زراعت کے لئے طلب کی گئی ہو اور سوائے ادائے محصول اراضی کے اور کوئی محصول بابت اُن درختوں کے نہیں لیا جائے گا۔

(۴) جو اشخاص کہ سیندہی یا تاڑ یا گل مہوہ کے درخت لگانا چاہیں تو اُن کو

ضرور ہوگا کہ تعلقہ دار صاحب ضلع کی اجازت لیں اور تعلقہ دار منظوری صوبہ دار بغرض حفاظت حقوق صیغہ آبکاری سرکار اُن پر ایک محصول لگائیں گے۔

(۵) جو درخت کہ بلا مزاحمت احدی یا اراضی آبادی میں یا دیول یا دھرمسالہ میں یا آس پاس لگائیں گے، اُن درختوں پر کوئی رقم یا محصول نہیں لیا جائے گا۔"

تربیت اطفال لاوارث

نواب انتصار جنگ نے اپنے زمانہ صوبہ داری میں ضلع ورنگل میں لاوارث بچّوں کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا تھا، لیکن دوسرے اضلاع میں اس قسم کے بچّوں کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ تھا۔ حالانکہ لاوارث اور مصیبت زدہ بچّے ہر جگہ پائے جاتے تھے۔ چونکہ لاوارث بچوں پر نواب انتصار جنگ کی شفقت کا حال نواب سر آسمان جاہ کو معلوم تھا اس لئے انھوں نے ذیقعدہ ۱۳۰۹ھ میں یہ خدمت بھی اُن کے متعلق کی۔ اس حکم کے بعض فقرے حسب ذیل ہیں :-

"آپ نے زمانہ صوبہ داری صوبہ شرقی میں نہایت پرجوش اور موثر الفاظ میں سرکار کو اس بات کا یقین دلایا کہ ایسے اشخاص کا جو پرورش کی صلاحیت رکھتے ہوں ملنا قریب ناممکن کے ہے اور آپ نے یہ بھی بیان فرمایا کہ ایسی صورت میں سرکار کا یہ اخلاق نہ ہونا چاہیئے کہ وہ ان ننھے ننھے معصوم بچوں کی طرف سے اپنا دل اس قدر سخت کرے کہ اُن کے مایحتاج سے بھی اُن کے ساتھ مضائقہ کرنے لگے جس سے انسان کی شرافت اس سے ہمیشہ کے لئے چھن جائے، چنانچہ سرکار نے آپ کی تجویز منظور فرمائی۔

اصل یہ ہے کہ ابھی ملک کی عام طبائع ان بچوں کے لئے پُر ترحم اور فیاض نہیں ہیں۔ پس جب تک نہایت مضبوطی اور استقلال کے ساتھ ان معصوموں کی حفاظت نہ کی جائے، اُن کے حقوق سے سرکار بری نہیں ہوسکتی، اس لئے بلحاظ آپ کی ذاتی فیلنگ اور فطرتی خواہش کے جو آپ کو ہمیشہ سے ان معصوم بچوں کے ساتھ رہی ہے، سرکار ارشاد فرماتے ہیں کہ پرورش اطفال لاوارث کا پورا تعلق آپ سے کردیا جائے، عدالت ہائے فوجداری کے زیر نگرانی یہ اطفال اس وقت تک رہیں گے جب تک کہ اس اشتہار کی میعاد ختم نہ ہوجائے جو اولیاء کی حاضری کے لئے بلاتعویق جاری ہوگا، اس کے بعد ہر ایک عدالت سے براہ راست اس کی اطلاع آپ کو دی جائیگی اور جو حکم آپ دیں گے بموجب اس کے تعمیل ہوگی۔"

طب یونانی کا باقاعدہ انتظام

حیدرآباد میں طب یونانی کا سرکاری طور پر کوئی انتظام نہ تھا، ڈاکٹری تعلیم کے لئے البتہ ایک اسکول[1] قائم تھا اور متعدد ڈاکٹر سرکار کے ملازم تھے۔ نواب انتصار جنگ اگرچہ ڈاکٹری علاج کے خلاف کوئی تعصب نہیں رکھتے تھے، تاہم وہ یونانی علاج کے بھی معترف

---

[1] سنہ ۱۲۵۶ھ میں نواب ناصرالدولہ آصف جاہ رابع علیل ہوئے، حرقت بول کی شکایت تھی، یونانی علاج کیا۔ مگر فائدہ نہ ہوا، اتفاق سے ایک دن فریزر صاحب رزیڈنٹ دربار میں حاضر ہوئے اور کیفیت مزاج دریافت کی نواب ممدوح نے علالت مزاج کا ذکر کیا اور یہ بھی فرمایا کہ ہم نے ڈاکٹری علاج کی بہت تعریف سنی ہے۔ رزیڈنٹ نے کہا کہ اگر ارشاد ہو تو ڈاکٹر حاضر کیا جائے، نواب صاحب نے فرمایا کہ اس شرط پر علاج کرونگا کہ ڈاکٹر کھانے پینے کی دوا کا استعمال نہ کرے، صرف بیرونی علاج کیا جائے۔ جس طرح کہ حکیم علوی خاں نے نادر شاہ کے دردسر کا علاج کیا تھا، غرض فریزر صاحب نے ڈاکٹر میکلین رزیڈنسی سرجن کو پیش کیا، انھوں نے صرف غذا کا خاص انتظام کیا ۳ مہینے میں مرض جاتا رہا۔ اور نواب ممدوح نے خوش ہوکر ریاست میں ڈاکٹری مدرسہ کھولنے کا حکم دیا چنانچہ "حیدرآباد میڈیکل اسکول" قائم ہوا، اور اسی زمانہ سے ڈاکٹری کا رواج ہوگیا۔

تھے، اور اس کو ہندوستانی طبائع کے مناسب سمجھتے تھے۔ حسن اتفاق سے اسی زمانے میں اہل شہر نے جن میں ہر درجہ اور طبقہ کے لوگ شامل تھے ایک عرضی پیش کرکے یہ خواہش کی کہ سرکاری طور پر یونانی مطب قائم کیا جائے اور یونانی اطبا رعایا کے علاج کے لئے مقرر کئے جائیں۔ اس درخواست کی نواب انتصار جنگ نے پورے زور سے تائید کی آخر کار مدارالمہام نے اعلیٰ حضرت کی منظوری حاصل کرکے پہلے سال کے لئے دو ہزار ماہوار منظور کیا۔ اور ۱۸۹۱ء میں تین یونانی مطب اور ایک یونانی مدرسہ بلدہ میں جاری کیا۔

انتظام کے لئے ایک مجلس بنام "مجلس انتظام مطب یونانی" قائم کی گئی جس کے ۱۵ ارکان تھے۔ اور حکیم الحکما نواب محی الدولہ بہادر میر مجلس تجویز کئے گئے تھے، اور امروہہ کے مشہور طبیب حکیم سید احمد سعید صاحب افسر الاطبا قرار پائے۔

چونکہ یونانی مطب قائم کرنے کے بظاہر یہ معنی بھی ہو سکتے تھے کہ ڈاکٹری طریقۂ علاج پر حکومت کو اعتماد نہیں ہی اس لئے جو احکام جاری کئے گئے اُن میں یہ شبہہ رفع کر دیا گیا اور صراحت کے ساتھ لکھا گیا کہ:-

"سرکار عالی کو اپنے موجودہ سررشتۂ طبابت پر جو انگریزی قسم کا ہی کافی اطمینان اور بھروسا ہی اور اس میں بھی کوئی مبالغہ نہیں ہی کہ اکثر مواقع پر اطبائے یونانی خود بھی اسی کو مناسب سمجھتے ہیں کہ انھیں شفاخانوں کی طرف رجوع کیا جائے جس کے فوائد ظاہر و باہر ہیں۔ لیکن چونکہ رعایا کا ایک گروہ کثیر جن میں بہت قدیم خاندانوں کے لوگ شامل ہیں اور خصوصاً مستورات اب تک یونانی قسم کے معالجات کی خوگر ہیں اور عمدہ طریقۂ علاج یونانی کے موجود نہ ہونے کی حالت میں وہ کم استعداد اطبا اور خراب ادویہ کے استعمال پر مجبور ہو جاتی ہیں لہٰذا انتظام ذیل عمل میں آتا ہی۔"

اس کے بعد انتظام کی تفصیل بیان کی گئی ہی۔ مثلاً

(۱) ہر مطب کے ساتھ دواخانہ ہو، جہاں سے صاحب استطاعت لوگوں کو بہ قیمت اور غربا کو مفت دوا دی جائے۔

(۲) لاوارث اور محتاج مریضوں کے لئے زمانہ علاج تک قیام و طعام اور آسائش و تیمارداری کا انتظام کیا جائے۔

(۳) متعدی امراض کے مریضوں کے لئے بیرون آبادی قیام و علاج کا انتظام

(۴) دوا فروشی کی دکانات کا انتظام تاکہ خراب دوا نہ فروخت ہو۔

(۵) آئندہ صرف وہی طبیب علاج کریں، جو صلاحیت و قابلیت رکھتے ہوں اور جن کو مجلس علاج کرنے کی اجازت دے۔"

اصلاح صیغۂ ملازمت

عام ملازمین اور عہدہ داروں کی ترقی و فلاح اور تہذیب و اصلاح

سرکاری ملازمین اور عہدہ داروں کے ساتھ نواب انتصار جنگ کا طرزِ عمل دیانت و اعتدال پر مبنی تھا، قابل متدین اور نیک طینت عہدہ داروں کی وہ قدر کرتے تھے، برخلاف اس کے نالایق بد اطوار اور سخت گیر لوگوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور باوجود نرم مزاجی اور نیک نفسی کے اُن کی تنبیہ و تہدید میں کبھی تامل نہیں کرتے تھے۔ جس طرح رعایا اُن سے خوش تھی اسی طرح سرکاری ملازمین کو بھی اُن پر اعتماد تھا کہ وہ اُن کے حقوق کی حفاظت کرینگے، اور اُن کی کارگزاری کو نظرانداز نہ کرینگے۔ اور اُن کا خیال غلط نہ تھا۔ کارگزار ملازمین سرکار کو جب کبھی اُن کی ماتحتی میں کام کرنے کا موقع ملتا تھا تو وہ خوش ہوتے تھے کہ اب اُن کی قدر شناسی ہوگی اور وہ اپنی محنت کا صلہ پائینگے، برخلاف اس کے جب نااہل لوگوں کو اُن کی ماتحتی کی مصیبت میں مبتلا ہونا پڑتا تھا تو وہ لرزہ براندام رہتے کہ اب اُن کی خیر نہیں چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ بہت سے لوگ اُن کی قدرشناسی اور حوصلہ افزائی کی بدولت معمولی درجہ کی محرری یا کسی ادنیٰ عہدہ سے ترقی کرکے بڑے بڑے عہدوں پر پہنچے، اور بہت سے نالایق و بد اطوار عہدہ دار جو کسی ناجائز تدبیر یا حیلہ سے ان عہدوں پر پہنچ گئے تھے معطل یا برخاست کیئے گئے۔

معتمدی کے زمانہ میں بہت سے سرکاری محکمے اور صیغے نواب انتصار جنگ کی نگرانی میں تھے اور اُن کو کافی اقتدار حاصل تھا، اس لیئے دفاتر کی اصلاح و تہذیب اور ملازمین کی ترقی و قدرشناسی کا اُن کو پورا موقع ملا، لیکن یہاں تمام جزئیات کا استقصا ناممکن ہے مثلاً چند واقعات بیان کیئے جاتے ہیں۔

تخفیف یافتہ ملازمین کا انتظام

انتظامی تغیرات کے سلسلہ میں مختلف محکموں کے بہت سے ملازمین تخفیف میں آ گئے تھے جو پریشان پھرتے تھے، البتہ جن کو کسی قسم کا رسوخ یا ذریعہ سفارش حاصل تھا وہ کسی دوسرے محکمہ یا صیغہ میں داخل ہو گئے، لیکن عام ملازمین جن کی تعداد سینکڑوں تک پہونچتی تھی سخت مصیبت میں مبتلا تھے۔ نہ تو ان کو تنخواہ ملتی تھی نہ کسی قسم کا وظیفہ یا انعام، ان لوگوں کی وجہ سے ایک عام پریشانی پھیلی ہوئی تھی، اور نواب انتصار جنگ کے مکان پر ان کا ہجوم رہتا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر نواب سر آسمان جاہ کو اس طرف متوجہ کیا چنانچہ جو لوگ خدمت کے قابل نہ تھے اُن کو وظیفہ یا انعام دیا گیا، اور جو ملازمت کر سکتے تھے اُن کو تاریخ تخفیف سے مناسب تنخواہ دی گئی اور یہ حکم جاری کیا گیا کہ :-

"جس وقت جو جگہ خالی ہو اس پر اُن میں سے اپنے درجہ اور قابلیت کے لحاظ سے تقرر کیا جائے"۔

بلکہ یہاں تک تاکید کی گئی کہ :-

"کوئی نیا شخص کسی چھوٹی سی جگہ پر بھی بغیر نواب مدار المہام کی خاص منظوری کے اس وقت تک مقرر نہ کیا جب تک مذکورۂ بالا تخفیف یافتہ لوگ سب مقرر نہ ہو جائیں"۔

اِن احکام کی پوری تعمیل کی گئی، یہاں تک کہ جن تخفیف یافتہ لوگوں کا انتقال ہو گیا تھا اُن کے اعزہ و اقارب کو اس شرط پر ملازمت دی گئی کہ وہ متوفی کے کنبہ کی بھی مناسب امداد کرینگے۔

نواب انتصار جنگ کا یہ کارنامہ اس قدر شہرت پذیر ہوا کہ اُن کے عدل و انصاف اور رحم و شفقت کی داستانیں گھر گھر پھیل گئیں اور کسی موزوں طبع تخفیف یافتہ نے ایک نظم بھی لکھی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

تخفیف یافتوں کی تو مٹی خراب تھی
کرتے مدد نہ اُن کی اگر انتصار جنگ

اِس قسم کی نظمیں اگرچہ شاعرانہ حیثیت سے کوئی قدر و منزلت نہیں رکھتیں لیکن ان سے پبلک کے عام جذبات و خیالات کا اندازہ ہوتا ہے ہمیشہ دیکھا گیا کہ بعض اوقات جب عدل و انصاف یا ظلم و ستم کے غیر معمولی واقعات پیش آتے ہیں تو عام جذبات میں خود بخود ایک جنبش پیدا ہوتی ہے اور موزوں طبع اشخاص اسی طریقہ سے شکر و شکایت کا اظہار کرتے ہیں۔

عہدہ داران مال کی تنخواہ میں اِضافہ

نواب انتصار جنگ نے معتمدی عدالت اور صوبہ داری کے زمانہ میں بھی سرکاری ملازمین کی تنخواہ میں اضافہ کرایا تھا۔ اب معتمد مال گزاری مقرر ہونے پر اُنھوں نے بلا تاخیر عہدہ داران مال کے اضافہ تنخواہ پر توجہ کی اور جدید موازنہ میں نائب تحصیلداروں سے لے کر تعلقہ داروں تک سب کی تنخواہ میں معقول اضافہ کرایا، اور جملہ عہدہ داروں کی تنخواہ کا گریڈ مقرر کردیا، مثلاً اوّل تعلقہ داروں کے ۳ درجہ قایم کیئے گئے درجہ اول کی تنخواہ ایک ہزار دوسو درجۂ دوم کی ایک ہزار درجہ سوم کی آٹھ سو مقرر کی گئی، اور اوّل تعلقہ داروں کی تنخواہ میں سے چھ سو روپیہ کا درجہ بالکل اڑا دیا گیا، اسی طرح دوم و سوم تعلقہ دار اور تحصیلداروں کے درجے قایم کیئے گئے، مثلاً پہلے جن تحصیلداروں کی تنخواہ اسّی یا سو ہوتی تھی اب ایک سو پچیس قرار دی گئی اور درجہ اول کے تحصیلدار کی تنخواہ ایک سو پچھتّر رکھی گئی۔ جو احکام اس سلسلہ میں جاری کیئے اُس میں اُنھوں نے یہ بتایا کہ:۔

"سرکار عالی کا منشا یہ ہے کہ جہاں تنخواہوں کی حالت اس وقت بالکل ہی عہدوں کے مناسب حال نہیں ہے اس کو فوراً درست کرکے باقی اور ترقیاں احتیاط اور اطمینان کے ساتھ جاری کی جائیں اور صرف اُن عہدہ داروں کو یہ ترقیاں ملیں جنھوں نے بلحاظ اپنی عمدہ کارگزاریوں اور اپنی عام نیکنامی کے اپنے کو ترقی کا مستحق ثابت کیا ہو اور البتہ اس تجویز کے وقت جہاں تک بغیر ضائع کرنے اس نہایت واجبی اُصول کے کہ اُن خدمات کی سب سے زیادہ قدر شناسی ہو جو رعایا اور سرکار دونوں کے حق میں عمدگی اور ایمانداری کے ساتھ عمل میں

آئی ہوں، قدامت پر بھی ضرور لحاظ کیا جائیگا۔

پس نواب مدار المہام سرکار عالی فرماتے ہیں کہ تمام وہ اوّل تعلقہ دار جو اس وقت آٹھ سو روپیہ سے کم تنخواہ پاتے ہیں شروع فروردی ۱۲۹۷ف سے آٹھ سو روپیہ تنخواہ پانے لگینگے، اور ڈھائی سو روپیہ سے کم ماہوار پانے والے سوم تعلقہ داروں کی ترقی ڈھائی سو روپیہ پر ہو جائے گی ....۔"

چنانچہ ان احکام کے مطابق متعدد تعلقہ داروں کو بلا تاخیر ترقیاں دی گئیں، اس کے علاوہ کام کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیئے تعلقہ داروں کی تعداد میں بھی اضافہ کیا گیا۔ ایک اور رعایت یہ کی گئی کہ اوّل تعلقہ داروں کے لیئے بحالت دورہ بجائے پانچ روپیہ روز کے آٹھ روپیہ بھتہ تجویز کیا گیا۔

اہل ملک کی ترقی کا خیال

حیدر آباد میں ملکی اور غیر ملکی کا جھگڑا سر سالار جنگ اوّل کے عہد سے درپیش ہے۔ اُنھوں نے شمالی ہند سے متعدد قابل اور تجربہ کار لوگوں کو بلا کر بڑے بڑے عہدوں پر مقرر کیا، ان عہدہ داروں کی وجہ سے عام دفاتر میں بھی کچھ ہندوستانی پہنچ گئے، یہ حالت اہل ملک کو قدرتًا ناگوار تھی، وہ خیال کرتے تھے کہ باہر والوں کے آنے سے اُن کی حق تلفی ہو رہی ہے، حالانکہ اُن کا یہ خیال صحیح نہ تھا، واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ تک اہل دکن نے تعلیم و تجربہ کے لحاظ سے اس درجہ ترقی نہیں کی تھی کہ بڑے بڑے عہدوں کا کام سنبھال سکیں، باہر سے جو لوگ گئے وہ انگریزی طرز حکومت کا تجربہ رکھتے تھے، اُنھوں نے حیدر آباد پہنچکر جدید انتظامات کی بنیاد رکھی، ملک کے قدرتی وسائل کو ترقی دی عمدہ عمدہ قوانین بنائے، رعایا کی راحت و آسایش کے اسباب فراہم کیئے، غرض ہر حیثیت سے اُن کا وجود ملک اور اہل ملک کے لیئے مفید ثابت ہوا، اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ان بڑے عہدہ داروں میں بعض ایسے بھی تھے جو اہل ملک کے مقابلہ میں ہندوستانی مسلمانوں کا زیادہ خیال رکھتے تھے، لیکن نواب انتصار جنگ کی ذات اس قسم کی جانبداری سے بالاتر تھی۔

نواب انتصار جنگ نے اپنے کامل اقتدار کے زمانہ میں بھی جب کہ اعلیٰ حضرت نظام اور مدار المہام کا پورا اعتماد اُن کو حاصل تھا یہ جائز نہیں رکھا کہ اہل ملک کے مقابلہ میں باہر والوں کو

ترجیح دیں، بلکہ اُنھوں نے یہ کوشش کی کہ اہل ملک انتظامی قابلیت وصلاحیت حاصل کریں تاکہ اپنے حقوق سے مستفید ہوں، متعدد واقعات سے یہ بتایا جاسکتا ہے کہ اُنھوں نے مختلف مواقع پر کس طرح اہلِ ملک کو فائدہ پہونچایا، لیکن یہ بہتر ہوگا کہ خود ایک حیدرآبادی عہدہ دار کی شہادت اس کے متعلق پیش کردی جائے۔

ایک صاحب جو ضلع نلدرگ میں سوم تعلقہ دار تھے، ایک خط میں نواب انتصار جنگ کو لکھتے ہیں :-

عالی جناب! یہ تو آپ پر اظہر من الشمس ہے۔ جیسے خیالات حیدرآبادیوں کے ہندوستانیوں کی نسبت تھے مگر الحمد للہ کہ آپ کی انصاف پسندی نے یہ بات ثابت کردی کہ آپ لاثانی خیر خواہ ملکیوں کے ہیں، عالی جناب آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ پہلے تو ملکیوں کا انتخاب تعلقہ داری کے واسطے ہوتا ہی نہ تھا اور اگر کہیں مجبوراً یا مصلحتاً کیا بھی گیا تو ایسا اور ایسے لوگوں کا جس سے منتخبین کی نیت میں یہ امر مکنون تھا کہ غیر ملکیوں کے مقابلہ میں ملکیوں کو نالایق ثابت کردیں۔

ہر چند یہ معروضہ چھوٹا منھ بڑی بات ہے مگر آپ کی انصاف پسندی کی وجہ سے بے ساختہ مجکو ایسے الفاظ لکھنے کی جرأت ہوئی آپ کے زمانہ کے انتخاب سے ملکیوں کو اپنی فلاح وبہبودی کا اتنا ہی یقین ہے جیسا کہ رات کے بعد دن نکلنے کا، چنانچہ مسٹر فرامجی جمشید جی اوّل تعلقہ دار ضلع کھمم اور مولوی عبد القادر اوّل تعلقہ دار نلدرگ اور مولوی سیف الدین اوّل تعلقہ دار ضلع ناگر کرنول ان تینوں صاحبوں کا عمدہ انتخاب آپ کی بیدار مغزی اور ملکیوں کی خیر طلبی اور خیر خواہی سرکار کی ایک اعلیٰ درجہ کی نظیر ہے۔"

ایک تعلقہ دار کی معطلی

جس طرح وہ سرکاری ملازمین کی قدر شناسی کرتے تھے اسی طرح اُن کی غلط کاریوں پر گرفت بھی کرتے تھے، ایسے موقع پر کوئی چیز اُن کو احتساب سے نہیں روک سکتی تھی، نہ کسی کی

سفارش کام آتی تھی۔ ایک دفعہ ایک دوم تعلقہ دار نے محض رعایا کے ستانے کے لیے پیمائش کے معاملہ میں ایک ناجائز کارروائی کی اور تعلقہ دار کے اعتراض پر انکار کر دیا کہ میں نے ایسا نہیں کیا۔ تحقیقات کرنے پر غلط بیانی ثابت ہو گئی۔ نواب انتصار جنگ نے تعلقہ دار کو معطل کر دیا اور لکھا کہ :-

"ایک ایسے درجہ کا افسر جب کہ ارتکاب قصور کے بعد غلط بیانی میں بھی اس قدر بے باک ہو، کسی طرح اس قابل نہیں ہو سکتا کہ رعایا کے حقوق اور سرکاری مقاصد اس کی حفاظت میں چھوڑ دیئے جائیں۔ سرکار عالی اب ایسے عہدہ داروں اور ملازموں سے جو رعایا کے حق میں درندہ جانوروں کی سی خصلت ظاہر کریں اور سرکار کے ساتھ اس قسم کی بے اعتنائی برتیں اپنے انتظام کو پاک و صاف کرنا چاہتی ہے۔ لہذا سید .... کو فوراً ان کی خدمت سے معطل کر دیا جائے۔"

ایک نائب تحصیلدار پر عتاب

۱۳۰۷ھ میں ایک نائب تحصیلدار کے متعلق لکھتے ہیں :-

"محمد ..... خاں نائب تحصیلدار پٹی امرآباد کے ذمہ علاوہ اور چند قسم کی بے اعتدالیوں کے یہ الزام بھی ثابت ہوا ہے کہ انھوں نے اپنے علاقہ کے لوگوں سے روپیہ قرض لیا اور اس کا نام قرض حسنہ رکھا، اور جب قرض حسنہ کی تشریح ان سے دریافت کی گئی تو کہا کہ میری مراد بلا سودی قرض سے تھی۔ بلا اجازت سرکار اپنے علاقہ میں قرض لینا اور وہ بھی از نام قرض حسنہ یا بلا سود سخت الزام کی بات ہے لہذا ..... کی موقوفی خدمت نائب تحصیلداری سے عمل میں آئی ہے۔"

ایک دوم تعلقہ دار کی کارگزاری پر ریمارک

امیر محمد خاں دوم تعلقہ دار ضلع اگلنڈل نے اپنے مستقر جگتیال کی ترقی میں خاص طور پر کوشش کی۔ وہاں کے ویران قلعہ کو آباد کیا، زراعت اور صنعت کو جو برباد ہو چکی تھی ترقی دی، جگتیال کی پیداوار اور مصنوعات کی ایک عمدہ نمائش قائم کی جہاں بہت سے عمدہ عمدہ نمونے پیش ہوئے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ شکایت بھی مدار المہام کے

سامنے پیش ہوئی کہ رعایا پر تشدد کیا گیا، رعایا کو پوری مزدوری اور مال کی مناسب قیمت نہیں ملی، چنانچہ تحقیقات کا حکم دیا گیا، اور جو رپورٹ اس واقعہ کے متعلق ضلع سے آئی تھی اس کے جواب میں مدار المہام کی طرف سے نواب انتصار جنگ نے لکھا کہ :-

"جو کام ملکی صنائع اور پیداوار کی ترقی کی نسبت جگتیال میں انھوں نے جاری کیے وہ اس قابل تھے کہ سرکار خوشنودی بلکہ شکر گزاری کے ساتھ اُن کو دیکھتی لیکن یہ سب کچھ اس وقت ہوتا جب معلوم ہوتا کہ رعایا پر اس کی وجہ سے کوئی ناواجب سختی نہیں ہوئی حالانکہ جو شکایتیں سرکار کے سامنے اس وقت پیش ہیں وہ یہ ہیں کہ رعایا پر اُن کی وجہ سے سختی ہوئی، اور اس لیے ابھی کوئی لفظ ان مذکورہ بالا کاموں کی نسبت سرکار کی طرف سے یہاں نہیں لکھا جا سکتا۔

بہت بڑے بڑے عالی شان کام اس وقت زمین کے پردہ پر ایسے ہیں جو تعجب کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں لیکن اُن کے بانیوں کی عظمت اور ناموری صرف اس لیے برباد ہو گئی کہ تاریخ بتلاتی ہے کہ اُن کے قایم کرنے میں رعایا پر ناواجب سختی ہوئی تھی تا بہ ایں چند ترقیات جگتیال چہ رسد۔"

عہدہ داروں کو ایک عام تنبیہ

اکثر با اختیار عہدہ دار رعایا اور اہل غرض کے ساتھ جس استغنا اور نازک مزاجی کا برتاؤ کرتے ہیں وہ محتاج بیان نہیں نواب انتصار جنگ عہدہ داروں کی اس بد دماغی کو جائز نہیں رکھتے تھے چنانچہ اُنھوں نے ایک مفصل حکم جاری کیا جس میں من جملہ اور امور کے یہ بھی لکھا :-

"کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی جاہل شخص ایک ہی مضمون کی عرضی بار بار پیش کرتا ہے جس سے خواہ نخواہ ایک قسم کی برہمی افسروں کے مزاج میں پیدا ہوتی ہے۔ لیکن نواب مدار المہام سرکار عالی بتاکید ارشاد فرماتے ہیں کہ ایسے وقتوں میں بھی ہمارے افسروں کو ضرور ہے کہ اپنی طبیعت کو قابو میں رکھیں اور اگر وہ عرائض واپسی کی قابل

ہیں تو بہ ثبت شرح واپس کریں۔

حاصل یہ ہے کہ سرکاری محکموں کے لیئے یہ آواز کہ کسی مستغیث کی کوئی عرضی بلا ثبت حکم واپس ہوئی، بہت ہی معیوب اور شرم کی بات ہے۔ اس سے کامل طور سے بچنا چاہیئے اور اگر باایں ہمہ معلوم ہوگا کہ کسی افسر نے محض اپنی کاہلی یا غصہ سے کسی عرضی کو بلا ثبت شرح واپس کیا ہے تو اس کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس بے محل کاہلی اور بیجا غصہ کا نتیجہ خود اُسی افسر کے حق میں مفید نہ ہوگا۔"

سیاسی معاملات

نواب انتصار جنگ کو اپنی ملازمت کے آخری دور میں ریاست کے پولیٹکل معاملات میں مداخلت کا زیادہ موقع ملا۔ تمام اہم معاملات جو نواب سر آسماں جاہ کے عہد میں پیش آئے سب میں اُن کا حصہ تھا۔ اس زمانہ میں اُن کے فرایض نہایت اہم تھے۔ وہ مدار المہام کی طرف سے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں جاکر مہمات ملکی پر گفتگو کرتے تھے۔ رزیڈنٹ سے سیاسی و انتظامی معاملات پر تبادلہ خیالات کرنے کے لیے بھی وہی بھیجے جاتے تھے۔ مدار المہام جو عرایض اور یادداشتیں اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کرتے تھے، وہ زیادہ تر انہی کے دست وقلم کی لکھی ہوئی ہوتی تھیں، اُن کا ایک نازک فرض یہ بھی تھا کہ اعلیٰ حضرت، مدار المہام، اور رزیڈنٹ کے مابین تعلقات کو عمدہ حالت میں قایم رکھیں۔ اس خدمت کی کامیابی کے ساتھ انجام دینے کا اعتراف خود ایک رزیڈنٹ نے بھی کیا ہے۔ ان سب فرایض کے علاوہ ایک بڑا کام اُن حملوں کی مدافعت تھی جو مختلف پارٹیوں کی طرف سے برابر ہوا کرتے تھے، غرض اس دور ملازمت میں اُن کو مسلسل حیدرآباد کی اندرونی و بیرونی پالٹکس میں مبتلا رہنا پڑا۔ اسی زمانہ میں بعض اہم معاملات ایسے بھی پیش آئے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے تو سیاسی نہ تھے لیکن اُن میں اس قسم کی پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں کہ آخر میں اُن کی حیثیت سیاسی ہوگئی۔ لیکن جیسا کہ

اوپر ایک موقع پر بتایا گیا ہے۔ مختلف وجوہ سے یہ تمام واقعات بیان نہیں کیئے جا سکتے، مثلاً چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

سردار دلیر جنگ کی ریلوے اسکیم سے اختلاف

مملکت آصفیہ میں یکم فروری ۱۸۷۰ء سے ریلوے کی تعمیر کا آغاز ہوا، گلبرگہ سے واڑی تک جی، آئی، پی کی ریلوے لائن پہلے سے موجود تھی جدید ریلوے لائن کا انتظام بھی اسی کمپنی کے متعلق کیا گیا، چنانچہ واڑی سے سکندرآباد تک ۱۲۱ میل طویل ریلوے لائن تیار کرائی گئی یہ لائن کمپنی نے اپنے صرف سے تیار کرائی جس پر ایک کروڑ ۳۵ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ چونکہ سب حصے فروخت نہیں ہوئے تھے اس لیے مصارف کی باقی ماندہ رقم سرکار کے خزانہ سے دی گئی۔

۱۸۸۱ء میں سردار دلیر جنگ (معتمد ہوم ڈپارٹمنٹ) نے سر سالار جنگ اوّل کے سامنے ملک کے ذرائع آمدنی کو وسعت دینے کے متعلق ایک اسکیم پیش کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ پرانی ریل جو واڑی سے سکندرآباد تک ہے ایک ایسی کمپنی کے ہاتھ فروخت کردی جائے جو علاوہ اس ریل کا انتظام بطور خود کرنے کے شمالی اور مشرقی حصہ ملک میں بھی جدید ریلوے جاری کرکے ملک کے ذرائع آمدورفت کو توسیع دے۔

اس اسکیم میں علاوہ ریلوے لائن کی تعمیر کے ایک معاملہ یہ بھی تھا کہ ممالک محروسہ کی معدنیات کے حقوق بھی اس کمپنی کو تفویض کردیئے جائیں لیکن بعد کو یہ تجویز اسکیم سے خارج کردی گئی۔ سردار دلیر جنگ اس اسکیم کی تکمیل و تصفیہ کے سلسلہ میں دو ڈھائی برس تک انگلستان اور ہندوستان میں مصروفِ کار رہے، اور آخرکار یہ کمپنی ۲۰ لاکھ پونڈ کے سرمایہ حصہ جات اور ۱۵ لاکھ پونڈ کے سرمایہ ڈبنچر سے ریلوے لائن کے جاری کرنے کے لیئے قایم ہوئی اور جو معاہدہ سرکار نظام اور ریلوے کمپنی کے مابین قرار پایا اس پر سردار دلیر جنگ نے ۲۰ر دسمبر ۱۸۸۳ء کو دستخط کیئے۔

اس معاہدہ کی دفعہ ۲ میں یہ اقرار کیا گیا تھا کہ :-

"کمپنی واڑی سے حیدرآباد و سکندرآباد تک کی موجودہ لائن (تقریب ۱۲۱ میل

کے طول میں) اُن شرائط پر لے لیگی جن کا ذکر آگے فقرہ ۲۰ و ۲۳ معاہدہ ہذا میں آتا ہے، اور اُن اوقات پر اور اس طریق سے اور اُن شرائط کے بموجب جن کا ذکر آگے آتا ہے، ریلوے کی ایک سنگل لائن پانچ فٹ چھ انچ کے پیمانہ پر بنائیگی، جس کا حصہ اول قریب ۲۱۰ میل کے طول میں حیدرآباد سے ورنگل تک اور ورنگل سے بنیرواڑہ کے نزدیک ممالک محروسہ کی جنوبی سرحد تک اور حصہ دوم قریب ۱۶۰ میل کے طول میں ورنگل سے چانده کے نزدیک ممالک محروسہ کی شمالی سرحد تک پہونچے گا۔ ان دونوں حصوں کا جملہ طول ۲۷۰ میل سے زیادہ نہو گا۔"

غرض مذکورہ بالا کمپنی نے جو "نظام گارنٹیڈ اسٹیٹ ریلوے کمپنی" کے نام سے قائم ہوئی تھی پرانی ریلوے لائن کو خرید لیا، اور ۱۸۸۶ء میں ایک لائن سکندرآباد سے ورنگل تک جاری کر دی اور ورنگل سے جنوبی سرحد تک بنیرواڑہ (بجواڑہ) لائن کا کام بھی جاری رہا، لیکن ۱۶۰ میل کی لائن شمالی سرحد کی طرف چانده تک جاری نہ ہو سکی اور مدت معینہ (سہ سالہ) گزر گئی یہ علاقہ جہاں سے یہ لائن گزرنے والی تھی زیادہ شاداب و آباد نہ تھا، اور شاید اسی سبب سے کمپنی نے تساہل کیا ہو، بہرحال معاہدہ کے مطابق عملاً یہ تجویز مسترد ہو گئی، لیکن سید عبدالحق (سردار دلیر جنگ) معتمد صیغہ ہوم ڈپارٹمنٹ نے جو کمپنی سے ہزاروں پونڈ بطور حق السعی حاصل کر چکے تھے، ۱۸۸۸ء میں ایک جدید اسکیم گورنمنٹ نظام کے سامنے پیش کی جس کا مقصد یہ تھا کہ چانده ریلوے لائن کے بجائے بجواڑہ، رائیور لائن تیار کی جائے جو اوّل الذکر سے زیادہ مفید و سودمند ثابت ہو گی اس تجویز کے مطابق گورنمنٹ نظام کو ۷۰ میل اور گورنمنٹ ہند کو ۱۰۱ میل ریلوے لائن اپنے علاقہ میں تیار کرنا پڑتی، اور چانده ریلوے کی تعمیر کی صورت میں گورنمنٹ ہند کے علاقہ میں ۳۶ میل اور علاقہ نظام میں ۱۶۰ میل لائن تیار کیجاتی لیکن گورنمنٹ ہند نے ریلوے لائن تیار کرنے کے واسطے کسی قسم کی کفالت سے انکار کر دیا تھا۔

سردار دلیر جنگ نے اس نہایت طویل پیچیدہ اور بظاہر مدلّل اسکیم میں اپنی غیر معمولی ذہانت اور قابلیت سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اُن کی اسکیم گورنمنٹ ہند اور ریاست نظام دونوں کے

لیئے غیر معمولی طور پر فائدہ بخش ثابت ہوگی، اور حصہ داروں کو بھی معقول فائدہ پہنچے گا۔ اُنھوں نے یہ بھی بتایا کہ جنوبی ہند اور ممالک محروسہ سرکار نظام میں اگر کبھی قحط واقع ہوا تو اُس وقت یہ لائن نہایت مفید ثابت ہوگی، نیز یہ کہ بحری تجارت کے لحاظ سے بھی یہ لائن رائیپور کے اضلاع چھتیس گڑھ و دیگر علاقہ جات ممالک متوسط سے جہاں کہ غلّہ کی پیداوار بکثرت ہوتی ہے، سمندر کے راستہ سے مال لیجانی کے واسطے ایک بڑی مفید لائن اندرونی تجارت کی ہوگی۔ اس کے بعد اُنھوں نے بتایا کہ اس لائن کی تعمیر میں ۱۷ لاکھ ۹۰ ہزار پونڈ صرف ہوگا پھر نہایت تفصیل و وضاحت سے سرمایہ فراہم کرنے کی تدبیریں بیان کیں۔ آخر میں اُنھوں نے اعداد سے یہ بتایا کہ اس لائن سے کس قدر مالی منفعت حاصل ہوگی۔ غرض اس ریلوے اسکیم میں سردار صاحب نے چاندہ ریلوے کا غیر ضروری ہونا اور رائیپور ریلوے کا نہایت مفید وکارآمد ہونا بظاہر ایسے دل نشین دلائل سے ثابت کیا تھا کہ جب تک خاص طور پر غور و فکر سے کام نہ لیا جائے۔ ان دلائل و نتائج میں کوئی سقم نظر نہیں آتا تھا جو سردار صاحب نے پیش کیئے تھے۔

جب یہ اسکیم پیش ہوئی تو نواب انتصار جنگ نے باضابطہ طور پر ایک نہایت مدلل اور مفصّل تبصرہ اس پر لکھا اور جو سبز باغ سردار دلیر جنگ نے دکھایا تھا اُس کی حقیقت اچھی طرح واضح کردی سب سے پہلے اُنھوں نے مناسب الفاظ میں یہ تسلیم کیا کہ کسی ملک میں ریلوے کی توسیع ملک کی عام بہبودی کے لیئے ازبس مفید ہے، لیکن موجودہ تجویز توسیع کی نسبت رائے دینے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن مالی نتائج کا جن پر کہ تجویز مبنی ہے اور جن کے لحاظ سے بشرط منظوری گورنمنٹ کی رقم گارنٹی کی تعداد مقرر کی جائیگی غور کی نگاہ سے امتحان کیا جائے۔

اِس تمہید کے بعد نواب انتصار جنگ نے آمدنی کے اُن اعداد پر بحث کی جو سردار دلیر جنگ نے پیش کیئے ہیں اور معقول طریقہ سے ان اعداد کی غلطیاں ظاہر کر کے بتایا کہ جو آمدنی دکھائی گئی ہے وہ محض غلط ہے۔ اسی سلسلہ میں اُنھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ موازنہ ریلوے اور اسکیم توسیع ریلوے کے مابین بلحاظ اعداد کس قدر تناقض ہے۔ یہ تمام بحث نہایت پیچیدہ اور غور طلب ہے۔ لہٰذا اس کا صرف ایک ٹکڑا یہاں نقل کیا جاتا ہے، جس سے یہ معلوم ہوگا کہ اُنھوں نے کیسی عمیق نظر سے ریلوے اسکیم کا

مطالعہ کیا تھا۔ وہ آمدنی کے اعداد پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"آمدنی کے ذیل میں جو دوسری رقم باربرداری کوئلہ کی بابت درج کی گئی ہے، اس کی نسبت میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کوئلہ کی سالانہ پیداوار دو لاکھ ٹن قرار دی گئی اور اُس کی باربرداری سے جو خالص آمدنی تخمیناً ہوگی وہ چار لاکھ پچانوے ہزار پانسو روپیہ حالی مقرر کی گئی ہے، اس لحاظ سے ضمیمہ (ب) کے نوٹ (د) میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ کوئلہ کی سالانہ پیداوار تین لاکھ ٹن ہوگی اور اُس سے سرکار کو مبلغ سات لاکھ چوالیس ہزار سات سو پچاس روپیہ سکہ حالی وصول ہونگے اُس رقم سے جو اس مد میں یادداشت بجٹ میں درج ہے، ڈیوڑھی ہے، اور سردار صاحب نے ابھی تک اس کی تشریح بھی نہیں کی ہے۔ یادداشت بجٹ اور یادداشت توسیع کی تیاری میں اتنا تھوڑا وقفہ ہے کہ یہ بھی نہیں گمان کیا جاسکتا کہ اس عرصہ میں واقعات میں اس قدر تبدیلی ہوگئی کہ اتنے ردوبدل کی ضرورت ہوئی، دونوں یادداشتوں میں کوئلہ کے ایک ہزار ٹن روزانہ کے اجارہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے حالانکہ آج کل صرف ۵۰۰ ٹن کوئلہ روز نکلتا ہے، اس لئے آمدنی کوئلہ کا جو دفعہ ۹ میں مذکور ہے نصف کرتے ہیں، تو مبلغ دو لاکھ اڑتالیس ہزار دو سو پچاس روپیہ سکہ حالی حاصل ہوتے ہیں نہ کہ مبلغ تین لاکھ بہتر ہزار جیسا کہ ضمیمہ میں درج ہے۔ ان دونوں رقموں میں مبلغ ایک لاکھ تیئس ہزار سات سو پچاس کا فرق ہے۔"

اسی طرح جملہ دفعات پر بحث کرنے کے بعد سلسلہ وار سردار دلیر جنگ کے دلائل پر توجہ کی ہے جو اُنھوں نے اپنی اسکیم میں ظاہر کئے تھے۔ اسی سلسلہ میں اُنھوں نے اس بات کو ناپسند کیا ہے کہ گورنمنٹ نظام ایک ایسی لائن کے بنانے کی ذمہ داری قبول کرے جو دو سو دس میل تک انگریزی علاقہ میں ہو کر گزریگی، اُنھوں نے نقشہ کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ رائے پور اور روزنگاٹیم کے مابین ریلوے لائن کا اجرا گورنمنٹ ہند کے زیر غور ہے اگر یہ لائن تیار ہوگئی تو مجوزہ اسکیم کو سخت نقصان

پہونچیگا۔ اُنھوں نے اپنا یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ

"سرکار عالی اپنے ملک کے باہر ریل بنانے سے اُن فوائد سے محروم رہ جائیگی جو عام طور ریلوں کے تیار ہونے اور راستوں کے کھلنے سے ہوا کرتے ہیں اور اُن نفعوں کا تو کچھ ذکر ہی نہیں کہ جو گورنمنٹ کو ایسی بھاری ذمہ داریوں کے معاوضہ میں ہوا کرتے ہیں۔"

لہٰذا اُن کی رائے ہے کہ اگر گورنمنٹ ہند، چاندا ریلوے پر رائے پور لائن کو ترجیح دے تو اس صورت میں وہ براہ مہربانی اُس دو سو دس میل لائن بنانے کی ذمہ داری کہ جو گوداری کے مشرق کی طرف واقع ہے خود اختیار کرے کیونکہ وہ ہماری سرحد کے باہر ہے، اور اپنی سرحد تک ہم خود گارنٹی دے دینگے۔

مذکورہ بالا تمام مباحث کے بعد اُنھوں نے ریاست کی مالی حالت پر نظر کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ موجودہ حالت میں جب کہ نہایت اہم ضرورتیں درپیش ہیں ایسی عظیم الشان اور کثیر المصارف اسکیم پر عمل کرنا کہاں تک جائز ہو سکتا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ملک کی حالت یہ ہے کہ

"کوئی ایک سال بھی ایسا نہیں گزرا کہ جس میں سرکار عالی کو معمولی اخراجات کے لیئے بیس لاکھ سے تیس لاکھ روپیہ تک قرض نہ لینا پڑا ہو، اور یہ قرض سال آیندہ کے محاصل سے ادا نہ ہوا ہو، اس معمولی سالانہ قرضہ کے علاوہ بھی گورنمنٹ کو اور بھی بہت سی بڑی بڑی ذمہ داریاں اپنی گردن پر لینی پڑی ہیں سلطان نواز جنگ شمشیر الملک کے قرضہ کی بابت تیس لاکھ کی ذمہ داری عائد ہوئی ہے۔ سر سالار جنگ مرحوم کا قرضہ جو قریب تیس لاکھ کے تھا، وہ بھی گورنمنٹ نے اپنے ہی ذمہ لے لیا ہے، اور اُس کا سود بھی اب ادا ہو رہا ہے، علاوہ اس کے اور بھی بڑی بڑی تعداد کے سرکاری قرضہ ہیں جن پر سود ادا ہو رہا ہے، موجودہ ریلوے کی بابت ایک بہت بڑی رقم بطور کمیشن کے دی گئی ہے، بارہ کروڑ سے زیادہ کے ڈبنچے

کمیشن قرضہ کے روبرو پیش ہو چکے ہیں، اور یہ اس وقت بتانا ممکن نہیں کہ ان کی تحقیقات کا کیا نتیجہ ہوگا۔ ۱۸۹۹ء سے گو ملک میں کوئی قحط سالی نہیں ہوتی مگر یہ محض اتفاقیہ بات ہی، خزانہ کی موجودہ حالت پر نظر کر کے کہہ سکتے ہیں کہ تھوڑی سی خشک سالی سے بھی سخت نقصان پہونچیگا اس لیے کسی ایسے شدنی امر کا خیال یک بخت قطع کر دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

خزانہ کی ایسی ابتر حالت ہو رہی ہو کہ ضروری سے ضروری اصلاحوں کو بھی ملتوی کرنا پڑتا ہی، اول درجہ کی سڑکیں تو معدوم ہیں ہی مگر دوسرے تیسرے درجہ کی سڑکوں کا پتہ بھی ملک میں نہیں ہی، دریا اور ندیاں بے پلوں کی پڑی ہوئی ہیں اور اس سے جو نقصان تجارت کو پہونچتا ہی، وہ محتاج بیان نہیں، شفاخانوں کی تعداد اس قدر کم ہو کہ ان کا ہونا نہونا ایک سا ہی، سوائے دو تین ضلعوں کے نہ کوئی ڈسٹرکٹ جیل ہی اور نہ سنٹرل محبس ہی، اور اس وجہ سے جو فتور انتظامات محبس میں پڑتا ہی وہ ظاہر ہی، ہزاروں بچے تعلیم پانے کے لائق ہیں مگر جائیں کہاں ؟ مدرسے تو ہیں ہی نہیں۔

پانچ برس سے زیادہ عرصہ ہوا کہ تلنگانہ کے ایک پورے ضلع کی پیمایش اور زمین کی تقسیم ہو چکی ہی مگر بندوبست ہو تو کیونکر ہو، ڈرتے ہیں کہ منصفانہ لگان سے خزانہ کے کئی لاکھ نکل جائینگے اور اس کا برداشت کرنا آج کل ممکن نہیں؛ بلکہ ہی تو یہ کہ تمام ملک تلنگانہ کا بندوبست اسی خطرہ سے بھرا ہوا ہی، مختصر یہ ہو کہ کوئی محکمہ کوئی صیغہ ایسا نہیں ہو کہ جسے روپیہ کی سخت ضرورت نہو، ایک بہت عمدہ تجویز (آبپاشی) کے پورا کرنے کے لئے بھی پانچ لاکھ قرض لینے کی ضرورت ہوئی، سر آسمان جاہ بہادر نے اس سال بہت سی غور و پرداخت کے بعد اہلکاران مال و عدالت کی تنخواہوں میں قدرے قلیل اضافہ کیا ہی لیکن اب بھی افسران ضلع کی تنخواہیں سرکار عظمت مدار

(گورنمنٹ انگریزی) کے ڈپٹی کلکٹروں اور ہمارے صوبہ داروں کی ڈپٹی کمشنروں کی برابر ہیں، اور عدالت عالیہ کے ججوں کی ماہواریں کمشنروں سے بدرجہا کم ہیں کوئی بھی محکمہ ایسا نہیں کہ جس میں روپیہ کی ضرورت نہ ہو، اور ہماری ضرورتیں سال بسال نہ بڑھتی جاتی ہوں، لیکن خزانہ میں روپیہ تو معدوم ہے، ناچار ضروری ضروری اصلاحوں کو بھی ملتوی رکھنا پڑتا ہے"۔

غرض نواب انتصار جنگ کے اختلاف کا یہ اثر ہوا کہ اس معاملہ میں واقف کار لوگوں سے مشورہ لیا گیا اور آخر کار یہ اسکیم مسترد کردی گئی۔

مقدمۂ معدنیات

معدنیات کا مقدمہ ایک نہایت پیچیدہ اور اہم معاملہ تھا جس کے حل کرنے میں حیدرآباد اور انگلستان کے بہت سے لائق اور تجربہ کار عہدہ دار اور ماہرین قانون مدت تک مشغول رہے، اس معاملہ میں حیرت انگیز چالاکی سے گورنمنٹ نظام کو مالی نقصان پہونچایا گیا تھا۔ لیکن ان دلچسپ تفصیلات کے بیان کرنے کے لیئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے، اور یہ ہمارا مقصد نہیں ہے، اس لیئے جہاں تک ممکن ہے نہایت اختصار کے ساتھ یہ بیان کیا جاتا ہے۔

ہم گزشتہ صفحات میں بیان کرچکے ہیں کہ سردار دلیر جنگ کی اسکیم کے مطابق جس ریلوے کمپنی کے قیام کی تجویز ہوئی تھی اس میں معدنیات کا معاملہ بھی شامل تھا۔ یعنی ممکلت نظام کی معدنیات کا اجارہ دینا بھی تجویز ہوا تھا۔ ور چند اشخاص اس اجارہ کے لیئے تجویز کرلیئے گئے تھے لیکن بعد کو یہ حصہ اسکیم سے جدا کرلیا گیا، اور اسکیم کچھ مدت کے لیئے ملتوی ہوگئی، کیونکہ جب یہ معاملہ وائسرائے کے سامنے پیش کیا گیا تو اُنھوں نے سرکار نظام کو اطلاع دی کہ جو لوگ اس تجویز سے متعلق ہیں وہ مالی لحاظ سے اس قدر معتبر نہیں ہیں کہ اُن کے ساتھ سرکار اتنا بڑا مالی معاملہ کرے۔

اس واقعہ کے بعد سردار دلیر جنگ انگلستان گئے تاکہ ریلوے اسکیم اور معدنیات کے اجارہ کے متعلق کوئی موزوں اور نہایت مناسب انتظام تجویز کریں، اور سرمایہ بہم پہنچانے کی تدابیر عمل میں لائیں چنانچہ مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد آخر کار مسٹر واٹسن سے معاملہ طے پایا، انھوں نے اس شرط پر ایک کمپنی قایم کرنا منظور کیا کہ بیس لاکھ پونڈ جو ریلوے کے واسطے نظام کو دیئے جائیں اس پر وہ بیس سال تک پانچ فی صدی سود کی کفالت کریں، مگر کمپنی ان بیس لاکھ پونڈ کا کچھ حصّہ اپنے حصوں میں دیگی، اس نئی ریلوے کمپنی قایم کرنے کے لیئے مسٹر واٹسن کو ایک لاکھ پونڈ ملے، جس میں سے اُن کے بیان کے مطابق ترانوے ہزار پونڈ انھوں نے کمپنی قایم کرنے میں صرف کیئے اور اُس کے بعد تراسی ہزار پونڈ دلیر جنگ کو بطور حق السعی دیئے گئے۔

اِسی زمانہ میں معدنیات کے اجارہ کی تجویز علیحدہ جاری تھی، ۱۸۸۳ء میں انڈیا آفس نے سردار دلیر جنگ کو یہ اطلاع دی کہ مسٹر واٹسن نے معدنیات کے اجارہ کی جو تجویز پیش کی ہے اس پر تجربہ کار صلاح کاروں کی رائے لینا چاہیئے۔ اس بنا پر دلیر جنگ نے مسرس وائٹ باربٹ اینڈ کمپنی کو یہ ہدایت کی کہ وہ سرکار نظام کی طرف سے مسٹر واٹسن اور مسٹر اسٹوارٹ کے ساتھ معدنی اجارہ کے شرائط فیصل کرے، چنانچہ قول نامہ کا مسوّدہ تیار ہوا، اور بعد دریافت (جو کئی مہینہ تک جاری رہی) مسرس وائٹ باربٹ اینڈ کمپنی نے مشہور بیرسٹروں کی صلاح سے مسوّدہ مکمل کردیا، یہ بیرسٹر مسٹر میگناٹن (جو بعد کو لارڈ میگناٹن ہوئے) اور مسٹر بلیک لے تھے۔

اس معاملہ کے بعد انڈیا آفس نے سردار دلیر جنگ کو اطلاع دی کہ اس تجویز کا سرکار نظام میں پیش ہونا مناسب ہے اور قطعی منظوری سے پہلے اس کے متعلق اور کارروائی بھی حیدرآباد میں ہونا چاہیئے۔ چنانچہ سردار دلیر جنگ مسوّدہ لے کر حیدرآباد آئے جس پر سر سالار جنگ ثانی نے (جو اس وقت مدار المہام تھے) غور کیا اور چند تبدیلیاں کر کے مع اپنی رائے کے رزیڈنٹ کے پاس بھیجدیا۔ رزیڈنٹ نے یہ مسودہ مع خط سر سالار جنگ، گورنمنٹ آف انڈیا کے پاس کلکتہ بھیجا۔ گورنمنٹ نے واقف کار لوگوں کی صلاح سے اس مسوّدہ پر غور کر کے اس کا اکثر حصہ منظور

کرلیا صرف چند فقروں میں ترمیم کردی اور مسودہ رزیڈنٹ کو واپس کرتے ہوئے یہ لکھا کہ مدارالمہام اور ایجنٹ کمپنی سے یہ سفارش کی جائے کہ وہ مجوزہ ترمیمات کے ساتھ مسودہ کو منظور کریں، چنانچہ فریقین نے منظور کیا اور ۷ جنوری ۱۸۸۶ء کو قول نامہ پر دستخط ہو گئے۔

اس قولنامہ میں اجارہ داروں کو بلا شرکت غیرے یہ حق دیا گیا تھا کہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں ۳۱ دسمبر ۱۸۹۱ء تک ہر قسم کے معدنیات کی تلاش اور جانچ کریں اور اس مدت کے اندر ایسے مقامات منتخب کرلیں جس کی معدنی کام کے واسطے انھیں خواہش ہو اور اس طرح جس رقبہ کا انتخاب کیا جائے، اُن کا اجارہ قولنامہ کی تاریخ سے ۹۹ سال کی مدت تک سرکار نظام کی طرف سے اُس محصول پر دیدیا جائے جو مائننگ انجنیر مقرر کرے ایسا ایک ایک انجنیر ہر فریق کی طرف سے مقرر ہوگا اور درصورت اختلاف رائے گورنمنٹ آف انڈیا کا مقرر کردہ انجنیر محصول مقرر کریگا۔ یہ حقوق ہر قسم کی معدنیات سونا، چاندی اور جواہر پر حاصل تھے، نیز یہ کہ اجارہ دار اس کے بھی ذمہ دار کیئے گئے تھے کہ کوئلہ کی کانوں کا کام (جو سنگارنی کول فیلڈس کے نام سے نامزد ہیں) فوراً جاری کردیں۔

کمپنی کے سرمایہ کی تعداد دس لاکھ پونڈ قرار پائی اور ایک حصّہ دس پونڈ تجویز ہوا۔ اِس لحاظ سے ایک لاکھ حصّے قرار دیئے گئے، جب اس طریقہ سے عہدنامہ مکمل ہو گیا تو گورنمنٹ ہند کے پاس بھیجا گیا، اس کے بعد سکریٹری آف اسٹیٹ نے اس پر غور کیا اور چند شرایط قایم کیں جن کی اطلاع اجارہ دارونکو دی گئی۔ اجارہ داروں نے ان شرائط کو منظور کیا، اور آخرکار ۲۷ جولائی ۱۸۸۶ء کو بہ پابندی ان ترمیمات کے سکریٹری آف اسٹیٹ کی منظوری کی اطلاع مسٹر واٹس کو لندن میں دی گئی۔

اب حصص کی فروخت شروع ہوئی اور منجملہ ایک لاکھ کے ۱۵ ہزار حصّے فروخت ہوئے جن کی قیمت بحساب ۵ پونڈ فی حصّہ ادا ہوئی، یہ حصّے آٹھ مختلف اشخاص نے خریدے۔ اس کے بعد ایک اقرارنامہ کے مطابق اجارہ کمپنی کے نام منتقل ہوا، اس شرط پر کہ پندرہ ہزار

حصص جن کے ۵ پونڈ فی حصّہ ادا شدہ سمجھے جائیں اشخاص متذکرہ (وہ ۸ شخص جو حصّہ دار تھے) کو عطا ہوں اور پچاسی ہزار کامل القیمت حصص اجارہ داروں کو ملیں، کمپنی اور مسٹر واٹسن اور مسٹر اسٹوارٹ کے مابین، اقرار نامہ میں یہ لکھا گیا کہ یہ عہد ہو چکا ہے کہ اجارہ دار کمپنی کے نام اجارہ منتقل کریں اور اس کے عوض میں کمپنی اجارہ داروں کو دس دس پونڈ کے پچاسی ہزار حصے دے جنکی پوری قیمت تمام اغراض کے لئے ادا شدہ سمجھی جائے۔ لہٰذا یہ طے پایا کہ کمپنی اجارہ داروں کو یا اُن لوگوں کو جن کو وہ نامزد کریں پچاسی ہزار کامل القیمت حصص عطا کرے، اور ان حصّوں کو اجارہ دار انتقال اجارہ کے متعلق اپنے تمام دعاوی اور مطالبات کی کامل ادائی میں قبول کریں۔ غرض ڈائرکٹروں[1] نے بعد تکمیل کارروائی پچاسی ہزار حصے بطور کامل القیمت حصص کے ۱۹ اگست ۱۸۸۶ء کو مسٹر واٹسن اور مسٹر اسٹوارٹ کو منتقل کیئے اور سارٹیفکیٹ بعد مہر و دستخط حصّہ پایوں کے حوالہ کیئے۔ ۲۴ اگست سنہ مذکور کو مسٹر واٹسن اور مسٹر اسٹوارٹ زائد ڈائرکٹر مقرر ہوئے جب ان دونوں کو پچاسی ہزار کامل القیمت حصص مل گئے تو اُنھوں نے باہم اس طرح ان حصص کو تقسیم کیا کہ مسٹر واٹسن مسٹر اسٹوارت اور دلیر جنگ کو ایک ایک ربع ملا، اور جو ایک ربع باقی رہا وہ دوسرے اشخاص کے درمیان تقسیم ہوا، اس کے علاوہ دلیر جنگ کو ان پندرہ ہزار حصص میں سے بھی ایک ربع ملا، اب ان لوگوں نے جن کو پچاسی ہزار حصص ملے تھے حصّوں کو فروخت کرنا شروع کیا۔ چنانچہ مسٹر واٹسن نے دلالوں کی معرفت اپنے حصّوں کی ایک معقول تعداد فروخت کرکے لاکھوں روپیہ حاصل کیا، اور کچھ حصے اُنھوں نے اپنے احباب کو ہدیتہً پیش کیئے، مثلاً مسٹر فرنیول انجنیر کو اُنھوں نے ۵۰۰ حصے مفت دیئے، جس کو اُنھوں نے گیارہ پونڈ فی حصّہ کی شرح سے فروخت کرکے پانچ ہزار پانسو پونڈ روپئے حاصل کیئے۔

اب سردار دلیر جنگ کو بھی اپنی محنت کا ثمرہ حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ اُنھوں نے نواب محسن الملک کے سامنے جو پولیٹکل و فنانشل سکریٹری تھے ایک یادداشت پیش کی جس میں

---

[1] ڈائرکٹروں کے نام حسب ذیل ہیں، مسٹر ہیٹن، مسٹر ہمرڈ، مسٹر ٹمن۔

یہ سفارش کی گئی کہ اعلیٰ حضرت نظام بھی کمپنی کے حصے خریدیں، اور اُنھوں نے عمدہ طور سے اُن اعتراضات سے بھی بحث کی جو لین دین کے اس طریقہ کے متعلق ہو سکتے تھے۔ نواب محسن الملک نے اس تجویز کی سفارش کر دی، مسٹر کاڈری (رزیڈنٹ) نے بھی اس تجویز کو پسند کیا، اور اعلیٰ حضرت نے حصص کی خریداری منظور فرمائی۔ چنانچہ سردار دلیر جنگ کو بحساب بارہ پونڈ فی حصہ دس ہزار حصص کی خریداری کا حکم دیا گیا۔

جب ان دس ہزار حصص کی خریداری عمل میں آئی اُس وقت سردار دلیر جنگ لندن میں تھے، اُنھوں نے مسٹر واٹسن سے ایک پرائیویٹ ملاقات کی باہم مشورہ ہوا اور آخر کار یہ قرار پایا کہ اس معاملہ کی باضابطہ تعمیل ضرور ہے کہ اس طریقہ سے کی جائے، جس طرح تبدیل سرمایہ کا معاملہ غرض ایک پیچیدہ طریقہ سے دلالوں کی معرفت سردار دلیر جنگ کے وہ حصے جو اُن کو باہم تقسیم میں ملے تھے سرکار نظام کے ہاتھ فروخت کر دیئے گئے اور اس طرح معمولی اُلٹ پھیر سے محض ذہانت اور ہوشیاری کی بدولت ایک لاکھ اکتیس ہزار دو سو پچاس پونڈ سردار صاحب بالقابہ کو ہاتھ آگئے گویا اُنھوں نے اس تدبیر سے خود اپنی گورنمنٹ سے یہ گراں قدر رقم حاصل کی۔

سرکار نظام کی خریداری کا اثر اچھا پڑا، جولائی ۱۸۸۸ء میں لارڈ لارنس اس کمپنی کے ایک ڈائرکٹر مقرر ہوئے، انھوں نے یہ عہدہ اس وجہ سے قبول کیا کہ نظام نے حصے خرید کیے ہیں اور یہ خیال کر کے کہ معاملہ کی تمام جزئیات و تفصیلات گورنمنٹ آف انڈیا اور انڈیا آفس کی وساطت سے طے ہو چکی ہیں اُنھوں نے پانسو حصص بھی خرید کیے۔

یہ ظاہر ہے کہ پچاسی ہزار حصص کے اس طرح تقسیم ہونے سے سرکار نظام کو نقصان پہنچا، اگر یہ حصے غیر کامل القیمت رہتے، تو اُن پندرہ ہزار حصوں کے علاوہ ان کے اجرا سے مختلف اوقات میں مزید سرمایہ حاصل ہو سکتا تھا، اور یہ سرمایہ زیادہ تر حیدرآباد میں صرف ہوتا جس سے ملک کو فائدہ پہنچتا، لیکن ان حصص کے اجارہ داروں کے نام منتقل ہو جانے سے ملک ان فائدوں سے جو اُس کو حاصل ہوتے محروم رہ گیا۔

جب یہ واقعات پیش آئے تو سر آسماں جاہ کا عہد وزارت شروع ہو چکا تھا، اور چونکہ وہ مخالفین کے اندر گھرے ہوئے تھے اس لیئے ہر معاملہ میں نہایت احتیاط اور غور و فکر سے کام لیتے تھے اب سردار دلیر جنگ انگلستان سے واپس آ چکے تھے، اور اُنھوں نے ایک یادداشت شایع کی تھی، جس میں ریلوے اور معدنیات کے معاملات پر بحث تھی اور بعض واقعات کو نہایت مبہم اور پیچیدہ طریقہ سے بیان کیا تھا۔ جب یہ یادداشت سر آسماں جاہ کی نظر سے گزری تو سب سے پہلے تو اُنھوں نے دلیر جنگ سے یہ سوال کیا کہ

"کیوں اور کس وثیقہ پر سردار صاحب نے ان صریح احکام سرکار عالی کے خلاف عمل کیا جس کا منشا یہ ہے کہ کوئی سرکاری کاغذ بلا ملاحظہ و منظوری مدار المہام طبع و شائع نہ کیا جائے، اس امر کی اطلاع کہ سردار صاحب کا ارادہ ہے کہ کوئی رپورٹ شائع کی جائے، اس وقت ہوئی جب وہ رپورٹ شائع ہو چکی تھی اور جب احکام مخولہ صدر کا عدول ہو چکا تھا"

اس اعتراض کے بعد اُنھوں نے رپورٹ کے مضامین اور مطالب پر توجہ کی ہے اور متعدد اعتراضات کرکے جواب طلب کیا ہے اور آخر میں اپنا حکم سردار دلیر جنگ کے متعلق جاری کیا ہے۔ ان میں سے بعض اعتراضات حسب ذیل ہیں :۔

(۱) کیا وجہ ہے کہ، جنوری ۱۸۸۶ء کے قولنامہ میں جو مسٹر واٹسن اور اسٹوارٹ کو دیا گیا کوئی شرط اس مضمون کی نہیں کی گئی کہ کمپنی مجوزہ حصّوں کی جو اجرائی کریگی اس کو اجارہ دار اجرائی اوّل پر محدود کر دینگے، جب کہ یہ معلوم تھا کہ سرکار انگریزی و سرکار نظام دونوں نے بارہا صاف طور پر تحریراً ہدایت دے دی ہے کہ حصّوں کی اجرائی "اجرائی اوّل" ہوگی اس غرض سے کہ غیر موصول شدہ سرمایہ موجود ہے تاکہ آیندہ کی ضرورتوں میں یا دوسرے مقامات پر کمپنی کے کاروبار کھولنے میں کام میں لایا جائے۔

(۲) معدنیات کی کمپنی کے ڈائرکٹروں نے جو پچاسی ہزار کامل القیمت حصّے اجارہ دار و ل

کی نذر کر دیئیے، اس کو سردار صاحب نے کیوں منظور کیا، یا بہرحال اس پر کیوں اعتراض نہ کیا، خصوصًا ایسی صورت میں جب کہ سردار صاحب کو معلوم تھا کہ سرکار انگریزی اور سرکار نظام دونوں کا منشاء اس کے خلاف تھا۔

(۳) جس وقت سردار صاحب کو معلوم ہوا کہ معدنیات کی کمپنی کا غیر وصول شدہ سرمایہ کے بارہ میں کیا قصد ہے تو معًا اپنی سرکار کو کیوں اس سے مطلع نہ کیا۔

(۴) سردار صاحب جواب دیں کہ وہ کون سی مشکل تھی جو اُن کو حصوں کے خریدنے میں جس کے لیئے وہ بحیثیت مختار سرکار عالی، ولایت بھیجے گئے تھے پیش آئی، تحریرات کے ملاحظہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر واٹسن سرکار کے لنڈن کے مختار کو پہنچنے کے بعد ۲۴ گھنٹہ کے اندر حصے ان کے قبضہ میں آ گئے۔

(۵) سردار صاحب نے سرکار نظام کے لیئے حصہ خریدنے کے واسطے مسٹر واٹسن کو کیوں مقرر کیا جب کہ سردار صاحب کو معلوم تھا کہ مسٹر واٹسن خود بھی ایک اجارہ دار ادر حیدرآباد کمپنی کے ایک ڈائرکٹر ہیں، اور ہر حالت میں ان کا یعنی مسٹر واٹسن کا حصوں کے فروخت ہونے میں ذاتی فائدہ متصور تھا، اگر مسٹر واٹسن سرکار عالی کے ولایتی مختار تھے تو کب، کیونکر، اور کس کے حکم سے اُن کی ماموری ہوئی تھی۔

(۶) حصوں کے خریدنے میں "بے انتہا ہوشیاری اور احتیاط" کام میں لانے کی جو ضرورت بیان کی گئی تھی اور جس کے بغیر حصوں کا ملنا ناممکن تھا، (حسب تحریر ضمیمہ یادداشت مرتبہ دلیر جنگ) اس کی تصدیق کے لیئے سردار صاحب نے کیا کارروائی کی تھی اور وہ "بے انتہا ہوشیاری اور احتیاط" کس طور پر کام میں لائی گئی۔

(۷) کیا سردار صاحب کو اجارہ داروں نے یا کسی اور شخص نے بلا واسطہ یا بالواسطہ کچھ حصے یا کوئی رقم بطور حق السعی یا اور کسی قسم کا مزد دیا، اگر دیا تو کس نے دیا، اور کیا دیا، کب دیا، کہاں دیا، اور کیوں دیا۔

سب کے آخر میں مدار المہام نے یہ لکھا کہ

"بہر حال سردار صاحب کی کارروائیاں، جو خود اُن کی یادداشت کے مضامین سے ظاہر ہوتی ہیں سرکار کی نظر میں ایسی سخت ہیں کہ تا وصول جواب و اختتام کارروائی، جو جواب آنے کے بعد سرکار کو مناسب معلوم ہو، مدار المہام سرکار عالی، سردار دلیر جنگ، دلیر الملک بہادر کو اُن کی خدمت معتمدی ہوم ڈپارٹمنٹ اور سرکاری ڈائرکٹری ریلوے و معدنیات سے معطّل فرماتے ہیں۔"

غرض سردار صاحب معطّل کر دیئے گئے اور اُن کی معطلی کی اطلاع ایجنٹ اور چیف انجنیر ریلوے اور معدنیات کو تحریراً دی گئی، اور انگلستان کے نیشنل پراونشل بنک کو بذریعہ تار یہ خبر بھیجی گئی۔ اس کے بعد معاہدہ کی تمام جزئیات پر از سر نو غور کیا گیا، اور جملہ کاغذات ماہرین قانون کو دکھائے گئے تو جو چالاکیاں اس معاملہ میں برتی گئی تھیں وہ ظاہر ہو گئیں جب واقعات نے یہ صورت اختیار کی تو معاملہ طشت از بام ہو گیا، اور پریس میں بھی اِن واقعات پر بحث چھڑ گئی جب انگلستان میں ان واقعات کی اطلاع ہوئی تو بڑے بڑے لوگوں کی توجہ اس طرف مائل ہو گئی مسٹر لابوشیر ممبر پارلیمنٹ نے اس معاملہ کے متعلق ہاؤس آف کامنز میں سوال کیا اور واقعات کی تحقیقات کے لیئے ایک کمیٹی قایم کرنے کی تجویز پیش کی غرض معاملات نے یہاں تک طوالت اختیار کی کہ آخر کار ایک پارلیمنٹری کمیٹی تحقیقات کے لیئے لندن میں قایم ہو گئی، جس کے ارکان سات جلیل القدر اشخاص مقرر کیئے گئے، اور کمیٹی کو اختیار دیا گیا کہ وہ اشخاص، کاغذات، اور امثلہ طلب کرے۔

کمیٹی قایم ہونے پر اُن اشخاص کی طرف سے جن کا تعلق اس معاملہ سے تھا، یہ درخواست پیش کی گئی کہ اُن کو بذریعہ اپنے کونسلیوں کے حاضر ہونے کی اجازت دی جائے، چنانچہ پارلیمنٹ نے منظوری حاصل کرنے کے بعد، کونسلیوں کو اجازت دی جائے کہ وہ حاضر ہوں اور بعض امور میں جو اظہار قلم بند ہوں اُس میں شریک رہیں، چنانچہ حضور نظام سردار دلیر جنگ، مسٹر واٹسن وغیرہ کی طرف سے کونسلی حاضر تھے۔

چونکہ معاملہ نہایت اہم تھا اس لیئے گورنمنٹ نظام نے مقدمہ کی پیروی کے لیئے نواب محسن الملک بہادر کو انگلستان روانہ کیا اور اُن کی مدد کے لیئے مسٹر فرید و نجی (حال نواب فریدون ملک) بھی شریک سفر کیئے گئے، نواب فتح نواز جنگ (مولوی مہدی حسن) پہلے سے انگلستان میں موجود تھے، بعد کو وہ بھی نواب محسن الملک کے ساتھ شریک کار کیئے گئے، اور ہندوستان میں اس مقدمہ کی کارروائی کا تمام بار نواب انتصار جنگ پر تھا، وہ یہاں سے برابر بذریعہ تار ہدایتیں بھیجتے رہتے تھے، مقدمہ کے متعلق معمولی واقعات بھی بذریعہ تار ہندوستان بھیجے جاتے تھے، اور تمام معاملات میں بذریعہ تار مشورہ لیا جاتا تھا، یہاں تک کہ کبھی کبھی نواب محسن الملک ان پابندیوں سے گھبرا اُٹھتے تھے، اور نواب انتصار جنگ کو خفا ہو کر لکھتے تھے کہ آپ ہزاروں میل کے فاصلہ پر بیٹھے ہوئے ہدایتیں جاری کیا کرتے ہیں آپ کو کیا خبر کہ یہاں کیا ہو رہا ہے اور کیسی مشکل کا سامنا ہے، لیکن جب خوش ہوتے تھے تو بڑے دلچسپ خطوط لکھا کرتے تھے، مقدمہ کے متعلق تو تمام معاملات تار کے ذریعہ سے طے ہوتے تھے اس لیئے خطوط میں بجز شکریہ یا شکایت کے اور کیا لکھتے، تاہم بعض خطوط سے نفس معاملہ کے متعلق بھی دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں، چنانچہ ذیل میں چند خطوط کے خاص خاص حصے نقل کیئے جاتے ہیں۔

لندن پہنچنے کے بعد سب سے پہلے جو خط بھیجا ہے اس میں لکھتے ہیں:۔

"میں بخیریت یہاں پہنچا اور ابتک جو کچھ ہوا، اس کی اطلاع تاروں پر دے چکا جس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہاں کیا ہوا، اور کیا ہو رہا ہے، اور میں نے کیا کیا۔ آج پہلا اجلاس کمیٹی کا ۱۲ بجے سے ہوگا اور غالباً ایک مہینہ لگیگا۔ میں امید کرتا ہوں کہ تمام کام مرضی کے موافق ہونگے، اور ہمارے سرکار کو ہر طرح کا فائدہ ہوگا، انڈیا آفس میں اب تک کوئی بُرا خیال تو سرکار کی اس کارروائی کی نسبت پایا نہیں جاتا × × × یہاں جن لوگوں کو یہ خیال تھا کہ ہمارے سرکار نے کارروائی راست بازی سے نہیں کی وہ خیالات اُن لوگوں کے دل سے جاتے رہے جو مجھ سے

ملے، جب میں یہاں آیا اور لوگوں کی باتیں سنیں تو مجھے ذرا تردد ہوا، مگر خود معاملہ ایسی عمدگی اور راست بازی سے کیا گیا تھا کہ ان غلط خیالات کے باطل کرنے کے لیئے صرف واقعات کا ظاہر کر دینا کافی تھا، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور لوگوں کو حقیقتِ حال معلوم ہونے پر اطمینان ہو گیا۔ یہاں آنے پر معلوم ہوا کہ سر دار صاحب نے طلسم قایم کر رکھا تھا اُن کا جادو گھر سرکار نے توڑ دیا۔

جناب لارڈ لارنس[۱] صاحب آئے، ایسے خفا تھے کہ بدن پر لرزا تھا اور بات منھ سے نہ نکلتی تھی کہنے لگے کہ میرے ساتھ نظام سرکار نے ایسا برتاؤ کیا ہے اور اس معاملہ میں وہ ایسی کارروائی کر رہی ہے کہ میں ابھی جا کر لارڈ کراس (وزیر ہند) سے کہتا ہوں، قریب تھا کہ رگِ ہاشمی جوش کرے اور بارہہ کے سید کو بھی غصہ آئے اور خوب گھونسے چلے، مگر صبر کیا اور اُن کو سمجھایا پھر تو وہ نہایت ہی شرمندہ ہوئے اور اپنے دوست کو گالیاں دینے لگے اور کہا کہ درحقیقت وہ نہایت ہی جھوٹا ہے۔ کارڈری صاحب (رزیڈنٹ) تشریف لائے تھے اُن کو اس قدر غصہ عبدالحق (دلیر جنگ) پر تھا کہ اُس کا بیان نہیں ہو سکتا اور اپنی کارروائی پر اتنا رنج کرتے تھے کہ آخر رونے لگے اور آنسو جاری ہو گئے۔ میں نے نواب صاحب (سر آسمان جاہ) کی طرف سے بہت کچھ تشفی کی اور کہا کہ سرکار کو آپ کی نسبت کچھ دوسرا خیال نہیں ہے اور وہ آپ کو نہایت متدین اور پاک سمجھتی ہے اس پر وہ بہت خوش ہوئے اور کئی دفعہ شکر گزاری کے الفاظ زبان پر لائے۔

ہاں یہ تو بھول ہی گیا کہ جناب لابوشیر دام اقبالہٗ سے ملا۔ مولانا کیا کہوں وہ تو عجب آفت کا پتلا ہے، ایسا آدمی تو نہ دیکھا، نہ سنا۔ وہ آدمی کا ہے کو ہے

---

[۱] ان بزرگ نے بھی ۵۰۰ حصے خریدے تھے، یہ سن کہ سرکار نظام نے بھی حصص خریدے ہیں۔

بلائے روزگار ہے اور اس پر حضرت مسخرے بھی ہیں، اور کوئی بات آپ کی ظرافت سے خالی نہیں، اور گو کہ آپ کمیٹی کے ممبر ہیں مگر اپنے گھر پر مقدمہ کے متعلق ایسی کارروائی کرتے ہیں کہ گویا وہ وکیل ہیں، نہ کسی سے پردہ ہے، نہ چوری، لوگوں کو بلانا، ان سے بات کرنا، مقدمہ کے حالات دریافت کرنا سب کچھ ہو رہا ہے۔ میں نے مہدی حسن سے کہا کہ دیکھئے یہ جج ہیں، کہا کہ لندن کے جج ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔"

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں :-

"میرا اظہار ہو گیا، سرکار عالی کی عزت اور وقعت کے خیال سے مجھ حلف نہیں دیا، میرے بیانات نہایت ہی سچے اور احتیاط کے تھے، سر رچرڈ ٹمپل بہت ہی تعریف کرتے تھے، اور لابوشیر مارٹن سے کہتے تھے کہ کمیٹی بہت خوش ہوئی اور گورنمنٹ نظام کے انصاف اور سچائی کا ایک ثبوت ملا۔"

ابتدا میں مقدمہ کی پیروی صرف نواب محسن الملک کے متعلق کی گئی تھی ان کے انگلستان جانے کے کچھ دنوں بعد نواب فتح نواز جنگ (مہدی حسن) بھی بطور جونیر ممبر نواب محسن الملک کے شریک کار بنائے گئے اور ایک تار کے ذریعہ سے اُن کو اس انتظام کی اطلاع دی گئی، یہ امر نواب محسن الملک کو بہت ناگوار گزرا اور اُنھوں نے خفا ہو کر لکھا :-

"مولوی صاحب مجھ سے آپ کو ایسا برتاؤ کرنا مناسب نہ تھا، اور جو شخص آپ کی محبت اور راستبازی اور دیانت اور دوستی پر پورا اعتماد رکھتا تھا اس کے ساتھ صفائی کا معاملہ رکھنا ہی لازم تھا بھلا یہ کوئی دوستی کی بات ہو سکتی ہے کہ اول تو آپ نے مجھے بھیجا، تمام اختیارات مجھے دیئے، تحریری اور زبانی مجھ پر پورا بھروسہ ظاہر کیا، اور چند روز تک اس پر عمل بھی کیا

پھر خدا جانے کیا ہوا کہ آپ نے بغیر میرے پوچھے، بغیر میری درخواست کے دوسرے کو شریک کر دیا اور اس کی مجھے صاف صاف اطلاع بھی نہ دی اگر آپ نے رزیڈنٹ کو یا انڈیا آفس کو لکھا ہو تو اُس سے صاف کیوں نہ مطلع کیا، کہ میں اتنے دنوں تک خواب غفلت میں نہ رہتا اور اب تک کب کا روانہ ہو گیا ہوتا، کیا ایک لحظہ کے لیے بھی میں ایسی ذلت برداشت کر سکتا تھا کہ مجھ پر بے اعتمادی کیجائے اور تمام نقشہ بدل دیا جائے اور پھر مجھ سے یہ اُمید کی جائے کہ میں صرف نوکری کے لیئے ان سب روحانی مصیبتوں کو اپنے اوپر گوارا کروں۔"

لیکن جب انتصار جنگ نے بذریعہ تار اصلی واقعات سے اطلاع دے کر اُن کی غلط فہمی رفع کر دی تو وہ مطمئن ہو گئے اور لکھا کہ:۔

"آپ کا تار آیا اور جب آپ نے ایسے الفاظ میں اپنا افسوس ظاہر کیا تو میں نہایت ہی پاجی ہوں کہ اس پر یقین نہ کروں یا اب ذرا بھی اس بات کا خیال دل میں رکھوں، لیجئے میرا دل صاف ہو گیا، اب اس کا خیال بھی میرے دل میں نہ آئے گا، نہ آپ اس کا آئندہ ذکر کیجئے۔"

ایک خط میں شکوہ و شکایت کے بعد نواب انتصار جنگ کو لکھتے ہیں:۔

"جب آپ ساری کہانی سنو گے اور امیر حمزہ کی داستان ختم ہو گی اُس وقت قبلہ ضرور آپ تسلیم کرو گے کہ غریب بارہہ کے سید نے نہ حماقت کی نہ شرارت، اور آپ نے جس کام پر اُسے بھیجا اس میں نا اُمیدی نہیں ہوئی۔ ہاں البتہ اس بیچارے کی جان کے لالے پڑ گئے اور تمام عمر کے لیے نکما ہو گیا، ایسا داغ لگ گیا کہ جس سے جان بری نہایت مشکل ہے۔ غرض کہ حضرت ہم تو اپنی جان پر کھیل گئے، ڈاکٹروں کی نہ سنی جان دینے ہی پر آمادہ ہو گئے، اور آپ نے یہ قدر کی، سبحان اللہ وبحمدہ۔"

اسی طرح متعدد خطوط میں اُنھوں نے نہایت وضاحت کے ساتھ اُن مشکلات کا ذکر کیا ہے جن سے اُن کو مقابلہ کرنا پڑا، ایک خاص دشواری یہ تھی کہ سردار دلیر جنگ اور اُنکی پارٹی نے گورنمنٹ نظام، اور مدار المہام کے متعلق انگلستان میں پروپگنڈا شروع کردیا تھا، اور لوگوں کو یہ باور کرایا جاتا کہ مدار المہام ذاتی عداوت کی بنا پر دلیر جنگ کو ذلیل کرنا چاہتے ہیں، ایک کوشش مخالفین کی طرف سے یہ بھی جاری تھی کہ گورنمنٹ ہند کو سرکار نظام سے بدظن کردیں، اور یہ ظاہر کریں کہ ریاست نے جو طریقہ کارروائی اختیار کیا ہے اُس سے رزیڈنٹ اور گورنمنٹ ہند کی ایک گونہ بدنامی ہوتی ہے کہ اُنھوں نے عہدنامہ کے معاملہ میں کافی احتیاط سے کام نہیں لیا اور ریاست کے فائدہ کو نظر انداز کردیا، نواب انتصار جنگ اس حقیقت کو سمجھ گئے تھے کہ اُن کے ہوشیار مخالف کس قسم کا جال پھیلا رہے ہیں اس لئے وہ نہایت احتیاط اور استقلال سے کام کرتے تھے، اور نواب محسن الملک کو بھی یہ ہدایت کردی گئی تھی کہ انگلستان میں بغیر انڈیا آفس کی صلاح و مشورہ کے کوئی کام نہ کریں، چنانچہ نواب محسن الملک نے مقدمہ کی پیروی کے علاوہ وزیر ہند اور انگلستان کے اکثر جلیل القدر اور ذمہ دار اشخاص کے خیالات کی اصلاح کی، اور اپنے طرز عمل سے گورنمنٹ نظام کی وقعت میں اضافہ کیا، اور حیدرآباد میں نواب انتصار جنگ نے معاملات کو پورے طور پر قابو میں رکھا اور علاوہ اپنے عہدہ کے فرائض کے، نواب محسن الملک کے عہدہ (معتمد پولیٹیکل و فنانس) کا کام بھی بڑی قابلیت سے انجام دیا، اور وزارت کی پالیسی پر عمدہ طریقہ سے عمل کیا، یہاں تک کہ نواب فتح نواز جنگ نے اپنے ایک خط میں اس کا اعتراف کرتے ہوئے اُن کو لکھا:-

"ہماری حالت یہ ہے کہ آپ سے خفا ہوتے ہیں، آپ کو الزام دیتے ہیں،
مگر روز بروز آپکے قائل ہوتے جاتے ہیں، کم سے کم یہ تو ضرور کہینگے کہ بڑی
بے خوفی اور مضبوطی اور ایمانداری کے ساتھ اس عرصہ میں گورنمنٹ کو آپنے
چلایا، اور بے انتہا تعریف کے قابل آپ کی پالیسی ہے"

مقدمہ کی تحقیقات کافی مدت تک جاری رہی، بڑے بڑے لوگوں کی شہادتیں ہوئیں بہت سے دلچسپ واقعات کا انکشاف ہوا۔ مسٹر کارڈری سابق رزیڈنٹ کی بھی شہادت ہوئی، جن کے زمانہ میں معاہدہ

کی تکمیل ہوئی تھی، جرح کے وقت وہ پریشان ہو گئے، اور بہت لغو و فضول باتیں اُن کی زبان سے نکل گئیں
اُن کا طرزِ عمل اس معاملہ میں ایسا تھا کہ بعض حلقوں میں خود اُن کی حالت مشتبہ سمجھی جاتی تھی، اور اسی سلسلہ
میں اعلیٰ حضرت کے پرائیویٹ سکرٹری کرنل مارشل کا نام بھی بُرے طریقہ سے لیا جاتا تھا۔

مسٹر کاڈری کے متعلق اس وقت لوگوں کے جو خیالات تھے، اس کا کسی قدر حال اس خط سے
معلوم ہوتا ہے جو مسٹر جے سیمور کے نے (جو اس مقدمہ میں سرکار نظام کے ایک مشیر تھے) نواب انتصار جنگ
کو لکھا ہے، جس کے چند فقرے اس موقع پر نقل کئے جاتے ہیں۔ مسٹر سیمور کہتے ہیں:-

"جو کچھ عبدالحق (دلیر جنگ) نے کیا وہ دونوں سلطنتوں کے سامنے کھلے بندوں کیا گیا ہے اس نے اور کاڈری (رزیڈنٹ) نے درحقیقت ہر قسم کا انتظام کیا، اور گورنمنٹ آف انڈیا نے بڑی بھاری غلطی کی جو اس پر (رزیڈنٹ پر) اعتبار کیا۔ میں کاڈری پر جرح تیار کر رہا ہوں جو سلیکٹ کمیٹی کے سامنے ہوگی اور یہ اس کے واسطے ایک نہایت ہی ناگوار تجربہ ہوگا جو اس کو کبھی اپنی عمر میں نہ ہوا ہوگا .... صرف کاڈری ہی ایک ایسا شخص رہ گیا ہے جو عبدالحق سے وابستہ ہے اور اس وابستگی کا سبب ادنیٰ سے ادنیٰ حیثیت کے شخص پر بھی ظاہر ہے، کیونکہ حیدرآباد میں برٹش رزیڈنٹ کی حیثیت سے اس کا فرض تھا کہ ایسے تغلب کو روکتا بجائے سدِباب کرنے کے اس نے ان بدنام کُن معاملات کو ترقی دی اور گورنمنٹ آف انڈیا تک پہنچایا۔

کاڈری کے لئے اگر کوئی ممکن عذر اس بدنام کن کارروائی کے متعلق ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ عبدالحق کی دیانت پر کامل بھروسہ اور اعتقاد کرے۔ جو بیوفائی نظام کے فوائد و اغراض کی نسبت اس نے عمداً برتی ہے اس کا اخفا اسی طرح ہو سکتا ہے، اور کاڈری جب تک ایسا اندھا اعتقاد عبدالحق کی دیانت کے متعلق ظاہر نہ کرے، اُس وقت تک خود اس کا کیرکٹر الزام سازش سے

محفوظ نہیں رہ سکتا۔"

غرض طویل تحقیقات کے بعد کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی کہ :-

(۱) اجارۂ معدنیات اجارہ داروں کے حق میں نہایت سودمند ہوا، کیونکہ کمپنی کے سرمایہ میں سے آٹھ لاکھ پچاس ہزار پونڈ اُن کے ہاتھ آئے، اب رہا یہ معاملہ کہ منجملہ ایک لاکھ حصص کے پچاسی ہزار حصص کیونکر اجارہ داروں کو حاصل ہوئے، تو اس کے متعلق یہ اقبال کیا جاتا ہی کہ اجارہ دار جب کسی اجارہ کو کسی کمپنی کے ہاتھ فروخت کریں تو وہ اس فروخت سے فائدہ اُٹھانے کے مستحق ہیں، چنانچہ موجودہ معاملہ میں مسٹر واٹسن نے یہ بیان کیا کہ "اقرارنامہ" کی شرائط کے اندر، اجارہ داروں کو ان پچاسی ہزار حصص سے فائدہ اُٹھانے کی گنجایش تھی۔

(۲) کمیٹی سرکار نظام، یا اجارہ داروں، یا کمپنی یا حصہ داروں کے قانونی حقوق یا ذمہ داریوں کی نسبت رائے ظاہر کرنے سے احتراز کرتی ہی، لیکن اُس کی یہ رائے ہی کہ اجارہ دار اجارہ کو اُس سے زیادہ بڑے بڑے فوائد حاصل کرنے کے کام میں لائے جن کے عطا کرنے کا ارادہ نہیں کیا گیا تھا، اور یہ فائدے اس طور سے حاصل کیئے گئے کہ اُس ریاست کو جس سے اُن کو (بہ اعانت اپنے شریک عبدالحق کے) اجارہ ملا، نقصان پہنچا۔

(۳) کمیٹی نے یہ رائے قایم کی کہ اگر یہ پچاسی ہزار حصص غیر کامل القیمت رہتے تو اجرائی اوّل کے پندرہ ہزار حصوں کے علاوہ اُن کے ذریعہ سے سرمایہ حاصل ہوتا جو زیادہ تر حیدرآباد کے ملک میں صرف ہوتا، جس سے اس ملک کو فائدہ پہنچتا، لیکن اجارہ داروں کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے، ملک کو نقصان پہنچا۔

مندرجۂ بالا نتائج کے علاوہ کمیٹی نے یہ رائے بھی قایم کی کہ :-

"جن حالات میں اجارہ معدنیات حاصل کیا گیا اُن سے واضح ہوتا ہی کہ کس قدر ضرر ہندوستانی ریاستوں کو لندن کے منصوبہ بازوں کے

بلا واسطت ہندوستانی وزرا تک دخل پانے سے پہنچ سکتا ہے معاملہ حال میں ابتدائی انتظامات عبدالحق اور اجارہ داروں کے مابین ہوئے اور جب ایک مسودہ اُن کے زیر ہدایت مرتب ہو چکا، انگریزی عہدہ داروں نے اس پر غور کیا، جب یہ معاملہ رزیڈنٹ، گورنمنٹ آف انڈیا اور سکریٹری آف اسٹیٹ کے سامنے پیش ہوا تو اُن میں سے کوئی بھی عبدالحق کے حالات سے جس سے احتیاط رکھنے کی ضرورت تھی واقف نہ تھا۔

اِس سے قطع نظر کر کے یہ صاف ظاہر ہے کہ قول نامہ کی شرائط پر کم غور کیا گیا بمقابلہ اُس کے جو اس وقت کیا جاتا جب شرائط مذکور سرکار نظام کے کارپرداز کی طرف سے منظور نہ کر لی گئی ہوتیں، یہ نتیجہ قابل افسوس ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اگر زیادہ مؤثر، بلاواسطہ مدد و صلاح گورنمنٹ حیدرآباد کو سرکار انگریزی کی طرف سے ملتی تو جو کچھ گزرا ہے وہ نہ ہونے پاتا۔"

کمیٹی کی تحقیقات کے سلسلہ میں جب یہ ظاہر ہو گیا کہ دلیر جنگ نے خود اپنے حصّے سرکار نظام کے ہاتھ فروخت کر ڈالے اور ریلوے کے معاملہ میں تراسی ہزار پونڈ بطور حق السعی حاصل کیے تو سردار دلیر جنگ نے سر سالار جنگ اوّل مرحوم کا ایک خط پیش کیا جس میں سردار صاحب کو یہ لکھا گیا تھا کہ :-

"میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ریلوے اور معدنیات کے معاملہ میں کوئی معاوضہ لینے پر جس سے وہ لوگ تمھاری خدمتوں کا تمھیں انعام دینا چاہیں مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا، اور یہ کہ جو کچھ تمھیں ان لوگوں سے ملے گا اُسے میں صرف تمھارا ہی حق سمجھوں گا۔"

مگر اس خط کا مقدمہ کی کارروائی پر کوئی اثر نہیں پڑا، اور اُس کی اصلیت پر بھی شبہ کیا گیا۔

کمیٹی کے تقرر کے بعد ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ جب کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا تو اُس کو باضابطہ طور پر اطلاع دی گئی کہ حضور نظام سے حصص کی خریداری کا جو معاملہ ہوا تھا وہ باہمی انتظام سے منسوخ کر دیا گیا، اور جو روپیہ سرکار نظام نے صرف کیا تھا وہ حضور نظام کو واپس ملگیا غرض جہاں تک حصص کی خریداری کا تعلق تھا معاملہ صاف ہو چکا تھا، اور اب صرف یہ امر زیر بحث تھا کہ آیندہ کمپنی کے متعلق کیا صورت اختیار کی جائے؟

ایک صورت یہ تھی کہ کمپنی سے جو عہدنامہ ہوا ہی وہ فسخ کر دیا جائے لیکن اوّل تو یہ امر مشتبہ تھا کہ ایسا ہونا بہ آسانی ممکن بھی ہی یا نہیں، اس کے علاوہ یہ کہ اس کارروائی سے کمپنی کو بہت نقصان پہونچتا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ مناسب شرائط پر جو فریقین میں سے کسی کے لیے مضر نہ ہوں مصالحت کر لی جائے، اس معاملہ میں دوسری طرف سب سے زیادہ نمایاں شخصیت مسٹر واٹسن کی تھی اور انہی کے طرز عمل پر مصالحت کا دارومدار تھا، کمیٹی کی تحقیقات کا نتیجہ شائع ہو چکا تھا، اور نواب محسن الملک ابھی انگلستان میں موجود تھے، اُنھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ بہترین قانونی مشورہ اور ایسے مستند لوگوں کی رائیں حاصل کی جائیں، جن پر پبلک کو اعتماد ہو، چنانچہ اُنھوں نے اس معاملہ میں وزیر ہند سے رہنمائی کی درخواست کی، اور اُنھوں نے تین اعلیٰ درجہ کے سالیسٹروں کے نام اُن کو بتائے، نواب محسن الملک نے ان لوگوں کی خدمات حاصل کیں اور اُن سے بحث و گفتگو کر کے اہم و پیچیدہ معاملات کو سلجھانے کی کوشش کی، ایک ماہرِ فن اور تجربہ کار بیرسٹر نے معاملہ پر غور کرنے کے بعد یہ رائے دی کہ گورنمنٹ نظام کو اس عطیہ (معدنیات) کے منسوخ کر دینے کا حق حاصل ہی۔

غرض مسٹر واٹسن اور اُن کے رفقا سے ماہرینِ قانون کے ذریعہ سے گفتگو جاری رہی مگر کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا، اور نہ نواب محسن الملک اپنی گورنمنٹ سے مشورہ لیئے بغیر کوئی قطعی فیصلہ کر سکتے تھے، اور چونکہ اُن کی صحت خراب ہو چکی تھی، ڈاکٹروں کے مشورہ کے مطابق وہ ہندوستان روانہ ہو گئے، اور ماہرین قانون کے مشورہ سے جو تجاویز مرتب کی گئی تھیں، ان کا مسودہ اُنھوں

نے اپنے ساتھ لے لیا۔

نواب محسن الملک کی روانگی کے سلسلہ میں وزیر ہند نے وائسرائے کے نام حسب ذیل تار صیغۂ راز میں بھیجا۔

"مہدی علی معیت رابرٹسن بارادہ ہندوستان ۱۱ راکتوبر کو جہاز پر روانہ ہوگا، غالباً سرکار نظام کے روبرو تصفیہ کی وہ تجویزیں جن کی نسبت واٹسن کے سولسٹروں سے بات چیت ہو چکی ہے وہ پیش کریگا، رزیڈنٹ کو لازم ہے کہ ہندوستان کے مباحثہ کی نسبت رپورٹ کرے۔"

اسی سلسلہ میں ۲۴ رنومبر ۱۸۸۸ء کو وزیر ہند نے ایک اور تار "بصیغۂ راز" وائسرائے کے نام بھیجا، کہ:۔

"پارلیمینٹ میں سوال ہوا، حیدرآباد کے غور وخوض میں کیا ترقی ہوئی"

وائسرائے نے رزیڈنٹ سے دریافت کیا، جس نے بذریعہ تار جواب دیا:۔

"بات چیت ہو رہی ہے لیکن واٹسن سرکار نظام کی تجویز کو نامنظور کرتا ہے، آخری کارروائی کے متعلق لندن کے کونسل سے مشورہ لیا گیا ہے، خط بعد کو روانہ ہوتا ہے، بغیر سابقہ اطلاع کے کوئی قطعی بات بیان نہ ہوگی۔"

غرض اب معاملہ کے لئے ۲۱ رجنوری ۱۸۸۹ء کو رزیڈنسی میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مدارالمہام کے تمام معتمدین، اور نواب فتح نواز جنگ شریک تھے، یہ سب لوگ باہم مختلف الرائے تھے، نواب محسن الملک کو نواب فتح نواز جنگ کی رائے سے اختلاف تھا، نواب انتصار جنگ نے علیحدہ ایک مفصل یادداشت تیار کی تھی، غرض کوئی تصفیہ اس وقت نہ ہوسکا، اور مدارالمہام اور رزیڈنٹ کے مابین سلسلہ مراسلت جاری رہا، رزیڈنٹ کو نواب محسن الملک کی تجاویز پسند نہیں لیکن سر آسمان جاہ کو نواب انتصار جنگ کی یادداشت کے مطابق تصفیہ کرنا پسند تھا، اور آخر کار اسی یادداشت کی بنیاد پر کافی مباحثہ کے بعد تصفیہ ہوگیا۔ اور جدید معاہدہ کے ماتحت ستر ہزار روپیہ

کے حصص گورنمنٹ نظام کو حاصل ہوئے۔

لنڈن ٹائمز نے اس جدید معاہدہ پر اظہارِ طمانیت کرتے ہوئے لکھا کہ

"خاص خاص معاہدے جو اس اقرار کے رو سے ہوئے ہیں، یہ ہیں کہ کہ اجارہ دار ایک لاکھ پچاس ہزار پونڈ کی رقم بطور سرمایۂ اضافی بکار کے فراہم کرینگے جس پر اس وقت تک کوئی منافعہ نہ دیا جائے گا، جب تک کہ پانچ فیصدی معمولی (اصلی) سرمایہ پر تقسیم نہ ہولے، اس شرط کے عوض میں کوئلہ کے کانوں کی تلاش کرنے کی مدت ۳۱ر دسمبر ۱۸۹۱ء تک بڑھا دی گئی ہے، جس کی وجہ سے یہ مدت اُس مدت کے مطابق ہوگئی ہے کہ اس سے قبل سونے اور جواہرات کے متعلق عطا کی جا چکی ہے × × × × × محاصل شاہی اور مستاجری، ذیلی اور تفصیلی باتیں ہیں جو یقیناً عمدہ طور پر سرکار عالی اور کمپنی کے مابین طے ہو جائینگے اس لئے کہ اب تمام امور متنازعہ فیہ کا تصفیہ ہو چکا ہے اور اُن کو ماضی کے مدفن میں جگہ مل چکی ہے۔"

کمپنی سے تو معاملہ طے ہو گیا لیکن قانونی مشیروں کی رائے سے سردار دلیر جنگ پر دیوانی میں مقدمہ چلایا گیا جو بمبئی ہائیکورٹ میں پیش ہوا، جواب دعوی کے سلسلہ میں دلیر جنگ نے ایسے کاغذات پیش کئے جو سر سالار جنگ اول و ثانی اور کرنل مارشل کے زمانہ سے تعلق رکھتے تھے، اور ان تحریروں کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ اعلیٰ حضرت کی منظوری سے لکھی گئی ہیں، اب مشکل یہ تھی کہ دونوں سالار جنگ وفات پا چکے تھے، اور کرنل مارشل کے متعلق کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ کیا بیان کرینگے واقعات کی نوعیت کے لحاظ سے یہ لازم آتا تھا کہ اعلیٰ حضرت کا اظہار باضابطہ قلمبند کیا جائے، لیکن سر آسماں جاہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ اعلیٰ حضرت کو زحمت دیجائے اس لیے اُنھوں نے چاہا کہ دلیر جنگ سے مصالحت کر لیں لیکن اسی زمانہ میں "سر پلوڈن" رزیڈنٹ ہو کر حیدرآباد آگئے تھے جو "خاص قسم" کی شہرت رکھتے تھے۔ اُنھوں نے مدار المہام سے اختلاف کیا اور زور دیا کہ مقدمہ

ضرور چلا یا جائے، لیکن سر آسمان جاہ نے اس کو کسی طرح منظور نہ کیا، اور مصالحت کرلی گئی لیکن اس واقعہ نے یلوڈن کو سر آسمان جاہ سے برہم کردیا۔

معدنیات کے معاملہ میں اگرچہ سردار دلیر جنگ نے کوئی کامیابی یا نیک نامی نہیں حاصل کی، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر بدقسمتی سے یہ واقعات پیش نہ آجاتے تو وہ حیدرآباد میں سب سے زیادہ با اقتدار اور دولتمند شخص ہوتے۔ مسٹر نارٹن (مشہور بیرسٹر) نے جن کو دلیر جنگ سے سابقہ پڑا تھا بالکل سچ کہا ہے کہ

"بہت سی صورتوں میں وہ (دلیر جنگ) ایک قابل توجہ آدمی تھا، اس کی قابلیت میں کوئی شک نہیں۔ اس نے اپنی زندگی کی ترقی کا پہلے سے راستہ بنا لیا تھا، اور بہت بہادری کے ساتھ اس نقشہ کے مطابق عمل کیا، فنانس اس کی خاص چیز تھی اور وہ پورا بزنس مین تھا، اس نے ریاست کو سیاسی اور اقتصادی اصول پر لوٹا۔"

نواب فتح نواز جنگ کا معاملہ اور رزیڈنٹ کی مداخلت

ریاست کے معاملات میں رزیڈنٹ کی مداخلت سر سالار جنگ کے زمانہ سے قایم تھی، اور سر آسمان جاہ بھی جہاں تک ممکن ہوتا تھا رزیڈنٹ کی خوشنودی کا خیال رکھتے تھے، تاہم وہ عام طور پر مداخلت کو ناپسند کرتے تھے۔ اور انھوں نے اپنا یہ خیال ایک دفعہ خود اعلیٰ حضرت کے سامنے بھی تحریراً ظاہر کر دیا تھا۔ سر سالار جنگ کے عہد میں مداخلت کا جو سلسلہ جاری تھا اس کے متعلق یہ عذر کیا جا سکتا تھا کہ اعلیٰ حضرت کی نوعمری کی وجہ سے مداخلت اور نگرانی کی ضرورت ہے، لیکن اعلیٰ حضرت کے بااختیار ہونے کے بعد ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت کے کوئی معنے نہ تھے۔ مگر بااین ہمہ یہ مداخلت بدستور جاری تھی۔

مقدمہ معدنیات کے زمانہ میں بجائے مسٹر کارڈری کے مسٹر ہاول حیدرآباد کے قایم مقام رزیڈنٹ مقرر ہوئے۔ یہ ایک معمر اور تجربہ کار شخص تھے، اس لیے بظاہر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ان کا زمانہ پرسکون رہیگا لیکن یہ خیال غلط نکلا زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ انھوں نے مولوی مہدی حسن (نواب فتح نواز جنگ) کے معاملہ سے مداخلت کی ابتدا کی۔

واقعہ یہ تھا کہ اُن عمدہ خدمات کے صلہ میں جو مولوی مہدی حسن نے مقدمہ معدنیات کے متعلق انگلستان میں انجام دی تھیں، اعلیٰحضرت کی منظوری سے اُن کے لیئے ہوم سکریٹری کا عہدہ تجویز کیا گیا، مسٹر ہاول نے بغیر کسی معقول وجہ کے اِس تقرر پر اعتراض کیا۔ سر دار دلیر جنگ کے علیحدہ ہونے کے بعد اس عہدہ پر عارضی طور پر مولوی سید علی صاحب بلگرامی کا تقرر کر دیا گیا تھا، اور وہ خود بھی اس جگہ پر رہنا چاہتے تھے اور اس کے لیئے کوشش کر رہے تھے، اس لیئے معاملہ اور بھی پیچیدہ ہو گیا تھا، بدقسمتی سے نواب محسن الملک کے تعلقات بھی مولوی مہدی حسن سے اچھے نہ تھے، لیکن نواب انتصار جنگ اُن کو پسند کرتے تھے اور اُن کی قابلیت کے معترف تھے، مگر مسٹر ہاول کو مولوی مہدی حسن سے کچھ ایسی بدگمانی تھی کہ وہ کسی موقع پر بھی اُن کی خدمات سے فائدہ اُٹھانا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ نواب محسن الملک اپنے پرائیویٹ روزنامچہ میں

۱۵ر جنوری ۱۸۸۹ء کو لکھتے ہیں :-

"۷ بجے شب کے ڈاکٹر لاری صاحب کے یہاں دعوت تھی۔ ہاول صاحب بھی آئے تھے، بہت دیر تک معدنیات کے مقدمہ کی بات چیت ہوتی رہی، ان کی تقریر سے نہایت خفگی مولوی مہدی حسن کی نسبت پائی گئی، میں نے کہا کہ گناہ سے زیادہ اُن کو سزا دی جاتی ہے، اگر کچھ اُن کی خطا ہو بھی تو وہ اسے غلطی ہے نہ کہ نیت کی، میں نے صاف لفظوں میں ہاول صاحب سے کہا کہ اُن کی دیانت داری اور ایمان داری میں کچھ شبہ نہیں ہے اور جب تک میں ولایت میں رہا، اور اب بھی مجھے اس کے باور کرنے کے وجوہ معلوم ہیں کہ وہ ایمان دار ہیں، اِس لیئے ان کو اس مقدمہ (معدنیات) کے مشورہ میں ضرور شریک کرنا چاہیئے، ہاول صاحب نے کہا کہ میں دیانت وغیر دیانت سے بحث نہیں کرتا، میں اُن کو بالکل اس کام کے لائق نہیں جانتا نہ اُن کے مشورہ کو کچھ مفید جانتا ہوں۔"

نواب محسن الملک نے رزیڈنٹ سے جو کچھ کہا ہو، لیکن واقعات سے یہ ثابت ہے کہ وہ اور اُن کی پارٹی نواب مہدی حسن کو ناپسند کرتی تھی، لیکن نواب انتصار جنگ اُن کے تقرر کی حمایت میں تھے، کیونکہ اعلیٰحضرت اس تقرر کا حکم دے چکے تھے اور مدار المہام اس کا اعلان کر چکے تھے، لہٰذا اس حکم کی تنسیخ سے اعلیٰحضرت اور مدار المہام کے رعب و اقتدار کو صدمہ پہنچنے کا احتمال تھا۔ اِس بنا پر انھوں نے سر آسمان جاہ کو مشورہ دیا کہ اس تقرر پر اصرار کریں لیکن باوجود سر آسمان جاہ کے اصرار کے مسٹر ہاول اپنی رائے تبدیل کرنے پر آمادہ نہ ہوئے، اور گویا انھوں نے مولوی

مہدی حسن کے مقابلہ میں ایک حریفانہ حیثیت اختیار کرلی۔ مسٹر ہاول نے جو الزامات لگائے تھے، نواب مہدی حسن نے اُس کا معقول و مدلّل جواب دیا، اور یہ نوٹس دیا کہ اگر اُن کی تردید قبول نہ کی گئی تو وہ سارا معاملہ گورنمنٹ آف انڈیا کے سامنے پیش کرینگے، غرض اس معاملہ کی بدولت یہاں تک نوبت پہنچی کہ رزیڈنٹ اور سر آسماں جاہ کے مابین سخت بے لطفی پیدا ہوگئی۔

اِن واقعات کی اب اسقدر شہرت ہوگئی کہ اخبارات میں بھی بحث چھڑ گئی، اور مسٹر ہاول کی مداخلت کو بُری نظر سے دیکھا گیا، چنانچہ دکن ٹائمز مورخہ ۷ ارجنوری ۸۹ء نے اس معاملہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا:۔

"آیا مسٹر کارڈری ابھی تک رزیڈنسی میں موجود ہیں تاکہ سلطنت نظام کے اندرونی معاملات میں غیر منصفانہ اور تحکمانہ مداخلت کرتے رہیں اور نظام گورنمنٹ کو آئے دن اُس کے احکام بدلنے پر مجبور کرتے رہیں۔ کچھ روز ہوئے کہ یہ افواہ مشہور ہو رہی تھی، کہ نواب فتح نواز جنگ کے ہوم سکرٹری کے عہدہ پر تقرر کے وقت رزیڈنٹ نے یہ اعتراض کیا تھا کہ جب کہ مسٹر عبدالحق (دلیر جنگ) کی معطلی پر سید علی بلگرامی کا تقرر عہدہ ہوم سکرٹری پر مشورہ رزیڈنٹ کیا گیا تھا تو مستقل طور پر تقرر کرتے وقت رزیڈنٹ کا مشورہ کیوں نہیں لیا گیا۔ ہم کو نہیں معلوم کہ گورنمنٹ نے اس کا کیا جواب دیا تھا، اور ہم اس بات کا یقین نہیں کرسکتے کہ ایسے وقت میں جب کہ رزیڈنٹ کی کرسی پر مسٹر ہاول رونق افروز ہوں (جن کی نسبت یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ موجودہ عہد نامہ کے مخالف اندرونی انتظامات ریاست میں دست اندازی کرینگے) ایسے واقعات کا اعادہ ہوگا۔"

حیدر آباد گارڈ کی تحریر سے ہمارے دل میں اس امر کا شبہ پیدا ہوتا ہے کہ نواب فتح نواز جنگ کا اپنے جدید عہدہ کا اس وقت تک چارج نہ لینا رزیڈنٹ کی کسی ایسی ہی

کارروائی کی وجہ سے ہے، نہیں معلوم کہ اس قسم کی مداخلت رزیڈنسی کی طرف سے کب تک جاری رہیگی۔"

"یہ بھی افواہ ہے کہ بعض اعلےٰ عہدہ داران ریاست بھی سید علی بلگرامی کا تقرر مستقل طور پر اس عہدہ پر چاہتے ہیں اور اس کے واسطے اپنی پوری کوشش صرف کر رہے ہیں۔ ریاست کے ملازمین کے لیئے اپنی خواہشات نفسانی کے پورا کرنے کی غرض سے ریاست کے احکام کی توہین کرنے کی کوشش کرنا نہایت غیر واجبی ہے ——— ہماری تو یہ رائے ہے کہ عہدہ ہوم سکریٹری حسب تجویز ہز ہائنیس، نواب فتح نواز جنگ کو دیا جائے نہ کسی دوسرے شخص کو۔ ہز اکسیلنسی (وزیر) کا تہور و استقلال رزیڈنسی کے خاموش کر دینے کے واسطے کافی ہے۔"

لیکن سب اخبارات وزارت کے موافق نہ تھے، بلکہ متعدد اخبارات پر مخالف پارٹیاں قبضہ کر چکی تھیں جو اُن کی مالی اعانت کرتی تھیں اور اُن کے لیئے خبریں بہم پہنچاتی تھیں، متعدد انگلو انڈین اخبارات اس وقت تاجرانہ حیثیت سے کام کر رہے تھے، یعنی جس پارٹی کے شریک ہونے میں منفعت سمجھتے تھے اُسی کے ساتھ شامل ہو کر اُس کے محامد و مناقب شایع کرتے اور دوسری پارٹی پر نکتہ چینیاں کرتے تھے، اِن اخبارات کے نامہ نگار حیدرآباد میں موجود تھے جو اُن کو ہر محکمہ و صیغہ اور ہر عہدہ دار کے متعلق خفیہ طور پر خبریں بھیجتے تھے، بعض اوقات یہ اخبارات دوسری پارٹی کو بدنام کرنے کے لیئے بہت سے اہم و خفیہ سرکاری کاغذات شائع کر دیتے تھے جس سے دفعتاً ایک شور برپا ہو جاتا تھا، سر آسمان جاہ اور نواب انتصار جنگ کے لیے یہ زمانہ نہایت نازک تھا اور اُن کو مجبوراً تدبر اور بیدار مغزی سے اس طوفان کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا، ورنہ وزارت کا خاتمہ تھا۔

کلکتہ کا انگریزی اخبار اسٹیٹسمین سر آسمان جاہ اور ریاست حیدرآباد کا ہوا خواہ تھا اور وزارت کی حمایت میں مضامین شائع کرتا تھا۔ ایک شریف انگریز مسٹر رابرٹ نائٹ اس زمانہ میں اسٹیٹسمین

کے اڈیٹر تھے، جو اخبار میں سر آسماں جاہ کی تائید کرنے کے علاوہ پرائیویٹ خطوط کے ذریعہ سے بھی سر آسماں جاہ کو مفید مشورے دیتے تھے۔ اپریل ۱۸۸۹ء میں انھوں نے سر آسماں جاہ کو جو خطوط لکھے ہیں اُن کے بعض حصے اس موقع پر نقل کیے جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:-

"آپ مجکو معاف کیجیے میرا یہ خیال ہے کہ بہت اچھا ہوتا اگر دیسی ریاستوں کے مدار المہام، رزیڈنٹوں اور ایجنٹوں کا ذرا زیادہ مضبوطی کے ساتھ مقابلہ کیا کرتے، اگر وہ ایسا کرینگے تو گورنمنٹ ہند بھی اُن کی زیادہ مدد کیا کریگی اگر ضرورت ہو تو پارلیمینٹ میں اپیل کرنے کا بھی مضایقہ نہیں، مجھے یقین ہے کہ مسٹر ہاول کبھی اس قابل نہیں ہیں کہ وہ حیدرآباد میں رزیڈنٹ رہیں۔"

"میرے دوست آپ کو کبھی مسٹر ہاول کو مہدی حسن کے تباہ کرنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے اگر وہ مشتعل ہوگئے تو وہ اُن کی تباہی کی ضرور کوشش کرینگے، اس صورت میں آپ کو وائسرائے سے اپیل کرنا چاہیے، میرے خیال میں لارڈ لینسڈاون ایسے شخص ہیں کہ اُن سے بہتر آج تک کوئی وائسرائے ہندوستان میں نہ آیا ہوگا اور وہ وائسرائے ہونے کی حیثیت سے آپکے ہاتھوں کو کمزور نہ ہونے دیں گے۔"

"وہ (رزیڈنٹ) کس طرح اس بات کے زبان پر لانے کی جرأت کرینگے کہ آپ مہدی حسن کو ہوم سکرٹری نہ کیجیے اس فعل میں انھوں نے اپنے اختیارات کا نہایت نالائق استعمال کیا۔"

"ایک صاحب میری ملاقات کو تشریف لائے جو کہ ایک انگریز بیرسٹر ہیں، تھوڑی دیر آئیں بائیں شائیں کرنے کے بعد مجھسے فرمانے لگے کہ میں یہ بھی کر سکتا ہوں کہ اسٹیمین کو سر آسماں جاہ کی مدار المہامی سے برخاست کرانے کے لیے استعمال کروں؟ ——— چونکہ مجکو نہایت ہی

حیرت ہوئی اس لیئے میں نے کوشش کی کہ انھیں کچھ اور بھی کھولوں۔ وہ بھی بہت
ہوشیار تھے اتنا کہہ کر چلے گئے کہ پرسوں پھر آؤنگا مگر چلتے چلتے صاف الفاظ
میں یہ بھی کہتے گئے کہ سر آسمان جاہ برخاست ہوگئے تو جتنا روپیہ مانگو گے
ملے گا۔"

ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہی کہ سر آسمان جاہ اور اُن کے مشیروں کے لیئے یہ زمانہ کسقدر پرخطر تھا۔ غرض اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ مقتضائے مصلحت وایسرائے نے مسٹر ہاول کو اُن کے عہدہ سے ہٹا کر سر ڈینس فٹز پیٹرک کو رزیڈنٹ مقرر کیا، جو ایک محتاط، معاملہ فہم، اور شریف طینت انگریز تھے، اور اعتدال سے تجاوز نہیں کرتے تھے، اور برٹش گورنمنٹ کی یہ صحیح پالیسی کہ ریاستوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے اُن کے پیش نظر تھی، اور یہ ظاہر ہی کہ وزیر کے کسی سکرٹری کا تقرر ایک اندرونی معاملہ تھا، جس میں مداخلت کرنے کا اصولاً رزیڈنٹ کو اختیار نہ تھا، لیکن اس معاملہ خاص میں یہ پیچیدگی پیدا ہو گئی تھی کہ نواب محسن الملک اور نواب انتصار جنگ باہم حریف مقابل سمجھے جاتے تھے، اور نواب فتح نواز جنگ سے اگرچہ نواب محسن الملک نے صلح کر لی تھی لیکن اندیشہ تھا کہ یہ صلح دیرپا نہ ثابت ہوگی، لہذا مخالف پارٹی کو یہ خطرہ تھا کہ نواب فتح نواز جنگ کے ہوم سکرٹری ہو جانے سے نواب انتصار جنگ کی قوت وطاقت میں اضافہ ہو جائیگا اور توازن قایم نہ رہے گا، ان واقعات کے لحاظ سے جدید رزیڈنٹ کو بھی اس معاملہ خاص میں اپنے پیشرو کے خلاف فیصلہ کرنے میں تامّل تھا، اور خود ریاست کے بعض بڑے عہدے دار بھی یہ چاہتے تھے کہ رزیڈنٹ کی مداخلت کا سلسلہ بدستور جاری رہے، لیکن جب سر آسمان جاہ نے رزیڈنٹ سے مل کر گفتگو کی اور واقعات کی حقیقت بتائی تو اُن کے تمام شکوک وشبہات رفع ہو گئے اور نواب مہدی حسن کے ہوم سکرٹری مقرر ہونے کا معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا۔

اِس ملاقات کے بعد سر آسمان جاہ نے اعلیحضرت کو پرائیویٹ طور پر حسب ذیل معروضہ لکھا۔

"شنبہ کو جب کہ خانہ زاد بڑے صاحب سے ملا تو ہوم سکرٹری وغیرہ

کے ضروری مسائل میں اُن سے گفتگو ہوئی بڑے صاحب نہایت ہی عمدہ شخص ہیں اُنھوں نے صاف صاف فرمایا کہ وہ کسی طرح مدار المہام کے اندرونی انتظام میں دخل دینا پسند نہیں کرتے، بالآخر جو انتظام اُن کے دوستانہ مشورہ و صلاح اور باہمی گفتگو سے طے ہوا، وہ خانہ زاد حضرت پیرو مرشد کی اطلاع کے لیے پیش کرتا ہے، اُمید ہے کہ حضرت پیرو مرشد بھی اس کو پسند فرمائینگے۔ غرۂ محرم ۱۳۰۷ھ سے جو شروع سال ہے اس انتظام کو خانہ زاد جاری کریگا، یہ دو دن کا توقف خاص اس لیے ہے کہ اگر حضرت پیرو مرشد کوئی اور ہدایت فرمائیں تو اُس کے موجب عمل کیا جائے۔ اس انتظام میں جو مسٹر فٹز پیٹرک کے اتفاق سے عمل میں آتا ہے، حضرت پیرو مرشد ملاحظہ فرمائینگے، کہ مولوی مہدی حسن نواب فتح جنگ نواز بہادر کی ہوم سکریٹری بہت عمدہ طریقہ سے قایم رہ گئی ہے، جو حضرت پیرو مرشد کی منظوری سے جریدہ میں مشتہر ہو چکی تھی، اور ہاول صاحب کے اصرار سے اب تک ملتوی رہتی چلی آتی تھی۔

خانہ زاد کو اس تمام کارروائی میں بہت زیادہ خیال جس بات کا تھا وہ یہی تھا کہ حضرت پیرو مرشد کی زبان مُبارک سے جو امر ایک دفعہ ارشاد ہوا، اُس کے مطابق جس طرح ممکن ہو عمل کیا جاوے تاکہ عام مخلوق کو معلوم ہوتا رہے کہ بادشاہ کا حکم بادشاہ ہی کا حکم ہے"

غرض ان واقعات کے بعد اکتوبر ۱۸۸۹ء میں نواب فتح نواز جنگ ہوم سکریٹری بنا دیئے گئے اور جو کشمکش اور باہمی مخالفت قریباً ایک سال سے جاری تھی، جدید رزیڈنٹ کی حکمت عملی سے عارضی طور پر اُس کا خاتمہ ہو گیا، اور مخالف پارٹی بھی اس وقت بظاہر خاموش ہو گئی، لیکن دقیقہ رس نگاہیں اس پُرسکون حالت میں ایک جدید طوفان کے آثار دیکھ رہی تھیں، اس واقعہ نے مخالفین کی آنکھیں کھول دی تھیں اور اگرچہ اس وقت وہ خاموش تھے، کیونکہ رزیڈنٹ سے اُن کو کسی اعانت کی توقع

نہ تھی، لیکن انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ نواب انتصار جنگ اور فتح نواز جنگ کے اقتدار پر کاری ضرب لگائیں، بلکہ اگر ضرورت ہو تو موجودہ وزارت کا بھی خاتمہ کر دیں۔

مقدمۂ الماس سر آسماں جاہ کی وزارت اور نواب انتصار جنگ کے زمانۂ معتمدی میں جو اہم واقعات حیدر آباد میں پیش آئے، اُن میں ایک ہیرے کا مقدمہ بھی ہے، اس مقدمہ کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ بعض لوگوں کے خیال میں یہی مقدمہ نواب انتصار جنگ کے زوال کا باعث ہوا۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک ہیرا کیمبرلے کی کان سے نکل کر انگلستان پہونچا، اور فرانس میں تراشا گیا، وزن کے لحاظ سے یہ سب مشہور ہیروں سے بڑا تھا، اس لئے چند روز میں اس کو خاص شہرت حاصل ہو گئی، ایک دفعہ جب پرنس آف ویلز (کنگ اڈورڈ) نے اس کو دیکھا تو بہت تعریف کی اور کہا کہ یہ "شاہنشاہ الماس" ہے، جب سے اس کا نام امپیریل ڈائمنڈ مشہور ہو گیا۔

جب مسٹر جیکب تاجر شملہ نے (جن کی آمد و رفت حیدر آباد میں بھی تھی) اس ہیرے کا حال سنا تو اُس کو ہندوستان منگوانے کا انتظام کیا، اور لندن کی کمپنی "گلبرگ اینڈ کو" سے اس کی خریداری کے متعلق مراسلت کر کے اُس کا ماڈل منگوایا، اور عابد[1] (ارمنی) کے ذریعہ سے اعلیٰحضرت آصف جاہ سادس کی خدمت میں پیش کیا۔ حضور ممدوح نے بشرط پسند اس کی خریداری منظور فرمائی۔ ہیرے کی قیمت ۴۶ لاکھ روپیہ تھی، مسٹر جیکب نے اعلیٰ حضرت سے یہ طے کیا کہ نصف قیمت (۲۳ لاکھ) کسی بینک میں امانتاً جمع کر دی جائے تاکہ وہ ہیرے کو حیدر آباد لاسکیں، اور اگر اعلیٰحضرت ہیرے کو ناپسند فرمائینگے تو روپیہ واپس کر دیا جائیگا۔

جب ہیرا ہندوستان آیا تو مسٹر جیکب نے شملہ میں اس کی نمائش کی، جب اس کی شہرت ہوئی تو لیڈی لینسڈون بھی دیکھنے آئیں اور اس کی آب و تاب دیکھ کر گرویدہ ہو گئیں، لارڈ لینسڈون نے جب اس ہیرے کی قیمت اور حالات دریافت کئے تو ان کو ایک کروڑ روپیہ قیمت بتائی گئی اور یہ کہا گیا کہ اعلیٰحضرت نظام نے اس کی خریداری منظور فرمائی ہے، اور انہی کی ضرورت سے

---

[1] اعلیٰ حضرت کا ایک مخصوص و مشہور خادم،

منگوایا گیا ہے۔

لارڈ لینسڈون (وائسرائے) نے رزیڈنٹ کو اطلاع دی کہ ریاست کی مالی حالت تو ناقابل اطمینان ہے، اور اعلیٰ حضرت اتنا قیمتی ہیرا خریدتے ہیں چنانچہ رزیڈنٹ نے اعلیٰ حضرت کو خریداری سے باز رہنے پر آمادہ کیا، لیکن پیشگی روپیہ بنک میں جمع ہو چکا تھا۔ اور مسٹر جیکب ہیرا لے کر حیدرآباد پہنچ گئے تھے۔ آخر کار اعلیٰ حضرت نے ہیرا واپس کر دیا۔ جب خریداری کا یہ معاملہ ہو رہا تھا اسوقت نواب انتصار جنگ، کوہ مہابلیشر پر تھے اور اُنھوں نے یہ خبر سُنکر وہاں سے تحریراً مشورہ دیا تھا کہ دونوں طرف سے بنیک ضامن کر دیا جائے، لیکن یہاں معاملہ طے ہو چکا تھا اور روپیہ ادا تہ بنک میں جمع ہو گیا تھا۔

ہیرا واپس کرنے کے بعد اعلیٰ حضرت نے عابد کو حکم دیا کہ جیکب کو مطلع کرے کہ امانت کا روپیہ فوراً واپس کرنا چاہئیے۔ مسٹر جیکب نے جواب دیا کہ وہ کلکتہ سے روپیہ واپس کرینگے، کیونکہ جب تک وہ ہیرا اُس کے مالکوں کے پاس نہ بھیجدیں، اُسوقت تک روپیہ واپس نہیں کر سکتے، لیکن مسٹر جیکب نے روپیہ واپس نہ کیا۔ اس واقعہ کے قریباً دو ماہ بعد اعلیٰ حضرت نے مکرر عابد کو حکم دیا کہ جیکب سے بذریعہ تار روپیہ کی واپسی کا تقاضا کرے، مگر باوجود تقاضے کے روپیہ واپس نہ ہوا، تو رزیڈنٹ نے قانونی چارہ جوئی کا مشورہ دیا، چنانچہ مُسٹر مرجی کے ذریعے سے جو خود بھی بیرسٹر تھے، کلکتہ کے ماہرین قانون سے مشورہ لیا گیا۔ اُنھوں نے یہ رائے دی کہ فوجداری میں مقدمہ قایم کیا جائے، اعلیٰحضرت کی شہادت کی ضرورت نہ ہوگی نہ عدالت دیوانی میں دعویٰ دائر کرنے کی نوبت آئے گی۔

غرض متعدد بیرسٹر اعلیٰ حضرت کی طرف سے مقدمہ کی پیروی کے لیئے مامور ہوئے اور پریسیڈنسی مجسٹریٹ کے یہاں مقدمہ دائر کیا گیا چنانچہ مسٹر جیکب کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوا اور بنک کے نام حکم امتناعی جاری کیا گیا کہ وہ مسٹر جیکب کو روپیہ نہ ادا کرے، ابتدائی کارروائی کے بعد مقدمہ سشن سپرد ہو گیا، کلکتہ میں مقدمہ کی جو کارروائی ہوتی تھی مسٹر مُرجی روزانہ تار کے ذریعہ سے اس کی اطلاع دیتے تھے، اور نواب انتصار جنگ کے دفتر سے ان تاروں کا ترجمہ اعلیٰحضرت

کے ملاحظہ میں پیش ہوتا تھا۔

جب مقدمہ شروع ہوا تو ملزم کے بیرسٹر مسٹر انور ارہٹی نے اعلیٰ حضرت کی شہادت پر بہت زور دیا، اور عدالت نے طویل مباحثہ کے بعد شہادت کا لیا جانا ضروری قرار دیا۔ اب دو صورتیں تھیں۔

(۱) مقدمہ سے دست برداری اختیار کی جائے۔

(۲) یا اعلیٰ حضرت شہادت دینا منظور فرمائیں۔

اوّل الذکر صورت مناسب نہ تھی کہ مطالبہ سے اس طرح دست کشی کی جائے، دوسری صورت میں کامیابی کی اُمید تھی کیونکہ معاملہ صاف تھا اور صداقت پر مبنی تھا۔ یہ بھی خیال تھا کہ اعلیٰ حضرت کا بیان بہت مختصر ہوگا۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت نے شہادت ادا کرنا منظور فرما لیا، اور عدالت نے کمیشن جاری کر دیا، جب یہ خبر عام طور پر شائع ہوئی تو لوگوں کو سخت حیرت ہوئی کیونکہ اعلیٰ حضرت کا بحیثیت ایک شاہد کے کمیشن کے سامنے جانا حیدرآباد کے لیئے ایک غیر معمولی واقعہ تھا اور یہ امر اعلیٰ حضرت کے مرتبہ اور خاندان آصفیہ کی روایات کے منافی سمجھا جاتا تھا، لہٰذا نواب انتصار جنگ نے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ پبلک اور اعیان سلطنت کے اطمینان کے لیئے حضور ممدوح کی طرف سے ایک اعلان شائع کیا جائے، جس میں یہ بتایا جائے کہ انصاف و معدلت کے آئین کے مطابق اعلیٰ حضرت کا شہادت دینا نہایت مستحسن اور قابلِ تقلید فعل ہے۔ غرض نواب انتصار جنگ نے اعلیٰ حضرت کی طرف سے اعلانِ شاہی کا ایک مسوّدہ تیار کیا جو اعلیٰ حضرت کے

لے اعلان شاہی | مجکو اطلاع ہوتی ہے اور چند عرضداشتیں بھی میرے سامنے پیش ہوئی ہیں کہ جن میں مجکو یقین دلایا گیا ہے کہ میری رعایا میں سے بعض لوگ اس کمیشن کو ناپسند کرتے ہیں جو الماس کے مقدمہ میں میری شہادت قلمبند کرنے کے لیئے جاری ہوا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ حاکم وقت کا کسی عدالتی مقدمہ میں گواہی دینا خلائق کو ناگوار ہے۔ کیونکہ وہ اس کی شان حکومت اور رسم و رواج ملک کے خلاف ہے۔

(۲) میں نے جہاں تک اس معاملہ پر غور کیا وہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ میری رعایا کے خیالات کا

دستخط سے جریدہ اعلامیہ (گورنمنٹ گزٹ) میں شائع ہوا، اس اعلان پر عام طور سے اعلیٰ حضرت کی تعریف کی گئی اور سر ڈینس فٹز پیٹرک نے اس کو گورنمنٹ آف انڈیا کے پاس بھیجا اور اپنی ایک چٹھی میں جو سر آسماں جاہ کے نام لکھی تھی، اس اعلان کی نہایت تعریف کی۔

(بقیہ نوٹ ص ۲۶۴) یہ اظہار چند مختلف وجوہ پر مبنی ہی، سب سے اوّل اور مقدم گروہ وہ ہی جن کے دلوں میں یہ خیال اپنے فرمانروا کی نسبت محض خیرخواہی اور وفاداری کی وجہ سے جوش زن ہوا ہی اور جس کے واسطے حیدرآباد کی رعایا ہمیشہ مشہور و ممتاز رہی ہی۔ مگر مجھے اندیشہ ہی کہ بعض لوگ ایسے تذکرے فقط اس منشاء سے بھی کرتے ہیں کہ میرے دل میں میرے خیرخواہ عہدہ داروں کی طرف سے جو اس معاملہ میں میری طرف سے کام میں مشغول رہے ہیں بے اعتمادی پیدا کریں اور موجودہ انتظام کو بدنام کریں اور شاید معدودے چند ایسے لوگ بھی ہیں جن کا اصلی مقصد صرف یہ ہی کہ کمیشن کی موقوفی سے مقدمہ کی غایت فوت ہو جائے۔

(۳) مجھ کو اس سے پورا اطمینان ہی کہ جن لوگوں نے اس مقدمہ پر کچھ بھی غور کیا ہی، وہ زیادہ تر اوّل قسم کے گروہ میں شامل ہیں، اور مجھے بہت خوشی ہی کہ میری رعایا دل سے مجکو اس قدر عزیز رکھتی ہی۔ ایک فرمانروا کے لئے البتہ یہ امر افتخار اور مباہات کا موجب ہوتا ہی کہ وہ اپنی رعایا میں اس درجہ ہر دل عزیز ہو۔

(۴) باقی لوگوں کی نسبت صرف اس قدر کہنا ضرور ہی کہ میرے عہدہ داروں نے جو کچھ کارروائی اس معاملہ میں کی ہی، وہ ہر قدم پر اُنھوں نے میرے علم اور میری منظوری سے کی ہی، اور میری عین خوشی ہی کہ

اس معاملہ میں کی ہی۔ وہ ہر قدم پر اُنھوں نے میرے علم اور میری منظوری سے کی ہی اور میری عین خوشی ہی

کہ اس مقدمہ کے متعلق قانونی کارروائی پورے طور سے عمل میں آئے، گو نتیجہ کچھ ہو۔

(۵) لیکن میرے دل پر جس قدر اثر ہی وہ اوّل قسم کے لوگوں کے خیالات کا ہی، اور اس لئے میں بہت خوش ہونگا اگر آپ میرے اس خط کو جریدہ اعلامیہ میں شائع کرا دیں، تاکہ وہ غلط فہمی رفع ہو جائے جس میں یہ گروہ مبتلا معلوم ہوتا ہی۔

(۶) المختصر واقعہ یہ ہی کہ مسٹر جیکب میرے پاس ایک اعلیٰ درجہ کی سفارش کے ساتھ حاضر ہوئے تھے اور مجکو اس سے زیادہ اُن پر اعتماد کرنا پڑا جس کے وہ مستحق تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ اُنھوں نے اس قسم کا برتاؤ

غرض مقررہ اوقات پر کمیشن آیا- اُس وقت نواب انتصار جنگ نے یہ کوشش کی کہ مناسب شرائط پر باہمی مصالحت سے معاملہ کا تصفیہ ہو جائے تاکہ اعلیٰحضرت کے بیان کی ضرورت نہ باقی رہے-

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۶۵) کیا کہ فوجداری عدالت میں اُن پر مقدمہ دائر کرنا پڑا اور یہ فرض کرکے کہ یہ مقدمہ یہاں کی عدالتوں میں بھی دائر ہو سکتا تھا تو بھی قرین مصلحت یہی تھا کہ کلکتہ ہی میں اس کو دائر کیا جاوے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ الماس بھی فوراً دستیاب ہو گیا اور ایک معتدبہ رقم بھی مسٹر جیکب سے بازیافت ہو کر جمع ہو گئی ہے، اور خود مسٹر جیکب گرفتار ہو کر تا فیصلہ عدالت، ضمانت پر رہا ہوئے -

(۷) اور کمیشن کا حال یہ ہے اور شاید حیدرآباد کے لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ جس درخواست پر کمیشن جاری ہوا ہے وہ ہمارے ہی وکلاء کی طرف سے اور خاص میرے علم اور اجازت سے پیش کی گئی ہے، ہمارے لائق ترین مشیران قانون کی رائے یہی تھی کہ میری شہادت کے بغیر مقدمہ کی روئداد ناقص رہ جائیگی، اور بالفرض مقدمہ اگر حیدرآباد میں بھی دائر ہوتا تو اس صورت میں بھی کمیشن کی ضرورت پیش آتی کیونکہ ہماری عدالتیں بھی اب اُس حالت میں نہیں ہیں جو حالت کہ سابق میں کسی وقت اُن کی تھی، ہمارے لایق اور راست باز نظماء بھی اب ہرگز ایک ایسے مقدمہ کو میری شہادت کے بغیر فیصل نہیں کر سکتے تھے -

(۸) یہ بھی کہا گیا ہے کہ ممکن تھا کہ بند سوالات بھیج دئیے جاتے اور میں اُن کے جوابات یہاں سے قلمبند کر کے روانہ کر دیتا، مگر یہ خیال صرف قانون اور ضابطہ عدالت کی ناواقفیت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، کیونکہ اگر انگریزی قانون سے قطع نظر بھی کی جائے، اور اس کا بھی محاظ چھوڑ دیا جائے کہ میرا عین منشاء ہے کہ مسٹر جیکب سے جو کچھ قصور سرزد ہوا ہو، اُس کی جوابدہی کا اور انصاف حاصل کرنے کا اُن کو پورا موقع دیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ہمارے عالم فقہا نے بھی ایسی شہادت کو کسی فریق کے خلاف جائز نہیں رکھا، جو تحریری سوالات کے جواب میں تحریراً ادا کی جائے، بدون اس کے کہ فریق متعلقہ کو اس پر سوالات جرح کا موقع دیا گیا ہو-

یہ سچ ہے کہ ایک زمانہ میں حیدرآباد کی عدالتیں ایسی شہادت بلکہ محض رقعوں پر مقدمات کا فیصلہ کر دیا کرتی تھیں، مگر یہ افسوسناک حالت اس وجہ سے تھی کہ اُس وقت حکومت کی قوت ضعیف تھی، اور سرکاری عہدہ داروں کو اُمراء اور دیگر اعیان ذی وجاہت کے مقابلہ میں تائید نہیں دی جا سکتی تھی اور نظماء باوجود ہر قسم کی قابلیت اور

مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی، اور ایوانِ سیف آباد میں اعلیٰ حضرت کی شہادت شروع ہوئی جو چھ روز تک جاری رہی، جرح میں بعض ایسے سوالات بھی کیئے گئے جو اعلیٰ حضرت کی تکدرِ طبع کا باعث ہوئے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۶۶) نیک نیتی کے اپنی آزادی رائے سے کام نہیں لے سکتے تھے اس سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ حاکمان وقت پر اس کی وجہ سے کس قدر وبال عاید ہوتا تھا اور مجکو کامل بھروسا ہے کہ میری رعایا اس حقیقتِ حال پر مطلع ہونے کے بعد کبھی ایک لمحہ کے واسطے بھی جائز نہ رکھے گی کہ دنیا میں یا آخرت میں وبال میری ذاتِ خاص پر عائد ہو۔

(۹) یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس خیالی اور فرضی کسرِ شان سے محفوظ رہنے کے لیے نقصان گوارا کرنا آسان تھا، لیکن تھوڑے غور سے معلوم ہو جائیگا کہ اس قسم کی کارروائی کا نتیجہ اول تو یہ ہوتا کہ دوسرے لوگوں کو بھی سٹر جیکب کے قدم بقدم چلنے کی ترغیب و تحریص ہوتی، اور دوم یہ کہ میری رعایا اپنے فرماں روا کی اصلی عزت اور شان کے متعلق کبھی اُس غلط فہمی سے نہ نکل سکتی جو عقائد اور سنتِ اسلام کے خلاف اُن کے اذہان میں مرتکز ہو گئی تھی۔

خداوند تعالےٰ جل شانہٗ خود ارشاد فرماتا ہے کہ "ولا یاب الشہداء اذا ما دعوا" یعنی شاہدوں کو جب کہ اُن سے شہادت چاہی جائے اداے شہادت سے پہلو تہی کرنا نہیں چاہیئے، مغرور سے مغرور اور جبار سے جبار مسلمان حاکم کی گردن بھی اس نظیر کے سامنے نیچی ہو جانی چاہیئے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ خود اپنے زمانہ خلافت میں فریق مقدمہ کی حیثیت سے عدالت کے سامنے حاضر ہوئے، اور حضرت امام حسن اور امام حسین علیہما السلام نے اُسی مقدمہ میں عدالت میں حاضر ہو کر شہادت ادا کی، مجکو جو خداوند جل شانہ نے محض اپنے فضل و کرم سے سوا کروڑ رعایا کی فرماں روائی کا مرتبہ بخشا ہی، میں ہرگز اس کی جرأت نہیں کر سکتا کہ اپنے درجہ کو اہل بیت نبوت کے درجہ سے فائق کرنا چاہوں جن کی غلامی بھی میرے لیئے موجبِ عزت و افتخار ہی۔

(۱۰) زمانہ کی رفتار اور شاہانِ وقت کے رسم و رواج کا اگر لحاظ کیا جائے تو صرف یہ نظیر کافی ہو کہ ہز امپریل ہائنس پرنس آف ویلس نے کئی مواقع پر بہ نفس نفیس عدالت کے سامنے حاضر ہو کر اظہار دیا ہی۔

(۱۱) آخر میں، میں چاہتا ہوں کہ میری محبوب رعایا کا ہر طبقہ، اُمرا اور جاگیر دار، وسپاہ، اور دوسری عام رعایا جن کو میں اپنی اولاد سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں بخوبی سمجھ لیں اور ہمیشہ کے لیئے سمجھ لیں کہ سابق میں گو کچھ ہی رسم و رواج رہا ہو، اور دوسرے فرماں رواؤں نے اپنے اختیار سے اپنے واسطے گو کیسے ہی حقوق قرار دیئے

اور اس بنا پر لوگوں کو یہ موقع ملا کہ وہ خواہ مخواہ نواب انتصار جنگ کو مقدمہ کا ذمہ دار قرار دے کر اعلیٰ حضرت کو اُن کی طرف سے بدظن کریں لیکن اس مقدمہ سے کھلا ہوا فائدہ یہ ہوا کہ الماس نصف قیمت پر مل گیا - یعنی لاکھوں روپیہ ریاست کا بچ رہا -

امپریل سروس ٹروپس اور نواب انتصار جنگ کی یادداشت

نواب انتصار جنگ کے زمانہ قیام میں ایک اہم معاملہ "امپریل سروس ٹروپس" کا پیش آیا جس کے عمدہ طریقہ سے حل کرنے میں اُنھوں نے خاص حصہ لیا - جس زمانہ میں یہ معاملہ پیش آیا ریاست کی مالی حالت نازک تھی، اور ملک کی اندرونی ضرورتیں بھی کچھ کم نہ تھیں - مگر با ایں ہمہ مشکلات اسی زمانہ میں سردار دلیر جنگ اور اعلیٰ حضرت کے پرائیویٹ سکرٹری

(بقیہ نوٹ ص ۲۶۷) ہوں، لیکن میں اپنی ذاتِ خاص کے واسطے اس سے زیادہ کوئی حق قایم کرنا نہیں چاہتا جس کو خدا نے اور اُس کے رسول نے میرے واسطے مقرر کر دیا ہے، اور میں خدا کی درگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ وہ میرے اس ارادہ پر آخر وقت تک ثابت قدم رکھے"۔

رزیڈنٹ کا خط مدار المہام کے نام

نواب آسمان جاہ نے اعلیٰ حضرت کا یہ اعلان رزیڈنٹ کے پاس بھی بھیج دیا جس کو پڑھ کر اُنھوں نے نواب ممدوح کو حسب ذیل خط لکھا:-

"مجکو ہز ہائنس کی چٹھی پڑھنے سے نہایت مسرت حاصل ہوئی، اور صرف ان وسیع اور فیاضانہ خیالات اور اعلیٰ درجہ کی آزادیِ طبع ہی کا نہیں جو اس سے ظاہر ہوتی ہے، بلکہ جو عنایت آمیز خیال ہز ہائنس اپنی رعایا کی نسبت رکھتے ہیں، اور جو شفقت آمیز لفظ ہز ہائنس نے اُن کے قابلِ عفو توہمات باطلہ کی نسبت جو برابر ظاہر ہیں ظاہر فرمایا ہے اُس کا بھی میرے دل پر نہایت اثر ہوا، نیز مجکو ہز ہائنس کی چٹھی سے اس بات کے معلوم ہونے سے بڑی خوشی حاصل ہوئی کہ جن بڑے بڑے اُصولوں کا چٹھی مذکور میں حوالہ دیا گیا ہے، اور جن پر مغربی ملکوں کے قانون داں اس قدر زور دیتے ہیں اُن کی تائید مذہب اسلام کے بزرگ پیشواؤں کی تلقین اور مثلیں سے ہوتی ہے - مجھ کو بھروسا ہے کہ اس چٹھی سے ایک نہایت مفید اثر پیدا ہوگا اور صرف موجودہ موقع یا حیدرآباد ہی پر محدود نہ ہوگا کیونکہ میں یقین کرتا ہوں کہ جو نظیر ایک ایسے ہندوستانی والیِ ملک نے قایم کی ہے جو بلحاظ رتبہ کے اس ملک میں سب سے اوّل درجہ پر ہے، اُس کا دوسرے ہندوستانی والیانِ ملک اور بکثرت درجے کے بہت سے سرداروں پر ضرور بالضرور نہایت مفید اثر ہوگا جو بالفعل اس طریقہ میں جو انصاف کے

کرنل مارشل کی تجویز سے اعلیٰ حضرت کی طرف سے ۶۰ لاکھ روپیہ کی نقد امداد، حفاظت ہند کے لیے گورنمنٹ آف انڈیا کی خدمت میں پیش کی گئی، اور عجیب بات یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت نے اس معاملہ میں اپنے ارکانِ سلطنت حتیٰ کہ مدار المہام سے بھی مشورہ نہیں لیا۔

اس امداد کے سلسلہ میں یہ تحریک بھی پیش ہوئی کہ بجائے ساٹھ لاکھ نقد کے، ریاست کے مصارف سے ایک جدید فوج مرتب کی جائے جس سے انگریزی فوج جب اور جہاں چاہے کام لے سکے یہ فوج علاوہ حیدرآباد کنٹنجنٹ کے تجویز کی گئی تھی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ کرنل مارشل کے ذریعہ سے جو اس تجویز کے اصلی مصنف تھے، گورنمنٹ آف انڈیا کی یہ خواہش بھی اعلیٰحضرت پر ظاہر کر دی گئی تھی کہ اس امدادی فوج کی تعداد برٹش گورنمنٹ کی مرضی پر منحصر ہوگی، اس زمانہ میں عام طور پر یہ بھی مشہور تھا کہ کرنل مارشل نے ۶۰ لاکھ کی امداد کا جو مشورہ اعلیٰ حضرت کو دیا، یہ درحقیقت گورنمنٹ ہند کے اشارہ اور تحریک پر مبنی تھا۔

اگرچہ ریاست اس وقت مالی مشکلات میں مبتلا تھی لیکن چونکہ اعلیٰ حضرت اپنے ارادہ کی اطلاع گورنمنٹ ہند کو دے چکے تھے، لہٰذا اب وزارت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا، کہ جس طرح بھی ممکن ہو اس وعدہ کے پورا کرنے کا انتظام کرے۔ حیدرآباد میں اس وقت جو فوج تھی اُس کا ایک حصہ نظم جمعیت (بے قاعدہ فوج) کہا جاتا تھا، جس میں زیادہ تر عرب اور روہیلے داخل تھے۔ اسی زمانہ میں یہ مسئلہ بھی درپیش تھا کہ یہ فوج موقوف کر دی جائے کیوں کہ رزیڈنسی کے نزدیک اسکی ضرورت نہ تھی۔

غرض اعلیٰ حضرت کے اس وعدہ کے متعلق سلسلہ مراسلت جاری تھا اور نواب انتصار جنگ اس معاملہ کے متعلق نہایت غور و احتیاط سے کام کر رہے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے اسی بحث کے سلسلہ میں اس امر پر زور دیا کہ

(بقیہ نوٹ ص ۲۶۸) مقاصد کی تکمیل کے لیے ضروری ہے شہادت دینا کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ میں نے آپ کی چٹھی اور کاغذ ملفوفہ کی نقل گورنمنٹ ہند کی خدمت میں بھیجی ہے۔"

(۱) شاہنشاہی اغراض کی امداد کے لیئے دولتِ آصفیہ کو اپنے درجہ اور مرتبہ کے لحاظ سے ضرور ایک اوّل درجہ کی فوج مرتب کرنا چاہیئے لیکن اس فوج کی افسری کے لیئے ہر سال اُمرائے حیدرآباد کے نوجوان لڑکے فوجی تعلیم کے لیئے انگلستان کے سینڈہرسٹ کالج میں بھیجے جائیں اور بالفعل جب تک کہ اِس قسم کے نوجوان تعلیم حاصل کرکے واپس آئیں کسی یورپین افسر کی خدمات سے فائدہ اُٹھایا جائے، اور مناسب یہ ہے کہ نواب افسر جنگ بہادر اس فوج کے افسر مقرر کیئے جائیں۔

(۲) چونکہ حیدرآباد ایک کوہی ملک ہے اس لیئے خچر کی بٹری بھی قایم کی جائے۔

(۳) اور چونکہ اس فوج کے پاس جدید قسم کے اسلحہ ہونگے اسلیئے اعلیٰ حضرت کے باڈی گارڈ کو بھی جدید اسلحہ سے آراستہ کرنا لازمی ہے کیونکہ اگر اس باڈی گارڈ کے پاس اس قسم کے اسلحہ نہونگے تو ذاتی طور پر اعلیحضرت کی کسرِشان کا باعث ہوگا۔

(۴) چونکہ امپیرئیل سروس ٹروپس کو فوراً قایم کرنا چاہیئے، اس لیئے بہ نظر تعجیل باقاعدہ فوج میں سے امپیریل سروس میں جوانوں کو منتخب کرکے منتقل کیا جائے اور نظم جمعیت میں سے باقاعدہ فوج کی کمی پوری کرلی جائے۔ اس طریقہ سے یہ فائدہ ہوگا کہ بے قاعدہ فوج باقاعدہ فوج میں مبدل ہوجائے گی، اور امپیریل سروس ٹروپس سے جو مصارف بڑہینگے وہ ایک بڑی حد تک بے قاعدہ فوج کی اس تخفیف سے پورے ہوجائینگے۔

(۵) ان ٹروپس کے علاوہ نواب آسمان جاہ بہادر کی طرف سے بھی انہی اصول و شرائط کے ساتھ ایک فوج کی امداد پیش ہوئی، لیکن اس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ یہ فوج اُس وقت میدانِ جنگ میں بھیجی جائے گی، جب کہ سر آسمان جاہ یا اُن کا کوئی قایم مقام ایکٹو سروس میں جائے گا۔

نواب انتصار جنگ کی یہ یادداشت جس کو ٹائمز آف انڈیا نے سرنٹیائن کے لفظ سے نامزد کیا تھا اس قدر معقول تھی کہ اس کے جواب و تصفیہ میں ایک زمانہ گزر گیا، حالانکہ دیگر ریاستوں نے اِس پیشکش کے بعد اعلان کیا تھا اور ہر جگہ یہ فوج ترتیب دی جارہی تھی مگر حیدرآباد میں ابھی سلسلہ مراسلت ہی جاری تھا۔ اور فریقین غور و فکر میں مصروف تھے۔

غرض نواب انتصار جنگ کے سامنے یہ معاملہ طے نہ ہو سکا، لیکن اُن کے حیدرآباد چھوڑنے کے بعد دو رسالے امپریل سروس ٹروپس کے قایم ہو گئے، یعنی باقاعدہ فوج کے تین رسالوں اور گول کنڈہ برگیڈ سے سواروں کا انتخاب کر کے چار چار سو سواروں کے دو رسالے قایم کئے گئے۔

استرداد برار کا معاملہ

مملکت آصفیہ سے صوبہ برار جس طور پر جدا کیا گیا، اُس کے واقعات اب اس قدر عام ہو چکے ہیں کہ یہاں اُن کے بیان کرنے کی حاجت نہیں۔ گزشتہ ۰ ،سال میں ہندوستان اور انگلستان میں بارہا یہ مسئلہ زیر بحث آ چکا ہے۔ سر سالار جنگ نے اپنے زمانہ وزارت میں برار کی واپسی کے لیئے زبردست کوشش کی، یہاں تک کہ اسی مقصد سے انگلستان بھی گئے، لیکن کامیابی نہیں ہوئی، اور آخر کار اُن کو یہ بتایا گیا کہ جب تک اعلیٰ حضرت با اختیار نہ ہوں یہ مسئلہ نہ چھیڑا جائے۔ چنانچہ سر سالار جنگ اور اُن کے شریک عمل نواب امیر کبیر نے مجبوراً اپنی جد و جہد کو اعلیٰ حضرت کی تخت نشینی کے انتظار میں ملتوی کر دیا۔ لیکن جب اعلیٰ حضرت با اختیار ہوئے تو سر سالار جنگ اور امیر کبیر دونوں دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، اس لیئے کوئی باضابطہ کوشش عمل میں نہیں آئی۔

سر سالار جنگ ثانی کے مختصر عہد وزارت میں بھی اندرونی مشکلات کی وجہ سے یہ معاملہ بدستور ملتوی رہا، لیکن سر آسمان جاہ اور اُن کے مشیر خاص نے ہمیشہ استرداد برار کے معاملہ کو پیش نظر رکھا اور گزشتہ تجربہ کے لحاظ سے یہ چاہا کہ اس دفعہ واپسی برار کا مطالبہ نہایت مضبوط اور مستحکم طریقہ سے کیا جائے، مدار المہام کے ارادوں کا حال کسی قدر اُس پرائیویٹ خط سے معلوم ہوتا ہے جو اُنھوں نے ایک سربرآوردہ انگریز کو اس بارہ میں لکھا ہے۔ اس انگریز نے نواب سر سالار جنگ مرحوم کی ایک چٹھی مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۸۷۵ء جو اُس کے نام لکھی گئی تھی، سر آسمان جاہ کے پاس بھیجی تھی، جس میں سر سالار جنگ نے مکتوب الیہ کو لکھا تھا کہ :-

" در صورت برار کی واپسی کے تم کو علاوہ اس دو لاکھ روپیہ کے جو دیئے جا چکے ہیں

آٹھ لاکھ اور دئیے جائینگے"۔

نواب سر آسماں جاہ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:-

" ذاتی طور پر مجکو اپنے لایق بیرسٹر کے وعدہ کی تائید کرنے میں ذرا بھی عذر نہیں ہے لیکن ایک ایسے بھاری معاملہ میں حضور پر نور کی رضامندی ضرور ہے، مگر میں آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ میں پہلے ہی موقع پر اس کو حاصل کرلونگا۔ آپ جانتے ہیں کہ آج کل سے زیادہ کوئی وقت مسئلہ برار کے چھیڑنے کے لیئے نہیں ہو سکتا اس معاملہ کو اس وقت تک خاموش رہنا چاہیئے جب تک کہ بندگان عالی گورنمنٹ کے روبرو ایسے دلائل پیش کرنے قابل نہ ہوں جن سے کامیابی کی اُمید ہو میں کبھی ہز ہائنس کو مشورہ نہ دونگا کہ وہ اس معاملہ میں اُس وقت تک کوئی کارروائی کریں اور نہ کسی اور شخص کو اُن کی طرف سے اس معاملہ میں کسی کارروائی کے کرنے کی اجازت دونگا جب تک کہ بندگانِ عالی کو اس امر کا پورا اطمینان ہوجاوے کہ صاحب رزیڈنٹ اور جناب ویسرائے مسئلہ برار کے شروع کیئے جانے پر راضی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بندگانِ عالی کے مشیر آپ کی عمدہ خدمات حاصل کرنے سے نہایت خوش ہونگے اور کامیابی کی صورت میں سر سالار جنگ کے وعدوں کے آپ پورے مستحق ہونگے، لیکن ریاست کی مالی اور پولیٹیکل حالت اس قدر نازک ہو رہی ہے کہ میں حضور پر نور سے اس امر کے کہنے کی کسی طرح جرارت نہیں کرسکتا کہ رقم مذکورہ بالا میں سے کوئی رقم آپ کو دیجائے مگر خط مذکورۂ بالا (سر سالار جنگ کا خط) کے موجب اگر ایک لاکھ روپیہ کی اشد ضرورت ریاست کے فائدہ کے لیئے کسی وقت ہوگی تو میں ہز ہائنس سے عرض کرکے ایک لاکھ روپیہ آپ کو مناسب اقساط میں دلا دونگا۔

لیکن اسی کے ساتھ میں اُمید کرتا ہوں کہ اس ریاست کے دوست خواہ

ہندوستان میں ہوں یا انگلستان میں اور جس میں آپ بھی شامل ہیں اُن کو یاد رکھنا چاہیئے کہ وقت بہت قریب ہے جب کہ گورنمنٹ اس مسئلہ کے شروع کرنے کی اجازت دیگی، اُس وقت ریاست کو اُن کی دوستی کی بہت ضرورت ہوگی اور جو لوگ کہ بندگان عالی کو اپنے مشورہ اور توسط سے اس وقت مدد دینگے وہ یقیناً اُن کے الطاف خسروانہ کے مستحق ہونگے“۔

غرض آسماں جاہ اور نواب انتصار جنگ نے عزم کرلیا تھا کہ وہ برار کے معاملہ کو ضرور چھیڑینگے چنانچہ جب ایک مرتبہ سر ڈینس فٹز پٹرک (رزیڈنٹ) نے بر سبیل تذکرہ اس معاملہ کے متعلق نواب انتصار جنگ کے خیالات دریافت کئے تو انھوں نے صاف جواب دیا کہ:۔

”ہم نے واپسی برار کا خیال کبھی ترک نہیں کیا اور ہم کو جو دعادی پیش کرتے ہیں وہ سب آپ ہی کے ذریعے سے پیش کرینگے“۔

غرض نواب انتصار جنگ پورے انہماک کے ساتھ اس کام میں مصروف ہوگئے اور تمام عہدناموں اور متعلقہ کاغذات کے عمیق مطالعہ کے بعد ڈھائی سال کی محنت میں ایک مدلل و مبسوط یادداشت تیار کی، یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس یادداشت کی ترتیب و تیاری میں ہر فرجی بیرسٹر نے بھی اُن کو مدد دی۔

یہ یادداشت مدارالمہام کے معروضہ کے ساتھ بغرض منظوری اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کی گئی لیکن اس سے پہلے کہ معاملہ اس حد سے آگے بڑھے نواب انتصار جنگ کو حیدرآباد چھوڑنا پڑا، اور اس کے بعد انقلاب وزارت ہوگیا ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

آخر کار سر مہاراجہ کشن پرشاد کے یادگار عہد وزارت میں لارڈ کرزن نے ۱۹۰۲ء میں ایک جدید معاہدہ کے مطابق ۲۵ لاکھ سالانہ کے معاوضہ میں برار کا (بظاہر) دوامی پٹہ حاصل کرلیا، ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا ۔

وظیفہ کی درخواست اور اُس کے اسباب

جب کہ معتمد مال گزاری اور مشیر مدار المہام کی حیثیت سے نواب انتصار جنگ کو پورا عروج و اقتدار حاصل تھا، اُنھوں نے یہ ارادہ کیا کہ اپنی سٹی سالہ مدت[1] ملازمت کے ختم ہونے کے بعد ملازمت سے سبکدوشی حاصل کریں۔ ۲۱ ستمبر ۱۸۹۰ء کو اُن کی ملازمت کے ۳۰ سال پورے ہوتے اُنھوں نے اس تاریخ سے قریباً دو ہفتہ پہلے نواب سر آسماں جاہ کی خدمت میں وظیفہ کی درخواست پیش کی اور اُس میں لکھا کہ :-

"میری دیرینہ آرزو ہے کہ اکتیسواں سال آزادی میں شروع کروں لہذا ان دو ہفتوں کے منقضی ہونے پر وظیفہ مرحمت کیا جائے اور ادائے خدمت سے سبکدوشی بخشی جائے"

لیکن نواب سر آسماں جاہ نے جب اس درخواست کے جواب میں خاموشی اختیار کی تو اُنھوں نے دو ہفتہ کی مدت گزر جانے کے بعد پھر لکھا کہ :-

"خدا کے فضل و کرم سے آج فدوی کی ملازمت کے ۳۰ سال ختم ہوئے الحمد للہ علیٰ ذٰلک کل دوشنبہ سے فدوی آزادی چاہتا ہے، اب جس کو ارشاد ہو خدمت کا جائزہ سپرد کردوں"

نواب انتصار جنگ کی یہ درخواست اس بنا پر نہ تھی کہ وہ اپنی پُر مشقت اور مصروف زندگی سے گھبرا گئے تھے، یا کام کرنے سے تھک گئے تھے اور اب آرام کرنا چاہتے تھے، قدرت نے ان کو کام کرنے کے لیے پیدا کیا تھا۔ اور کام ہی اُن کے لئے سب سے زیادہ راحت بخش چیز تھی

---

[1] سر سالار جنگ اول نے نواب انتصار جنگ کے تقرر کے وقت، گورنمنٹ انگریزی کے زمانہ ملازمت کو بھی سرکار نظام کے حساب میں داخل کرلیا تھا، اس لحاظ سے اُن کی ملازمت کو پورے تیس سال ہوگئے تھے، اگرچہ حیدرآباد کا زمانۂ ملازمت اس قدر نہ تھا۔

بلکہ اصلی واقعہ یہ تھا کہ وہ ان مُسلسل سازشوں کا مقابلہ کرنے سے معذور تھے جو بڑی قابلیت قوت اور تنظیم کے ساتھ عمل میں آتی تھیں۔ وہ مقابلہ کرنے سے اس وجہ سے عاجز نہیں تھے کہ اس کی قابلیت نہیں رکھتے تھے، اُن کی قابلیت اور تدبّر کا تو اُن کے حریفوں کو بھی اعتراف تھا، لیکن اُن کی خاص کمزوری یہ تھی کہ وہ ان اسلحہ سے کام لینا نہیں چاہتے تھے جن سے اُن کے مخالفین کام لیتے تھے، اُن کی سیاست وہ سیاست نہ تھی جس میں مذہب و اخلاق کے تمام قوانین نظر انداز کر دئیے جاتے ہیں لہٰذا ایسی حالت میں دیانت اور راست بازی کے ساتھ ان سازشوں کا مقابلہ ناممکن تھا اس کے علاوہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ اب حالات ایسے تبدیل ہو گئے ہیں کہ دیانت و آزادی کے ساتھ کام کرنا دشوار ہے، اور چونکہ ملازمت سے اُن کا مقصد صرف کسبِ معاش نہ تھا، بلکہ ایک اسلامی سلطنت کو اپنی خدمات سے فائدہ پہونچانا بھی مقصود تھا لہٰذا وہ ایسی حالت میں اپنے وجود کو بیکار سمجھتے تھے جب کہ مرضی کے مطابق کام کرنے کا موقع حاصل نہ ہو، اُن کے چاروں طرف جو طوفان برپا تھا وہ اُس کو اچھی طرح محسوس کرتے تھے اور اُنھوں نے سر آسماں جاہ سے بھی صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ :-

"ہر طرف انٹرگیں ہی انٹرگیں ہے، ہم منٹرنگ پر زندگی بسر کر رہے ہیں، خورشید جاہ کی دولت، کوتوال، اپنے معتمدین، مصاحبین، اور حضور کی مصاحب وغیرہ سب کی طرف سے ہر وقت خطرہ ہے۔"

نواب انتصار جنگ کی یہ رائے بالکل صحیح تھی، بڑے بڑے با اقتدار عہدے دار اور بعض اینگلو انڈین اخبارات اس زمانہ میں سر آسماں جاہ کی وزارت کو متزلزل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

سی سالہ ملازمت کے متعلق نواب انتصار جنگ کا ایک پُر معنی بیان

وظیفہ کی درخواست پیش کرنے کے بعد نواب انتصار جنگ نے اپنی سی سالہ ملازمت کے متعلق ایک خاص مضمون مشتہر کیا جس میں پر لطف تلمیحات و اشارات کے ذریعے اپنی ملازمت کے حالات بیان کیے ہیں اخبار

دکن اسٹنڈرڈ نے ۲۴ ستمبر ۱۸۹۰ء کے پرچہ میں یہ مضمون مع ایک نوٹ کے شائع کیا ہی جو حسب ذیل ہی:-

"نواب انتصار جنگ کی خدمت کا تیسواں سال بروز دوشنبہ ۲۲ ستمبر سنہ رواں کو ختم ہوا - نواب موصوف کے لیے یہ ایک ایسا دن تھا جس کی نسبت لوگوں کو معلوم ہی کہ وہ بڑے اشتیاق اور فخر کے ساتھ کئی مہینہ سے اُس کے منتظر تھے، اور سنا جاتا ہی کہ اُس کو وہ اکثر اپنا روز جوبلی کہا کرتے تھے نواب موصوف اس بات کو باور کرتے ہیں اور اُن کے باور کرنے میں کوئی اُن پر اعتراض نہیں کر سکتا کہ ایسی طویل کامیابی کے ساتھ تیس سالہ خدمت کے ملازم کے لیے بالکل کافی وجہ ہی کہ وہ اُس دن کو جس کے اندر ملازمت مذکور پوری ہو، اور اپنے کام سے سبکدوش ہو، کسی قسم کی خصوصیت سی مختص کرے - نواب موصوف جیسی سمجھ اور ادراک والے شخص خودستائی کے عادی نہیں ہوتے، لیکن اس موقع پر ہم نے اُن کو ایسے سنجیدہ الفاظ میں جس کے وہ عادی ہیں بیان کرتے سنا ہی۔

ہم ناگزیر طور پر جہاں تک ممکن ہی نواب صاحب کے مضمون کا لفظی ترجمہ کر کے شائقین اخبار کے ملاحظہ میں گزرانتے ہیں، نواب موصوف فرماتے ہیں:-

"میرا جہاز دور و دراز کے تیس سالہ سفر کے بعد آخرکار صحت و سلامت بندرگاہ میں پہنچ گیا، میرے لیے یہ ایک نہایت دلچسپ سفر تھا اور گو اس سفر کا روزنامچہ دنیا کے ہاتھ میں تھا، تاہم وہ سنجیدہ اور دل خوش کن واقعات سے خالی نہیں۔ بعض اوقات میری کشتی سمندر میں بڑے امن و امان سے بہتی ہوئی چلی گئی، لیکن بعض اوقات اس کو سخت طوفان سے مقابلہ کرنا پڑا جہاں اوپر سوائے تیرہ و تار آسمان اور نیچے خوفناک

سمندر کی لہروں اور جانب راست لوہے سے جکڑے ہوئے کنارے اور بائیں جانب خطرناک جوشش زن امواج کے شور و غوغا کے اور کچھ نہ تھا، گویا چاروں طرف سے خوف و خطر نے گھیر لیا تھا اکثر اس کمزور جہاز کو دہوکہ کی امواج نے بہاکر قرب جوار کی چٹانوں سے ٹکرانا چاہا، لیکن ہمیشہ ایک ہادی نمودار ہوگیا جس نے تباہ ہونے سے بچالیا، ایک مرتبہ اس جہاز نے پوشیدہ ٹکراتی لہروں سے ٹکر کھائی جس کی وجہ سے چالیس مہینے تک جہاز اُتھلے پانی اور دلدل میں غوطے کھاتا رہا، جہاں سے سالار جنگ نامی جہاز نے اُس کو بچایا، لیکن میرا جہاز ہمیشہ ایسا ٹکراتا ہوا نہیں رہا، مختلف اوقات میں وہ سمندر کی صاف سطح پر اُن کناروں پر سے جہاں لوگ بکثرت خوشی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اور اُن مرغزار اور کناروں پر سے جہاں خوشنما پھول پھولے ہوئے اور شیریں پھلوں سے باغیچے بھرے ہوئے تھے گزرتا اور بہتا چلا گیا، بعض اوقات وہ دُور کے سمندر کے ایسے جزیروں کے روبرو سے گزرا ہے جن میں غریب اور سیدھے سادے لوگ رہتے ہیں اور جو ڈکیتوں کے بے رحم ڈاکوؤں اور سخت دستورات کی ظلم سے تنگ ہیں، لیکن خدا کا شکر ہے کہ ایسے موقع پر ہم جہاز کے ملاحوں نے اپنے بدبخت بھائیوں کو مدد دینے میں کوتاہی نہیں کی، بلکہ حسب لیاقت ہر قسم کے ظلم سے اُن کے بچانے کی کوشش کی، بعض اوقات ہم کو اپنی خوش قسمتی سے ایسا موقع بھی دستیاب ہوا، کہ ہم نے ڈوبتے ہوئے لوگوں اور بیٹھتے ہوئے جہاز کو سمندر کے طوفان سے بچایا، اکثر ایسا ہوا ہے کہ ہماری رسد کم پڑ گئی ہے اور ہم کو عرصہ تک کم خوراکی پر گزر اوقات کرنی پڑی ہے، بعض اوقات ہم کو گھری ہوتی آبناتے سے جہاں لوگوں کے

فریق جان سے ہاتھ دہو کر لڑ رہے تھے، گزرنا پڑا ہی، جہاں سے ہم بالکل صاف نہ بچ سکے لیکن بعض وقت ہم نے اپنے راستہ کو بالکل رکا ہوا پایا، اور ہم کو اپنی قسمت اُس فرقہ کی تقدیر میں شریک کرنی پڑی جس کو ہم نے راستی و انصاف پر پایا، اس وقت ہم کو کمر بستہ ہو کر لڑنا اور جنگ کے نتیجہ پر قانع رہنا پڑا، بعض وقت ہمیشہ کی نگرانی اور افکار نے ہمارے جہاز راں کو بیمار ڈال دیا، اور ہمارا جہاز خوف و خطر کی حالت میں رہ گیا، اکثر سمندر کی عجیب مخلوقات نے ہم کو بھی اپنی ہی جنس سے سمجھا اور خیال کیا کہ ہم اُن کے امن و امان کو کھونے یا اُن کے ملک پر قبضہ کرنے کی غرض سے آئے ہیں پس اُنھوں نے ہماری کشتی کو بڑے خوف ناک اور خونخوار حملہ سے دبانا چاہا، لیکن ہمارے پورے پورے مسلح جہاز کو اُن کی ضعیف کوششیں صرف اسی قدر نقصان پہونچا سکیں کہ ہم کو اپنے جہاز کی رفتار تھوڑے عرصہ کے لیے کم کردینی پڑی، لیکن ان سب سے بڑھ کر دریائی افعی اور دوسرے حشرات الارض تھے جنھوں نے آفتاب کی روشنی سے بچکر سمندر کی پناہ میں اکثر ہمارے جہاز کے پیندے پر حملہ کیا۔ لیکن اب ہمارا سفر طے ہو گیا۔ اُس کا اچھا اور بُرا موسم، اُس کا آندھی اور طوفان کا زمانہ سب خواب و خیال باتیں ہو گئیں، منزل مقصود صرف ہمارے سامنے ہی بلکہ ہم اس پر پہنچ گئے ہیں، ہمارے ہوشیار رہبر کی جرات اور ہوشیاری نے ہم کو با امن و امان امن کی بندرگاہ یعنی آزادی وتن آسانی اور امن و امان کو مقام میں پہونچا دیا، وہ سامنے مختلف قسم کی جھنڈیاں سر پر اُڑاتے ہوئے عرصہ دراز کے فراق دیدہ دوست ہم آوارہ گردوں کو استقبال کر کے گھر کے جانے کے لیئے آرہے ہیں، پھر اچھی طرح دیکھو وہ سامنے مجمع میں علیگڑھ کے نوجوانوں کی کلاہ دگون نظر آتی ہیں اور جیسے لنگر کا چرخ موڑ کر جہاز اخیر

لنگر ڈالتا ہی۔ ان نوجوانوں کے نعرہائے خوشی سے کان گنگ ہوئے جاتی ہیں"

وظیفہ کی درخواست پر عام تعجب اور سر سید کی نارضامندی

جب اخبارات میں نواب انتصار جنگ کے اس ارادہ کی کیفیت شایع ہوئی تو لوگوں کو سخت تعجب ہوا، کیونکہ عین عروج و اقتدار کے زمانہ میں جبکہ وہ بادشاہ و وزیر دونوں کے مورد الطاف تھے اور ابھی عمر کے لحاظ سے بھی پورے طور پر کام کرنے قابل تھے، علیٰحدگی کا قصد کرنا درحقیقت تعجب کے قابل تھا جب سر سید نے یہ خبر سُنی تو اُس کو ایک بے بنیاد افواہ خیال کیا، لیکن جب خود نواب انتصار جنگ نے اُن کو اس ارادہ کی اطلاع دی تو بہت خفا ہوئے اور ایک طویل و ملامت آمیز خط لکھ کر اُن کو سخت تاکید کی کہ استعفا واپس لیں۔

درخواست وظیفہ کا واپس لینا

جب باوجود مکرر درخواستیں پیش کرنے اور زبانی اصرار و التجا کے اُن کو یہ محسوس ہوا کہ بغیر نواب سر آسمان جاہ کو ناخوش کئے وظیفہ کی درخواست منظور نہیں ہو سکتی، تو مجبور ہو کر اصلاحات کا وعدہ لینے کے بعد استعفا واپس لیا۔ وہ خود ایک موقع پر لکھتے ہیں:

"مجکو مجبوراً اپنا ارادہ اُس وقت ترک کرنا پڑا، مگر میں نے نواب صاحب مرحوم و مغفور کی خدمت میں اس وقت ایک عرضداشت پیش کی اور اس میں

لہ سر سید نے علاوہ خط کے، ۲ اکتوبر ۱۸۹۳ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک نوٹ بھی لکھا جو حسب ذیل ہی:-

"ہم کو نہایت افسوس ہی کہ نواب انتصار جنگ کی نسبت نہایت غلط خبریں مشہور ہوئی ہیں۔ خود حضور نظام نے فرمایا کہ نواب انتصار جنگ سی حضور نظام کی ناراضی کی افواہ غلط ہی ہمیں کچھ شبہ نہیں ہی کہ تمام امور کے ذمہ دار جن میں نواب انتصار جنگ کا استعفا منظور کرنا یا نکرنا بھی داخل ہی، سر آسمان جاہ مدار المہام سلطنت ہیں، اور نواب انتصار جنگ کا استعفا منظور کرنا یا نہ کرنا اور اُن کو پنشن دینا یا نہ دینا، سر آسمان جاہ کی مرضی پر منحصر ہی، مگر ہرگز اُمید نہیں ہی کہ وہ نواب انتصار جنگ کا علیٰحدہ ہو جانا پسند فرمائینگے۔

کچھ عجب نہیں ہی کہ نواب انتصار جنگ کے استعفا کا باعث کوئی امر انتظامی اُمور سی ہو،

عرض کیا کہ اس موقع پر مجکو ایک امر کا عرض کر دینا اس لیئے ضروری ہی کہ آیندہ میرے اوپر یہ الزام عائد نہ ہو کہ میرے مزاج مین تلون پیدا ہو گیا ہی، اور وہ بات یہ ہی کہ اب تک میں اپنی ضرورت سے نوکری کرتا تھا اور اس لیے بعض اوقات ناگوار باتیں بھی برداشت کرنی پڑتی تھیں اور اب پوری پنشن کا حق حاصل ہوجانے کے بعد جس میں میں اپنی آزاد زندگی آسائش کے ساتھ بسر کر سکتا ہوں آیندہ جو میں ملازمت کے بھاری جوے کو اپنی گردن پر رکھنا قبول کرتا ہوں تو یہ سرکاری ضرورت کی وجہ سے ہوگا، اور اس لیئے آیندہ اگر کوئی ناگواری مجھ کو پیش آئی جس کو میں اب تک کبھی کبھی برداشت کرتا رہا تھا تو اس کے برداشت کرنے سے میں معاف رکھا جاؤں اور اس وقت پھر خدمت سے سبکدوش ہونے کے لیے میں خواہش کرونگا۔ یہ بھی میں نے اس عرضداشت میں عرض کر دیا تھا کہ امور ناگوار اور ناقابل برداشت کی نسبت یہ ہرگز خیال نہ فرمایا جائے کہ مجکو اپنی ذات کی نسبت ایسا کوئی اندیشہ ہی یا کہ سابق میں کوئی ایسا امر میری ذات کی نسبت پیش آیا ہی جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہی وہ یہ ہیں کہ اگر کبھی میں دیکھونگا کہ کوئی کارروائی سرکار عالی کی طرف سے ایسی ہوتی ہی جو ملک کے حق میں مضر اور سرکار عالی اور خود مدار المہام بہادر کی نیک نامی کو اس سے نقصان پہونچتا ہی اور میری کوشش اس کے روکنے میں ناکام رہیگی

(بقیہ نوٹ ص ۲۷۹) جس کا عملدرآمد اس طریقہ سے نہ ہوتا ہو، جس طرح پر کہ نواب انتصار جنگ کی رائے یا خواہش ہو، اور اس لیئے اُنھوں نے اپنا علحدہ ہوجانا زیادہ تر پسند کیا ہو، مگر یہ کوئی ایسا امر نہیں ہی جو حل نہو سکے، اگرچہ نواب انتصار جنگ کو اپنی رائے پر تریاہٹ سے بھی زیادہ ہٹ ہوتی ہی اور ایک چھوٹی سی بات کو بہت بڑھا دیتے ہیں، حیدرآباد کے انتظامی امور میں بڑے سر سالار جنگ مرحوم کے زمانہ میں اسقدر اصلاحیں ہوئی ہیں جن کو سلسلہ وار غور کرنے سے تعجب ہوتا ہی اور ہم انکار نہیں کر سکتے کہ اور بھی اصلاحیں ہونی چاہئیں، مگر کیوں نہیں ہوتیں یا کیوں

تو ایسے ہر ایک امر کو میں اپنے لیے ناقابل برداشت سمجھونگا، اور بہ ادب درخواست کرونگا کہ مجھ کو خدمت سے سبکدوش ہونے کی اجازت بخشی جائے۔ اس عرضداشت کو ملاحظہ کرنے کے بعد نواب سر آسماں جاہ بہادر مرحوم و مغفور نے جن کی خوبیوں اور اپنے مالک کے ملک کی خیر خواہیوں کا بیان کرنا میرے حیطۂ امکان سے خارج ہے، نہایت خندہ پیشانی سے فرمایا کہ "یہ تو سراسر ہمارے ہی نفع کی بات ہے"

غرض درخواست کی واپسی کے بعد نواب انتصار جنگ پوری توجہ سے دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

اضافہ تنخواہ عہدہ کی اہمیت، اور فرائض کی کثرت کے لحاظ سے نواب انتصار جنگ کی تنخواہ درحقیقت کم تھی اور وہ ہمیشہ کفایت شعاری ملکہ عسرت کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ نومبر ۱۸۹۰ء میں معتمدی کی تنخواہ میں پانسو ماہوار کا اضافہ ہوا تھا، جس کا ابھی نفاذ نہیں ہوا تھا، اب یہ اضافہ معتمدی کا جائزہ لینے کی تاریخ سے عطا کیا گیا جس سے اُن کو ایک گونہ اطمینان ہوا۔

خطاب دولہ و ملک سے سرفرازی نواب صاحب کو سر سالار جنگ ثانی کے زمانہ میں "انتصار جنگ" کا خطاب عطا ہو چکا تھا، اب نواب سر آسماں جاہ کی سفارش پر ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۰۸ھ کو بارگاہ خسروی سے وقار الدولہ وقار الملک کا خطاب مع منصب و علم و نقارہ عطا ہوا، اس زمانہ میں یہ دستور تھا کہ سربرآوردہ عہدہ داروں کو خطاب ملنے سے پہلے اطلاع دیدی جاتی تھی کہ اُن کے لیے یہ خطاب تجویز کیا گیا ہے، چنانچہ نواب انتصار جنگ کو بھی مجوزہ خطاب کی اطلاع دی گئی۔

اگرچہ خطاب کا عطا ہونا عزت و قدرشناسی کی علامت ہے، اس لیے ہر شخص خطاب حاصل ہونے پر مسرور ہوتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اُس کی محنت اور حسن خدمت کا صلہ اُس کو مل گیا، لیکن نواب انتصار جنگ خطاب کے متعلق چند خاص خیالات رکھتے تھے۔ اُنھوں نے مناسب سمجھا

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۸۰) نہیں ہو سکتیں اس کا جواب ہم صرف اسی قدر دینگے کہ ترکی میں کیوں نہیں ہوتیں اور کیوں نہیں ہو سکتیں"

کہ اس موقع پر ایک عرضداشت کے ذریعہ سے یہ خیالات سرآسماں جاہ پر ظاہر کردیں چنانچہ اُنھوں نے نواب ممدوح کے لطف و مہربانی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد لکھا:۔

"اس جدید سرفرازی سے بالفعل اگر فدوی کو معاف فرمایا جاوے تو میں اس کو اپنے لیئے مزید سرفرازی کا موجب سمجھونگا۔ حقیقت یہ ہی کہ ایسے خطابوں کے لیئے اس قدر فارغ البالی ضرور ہی کہ جس سے اہلِ خطاب اپنے اس بڑے درجہ کی عزت کو محفوظ رکھ سکے جو ان خطابوں کی وجہ سے ظاہر میں ہونا چاہیئے"

اس کے بعد اپنی مالی حالت اور ملازمت کی بے ثباتی ظاہر کرکے لکھتے ہیں:۔

"جنگی" کا خطاب بھی جب مجکو ملا ہی، تو میری کوئی درخواست اس کی نسبت نہیں تھی بلکہ مجکو اُس وقت اس قدر مہلت بھی نہیں ملی کہ میں اپنا کوئی عذر بھی اسکی نسبت اطمینان سے پیش کرتا صبح کو دربار تھا رات کو حکم پہونچا کہ دربار میں خطاب ہوگا، دو نذریں لے کر حاضر ہو، یہ بھی اس وقت تک نہ معلوم ہوا کہ کیا خطاب ہوگا۔ خطاب کا لفظ بھی نواب مختار الملک مرحوم ثانی نے خود تجویز فرمایا تھا دربار کے وقت کے قرب تک مجھ کو اس کی صحیح اطلاع نہ تھی، اگر مجھ کو پہلے سے مہلت ملتی تو میں اُس وقت "جنگی" کے لیئے بھی یہی عذر کرتا جو اب "ولائی" "دولگی" کے لیے کر رہا ہوں"

اس کے بعد اُنھوں نے یہ بتایا ہی کہ خطابوں کی کثرت خطاب یافتہ لوگوں کی بے وقعتی کا باعث ہی۔ نیز یہ کہ اکثر خطاب یافتہ لوگ بے بضاعتی کی وجہ سے خطاب کی حیثیت کے لائق اپنا درجہ قایم نہیں رکھ سکتے، اس کے بعد اُنھوں نے ایک اور پہلو سے خطابوں کی کثرت کی مضرت ظاہر کی ہی وہ لکھتے ہیں:۔

"مجکو یہ اندیشہ ہی کہ بڑے بڑے خطابوں کی یہ کثرت کہیں آیندہ رزیڈنٹ اور امپیرئل گورنمنٹ کو دخل دینے کی طرف راغب نہ کرے، الغرض یہ ہر طرح قرین

مصلحت ہی کہ خطابوں کی وقعت کو قایم رکھنے کے لیئے خطابوں کی اِس افراط سے قلم کو روکا جائے، اور یہ بھی قابل عرض ہی کہ اگر مجھ کو سرکار "دولاتی" اور "ملکی" کے خطاب سے سرفراز فرمائینگے تو اور عہدہ دار بھی جو اس وقت جنگی کا خطاب رکھتے ہیں وہ بھی درخواست کرینگے، اگر اس وقت اُن کی درخواست منظور ہو گئی تو اعلیٰ خطابوں کی اور بھی افراط ہو جائیگی، جو آگے چل کر خطابوں کی وقعت کو گھٹا دینے والی چیز ہی، اور اگر اس سے انکار ہوگا تو وہ تمام لوگ سرکار سے ناراض ہونگے اور عہدہ داروں میں ایک عام بددلی پھیلے گی، پس ہر ایک حالت پر غور کرنے کے بعد میری ناقص رائے تو یہی ہی کہ میرے لیئے کسی ایسے خطاب کی تجویز وضع اشئے علیٰ غیر محلہ، ہی آیندہ جو حکم ہو۔

برخلاف اس کے ایک چیز کی بے شک ضرورت ہی، یعنی بعض اعلیٰ درجہ کے خطاب عہدوں کے واسطے تجویز فرمائیں، تاکہ عہدوں کی وقعت قایم رہے، مثلاً یہ کہ فلاں فلاں عہدوں پر جو لوگ مقرر ہوں وہ جب تک ان عہدوں پر رہیں، راجہ یا نواب لکھے جائیں اور جب وہ لوگ مجصول وظیفہ ان خدمات سے علیحدہ ہوں تو بھی یہ اعزاز اُن کا قایم رہے، اس لیئے عہدوں کی وقعت قایم رہیگی"

دوبارہ سبکدوشی کا قصد اگرچہ اعلیٰ حضرت کا اعتماد نواب وقار الملک پر بدستور تھا، اور نواب سر آسماں جاہ بھی بدستور عنایت و مہربانی کے ساتھ پیش آتے تھے، لیکن اُن کو محسوس ہوتا تھا کہ وزیر ممدوح کے مزاج میں خفیف سا تغیر پیدا ہو گیا ہی اور اُن کے گرد و پیش کچھ ایسے لوگ جمع ہو گئے ہیں جو اُن کی مروت، فیاضی اور سادہ مزاجی سے فائدہ اٹھا کر اپنا کام نکالتے ہیں اور بعض اوقات اپنی خطرناک تجویزوں سے ریاست کو مصیبت میں مبتلا کر دیتے ہیں، اُنھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ سر آسماں جاہ نے بعض معاملات اُن سے صیغہ راز میں رکھے اور بعض اوقات بغیر اُن کے مشورہ کے بالا بالا مختلف کارروائیاں عمل میں آئیں، نواب وقار الملک جیسے شخص کے لیے یہ حالت

ناقابل برداشت تھی اُنھوں نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ زیادہ دیر تک اپنے کو اس ناخوشگوار حالت میں رکھیں، اس لیئے اُنھوں نے مکرر وظیفہ کی درخواست پیش کی، اور جب نواب سر آسماں جاہ نے اس درخواست پر سکوت اختیار کیا، تو اُنھوں نے بار بار اصرار کیا اور مسلسل چند ماہ تک خانگی و سرکاری طور پر درخواستیں پیش کرتے رہے، یہ تمام درخواستیں عجیب و غریب ہیں اور حیرت ہوتی ہے کہ اُنھوں نے کیسی جرأت و دلیری سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان درخواستوں کے خاص خاص حصے جن سے کسی واقعہ کا انکشاف ہوتا ہے یا اُن کے کیرکٹر کی خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں نقل کیئے جاتے ہیں۔

آخر جنوری ۱۸۹۱ء کی ایک درخواست میں لکھتے ہیں:۔

آخر میں نہایت ادب سے یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ میری آرزو اور دلی تمنا یہ ہے کہ اب مجکو اس قید سے نجات بخشی جائے تیس برس کی طویل مدت نوکری کے لیئے کچھ کم نہیں ہوتی، اور اس سے زیادہ صرف ہوس ہی ہوس ہے میں بہت چاہتا ہوں کہ باقی عمر آزادی سے بسر کروں اور صرف ایک ہی خیال ہے جو مجکو اپنے اس مصمم ارادہ سے باز رکھ سکتا ہے، یعنی اپنی خدمات سے ملک کو فائدہ پہونچانا جس کا اتنے دنوں سے میں نے نمک کھایا ہے، اور جس کا ہر ایک مسلمان پر ایک حق ہے، اور یہ کہ اس تمام سعی و کوشش سے سرکار کی نیک نامی ہو جنکی بے انتہا خاوندیوں اور نوازشات کا شکریہ ادا کرنا بندی کے امکان سے باہر ہے، لیکن جب کہ قابل مشورہ امور مخفی رکھے جائیں اور خیر خواہی کو خود غرضی پر محمول کیا جائے، اور خیر خواہوں کو یہ موقع نہ دیا جائے کہ وہ خیر خواہی کے ساتھ کچھ عرض کر سکیں تو وہ نتیجہ بھی حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ میں خود اس حالت کو اپنے لیئے ایک دن بھی گوارا کرونگا، خدا کا شکر ہے کہ جوانی عزت و حرمت سے گزر گئی، اور اب بڑھاپے میں میں اپنے اوپر یہ دھبہ لگانا نہیں چاہتا

کہ میری موجودگی میں سرکار کے انتظام کو کوئی ناکامیابی ہو، لہذا میں نے جہاں تک غور کیا صلاح وقت یہی معلوم ہوتی ہو کہ اب میں یہاں سے علیحدہ ہی ہو جاؤں اور اگر آیندہ اس قسم کا اخفا میرے ساتھ برتا بھی نہ جائے اور مجکو اپنے معروضات پیش کرنے کی آزادی حاصل بھی رہے اور وہ خود غرضی پر بھی محمول نہ ہوں تو بھی مشکلات بدستور قایم رہینگے۔

لوگوں نے اگرچہ مجکو ضدی مشہور کیا ہو مگر جاننے والے جانتے ہیں اور سرکار خود بھی واقف ہیں کہ واقعات کی تبدیلی اور عمدہ دلائل کی قوت میری رائے کو بہت آسانی سے بدل دیتی ہو، اور میری ضد صرف اس وقت ہوتی ہو جب کہ میں اپنی رائے کی صحت پر یقین کرتا ہوں تاہم یہ ممکن ہو کہ کسی وقت پر میری رائے میں اور سرکار کی تجویز میں اختلاف ہو اور میں اس وقت تک نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھوں کہ اگر میری رائے پر عمل نہ ہوا تو اس سے سرکار کے انتظام کی بہت بدنامی ہوگی اُس وقت بھی میرے لیے چارہ کار یہی ہوگا کہ خدمت سے دست کش ہو جاؤں اور ایسے مواقع کا پیش آنا جہاں رایوں کا ایسا اختلاف ہو، اکثر ممکن ہوگا، اور ایسے ادنی درجے کے ملازم کے لیے جو اس درجہ سرکار کے نوازشات اور مراحم کا شکر گزار اور احسانمند ہو جیسا کہ میں ہوں بالکل نامناسب بلکہ ایک قسم کی گستاخی سی معلوم ہوتی کہ بار بار اس قسم کے الفاظ اس کی زبان وقلم پر آئیں مگر جس دن سے بہ عنایت الٰہی مجکو وظیفہ کا حق حاصل ہو گیا ہو یہ خطرات بہت قریب ہو گئے ہیں"

اس کے بعد بھی انھوں نے متعدد درخواستیں پیش کیں اور یہ سلسلہ چند ماہ تک جاری رہا اور ایک درخواست میں جو اگست سنہ ۱۸۹۱ء میں پیش کی انھوں نے صاف صاف لکھ دیا:۔

"میرا دل اب اس قدر سرد ہو گیا ہو کہ آیندہ میں اپنے آپ کو سرکار عالی کے

کام کے قابل نہیں پاتا، اور اب جو درخواست فدوی نے پیش کی ہے وہ کسی
میعادی رخصت کی نہیں ہے بلکہ دائمی رخصت کی منظوری کا اُمیدوار ہوں اور
اصل یہ ہے اور میں اس کو سرکار سے مخفی رکھنا نہیں چاہتا کہ آج کل جو رنگ سرکار
کی صحبت کا اور سرکار کے خیالات کا ہے اور جس طرح آج کل انتظامات ہو رہے
ہیں اور جس طرح بات بات پر لوگوں کی نسبت بدگمانی اور کسی قدر غصّہ کا بھی
اظہار برخلاف سابق اب ہوتا ہے اس کو دیکھ کر اب جی ڈرتا ہے اور اگرچہ
بمبئی سے واپس آنے کے بعد سے فدوی یہ حالات بچشم خود مشاہدہ کر رہا
تھا لیکن غلطی سے یہ سمجھتا تھا کہ شاید میری علالت اور ضعف کی وجہ سے ہے کہ مجکو
معاملات میں اظہار رائے کی تکلیف نہیں دی جاتی لیکن اس جائنٹ سکرٹری
کے واقعہ نے اور اسی طرح اور ایک دو باتوں نے میری آنکھیں کھول دیں اور
صاف معلوم ہونے لگا کہ گو لاکھ اعتبار سہی مگر پھر بھی اس عام بدگمانی کے اثر
سے میں بالکل محفوظ نہیں رہا ہوں اور تھوڑا بہت اثر اس کا مجھ کو بھی پہنچا
ہے گو کہ اس وقت وہ خود سرکار کے ہی ارشاد کے بموجب ایک دانہ خشخاش
ہی کے برابر ہو"۔

اگرچہ معاملات اس حد تک پہنچ گئے تھے لیکن نواب سر آسمان جاہ برابر لیت ولعل کر رہے تھے، اور نواب فتح نواز جنگ کے ذریعے سے فہمایش بھی کرتے تھے۔ اُن کی یہ خواہش تھی کہ یا تو نواب وقار الملک اس ارادہ سے باز آئیں یا کچھ مدت کے لیئے رخصت لے لیں لیکن وہ اُن کی مستقل جدائی پر کسی طرح راضی نہ تھے، مگر نواب وقار الملک کے لیے موجودہ حالت اس قدر ناقابل برداشت تھی کہ وہ ایک لمحہ کے لیئے بھی رہنا نہیں چاہتے تھے، اس لیئے اُن کا اصرار برابر جاری رہا اور اُنھوں نے اس کے بعد بھی متعدد باضابطہ اور خانگی تحریریں مدار المہام کی خدمت میں بھیجیں اگر اُن کی یہ تحریریں صرف معمولی درخواستوں کی حیثیت رکھتی ہوتیں تو اُن کا یہاں

نقل کرنا قطعاً غیر ضروری تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان تحریروں سے اُن کے بعض اخلاقی اوصاف ایسی خوبی سے نمایاں ہوتے ہیں کہ کسی دوسرے طریقہ سے ظاہر نہیں ہو سکتے، اس لیئے ان تحریروں کے بعض ضروری حصے اس موقع پر نقل کیئے جائینگے، جن سے اُن کی جرأت، دیانت، راست بازی اور عزم و استقلال کا حال معلوم ہوگا۔

ایک اور عرضداشت اسی سلسلہ میں اُنھوں نے ایک اور عرضداشت ۶ اگست ۱۸۹۱ء کو پیش کی، جس کا ایک حصّہ حسب ذیل ہے:-

"اپنی قطعی علیحدگی پر جو فدوی کو اس درجہ اصرار ہے تو اس کی وجوہ سابق میں بھی عرض کر چکا ہوں اور اب پھر کسی قدر زیادہ صراحت سے عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں اپنی تیس برس کی مدت ملازمت ختم ہونے کے قبل میں نے سرکار کی طرف سے بعض بے اعتباری کی باتیں اپنی نسبت دیکھیں بعض باتیں مجھ سے مخفی رکھی گئیں، لارڈ رنڈالف چرچل کے نام کی چٹھی اور مسٹر فرتھ و کے پونے تین لاکھ روپیہ کے کمیشن کا معاملہ مجھ سے بالکل مخفی رکھا گیا تھا، وعلیٰ ہذا۔

حالانکہ یہ کارروائی ایک ایسے ملازم کے ساتھ مناسب نہ تھی جس نے اپنی تمام زندگی کا مقصد صرف سرکار کی خیر خواہی میں منحصر کر دیا تھا، مگر چونکہ میرے پاس کوئی سرمایہ نہ تھا جو میں اُسی وقت اپنی علیحدگی کا خیال کرتا، لہذا بہ مجبوری مجکو مدت پنشن کا انتظار کرنا پڑا، اور میں نے اپنے دل کو اس وقت اس خیال سے سمجھا لیا کہ میں ایک ملازم ہوں اور آقا کو اختیار ہے کہ جس قدر راز کسی ملازم پر چاہے ظاہر کرے، اور جس قدر نہ چاہے نہ ظاہر کرے، اور اگر مجکو نوکری کی چندے اور ضرورت ہے تو ناگزیر اس کو برداشت کرنا چاہیئے مگر اپنے فرائض کے ادا کرنے میں جس میں سب سے بڑا فرض ہر حالت میں سرکار کی خیر خواہی ہے اُس کی وجہ سے کوئی کوتاہی نہ کرنی

چاہئے اور سرکار نے ملاحظہ فرمایا کہ وہ تمام زمانہ بغیر کسی قسم کی شکایت کئے میں نے کس طرح سرکار کی خیرخواہی اور دل سوزی کے ساتھ ہنسی خوشی سے بسر کردیا اور کبھی ایسی کوئی شکایت زبان تک نہ لایا۔

لیکن جب میری تیس سالہ مدت ملازمت ختم ہوتی اور خدا کے فضل و کرم سے میں نے خوشی کا وہ مبارک دن دیکھا جب کہ اپنے ہاتھ پاؤں کی کمائی یعنی پنشن سے میں اپنی زندگی آزادی اور آرام کے ساتھ بسر کرسکتا ہوں تو اس کے بعد سے میری حالت بالکل دوسری تھی اور اس وقت سے کوئی مجبوری اور کوئی ترغیب مجکو حیدرآباد میں رہنے کے لیئے باقی نہیں رہی، بجز اس کے کہ اپنی ناچیز خدمات سے سرکار کے انتظام کی نیک نامی کو ترقی ہو مگر جب کہ میرے اوپر بھی کامل بھروسہ نہیں ہی۔ تو وہ تھوڑی بہت ترغیب بھی باقی نہیں رہی گی

سرکار کے مزاج میں اپنے تمام ملازموں کی نسبت ایک قسم کی بدگمانی پیدا ہوگئی ہی اور میں بھی اس بدگمانی کی وبا سے محفوظ نہیں رہا ہوں، البتہ اسقدر فرق ضرور ہی کہ اوروں کی بہ نسبت شاید میرے اوپر زیادہ بھروسا کیا جاتا ہی لیکن کامل بھروسہ میرے اوپر بھی نہیں ہی، نظیر کے لیئے یہی ایک معاملہ کافی ہی کہ مولوی سید اقبال علی صاحب پر جن وجوہ سے بے اعتمادی کی گئی ہی وہ مجھ سے صرف مخفی ہی نہیں رکھی گئی ہیں بلکہ اُن کے بیان کرنے سے بھی سرکار نے صاف انکار فرمادیا ہی اور یہ ایک صریح بے اعتمادی کا اظہار ہی، اور خود سرکار کے قول کے مطابق بھی وہ بے اعتمادی ایک دانہ خشخاش کے برابر تو ضرور ہی حاشا میری یہ التجا نہیں ہی کہ سرکار وہ راز مجھ سے بیان فرمائیں یا خواہ مخواہ میرے اوپر بھروسہ کریں، لیکن اگر ایک ملازم خشخاش کے دانہ کے سویں حصہ کے برابر بھی اپنے

آقا کی طرف سے کسی بے اعتمادی کا اظہار گوارا کرنا نہیں چاہتا، اور وہ اِس کو اپنے لئے ذلّت کا موجب سمجھتا ہے، اور آپ کی نوکری سے وہ دست بردار ہوتا ہے تو پھر اُس کا غرور بھی حق بجانب ہوگا اور اُس کی بھی کچھ شکایت نہیں ہو سکتی۔

اِس کے علاوہ یہ بھی غور طلب امر ہے کہ اگر مجکو ایسی حالت میں رکھا جائے کہ سلطنت کے کاروبار میں سے جس معاملہ میں مجھ سے چاہا مشورہ لیا اور جس میں چاہا نہ لیا، جس راز کو چاہا ظاہر کیا اور جس کو نہ چاہا نہ ظاہر کیا، تو میں درحقیقت اس خدمت کو بھی درستی کے ساتھ بجا نہیں لاسکتا جس خدمت کی ضرورت سے اب میں حیدرآباد میں اپنے آپ کو مقیم سمجھتا ہوں اور جس خدمت کی تشریح مختصر لفظوں میں اس طرح ہو سکتی ہے کہ سرکار کی حفاظت کی خدمت، یعنی ہر ایک ایسی کوشش جس سے سرکار کے انتظام کی نیکنامی ہو اور کوئی الزام سرکار کے انتظام پر وارد نہ ہو سکے، اور حضور پر نور اور رزیڈنٹ و گورنمنٹ کے ساتھ سرکار کے تعلقات درست رہیں۔

نواب فتح نواز جنگ کے ذریعہ سے ایک دفعہ یہ بھی سرکار نے فرمایا تھا کہ "دیکھو حضور پر نور کس طرح ہماری بعض باتوں کا جواب نہیں دیتے" مگر فدوی اب بہت ادب سے عرض کرتا ہے کہ اگر حضور پر نور ایسا کرتے ہیں تو وہ ٹھیک نہیں کرتے اور ایک غلطی دوسری غلطی کے لیے نظیر نہیں ہوا کرتی علاوہ اِس کے میری اور سرکار کی حالت میں زمین اور آسمان کا فرق ہے، سرکار پر حضور پر نور کے اور اس ریاست کے بے انتہا حقوق ہیں، سرکار حضور پر نور کے قرابتمند ہیں، موروثی تعلقات ہیں۔ ایک بڑے ملک کے گویا مالک بنے

بڑی سی پائیگاہ ہے، بڑی سی فوج ہے، توپخانہ ہے، خزانہ ہے، اور ہندوستان بھر کے امیروں میں سرکار سب سے اوّل درجے کے امیر ہیں، بلکہ بہت سے والیان ملک سے بھی بعنایت الٰہی ثروت میں زیادہ ہیں، جس دولت و حشمت کو خداوند کریم نسلاً بعد نسلٍ تا قیامِ قیامت قائم رکھے، اور اُس میں روز افزوں ترقی بخشے لہٰذا اگر سرکار نے حضورِ پرنور کی کسی بے اعتنائی کو برداشت کیا تو حق بجانب ہے، برخلاف اس کے میری حالت یہ ہے کہ اگر آج مرجاؤں تو کل کو بال بچوں کی پرورش بھی سرکار کی مہربانی پر منحصر ہوجائیگی، جو ایک قسم کی خیرات ہے، پس میرے لئے اس ملک میں وہ کونسی ترغیب ہے، کہ اس کی وجہ سے میں اپنے ہر ایک قسم کے آرام اور راحت اور تندرستی اور صحت کو قربان کردوں اور اپنی جان تک کو بھی جوکھوں میں ڈالوں، اور اس تمام جانفشانی کے صلہ میں سرکار کی بے اعتمادی برداشت کروں۔



سرکار اگر ذرا غور فرمائینگے تو سرکار کو معلوم ہوجائیگا کہ انہی رات دن کی محنتوں اور مشقتوں کا یہ نتیجہ تھا کہ سرکار کے ابتدائی عہد دیوانی سے میں متواتر تین سخت بیماریوں میں مبتلا ہوا، میرا اکثر وقت بیماری میں صرف ہوا، اور تکلیف کے علاوہ اپنی حیثیت سے زیادہ مجکو مصارف برداشت کرنے پڑے، میں نے سرکاری کام کے علاوہ نہ دن کو دن سمجھا اور نہ رات کو رات، سرکاری کام کو میں نے ہر چیز پر مقدم سمجھا، سرکار کے ابتدائی عہد دیوانی سے اس وقت تک مجکو خبر نہیں کہ تنخواہ کہاں آتی ہے اور کہاں خرچ ہوتی ہے، البتہ جب ختم شہر کے قبل روپیہ ہوچکتا ہے اور خرچ کی تکلیف ہونے لگتی ہے تب وہ فکر میری جان کو ہوتی ہے۔ میں اپنا حساب دیکھ سکتا ہوں نہ خانہ داری کے انتظاموں کے لیئے

وقت صرف کر سکتا ہوں، دوست اور اعزہ خطوں کے جواب کے تقاضا کی رہتے ہیں
ہر لمحہ جو مجکو ملا ہی میں نے قریبًا قریبًا اُس کو سرکاری کام میں صرف کرنا زیادہ
ضروری سمجھا مگر اس سب کے صلہ میں اب آخر میں عنایت کیا ہوتا ہی؟" ایک قسم
کا اظہار بے اعتمادی" پھر جب اس کے مقابلہ میں، میں یہ دیکھتا ہوں کہ وظیفہ کے
ساتھ اپنے وطن میں اپنی زندگی کافی آرام اور آزادی کی برکتوں اور خوشیوں
کے ساتھ بسر کر سکتا ہوں تو کیوں میں کسی چھوٹی سی بے اعتباری اور ذلت
کو بھی برداشت کروں ؎

ہر کہ نان از عملِ خویش خورد
منّتِ حاتم طائی نبرد

اور کیوں میں اپنی جان جوکھوں میں ڈالوں۔ جب ایک طرف تو یہ حالت ہو کہ کل جب
طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو سب سے پہلے یہ فکر تھی کہ اب کی دفعہ تو علاج کرانے
کے واسطے اور اگر ضرورت ہو تو کسی سفر کے لئے بھی روپیہ پاس نہیں ہی، اور
دوسری طرف باوجود حضور پُرنور اور سلطنت کے اُن بے انتہا حقوق کے
سرکار کی یہ کیفیت روزمرّہ مشاہدہ ہو رہی ہی کہ حضور پرنور میں جو تین دن حکمًا
اور بطور فرض خدمت کے سرکار کی حاضری کے ہیں، سرکار سے اُس کا بھی التزام
نہیں ہو سکتا اور آرام و تفریح کے مشاغل کو فرائض خدمت پر مقدم دیکھا جاتا
ہی، اور اب میں سرکار ہی پر اس معاملہ کا انصاف چھوڑتا ہوں، سرکار ہی
انصاف سے ارشاد فرمائیں کہ جو کچھ میں عرض کر رہا ہوں صحیح ہی یا غلط؟
میں حاضر ہوں کہ اگر ضرورت ہو تو جان بھی قربان کروں، لیکن یہ بھی تو
معلوم ہو کہ وہ جان کا خریدار کون ہی۔ بے اعتمادیاں جان کا مول نہیں
ہوتیں، بے اعتمادی گو کہ ایک دانہ خشخاش سے بھی کم ہو، بلکہ صرف بے اعتمادی

کا نام اشراف کے لیئے موت سے بدتر ہی، اور اب میں اس گزارش کو ختم کرتا ہوں
اس التجا پر کہ اب جو کچھ میری نسبت ہونا ہو، خدا کے لیے جلد ہو، اور سرکار کو
جو حکم دینا ہو جلد دیا جائے، میں سخت تکلیف میں ہوں اور ایک ایک لمحہ میرے لیئے
اب بھاری ہی۔ بیماری جسم سے متجاوز ہو کر دل تک پہنچ گئی ہی، اور روح
پر صدمہ ہی، اور اب جان کی باری ہی۔"

جب اس تحریر پر بھی نواب سر آسمان جاہ اُن کا استعفا منظور کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تو اُنھوں نے ۱۰ اگست کو ایک اور نہایت مؤثر و دل گداز تحریر نواب ممدوح کی خدمت میں بھیجی، جسکی پیشانی پر یہ فقرہ تھا:-

"ایک انسان کی جان کا معاملہ ہی لہذا اشد ضروری ہی۔"

اس درخواست میں اُنھوں نے صاف صاف لکھ دیا کہ اب تکلیف ناقابل برداشت ہی، اور اگر میرا استعفا منظور نہ ہوا تو میری جان ضایع جائیگی اور میں اس صدمہ سے یقیناً مر جاؤنگا، جب نوبت یہاں تک پہونچی تو سر آسماں جاہ نے پورا قصد کر لیا کہ جس طرح ممکن ہو، نواب وقار الملک کو اس ارادہ سے باز رکھیں چنانچہ اُنھوں نے ایک معزز عہدہ دار کے ذریعہ سے جو نواب وقار الملک کے قدیم دوست اور معتمد علیہ تھے سلسلۂ گفتگو شروع کیا، اور تالیف قلب کے لیئے چند قیمتی تحائف (شال وغیرہ) اُن کو ہدیۃً بھیجے، لیکن اس عنایت و سرفرازی نے بھی نواب وقار الملک کی رائے میں کوئی تزلزل نہیں پیدا کیا۔ اُنھوں نے ایک تحریر کے ذریعہ سے تحائف کا بہت بہت شکریہ ادا کیا لیکن آخر میں یہ بھی لکھ دیا:-

"مگر بڑی سرفرازی تو اس وقت یہ ہی کہ فدوی کی درخواست وظیفہ منظور
فرمائی جائے۔ مجکو خود اپنی نالایقیوں پر بے انتہا افسوس ہی جو باوجود سرکار
کی ان بے انتہا خاوندیوں کے اس قسم کی تکلیف دہ درخواستیں بار بار

سرکار میں پیش کرتا ہوں لیکن میں بھی بالکل ہی مجبور ہوں انسان کا دل سخت بھی بہت ہے، اور نرم بھی بہت ہے، مگر دونوں حالتوں میں جب آدمی کا اُس پر سے قابو جاتا رہتا ہے تو اُس آدمی کی حالت بھی رحم کے لائق ہو جاتی ہے، اور وہی حالت اس وقت فدوی کی ہے۔"

نواب وقار الملک ایک طرف تو اس قسم کی دل گداز تحریریں نواب آسمان جاہ کی خدمت میں بھیجتے تھے لیکن جب اُن کے سامنے جاتے تھے تو اُن کے انداز و اطوار سے ذرا بھی ان اندوہ ناک جذبات کا پتہ نہیں چلتا تھا، نہ چہرہ سے حُزن و ملال کے آثار ظاہر ہوتے، نہ زبان سے ان معاملات کے متعلق کوئی لفظ کہتے تھے بلکہ اپنے مقررہ طریقہ کے مطابق سرکاری کام اور معاملات پر بحث و گفتگو میں اس طرح مصروف نظر آتے تھے کہ کوئی شخص یہ محسوس نہیں کرتا تھا کہ اُن میں کسی قسم کی تبدیلی واقع ہوئی ہے یا یہ کہ اس خاموش اور پرسکون چہرے والے انسان کے سینہ کے اندر جذبات کا ایک طوفان موجزن ہے۔ اُن کے اس انداز نے نواب آسمان جاہ کو شبہ اور حیرت میں ڈال دیا اور وہ خیال کرنے لگے کہ شاید اُن کی حالت اس قدر نازک نہیں ہے جس قدر عرایض میں ظاہر کی جاتی ہے۔ نواب وقار الملک بھی آخر اپنے آقا کے ادا شناس تھے، سمجھ گئے کہ یہی شبہ میرے وظیفہ کی منظوری میں حائل ہو رہا ہے، چنانچہ اُنھوں نے ایک درخواست پیش کر کے اس شبہ کو زائل کیا اور بتایا کہ میری ظاہری اطمینان بخش حالت سے ہرگز یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیئے کہ مجکو طمانیت خاطر حاصل ہے کیونکہ :-

"یہ حالت میری طبیعت کی، شاید میری روح کے پرواز کرنے کے چند منٹ پہلے تک بھی قایم رہیگی اس سے میرے اُس بے انتہا روحانی صدمہ کی طرف سے بے التفاتی نہ فرمائی جائے جس میں مبتلا ہوں اور آج دسویں محرم کو بھی سرکار کو یہ تکلیف دے رہا ہوں، میرے اوپر ایکی دفعہ عید کا مہینہ بھی محرم ہی کی طرح گزرا ہے، اور یہ سب تکلیف ایک لمحہ میں سرکار کی نوازش سے وظیفہ

کی منظوری کے ساتھ ہی دفع ہو سکتی ہے۔"

اب معاملہ آخری مرحلہ تک پہنچ گیا تھا۔ لہٰذا سر آسماں جاہ کے لئے اب وہی راستے تھے یعنی

(۱) وظیفہ کی درخواست منظور کر کے ہمیشہ کے لئے اس قضیہ کا خاتمہ کر دیں۔

(۲) یا یہ کہ اُن کی تمام شکایات کا ازالہ کر کے جو خفیف بے اعتمادی ان پر کی گئی ہے اس کی تلافی کریں اور جن شرائط کے ساتھ بھی وہ رہنے پر راضی ہوں اُن شرائط کو قبول کریں۔

سر آسماں جاہ نے دوسرا راستہ اختیار کرنا پسند کیا اور شرائط پر گفتگو شروع ہوئی اور چار پانچ روز کے اندر تمام معاملات کا تصفیہ ہو گیا۔

آخری عرضداشت اور فیصلہ

اس سلسلہ میں نواب وقار الملک نے جو آخری عرضداشت لکھی اُس میں سب سے پہلے اُن شکایات کا تذکرہ کیا جو نواب سر آسماں جاہ سے تھیں اور تفصیل سے بتایا کہ فلاں فلاں معاملہ میں اُن پر بے اعتمادی کی گئی جو کسی طرح قابل برداشت نہ تھی۔ اس کے ساتھ ہی اُنھوں نے یہ بھی بتایا کہ ان شکایات کی تلافی کس طرح ہو سکتی ہے۔

سب کے آخر میں اپنے رہنے کے شرائط بیان کئے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

(۱) "مجھ کو اب کوئی ضرورت نوکری کی باقی نہیں۔ نہ خواہش ہے، اور دلی خواہش اسی میں ہے کہ پنشن ملے جس میں بہت آرام اور خوشی سے اپنی زندگی آزادی سے بسر کر سکتا ہوں۔"

(۲) "صرف ایک ہی وجہ یہاں میرے رہنے کی ہے جس سے میں انکار نہیں کر سکتا اور اُس میں اپنی جان لڑا دینے تک کو حاضر ہوں یعنی سرکار کے انتظام کو ایمانداری اور عمدگی سے چلانے کے لئے کوشش کرنا۔"

(۳) تو اب سرکار مجھکو کس پوزیشن میں رکھنا چاہتے ہیں آیا خاص خاص کاموں پر جیسے رزیڈنسی کی سفارت اور حضور پر نور کے ساتھ عرضداشتوں کا انتظام اور بالمشافہ گزارشات، اور معتمدی مال، یا عام طور کی نگرانی مجھ سے متعلق فرماتے ہیں،

جس سے ہر چھوٹے سے چھوٹے اور روزمرہ کے انتظامی معاملات میں بھی میری مداخلت رہے، اگر صرف اوّل حیثیت رکھنا منظور ہے تو یہ مجکو منظور نہیں ہے، کیونکہ عام کی نگاہ میں اب ہر ایک برائی بھلائی کا میں ذمہ دار قرار دیا جاتا ہوں جو سرکار کے انتظام سے پیدا ہو،

(۴) اگر دوسری حیثیت عام میں رکھنا منظور ہے تو اس کے لیئے یہ ضرور ہے کہ انتظامی معاملات میں کسی قسم کا راز مجھ سے نہ رکھا جائے اور مجکو اصرار ہے کہ میر اقبال علی کی نسبت جو راز ہے وہ مجھ سے بیان فرمایا جائے، اور تمام کاغذات ہر ایک معتمدی وغیرہ کے میرے ذریعہ سے سرکار میں پیش ہوں، اور مجھ کو ہر چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں رائے دینے کا موقع رہے، آیا سرکار کو یہ منظور ہے؟ اگر نہیں ما تو میں نہیں رہ سکتا، اس وقت صرف اصولاً طے کرتا ہے، اور عمل اس پر بقدر اپنی صحت اور تندرستی کے میں کرسکونگا، جس قدر صحت بڑھتی جائیگی اپنی مداخلت کو بڑھاتا جاؤنگا۔

(۵) اگر میری حیثیت عام سرکار نے اس طرح پر منظور فرمائی تو یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ تمام لوگ یہ کہینگے کہ مشتاق حسین دیوانی (وزارت) کرتا ہے، اور اس سے انکار نہو سکے گا، آیا اس کو سرکار برداشت کرینگے، اور اگر اس کو برداشت نہ فرمائیں تو میری حیثیت عام قایم نہیں رہ سکتی، کیونکہ اخفا میں انسان چند روز اور کسی معیّن عرصہ تک کام کرسکتا ہے نہ کہ غیر محدود زمانہ کے لیئے اور یہ تو ایسے معاملات ہیں کہ چند روز بھی اخفا میں نہیں رہ سکتے، اب کیا اخفا ہے رزیڈنٹ جانتے ہیں، گورنمنٹ آف انڈیا جانتی ہے، حضور پرنور جانتے ان میں سے کسی نے اعتراض نہیں کیا، رہے عام لوگ، اُن کی باتوں کا خیال بیکار ہے۔

(۶) اگر سرکار اس صدا کو برداشت کریں تو اب پرسنل اسسٹنٹی کا نام ضابطہ سے آجانا چاہیئے، اُس سے ہر چیز ظاہر ہو جائیگی اور کام کرنے میں بھی آسانی ہوگی اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، لارڈ ڈفرن کو سرکار شملہ پر ضابطہ سے تحریر فرما چکے ہیں کہ :-

"مشتاق حسین نے میری ابتدائے دیوانی سے میرے پاس بحیثیت کانفیڈنشل ایڈوائزر اور پرسنل اسسٹنٹ کے کام کیا ہے"

اور لارڈ ڈفرن نے اس کو بخوشی تسلیم کیا، اور میری ذاتی حیثیت سے بہت زیادہ میرے ساتھ باخلاق و اعزاز پرائیوٹ ملاقات کی۔ رزیڈنسی میں اس خط و کتابت کی نقل موجود ہے، ہاول صاحب بھی اس کو دیکھ چکے ہیں، سر ڈینس بھی دیکھ چکے ہیں، فارن سکرٹری واقف ہیں کوئی اخفا نہیں ہے صرف اس نام کا ضابطہ سے ظاہر ہو جانا کافی ہے۔

لیکن اگر رزیڈنٹ، یا حضور پر نور ان میں سے کوئی اس کی صلاح نہ دے تو میں پرسنل اسسٹنٹ کے نام کے باضابطہ ظاہر ہونے پر اصرار نہ کرونگا،

(۷) انتظامات صدر کے بعد یہ ممکن ہوگا کہ بہت سے معاملات میں میری اور سرکار کی رائے کے درمیان اختلاف واقع ہو، مگر وہ اُمور جن میں اختلاف ہوگا، دو قسم کے ہونگے ایک چھوٹی قسم کے جس کا اثر عام طور پر انتظام پر نہوگا، اور دوسرے اہم معاملات جن کا اثر سرکار اور سرکار کے انتظام کی نیکنامی اور بدنامی پر پہونچتا ہو، اول قسم کے معاملات میں تو مجکو اصرار نہوگا گو میرا دل کہتا رہ جائے کہ میری رائے پر کام ہوتا تو بہتر تھا، لیکن دوسری قسم میں اگر میری رائے پر عمل نہوگا تو دیانتاً مجکو اُس وقت اپنے عہدہ سے علیحدہ ہو جانا چاہیئے، اور اگر بدقسمتی یا اتفاق سے بار بار یہ امر پیش آئے تو میرے

اور متلون مزاج یا مغرور المزاج ہونے کا الزام نہ ہوگا۔"

اس کے بعد اُنھوں نے سر آسماں جاہ کو دو معاملات کی طرف توجہ دلا کر یہ ظاہر کیا ہے کہ اُن کا تعلق دوسری قسم کے معاملات سے ہے یعنی جن میں مجکو اپنی رائے پر اصرار رہے گا، اور وہ معاملات یہ ہیں :-

" اوّل سرکار کا حضور پر نور میں ایّام مقررہ پر باوجود حضور پر نور کے قطعی حکم کے حاضر نہ ہونا۔

دوم بغیر کسی کافی وجہ کے اپنے کسی عہدہ دار سے بدگمان ہو جانا جس سے اُس کو کوئی مالی یا اخلاقی نقصان پہونچے،

ایک عہدہ دار کے ساتھ اگر ایسی کارروائی ہو تو اس کا اثر عام ہو جاتا ہے اور سب عہدہ دار بددل ہو جاتے ہیں اور سرکار کو بھی ویسی ہی عادت پڑتی ہے جو ایک منتظم کی شان کے خلاف ہے، اسی عادت کی وجہ سے ہی جو مجھ سا شخص بھی سرکار کی بدگمانی سے محفوظ نہیں رہا، میں پھر کہتا ہوں کہ یہ عادت سرکار میں صرف اُن خود غرض لوگوں کی صحبت سے پیدا ہوئی جن پر باوجود اس کے کہ سرکار نے بارہا بے اعتمادی کا اظہار فرمایا مگر اُنھوں نے اپنی مختلف اغراض کے سبب سے اس ذلت کو برداشت کیا اور اپنی پوزیشن کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

میں ایک منٹ کے لیئے کبھی بھی اس کو برداشت نہ کرونگا اور اگر میں بھی ایسا کر سکتا تو سرکار یقین فرمائیں کہ اس کے بعد میں نہ سرکار کے لیئے کچھ مفید ہوتا اور نہ ملک کے لیئے۔"

نواب وقار الملک کا پرسنل اسسٹنٹ مدار المہام مقرر ہونا

اس عرضداشت کا نتیجہ یہ ہوا کہ سر آسماں جاہ نے تمام اُمور انتظامی میں اُن کی مداخلت منظور کر لی اور اسی سلسلہ میں اُن کی تنخواہ میں

بھی اضافہ ہوا، اور اب معتمد مال گزاری کے علاوہ اکتوبر ۱۸۹۱ء میں پرسنل اسسٹنٹ مدار المہام کے فرائض بھی اُن کے عہدہ میں شامل کیئے گئے اور اس کا باقاعدہ اعلان جریدہ اعلامیہ میں کیا گیا، اور اس طرح اُن کو مملکتِ آصفیہ کے تمام انتظامی اُمور پر اقتدار اور مداخلت کا اختیار حاصل ہو گیا۔

معاملات کا تصفیہ مرضی کے مطابق ہو جانے کے بعد نواب وقار الملک نے ایک عرضداشت کے ذریعہ سے مدار المہام کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور اُن کو لکھا کہ:۔

"فدوی اس بے انتہا تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہے جو اس عرصہ میں سرکار کو فدوی کی وجہ سے ہوئی، اور نہایت نادم ہے، لیکن ساتھ ہی سرکار کو یہ بھی معلوم ہوا ہوگا کہ یہ جو کچھ تھا وہ بھی سب از راہ خیر سگالی ہی تھا، اگر میں اس نیم زندہ اور نیم مردہ حالت میں رہتا تو سرکار کے لیے بھی کچھ مفید نہ ہوتا اور اب یہ دعا ہے کہ پھر مجھکو اس قسم کی تکلیف دہی کا موقع پیش نہ آئے اور سرکار کو بھی میری طرف سے بجز ہر وقت کی خوشی کے اور کسی قسم کا خیال پیدا نہ ہو۔"

اِن تحریروں سے جس مضبوط کیرکٹر کا اظہار ہوتا ہے وہ محتاج بیان نہیں، کیا آج بھی کوئی ملازم یہ جرأت کر سکتا ہے کہ وہ معلّم اخلاق کا جامہ پہنکر اپنے آقا کو اس طرح نصیحت کرے، بلکہ اس سے باز پُرس کرے کہ تم اپنے فرائض کیوں نہیں ادا کرتے، اور مقررہ اوقات پر بارگاہ خسروی میں کیوں نہیں حاضر ہوتے، اور آقا بھی کیسا، سر آسماں جاہ جیسا، جو سلطنت کا خود مختار وزیر اور بلند پایہ امیر ہے، اور امیر بھی اس رتبہ کا کہ ہندوستان کے بہت سے والیانِ ملک بھی دولت وحشمت میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے، لیکن دیانت وصداقت انسان میں جرأت و دلیری پیدا کر دیتی ہے اور یہ چیزیں نواب وقار الملک کا خاص جوہر تھیں، اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو امروہہ کے منشی مشتاق حسین جو تحصیل مراد آباد میں بیس روپیہ ماہوار کے محرر انکم ٹیکس تھے حیدر آباد کے نواب وقار الدولہ وقار الملک نہ ہوتے، اور نہ آصف جاہ سادس کے معتمد علیہ اور وزیر اعظم کے بازوئے راست

بن کر مملکتِ آصفیہ کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے سکتے۔

یہ کشمکش جو چند ماہ تک ایک وفادار ملازم اور قدرشناس آقا میں جاری رہی بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں آسماں جاہ کو شکست ہوئی، لیکن یہ صحیح نہیں! بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس "اخلاقی جنگ" میں کس کو فتح اور کس کو شکست ہوئی، اس جنگ میں ایک طرف اخلاص و وفاداری، ولولۂ عمل اور سب سے بڑھ کر اسلامی سلطنت کی خدمت کے لئے دلی سوز و گداز تھا، دوسری طرف قدردانی اور وفاپروری کے اوصاف تھے، نیک طینت آقا نے جب یہ دیکھا کہ وفادار ملازم کے دل کو نادانستہ سخت صدمہ پہنچ گیا ہے تو وہ اس دل شکستہ انسان کے سامنے حُسنِ اخلاق سے جھک گیا، آقا کے اس انداز نے وفادار ملازم کے قدم ڈگمگا دئیے اور وہ جنگ سے دست بردار ہو کر اپنے آقا کے سامنے ادب سے سرنگوں ہوگیا، اب کون شخص یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ کس کو فتح ہوئی؟

افسوس! کہ اب نہ ایسے با اخلاص اور وفادار ملازم ہیں نہ ایسے قدرشناس آقا، یہ لوگ ہمارے کاروانِ رفتہ کے آخری مسافر تھے، جو ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہوگئے، صرف ان کے نقشِ پا باقی ہیں، لیکن ڈر ہے کہ کہیں حوادثِ زمانہ اُن کو بھی نہ مٹادیں۔

حیدرآباد کا سیاسی مطلع اور آثارِ انقلاب

اب نواب وقار الملک کا آفتابِ اقبال نصف النہار پر پہنچ چکا تھا، اعلیٰ حضرت آصفجاہ سادس اُن پر پورا اعتماد کرتے تھے، دربارِ وزارت میں اُن کو سب سے زیادہ رسوخ حاصل تھا رزیڈنسی سے تمام معاملات وہی طے کرتے تھے، بڑے بڑے اُمراء و جاگیردار اور اربابِ مناصب اُن کے سلام کو حاضر ہوتے تھے، اور بڑے بڑے "جنگ" و "دولہ" اُن کے اشارۂ چشم و ابرو کے منتظر رہتے تھے، غرض اُن کی ذات ہر قسم کے اقتدار کا مرکز تھی، اور اُن کی جنبشِ قلم انتظامِ مملکت

میں تغیر و انقلاب پیدا کر دیتی تھی یہ سب سمجھتے تھا لیکن دستِ قضا و قدر پسِ پردہ کسی اور تیاری میں مصروف تھا۔

ملک میں ایک ایسی جماعت موجود تھی جو انقلاب وزارت کے لیئے کوشش کر رہی تھی، لیکن انقلاب وزارت بظاہر نواب وقار الملک کے زوال پر موقوف تھا، لہذا یہ جماعت اُن کے زوال کی بھی خواہاں تھی، اس کے علاوہ حیدر آباد کے خاندانی اُمراء اور بڑے عہدہ داروں کو بھی نواب وقار الملک کا یہ اقتدار پسند نہ تھا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انگریز عہدے دار بھی اس دورِ جدید میں کچھ خوش نہ تھے، اور اگر ایسا ہو تو کچھ تعجب نہیں کیونکہ اسی عہد میں کرنل مارشل کا وجود عضوِ معطل بن گیا تھا یہاں تک کہ آخر کار اُن کو بحالت مایوسی رخصت ہونا پڑا۔ غرض مخالفین کی جماعت میں ہر طبقے کے لوگ تھے اور اگرچہ اُن کے اسباب مخالفت، مختلف تھے لیکن مقصد ایک تھا، مگر نواب وقار الملک اس قدر محتاط و بے لوث تھے کہ اُن پر کسی قسم کا اتہام لگانا سہل نہ تھا، اس لیئے مخالفت کی ابتدا سر آسمان جاہ کے ہوم سکرٹری نواب فتح نواز جنگ سے کی گئی۔ اس مخالفت اور سازش میں بڑے بڑے لوگ شریک تھے، مخالفین نے ایک مفلٹ شایع کیا جس میں نواب فتح نواز جنگ اور اُن کی یورپین بیوی کے خلاف نہایت شرمناک الزامات لگائے گئے تھے، رزیڈنسی میں مقدمہ چلا جو مفلٹ کیس کے نام سے مشہور ہے، اس معاملہ میں نواب فتح نواز جنگ مورد عتاب ہوئے اور نواب وقار الملک اُن کے طرفدار و ہوا خواہ مشہور کر کے خوب بدنام کیئے گئے۔ مولوی سید علی بلگرامی اور نواب سرور جنگ نے بھی اس مقدمہ میں نواب فتح نواز جنگ کے خلاف پورا حصہ لیا۔

آبکاری کی جدید اسکیم نواب وقار الملک کے دماغ کا نتیجہ تھی، اسکیم کی بعض جزئیات ابھی زیرِ غور تھیں، مخالفین نے اس موقع سے بھی فائدہ اٹھایا، جاگیرداروں کو یہ باور کرایا کہ اُن کی سخت حق تلفی ہے، غرض جاگیرداروں کی پوری جماعت بھی نواب وقار الملک کی مخالف ہو گئی۔

الماس کا مقدمہ بھی ابھی تازہ واقعہ تھا، اس مقدمہ میں بہ حیثیت شاہد کے اعلیٰ حضرت پر کسی قدر جرح کی گئی تھی جو تکدرِ طبع کا باعث ہوئی، یہ ملال ابھی تازہ تھا، مخالفین نے اس واقعہ کو

بھی نواب وقار الملک کی سوء تدبیر کا نتیجہ قرار دیا۔

آخر ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں بعض اُمراء اور نواب سرور جنگ کا (جو حضور پر نور کے اُستاد رہ چکے تھے) رسوخ اعلیٰ حضرت کے دربار میں زیادہ بڑھ گیا تھا، اور اُن لوگوں کو باریابی کا زیادہ موقع ملتا تھا۔ اور یہ بھی عام طور پر سب کو معلوم تھا کہ نواب سرور جنگ بھی نواب وقار الملک کے مخالف ہیں، اس زمانہ میں نواب سرور جنگ اور نواب محسن الملک کے تعلقات بھی بڑھے ہوئے تھے اور اگرچہ یہ ثابت نہیں ہے کہ وہ نواب وقار الملک کی تباہی کے خواہاں تھے، لیکن اس میں تو کچھ شبہ نہیں کہ وہ اپنے گزشتہ اقتدار کو حاصل کرنے کے متمنی تھے جو اب قریباً زائل ہو چکا تھا۔

سر ڈینس فٹز پیٹرک واپس جا چکے تھے، اور مسٹر چیلی پلوڈن اُن کی جگہ رزیڈنٹ مقرر ہو کر آئے تھے، جن سے نواب سرور جنگ کے خاص تعلقات پیدا ہو گئے تھے، اگرچہ کچھ مدت بعد دونوں ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے، اور ایک عجیب فتنہ برپا ہوا۔

نواب سر آسماں جاہ اور نواب وقار الملک محسوس کر رہے تھے کہ اب حیدر آباد کی فضا بدل رہی ہے اور مطلع غبار آلود ہو رہا ہے اگرچہ ابھی تک خود اعلیٰ حضرت آصف جاہ سادس کی طرف سے کسی بدگمانی کا اظہار نہیں ہوا تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت کے مزاج میں تغیر پیدا کر دیا گیا تھا، اعلیٰ حضرت کی طبیعت کا انداز یہ تھا کہ حضور ممدوح فطری طور پر نہایت حلیم، مستقل مزاج فیاض طبع اور قدر شناس فرماں روا تھے، کسی معمولی شخص کی حق تلفی بھی گوارا نہیں کرتے تھے، نہ معمولی معمولی باتوں پر مزاج میں برہمی پیدا ہوتی تھی، وقار کی یہ کیفیت تھی کہ اندرونی جذبات اور خیالات کے آثار چہرہ پر نمایاں نہیں ہوتے تھے، لیکن بشری کمزوریوں سے کون محفوظ ہے آخر کار اعلیٰ حضرت کا مزاج بھی برہم کر دیا گیا، اب سر آسماں جاہ کی حالت نہایت نازک تھی مسٹر پلوڈن سے اُن کے تعلقات پہلے سے ہی ناقابل اطمینان تھے، اور یہ کہا جاتا تھا کہ وہ نواب وقار الامراء کی وزارت کے لیئے کوشش کر رہے ہیں اس کے علاوہ اُن کی طرف سے سر آسماں جاہ کے خلاف اور کارروائیاں بھی عمل میں آتی تھیں (مثلاً مقدمہ تانگہ وغیرہ) جن کے ذکر کی اس موقع پر

ضرورت نہیں۔ غرض سالار جنگ ثانی کی مانند اُن کو رزیڈنسی یا گورنمنٹ ہند سے کسی حمایت کی توقع نہ تھی اور اس طرف اعلیٰحضرت کے مزاج میں برہمی پیدا ہو چکی تھی، اگر سر آسماں جاہ بجائے خود سلیم الطبع اور وفا شعار نہ ہوتے، یا نواب وقار الملک جیسا مشیر اُن کو میسّر نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ کوئی غلط راستہ اختیار کرتے، اور غدّاری کے مرتکب ہوتے لیکن اُنھوں نے ایسا نہیں کیا، بلکہ یہ چاہا کہ جس طرح بھی ممکن ہو اپنے آقا کو راضی کریں، چنانچہ اُنھوں نے متعدد تحریریں جو اخلاص اور جوشِ وفاداری سے لبریز ہیں، اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کیں، اور اگرچہ بدقسمتی سے وہ اپنے آقا کو خوش کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے، لیکن یہ امر اُن کے لیے باعثِ صد ناز و افتخار ہے کہ اُن کا دامنِ وفا غدّاری کے داغ سے پاک رہا۔

یہ تحریریں جو سر آسماں جاہ نے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کیں ہمارے دست رس سے باہر ہیں، البتہ اس سے پہلے کی ایک مفصّل و مدلل تحریر ہمارے پیش نظر ہے لیکن وہ تمام و کمال شائع کرنے کے لایق نہیں ہے کیونکہ اس میں بعض لوگوں کے کیرکٹر پر صراحت سے نکتہ چینی کی گئی ہے، اور اُن کے پوست کندہ حالات بیان کیئے گئے ہیں، اور شاید مناسب نہ ہوگا کہ گڑے مُردے اُکھاڑے جائیں لہٰذا اس تحریر کے صرف بعض حصّے جن کا ایک حد تک معاملات سے تعلق ہے نقل کیئے جائینگے۔

نواب سر آسماں جاہ تمہید کے بعد لکھتے ہیں:۔

"اصل تو یہ ہے کہ جاگیر، منصب پائگاہ، فوج، خطاب، اور دیوانی (وزارت) کی خدمت اور اس سے بھی زیادہ حضرت پیر و مرشد کی اور بہت سی ذاتی اور موروثی اور خاندانی سرفرازیوں نے غلام کو اس قدر مستغنی کر دیا ہے کہ دنیا میں اب کوئی ہوس خانہ زاد کو حضرت پیر و مرشد کی خوشنودی اور رضا جوئی کے سوا باقی نہیں ہے، حضرت کی نعلین برداری کی عزت میں جو فخر اغلام کو حاصل ہے وہ دوسری کسی سلطنت کی بخشی ہوئی بڑی سے بڑی سرفرازی میں نہیں ہے۔

مجکو نہ کے۔ سی۔ آئی۔ ای کے خطاب کی خوشی اپنے مالک کی خیرخواہی

سے دوسری طرف پھیر سکتی ہے نہ سلامی کی توپوں کی آواز کی خواہش میرے خیال کو اپنے ملک اور حضرت پیر و مرشد کی رعایا کی بھلائی اور بہتری کے سوا کسی اور طرف مصروف کر سکتی ہے، کوئی ہوس اب مجھکو اس دنیا میں باقی نہیں ہے بجز اس کے کہ میرا مالک اور میرے مالک کی رعیت مجھ سے خوش رہے، اور ملک کو مجھ سے آرام و راحت پہونچے۔"

اِس کے بعد وہ اعلیٰ حضرت کے شاہی اختیارات کی نوعیت پر بحث کرتے ہیں اور اِسی سلسلہ میں لکھتے ہیں :-

"تمام معاہدات اور تہ ناموں کے ذریعہ سے جو سرکار عالی اور سرکار عظمت مدار (گورنمنٹ انگریزی) کے درمیان ہوئے ہیں یہ امر طے ہو گیا ہے کہ حضور کی گورنمنٹ اپنے ملک کے اندرونی انتظامات میں آزاد گورنمنٹ ہے اور انگریزی سرکار کو اُس کے اندرونی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں ہے۔"

اِس کے بعد اُنھوں نے چند واقعات کا حوالہ دیکر اندرونی خود مختاری کے مسئلہ کو ثابت کرکے یہ بیان کیا ہے کہ وزیر کے تقرر و برخاستگی کا معاملہ بھی کامل طور پر اعلیٰ حضرت کے اختیار میں ہے اس کے بعد اُنھوں نے رزیڈنٹ اور وزیر کے تعلقات اور عہد گزشتہ کے بعض معاملات پر بحث کی ہے۔ اور اِسی سلسلہ میں لکھا ہے :-

"ہم لوگ جن کا تمام تر نشو و نما پشت در پشت حضرت پیر و مرشد کی بدولت ہوا ہے اُن کا فرض ہے کہ جس وقت معلوم ہو کہ مالک کی مرضی ہم سے کام لینے کی نہیں ہے فوراً بہت ادب کے ساتھ اُس خدمت سے علیحدہ ہو جائیں۔"

اس معاملہ پر اُنھوں نے تفصیل سے بحث کی ہے اور اپنے متعلق خصوصیت سے لکھا ہے کہ میں کسی حالت میں بھی یہ جائز نہ رکھونگا کہ اعلیٰ حضرت کی مرضی کی خلاف اپنے عہدہ پر قایم رہوں، لہذا

اعلیٰ حضرت کو میرے معاملہ میں اس قسم کی دشواری پیش نہیں آئیگی جیسی کہ پہلے پیش آئی تھی، پھر انھوں نے یہ واقعہ بیان کیا ہی کہ جب اعلیٰ حضرت نے مجکو وزارت پر سرفراز فرمایا تو میں انگلستان میں تھا اور چونکہ ابتدا میں یہ تقرر عارضی یعنی ایک سال کے لیئے تھا لہذا :-

"بمبئی پہنچکر مجھ سے اور نواب وقارالامراء بہادر سے جب دیوانی کی ایک برس کی مدت کا تذکرہ ہوا جس کو بعض لوگوں نے بہت کچھ مشہور کیا تھا تو ہم دونوں آپس میں یہی کہتے تھے کہ جن لوگوں نے اس ایک برس کی میعاد کا خیال کیا ہی وہ ہم لوگوں کی طبیعتوں سے واقف ہی نہیں ہیں یہ شرطیں اور یہ تذکرہ اُن لوگوں کے لیئے چاہیئے جو باہر سے بلائے جاتے ہوں اور جن سے یہ اندیشہ ہو کہ وہ حضرت پیر و مرشد کی مرضی کے برخلاف بھی دیوانی کے عہدہ کو اپنے پاس رکھنا چاہینگے ہم لوگوں کی نسبت ایسے تذکروں کی کیا ضرورت ہی جب کہ ہمارے لیئے ایک دن اور ایک سال اور ایک قرن، سب مساوی ہی، جس وقت مالک کی جو مرضی ہو اُسے بجالانا ہماری سرفرازی اور وہی ہمارا خلعت ہی، حاصل یہ ہی کہ جو کچھ مشکلات دیوانی کے عہدہ متعلق پیش آئیں اُن کا اب خاتمہ ہو چکا ہی اور کسی وقت بھی حضرت پیر و مرشد کو اس معاملہ کے متعلق فکر کا محل باقی نہیں رہا، جس وقت مرضی ہو صرف ایک اشارہ کافی ہی"

اِس کے بعد سر آسمان جاہ نے اُن مشکلات کو پیش کیا ہی جو حسن انتظام میں مانع ہوتی ہیں اور کسی سلسلہ میں نہایت ادب سے مگر مستقل اور پُر زور لہجہ میں یہ ثابت کیا ہی کہ بعض دشواریاں خود اعلیٰ حضرت کے طرز عمل سے پیدا ہوتی ہیں، اس بحث میں اُنھوں نے سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا ہی کہ اعلیحضرت کو رزیڈنٹ یا گورنمنٹ آف انڈیا سے بلا توسط مدار المہام نہ تو کوئی وعدہ کرنا چاہیئے نہ کوئی معاملہ طے کرنا چاہیئے کیونکہ اس سے بعد کو سخت دشواریاں پیدا ہوتی ہیں چنانچہ اُنھوں نے متعدد مثالوں سے ثابت کیا ہی کہ اعلیٰ حضرت کے اس طرز عمل سے مدار المہام کو کن مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا -

وہ لکھتے ہیں کہ :-

"۶۰ لاکھ روپیہ کے آفر کا معاملہ بھی اس قسم کا معاملہ ہے، خانہ زاد کو درحقیقت اس وقت اس معاملہ کی اطلاع دی گئی جب کہ حضرت پیر و مرشد سے اُس کا اقرار لے لیا گیا تھا، پھر اُس وقت کیا ہو سکتا تھا، اور اب اُسی سلسلہ میں یہ تحریک پیش ہے کہ اس ۶۰ لاکھ نقد کے ریاست کے صرف سے ایک ائد فوج مرتب کی جائے، جس کو انگریزی گورنمنٹ جب چاہے اور جہاں چاہے بھیجے، یہ فوج علاوہ سکندر آباد...... فورس اور حیدرآباد کنٹنجنٹ کے ہو گی"

....

"۶۰ لاکھ کے آفر کے متعلق اب میں خارج سے سنتا ہوں کہ یہ فرمائش خود انگریزی گورنمنٹ کی تھی اور سردار دلیر الملک بہادر سید عبدالحق اس منصوبہ کو لندن سے اپنے ساتھ لائے تھے مگر خانہ زاد کو جس کے ہر قطرۂ خون میں اپنے مالک اور اپنے ملک کی خیر خواہی کا جوش بھرا ہوا ہے اس راز سے اب تک کوئی اطلاع نہیں ہوئی، اس صورت میں بہت کچھ ممکن تھا کہ کارروائی کے وقت خانہ زاد سے کوئی غلطی ہو جاتی مگر خدا کا شکر ہے کہ ایسی کوئی غلطی نہیں ہوئی اور یہ بوجہ اس بے ریا پالیسی کے ہوا جو سرکار عالی کی ہمیشہ سے انگریزی گورنمنٹ کے ساتھ ہے"

"جب حضرت پیر و مرشد کسی معاملہ کے متعلق گورنمنٹ آف انڈیا سے بذریعہ خط و کتابت یا بذریعہ پیغامات زبانی کارروائی فرماتے ہیں تو دوسری طرف اس کے جواب دینے کے لیئے رزیڈنٹ صاحب اور فارن سکرٹری اور پرائیویٹ سکرٹری اور خود وائسرائے ہوتے ہیں جن کی عمر کا بہت بڑا حصہ قیمتی نہایت اہم اور اعظم امور ملک داری میں صرف ہو چکا ہوتا ہے اور اس کے علاوہ ایک کونسل اُن کے پاس مشورہ دینے کے لیئے موجود ہوتی ہے...... آفر کے صرف قبول کرنے میں جس کی نسبت میں سنتا ہوں کہ قبول کیا گیا ہے، اور اگر روپیہ کی صورت میں نہیں تو فوج کی

صورت میں وہ دینا پڑیگا، گورنمنٹ آف انڈیا کو اس قدر فکر کرنی پڑی اور ولایت تک ممبران کونسل اور تمام وزراء نے اس پر غور کیا جب لینے والوں کو اس قدر فکر کی ضرورت ہوئی تو دینے والوں کو بدرجہ اولی اُس سے بہت زیادہ صلاح اور مشورہ کی ضرورت تھی۔"

....

"اب ۶۰ لاکھ آفر کے سلسلہ میں فوج کا سوال انگریزی گورنمنٹ کی طرف سے شروع ہوا ہے اور یہ وقت نہایت درجہ احتیاط اور غور و فکر سے کام کرنے کا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہم کو کوئی عذر اس وقت فوجی مدد دینے میں نہیں ہے جب کہ درحقیقت مدد کی ضرورت ہو، ہم جب دوستی کے الفاظ کو زبان و قلم سے ادا کرتے ہیں تو ضرورت کے وقت تلوار سے بھی ضرور ادا کرینگے، لیکن اس وقت جو فکر ہے وہ یہ ہے کہ خزانہ کی حالت درست نہیں ہے۔"

اس عرضداشت میں اُنھوں نے اعلیٰ حضرت کو یہ بھی بتایا ہے کہ :۔

"گزشتہ زمانوں میں حضرت پیر و مرشد کے آبا و اجداد کا طریقہ صاحبان رزیڈنٹ کے ساتھ یہ تھا کہ باہم بہت ہی کم ملاقات ہوتی تھی اور ہمیشہ ملاقات کے وقت دیوان (وزیر) حاضر رہتے تھے، شاید ایک دو وقت تخلیہ میں بھی ملاقات کا اتفاق ہوا، اور جب ایسا ہوا تو تمام ملک میں اس کا چرچا ہوا اور سب نے اس کو حیرت کی نگاہ سے دیکھا، اور پھر اُن تخلیہ کی ملاقاتوں میں بھی شاہانِ وقت نے صاحبان رزیڈنٹ کو کسی بات کی نسبت کوئی قطعی انکاری یا اقراری جواب نہیں دیا، اور معاملات کو اپنے مشیروں کے مشورہ پر ملتوی کیا۔"

"بے شک آج وہ زمانہ نہیں ہے اور کوئی شخص حضرت پیر و مرشد کو یہ صلاح نہیں دے سکتا کہ ملاقاتوں کا پھر وہی پرانا طریقہ اختیار کیا جائے، مگر جہاں تک ممکن ہو

حفاظت اس میں ہے کہ اس قسم کے تعلقات کم کیے جائیں جس میں بالمشافہ حضرت پیر و مرشد کو کسی چیز کی نسبت اقرار یا انکار کرنا پڑے۔"

اس تحریر کے بعد بھی عرائض کا سلسلہ جاری رہا، لیکن اب معاملات اس حد تک پہنچ گئے تھے کہ ان تحریروں کا کچھ اثر نہیں ہوا۔

اعلیٰ حضرت کی ناراضامندی اور نواب وقار الملک کا زوال

نواب وقار الملک موجودہ حالات سے بے خبر نہ تھے، ملک کی سیاسی فضا میں جو تبدیلی پیدا ہو گئی تھی وہ اس کو بخوبی محسوس کرتے تھے، لیکن بااین نہایت انہماک و استقلال کے ساتھ اپنے فرائض کے ادا کرنے میں مشغول تھے، یہاں تک کہ دفعتاً ایک دن شام کو اُن کو یہ اطلاع ملی کہ اعلیحضرت نے ایک موقع پر یہ ارشاد فرمایا کہ :۔

"سرآسماں جاہ تو اچھے ہیں لیکن اُن کے مشیر اچھے نہیں"۔

یہ سنکر اُن کو یقین ہو گیا کہ اب اعلیٰ حضرت کا اعتماد اُن پر باقی نہیں رہا، نواب وقار الملک جیسے شخص کے لیے یہ حالت نہایت اندوہ ناک تھی، رات کو جب وہ بستر پر گئے تو اسی معاملہ پر غور کرتے رہے، اسی حالت میں سو گئے تو خواب دیکھا کہ "میں ایک اسٹیشن پر ایک ٹرین سے اُترا ہوں اور ایک شخص مجھے دوسری ٹرین کو بتا رہا ہے کہ اب اس میں سوار ہو جاؤ"۔ اس کے بعد دوسرا خواب دیکھا کہ "میں سفید لباس پہنے ہوئے زینہ سے اُتر رہا ہوں"۔ علی الصباح جب بیدار ہوئے تو آخرکار اُنھوں نے ایک آخری فیصلہ کر لیا، یعنی فوراً وظیفہ کی درخواست لکھ کر مدار المہام کی خدمت میں پیش کر دی، اور مدار المہام نے اُن کے شدید اصرار سے مجبور ہو کر یہ درخواست معہ ایک معروضہ کے بارگاہ خسروی میں پیش کر دی، اعلیٰ حضرت نے اس درخواست کو اپنے بکس میں رکھ لیا اور کسی سے تذکرہ نہ کیا، نہ قریباً ایک ماہ تک اس کا جواب دیا۔

درخواست کی منظوری اور عتاب

لیکن جب لارڈ ڈلینسڈون حیدرآباد آرہے تھے تو اعلیٰ حضرت نے

یہ درخواست منظور کرلی اور خود اپنے دستِ مبارک سے ایک طویل تحریر سر آسمان جاہ کے نام لکھی، جس سے بہت کچھ نارضامندی کا اظہار ہوتا تھا اس تحریر کا تمام وکمال شائع کرنا مناسب نہیں ہو صرف ابتدائی و آخری جملے لکھے جاتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت تحریر فرماتے ہیں:۔

"سر آسمان جاہ بہادر، آپ کی عرضی مورخہ ۲۲ صفر ۱۳۱۰ھ مع عرضی وقار الملک بہ درخواست وظیفہ موصول ہوئی میں نے جو لفظ "دہوکہ" اپنے خط موسومہ نواب وقار الامرا بہادر میں تحریر کیا تھا، اُس کی نسبت آپنے بڑی شکایت لکھی ہو مگر آپ اُس خط کو پھر غور سے پڑہیئے، اور دیکھئے کہ ربط عبارت سے اُس کے کیا معنے پیدا ہوتے ہیں، اس وقت تک مجکو آپ کی طرف سے دہوکہ کا گمان بھی نہ تھا اس واسطے کہ دہوکہ بازی کے واسطے، طبع رسا، فکر دراز، اور تجربہ سرد و گرم زمانہ چاہیئے"

"میں آپ کو پہلے لکھ چکا ہوں اور پھر اس کی تکرار کرتا ہوں کہ مجکو کوئی وجہ نہیں ہو کہ جو اعتراض مجکو آپ کی کاروائی پر ہو اُس کو میں آپ سے پوشیدہ رکھوں، یا جو انتظام مجکو آپ کی خدمت سے متعلق کرنا ہو، اُس کو مخفی کروں پس آیندہ آپ اس قسم کی بدگمانی کو ہرگز تحریر میں نہ لائیے، افسوس ہو کہ آپ میری تحریر کو برابر نہیں سمجھے ورنہ غلط فہمی کی نوبت نہ آتی، قبل اس کے کہ میں دہوکہ کے معنی بیان کروں دو تین جملے آپ کی زیر بحث عرضی میں ایسے ہیں کہ اُن کی نسبت پھر مجکو دہوکہ کا لفظ استعمال کرنا پڑتا ہو۔

جملہ اوّل۔ اس بے اعتباری میں ریاست کا کام خراب ہوتا ہو۔

جملہ دوم۔ حکومت اور انتظام روز بروز ضعیف ہوتے جاتے ہیں۔

جملہ سوم۔ اور اس کا اثر حضرت پیر و مرشد کی سلطنت کے لیئے مضر ہو رہا ہو۔

"ان جملوں سے یہ پیدا ہی کہ میری بے اعتباری اس قدر زمانہ سے ہی جس کا اثر ایسا خراب ریاست پر ہو رہا ہی باوجودیکہ مجکو لفظ "دہوکہ" لکھ کر شاید ایک مہینہ کا عرصہ نہیں گزرا اور نفس الامر ان جملوں کے یہ معنیٰ ہیں کہ آپ کے مشیر اپنی بدرفتاری کے نتائج کو میری خیالی بے اعتباری کی آڑ میں چھپایا چاہتے ہیں"۔

اِس کے بعد اعلیٰ حضرت نے اُمورِ انتظامی کے سلسلہ میں متعدد واقعات بیان کرکے سر آسمانجاہ کے طریقِ عمل پر اعتراض کیا ہی مثلاً مقدمہ معدنیات، مقدمہ الماس، معاملہ فتح نواز جنگ وغیرہ ذالک پھر ایک جگہ لکھا ہی:-

"اِس قدر مجھے یاد ہی کہ وقار الملک اس سے قبل بھی زمانہ مختار الملک اوّل میں مشہورہ مرر چرڈ میڈ ملازمت سے خارج ہو چکے ہیں"۔

اِس کے بعد آخر میں تحریر فرمایا کہ:-

"وقار الملک کی درخواست وظیفہ کے متعلق میں بالکل اُن کی رائے کا متفق ہوں کہ جب اُن کی بدنامی اس قدر بڑھ گئی تو اُن کا قیام کسی طرح ممکن نہیں، پس اُن کو فوراً یہاں سے روانہ ہونا چاہیئے، بلکہ وہ چار روز میں چلے جائیں، اُن کے کام پر فی الحال کسی کا نام لکھ کر میرے پاس روانہ کیجئے، بعد میری منظوری کے وہ اس کام پر مقرر کئے جائیں، فتح نواز جنگ کی نسبت میں علیحدہ حکم دے چکا ہوں وہ فوراً معطل کیے جائیں اور اُن کی جگہ پر مولوی علی رضا خاں صاحب یا مسٹر ڈنلاپ منصرمانہ کام دیکھا کریں اور وقار الملک کے وظیفہ کی کارروائی رفتہ رفتہ ہوتی رہیگی، اس کے واسطے اُن کا یہاں توقف ضروری نہیں وہ چلے جائیں"۔

رزیڈنٹ کی چٹھی | جب اُن کے وظیفہ کی منظوری کا حال معلوم ہوا تو رزیڈنٹ نے اُن کو حسبِ ذیل یہ چٹھی لکھی:-

رزیڈنسی حیدرآباد

مائی ڈیر سر، اگرچہ مجکو آپ سے ملنے اور بذاتِ خود آپ کو خدا حافظ کہنے سے بہت مسرت ہوتی لیکن میں اس امر کو بخوبی سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کوئی ایسی بات کرنی پسند نہیں کرتے، جو موجودہ حالت میں موجب غلط فہمی ہوتی[1]۔

مجکو اُمید ہو کہ آپ کو بہت برسوں تک اپنے نئے وطن اور نئے لوگوں میں وہ آسایش نصیب ہو گی جو آپ نے ایک با مشقت اور مفید زندگی سے واجبی طور پر حاصل کی ہو، آپ کی بہبودی کے واسطے بہت بہت خواہشمند۔

آپکا دوست

پ چپلی پلوڈن

حیدرآباد سے روانگی

نواب وقار الملک نے ۲۱ صفر ۱۳۱۰ھ کو وظیفہ کی درخواست پیش کی تھی۔ ۲۸ ربیع الاوّل (۲۰ اکتوبر ۱۸۹۲ء) تک معاملہ کا تصفیہ ہو گیا، لیکن یہ تمام کارروائی اس طرح خفیہ طور پر انجام پذیر ہوئی کہ خاص خاص حلقوں میں بھی لوگوں کو اس کی اطلاع نہ تھی، یہاں تک کہ لارڈ لینسڈون کے ڈنر میں شریک ہونے والے مہمانوں کی فہرست میں اُن کا نام موجود تھا اور دعوت کا کارڈ اُن کے پاس بھیجا گیا تھا۔

نواب وقار الملک نے خود افسر جنگ بہادر کو اپنے وظیفہ کی اطلاع دی، اُس وقت پہلی مرتبہ

---

[1] چٹھی کے اس فقرہ پر نواب وقار الملک نے اپنے ہاتھ سے ایک نوٹ لکھا ہو جو حسب ذیل ہو:-

"جس وقت سے کہ میں نے اپنے وظیفہ کی درخواست پیش کی اُس وقت سے میں پھر رزیڈنسی میں کبھی نہیں گیا تھا، صرف اس خیال سے کہ مبادا لوگ خیال کریں کہ میں اپنی سرکار کی وہاں کوئی شکایت لیکر گیا ہوں، میری اسی احتیاط کی طرف رزیڈنٹ صاحب کے اس فقرہ میں اشارہ کیا گیا ہو۔" مشتاق حسین وقار الملک

لوگوں کو معلوم ہوا کہ مملکتِ آصفیہ آج اپنے ایک وفادار ملازم اور راست باز مدبّر کی شخصیت سے خالی ہو گئی۔ رخصت ہوتے وقت اُنھوں نے ٹیلیفون کے ذریعہ سے اپنے قدرشناس آقا یعنی نواب سر آسمان جاہ کو الوداعی سلام کیا، تو اس نیک طینت امیر نے اپنی ذمہ داری پر اُن کو پھر روکنا چاہا اور اصرار کیا کہ بالفعل اپنا ارادہ ملتوی کر دو، لیکن نواب وقارالملک نے کہا کہ "تعمیل تو اعلیٰ حضرت کے ہی حکم کی ہوگی، اور اب معینہ مہلت میں چند گھنٹے باقی ہیں اور میں اسی مہلت میں تعمیل کرونگا"۔

غرض ۲۳ ر اکتوبر ۱۸۹۲ء کی تیرہ و تار شب میں جب کہ آہستہ آہستہ بارش ہو رہی تھی یہ کوہ عزم و وقار انسان ۱۰ بجے کی ٹرین سے دولتِ آصفیہ کے پایۂ تخت سے روانہ ہوا۔ اسٹیشن پر صرف چند مخلص احباب کا مجمع تھا جو بصد حسرت و یاس اس کو رخصت کر رہے تھے، مگر رخصت ہونے والے کا چہرہ پرسکون اور سنجیدہ تھا۔ کوئی شخص نہیں کہہ سکتا تھا کہ اُس کے دل میں کس قسم کے جذبات موجزن ہیں۔ جب روانگی میں چند منٹ باقی رہ گئے تو وہ اپنے دوستوں سے رخصتی معانقہ کر کے ٹرین کی طرف بڑھا۔ رخصت ہوتے وقت اُس نے اپنے محبوب آقا اور ولی نعمت، آصف جاہ سادس کے پایۂ تخت کو پھر ایک دفعہ نظر اُٹھا کر دیکھا۔ جہاں وہ سر سالار جنگ اعظم کے عہد میں بعالم نوجوانی آیا تھا، جہاں اُس نے ایام شباب کی بہترین طاقت اور دل و دماغ کی تمام بہترین قوتیں صرف کر دیں، جہاں اُس نے اپنی صحت اور شباب دونوں کو ہمیشہ کے لیئے رخصت کر دیا، اب وہ امروہہ کا نوجوان مشتاق حسین نہ تھا، بلکہ بوڑھا وقارالملک تھا، جو دولتِ مغلیہ کی اس آخری یادگار کو بڑی اُمید و محبت کی نظروں سے دیکھ رہا تھا جو اس کو بہت عزیز تھی اور جس کے ویران جنگل اور جھلسے ہوئے پہاڑوں کو سرسبز و آباد کرنے کے لیئے اُس نے بڑی کوشش کی تھی۔

آخرکار ٹرین کی روانگی نے اس پُرحسرت منظر کا خاتمہ کر دیا، اور یہ بوڑھا نواب ہمیشہ کے لیئے حیدرآباد سے رخصت ہو گیا۔

وظیفہ فرمان روایانِ دولتِ آصفیہ خلد اللہ ملکہم کی یہ عجیب خصوصیت ہو کہ وہ نارضامندی کی حالت میں بھی ایک لمحہ کے لیے کسی کی حق تلفی گوارا نہیں فرماتے چنانچہ باوجودیکہ حریفوں نے اعلیٰ حضرت کی طبع شاہانہ کو نواب وقار الملک کی طرف سے مکدر کر دیا تھا، اعلیٰ حضرت نے اُن کی قدر شناسی میں کوتاہی نہ کی" اور ایک ہفتہ کے اندر اُن کے وظیفہ کی منظوری کا حکم صادر فرما دیا، اور ۶ ربیع الثانی ۱۳۱۰ھ کو اُن کو اطلاع دی گئی کہ "حضرت بندگانِ عالی متعالی مدظلہ العالی نے براہِ نوازش شاہانہ اُن کے واسطے سات سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ تا حین حیاتی منظور فرمایا ہے کیونکہ چھ سو ماہوار سے زیادہ وظیفہ کسی کو عطا نہیں کیا گیا" اور ایک سو روپیہ ماہوار بوجہ سفارش خاص نواب مدار المہام سرکار عالی کے منظور ہوا ہے۔

ایک سربستہ راز کا انکشاف

اعلیٰ حضرت کی ناراضمندی کا سبب

نواب وقار الملک نے ۱۸۹۱ء میں نواب سر آسمان جاہ کی خدمت میں صرف اس بنا پر استعفا پیش کر دیا تھا کہ اُن کو یہ محسوس ہوا تھا کہ اب نواب ممدوح کو اُن پر پہلا جیسا اعتماد باقی نہیں رہا، اور جب خود نواب سر آسماں جاہ نے بھی یہ تسلیم کیا کہ اُن کے اعتماد میں بقدر دانہ خشخاش کمی آگئی ہے تو وہ اس حالت کو بھی برداشت نہ کر سکے اور اُنھوں نے صاف صاف کہدیا کہ :۔

"بے اعتمادی گو کہ ایک دانہ خشخاش سے بھی کم ہو بلکہ صرف بے اعتمادی کا نام اشراف کے لیئے موت سے بدتر ہے"

بلکہ تحلیل و تجزیہ کے بعد نوبت یہانتک پہونچی کہ اُنھوں نے "دانہ خشخاش" کے سویں حصہ کی برابر بھی بے اعتمادی کے اظہار کو گوارا نہیں کیا، ایسی حالت میں اعلیٰ حضرت کا یہ فرمانا کہ :۔

"سر آسماں جاہ تو اچھے ہیں لیکن اُن کے مشیر اچھے نہیں"

صاف طور پر بے اعتمادی کا اظہار تھا، اور اگرچہ اس فقرہ میں اُن کا نام نہیں لیا گیا تھا، لیکن یہ امر روز روشن کی طرح ظاہر تھا کہ "مشیر" سے مراد نواب وقار الملک کی ذات تھی اس لیئے اُنھوں نے بلا تامل استعفا دے دیا جو منظور ہو گیا، کیونکہ جب "آقا" کا اعتماد باقی نہیں رہا، تو ایک لمحہ کے لیئے بھی ٹھہرنا، اُن کے لیئے ناقابل برداشت تھا۔

یہ ایک واقعہ تھا جو دنیا کے اور واقعات کی طرح گزر گیا اور ماضی کے دفتر میں شامل ہو گیا، لیکن نواب وقار الملک کے لیئے اس واقعہ کے اندر ایک ایسی چیز تھی جس نے اُن کو زمانہ

دراز تک بےچین اور مضطرب رکھا، یعنی اعلیٰ حضرت کا "اظہار بے اعتمادی"۔ وہ متحیر تھے کہ آخر یہ ناراضمندی اور بے اعتمادی کا کیا سبب ہے؟ وہ ایک ایک واقعہ پر غور کرتے تھے، لیکن اُن کو کوئی واقعہ بھی اس قدر مہتم بالشان نظر نہیں آتا تھا جو اعلیٰ حضرت جیسے مستقل مزاج فرمانروا کو اپنے دیرینہ معتمد علیہ اور وفادار ملازم سے ناراض کردے، لہٰذا اُنھوں نے خیال کیا کہ اس معاملہ کے اندر کوئی راز ہے جس کے معلوم کرنے سے وہ اب تک قاصر ہیں لیکن اس راز کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا، اس لئے اُن کو خواہ مخواہ صبر کرنا پڑا۔

لیکن علیحدگی سے چند سال بعد ایک سفر کی حالت میں دفعتاً یہ راز اُن پر کُھل گیا، اور جو کانٹا سالہا سال سے اُن کے دل میں کھٹک رہا تھا نکل گیا۔

خود نواب وقارالملک نے اس راز کو ایک خط میں بیان کیا ہے جو اُنھوں نے سر ڈینس فٹز پیٹرک کو انگلستان بھیجا ہے۔ صاحب موصوف پہلے حیدرآباد میں رزیڈنٹ تھے پھر پنجاب کے لفٹنٹ گورنر مقرر ہوئے اور اپنی مدتِ معینہ پوری کر کے انگلستان چلے گئے۔ نواب وقارالملک کا یہ خط حسب ذیل ہے۔

نوّاب وقارالملک کا ایک پُر اسرار خط

مائی ڈیر سر! میں اگرچہ اپنے حیدرآباد چھوڑنے سے دو سال پہلے اس بات کا آرزومند تھا کہ مجکو ریٹائر ہونے کی اجازت ملے، لیکن اسی کے ساتھ اس گورنمنٹ نے جن شاہانہ نوازشات کے ساتھ ہمیشہ میری خدمات کی قدرشناسی کی تھی اس کے لحاظ سے میری یہ بھی نیچرل خواہش ضرور تھی کہ میرے وہاں کے قیام کے آخر وقت تک بادشاہ و وزیر و پبلک کا اعتماد بھی میری نسبت قائم رہے، اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ حیدرآباد سے میری رخصت ہوتے وقت بادشاہ کا اعتماد میری نسبت عمدہ حالت میں نہیں رہا تو بیشک اس کا افسوس مجکو ہمیشہ رہا ہے۔

(۱) ہز ہائنس نظام کی رائے سر آسمان جاہ اور اُن کے مشیروں کے متعلق | جو الفاظ کہ اس معاملہ کے متعلق اوّل تم

میرے کان میں پہونچے وہ یہ تھے کہ ہز ہائنس فرماتے ہیں کہ:۔

"آسماں جاہ تو اچھے ہیں مگر اُن کے مشیر اچھے نہیں ہیں"

یہ سنتے ہی میں نے بلا تاخیر وظیفہ کی درخواست پیش کی اور اُس میں عرض کر دیا کہ درخواست کی منظوری کے بعد میں اپنے وطن کو روانہ ہونا چاہتا ہوں۔

اِس بے اعتمادی کی نسبت جو کچھ گزشتہ زمانہ میں بیان کیا گیا اُس میں سے کوئی امر بھی ایسا نہ تھا جس کو میں اس تغیر عظیم کی وجہ قرار دے سکتا جو ہز ہائنس کی سی مستقل اور نہایت پر غور و فکر اور منصف طبیعت میں میری طرف سے پیدا ہو گیا تھا۔

(۲) ہز ہائنس کی ناخوشی کے اسباب

بعض نے کہا کہ یہ الماس والے مقدمہ کا نتیجہ تھا مگر جنھوں نے ایسا خیال کیا اُنھوں نے تو بالکل ہی برعکس نتیجہ نکالا۔ بعض نے نواب مہدی حسن کے مقدمہ کو اس کی وجہ قرار دیا، مگر یہ بھی محض غلط خیال تھا، ہز ہائنس وہ شخص نہیں ہیں جن پر ایسی لغو باتوں کا کوئی ایسا اثر پڑتا اور وہ بھی میری نسبت کسی نے کہا کہ یہ جاگیرداروں کی شورش کی وجہ سے تھا جن کو اپنی جاگیرات کی تحقیقات ناگوار تھی، اسی طرح کسی نے کچھ اور کسی نے کچھ اُس کی نسبت بیان کیا جس کو میں ہمیشہ بہت ہی غور سے پڑھتا رہا ہوں، مگر کوئی ایک بات بھی مجکو اس میں کام کی نہیں ملی خود ہز ہائنس کی ایک تحریر بھی میرے معاملہ کے متعلق نواب سر آسمان جاہ بہادر کے نام میں نے دیکھی ہے اور اگر کبھی مجکو موقع ملا تو میں نہایت ادب کے ساتھ ہز ہائنس کے حضور میں یہ عرض کرنے کی عزت حاصل کروں گا کہ اصل ناراضامندی کی وجہ کا اظہار اس معزز ترین تحریر میں بھی نہیں ہوا تھا۔

(۳) بمبئی کا سفر اور ایک جدید انکشاف

لیکن حال ہی میں چند ہفتہ پیشتر جب کہ مجکو اپنی بہو مسز محمد احمد مرحوم کے انگلستان جاتے وقت بمبئی کا سفر پیش آیا تو اس سفر کے اثناء میں مجکو بعض ایسے لوگوں سے ملنے کی عزت حاصل ہوئی جو میرے بعد کچھ عرصہ تک حیدرآباد میں رہے تھے، اور جن کو میرے آخر زمانہ قیام حیدرآباد اور اس کے بعد بھی عرصہ تک ہز ہائنس کے خیالات پر مطلع ہونے کا کافی موقع حاصل رہا تھا۔ ان ملاقاتوں میں البتہ مجکو ایک خاص بات ایسی دریافت ہوئی کہ جس کو

میں اس انقلاب کی وجہ قرار دے سکتا ہوں جو ہز ہائنس کی طبیعت میں دفعتاً میری طرف سے پیدا ہوا تھا، اور وہ ایک ایسی وجہ ہے جس کو آپ کی ایک ایسی کارروائی سے تعلق ہے جو کہ آپکے حیدرآباد چھوڑنے کے بعد ظہور میں آئی، لہٰذا امید ہے کہ اگر میں اس کو آپکے نوٹس میں لانے کی جراءت کروں تو آپ مجکو معاف فرمائینگے۔

(۴) نواب سرور الملک کی ایک یادداشت

میرے کان تو اُسی وقت کھڑے ہوئے تھے، جب کہ کچھ عرصہ پیشتر نواب سرور الملک بہادر (سرور جنگ) کی ایک یادداشت جو کہ اُنھوں نے ہز ہائنس اور رزیڈنٹ اور مدارالمہام وقت کے باہمی تعلقات کی نسبت شائع کی ہے، اخبارات میں شائع ہونی شروع ہوتی اور جس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ :۔

"ہر شخص جو حیدرآباد کے حالات سے واقف ہے بخوبی جانتا ہے کہ چند دنوں ہیلی آنریبل آسمان جاہ بہادر مدارالمہام تھے اور ملک کی فنانشل حالت بھی کسی قدر مخدوش تھی اور اس زمانہ میں بھی یہی شور وغل ہوا کہ اعلیٰ حضرت کے مصارف سے خزانہ خالی ہو رہا ہے، خوش قسمتی سے ان دنوں ایک باخبر اور راستباز رزیڈنٹ سر ڈینس فٹز پٹرک موجود تھے جن کی طرز کارروائی بالکل اُن کے قایم مقام سے جس نے کشمیر میں بڑا نام کمایا ہی علیحدہ تھی۔

اعلیٰ حضرت کی عظمت اور وقعت کے محافظ (ہم کو ایسے لقب سے اُن حکام کو یاد کرنا چاہیئے) جو حکام تھے انھیں حکم دیا گیا کہ اسراف کے ثبوت میں ایک تحریری یادداشت تیرہ سال کے آمد و صرف کی پیش ہو، وہ مسٹر ڈینس کو کچھ اور ہی سمجھے ہوئے تھے، سر ڈینس ایک لائق شخص ہونے کے علاوہ قانون داں اور بے لوث حاکم تھے، اُنھوں نے اصل مطلب کو آناً فاناً پالیا، پنجاب کی گورنری پر جانے کا زمانہ قریب آگیا تھا، اور گورنری پر جانے کے وقت وہ حسابات کو لیئے ہوئے انگلینڈ گئے، اور بعد تنقیح اُنھوں نے ایک بسیط رپورٹ لکھی اور نرم الفاظ میں

اعلیٰ حضرت پر جنھوں نے اسراف کا الزام لگایا تھا ان پر ملامت کی، اور تمام برائیوں کو جو ریاست کی تباہی کا باعث تھیں اور جن سے آیندہ بہت کچھ صدمہ ریاست کو بصورت عدم السداد پہونچنے والا تھا لکھدیا۔

اِس رپورٹ کو سر ڈینس نے خاص اعلیٰ حضرت کی خدمت میں روانہ کیا، اور ساتھ اس کے ایک دوستانہ خط بھی پند آمیز لکھ بھیجا کہ اعلیٰ حضرت کو کیا کرنا چاہیئے۔ یہ پہلا وقت تھا جو اعلیٰ حضرت کو اصلی واقعات کی اطلاع ہوئی اور نہایت متعجب ہوئے کہ خود ملازمین کی بد انتظامی سے جو برائیاں پیدا ہوئی ہیں اُن کو ان ملازمین نے اعلیٰ حضرت کی طرف منسوب کیا کہ اعلیٰ حضرت کے اسراف سے ہوتی ہیں، دوسری حالت میں یہ الزام ضرور اعلیٰ طبقوں میں باور کیئے جاتے۔

اس وقت اور اب بھی اس قسم کے الزامات اعلیٰ حضرت پر لگانے سے مقصود یہ تھا کہ اعلیٰ حضرت کو گورنمنٹ آف انڈیا کی نظروں میں حقیر گردان کر گوشہ نشین کردیں اور خود مختار ملک بن بیٹھیں"۔

(۵) سیزدہ سالہ یادداشت اور اعلیٰ حضرت کی نارضامندی

مذکورہ بالا مضمون اخبار میں میں نے پڑھا تو سہی مگر مجکو پوری طرح اطمینان نہ ہوا کہ یہ واقعات کہاں تک صحیح ہیں، لیکن اپنے گزشتہ سفر بمبئی کے اثنا میں جن جنٹلمینوں کی ملاقات کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، اُنھوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی آپ کی وہی یادداشت جس وقت سے ہز ہائنس کے ہاتھ میں آئی اُسی وقت سے ہز ہائنس کو میری طرف سے نارضامندی پیدا ہوئی تھی اور یہ وجہ اب ایسی قوی اور صاف تھی کہ میں نے بھی جہاں تک اس پر غور کیا مجکو بھی اس میں کوئی شبہ نہیں رہا اور اب میں سمجھتا ہوں کہ جس گوہرِ مقصود کی مجکو ایک عرصہ سے تلاش تھی وہ اب ہاتھ آگیا ہے۔

(۶) یادداشت کے متعلق اعلیٰ حضرت کا خیال

بہ حیثیت ایک ایسے شخص کے جس کو آپ کی وہ مبسوط

یادداشت، اور اُس کے ساتھ کا خط دیکھنے کی عزت حاصل نہ ہوئی ہو، اور جو کچھ کہ میں سمجھ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ کی اس رپورٹ سے جس میں ہز ہائنس کی فرمائشات اور اخراجات پر صراحتہً وضمناً نکتہ چینی کا موقع دیا گیا تھا، کم از کم ہز ہائنس کو یہ تو ضرور ہی معلوم ہوا ہوگا کہ وہ سیزدہ سالہ یادداشت مدارالمہام کے ایک دفتر میں تیار ہوئی تھی اور مدارالمہام کے کسی سکرٹری نے اُسکو مدارالمہام کی اجازت سے آپ کے سامنے پیش کیا تھا، اور اس حالت میں ہز ہائنس پر ہی منحصر نہیں اگر ایک فرشتہ بھی اُن کی جگہ ہوتا تو اُس کو اپنے مدارالمہام اور اُس کے مشیروں پر ضرور غصہ آنا چاہیئے تھا، اور جب حالت یہ تھی اور ہز ہائنس کو اس بات کی بھی ضرورت لاحق ہوئی ہوگی کہ کسی شخص یا اشخاص سے اس اہم معاملہ کے متعلق مشورہ کریں تو مدارالمہام کی مخالف پارٹی کے لوگ شریک ہوئے ہونگے جن کی نہ وہاں اُمراء کے گروہ میں کمی تھی، نہ مڈل کلاس میں اور ان مشوروں کا جو کچھ نتیجہ ہو سکتا تھا وہ بھی محتاج بیان نہیں ہے اور جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہز ہائنس مدارالمہام اور اُن کے مشیروں سے بددل ہو گئے اور چونکہ مدارالمہام کو آپ کی اس رپورٹ کی کوئی اطلاع نہیں دی گئی تھی جو کہ ہز ہائنس اور ظاہرا گورنمنٹ آف انڈیا اور رزیڈنٹ وقت کے ہاتھوں میں پہنچ گئی تھی، لہٰذا مدارالمہام کو ہز ہائنس کی بدگمانیوں سے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیئے کوئی موقع نہ ملا، اور یہ صرف ہز ہائنس کی نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی طبیعت کی وجہ سے تھا جو حضرت نے اپنے مدارالمہام کو جن کی نیک طبیعت کا اُن کو دیرینہ تجربہ ہو چکا تھا یہ فرما کر گویا کسی قدر معاف کر دیا کہ مدارالمہام تو اچھے ہیں لیکن اُن کے مشیر اچھے نہیں، اور مشیر ہونے کی تمام تر ذمہ داری کا بوجھ جیسا کہ اُس وقت کی حالت کا مقتضے تھا، مشتاق حسین کی بے گناہ گردن پر پڑا، اور واقعات کی لاعلمی کی وجہ سے میں نے فوراً اپنے وظیفہ کی درخواست پیش کی اور اُس میں لکھ دیا کہ میں اپنے وطن کو جانا چاہتا ہوں اس لیئے یقیناً ہز ہائنس کی بدگمانی کو جو میری نسبت ہو گئی تھی یقین کے درجہ تک پہونچا دیا، اور یہ حالت تھی جس میں بعض اوقات نہایت وفادار سے وفادار نوکروں کے تباہ وبرباد ہو جانے کی مثالیں دنیا کی ہسٹری میں درج پائی جاتی ہیں، اور میں تو اپنے پاس وہ الفاظ نہیں پاتا جن میں ہز ہائنس کا شکریہ

اُن کی ان نوازشات کے لحاظ سے ادا کر سکوں جن سے حضرت نے با این ہمہ میرے ساتھ پنشن وغیرہ کے متعلق برتاؤ کیا اور یہ انھیں کی فیاضی کی وجہ سے ہے جو میں اس وقت تک کسی غیر کا دست نگر نہیں ہوا، اور نہ مجھے اس آخر عمر میں دوسری جگہ کسی نوکری وغیرہ کی تلاش کرنی پڑی۔

(۷) وفادار ملازمین کا صحیح طریق عمل

میں نے جو اوپر کے فقرہ میں اپنی بے گناہی کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے میرا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ میں کسی کارروائی کو جس میں ریاست کے فائدے کی غرض سے ہز ہائنس کو کفایت شعاری کا مشورہ دینے کی ضرورت ہو تو میں اس کو کوئی گناہ سمجھتا ہوں اس کو تو میں اعلیٰ درجہ کی خیر خواہی اور ہز ہائنس کے ساتھ عین وفاداری سمجھتا ہوں۔ البتہ طریق عمل کو ہر ایک کام میں بہت بڑا دخل ہوتا ہے، نہایت صاف اور ایک ایمانداری کا طریقہ ایک مدار المہام کے لیئے اس وقت میں یہ ہونا چاہیئے کہ جو کچھ وہ ہز ہائنس سے چاہتے ہوں اُس کو اوّل خود ہز ہائنس کے سامنے پیش کریں نہ یہ کہ خود تو ایک لفظ بھی اس قسم کا ہز ہائنس سے عرض نہ کریں اور رزیڈنٹ کے سامنے لمبے لمبے نقشے اور رپورٹیں اس غرض سے پیش کریں کہ وہ اپنے انفلوئنس سے ہز ہائنس کو کفایت شعاری پر راغب کریں جو ایک نہایت بزدلانہ فعل ہے اور جو کسی طرح بھی قابل معافی نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی شخص مدار المہام کو اس قسم کی خراب مشورت دے تو کم از کم وہ کان پکڑ کر نکال دینے کے قابل ہے اور اب میں اجازت چاہتا ہوں کہ اس تیرہ سالہ حسابات کی کارروائی کے متعلق چند واقعات عرض کروں۔

(۸) سیزدہ سالہ رپورٹ کی حقیقت

یہ سیزدہ سالہ تختہ جات مداخل و مخارج جو پولیٹکل و فنانشل سکریٹری کے دفتر میں تیار ہوئے تھے، میرے علم میں کبھی نواب سر آسمان جاہ بہادر نے اُن کی تیاری کا حکم نہیں دیا، بالآخر جب وہ کاغذات تیار ہوئے تو پولیٹکل و فنانس کے آفس سے مع ایک مسودہ عرضداشت منجانب مدار المہام بنام ہز ہائنس اس منشا سے مدار المہام کے سامنے پیش ہوئے کہ وہ ہز ہائنس کے سامنے پیش کیئے جائیں اس مسودہ عرضداشت میں ہر جگہ اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ موجودہ فنانشل حالت نہایت ہی قابل اطمینان ہے اس وقت نواب سر آسمان جاہ بہادر

نے وہ کاغذات مجھے دیکھنے کو دیئے، اور میری رائے بھی اُن کی نسبت دریافت کی میں نے جہاں تک کہ ان کاغذات کو مراتب مندرجہ مسودہ عرضداشت سے تعلق تھا دیکھا تو مجکو معلوم ہوا کہ محض غلط دلیلوں سے فنانشل حالت کی عمدگی ثابت کی گئی ہے اور ہزہائنس کو اس کے ذریعہ سے محض ایک سبز باغ دکھایا جاتا ہے

میں نے اپنی یہی رائے مدار المہام سے عرض کی اور تفصیل وار ہر ایک نتیجہ کو رقموں اور ہندسوں سے ان کو دکھلا دیا۔ اس پر مدار المہام نے اس مسوّدہ عرضداشت کو خارج کر دیا جو اُن کی طرف سے ہزہائنس کے نام پولیٹکل و فنانس سکرٹری کے آفس سے پیش ہوا تھا اور مجکو اجازت دی کہ میں آپ سے اس کے متعلق گفتگو کروں، چنانچہ اپنی یہی رائے زبانی میں نے آپکے سامنے پیش کی اور جو نتائج ریاست کی مالی حالت کے عمدہ ہونے کے ثبوت میں ان کاغذات کے ذریعہ سے قائم کیئے گئے تھے اُن کی غلطیوں کو میں نے آپکے سامنے مفصّل بیان کیا جس کی کسی قدر یادداشت اس وقت آپ نے لکھی۔

(۹) ہزہائنس کو سفرِ انگلستان کی ترغیب

جس زمانہ میں یہ کارروائی ہو رہی تھی مدار المہام کے کان میں یہ آوازیں بھی آ رہی تھیں کہ کچھ لوگ جن کو ہزہائنس کی خرید کے وقت کمیشن لینے کا خوب موقع ملتا ہے اس منصوبہ میں ہیں کہ ہزہائنس کو انگلستان کے سفر کی ترغیب دیں جس میں تقریباً پچاس لاکھ روپیہ سے کم صرف نہ ہوتا، لہذا بلاشبہ اس وقت مجکو یہ خیال بھی پیدا ہوا تھا کہ یہ نادقت اور سرتاسر غلط یادداشت جو پولیٹکل اور فنانس آفس سے پیش ہوتی ہے اور مدار المہام ہی کی طرف سے ہزہائنس کے سامنے پیش کرائی جاتی ہے اور جس میں دکھلایا جاتا ہے کہ اسٹیٹ کے پاس لاکھوں کروڑ روپیہ موجود ہے، اور جو قرضہ ریاست پر ہے اس کی کچھ بھی حقیقت نہیں ہے، اور فنانشل حالت ریاست کی اور خزانہ کی اس وقت عمدہ سے عمدہ حالت میں ہے، یہ کارروائی بھی ایک جزو انھیں لوگوں کی کوشش کا ہے تاکہ ہزہائنس کو سفر انگلستان کے متعلق غور کرتے وقت اس کے مصارف کی طرف سے کوئی فکر لاحق نہ ہو، اور اپنے اس خطرہ کو میں نے مدار المہام سے بھی اور اُن کی اجازت سے

آپ کے سامنے بھی اُسی وقت عرض کیا تھا۔

(۱۰) نواب محسن الملک کا کاغذات لیکر رزیڈنٹ کے پاس جانا

بہر حال آپ کی خواہش اس کے بعد یہ ہوئی کہ خود پولٹیکل اور فنانس سکریٹری جنھوں نے وہ کاغذات مرتب کیے ہیں، اِن کاغذات کے متعلق بالمشافہ آپ سے تفصیلی گفتگو کریں چنانچہ نواب سر آسمان جاہ بہادر کی اجازت سے نواب محسن الملک بہادر کاغذات لے کر آپ کے پاس حاضر ہوئے، اور مجکو پھر کچھ نہیں معلوم ہوا کہ وہ گفتگو کیا تھی اور اُس کا نتیجہ کیا ہوا۔ مجھ سے اگرچہ مختلف ڈپارٹمنٹوں کے متعلق کام لیا جاتا تھا لیکن وہ جو کچھ تھا محض اس وجہ سے تھا کہ مجکو اس کا حکم ہوتا تھا، خود مجکو ریونیو سکریٹری آفس کے سوا دوسرے سکریٹریوں کے صیغوں میں دخل دینے کا کچھ شوق نہ تھا اور اس لیئے صدہا کام دوسرے آفسوں سے ایسے ہوتے رہتے تھے کہ جن سے مجکو کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ مجکو اس قدر فرصت ہی تھی کہ ان سیزدہ سالہ تختہ جات کی تمام رقموں پر اور ان نتائج پر غور کرتا جو کہ ان سے اخذ ہو سکتے تھے۔ لہذا میں نے اپنی توجہ کو صرف اُن اُمور میں منحصر رکھا جو کہ مسودۂ عرضداشت میں درج تھے، تاکہ مدار المہام کی طرف سے کوئی غلط رپورٹ ہز ہائنس کے سامنے پیش نہ ہونے پائے، اور اس زمانہ میں میرے اور نواب محسن الملک کے تعلقات کچھ ایسے ہو رہے تھے کہ مجکو مناسب نہیں تھا کہ میں یہ دریافت کرتا کہ ان سیزدہ سالہ تختہ جات کی کارروائی کے متعلق نواب محسن الملک اور رزیڈنٹ میں کیا گفتگو ہوئی اور اُس کا آخری نتیجہ کیا نکلا، لیکن اس ملاقات کے بعد جو آپ سے اور نواب محسن الملک بہادر سے ہوئی تھی، میں نے آپ کو ایک دفعہ یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مدار المہام مختلف ناموں سے ایک لاکھ روپیہ سالانہ کے قریب خزانہ سے لے لیتے ہیں، اور بجنسہ نواب مدار المہام سے عرض کر دیا کہ جنھوں نے سنکر فرمایا کہ اس سے رزیڈنٹ صاحب کی مُراد میرے اسٹاف، گاڑی خانہ وغیرہ اور لوازم مدار المہامی سے معلوم ہوتی ہے، لیکن ان لوازم میں میرے وقت میں کچھ تخفیف ہی ہو گئی ہے، کوئی اضافہ نہیں ہوا۔

(۱۱) نواب انتصار جنگ کا ہز ہائنس نظام کی خدمت میں حاضر ہو کر سب واقعات عرض کرنا۔

چونکہ ہز ہائنس کے تعلقات اپنے مدار المہام کے ساتھ نہایت ہی عمدہ حالت میں تھے، لہٰذا اس عرصہ میں مدار المہام کے حسب ایماء ایک رات کو میں نے ہز ہائنس کے سامنے بھی مدار المہام کی طرف سے اس کل کارروائی کا تذکرہ من اوّلہ الیٰ آخرہ عرض کر دیا۔ کہ کس طرح پر پولیٹیکل و فنانس آفس سے اس قسم کے کاغذات مرتب ہو کر پیش ہوئے جن میں غلط طور پر ریاست کی مالی حالت نہایت عمدہ تبلائی گئی تھی اور یہ اُن لوگوں کی کوشش کا ایک جزو معلوم ہوتا ہے جو ہز ہائنس کو انگلستان کے سفر کی ترغیب محض اپنے منافع کی غرض سے دلانا چاہتے ہیں۔ اس تذکرہ کے وقت یہاں تک بھی میں نے ہز ہائنس کے گوش گزار کر دیا تھا کہ مدار المہام نے رزیڈنٹ پر بھی یہ ظاہر کر دیا ہے کہ ریاست کی مالی حالت ایسی عمدہ نہیں ہے۔ جیسی کہ دفتر سے دکھلائی گئی ہے، اور چونکہ وہ محض ایک سبز باغ تھا لہٰذا وہ کاغذات حضور پُر نور کے سامنے پیش نہیں کیئے گئے۔ یہ ہیں کل واقعات اس معاملہ کے متعلق، اور جہاں تک کہ میرا تعلق ہے آپ کو کبھی یاد نہ ہوگا کہ میں نے مدار المہام کی طرف سے یا اپنی طرف سے کبھی اس قسم کا کوئی بیان کیا ہو جس میں ہز ہائنس کی فرمائشات وغیرہ کے متعلق کوئی نکتہ چینی کی گئی ہو۔

(۱۲) سیزدہ سالہ یادداشت تیار کرنے والوں کا خطرناک مقصد

اور خواہ یہ اصلی واقعہ ہو یا محض میری بدگمانی ہو جس کے واسطے خدا مجکو معاف کرے، مگر اب میں یہ عرض کرنے کی ضرور جرأت کرونگا کہ اس سیزدہ سالہ کاغذات کے مصنفوں کی منشا اپنی اس تصنیف سے اسی قدر نہ تھی کہ جس قدر کہ میں اس وقت سمجھا تھا، یعنی ہز ہائنس کے ان گرد و پیش والوں کو جو کہ ہز ہائنس کو انگلستان کے سفر پر آمادہ کرنا چاہتے تھے مدد دیکر اپنا مشکور کر لیں اور مدار المہام اور ہز ہائنس کو یہ دکھلا کر اپنے سے خوش کریں کہ اُن وہ کوشش جس سے ریاست کی مالی حالت عمدہ سے عمدہ حالت میں دکھلائی گئی تھی صرف اس لیئے تھی کہ ریاست کا اعتبار بڑہے اور ایسے منتظموں کی نیک نامی کا باعث ہو، بلکہ اس سے دو عظیم الشان اور گہرے مقصد اور بھی تھے، اور وہ یہ کہ:-

(اوّل) جس وقت اُن کی وہ تصنیف رزیڈنٹ اور گورنمنٹ آف انڈیا کے سامنے پیش ہو تو وہاں وہ اس سے یہ ثابت کر سکیں کہ بادشاہ اور وزیر دونوں اپنی فضول خرچیوں سے خزانہ کو برباد اور ریاست کی مالی حالت کو تباہ کر رہے ہیں (گو کہ اس میں سے ایک معتدبہ صرف انھیں کی مشورتوں کا نتیجہ تھا) اور اس طرح رزیڈنٹ اور گورنمنٹ آف انڈیا کی نظروں میں اپنے آپ کو نہایت ایماندار ثابت کریں، اور اُن کی مدد اپنی نسبت حاصل کریں۔

(دوم) جس وقت کہ گورنمنٹ آف انڈیا اور رزیڈنٹ اپنا انفلوئنس ان کاغذات کی بنیاد پر ہز ہائنس کو کفایت شعاری کی ترغیب دینے میں براہِ راست کام میں لائیں، تو اس خیال سے کہ مدار المہام اور اُن کے "مشیر خاص" ہی نے یہ شکایت رزیڈنٹ اور گورنمنٹ آف انڈیا سے کی ہے ہز ہائنس کے دل میں ان دونوں کی طرف سے دلی نفرت پیدا ہو جائے اور خود ان مصنفوں کے لیئے تو صاف راستہ کھلا ہوا تھا کہ ہم تو محض برائے نام عہدہ رکھتے ہیں، اور کسی مشورت میں شریک ہی نہیں ہیں، اور یہ جو کچھ انھوں نے سوچا تھا اس میں وہ کامل طور سے کامیاب ہو گئے، اور مدار المہام کو آخر وقت تک یہ خبر نہوئی کہ کیا ہو رہا ہے اور اصل وجہ ہز ہائنس کی اس نارضامندی کی کیا ہے؟ ورنہ چونکہ مدار المہام کی طرف سے ایک مرتبہ ان سیزن سالہ کاغذات کا تذکرہ ہز ہائنس کے سامنے ہو ہی چکا تھا تو یہ چنداں مشکل نہ تھا کہ ہز ہائنس کی طبیعت میں آپکی یادداشت کی وجہ سے کوئی غلط خیال پیدا نہ ہونے دیتے۔

(۳) اعلیٰ حضرت کی نارضامندی کا صدمہ

آخر میں مجکو اس قدر اور بھی عرض کر دینا ضرور ہے کہ یہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے یہ صرف وہ ہے جہاں تک کہ میری ذاتی معلومات، اور ذاتی رائے اور ذاتی کارروائی کا تعلق ہے اور اگر آپ کے علم میں اس سے زیادہ کچھ اور بھی ہے جو کہ مجھ سے بالا بالا وقوع میں آیا ہو اور جس کا مجکو کوئی علم نہیں ہے تو اس کی ذمہ داری سے میں ہر طرح بری ہوں، اور آپکے سامنے میرے یہ عرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ایک شخص کی تسکین خاطر کے لیئے جس کی میری سی پوزیشن رہی ہو، صرف اس قدر کافی نہیں ہوتا

کہ روٹی اور کپڑے کی طرف سے اُس کو بےفکری ہو جائے۔ میرے لئے سب سے قیمتی چیز جو میں نے تیس سالہ سروس میں حاصل کی تھی وہ اعتماد تھا جو کہ ہز ہائنس میری نسبت فرماتے تھے، اور بغیر میرے کسی قصور کے اس کا اس طرح پھر آخر عمر میں مجھ سے چھن جانا اور برخلاف اس کے نمک حرامی کے الزام کا مجھ سے منسوب ہونا، یہ میری ہر ایک خوشی اور مقصد کے لئے جو اس دنیا میں حاصل ہو سکتے ہیں ایک موت ہی جو طبعی موت سے میرے لئے زیادہ تلخ ہی اور اس تلخی سے مجبور ہو کر میں نے مذکورہ بالا حالات کا آپکے نوٹس میں لانا مناسب سمجھا اور جو تکلیف اس کی وجہ سے جناب عالی کو ہو گی اُس کی میں نہایت ادب سے معافی چاہتا ہوں۔

حیدرآباد کی ملازمت کی ہوس تو میرے دل سے اُسی وقت نکل گئی تھی جب کہ میری مدتِ ملازمتِ پنشن کی حد تک پہونچ گئی تھی اور اب بھی اور آرزو مجکو حیدرآباد کے معاملات کے متعلق اس کے سوا باقی نہیں ہی کہ ہز ہائنس کے دل میں جو بے اعتمادی میری طرف سے پیدا ہو گئی ہی وہ رفع ہو جائے تاکہ بغیر ان تکلیف دہ اور تلخ خیالات کے میری روح اس دنیا سے کوچ کرے، اور میرا نام اس دنیا میں آیندہ برائی کے ساتھ یاد نہ کیا جائے، خدا کے ہاں مجکو اس معاملہ کے متعلق کوئی خوف نہیں ہی کیونکہ وہ سب طرح دانا، بینا ہی اور اُس کے ہاں اس قسم کی غلط فہمیاں نہیں ہو سکتیں“۔

اس خط سے نواب وقار الملک کا مقصد یہ تھا کہ سر ڈینس فٹز پٹرک پر سیزن سالہ رپورٹ“ کے متعلق اصلی واقعات ظاہر کر دیں تاکہ اُن کی بے تعلقی اس معاملہ سے ثابت ہو جائے اور وہ اعلیٰ حضرت کے سامنے اپنی براءت ظاہر کر سکیں اس باضابطہ خط کے ساتھ اُنھوں نے ایک علیحدہ چٹھی بھی سر فٹز پٹرک کو لکھی تھی لیکن افسوس کہ اُن خطوط کا اُن کو کوئی جواب نہیں ملا اور یہ کچھ خلاف

توقع نہ تھا، حیدرآباد کے سابق رزیڈنٹ کے لئے مشکل یہ مناسب ہو سکتا تھا کہ وہ حیدرآباد کے معاملات سے کامل طور پر بے تعلق ہو جانے کے بعد دوبارہ وہاں کے معاملات میں حصّہ لے، اور زمانہ گزشتہ کے کسی واقعے کے متعلق ذمہ دارانہ حیثیت سے کسی رائے کا اظہار کرے، اس لئے اُنھوں نے خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ تاہم نواب وقار الملک نے ۶۔ ۷ ماہ تک جواب کا انتظار کیا۔ لیکن جب اس طرف سے مایوسی ہوئی تو اُنھوں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ اعلیٰ حضرت کو زیادہ مدت تک حقیقتِ حال سے بے خبر رکھیں، چنانچہ ایک طویل عرضداشت بارگاہِ خسروی میں پیش کرنے کے لئے تیار کی، یہ عرضداشت درحقیقت نواب وقار الملک کی حیدرآبادی زندگی پر ایک مکمل تبصرہ ہے اور تبصرہ بھی خود صاحب سوانح کے قلم سے، اس لئے ایک ایک لفظ بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے۔

اس عرضداشت نے تمام واقعات سے پردہ اٹھا دیا ہے، اور تمام الزامات کو ایک ایک کر کے رفع کر دیا ہے، اس لحاظ سے یہ یادداشت اُن کے سوانح حیات کا ایک ضروری حصّہ ہے۔ حیدرآباد سے اُن کی علٰحدگی کے بعد لوگوں نے اخبارات میں بہت کچھ طبع آزمائی کی تھی، اور اپنے اپنے خیال کے مطابق اُن کی علٰحدگی کے وجوہ تجویز کر کے اُن کو موردِ الزام قرار دیا تھا، لیکن اُس موقع پر نواب وقار الملک نے کسی مصلحت سے ان مباحث میں مبتلا ہونا پسند نہ کیا، صرف یہ چاہا کہ اعلیٰ حضرت کے دل میں اُن کی طرف سے جو شکوک ہیں وہ رفع ہو جائیں، اور اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے اُنھوں نے یہ عرضداشت مرتب کی جو پرائیویٹ طور پر بارگاہِ آصف جاہ میں پیش کی گئی۔ اُس وقت یہ مناسب نہ تھا کہ جو واقعات اس میں لکھے گئے ہیں اور برأت کے جو وجوہ بیان کئے گئے ہیں وہ پبلک کے سامنے پیش کئے جائیں، لیکن اُن کی یہ خواہش ضرور تھی کہ اُن کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے آقا کے وفادار اور خیر خواہ تھے، اور اُن کا دامن غدّاری کے داغ سے پاک تھا۔ اس خواہش کا اظہار خود اس عرضداشت کے ایک فقرہ سے ہوتا ہے جب کہ وہ تمام الزامات کا جواب

دینے کے بعد لکھتے ہیں :-

"اس عرضداشت کے ذریعہ سے فدوی نے بھی اس قدر ساماں ضرور مہیا کر دیا ہے کہ میرے اس جہان سے سفر کر جانے کے بعد اگر وہ خلقت کی نگاہ سے گزرے تو آیندہ کی دنیا میری نسبت یہ صحیح رائے قایم کر سکے کہ میں اپنے بادشاہ کا ناوفادار ملازم نہیں تھا، اور جہاں تک میرے امکان میں تھا میں نے اپنے فرائض کو نہایت ایمانداری کے ساتھ انجام دیا تھا۔"

خدا کا شکر ہے کہ آج کامل پچیس برس بعد اُن کی یہ آرزو پوری ہوئی اور یہ عرضداشت جو اخلاص و وفاداری کے جذبات سے لبریز ہے، اور نوجوانوں کے لیئے عبرت و بصیرت کا مرقع ہے، منظر عام پر آرہی ہے۔ اس میں متعدد واقعات نہایت سبق آموز ہیں، جو مطالعہ کرنے والوں کے لیئے شمع راہ کا کام دیتے ہیں، اس عرضداشت سے اُن کے عام اخلاقی محاسن کے علاوہ اخلاص اور شرافت نفس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ حضرت کے سامنے از راہ خود غرضی صرف اپنی برأت پر قناعت نہیں کرتے، بلکہ اپنے مرحوم و مغفور آقا سر آسماں جاہ کی بھی پوری قوت سے حمایت کرتے ہیں اور یہ بات اعلیٰ حضرت کے ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں کہ "مرحوم وزیر" سلطنت کا اور ذات شاہانہ کا وفادار تھا مگر حریفوں کی سازش کا شکار ہو گیا، اسی جگہ سے یہ راز کھلتا ہے کہ نواب وقار الملک پر مرحوم وزیر کا سب سے زیادہ اعتماد کچھ بے جا نہ تھا، سینکڑوں مدعیان اخلاص و وفاداری اس امیر کبیر کے دربار میں کمر بستہ حاضر رہتے تھے، لیکن جب زمانہ پلٹا اور اُس کو مسند وزارت سے ہٹنا پڑا تو کسی نے اُس کی حمایت میں ایک لفظ بھی نہیں کہا، لیکن نواب وقار الملک اپنے نیک طینت آقا کو کبھی نہ بھولے یہاں تک کہ اس جہاں سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی اُنھوں نے مرحوم کے آقا کے سامنے اُس کی حمایت کی، یہی چیزیں ہیں جو ہماری قدیم تعلیم و تربیت کا جوہر تھیں، اور وقار الملک اسی تعلیم و تربیت کا ایک نمونہ تھے۔

عرضداشت وقار الملک بحضور نظام الملک آصفجاہ سادس

فرماں روائے حیدرآباد

حیدرآباد سے علیحدہ ہونے کے بعد فدوی ہمیشہ اس ارادہ میں رہا ہی کہ حضرت ظلِ سبحانی کی پیشگاہ اقدس و اعلیٰ میں کسی وقت ایک عرضداشت پیش کرنے کی عزت حاصل کرے۔ لیکن ہر مرتبہ جب ایسا ارادہ کیا کوئی نہ کوئی خیال جس کا اعادہ اس وقت قلم سے ناممکن ہی مانع رہا۔ مگر یہ حال کا موقع جس میں فدوی کو اپنا ایک آخری فرض نواب سر آسمان جاہ مرحوم و مغفور کے متعلق جن کے نام کے ساتھ آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں ادا کرنا ناگزیر ہی ایسا پیش آیا ہی کہ اُس کو فدوی زیادہ عرصہ تک ملتوی نہیں رکھ سکتا تھا۔ اور وہ ایک مختصر سی عرضداشت ہی جو فدوی مرحوم و مغفور کے متعلق علیحدہ پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہی اور اِسی کے ساتھ اب یہ بھی ضروری ہی کہ فدوی اس دیرینہ آرزو کو بھی پورا کرے جس کے خیال سے فدوی کا کوئی وقت بھی خالی نہیں رہا ہی اور یہی عرضداشت ہی جس کو نہایت ادب اور عاجزی سے پیش کرنے کی عزت فدوی حاصل کرتا ہی۔

معذرت واستدعا ترحم

۲- ہر ایک شخص جو کسی وقت اپنے بادشاہ ظل اللہ کا مورد مراحم رہ چکا ہو اور اب بھی جس کا گوشت پوست اپنے مالک کے نمک سے پرورش پاتا ہو اور جس کے بال بچوں کی گزران سب اپنے مالک بادشاہ کے تصدق سے ہوتی ہو وہ ضرور اس بات کا آرزومند ہوتا ہی کہ اگر اتفاق سے اس کے مالک اور آقا کو اُس کی طرف سے کوئی ایسا خیال پیدا ہو جائے جو اُس کی نمک حلالی اور جان نثاری کے خلاف ہو تو حتے الامکان اس کی اِصلاح میں سعی کرے اور اگر درحقیقت اُس سے کوئی خطا سرزد ہو گئی ہو جس سے کوئی فرد و بشر بھی خالی نہیں ہی تو نہایت ادب سے اِس کی معافی کا خواستگار ہو اور یہی مقصد اس گزارش کا ہی بلکہ ایک ناکردہ گناہ کے لیے

بھی نجات کا یہی ایک راستہ ہے کہ اپنے گناہ کا اعتراف کرلے اور خدا سے عفو و رحمت کا طالب ہو۔

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیرِ خویش — عذر بدرگاہِ خدا آورد
ورنہ سزاوارِ خداوندیش — کس نتواند کہ بجا آورد

بعض خیالات کی نسبت کچھ گزارش

۳ - اب سب سے پیشتر فدوی بعض اُن خیالات کی نسبت کچھ عرض کرنا چاہتا ہے جو فدوی کی نسبت حیدر آباد میں عام طور پر پھیلے ہوئے تھے اور جن کی وجہ سے لوگوں کو اکثر غلط فہمی ہوتی تھی۔ ان خیالات میں سب سے اہم تر خیال یہ تھا کہ "نواب سر آسماں جاہ بہادر مرحوم مغفور جو کچھ کرتے تھے وہ سب مشتاق حسین کی رائے سے ہوتا تھا"۔ اس معاملہ کی اصل حقیقت یہ تھی کہ بلا شبہ نواب صاحب موصوف فدوی پر بہت زیادہ اعتماد کرتے تھے اور فدوی کو اپنا سچا خیر خواہ سمجھتے تھے اور جو کچھ فدوی مرحوم موصوف سے عرض کرتا تھا اُس کو وہ بہت توجہ اور بھروسہ کے ساتھ سنتے تھے اور بسا اوقات اس سے اتفاق فرماتے تھے اور منظور کرتے تھے مگر یہ صرف نواب سر آسماں جاہ بہادر اور مشتاق حسین پر ہی منحصر نہیں ہے جب کوئی ملازم اپنے آقا کے ساتھ ایمانداری اور وفاداری اور خیر خواہی سے پیش آئیگا ہمیشہ یہی نتیجہ نکلیگا۔ لیکن باایں ہمہ یہ ہرگز نہیں تھا کہ جو کچھ فدوی چاہتا تھا وہی ہوتا تھا یا یہ کہ جو کچھ بھی مرحوم موصوف کے زمانہ مدار المہامی میں ہوا وہ سب فدوی کی رائے سے ہوا۔ معتمدی تعمیرات کے علاوہ جس میں ریلوے اور معدنیات کے ایسے صیغے شامل ہوگئے تھے جو بہت کچھ معتمد مال گزاری سے علاقہ رکھتے تھے اور جن کی نسبت صاحب عالی شان بہادر کی اتفاق رائے سے جریدہ میں چھپ چکا تھا کہ اس معتمدی کے کاغذات معتمد مال گزاری کے ذریعہ سے مدار المہام کے سامنے پیش ہونگے، باقی تمام معتمدین کے کاغذات براہ راست خود مدار المہام کے پاس جاتے تھے اور جناب ممدوح خود ہی اُن کو ملاحظہ فرماتے تھے اور اس طرح پر صدہا تجویزیں دیگر دفاتر سے ایسی جاری ہوتی تھیں جن کی فدوی کو خبر تک نہیں ہوتی تھی۔ البتہ اُن کاغذات میں سے جس جس کاغذ کی نسبت مدار المہام فدوی سے رائے لینا

مناسب سمجھتے تھے اس میں وہ فدوی سے رائے لیتے تھے ورنہ نہیں۔ اور بیسیوں تجویزیں ایسی بھی ہوتی تھیں جو فدوی کی رائے کے خلاف ہوتی تھیں، پھر جہاں تک عمائد ریاست کا تعلق تھا وہاں تک اکثر اشخاص اپنے معاملات کو اڈی کانگوں کے ذریعہ سے خاص مدار المہام کے سامنے حاضر ہو کر خود پیش کرتے تھے۔

معتمدی مال گزاری | ۴۔ البتہ مال گزاری کی معتمدی سے جو صیغے متعلق تھے یعنی مالگزاری بندوبست، اسٹام، کروڑگیری، آبکاری، جنگلات اور بعض اور متفرقات، یہ فدوی سے متعلق تھے اور ان صیغوں کے متعلق اگر کسی قسم کی شکایت ہوئی ہو تو اس کا بلاشبہ فدوی ذمہ دار ہے۔ لہٰذا ان صیغوں کی کارروائی کی حالت یہ تھی کہ جو کیفیت اور رائیں اُن میں فدوی بہ حیثیت معتمد مالگزاری تحریر کرتا تھا وہ اول معین المہام کے سامنے پیش ہوتی تھیں اور وہ بسا اوقات اُن سے اختلاف بھی فرماتے تھے اور اگرچہ فدوی کو اس وقت یہ قابو حاصل تھا کہ فدوی ایسے کسی مقدمہ مختلف فیہ میں مدار المہام کے سامنے کیفیت پیش کر کے وہاں پر اپنی ہی رائے برقرار رکھ دیتا لیکن اس کو فدوی نے کبھی مناسب نہیں سمجھا اور اگر اس اختلاف میں کچھ زیادہ ہرج معلوم نہ ہوتا تھا تو انھیں تجویزوں کو فدوی منظوری کے لیئے مدار المہام کے سامنے پیش کرتا تھا۔ اور نواب مدار المہام بھی ایسی صورتوں میں اکثر بلکہ قریباً قریباً کل کے معین المہام کی رائے سے اتفاق فرماتے تھے اور اگر فدوی کبھی یہ دیکھتا تھا کہ معین المہام کی تجویز انتظام یا انصاف کے زیادہ تر خلاف ہی تو ان مثلوں کو فدوی دوبارہ خود بالمشافہ معین المہام کے سامنے پیش کرتا تھا اور اس وقت یا فدوی معین المہام کی تجویز سے اتفاق کر لیتا تھا یا معین المہام اپنی تجویز کو بدل دیتے تھے اور اس طرح معتمد اور معین المہام کا اختلاف مدار المہام کے سامنے معتمدی مالگزاری کے متعلق تصفیہ کے لیے شاید کبھی پیش نہیں ہوا، اور فدوی کا یہ عمل درآمد نہ صرف نواب وقار الامراء بہادر کی معین المہامی میں ہا بلکہ نواب منیر الملک بہادر مرحوم و مغفور کی معین المہامی میں بھی فدوی نے اسی مسلک کو بہتر خیال کیا۔

اس تصریح سے فدوی کا یہ مطلب نہیں ہی کہ معتمد مال گزاری کے کام کے متعلق فدوی اپنی

ذمہ داری کو کچھ کم کر دے نہیں بلکہ جیسا فدوی اوپر عرض کر چکا ہی جو کام بھی معتمد مال گزاری کے
دفتر سے اس زمانہ میں اجرا ہوئے اُن کے متعلق دعوے کے ساتھ فدوی یہ عرض کرنے کی جرأت
کر سکتا ہی کہ اس سے زیادہ سچّا اور ستھرا اور صاف اور بے لگاؤ کام ہو نہیں سکتا۔ اور اس کو
اُن ہی لاکھوں انسانوں کے دل اچھی طرح جانتے ہیں جن کو کہ ان کاموں سے سروکار پڑا ہی
اور یہ تو نہ کبھی ممکن ہوا ہی اور نہ آیندہ ممکن ہو سکتا ہی کہ جو شخص کسی ملک کے انتظام میں اور
تصفیہ حقوق میں حصہ رکھتا ہو اس سے کوئی فرد بشر بھی ناخوش نہ ہو، اور جو افسر کہ غلطی سے اپنی
نسبت عام خوشنودی حاصل کرنے کی فکر میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ درحقیقت اپنا کام ایمانداری
سے انجام نہیں دے سکتے۔ اور ایسا شخص جو سب کو رضامند رکھنا چاہتا ہی وہ بہت ہی تھوڑے
لوگوں کو اپنے سے رضامند رکھ سکتا ہی۔ اور مشہور تو یوں ہی کہ وہ کسی کو بھی رضامند نہیں رکھ سکتا۔
اسی طرح اگر کچھ جاگیرداروں نے اس بات کو پسند نہ کیا کہ ان کی جاگیرات کے محصولات آبکاری
کا عمدہ انتظام بہترین اصول پر عمل میں آ جاوے تو یہ اُن صاحبوں کی صرف غلط فہمی تھی۔
فدوی کی رائے اس معاملہ میں صرف یہ تھی کہ تمام ملک کی آبکاری کا انتظام ایک مضبوط ہاتھ
میں رہے یعنی مدار المہام وغیرہ کے ہاتھ میں اور اس کا حصہ رسدی منافع جاگیرداروں
کو خزانے سے نقد ملتا رہے اور اس کا تعین پانچ سال یا دس سال کے لیئے ایک دفعہ ہو جایا کرے
اور یہ یقینی امر تھا کہ اس طریقے سے نہ صرف سرکار عالی کا محاصل دوچند و سہ چند ہو جاتا بلکہ جاگیرداروں
کی آمدنی میں بھی اس سے اسی تناسب کے ساتھ کئی حصہ زیادہ ترقی ہو جاتی۔ اور حضرت
ظلّ سبحانی یقین فرمائیں کہ اگر انگریزی گورنمنٹ کو اپنے ملک میں جب کبھی ایسی ضرورت
پیش آئی ہی تو اس نے اپنے جاگیرداروں کے ساتھ ہرگز بھی ایسی رعایت نہیں کی بلکہ موجودہ
محاصل سے یکمشت معاوضہ دیکر آیندہ کی تمام ترقیات محاصل کی خود مالک ہو گئی ہی۔ لیکن فدوی
نے ملک کی حالت کا خیال کر کے اس قسم کی رائے قایم کرنے سے قطعاً اجتناب کیا اور جاگیرداروں
کو آیندہ کے اضافہ میں بھی برابر شریک رہنا تجویز کیا جس سے زیادہ مفید تجویز ان کے

حق میں اور کوئی ہو نہیں سکتی تھی۔

سر ڈینس فٹز پیٹرک صاحب بہادر رزیڈنٹ وقت نے بھی اس وقت سکندر آباد و حوالی سکندر آباد کے انتظامات آبکاری پر غور کرتے وقت جو رائے اپنی تحریر فرمائی تھی اور جو دفتر میں موجود ہی اس سے بھی فدوی کی رائے کی تائید ہوتی تھی۔ لیکن اسی عرصہ میں جینحلی پلوڈن صاحب ریزیڈنسی پر تشریف لے آئے جن کی پالیسیوں کا سمجھنا ہر ایک کے لئے کوئی آسان کام نہیں تھا اُن سے جب بعض جاگیرداروں نے ہنگام ملاقات بالمشافہ اس انتظام کا ذکر کیا تو اُنھوں نے فرمادیا کہ آپ کو اپنی جاگیرات کے انتظام آبکاری کی نسبت جو آزاد اختیارات قدیم سے حاصل رہے ہیں آیندہ بھی آپ مستحق ہیں کہ آپ کی وہ آزادی باقی رہے بس پھر کیا تھا' دیوانہ را ہوئے بس ست'، ہر شخص نے یہی خیال کر لیا کہ ہمارے ساتھ کوئی بڑی ناانصافی ہو رہی ہی اور کسی نے یہ نہ سمجھا کہ خود اس کا مالی نفع کس میں ہی۔ اس غلط فہمی کے رفع کرنے کے لئے نواب آسمان جاہؔ مرحوم و مغفور نے بہ تحت میر مجلسی معین المہام مالگزاری بڑے بڑے جاگیرداروں کی ایک مجلس قایم کی تھی جو ان معاملات پر غور کر کے کوئی فیصلہ قرار دے۔ اور اس مجلس میں جاگیرداروں کے سوا اور بھی متعدد سرکاری عہدہ دار شریک تھے اور ایک اجلاس بھی اُس کا منعقد ہو چکا تھا اور ہر طرح یقین تھا کہ بہت عمدگی کے ساتھ وہ غلط فہمی رفع ہو جائے گی کہ اسی عرصہ میں فدوی حیدرآباد سے چلا آیا۔ اور وہ انتظام ویسا ہی ناکمل چھوڑ دیا گیا، جس کی وجہ سے ریاست کو تقریباً نصف کروڑ کا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہی، اور جاگیردار علیحدہ نقصان میں ہیں۔

مشکلات جو بعض دوسرے عہدہ داروں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں

۵۔ کارروائی کی حالت تو یہ تھی جو فدوی نے معروضہ بالا فقرات میں عرض کی اور فدوی کی حالت یہ تھی کہ جو کارروائیاں ایسی ہوتی تھیں جن سے لوگ زیادہ مشکور ہوتے تھے گو کہ وہ فدوی کی رائے بلکہ کوشش کا نتیجہ ہوتی تھیں تو بھی فدوی نے لوگوں سے اُن کی نسبت یہ ہی بیان کیا ہو گا کہ وہ تجویز نواب مدار المہام بہادر کی اپنی ایجاد ہیں جن کو اپنے ملک اور اہل ملک کی بہتری کا

خود ہر وقت سب سے زیادہ خیال ہے اور جو باتیں اتفاق سے ایسی ہو جاتی تھیں جن کی نسبت لوگ شاکی ہونے لگتے تھے اور گو کہ وہ فدوی کی رائے کے صریح مخالف ہی ہوتی تھیں تو بھی جب کہ کوئی شکایت اُن تجویزوں کے متعلق میرے سامنے پیش ہوتی تھی تو میں ہمیشہ ان تجویزوں کی تاویل ہی کیا کرتا تھا کہ خلایق کے دل میں اپنے مدار المہام کی طرف سے بددلی پیدا نہ ہو۔ دوسری طرف بدقسمتی سے بعض اور عہدہ داروں کا یہ حال تھا کہ وہ عام پسند اور عام دل خوش کن تجویزوں کو تو اپنی کوششوں سے منسوب کیا کرتے تھے گو کہ اُن سے اُن کا کچھ بھی تعلق نہ ہوا ہو اور جن تجویزوں کی نسبت وہ لوگوں کو شاکی پاتے تھے اُن کو وہ مشتاق حسین کے سر رکھ دیا کرتے تھے گو کہ وہ تجویزات خود اُن ہی کی ایجاد سے ہوئی ہوتیں اور اس کا جو کچھ نتیجہ ہو سکتا تھا وہ ظاہر ہے اور اس کا کوئی علاج فدوی کے ہاتھ میں نہیں تھا اور اس ہمت نے جو انسان میں اپنے فرایض کو ایمانداری کے ساتھ انجام دینے سے پیدا ہوتی ہے فدوی کی کسی ایسے علاج کی تلاش کی طرف چنداں راغب بھی نہ ہونے دیا اور ہمیشہ فدوی نے اس کو ایک حقارت کی نگاہ سے دیکھا۔

مدار المہام کے معروضات حضرت خداوندی میں

۶۔ سب سے زیادہ نازک حالت فدوی کی اُس وقت ہوتی تھی جب کہ فدوی حضرت خداوندی کے جناب قدس میں نواب مدار المہام کی کوئی ایسی درخواست لیکر حاضر ہوتا تھا جو فدوی کی رائے کے خلاف ہوتی تھی اور نواب صاحب کے اصرار کی وجہ سے فدوی کو اُن کے ایماء کے مطابق کام کرنا پڑتا تھا یا جب کہ اس قسم کی عرضداشت کا مسوّدہ فدوی کو مرتب کرنا پڑتا تھا اور اگرچہ ایسے مواقع کو فدوی نے حتی الامکان اور اکثر ٹالا تاہم بعض اوقات ایسا کرنا ہی پڑا۔ چونکہ فدوی اکثر قیاساً دریافت کر سکتا تھا کہ حضرت ظل سبحانی اُن میں سے کن تجویزوں کو پسند فرماتے ہیں اور کن کو ناپسند، لہذا اُس وقت فدوی کو بخوبی اس بات کا موقع حاصل تھا کہ اپنی ناچیز رائے کو بھی فدوی حضرت ظل سبحانی میں ظاہر کر کے اپنی ذاتی سرخروئی حاصل کر لیتا۔ لیکن اس سخت امتحان کے موقع پر فدوی نے ہمیشہ اپنے دل کو یہ سمجھا کر اپنے قابو میں رکھا کہ اگر مجھ سے بھی ایسا ہی وقوع میں آوے اور مدار المہام کی طرف سے سفارت

کے فرائض ادا کرتے وقت مشتاق حسین بھی اپنے ذاتی فوائد کو مدِ نظر رکھے تو آئندہ کون آقا اپنے کسی ملازم پر اعتماد کریگا مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ہرگز نہ تھا کہ جس بات کو فدوی غلط سمجھتا اُسکو حضرت ظل سبحانی میں بطور اپنی رائے کے صحیح قرار دیکر عرض کرتا کیونکہ ایسا کرنا بھی فدوی کے نزدیک کفر کے قریب قریب ہی مضمون تھا اور اس لیے فدوی کی کارروائی کا طرز ہمیشہ یہ رہا کہ جو گزارش جن دلائل کے ساتھ مدار المہام کی طرف سے فدوی کے سپرد ہوتی تھی اُس کو فدوی بجنسہ عرض کر دیتا تھا اور جب تک فدوی کی ذاتی رائے کسی معاملہ کی نسبت دریافت نہیں فرمائی جاتی تھی اُس وقت تک فدوی اپنی طرف سے اور کچھ عرض کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ اور یہ حضرت پیر و مرشد کو خود معلوم ہے کہ حضرت پیر و مرشد مدار المہام کے معروضات کو سماعت فرماتے وقت فدوی کی ذاتی رائے بہت ہی کم کبھی دریافت فرماتے تھے بہ استثناء مقدمہ الماس کہ اس میں البتہ اپنی ناچیز رائے کے طور پر بھی فدوی کو بہت کچھ عرض و معروض کا اتفاق ہوا۔ اور اس کی نسبت فدوی اس عرضداشت میں آئندہ علیحدہ عرض کریگا اور گو یہ سب کچھ احتیاط کام میں لائی گئی مگر اس میں شک نہیں کہ فدوی کی یہ حالت بہت نازک تھی اور فدوی ہی پر منحصر نہیں جو کوئی ملازم بھی اس طرح پر انتہا درجہ کی خیرخواہی اور وفاداری اپنے آقا کی نسبت صرف کریگا وہ ضرور اپنے آپ کو اس قسم کے خطرات میں مبتلا کرے گا اور اب اس بات کا تصفیہ حضرت ظل سبحانی سے بہتر اور کون کر سکتا ہے کہ آیا یہ جو کچھ تھا عیب تھا یا ہنر تھا۔ اور اگر عیب تھا تو حضرت خطاپوش ہی سے عیب پوشی کی توقع ہو سکتی ہے۔

فتح نواز جنگ سے دوستی

۷۔ دوسری ایک شہرت فدوی کی نسبت وہاں یہ ہو رہی تھی کہ فتح نواز جنگ بہادر سے دوستی ہے اور محسن الملک بہادر سے دشمنی۔ اور اس شہرت نے بھی فدوی کی نسبت لوگوں میں بسا اوقات غلط فہمی کا موقع دیا حالانکہ حیدرآباد بھر میں سرکاری تعلقات کے لحاظ سے فدوی نہ کسی کو اپنا ذاتی دوست سمجھتا تھا اور نہ ذاتی دشمن۔

مدار المہام اور سلطنت کے ساتھ جو اشخاص وفاداری اور خیرخواہی سے پیش آتے

تھے اُن سے فدوی کے تعلقات بھی دوستانہ رہتے تھے اور جن کا ویترہ اس کے برخلاف تھا وہ فدوی سے بھی صاف نہیں رہ سکتے تھے۔ فتح نواز جنگ میرے رشتہ دار نہ تھے، ہم قوم نہ تھے ہم وطن نہ تھے، ہم مذہب نہ تھے، آوردہ نہ تھے، اور حیدرآباد سے پہلے میں نے اُن کو صرف ایک دفعہ علی گڑھ میں تھوڑی دیر کے واسطے دیکھا تھا لیکن چونکہ فدوی نے اُن کو کسی وقت سلطنت کا اور مدار المہام کا بدخواہ نہ پایا تھا لہذا فدوی کے تعلقات اُن کے ساتھ ایک حد تک دوستانہ سمجھے جاتے تھے۔ بااین ہمہ جب کبھی مدار المہام نے ان کے علاقوں کی مثلوں میں مجھ سے رائے لی تو میری اور فتح نواز جنگ کی رائے میں اکثر اختلاف ہوا ہے جس کی تصدیق خود اُن کے دفتر کی مثلوں سے ہو سکتی ہے۔

حیدرآباد میں یہ بڑی مشکل ہے کہ وہاں دو شخصوں کی نسبت جن میں باہم کوئی تعلق ہو یا تو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ باہم دوست ہیں یا یہ کہا جاتا ہے کہ وہ باہم دشمن ہیں۔ تیسرا درجہ جو کہ دوستی اور دشمنی دونوں سے خالی ہے وہ وہاں کسی کے خیال میں نہیں گزرتا۔

محسن الملک بہادر سے دشمنی

۸۔ محسن الملک بہادر کے ساتھ فدوی کے تعلقات کی کیفیت یہ ہے کہ جب ایک مرتبہ مرزا نذیر بیگ کی شادی کی دعوت میں محسن الملک بہادر نے مہربانی سے میری نسبت اپنے دوستانہ خیالات کا اظہار کیا اور مجھ کو اس کا جواب دینا ناگزیر ہی ہو گیا تو میں نے اس مجمع میں جس میں قریباً قریباً تمام اعلیٰ عہدہ دار اور اکثر عمائد شریک تھے صاف لفظوں میں یہ بیان کر دیا تھا کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں محسن الملک بہادر کو اپنا ایک بزرگ اور اُن کی تعظیم و تکریم کو اپنے اوپر واجب سمجھتا ہوں اور جہاں تک کہ سرکاری معاملات کا تعلق ہے وہاں تک میرے تعلقات اُن کے ساتھ ایسے ہی ہونگے جیسے کہ اُن کے تعلقات مدار المہام کے ساتھ۔ اور جو کچھ کہ اس موقع پر فدوی نے بیان کیا اس میں ایک ذرّہ برابر بھی تصنّع نہیں تھا۔ محسن الملک بہادر کا علم و فضل اور سن و سال اُن کی تعظیم و تکریم کو میرے اوپر واجب کرتا تھا لیکن خداوند نعمت! انسان جس سرکار کا نمک کھاتا ہے اُس کے فرائض اُس پر مذکورۂ بالا تعظیمی و

نکرمی فرائض سے بہت زیادہ ہوا کرتے ہیں اور اس لیئے جو حالت کہ وہاں گزر رہی تھی اس کے لحاظ سے میری اور اُن کی کارروائیوں میں جہاں تک کہ وہ سرکاری کاروبار سے متعلق تھیں اختلاف کا ہونا لازمات سے تھا اور سرکاری معاملات سے اگر علیٰحدہ دیکھا جائے تو ہم دونوں کے غیر سرکاری تعلقات اُن تعلقات غیر سرکاری کے مقابلہ میں جو میرے اور فتح نواز جنگ کے باہم تھے بہت زیادہ دوستانہ حیثیت رکھتے تھے۔ محسن الملک بہادر جب ایک دفعہ سخت علیل اور اپنی زندگی سے مایوس ہوئے تو اُنھوں نے فدوی ہی کو اپنا وصی مقرر کیا اور اپنی بی بی کو اور اپنے دیگر تعلقات کی حفاظت فدوی کے سپرد کی تھی حال کے زمانہ میں جب فدوی کے فرزند محمد احمد مرحوم نے انتقال کیا اور دوسرے مصائب اسی قسم کے فدوی پر نازل ہوئے تو محسن الملک بہادر ہی برسم تعزیت فدوی کے پاس امروہہ آئے۔ فتح نواز جنگ بہادر نے کبھی شاید اس کا خیال بھی نہیں کیا۔ ایک روز جب سر ڈینس فٹز پٹرک صاحب مجھ سے دریافت کر رہے تھے کہ تم کیوں ابھی سے وظیفہ لینا چاہتے ہو جب کہ تم ایسے ضعیف نہیں ہوئے اور کسی کی مرضی بھی نہیں ہے تو میں نے اُن کو یہ جواب دیا تھا کہ میرے عہدے کے فرائض ایسے خراب ہیں کہ میں وظیفہ لے کر اس عہدہ سے علیٰحدہ ہی ہونا بہتر سمجھتا ہوں۔ یہ کوئی انسانیت کی بات نہیں ہے کہ میں ظاہر میں تو محسن الملک بہادر سے دوستانہ ہاتھ ملاؤں اور باطن میں اُن کی کارروائی کو شبہ کی نگاہ سے دیکھوں اور یہ خیال کروں کہ وہ مدار المہام اور سلطنت کے سچے خیر خواہ نہیں ہیں اور اپنا ذاتی مقصد سب پر مقدم رکھتے ہیں۔

الحب للہ والبغض للہ

۹۔ خلاصہ گزارش یہ ہے کہ حیدرآباد میں نہ میرا کوئی دوست تھا اور نہ دشمن، اور میرا عمل اس پر تھا کہ "الحب للسلطان والبغض للسلطان" اور جو لوگ میرے وہاں دشمن سمجھے جاتے تھے وہ میرے دشمن نہ تھے بلکہ وہ صرف اپنی اغراض کے بندے تھے اور جس طرح وہ مجھ کو کسی موقع پر اپنی اغراض میں حارج سمجھ کر وہاں سے ہٹانا چاہتے تھے اسی طرح وہ اپنے حقیقی بھائی کو بھی اگر اپنے اغراض میں حارج سمجھتے تو اُن کے برخلاف بھی وہ

ایسی ہی کوشش کرتے۔ میں تو اپنا دشمن اُس کو سمجھتا ہوں جو آج بھی امروہہ میں مجھ کو چین سے اور اطمینان سے نہ بیٹھنے دیتا اور الحمد للہ ایسا ایک شخص بھی وہاں موجود نہیں ہے۔

خیر خواہوں کے اقسام | ۱۰۔ تیسری ایک اور بات بھی ہے جو فدوی کے معاملات پر غور ہوتے وقت پیش نظر رہنے کی مستحق ہے اور وہ فدوی کا طرز خیر خواہی اور ادب اپنے آقا اور اپنے مالک کی نسبت تھا۔ آقاؤں کو اپنے دو قسم کے خیر خواہ ملازموں سے سابقہ ہوتا ہے ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو باوجود ہر طرح کی خیر خواہی کے اس بات کو بھی ہمیشہ پیش نظر بلکہ اس کو سب پر مقدم رکھتے ہیں کہ اُن کا آقا اُن کی کسی کارروائی اور اُن کی کسی گزارش کو ناپسند نہ کرے اور جس قدر اس قسم کا مادّہ کسی ملازم میں کم یا زیادہ ہوتا ہے اسی تناسب سے اُس کو اس کی ضرورت بھی کم یا بہت کم محسوس ہوتی ہے یا بالکل نہیں ہوتی کہ اُس کا آقا خداوند تعالیٰ اور مخلوقِ خدا کی نگاہ میں عزیز بھی رہے۔ دوسری قسم کے ملازم وہ ہوتے ہیں جن کو بہت زیادہ خواہش صرف اس بات کی ہوتی ہے کہ اُن کا آقا اور اُن کا مالک خدا اور مخلوق خدا کی نگاہ میں ہر طرح عزیز رہے گو کہ اُن کا کوئی مشورہ جو وہ اس غرض کے حاصل کرنے کے لیئے عرض کریں ناپسند ہی کیا جائے۔ اُسی کے ساتھ بلاشک اُن کی یہ خواہش اور کوشش بھی ضرور ہوتی ہے کہ حتے الوسع اُن کی گزارش آقا کو ناگوار بھی نہ ہو لیکن بالآخر جب وہ دیکھینگے کہ ایک طرف اصلی خیر خواہی اور نمک حلالی اور وفاداری اصلی حقیقت کے اظہار اور واجبی اور صحیح مشورہ عرض کرنے پر مجبور کرتی ہے اور دوسری طرف اس بات کا اندیشہ ہے کہ اُن کا مالک اس کو ناپسند نہ کرے تو وہ خطرہ میں پڑنا پسند کرینگے بجائے اس کے کہ اپنے آقا کی نسبت اپنی خیر خواہی کو ہاتھ سے دیں اور گو کہ اپنی زبان و قلم سے اپنی نسبت اس قسم کی تعلّی پسندیدہ امر نہیں ہے لیکن گزارش بدون چارہ بھی نہیں ہے اور فدوی بہت ادب سے یہ عرض کر سکتا ہے کہ محض بتوفیق ایزد متعال فدوی کا طرز خیر خواہی اُن دوسرے قسم کے ملازموں کا سا رہا ہے۔ جس زمانہ میں کہ ظلِ سبحانی نے الماس کے مقدمہ میں ادائے شہادت کے متعلق جریدۂ غیر معمولی میں اشتہارِ عام جاری فرمایا

ہی تو فدوی سے بعض اہل الرائے نے اُس وقت یہ کہا کہ یہ بادشاہ لوگ ہیں آج اس کارروائی کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن آیندہ اگر کسی وقت اُس کو ناپسند کیا تو اُس وقت تم کو بہت مشکل پیش آئیگی۔ فدوی نے اُن کو جواب دیا کہ یہ بالکل صحیح ہے اور میں بھی اس سے غافل نہیں، لیکن کیا میں اس اندیشہ سے سچائی کے ساتھ اپنے بادشاہ کا فرض جو میرے ذمّہ ہے ادا نکروں؟ اور اگر آج میں اپنی خود غرضی کو اپنے بادشاہ کی اصلی خیر خواہی پر مقدم کردوں تو کل کو خدا کے سامنے کیا منھ لیکر جاؤنگا۔ اسی طرح فدوی اپنے ہر ایسے فعل کو اپنی اس گزارش کے ثبوت میں پیش کرنے کو موجود ہے جن پر لوگ معترض ہوتے ہوں وہ افعال خود تبلا دینگے کہ اُن میں فدوی کی کوئی خود غرضی شامل تھی یا وہ محض مالک اور سلطنت کی اصلی خیر خواہی اور اصلی وفاداری پر شامل تھے۔ ہاں یہ دوسرا امر ہے کہ کسی وقت رائے نے کوئی خطا کی ہو کہ "ہیچ نفسِ بشر خالی از خطا نہ بود" اور خطا اجتہادی جس طرح عند اللہ قابل عفو ہے اسی طرح بادشاہوں سے بھی جو ظل اللہ و خلیفۃ اللہ ہیں اس کی معافی کی اُمید کی جاسکتی ہے۔

بعض تفصیل طلب واقعات

۱۱- گزارشات معروضہ بالا پر غور کرنے کے بعد اُن اعتراضات کا اکثر حصّہ خود بخود دفع ہوجاتا ہے جو اس زمانہ میں فدوی کی نسبت عائد ہوتے تھے لیکن بعض بعض معاملات اب بھی وہ باقی رہ جاتے ہیں جو اُس وقت فدوی کی نسبت حضرت ظلِ سبحانی کی توجّہ میں لائے گئے تھے اور اُن کی نسبت فدوی بہت ادب کے ساتھ کسی قدر تفصیل سے عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے اور اُن میں سب سے اوّل مسٹر رودرا بیرسٹر کے معاملہ کی نسبت عرض کریگا۔

مسٹر رودرا بیرسٹر کا معاملہ

۱۲- مسٹر رودرا کو ایک وقت میں مجلس عالیہ عدالت نے سرکار

لے اعلیٰ حضرت نے سر آسماں جاہ کی عرضی اور نواب وقار الملک کے خلیفہ کی درخواست کے جواب میں سر آسماں جاہ کو جو خط عتاب آمیز لکھا تھا، اُس میں یہی الزامات لگائے تھے، جن کے متعلق آگے چل کر نواب وقار الملک تفصیلی بحث کرکے، اصلی حقیقت ظاہر کرتے ہیں۔

عالی کی عدالتوں میں کام کرنے سے ممنوع کر دیا تھا، اور وہ اس فکر میں تھے کہ حضرت پیر و مرشد کے حضور میں اپنی بحالی کے لیئے پیروی کریں۔ اُس وقت نواب سر آسماں جاہ مرحوم و مغفور نے فدوی کے ذریعہ سے حضرت ظلِ سبحانی میں عرض کرایا کہ ان صاحب نے ہماری عدالتوں کو رزیڈنسی کی عدالتوں کے سامنے بہت بدنام کیا ہے، ایسے شخص کی بحالی مناسب نہ ہوگی اس معروضہ کے کچھ عرصہ کے بعد مدار المہام مرحوم نے مسٹر رودرا کو خود بحال کر دیا بغیر اس کے کہ حضرت پیر و مرشد میں کچھ بھی اس معاملہ کے متعلق عرض کیا ہو، اور خود ظاہر ہے کہ جس وقت حضرت ظلِ سبحانی کو یہ اطلاع ہوئی ہوگی تو جس قدر بھی تعجب اُس کی نسبت حضرت کو ہوا ہو وہ کم ہے اور اس ناخوشی خاطر اقدس کا اثر اگر فدوی پر عائد ہوا تو حق بجانب تھا، مگر واقعات کی صورت کچھ اور ہی تھی جس کو فدوی نے اپنی طرف سے اُس عرصہ میں ظاہر کرنا اس خیر خواہی کے لحاظ سے مناسب نہیں سمجھا جو فدوی پر مدار المہام کے متعلق واجب تھی، اور معاملات کی حالت اگر وہی رہتی جو اُس وقت تھی تو اب بھی فدوی کی زبان و قلم سے اُن واقعات کی اصل حقیقت ظاہر نہوتی۔ اصل واقعہ اس کا یہ ہے کہ فدوی کو مسٹر رودرا کی بحالی کی اطلاع اُس وقت ہوئی جب کہ اور سب کو اُس کی اطلاع ہوئی، اور اخباروں میں اُن کی بحالی مشتہر ہوئی، اور جب ہی کہ فدوی کو اُس کی اطلاع ہوتی فوراً نواب مدار المہام کے پاس حاضر ہوا اور اُن سے دریافت کیا کہ آیا اس کی اجازت یا اطلاع حضرت ظلِ سبحانی میں بھی ہے یا نہیں۔ جواب ملا کہ نہیں۔ اُس وقت فدوی نے عرض کیا کہ آپ کو یاد ہے کہ اس باب میں حضرت خداوندی سے آپ نے کیا عرض کرایا تھا۔ یہ سنتے ہی نواب آسماں جاہ بہادر پر ایک عجیب حالت طاری ہوگئی اور اُس وقت دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ بعض سرکاری عہدہ داروں نے ہی جو کہ مسٹر رودرا کے طرفدار تھے نواب سر آسماں جاہ بہادر کے پاس حاضر ہو کر اُن سے مسٹر رودرا کی بحالی کے لیئے سفارش کی، اور بحالی کا حکم حاصل کیا، اور یہ ایک یقینی بات تھی کہ نواب صاحب کو اُس وقت یہ بات بالکل یاد نہ رہی تھی کہ وہ اس باب میں حضرت پیر و مرشد سے

کیا عرض کرا چکے ہیں اور اس غلطی پر مطلع ہوتے ہی مدار المہام نے فرمایا کہ حکم کو رو کو، معلوم ہوا کہ حکم جس کو صادر ہوئے دو دن گزر چکے تھے صبح جاری ہو چکا تھا، اُس وقت نواب صاحب کی حالت ناگفتہ بہ تھی اور اُن کو حد درجہ کا اُس پر قلق تھا اور کئی دن تک وہ اس کو سوچتے رہے کہ کیا کرنا چاہیئے اور بالآخر یہ رائے قرار پائی کہ کسی روز حضرت پیر و مرشد میں بالمشافہ اس کل واقعہ کو عرض کر کے اپنی غلطی کی معافی چاہینگے لیکن ابھی اُس کا موقع پیش نہ آنے پایا تھا کہ فدوی نے اپنے وظیفہ کی درخواست پیش کی اور اس سے تقریباً ایک مہینہ کے بعد جب حضرت پیر و مرشد نے فدوی کی درخواست وظیفہ کے جواب میں مسٹر رو ورا کے معاملہ کا ذکر ارشاد فرمایا تو نواب سر آسمان جاہ بہادر کی ندامت کی کوئی حد باقی نہ رہی تھی، اور جب نواب صاحب نے دیکھا کہ یہ الزام مشتاق حسین پر عاید ہوتا ہے تو انھوں نے اپنے امیرانہ اخلاق کو کام فرما کر فدوی کو حکم دیا کہ ایک مسودہ عرضداشت تیار کیا جائے اور اُس میں تمام واقعات مسٹر رو ورا کے متعلق صاف صاف عرض کر دئیے جائیں اور جو غلطی ہوئی ہے اُس کا مدار المہام کی طرف سے اعتراف کیا جائے اور معافی چاہی جائے۔ فدوی نے عرض کیا کہ اس وقت جو حالات گزر رہے ہیں اُن کے لحاظ سے اس کا اندیشہ ہے کہ حضرت پیر و مرشد کی ناخوشی میں آپ کی نسبت کچھ اور ترقی نہ ہو جائے، اور میں ایک غریب اور مسافر آدمی ہوں۔ آج مرا کل دوسرا دن میرا خیال نہ فرمائیے۔ آپ کے البتہ بہت سے تعلقات حضرت ظل سبحانی کے ساتھ ہیں اور اُن تعلقات کی حفاظت ہر چیز پر مقدم ہے۔ خلاصہ یہ کہ فدوی کے بہت ہی اصرار پر نواب سر آسمان جاہ بہادر نے اپنا ارادہ اس عرضداشت کے بھیجنے کا ملتوی فرمایا، اور فدوی اس اطمینان کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوا کہ یہ بھی ایک اخیر قربانی تھی جو فدوی سر آسمان جاہ کے مقاصد کی غرض سے اپنے آپ کو قربان کرنے سے بجا لاسکا، اور جس کے بعد اس بات کی ہر طرح اُمید تھی کہ حضرت ظل سبحانی اپنے ایک ایسے خیر خواہ بلا اشتباہ کو جیسے کہ سر آسمان جاہ تھے بالضرور بہت جلد اپنی شاہانہ نوازشات سے عفو فرماوینگے۔

وقار الامراء کی واقفیت کا حوالہ

۱۳۔ یہ ہیں مسٹر رودرا کے معاملہ کے واقعات جن سے نواب سر وقار الامراء بہادر بخوبی واقف ہیں۔ اور یہ علم اُن کو اُس وقت حاصل ہوا تھا جب کہ مسٹر رودرا بحال کر دیئے گئے تھے اور خود اُن سے بھی فدوی نے ذکر کیا تھا کہ مدار المہام صاحب سے یہ کیسی بھاری غلطی ہو گئی ہے اور پھر بعد اس کے جب کہ حضرت ظلّ سبحانی نے فدوی کی درخواست وظیفہ کے جواب میں مسٹر رودرا کے معاملہ کی طرف اشارہ فرمایا اور اس وقت اُن میں اور مدار المہام میں بارہا اس باب میں بالمشافہ گفتگو رہی لیکن آج کا زمانہ اور ہے اور فدوی اس وقت یہ عرض نہیں کر سکتا کہ نواب وقار الامراء بہادر فدوی کے اس معروضہ کی تصدیق فرما دینگے یا نہیں۔ دوسرے گواہ ان واقعات کے مولوی ابو الحسن صاحب ہیں جو اس وقت عدالت دیوانی بلدہ کے ناظم ہیں اور اُس زمانہ میں وہ نواب سر آسمان جاہ بہادر کی پیشی میں تھے اور یہ مدار المہام کے صیغہ راز سے کامل طور پر تعلق رکھتے تھے اور سب سے زیادہ تو خود وہ صاحب گواہ ہیں جنھوں نے فدوی سے بالا بالا سفارش کر کے مدار المہام سے مسٹر رودرا کو بحال کرایا اور یہ وہ صاحب ہیں کہ اُن کا شمار بھی حضوری ہی کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ اور اگر ضرورت ہوگی تو فدوی اُن کا نام[۱] بھی عرض کر سکیگا گو کہ اُن کی نسبت بھی فدوی کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں تک ان حالات کی تصدیق کرینگے اور حقیقت امر تو یہ ہے کہ وہ سفارش کرنے والے اس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ مدار المہام اس معاملہ میں حضرت ظلّ سبحانی میں عرض کرا چکے ہیں اُنھوں نے سادہ دلی سے اور محض معمولی سی بات سمجھ کر اس بہتے دریا میں ہاتھ دھوئے اور مدار المہام کو نادانستہ ایک ایسی بھاری غلطی میں مبتلا کر دیا۔ اور اب ان تمام شہادتوں اور گواہوں سے قطع نظر کر کے نہایت ادب کے ساتھ فدوی حضرت ظلّ سبحانی کا دامن مبارک تھامے گا کہ حضرت ظلّ سبحانی خود ہی اس کا شاہانہ فیصلہ فرمائیں یعنی جس قدر علم کہ حضرت ظلّ سبحانی کو اپنے اس ملازم کی فہم و ادراک اور احتیاط کی نسبت حاصل ہے اُس کے لحاظ سے حضرت ظلّ سبحانی ہی اس بات کا فیصلہ فرما سکتے

---

[۱] نواب مہدی حسن نے بحال کرایا تھا۔

ہیں کہ آیا مشتاق حسین سے بھی ایسی بڑی بھاری غلطی کا امکان تھا یا دوسری کوئی اور اس قسم کی نظیر اُس کی کارروائی میں کبھی سننے میں بھی آتی ہے اور صرف اس شاہانہ فیصلہ کی بنیاد پر اگر فدوی ملزم قرار دیا جائے تو جو سزا فدوی کی نسبت تجویز ہو فدوی اُس کی تعمیل کے لئے بہ سر و چشم قدم مبارک میں اپنے آپ کو ڈال دیگا وکفی باللہ شہیدًا اور یوں ملازم ہر وقت قصوروار ہے اور مالک کے ترحم ہی سے اُس کا نباہ ہوتا ہے۔

الماس کا مقدمہ

۱۴۔ الماس والے مقدمہ کا ذکر بھی اُس وقت درمیان میں آیا تھا جب کہ فدوی اپنی خدمت سے علیحدہ ہوا تھا اور چونکہ اس مقدمہ کی کل کارروائی سے حضرت پیر و مرشد ظل سبحانی کو ذاتی علم ہے لہذا اس کی نسبت کچھ زیادہ عرض کرنے کی فدوی کو ضرورت نہیں ہے بجز اس کے کہ فدوی اُس وقت حیدرآباد میں موجود بھی نہ تھا بلکہ اپنی بیماری کی وجہ سے کوہ مہابلیشر پر تھا۔ اور جب ہی کہ فدوی کو مہابلیشر پر اطلاع ہوئی کہ اس قسم کی معاملت پیش ہے تو فدوی نے مدارالمہام کی خدمت میں لکھا کہ اگر بنیک کو دونوں طرف سے ضامن کر دیا جائے تو سب اطمینان کے ساتھ کارروائی ہو سکے گی لیکن میری یہ گزارش حیدرآباد میں اس وقت پہونچی جب کہ مسٹر جیکب روپیہ لے کر حیدرآباد سے روانہ ہو چکے تھے اُس کے کچھ عرصہ بعد فدوی حیدرآباد اُس وقت آیا جب کہ سر ڈینس فٹز پٹرک کو اس کارروائی کی اطلاع ہو چکی تھی اور اُنھوں نے بذات خود حضرت پیر و مرشد کو بالمشافہ مشورہ دیا اُس وقت اُن کو مدارالمہام کی طرف سے ایک طرح کی ناخوشی سی بھی تھی کہ مدارالمہام نے رزیڈنٹ صاحب کو کیوں اس معاملہ سے بے خبر رکھا۔ حضرت پیر و مرشد کو سر ڈینس کی وہ حلفی شہادت یاد ہوگی جو اس مقدمہ میں اُنھوں نے کمیشن کے سامنے دی تھی اور اس سوال کے جواب میں کہ آیا یہ اطلاع رزیڈنٹ کو مشتاق حسین کے ذریعہ سے ہوئی، اُنھوں نے صاف صاف کہا کہ یہ اطلاع مجھ کو مشتاق حسین سے نہیں ہوئی بلکہ دوسرے کے ذریعہ سے ہوئی تھی اور اُس کے بعد سے جو کچھ کارروائی الماس کی واپسی و مقدمات کے دائر ہونے کی ہوئی وہ سب رزیڈنٹ صاحب اور حضرت ظل سبحانی کے باہم مشورہ

اور ارشاد پر ہوئی - فدوی اگر ذمہ دار ہے تو اس مشورہ اور اُس گزارش کا ذمہ دار ہے جسکی وجہ سے وہ جریدہ غیر معمولی حضرت پیر و مرشد کے اظہار قلمبند ہونے کے متعلق جاری ہوا لیکن حضرت پیر و مرشد کو یہ یقیناً یاد ہو گا کہ وہ جریدہ قلمبندیِ اظہار کی بنیاد نہیں تھا بلکہ اظہار قلمبند ہونے کی تجویز مقدمہ دائر ہونے کے بعد کلکتہ میں ہو چکی تھی، کمیشن جاری ہو کر حیدرآباد میں آچکا تھا مسٹر وڈرف بیرسٹر "حضرت" کی طرف سے اور مسٹر انورارٹی جیکب کی طرف سے حیدرآباد پہنچ گئے تھے، اظہار لیئے جانے کی تاریخ وغیرہ سب مقرر ہو چکی تھی۔

مسٹر وڈرف پیر و مرشد کے حضور میں باریاب ہو چکے تھے اور اظہار لیئے جانے میں صرف دو روز باقی رہ گئے تھے جب کہ فدوی کو اس غیر معمولی جریدہ کا خیال پیدا ہوا۔ پس جریدہ غیر معمولی اگر جاری نہ ہوتا تو بھی اظہار قلم بند ہی ہوتا۔ جریدہ کی اجرا سے تو صرف یہ غرض تھی کہ ایک طرف تو عامہ رعایا کو اطمینان حاصل ہو جائے اور حضرت پیر و مرشد کے اظہار قلم بند ہونے کو وہ ایک مسلمان بادشاہ کے درجہ کے خلاف نہ سمجھیں۔ اور دوسری طرف اہل ملک کو جو کہ عدالتوں کو اکثر تحقیر کی نظر سے دیکھنے کے خوگر رہے تھے، ایک نہایت مفید سبق ملے۔ اور تیسری طرف دیگر اقطاع ملک اور گورنمنٹ آف انڈیا اور اخباروں میں جو یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ مسٹر جیکب کو ایک کثیر رقم بغیر کسی ضمانت کے حوالہ کر دی گئی اور اسی قسم کے دوسرے خیالات جو پیدا ہو گئے ہیں وہ سب دفعتہ ایسے خیالات کے ساتھ بدل جائیں کہ ہر طرف سے حضرت پیر و مرشد کی نسبت تعریف ہی تعریف کے نعرے بلند ہوں۔ اور یہ ایک ایسی خیر خواہانہ رائے تھی کہ نواب سر آسماں جاہ اور سر ڈینس فٹزپٹرک اور مسٹر وڈرف نے اُس سے اتفاق کیا اور حضرت پیر و مرشد نے بھی اُس سے اتفاق فرمایا تھا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ یہ جملہ مراتب بوجہ احسن حاصل ہوئے اور حضرت پیر و مرشد کے لیئے اس قدر دعائیں مخلوق کے دل سے نکلیں کہ اُس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ اور ہندوستان سے لے کر انگلستان تک اور رعایا سے لے کر گورنمنٹ آف انڈیا تک اور تمام اخباروں میں بھی بالاتفاق تحسین و آفریں کے سوا دوسری بات کوئی سُنائی نہیں دی۔ اور اس عام مسرت

کی وجہ سے اُس سال ہی حضرت پیر و مرشد کی سال گرہ مبارک کے موقع پر رعایا نے اُسی جریدۂ وغیرہ کی کارروائی کے شکریہ میں بہت کچھ غیر معمولی طور پر اپنے جوشِ خیر خواہی کا اظہار کیا تھا۔ پھر حتی الامکان اس کوشش میں بھی غفلت نہیں ہوئی ہی کہ اظہار کے قلم بند ہونے کی نوبت ہی نہ پہونچے اور معاملہ بہ صلح فیصل ہو جائے۔ چنانچہ اسی لیئے مسٹر انور اریٹی کی فیس دو روز تک سرکار عالی کی طرف سے ادا کی گئی اور مقدمہ بار بار ملتوی کیا گیا۔ اور کوشش کی گئی کہ مسٹر جیکب بذاتِ خود حاضر ہو جائیں جس کے بعد فیصلہ آسان ہو جائیگا۔ لیکن مسٹر جیکب اس وقت کسی طرح حاضر نہ ہوئے۔ اور اُس کے بعد ہوا جو کچھ ہوا۔ اور گو کلکتہ ہائی کورٹ پر کسی کا قابو نہیں چل سکتا تھا لیکن انجام کار اس قدر تو ضرور ہوا کہ نصف قیمت پر الماس سرکار عالی کے ہاتھ آیا اور گو حضرت پیر و مرشد کو تکلیف ضرور ہوئی لیکن دنیا نے اس وقت کی فرمانرواؤں میں مدتوں کے بعد ایک ایسا نمونہ دیکھ لیا جو اپنے ملک کی خدمت گزاری میں زبان اور قلم سے ویسا ہی کام لے سکتے ہیں جیسا کہ ضرورت کے وقت اپنی تلوار سے، اور یہ پُر مشقت خدمت اُن خدمات سے کسی طرح دوئم درجہ کی خدمت نہ تھی جو حضرت پیر و مرشد کے اجداد امجاد رضوان اللہ تعالےٰ اجمعین نے اپنے ملک کے مقاصد کی غرض سے میدان ہائے جنگ میں ادا کی تھیں اور بیس بائیس لاکھ کی رقم بھی اگر نقد بچ رہی تھی تو وہ بھی مجھ جیسے ایک محدود شخص کے خیال سے کوئی ایسی قلیل رقم نہیں تھی جس کو نظر انداز کر دیا جاتا۔ تمام ممالک محروسہ سرکار عالی کی رعایا جب صبح سے شام تک سال بھر محنت کرتی ہی تب بھی سرکار عالی کو بعد منہائی اخراجات سلطنت اس قدر رقم پس انداز نہیں ہوتی۔ اور جہاں تک فدوی کی گزارشات کا تعلق اس معاملہ سے ہے فدوی باادب تمام عرض کرنے کی جرات کر سکتا ہی کہ کوئی گزارش بھی جو کہ فدوی نے کی ہو گی ایک شمہ برابر بھی اس میں کوئی امر خلاف واقعہ نہ ہو گا اور نہ کبھی فدوی نے کوئی غلط اُمید دلائی ہو گی۔ غلام سبز باغ دکھلانے والا آدمی نہیں رہا ہی۔ فدوی کا ہمیشہ خیال رہا ہی کہ وقت نکل جاتا ہی اور بات ہی باقی رہ جاتی ہی۔

سردار دلیر الملک اور معدنیات کا مقدمہ

۱۵ - سردار دلیر الملک مرحوم کا ایک معاملہ بھی قابل ذکر ہے جس کے متعلق فدوی کی علیحدگی کے وقت بیان کیا گیا تھا کہ مدار المہام صاحب نے اول تو سردار صاحب پر الزامات عائد کیے اور بعد میں پھر خود ہی اُن کو بری کر دیا اور بدون اس کے کہ ریاست کی بدنامی کا خیال کیا جاتا ستر ہزار پونڈ کے حصص معدنیات سرکار عالی کے واسطے قبول کر لیے۔ اگرچہ یہ ضرور نہیں ہے کہ جو کچھ بھی نواب سر آسمان جاہ بہادر اس وقت کرتے تھے اُس سب کی جواب دہی فدوی سے متعلق ہو۔ اور غالباً حضرت ظل سبحانی کو یہ بھی بخوبی یاد ہوگا کہ سردار دلیر الملک کی معطلی کی تجویز حضرت ظل سبحانی کی منظوری حاصل کرنے کی غرض سے مدار المہام کی طرف سے لیکر نواب محسن الملک بہادر حضرت ظل سبحانی کی حضور میں حاضر ہوئے تھے نہ کہ فدوی۔ اور حقیقت امر بھی یہی ہے کہ جس وقت تک نواب محسن الملک بہادر اس مقدمہ کی پیروی کی غرض سے انگلستان کو روانہ ہوئے ہیں، تمام تر کارروائی اس مقدمہ کی زیادہ تر اُن ہی کے مشورہ اور اُن ہی کے ہاتھوں سے چلتی رہی تھی۔ لیکن باایں ہمہ فدوی نہایت جرأت سے مگر ادب کے ساتھ یہ عرض کر سکیگا کہ جو کچھ کارروائی اس مقدمہ میں من اولہ الی آخرہ نواب سر آسمان جاہ مرحوم و مغفور کے وقت میں ہوئی، وہ بالکل واجبی تھی اور اُس کے خلاف جس قدر بھی خیالات عوام میں پھیلائے گئے تھے وہ سب نہایت ہوشیاری کے ساتھ خود سردار صاحب اور اُن کے دوستوں کے پھیلائے ہوئے تھے جس سے اُن کا مطلب یہ تھا کہ ایک طرف تو حضرت پیر و مرشد کے ذہن مبارک میں یہ امر جاگزیں ہو کہ سردار صاحب کے ساتھ جو کارروائی ہوئی وہ دشمنی کی راہ سے تھی۔ اور دوسری طرف یہ کہ حصص معدنیات کو جو آخری معاہدہ میں سرکار عالی کے واسطے تجویز ہوئے تھے اُن کو ایک ناجائز اور لوٹ کا مال قرار دیدیں تاکہ حضرت پیر و مرشد دق ہو کر حکم فرمائیں کہ ہم کو ایسی ناجائز چیز منظور نہیں، اور لاکھوں روپیہ کی یہ قیمتی چیز بہت ہی آسانی سے اُن کے ہاتھ لگ جائے۔ سب سے آخر کارروائی جو سردار صاحب کے مقدمہ کے متعلق ہوئی وہ عدالت دیوانی میں سرکار عالی کی طرف سے مقدمہ کا دائر ہونا تھا اور ہر قسم کی احتیاط اس میں کر لی گئی تھی اور اگر یہ دعوے

عدالت میں دائر نہ ہوتا تو صاحب عالی شان بہادر اور گورنمنٹ آف انڈیا اور تمام دنیا کے نزدیک یہی بات کہنے میں آتی کہ سرکار عالی نے محض بے پروائی اور غفلت سے اپنا نقصان کر لیا اور دوسرے ملازموں کو بھی جو لالچی مزاج رکھتے ہوتے یہ جرأت ہو جاتی کہ جب موقع پاتے بے دھڑک سرکاری مال کی لوٹ مچاتے۔ المختصر عدالت دیوانی میں مقدمہ دائر ہوا اور اس وقت تک کسی کو کچھ نہ معلوم تھا کہ سردار صاحب کی طرف سے کیا جوابدہی ہوگی۔ یہاں تک کہ جواب دعویٰ داخل ہوا جس میں بعض تحریرات مدارالمہامان سابق کی اور بعض تحریرات کرنل مارشل صاحب کے زمانہ کی پیش کی گئیں جن کی نسبت کہا گیا تھا کہ یہ تحریرات حضرت ظل سبحانی کی منظوری سے ہوئی ہیں اور اب یہ مشکل پیش آئی کہ نواب سر سالار جنگ مرحوم اول اور ثانی کا انتقال ہو چکا تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ کرنل مارشل صاحب کیا بیان کرینگے اور سب سے زیادہ مشکل یہ تھی کہ سردار صاحب کی دستاویز پیش کردہ کے لحاظ سے جن کا کوئی علم ہم میں سے کسی کو بھی اس سے پہلے نہیں ہوا تھا حضرت ظل سبحانی کا اظہار باضابطہ قلمبند ہونا لازم ہوا جاتا تھا اس وقت سر ڈینس فٹز پیٹرک کی رزیڈنسی کا آخر زمانہ تھا۔ نواب سر آسمان جاہ بہادر نے اُن کی رخصتی دعوت کی شب کو بشیر باغ میں اُن سے اس باب میں مشورہ کیا، اور اُن سے کہا کہ الماس والے مقدمہ کی حالت اور تھی اور وہ ایک والی ملک کے خرید و فروخت کا معاملہ تھا جس میں بہت سے اُمور حضرت ظل سبحانی کے علم پر منحصر تھے لیکن سردار صاحب کا معاملہ محض ایک سرکاری مقدمہ ہے اور یہ میں کسی طرح جائز نہ رکھونگا کہ ایسے معاملات میں حضرت پیر و مرشد کو بار بار تکلیف دی جائے لہٰذا میرے نزدیک اس مقدمہ میں سردار صاحب سے مصالحت ہو جانا مناسب ہے۔ سر ڈینس فٹز پیٹرک صاحب بہادر نے اس رائے کو بہت پسند کیا یہی رائے پھر حضرت ظل سبحانی کے حضور میں بھی عرض کی گئی اس پر حضرت ظل سبحانی نے بھی اتفاق فرمایا اور اُسوقت سے نواب وقار الامراء بہادر کے ذریعہ سے مصالحت کی گفتگو شروع ہوئی۔ اس عرصہ میں سر ڈینس تشریف لے گئے اور سر پلوڈن صاحب بہادر تشریف لے آئے اور اُن کی رائے یہ ہوئی کہ صلح نہ کی جائے اور مقدمہ چلایا جائے

اور اگر حضرت پیر و مرشد کے اظہار قلم بند ہونے کی ضرورت ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اظہار ہونا چاہیئے لیکن سر آسمان جاہ بہادر کسی طرح اس پر رضامند نہ ہوئے اور سب سے پہلا امر جو سر بلوڈن صاحب بہادر اور نواب سر آسمان جاہ مرحوم و مغفور میں اختلاف شدید کا باعث ہوا وہ یہی معاملہ تھا۔ مدارالمہام صاحب مرحوم یہ کہتے تھے کہ سب کچھ ہونے کے بعد بھی نتیجہ مشتبہ ہی اور ایسی حالت میں میں کبھی مشورہ نہ دونگا کہ حضرت پیر و مرشد کو اظہار کی تکلیف دی جائے اور سر بلوڈن صاحب بہادر کو اُس پر اصرار تھا، اور فدوی ہی اُن تمام گفتگوؤں میں مدارالمہام صاحب اور رزیڈنٹ صاحب کے باہم متوسط تھا۔

حصص معدنیات سرکار عالی

۱۶۔ حصص معدنیات جو سرکار عالی میں لیئے گئے اُن کی نسبت بھی اس قدر اور عرض کرنا ضرور ہی وہ اگر ناجائز تھے تو سردار صاحب کے واسطے تھے جنھوں نے سرکار عالی سے مخفی مخفی اُن کو اپنی ذات کے لیئے حاصل کیا تھا۔ سرکار عالی کا تو وہ اپنا مال تھا اُس کے لیئے وہ کیونکر ناجائز ہو سکتا تھا، اگر ایک ملازم اپنے آقا کے جواہرات سرقہ کے ذریعہ سے حاصل کرے تو وہ اُس ملازم کے لیئے مال مسروقہ اور مال ناجائز کہا جاویگا لیکن اگر آقا وہ جواہرات اُس سے واپس لے تو آقا کا تو وہ اپنا مال ہی۔ اس قسم کے معروضات اگر حضرت ظل سبحانی تک پہنچائے گئے تو وہ مغالطہ دہی کی غرض سے تھے اور اعتراض کرنے والوں کی حالت تو یہ ہی کہ اُن میں سے کسی ایک نے بھی ان ہزاروں صفحات میں سے جو ان مقدمہ کی مثلوں سے متعلق ہیں خیر سے دس صفحہ بھی شاید ہی کبھی مطالعہ کیئے ہوں۔

ظفریاب خاں مجرم انگریزی

۱۷۔ ظفریاب خاں ایک انگریزی مجرم کی پناہ دہی بھی فدوی سے اُن وقتوں میں منسوب کی گئی تھی وہ اصل واقعہ یہ ہی کہ ظفریاب خاں حیدرآباد میں اُس وقت آئے تھے جب کہ مہاراجہ نریندر پرشاد بہادر کی دیوانی کا زمانہ تھا اور عماد نواز جنگ بہادر کے ذریعہ سے وہ نواب منیر الملک بہادر کے پاس باریاب ہوئے اور جو کچھ کارروائی اُن کے متعلق ہوئی سب اسی وقت میں ہوئی۔ اور حضرت پیر و مرشد پر بخوبی روشن ہی کہ مہاراجہ

صاحب کے زمانہ میں اور اُس کے بعد میں ایک عرصہ تک فدوی کا کوئی خاص رسوخ مدار المہامان وقت کے سامنے نہ تھا اور نواب سر آسماں جاہ بہادر کے زمانہ میں ظفر یاب خاں کے متعلق اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوا کہ رسالہ مُقنن دکن کی چھپائی کا کام محمد علی کے نام سے جو پہلے سے اُن کے متعلق چلا آتا تھا وہ بدستور جاری چلا آیا۔ فتح نواز جنگ بہادر نے البتہ ایک مرتبہ غلطی سے اُن کو نواب سر آسماں جاہ کے وقت میں اپنے دفتر کا ایک عہدہ دیا تھا اُس کی اطلاع جب فدوی کو ہوئی تو فدوی نے خان مذکور کے کل حالات نواب صاحب مرحوم سے عرض کئے۔ جہاں تک فدوی کو معلوم ہی مرحوم موصوف نے فوراً اُن کو اس خدمت سے علیحدہ کر دیا اور فتح نواز جنگ بہادر کی نسبت بھی ناخوشی کا اظہار کیا کہ کیوں ایسے شخص کی نسبت سفارش کی گئی تھی۔

قتل ممتاز بی

۱۸- ممتاز بی ایک فاحشہ نوعیسائیہ کے قتل کے بعد محض گمنام طور پر یہ بیان کیا گیا کہ قاتل کے فرار ہو جانے میں جو کہ ایک مسلمان شخص تھا فدوی نے بھی چشم پوشی کی لیکن یہ سفید جھوٹ نہیں بلکہ نہایت سیاہ جھوٹ تھا اور یہ صرف اُن ہی لوگوں کی کوشش کا ایک شگوفہ تھا جو فدوی کو اپنے مقاصد کے لحاظ سے اپنی جگہ سے کسی نہ کسی طرح ہٹانا چاہتے تھے۔ جو شخص قاتل بیان کیا گیا تھا وہ نہ میرا کوئی رشتہ دار تھا نہ ہم قوم نہ ہم وطن بلکہ برار کا ایک باشندہ تھا جس کو غالباً میں پہچانتا تک بھی نہ تھا اگر یوں کسی سے کوئی الزام منسوب ہو جایا کرے تو اس دنیا میں کوئی شخص بھی اپنی عزت کو محفوظ نہیں رکھ سکتا اور آخر الامر وہ بیان اس قدر پایۂ صدق سے گرا ہوا تھا کہ کسی نے بھی اُس پر کچھ اعتنا نہ کیا۔

سالار جنگی اسٹیٹ کے معاملات

۱۹- سالار جنگی اسٹیٹ کے بعض معاملات کی نسبت بھی اس زمانہ میں اشارات ہوئے کہ مدار المہام کے مشیروں کی کارروائی اُن کے متعلق قابل اطمینان نہ تھی۔ اور جہاں تک فدوی خیال کر سکتا ہی غالباً اس سے فتح نواز جنگ مراد ہونگے۔ کیونکہ کورٹ آف وارڈس کی حیثیت سے یہ صیغہ انھیں سے متعلق تھا اور فدوی اس

موقع پر نہایت ادب کے ساتھ یہ عرض کر سکتا ہے کہ جہاں تک فدوی کا تعلق اس اسٹیٹ کے معاملات سے کبھی رہا ہے فدوی نے ہمیشہ اس کی نسبت وفادارانہ برتاؤ کیا ہے جس کی خاص وجہ یہ بھی تھی کہ سر سالار جنگ مرحوم و مغفور اوّل نے ہی فدوی کو حیدرآباد بلایا تھا اور پھر رفتہ رفتہ اُن ہی کے یادگار زمانہ میں فدوی نے معتمد عدالت و کوتوالی کے درجہ تک ترقی پائی تھی۔ فدوی نے اس ڈیوڑھی کو جس کو خدا ہمیشہ قایم رکھے صدق دلی سے اپنے آقائے ولی نعمت کی ڈیوڑھی ہی سمجھا۔ خاص خاص بیگمات سے اور خصوصاً دلھن بیگم صاحبہ سے دریافت کیا جاوے تو اُمید ہے کہ وہ فدوی کو اب بھی نیکی ہی کے ساتھ یاد فرماوینگی نواب سر آسماں جاہ مرحوم و مغفور کی خدمت میں کئی مرتبہ فدوی کو یہ عرض کرنے کا موقع ملا تھا کہ فدوی کی خیرخواہی جہاں تک کہ فدوی کے عہدہ کے فرائض اجازت دے سکینگے سالار جنگی ڈیوڑھی کے مقابلہ میں اوّل نمبر پر ہوگی اور آپ کی نسبت دویم نمبر پر۔ اس لیے کہ سالار جنگ مرحوم و مغفور نے ہی نے فدوی کو سر آسماں جاہ مرحوم و مغفور کے پاس متعین فرمایا تھا اور یہ فرق مدارج میں بھول نہیں سکتا تھا۔ فدوی نے جب ایک مرتبہ اپنی صوبہ داری صوبہ شرقی کے زمانہ میں سنا کہ نواب بہرام الدولہ بہادر صوبہ داری چاہتے ہیں اور صوبہ داری کوئی خالی نہیں ہے تو فوراً فدوی نے اپنی تحریری درخواست مدار المہام کے سامنے پیش کی کہ نواب بہرام الدولہ بہادر فدوی کی جگہ صوبہ دار بنا دیئے جائیں اور فدوی بہت خوشی کے ساتھ اُن کی مددگاری کو اپنی عین عزت سمجھیگا یہ کیا تھا؟ یہ صرف ایک جوش وفاداری اس گھر کی نسبت تھا جس کی بدولت فدوی حیدرآباد آیا تھا اور جس کا مدة العمر فدوی احسان مند رہیگا۔

کرنل مارشل صاحب کے خیالات فدوی کی نسبت

۲۰۔ فدوی کی علیحدگی کے زمانہ میں یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ کرنل مارشل صاحب کے خیالات فدوی کی نسبت اچھے نہیں تھے اس کی نسبت فدوی صرف اسی قدر گزارش کافی سمجھتا ہے کہ وہ بھی سرکار عالی کے ایک عہدہ دار تھے اور فدوی بھی۔ اور کرنل صاحب کی رائے اس وقت فدوی کی نسبت کسی خاص امتیاز کی

مستحق نہیں ہی اُن کے خیالات اگر فدوی کی نسبت اچھے نہ تھے تو اُن کے خیالات اُن کو مبارک رہیں۔ اس پاک پروردگار کے فضل سے فدوی یہ دعویٰ کر سکتا ہی کہ کرنل صاحب کی بہ نسبت فدوی اپنے سرکار کا شاید کچھ زیادہ ہی خیرخواہ اور وفادار تھا اور اس کے متعلق حضرت ظل سبحانی سے بہتر دوسرا کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔

سر رچرڈ میڈ صاحب بہادر کے خیالات فدوی کی نسبت

۲۱- کہنے والوں نے اس وقت میں فدوی کی نسبت کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی لیکن طلائے خالص کو جس قدر بھی آگ پر رکھا جاویگا خالص تر ثابت ہوگا۔ غرضکہ ایک پرانی بات یہ بھی دہرائی گئی تھی کہ سر رچرڈ میڈ صاحب سابق رزیڈنٹ کے خیالات فدوی کے نسبت اچھے نہیں تھے۔ سر رچرڈ میڈ صاحب گورنمنٹ آف انڈیا کے قایم مقام تھے اور اس لیے ان کی رائے اور اُن کے خیالات بلاشبہ ہر وقت میں وقعت کی مستحق ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ضرور ہوگا کہ جس وقت کے وہ خیالات ہیں اُس وقت کی حالت بھی پیش نظر رہے۔ اس وقت کی یہ حالت تھی کہ عنان سلطنت نواب سر سالار جنگ اوّل کے ہاتھ میں تھی اور اُن کے اور سر رچرڈ میڈ صاحب کے تعلقات دوستانہ نہیں رہے تھے اور نواب رشید الدین خاں مرحوم و مغفور سر سالار جنگ مرحوم کی مرضی کے برخلاف بطور کو ریجنٹ کے اُن کے ساتھ انتظام میں شریک کر دیئے گئے تھے اور نواب رشید الدین خاں مرحوم اور اُن کے بھتیجوں نواب محتشم الدولہ مرحوم و نواب بشیر الدولہ مرحوم (حال نواب سر آسمان جاہ مرحوم) میں خانگی نزاعات ترقی پر تھے اور ایک طرف رزیڈنٹ صاحب وقت سر رچرڈ میڈ اور دوسری طرف نواب سر سالار جنگ مرحوم دونوں اس فکر میں رہتے تھے کہ شریک مدار المہام کو جس طرح ممکن ہو اپنا ممنون اور اپنا طرفدار بنا کے رکھیں اور نواب بشیر الدولہ بہادر اس وقت میں صدر المہام عدالت تھے اور فدوی اُن کا معتمد تھا اور اگرچہ فدوی کی یہ خواہش نہیں ہوئی کہ خواہ مخواہ بھی اپنے عہدہ کے سوا دوسرے کاموں میں دخل دے مگر جب اعلیٰ حکام نے خود ہی فدوی سے دوسرا کام لینا چاہا تو تعمیل ارشاد کے سوا فدوی کے لیئے اور کچھ چارہ نہیں تھا۔ جو جھگڑے

کہ اس وقت چچا بھتیجوں کے مابین پیش تھے ان میں خود نواب سالار جنگ مرحوم اوّل نے فدوی کو اپنی طرف سے نواب بشیر الدولہ کے پاس پیامات لے کر بھیجا اور فدوی کے ذریعہ سے نواب بشیر الدولہ مرحوم بھی ان پیاموں کے جوابات بھیجتے رہے یہ بنیاد تھی کہ ایک معتمد محکمہ صدر المہام عدالت یعنی فدوی کا تعلق ان اُمرا کے خانگی معاملات سے ہو گیا اور جب ایسا تعلق ہو گیا تو پھر اس کو ایمانداری کے ساتھ بجالانا یہ فدوی کا فرض تھا۔ ایک دفعہ نواب سر سالار جنگ مرحوم نے فدوی سے فرمایا کہ تم بشیر الدولہ بہادر سے جاکر کہو کہ میں اور نواب رشید الدین خاں میرے شریک جو فیصلہ آپ کے معاملات کا کر دینگے گورنمنٹ آف انڈیا اس میں دخل نہیں دے سکتی۔ فدوی نے جواب میں عرض کیا کہ بہت خوب لیکن نواب بشیر الدولہ بہادر کی عادت ہے کہ فدوی سے فدوی کی رائے بھی دریافت کیا کرتے ہیں لیکن اس موقع پر بھی اگر انھوں نے رائے دریافت کی تو فدوی کیا عرض کرے؟ نواب سر سالار جنگ بہادر نے فرمایا کہ "تم اپنی ہی رائے بیان کرنا" میں نے عرض کیا کہ "میری یہ رائے ہی نہیں" نواب صاحب نے فرمایا کہ "پھر تمہاری کیا رائے ہے" میں نے عرض کیا کہ "آپ کا یہ ارشاد اُس وقت ٹھیک ہو سکتا تھا جب کہ عنانِ حکومت خود والیِ ملک کے ہاتھ میں ہوتی اور آج تو گورنمنٹ آف انڈیا اپنے آپ کو اعلیٰ درجہ کا ولی اور محافظ قرار دے کر سب کچھ دخل دے سکتی ہے" یہ سُن کر نواب صاحب نے فرمایا کہ ہم دونوں گورنمنٹ آف انڈیا کو اس کا موقع اور یاوری نہ دینگے تو وہ دخل کس طرح دیگی میں نے عرض کیا کہ اس کی یاوری اس کی گرجتی ہوتی توپوں اور چمکتی ہوئی سنگینوں سے ہے نہ کہ مدار المہام اور شریک مدار المہام کی منظوری سے۔ جس نے خاص بڑودہ کی سلطنت میں مہاراجہ بڑودہ پر فوجداری کے الزام کی تحقیقات کے لئے کمیشن قایم کر دیا۔ کیا آپ اس کو اس سے روک سکینگے کہ وہ آپ کی بعض اُمرا ریاست کی فریاد کو سُنے جو صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ "ہمارے اوپر ہمارے چچا جو شریک مدار المہام ہیں ظلم کر رہے ہیں اور مدار المہام ان کی خاطر سے ہماری داد نہیں دیتے اور ہمارے بادشاہ کے ہاتھ میں جو کہ ہمارے مالک ہیں اس وقت اختیار نہیں ہے" فدوی کے اس جواب کو

سُن کر سر سالار جنگ مرحوم نے فرمایا کہ "اب معلوم ہوا کہ آپ ہی باہم صلح نہیں ہونے دیتے"۔ فدوی یہ سن کر خاموش چلا آیا۔ اور اسی گھنٹہ میں اپنی خدمت سے استعفا لکھ کر مرحوم و مغفور کی خدمت میں بھیجدیا اور اس میں یہ بھی لکھ دیا کہ اس استعفا سے میرا یہ مطلب نہیں ہو کہ میں نواب بشیر الدولہ بہادر کی ملازمت اختیار کروں بلکہ میں کل ہی کو وطن اپنے کو روانہ ہوجانا چاہتا ہوں اس کاغذ کو پڑھ کر نواب صاحب نے فدوی کو یاد فرمایا اور جب میں وہاں پہونچا تو اوّل مولوی مہدی علی صاحب نے اور اُن کے بعد نواب مکرم الدولہ بہادر نے جہاں تک اُن سے ممکن تھا فدوی کو سمجھایا کہ فدوی اپنا استعفا واپس لے اور جب یہ دونوں کوششیں بے سود ثابت ہوئیں تو نواب سر سالار جنگ مرحوم نے فدوی کو خود اپنے سامنے بلایا اور مجھ سے فرمایا کہ جو کچھ مولوی مہدی علی اور مکرم الدولہ نے تم سے کہا وہ اُنھوں نے میرا کہا ہوا نہیں کہا یہ اُن کی اپنی رائے تھی۔ میں نے تم کو کچھ اور ہی کہنے کو بلایا ہو اور وہ یہ ہو کہ جو کچھ اس وقت میں نے تم سے کہا وہ میری غلطی تھی مجھے کوئی حق نہیں تھا جو میں تم سے کہتا کہ جو کچھ تمھاری رائے نہ ہو اُس کو تم اپنی رائے کے طور پر بیان کرو اور میں اب تم سے اپنی خطا کا اعتراف کرتا ہوں"۔ اس وقت فدوی پر ایک رقت کا عالم طاری ہو گیا جس کے اثر سے نواب صاحب مرحوم خود بھی اس وقت محفوظ نہ رہ سکے۔ اور جس محبت و نوازش کا اظہار اس وقت مرحوم و موصوف کی طرف سے ہوا وہ کبھی میرے دل سے محو ہونے والا نہیں ہو اور جب وہ وقت یاد آجاتا ہو تو بے اختیار اُن کی مغفرت کے لئے دل سے دعا نکلتی ہو۔

حیدرآباد سے علحدگی اور پھر اُسی خدمت پر بحال ہونا

۲۲۔ نواب رشید الدین خاں مرحوم کی خدمت میں حاضر ہونے کی عزت فدوی کو کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی اور نہ فدوی کی خاصیت مزاج سے واقف ہونے پائے اُنھوں نے جیسا سنا ویسا ہی صحیح سمجھا اور بالآخر اُن کی خواہش یہ ہوئی کہ فدوی اپنی خدمت سے علحدہ کیا جائے تاکہ نواب بشیر الدولہ بہادر کو فدوی سے مدد نہ مل سکے سر رچرڈ میڈ صاحب نے اُن کی اس خواہش کی تائید کی سر سالار جنگ بہادر بہت عرصہ تک اس کو ٹالتے رہے۔ اس عرصہ میں فدوی بحصولِ رخصت اپنے وطن کو آیا ہوا تھا اور فدوی کر نل

ڈوڈی صاحب رزیڈنٹ گوالیار سے بھی ملا تھا جو کہ ایک وقت میں حیدر آباد کے فرسٹ اسسٹنٹ رزیڈنٹ رہے تھے اور نواب بشیر الدولہ بہادر کے دوست سمجھے جاتے تھے جب اس کی اطلاع نواب رشید الدین خاں اور سر رچرڈ میڈ صاحب کو ہوئی تو ان کو یہ ایک کافی موقع مل گیا اور انھوں نے دوبارہ سر سالار جنگ سے میری علٰحدگی کے متعلق تقاضہ کیا اور یہاں تک اس پر زور دیا کہ آئندہ ان میں اور مدار المہام میں باہم تعلقات کا دوستانہ حالت میں رہنا صرف اسی پر منحصر ہے۔ فدوی ابھی رخصت کی تقریب سے اپنے وطن ہی میں تھا فدوی کو جب ان حالات کی اطلاع ہوئی تو فدوی نے فوراً نواب سر سالار جنگ کی خدمت میں تحریراً عرض کیا کہ میں نہیں چاہتا کہ مشتاق حسین وہ شخص قرار پائے جس پر مدار المہام اور ان کے شریک اور رزیڈنٹ صاحب کے باہم نا اتفاقی کی بنیاد قایم ہو اور ریاست کے کاروبار میں خلل آئے۔ آپ بے تامل اس وقت شریک مدار المہام کی خواہش پوری کر دیجئے اور مجھ کو اس سے کچھ رنج نہ ہوگا۔ بلکہ خوشی ہوگی کیونکہ میں سمجھونگا کہ یہ بھی مجھ سے اپنی سرکار کی ایک عمدہ خدمت ادا ہوئی نواب سر سالار جنگ مرحوم نے اس تحریر کے ساتھ کہ شریک مدار المہام کو شکایت ہے کہ یہ ہماری خانگی نزاع میں ہمارے بھتیجوں کو مدد دیتے ہیں فدوی کی علٰحدگی کا حکم دیا لیکن ساتھ ہی چار سو روپیہ ماہوار کلدار بطور مدد خرچ کے سکریٹ سروس فنڈ سے مقرر کر دئیے اور فدوی کو مطمئن کر دیا کہ جب موقع ملیگا تم بحال کر دئیے جاؤگے چنانچہ اس طرح ساڑھے تین برس گزرنے کے بعد جب ان کو موقع ملا تو اول موقع ہی پر فدوی کو یاد فرمایا اور اول ان ہی نواب بشیر الدولہ بہادر کے پاس اور اسی معتمدی صدر المہام عدالت پر مقرر کیا اور پھر بہت جلد گلبرگہ کا صدر تعلقدار مقرر فرمایا اس صدر تعلقداری کی نذر پیش کرنے کے لئے فدوی جب مرحوم ممدوح کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمایا کہ خیر اس وقت تو یہ نذر لیتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں تم کو حیدر آباد سے باہر بھیج نہیں سکتا تمہارے گلبرگہ تشریف جانے کی خبر سنکر اس قدر لوگوں نے مجھ سے تمہاری نسبت کہا ہے کہ میں بلدہ ہی میں تمہارے لئے کچھ اور فکر کرتا ہوں اور میں زیادہ تر اس سے خوش ہوا ہوں کہ زیادہ تر غریب لوگ تمہارے

باہر جانے سے ناخوش ہیں۔ خیر اب تم جاؤ اور صدر تعلقداری کا جائزہ لو اور ایک دن کام کر کے پھر بلدہ کو واپس چلے آؤ اور فدوی کو ایک تحریر کے ذریعہ سے بھی نواب صاحب کے یہ خیالات اس وقت ظاہر ہو گئے تھے جو شاید اب تک کہیں میرے کاغذات میں ہو بہر حال ایسا ہی ہوا اور اسی مہینہ میں نواب صاحب مرحوم نے فدوی کو اپنا خاص معتمد عدالت و کوتوالی مقرر کیا اور مرحوم و موصوف کے اخیر وقت تک فدوی اسی عہدہ پر تھا۔

زمانہ بیکاری کی تنخواہ

۲۳۔ اسی عرصہ میں نواب سر سالار جنگ مرحوم و مغفور اول نے فدوی کے تمام زمانہ بیکاری کی تنخواہ کا حساب محاسبی سے پیش ہونے کا حکم دیا اور جب وہ پیش ہوا تو معلوم نہیں کن خیالات سے اس پر یہ لکھدیا کہ بالفعل ملتوی رہے۔ اس کے چند ہی ہفتے کے بعد مرحوم موصوف نے اس جہان سے انتقال کیا اور مہاراجہ نریندر بہادر نے تمام حالات پر غور کرنے اور کاغذات کا ملاحظہ فرمانے کے بعد یہ تصفیہ کر دیا کہ جو کچھ سکریٹ سروس فنڈ سے مل چکا تھا وہ مجرا کر کے باقی سالم تنخواہ تمام زمانہ بیکاری فدوی کو دلادی جائے۔ لیکن جب اس کی اطلاع رزیڈنسی میں ہوئی تو وہاں سے اس پر اعتراض ہوا اور اس پر سر جیرڈ میڈ صاحب کی کارروائی کا حوالہ دیا گیا اور پیکار صاحب نے وہ تنخواہ فدوی سے واپس لے لی۔ اس کے کئی سال کے بعد جب ہاول صاحب رزیڈنٹ ہو کر آئے اور نواب سر آسماں جاہ مرحوم و مغفور نے ان کی توجہ اس معاملہ کی نسبت چاہی تو انھوں نے گورنمنٹ آف انڈیا کو ایک خاص رپورٹ بھیجی اور اس میں ثابت کیا کہ سر جیرڈ میڈ کے وقت میں مشتاق حسین کے متعلق جو کچھ ہوا وہ انصاف کے خلاف تھا ہاول صاحب کی اس رپورٹ کے ساتھ کرنل ٹونڈی صاحب رزیڈنٹ گوالیار کی ایک چھٹی بھی شامل تھی جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ مشتاق حسین نے جس وقت گوالیار میں مجھ سے ملاقات کی تو اس میں مشتاق حسین نے ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا تھا جو نامناسب ہو یا مناسب نہ ہو، اور ختم ملاقات کے وقت مشتاق حسین نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ میں اس ملاقات کا ذکر نواب سر سالار جنگ سے بھی کر دونگا۔ سر اسٹورٹ بیلی صاحب کی

ایک چٹھی بھی اس رپورٹ کے ساتھ بھیجی گئی جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ نواب سر سالار جنگ نے اس زمانہ میں جب کہ میں حیدرآباد کا رزیڈنٹ تھا مجھ سے مشتاق حسین کا ذکر کیا تھا اور میری اتفاق رائے سے پھر اُن کو اپنے پہلے عہدہ پر بلا کر بحال کیا گیا تھا۔ اُن کاغذات کے مطالعہ کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا نے ہاول صاحب کی رائے سے اتفاق کیا اور فیصلہ کر دیا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کو مشتاق حسین کی تنخواہ دلانے میں کچھ عذر نہ ہوگا۔ اس وقت فدوی کو فدوی کے زمانہ بیکاری کی وہ واپس شدہ تنخواہ پھر مرحمت ہوئی۔

یہ ہے سر رچرڈ میڈ کے وقت کا قصہ۔ لوگ یا تو واقعات سے واقف نہیں ہوتے یا دانستہ اچھی بات کو بھی دوسرے پیرایہ میں بیان کر دیتے ہیں۔ نواب سر سالار جنگ مرحوم و مغفور نے جب کہ معروضہ بالا مجبوریوں سے فدوی کی علٰحدگی کا حکم دیا تھا تو اس کے بعد بارہا لوگوں نے اُن کو یہ کہتے سنا کہ میں نے مشتاق حسین ہی کے ساتھ یہ ناانصافی نہیں کی بلکہ خدا کا گناہ کیا ہے۔

اصل وجہ اپنی علٰحدگی کی فدوی کو آخر وقت تک معلوم نہ ہوئی

۲۴ - یہ ہے فدوی کے منسوبہ قصورات کی فہرست جو کہ سابق کے وقتوں میں فدوی سے منسوب کیے گئے تھے لیکن کوئی خیر خواہ سے خیر خواہ اور وفادار سے وفادار ملازم بھی دنیا میں ایسا نہیں گزرا ہوگا جس پر لوگ معترض نہ ہوئے ہوں اور یہ تو بہت چھوٹی سی فہرست ہے فدوی جس قدر اپنے معائب سے آگاہ ہے ایسا کوئی دوسرا شخص کیا ان سے آگاہ ہو سکتا ہے خدائے ستار العیوب اور دانائے پنہاں و آشکارا کی شان ستاری اور غفاری سے بندہ کا صرف گزارا ہو سکتا ہے اور بادشاہانِ وقت بھی چونکہ خلیفہ فی الارض ہیں وہی شان اُن کو بھی اللہ عز و جل نے مرحمت فرمائی ہے اور اسی کی بدولت اس عالم اسباب میں خلقت کا نباہ ہو جاتا ہے ورنہ ہمارے افعال کے لحاظ سے ہمارے ساتھ برتاؤ ہوا کرتا تو نہ اس دنیا میں کبھی ہم ایک دن عزت و مسرت کے ساتھ بسر کر سکتے اور نہ اس دوسرے جہان ہی میں جو ضرور ایک دن سب کے سامنے آنے والا ہے کسی طرح ہم نجات کے اُمیدوار ہو سکتے

تھے الغرض یہ تو فدوی کبھی دعویٰ نہیں کرسکتا کہ فدوی کا کوئی قصور نہ تھا ملازم کے لئے قصورمند ہونا اور ہر وقت اعتراف قصور اور عفو تقصیرات کا ملتجی رہنا لازم و ملزوم ہی لیکن پیر و مرشد ظل سبحانی فدوی نہایت ادب اور عاجزی کے ساتھ اس قدر عرض کرنے کی اجازت اس مقام پر ضرور چاہتا ہی کہ معروضہ بالا تقصیرات کا فدوی ملزم تھا خواہ دوسری اسی قسم کی بہت سی خطائیں فدوی سے سرزد ہوئی تھیں۔ مگر یہ تمام امور اس قابل ضرور تھے کہ فدوی سے اُن کے متعلق کوئی جواب تو طلب فرمایا جاتا اور کوئی موقع تو فدوی کو صفائی کے حاصل کرنے کا دیا جاتا۔ حضرت ظل سبحانی کا ترحم و انصاف اور دہ درگزر کی شان جو غفور الرحیم نے حضرت ظل سبحانی میں ودیعت رکھی ہی ہرگز بھی اس بات کی مقتضی نہیں ہوسکتی کہ یوں فدوی کی خیرخواہی حرف غلط کی طرح دفعتہً حضرت ظل سبحانی کے دلِ صفا منزل سے محو ہوجائے اور کوئی وقت بھی اس کام زمانہ میں فدوی کے لیے اس فکر سے خالی نہیں گیا ہی کہ ضرور کوئی نہ کوئی بات اور ہی جو فدوی کی ان تمام بدقسمتیوں کا باعث ہوئی ہی اور جس کا اظہار کسی خاص مصلحت کی وجہ سے نہیں فرمایا گیا اگر فدوی کے وظیفہ کی منظوری ہوگئی ہوتی جس کے لیئے فدوی نے خود درخواست پیش کی تھی اور جس درخواست میں خود ہی فدوی نے یہ گزارش کردیا تھا کہ اس منظوری کے بعد فدوی اپنے وطن کو روانہ ہوجانا چاہتا ہی تب بھی فدوی اپنے دل کو سمجھا سکتا تھا لیکن اسی کے ساتھ چونکہ یہ حکم بھی شامل تھا کہ چار دن کے اندر فدوی حیدرآباد سے چلا جاوے تو اس چار دن کی قید نے ضرور اس بات کو ثابت کردیا کہ کوئی نہ کوئی بات اور بھی ہی جس کی وجہ سے حضرت ظل سبحانی کو جو کہ ایک چیونٹی کا دل بھی بلاوجہ دکھانا پسند نہیں فرماتے فدوی کی بدقسمتی سے ناخوشیٔ خاطر اقدس کے لیے کوئی تحریک پیدا کردی ہی اور یہ تمام زمانہ درحقیقت اس وجہ ناخوشی کی تجسس و تلاش میں فدوی نے گزارا ہی اور مثل مشہور ہی کہ جوئندہ یابندہ آخر کار وہ گوہر مقصود فدوی کے ہاتھ آگیا ہی جس کو فدوی اس رازِ سربستہ کی کلیدِ فتح سمجھ سکتا ہی ہر ایک کام کا اللہ جل شانہ کے ہاں ایک وقت مقرر ہوا کرتا ہی اور کیا بعید ہی کہ فدوی کی اس عقدہ کشائی

کا بھی اس نے یہ ہی وقت مقرر کر رکھا ہو۔

اعلیٰحضرت کی ناراضامندی کا سبب معلوم ہونا

۲۵۔ دسمبر گزشتہ میں جب کہ فدوی اپنی بیوہ بہو مسز محمد احمد کو انگلستان رخصت کرنے کی غرض سے بمبئی گیا ہوا تھا تو وہاں سے واپسی کے وقت علی گڑھ کے مقام پر نواب سرور الملک بہادر سے فدوی کی ملاقات ہوئی اور پندرہ سولہ گھنٹہ فدوی اور وہ ایک ہی جگہ رہے اور اس عرصہ میں سب ہی قسم کی باتیں ان سے رہیں اُسی وقت میں جب کہ فدوی ان سے یہ ذکر کر رہا تھا کہ اصل وجہ حضرت ظل سبحانی کی ناخوشی خاطر کی مجھ کو اب تک معلوم نہیں ہو سکی کہ کیا تھی تو اُنھوں نے بے ساختہ جواب دیا کہ وہی سیزدہ سالہ رپورٹ جو نواب سر آسماں جاہ بہادر کی مدار المہامی میں ریاست کے مداخل و مخارج کی نسبت مرتب ہو کر سر ڈینس فٹزپیٹرک صاحب کو دی گئی اور اس میں حضرت کی فضول خرچیوں کا ثبوت بہم پہونچایا گیا تھا۔ وہی رپورٹ تمھاری نسبت حضرت ظل سبحانی کی ناخوشی کی بنیاد تھی۔ نواب سرور الملک بہادر کی یہ صاف صاف تقریر اور اُن کا بے تصنع لب و لہجہ ایسا تھا کہ جو کچھ اُنھوں نے کہا فدوی کے دل میں بیٹھ گیا۔ اور اپنے دل میں فدوی نے کہا کہ الحمدللہ مرض تشخیص میں آگیا ہے اور ظاہر میں فدوی نے اپنی حالت اس وقت ایسی قایم رکھی کہ گویا کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوئی اور اب فدوی نہایت ادب سے یہ عرض کرتا ہے کہ اس سیزدہ سالہ رپورٹ کے معاملہ میں فدوی ایک ذرہ برابر بھی قصوروار نہیں ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ ایک ایسا بڑا معاملہ ہے کہ صرف اس قدر عرض کر دینا کہ فدوی کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے کسی طرح کافی نہیں ہو سکتا اور اس لیئے بہت کچھ غور کے بعد فدوی نے اس بات کو ضروری سمجھا کہ قبل اس کے کہ اس باب میں حضرت ظل سبحانی کے حضور اقدس میں کچھ عرض کروں سر ڈینس فٹزپیٹرک صاحب سے جن کے وقت کی یہ کارروائی ہے خط و کتابت کروں چنانچہ فروری گزشتہ میں جس کو سات مہینہ سے زیادہ عرصہ ہونے آیا ہے فدوی نے سر ڈینس کو جو کہ اس وقت سکرٹری آف اسٹیٹ ہند کی کونسل کے ایک

---

۵۱ سرور جنگ

ممبر اور رکن تھے ایک چٹھی لکھی اِس چٹھی میں فدوی نے ان تمام واقعات کو نہایت صراحت کے ساتھ بیان کر دیا ہی جو ان سیزدہ سالہ تخمینہ جات مداخل و مخارج کی تیاری سے متعلق اس وقت وقوع میں آئے تھے اور اب تک فدوی اس کے جواب کا منتظر رہا لیکن جواب نہیں آیا اور نہ آئندہ اب اس کے جواب ملنے کی اُمید ہی لہذا بغیر کسی زیادہ انتظار کے اور بغیر اس کے کہ ان واقعات کو اس عرضداشت میں جو پہلے ہی سے بہت زیادہ طویل ہو گئی ہی درج کروں - اپنی اس چٹھی مورخہ دہم فروری ۱۸۹۸ء موسومہ سر ڈینس فٹز پٹرک کی بجنسہ ایک نقل معہ اُس کے ترجمہ کے حضرت ظل سبحانی کے ملاحظہ کی غرض سے عرضداشت ہذا کے ساتھ گزرانتا ہوں اس کے ملاحظہ سے حضرت ظل سبحانی کو تمام کیفیت ان سیزدہ سالہ کاغذات کے متعلق روشن ہو جائے گی مع فدوی کی بے گناہی کے -

سر ڈینس کی ایک چٹھی فدوی کی نسبت

۲۶ - فدوی جس زمانہ میں حیدر آباد سے علیحدہ ہو کر اپنے وطن میں پہونچا تو سر ڈینس فٹز پٹرک صاحب سے جو اس وقت پنجاب کے لفٹنٹ گورنر تھے درخواست کی کہ ممالک مغربی و شمالی کے لفٹنٹ گورنر صاحب کو جس صوبہ میں کہ فدوی کا وطن ہی ایک ملاقاتی چٹھی لطف فرماویں - اُس پر صاحب ممدوح نے وہ چٹھی تحریر فرمائی اور اس کی ایک مصدقہ نقل مہربانی سے فدوی کے پاس بھی بھیجدی چنانچہ ایک مطبوعہ کاپی اس چٹھی کی معہ ترجمہ فدوی اس

لہ یہ چٹھی حسب ذیل ہی :-

میرے پیارے کراسٹویٹ، مولوی مشتاق حسین رئیس امروہہ یا نواب وقار الملک نے جیسا کہ ان کو حیدر آباد سے خطاب ملا ہی مجھ سے درخواست کی ہی میں ان کا خط ملفوف کرتا ہوں کہ میں اُن کو آپ سے ملنے کے لیے ایک تعارفی چٹھی دوں - میں خیال کرتا ہوں کہ اس قسم کا خط ٹریور پلوڈن کے پاس سے آتا تو زیادہ مناسب تھا جو میرے بعد حیدر آباد میں رزیڈنٹ ہوئے، اور جن کا اُس وقت تک کا علم مجھ سے زیادہ ہی لیکن میرے حیدر آباد کے زمانہ میں چونکہ وہ وزیر کے بازوئے راست تھے اور وہی شخص تھے جن سے میرا اکثر کام پڑتا تھا اور چونکہ

عرضداشت کے ساتھ منسلک کرتا ہی (منسلکہ حرف ب) اور اس سے فدوی کے دو مقصد ہیں اول تو یہ کہ سر ڈینس نے اُس وقت میں جو کچھ فدوی کی نسبت اپنی معلومات ذاتی کا اظہار کیا ہی وہ ملازمان حضرت ظل سبحانی کے ملاحظہ سے گزر جاوے اور دوسرے یہ کہ سر ڈینس ایک معمولی قسم

(بقیہ نوٹ ص ۳۵۷) :-

میں نے حیدرآباد میں کافی مدت تک رہ کر اُن کے چال چلن کا اندازہ کرلیا ہی لہذا میں جانتا ہوں کہ اپنے اس رائے کا اظہار کرنے سے جو میں نے اُن کے چال چلن کی نسبت قایم کی تھی انکار کرنا معقول نہیں ہی۔

آپ واقف ہیں کہ حیدرآباد کی حالت برٹش انڈیا کی سی نہیں ہی، وہاں وزیر کی ہمیشہ شدید اور تلخ مخالفت رہتی ہی اور اس حالت میں جو اس مخالفت کا نتیجہ ہوتا ہی، آپ یہ ہرگز اُمید نہیں کرسکتے کہ وزیر کا معتبر ترین معتمد ٹھیک وہی طریقہ اختیار کریگا جو ایک اعلیٰ افسر برٹش انڈیا میں کرتا ہی، خاص حد تک اس کو اپنے خاص خاص مددگار و معین سے بہ عنایت اور اپنے خاص خاص مخالفین سے بناراضی پیش آنا ضرور ہوگا، اس کام کی تہمت مشتاق حسین پر بھی لگائی جاتی تھی اور اگرچہ جو کچھ اس موقع پر کہا جاتا تھا (میں اپنے ہی زمانہ کی بابت کہتا ہوں) اس میں بہت مبالغہ ہوتا تھا اور جیسا کہ خیال کیا جاسکتا ہی اُس میں کسی قدر سچ بھی تھا، لیکن ان خیالات کی علاوہ جو کہ ایک حد تک قابل معافی ہیں، میں مشتاق حسین کے چال چلن کو جب تک میں حیدرآباد میں تھا ہر طرح سے قابل تعریف سمجھتا رہا۔

میں نے اُن کے بدترین دشمن کو بھی اس کے سوا اور کچھ کہتے نہ سنا کہ اُن کا دامن برائی سے بالکل پاک ہی، اس ملک کے لوگوں میں جن سے مجھے واسطے پڑا ہی وہ سب سے زیادہ ایماندار اور کارگزار ہیں، اور اُن کی وہ دانائی جو اُنھوں نے وزیر، نظام اور رزیڈنٹ کے تعلقات درست رکھنے میں کی ہی، تعریف سے باہر ہی۔

مجکو اسقدر اور اضافہ کرنا ہی کہ اگرچہ وہ نہایت ہی گھرے مذہبی مسلمان ہیں، لیکن اپنی

کی خط و کتابت میں کس قدر حد سے زیادہ محتاط ہیں۔ چنانچہ حضرت ظل سبحانی اُن کی اس چٹھی میں ملاحظہ فرمائینگے کہ انھوں نے اوّل اپنی چٹھی کا مسودہ سر ہلوڈن صاحب بہادر کے دیکھنے کے لیئے بھیجا اور جب اُن کا جواب اُس کی نسبت منگا لیا تب وہ چٹھی انھوں نے مرسل کی اور جو شخص محض معمولی خط و کتابت میں اس قدر محتاط ہو وہ میری دسویں فروری گزشتہ کی چٹھی کا جواب کب کسی آسانی کے ساتھ دے سکتا ہے اور اُن کے جادہ طبیعت سے تو کچھ بعید نہیں معلوم ہوتا کہ انھوں نے میری چٹھی وہ گورنمنٹ آف انڈیا میں بھیجدی ہو یا سکرٹری آف اسٹیٹ کو دکھلائی ہو اور فدوی کے نزدیک تو اصل وجہ اُن کی طرف سے اُس کے جواب نہ ملنے کی یہ ہے کہ جو واقعات کہ فدوی نے اپنی ۱۰ ر فروری کی چٹھی میں بیان کیئے ہیں اُن کی تردید تو وہ فرما نہیں سکتے پھر اگر وہ اس کا کچھ جواب لکھیں تو لا محالہ اس سے ان سیزدہ سالہ کاغذات کے مرتب کرنے کی ذمہ داری اُس دوسرے کسی افسر پر آجاتی ہے جس نے سر ڈینس کی فرمایش سے اُس وقت میں اُن کاغذات کو مرتب کیا تھا فدوی کو تو اس بات کا علم کبھی نہیں ہونے پایا کہ سر ڈینس ہی کی فرمایش سے کسی افسر نے وہ کاغذات مرتب کیئے تھے۔ لیکن اب جو سر والملک بہادر کے پمفلٹ میں خود سر ڈینس کی تحریر میں سے یہ فقرہ پڑھنے میں آتا ہے کہ "جو افسر اعلیٰ حضرت کی وقعت و عظمت کے محافظ تھے اُن کو حکم دیا گیا تھا کہ اسراف کے ثبوت میں ایک تحریری یادداشت تیرہ سال کے مداخل و مخارج کی پیش کریں" تو اس فقرہ سے صاف یہی معلوم ہوتا ہے کہ ضرور سر ڈینس فٹز پٹرک کے ایماء سے وہ کاغذات مرتب ہوئے جس سے نہ صرف فدوی ہی مطلقاً

(بقیہ نوٹ ص ۳۵۸): ۔ رلاتے ہیں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں سے تعلقات رکھنے میں وہ نہایت آزاد اور وسیع ہیں۔

جب میں اسقدر لکھ چکا تھا مجھے خیال ہوا کہ اس خط کو مسٹر ہلوڈن کے ملاحظے کے لیئے بھیجدینا چاہیئے قبل اس کے کہ میں اُس کو آپ کے پاس بھیجوں یہ جو خط مسٹر ہلوڈن کا اس کے ساتھ آیا ہے وہ بھی ملفوف کرتا ہوں۔

آپکا نہایت صادق دوست، ڈی، فٹز پٹرک

بے خبر رہا بلکہ غالباً نواب سر آسمان جاہ بہادر کو بھی اس کی اطلاع نہ ہوئی۔ ورنہ فدوی سے ضرور اس کا ذکر فرماتے اور اب بحیثیت ایک ریزیڈنٹ کے سر ڈینس کی یہ کارروائی جائز کارروائی تھی اور خصوصاً جب کہ اس کے ساتھ اس بات کو شامل کر لیا جائے کہ سر ڈینس فیٹز پیٹر صاحب کی نیت اس میں حضرت ظل سبحانی اور ریاست حیدر آباد کے متعلق نیک تھی اور وہ ایک مخلصانہ مشورہ دینے کے لئے حسابات دیکھنا چاہتے تھے! اور جو چیز کہ اس میں ناجائز تھی وہ یہ تھی کہ سرکار عالی کے کسی عہدہ دار کو یہ جائز نہ تھا کہ ریزیڈنٹ صاحب کے ایسے منشاء کی تعمیل اس طرح بالا بالا عمل میں لائے کہ مدار المہام کو بھی اصل حقیقت پر اطلاع نہ ہو اور پھر جب وہ حسابات مرتب ہوں تو ایسے پیرایہ میں مرتب ہوں جس سے نصیب اعداء حضرت ظل سبحانی کے اخراجات پر کوئی اعتراض عائد ہوتا ہو۔ فدوی نے اپنی ۱۰ر فروری کی چٹھی میں اس کو بہت تفصیل سے ثابت کیا ہے کہ یہ تمام کارسازی اس غرض سے ہوئی تھی کہ حضرت ظل سبحانی اور نواب سر آسمان جاہ کے فی مابین صفائی نہ رہے اور حضرت ظل سبحانی اپنے مدار المہام کو اپنا خیر خواہ نہ سمجھیں اور یہ ایک تدبیر تھی انقلاب وزارت کی غرض سے بعض ہمارے ہی عہدہ داروں کی طرف سے اور وہ ایسی ہوشیاری کے ساتھ عمل میں لائی گئی کہ سر ڈینس فیٹز پیٹرک سا بیدار مغز مدبر بھی اُس پر پے نہ لے جا سکا۔ اور اب ایک غلطی میں وہ خود ہی مبتلا ہو گئے جس کو فدوی نے اُن کی موسومہ چٹھی میں صاف صاف بتلا دیا ہے۔

سر بلوڈن کی چٹھی فدوی کے نام | ۲۷۔ سر بلوڈن صاحب بہادر نے بھی فدوی کو ایک چٹھی میں اس وقت لکھی تھی جب کہ فدوی دو تین گھنٹہ کے بعد حیدر آباد کو الوداع کہنے والا تھا۔ اس چٹھی[1] کی ایک نقل مطبوعہ بھی معہ اس کے ترجمے کے فدوی اس عرضداشت کے ساتھ منسلک کرتا ہے۔ اس چٹھی سے حضرت ظل سبحانی کو یہ بھی معلوم ہو سکیگا کہ ریزیڈنسی کے دفتر میں فدوی کی طرف سے کوئی بدنما دھبہ موجود نہیں ہے اور نہ فدوی کی اس علیحدگی کو ریزیڈنسی کے کسی

[1] یہ چٹھی اُس موقع پر نقل ہو چکی ہے جہاں حیدر آباد سے نواب وقار الملک کی روانگی کا ذکر ہے ۱۲

ایماء سے کوئی تعلق رہا ہے۔

فدوی کے کان میں ایک آواز پڑی کہ حضرت ظلّ سبحانی ارشاد فرماتے ہیں کہ "سر آسمان جاہ تو اچھے ہیں لیکن اُن کے مشیر اچھے نہیں"۔ صرف اسی ایک اشارہ کی بنیاد پر فدوی نے خود ہی وظیفہ کی درخواست پیش کی اور اس دن کے بعد سے آخر وقت تک کبھی رزیڈنسی کے دروازہ میں بھی قدم نہیں رکھا۔ سر پلوڈن صاحب کی اس چھٹی میں میرے اسی نہ ملنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ فدوی کے درخواست وظیفہ کی اطلاع مسٹر فریدوں جی جمشید جی پرائیوٹ سکریٹری نے مدار المہام صاحب کی طرف سے رزیڈنٹ صاحب کو کی جس کو رزیڈنٹ صاحب نے بہت تعجب کے ساتھ سُنا اور اُن کو مشکل سے اس بات کا یقین آیا کہ یہ درخواست پیش ہوئی ہوگی غرض کہ جو کچھ بھی اُس وقت ہوا وہ فدوی کی درخواست پر اور حضرت ظلّ سبحانی کے حکم سے ہوا نہ رزیڈنسی کی کسی خواہش پر اور اس لیے فدوی کا معاملہ آئندہ بھی بفضل ایزدی حضرت ظلّ سبحانی ہی کے یدِ قدرت اور حضرت ظلّ سبحانی ہی کی مرضیِ مبارک پر منحصر ہے۔

والحمد للہ علیٰ ذالک۔

اخیر معذرت و استدعائے ترحم شاہانہ

۲۸- اور اب نہایت ادب کے ساتھ اس تمام طویل گزارش کی معافی چاہنے کے بعد جو کہ دل کی بے چینی میں بے ساختہ قلم سے نکلتی چلی گئی ہے اور حضرت ظلّ سبحانی کے شاہانہ ترحم پر بھروسہ کر کے دو جداگانہ درخواستیں اس کی ساتھ فدوی گزرانتا ہے تاکہ اگر حضرت ظلّ سبحانی کا دریائے رحمت جوش میں آئے تو ان درخواستوں میں سے (اوّل) متعلق علاقہ آسمان جاہی (دوم) متعلق ضروریات ذاتی فدوی نسبت مکان وغیرہ جس پر بھی فدوی کی خوش قسمتی سے حضور ظلّ سبحانی مناسب خیال فرمائیں کوئی حکم صادر فرمائینگے۔ آئندہ میں ایک موسم تک کی گھوڑ دوڑ کا بھی آتا ہے جب کہ بغیر کسی مزید توضیح اور تصریح کے گھوڑ دوڑ کا ایک چھوٹا سا زرد ٹکٹ فدوی کی آئندہ قسمت کا فیصلہ کر دے سکتا ہے اور فدوی کی خوش قسمتی میں ایک تازہ روح پھونک سکتا ہے یا اور جو

کوئی طریقہ کہ خدام حضرت ظل سبحانی کے نزدیک مستحسن ہوسے

کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند

اور سے رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

اور فدوی کے لیئے تو منتہائے آرزو اب صرف یہ باقی ہے کہ اس دنیا سے اس اطمینان کے ساتھ عالمِ آخرت کا سفر اختیار کروں کہ میرے بادشاہ کا اطمینان میری وفاداری کی نسبت بدستور قایم تھا۔ فدوی کو اپنی اس بدقسمتی کے زمانہ میں ایسی ایسی مصیبتوں کا سامنا رہا ہے جس کو انسان کی اعلیٰ درجہ کی مصیبتوں سے تعبیر کیا گیا ہے جس پر تیز ادجوان اور لائق فرزند کی موت نے گویا گھر ہی کو بے چراغ کر دیا۔ خدا علیم و دانا ہے کہ میں نے اُن میں سے ہر ایک مصیبت کو اس کامل استقلال کے ساتھ برداشت کیا ہے کہ جو خداوند تعالیٰ جلشانہ نے ان نازک مواقع پر فدوی کو بخشا لیکن جو چیز کہ فدوی کی برداشت سے باہر ہے وہ صرف یہ ہے کہ حضرت ظل سبحانی جیسے مالک اور خاوند کے خیالِ مبارک میں **مشتاق حسین** جیسا غلام بدخواہ اور ناوفادار سمجھا جاوے جس کے بعد یہ دو روزہ زندگی وبالِ جان معلوم ہوتی ہے اور موت اس زندگی سے بدرجہا خوشتر ہے کیونکہ وہاں یہ تکلیف تو نہ ہوگی اور معاملہ سیدھا خدائے علام الغیوب کے ساتھ ہوگا۔ اور وہ ہر ایک نہاں و آشکارا سے واقف اور اُس کے دربار میں کبھی کوئی غلط فہمی نہیں ہوتی۔ اور اس عرضداشت کے ذریعہ سے فدوی نے بھی اس قدر سامان ضرور مہیا کر دیا ہے کہ میرے اس جہان سے سفر کر جانے کے بعد اگر وہ خلقت کی نگاہ سے گزرے تو آیندہ کی دنیا میری نسبت یہ صحیح رائے قایم کر سکے کہ میں اپنے بادشاہ کا ناوفادار ملازم نہیں تھا اور جہاں تک میرے امکان میں تھا میں نے اپنے فرایض کو نہایت ایمانداری کے ساتھ انجام دیا تھا اور اب اس سے زیادہ کچھ عرض نہیں کیا جا سکتا کہ دل بھرا چلا آتا ہے اور حدادب مانع عرض ہے۔ اور پھر ایک دفعہ اپنے قصور کی معافی چاہ کر اور ترحم کی استدعا کے ساتھ اس دعا پر ختم گزارش ہے کہ :۔

آفتابِ دولت و اقبال و نیّرِ مدارج روز افزوں تاباں و درخشاں باد بحرمۃِ النّبیِ وَ آلِہِ الاطہارِ و اصحابہِ الکبارِ ۔

عرض

فدوی سراپا تقصیر مشتاق حسین وقار الملک

مقام امروہہ - ممالک مغربی و شمالی

معروضہ چہاردہم جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۱۶ھ

یوم شنبہ (۱ اکتوبر سنہ ۱۸۹۸ء)

خدمات حیدرآباد پر ایک عام تبصرہ

سر سالار جنگ اعظم کے زمانہ سے سر آسماں جاہ کے عہد تک نواب وقار الملک کا تمام زمانہ ملازمت نہایت مصروفیت کی حالت میں گزرا، اگر وہ چاہتے تو اکثر دوسرے بڑے بڑے عہدہ داروں کی طرح ایک حد تک آرام و راحت کے ساتھ رہ سکتے تھے لیکن وہ درحقیقت کام کے لیئے پیدا کیئے گئے تھے اور کام ہی اُن کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ لہٰذا اُنھوں نے کام کو آرام پر ترجیح دی، بلکہ خود اپنے لیئے کام پیدا کیئے۔ ابتدا سے انتہا تک جن عہدوں پر اُنھوں نے کام کیا، اُن عہدوں پر اُن سے ماقبل و مابعد بہت سے لوگ مقرر ہوئے مگر کسی کو وہ شہرت، عزت اور ناموری نصیب نہیں ہوئی جو نواب وقار الملک نے حاصل کی تھی۔ وہ جس عہدہ پر پہونچتے تھے اپنی ہمہ گیر اور محنت پسند طبیعت کی وجہ سے اُس عہدہ کے کام کو اس قدر وسعت دیتے تھے کہ بعد میں کام کرنے والوں کے لیئے اُن کی تقلید کرنا قریباً ناممکن ہو جاتا تھا۔ صوبہ دار اور معتمد مالگزاری بہت لوگ مقرر ہوئے لیکن نواب وقار الملک کی صوبہ داری اور معتمدی کا سکہ لوگوں کے دل پر ایسا بیٹھ گیا تھا کہ پھر کوئی دوسرا اُنکی نگاہ میں نہیں جچتا تھا۔

اُن کی قابلیت اور حُسن کارگزاری کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہر مدار المہام نے اپنے اپنے زمانہ میں نہایت شاندار الفاظ میں اُن کی خدمات کا اعتراف کیا ہے، خصوصاً سر سالار جنگ اعظم تو اُن کی، دیانت، کارگزاری اور اصابت رائے پر اس قدر اعتماد کرتے تھے کہ کسی دوسرے شخص پر اُنھوں نے ایسا اعتماد کبھی نہیں کیا۔ اگر وہ کچھ مدت اور زندہ رہتے تو نواب وقار الملک کی قابلیت سے دولت آصفیہ کو اور زیادہ فائدہ پہونچتا لیکن اُن کی اچانک وفات نے ہوا کا رُخ بدل دیا۔ جدید مدار المہام کے زمانہ میں حریفوں کو عروج ہوا اور اُنھوں نے نواب وقار الملک کو باہر ٹالا یعنی وہ صوبہ داری پر بھیجدیئے گئے۔ جب سر آسمان جاہ

کے عہد میں دوبارہ حیدرآباد آئے تو زمانہ نہایت پرآشوب تھا، ہر طرف سازش کا بازار گرم تھا۔ اُن کے حریف معمولی لوگ نہ تھے بلکہ بڑے بڑے پولیٹیکل شاطر تھے، جن کی ساری عمر جوڑ توڑ میں گزری تھی، اُمرا کا بھی اس زمانہ میں بڑا دبدبہ تھا، اور یہ لوگ غیر ملکی عہدہ داروں کے اقتدار کو ایک لمحہ کے لیئے بھی پسند نہ کرتے تھے، ان اُمرا کے لیئے یہ امر ناقابل برداشت تھا کہ غیر ملکی عہدہ دار اُن پر حکومت کریں، ان سب سے بڑھ کر مغربی سیاست کی نیرنگیاں تھیں جن کا مقابلہ سہل نہ تھا۔ غرض ان تمام حالات نے ملکر ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ کام کرنا نہایت مشکل تھا، لیکن باوجود ان سب مشکلات کے اُنھوں نے ایسے شاندار طریقہ سے کام کیا کہ حریفوں کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا۔

آخر زمانہ میں جب وہ معتمد مال گزاری تھے خود اُن کے عہدہ کے فرایض اسقدر وسیع تھے کہ اُن کو صبح سے شام تک کام کرنا پڑتا تھا، لیکن ان فرایض کے علاوہ مشیر مدار المہام کی حیثیت سے اُن کو جو کام کرنا پڑتا تھا وہ اور بھی زیادہ اہم تھا، اور یہی حصہ اُن کے کام کا سب سے زیادہ قابل قدر و لایق ستایش ہے۔ لیکن افسوس کہ یہی حصہ سب سے زیادہ مخفی اور عام دسترس سے باہر ہے، اس لحاظ سے یہ کہنا گویا بالکل صحیح ہے کہ انکا اصلی کارنامہ ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حیدرآباد کے مخصوص حلقوں میں اب تک بہت سے نہایت دلچسپ اور عجیب و غریب واقعات نواب وقار الملک کے متعلق بیان کیئے جاتے ہیں جو زیادہ تر اُن کی پولیٹیکل کارروائیوں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اوّل تو بغیر کافی ثبوت کے ان روایات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، دوسرے کوئی شخص اس کے لیئے تیار نہیں ہے کہ وہ اپنی روایت اور ذمہ داری پر ان واقعات کو شائع اور مشتہر کرنے کی اجازت دے۔

حیدرآباد میں معمولی معمولی باتوں کے متعلق ایسی احتیاط برتی جاتی ہے،

اور ہر اجنبی ایسی مشکوک و مشتبہ نظروں سے دیکھا جاتا ہی کہ کسی اہم یا پولیٹکل معاملہ کی اصلی حقیقت معلوم کرنے کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا، احتیاط کی انتہا یہ ہی کہ جو واقعات عام طور پر لوگوں کو معلوم ہیں اور جن کی صحت و واقعیت میں کچھ بھی شبہ نہیں، وہاں کے مصنفین اُن واقعات کو بھی جب لکھتے ہیں تو اس طرح لکھتے ہیں کہ حقیقت پر اور پردہ پڑجاتا ہی۔ مثلاً یہ واقعہ عام طور پر اکثر لوگوں کے معلوم ہی کہ اعلیٰ حضرت آصف جاہ سادس کے زمانہ میں، سر سالار جنگ ثانی سر آسماں جاہ اور سر وقار الامراء نے جو یکے بعد دیگرے حیدر آباد کے وزیر اعظم مقرر ہوئے اعلیٰ حضرت کی نارضامندی کی وجہ سے مجبور ہو کر استعفا دیا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اُن سے استعفا لے لیا گیا۔ لیکن حیدر آباد کا کوئی مصنف ان واقعات کی طرف اشارہ بھی نہیں کریگا بلکہ ہمیشہ یہ لکھے گا کہ ان امراء نے بوجہ علالت استعفا دیا (یا چھ ماہ کی رخصت حاصل کی) اور اعلیٰ حضرت نے ازراہ مراحم خسروانہ اُن کا استعفا قبول فرمایا، ان حالات کے ماتحت کیوں کر توقع کی جا سکتی ہی کہ جو اہم پولیٹکل معاملات نواب وقار الملک کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں اور سلطنت کے صیغہ راز سے متعلق ہیں عام طور پر معلوم ہو سکینگے۔

البتہ بعض واقعات ضرور ایسے ہیں جو معلوم ہیں اور اُن کے متعلق ایک حد تک کاغذی شہادت بھی موجود ہی۔ لیکن ان واقعات کی کڑیاں دوسرے واقعات سے اس طرح ملی ہوئی ہیں کہ جب تک پورا سلسلہ نہ بیان کیا جائے واقعہ ذہن نشین نہیں ہو سکتا، اور اس پورے سلسلہ کے بیان کرنے میں بہت سے ایسے واقعات درمیان میں آجاتے ہیں کہ اُن کو بیان کرنا گویا فتنہ خوابیدہ کو بیدار کرنا ہی۔ لہذا نواب وقار الملک کی پولیٹکل خدمات کا جس قدر ذکر بھی اشارۃً یا صراحۃً کیا گیا ہی ناظرین کو اُسی پر قناعت کرنا چاہیئے۔

پولیٹکل خدمات کے علاوہ وہ خدمات ہیں جن کا تعلق اُن کے عہدہ کے فرایض سے ہی، ان خدمات کی حالت یہ ہی کہ صوبہ داری کے زمانہ میں اس زمانہ کے نظامِ حکومت

کے مطابق بہت سے صیغے اور محکمے اُن کے متعلق تھے یعنی وہ صوبہ کے ہر صیغے کے افسر اعلیٰ تھے، اس لیئے اُن کے پاس کام کی کثرت تھی اور چونکہ وہ اپنی عادت کے مطابق جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے، اس لیئے کام اور بھی زیادہ بڑھ گیا تھا۔ ان سب کاموں کے علاوہ اُن کو دورہ کرنا پڑتا تھا، اور اُن کی عادت تھی کہ دورہ میں شدید محنت کرتے تھے اور نہایت آزادی سے عام رعایا سے مل کر اُن کی شکایات سنتے اور اُن کا انسداد کرتے تھے، اور واپس آکر اپنے دورہ کی نہایت مفصل و مکمل رپورٹیں مرتب کر کے مدار المہام کی خدمت میں بھیجتے اور اصلاح طلب اُمور پر توجہ دلاتے تھے، لیکن وہ رپورٹ بھیجکر اپنے کو ذمہ داری سے سبکدوش نہیں خیال کرتے تھے، بلکہ جب تک اصلاح طلب امور کا فیصلہ نہیں ہوتا تھا وہ برابر وزیر اعظم سے مراسلت کرتے رہتے تھے۔ ان مراسلات اور رپورٹوں کے ہزاروں صفحے اُن کے دست و قلم کے لکھے ہوئے آج بھی حیدرآباد کے دفاتر میں موجود ہیں۔

معتمدی کے زمانہ میں کام اور زیادہ بڑھ گیا تھا، بڑے بڑے مستقل محکمے اُن کے ماتحت تھے اور ہر محکمہ کے متعلق کام کی کثرت تھی اور یہ کام کسی ایک صوبہ کے ساتھ محدود نہ تھا، بلکہ تمام سلطنت سے تعلق رکھتا تھا۔ اس زمانہ میں اُنھوں نے ہزاروں احکام جاری کیئے ہزاروں مقدمات کا فیصلہ کیا، اور تمام ماتحت دفاتر کی اصلاح و تہذیب کر کے کام میں سہولت اور باقاعدگی پیدا کی۔

اُن کی دماغی قابلیت کا حال مقدمات کے اُن فیصلوں سے معلوم ہوتا ہی جو اُنھوں نے صوبہ داری اور معتمدی کے زمانہ میں کیئے، صوبہ شرقی (ورنگل) اور خاص حیدرآباد میں سرکاری دفاتر میں ان فیصلوں کا اتنا بڑا انبار ہم نے بچشم خود دیکھا ہی کہ صرف ان کے پڑھنے کے لیئے کئی مہینے درکار ہیں لیکن اس کتاب کی محدود ضخامت کے لحاظ سے ایک فیصلہ کا نقل کرنا بھی دشوار ہی اس لیئے صرف چند اصلاحی احکام کا تذکرہ کرنے پر قناعت کی گئی ہی۔

ان سب فرایض کے علاوہ وہ قریباً ہر کمیٹی اور ہر مجلس کے ممبر تھے، مختلف انتظامی

امور کے سلسلہ میں یہ کمیٹیاں قایم ہوتی تھیں، اور نواب وقار الملک اپنی قابلیت و تجربہ کی بنا پر اُن کے ممبر بنائے جاتے تھے۔ اُن کی ممبری رسمی طریقہ کی نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ سب ممبروں سے زیادہ باقاعدہ طور پر کام کرتے تھے، چنانچہ وہ مجلس آب پاشی کے ممبر تھے جہاں اُنھوں نے بڑی قابلیت سے کام کیا۔ بعض اوقات اہم مقدمات کے فیصلہ کے لئے کسی کمیشن کا تقرر ہوتا تھا اور مخصوص قابلیت کے لوگ اس میں انتخاب کئے جاتے تھے، تو نواب وقار الملک کی شرکت اُس میں بھی ضروری سمجھی جاتی تھی۔ غرض سلطنت کا کوئی اہم اور قابل توجہ کام ایسا نہ تھا جس میں اُن کی شرکت ضروری نہ سمجھی جاتی ہو۔ کام کی اس وسعت و کثرت کا یہ نتیجہ تھا کہ اُن کو صبح سے رات کے دس بجے تک فرصت نہیں ملتی تھی۔

ملک کو سر سبز و شاداب بنانے، مالی وسائل کو ترقی دینے، رعایا کے ادنیٰ اور مظلوم طبقہ کے اُبھارنے، اور مظالم کا استیصال کرنے میں اُنھوں نے جو کوششیں کی ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ وہ خود ایک اعلیٰ عہدہ دار تھے لیکن غریب رعایا کی خاطر، گورنمنٹ سے لڑتے تھے، اور خدا تعالیٰ کی اس عاجز و درماندہ مخلوق کی اس قدر حمایت و اعانت کرتے تھے کہ اُن کا کوئی منتخب کردہ وکیل بھی اس قدر نہ کرسکتا۔

عدالتیں اُنہی کے زمانہ میں آزاد ہوئیں اور اُن کی عزت و وقعت لوگوں کی نگاہ میں قایم ہوئی، اُمرا کا ناجائز اقتدار اور زور اُنہی کے زمانہ میں ٹوٹا اور قانون کی نگاہ میں امیر و غریب عملاً یکساں قرار دیئے گئے، بڑی خوبی یہ تھی کہ اُنھوں نے حکومت کا رعب و دبدبہ بھی قایم رکھا بلکہ اُس میں اضافہ کیا اور رحم و انصاف کو بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اُن کے زمانہ میں کسی بڑے سے بڑے عہدہ دار کو بھی یہ جرأت نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ رعایا کے کسی ادنیٰ فرد پر ظلم کرسکے۔ کیونکہ مشتاق حسین کے بے لاگ انصاف سے ہر شخص خائف و لرزاں رہتا تھا، اسی عدل و انصاف کا نتیجہ تھا کہ رعایا اُن سے بے حد محبت کرتی تھی، خصوصاً صوبہ شرقی میں تو آج تک لوگ اُن کو بے حد محبت سے یاد کرتے اور اُن کے رحم و شفقت کی داستانیں سناتی ہیں

ایک بوڑھے ہندو نے (ورنگل) میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے ایسے الفاظ کہے جن کا مفہوم یہ تھا کہ انتصار جنگ ایک اوتار یا خدا رسیدہ بزرگ تھے جو اس صوبہ میں صرف اس لیے بھیجے گئے تھے کہ مظالم کا خاتمہ کریں اور رعایا کو آزاد کرائیں، اسی طرح ایک پنشنر تحصیلدار کو جو ہندو ہیں میرے صوبہ شرقی کے سفر میں جب یہ معلوم ہوا کہ میں نواب وقار الملک کی سوانح عمری لکھ رہا ہوں، تو انھوں نے میرے ہاتھوں کو بوسہ دیا صرف اس خیال سے کہ ان کے نزدیک یہ ایک مقدس کام تھا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے حسن عمل کا کیسا گہرا اثر لوگوں کے دلوں پر چھوڑا ہے۔

ان کا ایک سب سے زیادہ قابل ستایش کارنامہ یہ ہے جیسا کہ خود سر ڈینس فٹز پٹرک نے بیان کیا ہے کہ نواب وقار الملک نے، حضور نظام، مدار المہام اور رزیڈنٹ کے مابین خوشگوار تعلقات قایم رکھنے میں سخت کوشش کی اور اس میں وہ بہت کچھ کامیاب بھی ہوئے، خود نواب وقار الملک نے ایک موقع پر سر آسمان جاہ کو لکھا تھا کہ حیدر آباد میں سب سے زیادہ بہتر و مبارک وہ زمانہ سمجھا جاتا ہے جب کہ حضور نظام، وزیر اور رزیڈنٹ کے باہمی تعلقات عمدہ حالت میں ہوں، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ان تعلقات کو عمدہ حالت میں رکھنے کی جو کوشش کی وہ کس قدر لائق تحسین و ستایش ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر نواب وقار الملک کی حیدر آباد کی زندگی کے متعلق کسی ایسے شخص کا بیان پیش کیا جائے جس نے بچشم خود ان کو اس عروج و اقتدار کی حالت میں دیکھا ہو۔ اس بنا پر ہم مولوی بشیر الدین احمد صاحب خلف شمس العلماء مولانا نذیر احمد صاحب

لہ صوبہ شرقی میں نواب صاحب اب تک انتصار جنگ ہی کے نام سے مشہور ہیں جب میں نے دفتر صوبہ داری میں محافظ دفتر سے یہ کہا کہ میں نواب وقار الملک کے متعلق مواد فراہم کر رہا ہوں، تو اس نے دوسرے دن کسی قدر تلاش و جستجو کے بعد کہا کہ ان کے متعلق یہاں کچھ نہیں، لیکن جب اتفاقیہ اس کو تھوڑی دیر بعد میری گفتگو سے یہ معلوم ہوا کہ میری مراد نواب انتصار جنگ سے ہے تو اسکو تعجب ہوا کہ انتصار جنگ اور وقار الملک دونوں ایک ہیں پھر تو بہت سے کاغذات تلاش کر کے دیئے
محمد اکرام اللہ خاں ندوی

دہلوی کا ایک مضمون جو دلچسپ تبصرہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس حصہ کے خاتمہ پر نقل کرتے ہیں۔ صاحب موصوف نواب وقار الملک کے زمانہ میں حیدرآباد میں تھے اور ایک معزز عہدہ پر ممتاز تھے۔ مولوی صاحب موصوف کا بیان حسب ذیل ہے:-

---

نواب صاحب مرحوم کی لائف کا وہ حصہ جو سرکارِ عالی نظام کی ملازمت میں گزرا خاص طور پر ذکر کرنے کے قابل ہے۔ میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ سنی سنائی باتیں نہیں ہیں ؎

"شنیدہ کے بود مانند دید"

بلکہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے۔ حیدرآباد کی ریاست بلحاظ وسعتِ ملک و کثیر المحاصل ہونے کے اوّل درجہ کی اسٹیٹ ہے اور خوش نظمی کے اعتبار سے بھی وہ کسی ریاست سے دوسرے درجہ پر نہیں ہے۔ سالار جنگ ڈی گریٹ بسمارک آف انڈیا نے نظم و نسق کی بنا ڈالی جس کے لیے ان کو عمدہ اور لایق اور تجربہ کار عہدہ داروں کی ضرورت تھی۔ اُنھوں نے ملک دکن کے باہر سے بہت سے نامور اصحاب کو بلا کر ریاست کی کل کو از سر نو درست کیا۔ ان کا انتخاب ہمیشہ لاجواب ہوتا تھا۔ ہندوستان کے شمالی حصہ سے اُنھوں نے بمشورت سرسید علیہ الرحمۃ کریم آف انڈین سوسائٹی کو چن لیا۔ اور ایسے ایسے نامور لوگوں کو منتخب کر کے بلا لیا جو برٹش گورنمنٹ کے بھی چمکتے ہوئے ستارے تھے۔ مثلاً مولوی سید حسین بلگرامی، مولوی مہدی علی مولوی چراغ علی، مولوی مشتاق حسین، مولوی نذیر احمد وغیرہ حیدرآباد کی ریاست کے یہ لوگ ستون تھے اور سب کے سب سرسید کے حواری تھے اب ان سب میں صرف مولوی سید حسین بلگرامی باقی ہیں اور سب یکے بعد دیگرے چل بسے اور ایسے گئے کہ ان کی جگہ آج تک پُر نہ ہو سکی۔ ان بزرگان قوم نے نہ صرف دکن میں نام پیدا کیا اور اپنا سکہ بٹھا دیا بلکہ وہاں سے چلے آنے کے بعد بھی جب تک جیئے ملک و قوم کی خدمت کرتے رہے۔ مجھ کو اس آرٹیکل میں صرف مولوی مشتاق حسین صاحب مرحوم کے وہ حالات لکھنے مقصود ہیں

جو حیدر آباد کے زمانہ قیام سے متعلق ہیں۔ حیدر آباد کی ریاست میں ہمیشہ سے خاطر، مروت پاسداری، اور سفارش ہی کا بول بالا رہا ہے۔ اور کچھ وہی لوگ وہاں بن گئے جو پالیسی برتتے تھے ورنہ جس شخص نے ایک قدم بھی اس احاطہ سے باہر رکھا وہ خود خطرے میں پڑا۔ نواب صاحب مرحوم ہی ایک ایسے شخص تھے جنھوں نے اوکھلی میں سر دیدیا اور حیدر آباد کی پولیٹکل ہسٹری میں ایک نیا ورق کھولا۔ نواب صاحب مختلف حیثیتوں سے حیدر آباد میں رہے اور ایک دفعہ درمیان میں ملازمت سے قطع[1] تعلق کر کے چلے بھی آئے مگر یہ پھر دوبارہ بلائے گئے اور اس دفعہ وہ پوری آزادی اور بڑی آن وبان سے گئے ان کی سب سے زیادہ با اقتدار خدمت معتمد مال گزاری یعنی ریونیو سکرٹری کی تھی جس طرح سر سالار جنگ کی مدار المہامی نواب اکبر جنگ کی کوتوالی ڈاکٹر لاری کی طبابت مولوی مہدی علی کا عالم گیر تسلط مشہور ہے ویسی ہی نواب صاحب کی معتمدی کی بھی دھاک رہی ہے ؎

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

نواب بشیر الدولہ مدار المہام وقت کے وہ نفس ناطقہ تھے اور کہنے کو معتمد مالگزاری تھے مگر در اصل چیف سکرٹری تھے یعنی ہر صیغہ میں اُن کو دخل کلی تھا اور کوئی اہم کام خواہ وہ کسی صیغہ کا ہو ان کی مشورت کے بغیر نہیں ہوتا تھا اور انھوں نے ایسی قوت اور اقتدار کے زمانے میں بھی کبھی خود غرضی کو دخل نہیں دیا بلکہ اُن کے ہر کام میں انصاف اور راست گوئی کی جھلک تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ روز بروز ان کا اعتماد بڑھتا جاتا تھا اور دکن میں ان کا طوطی بولتا تھا، اور بالعموم (حقیقی وزیر) سمجھے جاتے تھے اور عملاً ان کا مرتبہ ریاست کے اراکین میں کسی سے درجۂ دوم پر نہ تھا۔ یوں تو سالار جنگ کے چنے ہوئے لوگ سب ہی چوٹی کی تھی ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر لیکن مولوی مشتاق حسین کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اس جامعیت کا آدمی دیکھنے

---

[1] خود قطع تعلق نہیں کیا تھا بلکہ ہیسر کیبر کی خواہش پر برخاست کر دیئے گئے تھے، اور اُن کی وفات کی بعد پھر بلائے گئے۔ (زندوی)

میں نہیں آیا یا وجہ دے کہ وہ فقیر منش، نہایت منکسر المزاج متواضع اور بے انتہا خلیق اور ہمدرد تھے لیکن پھر بھی ان کی خودداری، ان کا رعب داب، دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا جس نے وہ آن بان اور وہ شان و شوکت دیکھی ہے وہی اس کا کچھ اندازہ کر سکتا ہے۔ ان کا دربار ہر کہہ و مہ کے واسطے ہر وقت کھلا ہوا تھا۔ کسی وقت کی روک ٹوک کسی ادنیٰ سے ادنیٰ ملازم کیواسطے بھی نہ تھی ہر شخص ان تک بہ آسانی پہنچ کر اپنا درد دکھ کہہ سکتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ ان کی کوٹھی کا وسیع کمپونڈ صبح سے گیارہ بجے رات تک گاڑیوں اور اہل غرض کے ہجوم سے بھرا رہتا تھا لیکن وہ فرداً فرداً سب سے ہی ملتے تھے اور کبھی اُن کا دل اکتاتا نہ تھا۔ اکثر ملنے والوں کو وہ کمرے کے دروازے سے لیتے اور وہیں تک پہونچاتے تھے سب کی بات نہایت غور اور توجہ سے سنتے تھے اور فوراً دو ٹوک جواب ہست نیست کا دیدیتے تھے وہ کسی کو بھول کر بھی جھوٹی اُمید نہ دلاتے تھے۔ بعض ناعاقبت اندیش ان کی اس صاف گوئی سے ملول بھی ہو جاتے تھے۔ مگر "سخی سے سوم بھلا جو جلدی دے جواب"

حیدرآباد کی اُمیدواری میں لوگوں کی عمریں بسر ہو گئی ہیں۔ یہی مال گزاری عمر گزاری مشہور تھی۔ لیکن مولوی صاحب کے عہد میں "کار امروز بہ فردا مگزار" کا اُصول تھا اگرچہ وہ خلق مجسم اور بالکل ہندوستانی وضع کے سر گھٹے ملّا تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ کسی کا دل دُکھے۔ مگر پھر بھی حق بات کہنے میں مطلقاً پس و پیش نہ کرتے تھے۔ آج کل کے زمانہ میں بھلا اس پُرانی طرز کے آدمی کا کیا رعب ہو سکتا ہے مگر اللہ اکبر ان کا رعب داب کہ اُن کے سامنے جاتے کلیجا کانپ جاتا تھا اور کبھی کسی کو جھوٹی خوشامد یا غیر مستحق ادعا کرنے کی جراُت نہوتی تھی۔ ان کی "ہاں" اور "نہیں" پتھر کی لکیر تھی وہ بے جا خاطر و مروت کی آڑ میں کبھی دفع الوقتی کے طور پر کوئی بات زبان سے نکالنا اخلاقی جرم سمجھتے تھے۔ فلاں کے فلاں ہونا یا سفارش اُن کے نزدیک کچھ بھی وقعت نہ رکھتی تھی بلکہ سفارش سے اور چڑ جاتے تھے جو انصاف اور خالص انصاف ہوتا تھا وہی کرتے تھے ان کے پاس داو دہش بالکل بے کار تھی جس کا

حق ہوتا تھا اُسے گھر بیٹھے بے منت پہونچتا تھا اُن کے زمانہ میں ملازموں کے حقوق اُن کی ترقیاں کبھی سعی و سفارش خاطر مروّت سے نہیں ہوتیں بلکہ محض استحقاق اور لیاقتِ ذاتی سے۔ اُنھوں نے یہ بھی التزام رکھا تھا کہ کسی بڑے عہدے پر ایک دم کسی کو مامور نہ کرتے تھے جس سے حکام تحت کی حق تلفی اور حرمان ترقی لازم آتی تھی بلکہ چھوٹے سے چھوٹے درجہ سے سلسلہ شروع کرتے تھے اور اس طرح ایک خالی شدہ جائداد کے سلسلہ میں بعض وقت پچاس پچاس آدمیوں کو ترقی ملی ہے۔ اور اس طرح سب کی حق رسی اور اشک شوئی کرتے تھے۔ اِن کے اس بے لوث طرزِ عمل نے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال راسخ کر دیا تھا کہ اگر ہم دیانت کے ساتھ دل دہی سے اچھا کام کرینگے تو ہماری قدر ہوگی۔ خائن لوگوں نے کچھ ڈر سے اور کچھ مصلحت وقت سے اپنی طرزِ روش بدل دی اگر کسی کو باوجود گریڈ کے ترقی نہیں دیجاتی تھی تو فوراً اُسے صیغۂ راز سے اطلاع بھی دی جاتی تھی کہ تمھاری نسبت فلاں امر سدراہ ہے جب تک اس عیب کو رفع نہ کروگے ترقی سے محروم رہوگے۔ اپنے قول کے ایسے پکے تھے کہ دُنیا اِدھر کی اُدھر ہوجاے مگر اُن کا وعدہ کبھی خلاف نہیں ہوتا تھا۔ اگر احیاناً غلطی واقعات کی بنا پر کوئی غلط حکم نکل چکا ہو تو سمجھانے سے اپنے حکم کو فوراً معذرت کے ساتھ واپس بھی لے لیتے تھے۔

میں نے عموماً یہ دیکھا ہے کہ بڑے بڑے عہدہ دار بڑے بڑے عہدہ داروں کے حال سے واقف رہتے ہیں۔ کیوں کہ اُنھیں کی رسائی اُن تک ہے مگر چھوٹے چھوٹے ملازموں کی اُنھیں کچھ خبر نہیں رہتی حتیٰ کہ تحصیلدار اور پیشکار تحصیل کو بھی نہیں جانتے اور جانیں کیسے جب ان بیچاروں کے پر وہاں جاتے ہوئے جلتے ہوں۔ مگر ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ مرحوم نے کون سا ڈیڈ لیٹکو ڈپارٹمنٹ رکھا تھا کہ تحصیلدار تو ایک بڑا عہدہ دار ہے بلا مبالغہ و بلاخوف تردید میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ مفصلات کے دس دس اور بیس بیس روپے کے عملوں کے حالات سے ایسی ذاتی واقفیت تامّہ رکھتے تھے کہ ہم رات دن کے ملنے والوں کو خبر نہ تھی وہ اپنے

ماتحتوں کی پرائیوٹ لائف اور طرز روش کے سخت نگراں تھے اور اس وجہ سے بد روش اشخاص سے سخت متنفر تھے وہ اکثر خانگی معاملات میں بھی دخل دیتے تھے اور نہ صرف دخل دیتے تھے بلکہ سرکاری طور پر اثر ڈالتے تھے میں نے دیکھا ہے کہ وہ اپنے قلم خاص سے صیغہ راز میں اس طرح کہ اُن کے اور مکتوب الیہ کے سوا کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو مشفقانہ اور بزرگانہ تنبیہ کرتے تھے اور موقع دیتے تھے کہ فلاں عادت بد چھوڑی جائے اور فلاں بات کی اصلاح کر کے مجھے مطمئن کیجئے ورنہ میں سرکاری طور پر نوٹس لینے پر مجبور ہونگا۔ ایسی عام اور زبردست نگرانی اور باخبری کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں ایک ایسی دہشت بیٹھ گئی تھی کہ وہ راتوں کو چونک چونک پڑتے تھے اور ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ مشتاق حسین ہر دو میں کا تیسرا موجود ہے۔ ایسا نہ ہو کہ خبر ہو جائے تو بس شامت آئی دھری ہے۔

غریب رعایا سے انھیں ہمدردی نہیں عشق تھا دورے کے زمانہ میں سب سے پہلے وہ چماروں کی جھونپڑیوں، بڑہئی، لوہار، دھوبی معمولی سے معمولی کاشتکاروں کے مکانوں میں بہ نفس نفیس جاتے اور وہاں اُن کی ٹوٹی کھٹیا یا کمبل یا بورئیے پر بیٹھ کر گھنٹوں ان کے حالات پوچھ کر نوٹ کرتے۔ کہیں بیگار تو مفت نہیں لی گئی بنیوں پر عہدہ داروں کا ظلم تو نہیں سامان رسد کے دام برابر خوش خریدی دئیے جاتے ہیں یا حکومت کے دباؤ سے کام نکلتا ہے۔ رعایا کے ساتھ عہدہ داروں کا سلوک کیا ہے۔ جہاں کہیں شکایت ہو بس جان کو آجاتے تھے۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے کئی ملازموں کو ایسی ہی شکایت پر موقوف کر دیا۔ ایک دوم تعلقہ دار (جنٹ مجسٹریٹ) کو محض اس بات پر برخاست کیا کہ وہ رعایا کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرتے تھے اور صاف کہہ دیا کہ سرکار ایسے درندہ خصلت عہدہ داروں سے اپنی سروس کو پاک کرنا چاہتی ہیں۔ ایک سوم تعلقہ دار (ڈپٹی کلکٹر) کو دورے کے غلط اور فرضی مقامات لکھنے میں موقوف کیا ایک اہلکار کو جس کی تنخواہ صرف دس بارہ روپئے تھی سنا کہ اس نے کوئی طوائف رکھی ہے اور سواری کے لیئے ایک ٹٹوانی بھی رکھی ہے موقوف کر دیا۔ غرض سزا اور جزا

دونوں کا دروازہ کھلا ہوا تھا دورہ کے زمانے میں بڑی دیکھ بھال کرتے تھے۔ بیگار کے پیسے اپنے سامنے دلواتے تھے۔ گاؤں سے چارپائیاں منگوانے کی قطعی ممانعت کردی تھی حتیٰ کہ بنئیے بقال قصابوں کی دکانات کیمپ میں لانے کا حکم نہ تھا بلکہ ہر شخص کو بازار سے سامان خریدنے کا حکم تھا ان کا اصول اور صحیح اصول تھا کہ ؎

بہ نیم بیضہ جو سلطاں ستم روا دارد
زنند لشکریانش ہزار مرغ بہ سیخ

اگر حیدرآباد میں بڑے بڑے امرا کے صاحبزادے اور خود مرشد زادے ملازم ہیں اور بعض ان میں سے وسائل کے گھمنڈ میں بہت آزادی برتتے ہیں مگر مولوی صاحب کے زمانہ میں شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔ اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوتا تھا جس کی ہزاروں مثالیں ہیں۔ مولوی مہدی علی کا جو عروج حیدرآباد میں تھا وہ کون نہیں جانتا تمام ہندوستانی انھیں کی بدولت حیدرآباد میں ٹکڑے کے سر لگے۔ اور اس میں مولوی مشتاق حسین[1] بھی تھے مولوی مہدی علی کے چچیرے بھائی بندوبست میں ملازم تھے انھوں نے بوجہ ضعفِ بصارت سررشتہ مال میں آنا چاہا اگر مشتاق حسین کا دور نہ ہوتا تو سر آنکھوں پر بٹھا کر اُن کو لاتے لیکن یہ زمانہ ہی اور تھا اسی لحاظ سے مولوی مہدی علی نے سفارش کرنے سے انکار کردیا لیکن بیگم صاحب نے مولوی علی حسن کو بھیجا۔ مولوی مشتاق حسین نے کہا کہ بیگم صاحب قبلہ کی خدمت میں میری طرف سے بہت بہت آداب عرض کرنا اور کہنا میں ضرور آپ کی سفارش پر رفیق حسن کو مال کے صیغہ میں لے لیتا مگر کیا کروں سخت مجبور ہوں جب اُن کی بصارت میں نقص ہے اور وہ بندوبست میں کام نہیں کرسکتے تو مال میں کیا کرینگے صیغۂ مال کوئی اندھوں کا محکمہ نہیں ہے۔ مولوی علی حسن صاحب بیچارے اپنا سا منہ لے کر چلتے ہوئے۔

---

[1] مولوی مشتاق حسین سرسید کی تحریک وسفارش سے حیدرآباد گئے تھے، مولوی مہدی علی خاں کا اُن کے معاملہ میں کچھ تعلق نہ تھا نہ اُس وقت مولوی مہدی علی خاں کا اس قدر اثر تھا۔ (رنلا وی)

ممکن ہے کہ بیگم صاحب کو بھی یہ رُکھائی ناپسند ہوئی ہو لیکن مولوی مشتاق حسین جیسے ایک آدمی سے یہ کب ممکن تھا کہ وہ اپنے کانشنس کے خلاف کوئی کام کرتے۔ خواہ اس میں مہدی علی کا قدم درمیان ہو یا کسی اور کا۔ خود میری نسبت ایک مرتبہ صوبہ داری (کمشنری) سے تبادلہ کی تحریک محض مولوی چراغ علی کی خاطر سے اُن کے بھائی ولایت علی صاحب کے خوش کرنے کو کی گئی اور وجہ یہ لکھی گئی کہ سنگاریڈی کی آب وہوا ناقص ہے اور بیدر کی آب وہوا بہ لحاظ عمدگی مشہور مجھے بیدر سے سنگاریڈی ولایت علی صاحب کے ساتھ بدل دیا جائے۔ مرحوم نے اس کا جواب یہ دیا کہ ولایت علی صاحب نے ایسی کیا کارگزاری کی ہے کہ وہ ایک خوش آب وہوا مقام پر بدلے جائیں۔ اور بشیر الدین احمد نے ایسا کیا قصور کیا ہے کہ وہ بے وجہ اپنے مقام سے ہٹائے جائیں سرکار کے نزدیک دونوں عہدہ دار برابر ہیں یہ ترجیح بلا مرجح کیوں۔ جب تک بشیر الدین احمد کی ترقی نہ ہو (جو عن قریب ہونے والی ہے) وہ بیدر سے ہٹائے نہیں جا سکتے۔

اسی طرح ایک تعلقہ دار صاحب (کلکٹر ضلع) اور صوبہ دار صاحب سے کسی بات پر شکر رنجی ہو گئی۔ تعلقہ دار بڑے طنطنہ کے آدمی تھے گرم دکھا نہ سرد جھٹ استعفا ہی دے گھسیٹا۔ مولوی صاحب نے تعلقہ دار کو تو یہ لکھا کہ آپ کا استعفا پہونچا اسے دیکھ کر مجھے افسوس ہوا لیکن قبل اس کے کہ میں آپ کے استعفے کو سرکار کے ملاحظہ میں پیش کروں میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ کی خدمت میں عرض کردوں کہ سرکار کو آپ کے استعفے کے منظور کرنے میں غالباً کچھ بھی تامل نہ ہوگا۔ سرکار کو بہتر سے بہتر تعلقہ دار ہر وقت مل سکتا ہے۔ لیکن آپ کو براہ مہربانی غور کر لینا چاہیئے کہ آپ کو بھی تعلقہ داری کہیں اور مل سکے گی یا نہیں اور اسی طرح صوبہ دار صاحب کو بھی چشم نمائی کی کہ تعلقہ دار ضلع کے عہدہ کی وقعت کا خیال آپ کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیئے تعلقہ دار کا عہدہ ایسا نہیں ہے کہ محض صوبہ دار کی مرضی پر وہ ہٹایا جا سکے بالادستوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں سے حسن سلوک سے پیش آئیں اور پھر لطف یہ کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں کہ کیا لکھا گیا۔ نتیجہ یہ کہ دونوں حد اعتدال پر آگئے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

میں ایک رخصت کے سلسلہ میں عارضی طور پر قایم مقام کرکے بھیجا گیا مجھے چند روز کے واسطے نقل و حرکت ضرور ناگوار ہوئی مگر کس کا حوصلہ تھا کہ چون و چرا کر سکتا سنگ آمد و سخت آمد گیا پر گیا، جا تے دیر نہوئی تھی کہ روزانہ یہ ڈرا و الگا رہتا کہ آج مستقل صاحب آتے ہیں، کل آتے ہیں - ناچار میں نے مولوی صاحب کو لکھا اُنھوں نے میرے خط ہی کی پشت پر لکھ دیا کہ آپ اطمینان سے جہاں بیٹھے ہیں بیٹھے رہیئے اور اپنا کام کیئے جائیے اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ جب عہدہ دار گھوڑے کی دُم کی طرف منھ کرکے بیٹھا کرتے تھے اور دیکھتے جاتے تھے کہ کوئی ان کے پیچھے تو نہیں آتا اور ایسا ہی ہوا کہ میں اسی جگہ مستقل ہو گیا - ایسی بیسوں مثالیں میں پیش کر سکتا ہوں - لیکن بخوف طوالت اختصار کرتا ہوں - مولوی صاحب کی نماز کی پابندی اللہ اکبر! میں نے دیکھا ہی کہ حضور نظام کی اسپیشل نماز کے وقت روک دی جاتی تھی مولوی صاحب اپنا مصلّے لیکر جب پلیٹ فارم پر نماز پڑھ لیتے تھے تو آگے بڑھتی تھی -

خلاصہ یہ کہ دکن میں اس سطوت و جبروت، اس دیانت و راستبازی اور مستقل مزاجی کا عہدہ دار دیکھنے میں نہیں آیا اور گو برسوں ان کو دکن چھوڑے ہوئے ہوئے مگر ان کا زمانہ ہر اعتبار سے اب تک ضرب المثل ہی اور مدتوں رہیگا -

جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے لکھا ہی کہ مولوی صاحب مستعفی ہو کر چلے آئے میں سمجھتا ہوں کہ شاید کچھ سہو ہوا ہو وہ مستعفی نہیں ہوئے بلکہ وہ خود پنشن کی درخواست دے کر ملازمت سے دست بردار ہوئے چنانچہ میں اس زمانہ میں وہیں تھا اور میں نے ایک عرضیہ بہ اظہار افسوس اور اپنی بے وسیلگی اور کس مپرسی لکھا تھا جس کا جواب یہ ملا کہ یہ خبر صحیح ہی کہ میں نے پنشن کی درخواست کر دی اور جہاں تک مجھ کو علم ہی وہ منظور بھی ہو جائے گی - آپ کو دل برداشتہ ہونے کی وجہ نہیں ، اگر میں نے آپ کو آپ کا حق (جو بہت افسوس ہے کہ بدیر ملا) پہونچا دیا تو یہ میرا فرضِ عین تھا میں اس کے لئے کسی شکریہ کا مستحق نہیں ہوں میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ اپنی لیاقت اور دیانت کی بدولت بہت جلد کسی ضلع کی کرسی کو رونق دینگے -

جیسا کہ آگے چل کر ہوا۔

مولوی صاحب نہایت زود قلم اور صاف صاف لکھنے والے تھے اُن کے حروف چھوٹے چھوٹے خاص روش کے تھے جس کی پوری پوری تقلید شمس العلماء نواب عزیز جنگ بہادر نے ایسی کی ہی۔ (جو مولوی صاحب کی پیشی میں کام کرتے رہے ہیں) کہ مشکل سے دونوں خطوں میں تمیز ہو سکتی ہی۔

یہ بات جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے بالکل صحیح لکھی ہی کہ وہ بڑے لکھنے والے تھے صفحہ کے صفحہ خود اپنے قلم سے لکھتے تھے۔ اور میں کہتا ہوں کہ جزو کے جزو حیدر آباد کے دفاتر ان کی ہزار ہا تجاویز احکام اور رپورٹوں سے بھرے پڑے ہیں۔ وہ لکھنے کی ایک مشین تھے۔ ان کے پیشی کے اہلکاروں کو مشکل سے اتنا وقت تھا کہ وہ اُن کے لکھے ہوئے مسودہ کو صاف کر سکیں۔

مولوی صاحب جہاں خدا کے برگزیدہ اور نیک نہاد بندے تھے ایک بات اُن میں یہ بھی نادر تھی کہ وہ ہر شخص کے خط کا جواب بہ واپسی ڈاک اپنے قلم سے دیتے تھے گو وہ مختصر ہی کیوں نہ ہو لیکن سوال کا مکمل جواب ضرور ہوتا تھا۔ یہ پابندی ایک ایسے جلیل القدر عہدہ دار کے لیے جس کے اتنی بڑی ریاست کا کل کام سپرد ہو اور جس کا ایک ایک منٹ کام میں گتھا ہوا ہو ایک ایسا مشکل کام ہی کہ جس کی نظیر ملنا محال نہیں تو مفقود المثال ضرور ہی وہ اپنے اوپر اپنی طاقت سے زیادہ بار اُٹھاتے تھے اور میرا خیال یہ ہی کہ اُنھوں نے اپنے اوپر کام کا اس قدر بوجھ لاد لیا کہ ایسا انہماک اُن کی تندرستی کے لیے ہارج و مخل تھا اور قوم کے کام پر اُنھوں نے اپنی جان کو قربان کر دیا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حصّۂ دوم

ملکی و قومی خدمات

نواب وقار الملک کی قومی خدمات کا آغاز اُس وقت سے ہوا جب کہ اُن کی عمر ۲۰ سال کی تھی، اور جب تک اُن کی صحت کام کرنے کے لائق رہی یہ سلسلہ جاری رہا، گویا وہ مُسلسل ۵۵ سال تک قومی و مُلکی خدمات میں مصروف رہے، یہاں تک کہ سنّی سالہ سرکاری ملازمت کے زمانہ میں بھی جب کہ ہر طرف سے کام کا ہجوم تھا وہ پوری توجہ و انہماک کے ساتھ بقدر طاقت و استطاعت قومی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ اُن کی قومی خدمات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہی کہ اُنھوں نے جو کچھ کیا وہ خلوص اور صحیح اسلامی اثر پر مبنی تھا، نمایش، ترفع، اور حبِ جاہ کا کسی کام میں شائبہ تک نہ تھا، نہ کسی صلہ یا معاوضہ کی تمنّا تھی۔

قومی معاملات کے متعلق اُن کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ کسی شخص یا جماعت کی کورانہ تقلید نہیں کرتے تھے، بلکہ ہر معاملہ پر بجائے خود کامل غور کرنے کے بعد ایک رائے قایم کرتے تھے اور جب ایک دفعہ رائے قایم کر لیتے تھے تو پوری مضبوطی سے اُس پر قایم رہتے تھے کسی بڑے سے بڑے انسان کی شخصیت کا اثر اُن کو رائے تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا، تاوقتیکہ واقعات وحالات میں خود اس قدر تغیر ہو جائے کہ وہ اپنی رائے تبدیل کر دیں، لیکن ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ عموماً اُن کی رائے معاملات کے متعلق نہایت صائب ہوتی تھی اور اس میں بہت کم تبدیلی کی نوبت آتی تھی، تاہم وہ دوسروں کی رائے کو نہایت تحمل سے سنتے تھے اور اگر اُن کی رائے یا کام پر نکتہ چینی کی جائے تو ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرتے، چیں بجبیں ہونا یا مشتعل ہو جانا گویا وہ جانتے ہی نہیں تھے۔

اظہار رائے میں بلکہ جملہ معاملات میں وہ مصالح کا بھی لحاظ رکھتے تھے، لیکن صرف اس حد تک جو دیانت کے خلاف نہ ہو۔ مغربی ڈپلومیسی سے اگرچہ وہ ناآشنا نہ تھے لیکن اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اُن کے نزدیک بہترین طریق عمل وہ تھا جو صداقت پر مبنی ہو، خواہ بظاہر اُس کے نتایج خطرناک ہی کیوں نہ ہوں اس لیئے اُن کی پالیسی ہمیشہ ضمیر کے تابع رہتی تھی نہ کہ ضمیر پالیسی کے تابع۔

اُن کو پوری قوت اور توجہ سے قومی خدمات میں اُس وقت مشغول ہونا پڑا جب کہ اُن کے قویٰ مضمحل ہو چکے تھے اور پچاس سال کی طویل اور پُرمشقت زندگی کے بعد وہ درحقیقت آرام کے مستحق تھے۔ تاہم اُنھوں نے اپنے فرایض خدمات کو نہایت محنت وہمت اور پورے جوش و دلولے کے ساتھ انجام دیا، اور جب تک صحت نے بالکل جواب نہیں دے دیا کام سے دست کش نہ ہوئے۔

اب ہم کسی قدر تفصیل سے اُن کی ہر قسم کی خدمات کو علیحدہ علیحدہ بیان کرتے ہیں:۔

علمی و تعلیمی خدمات

مولوی مشتاق حسین ۲۰ سال کے نوجوان تھے جب کہ مراد آباد میں سرسید سے اُن کی ملاقات ہوئی، اور وہ اُن کی شخصیت اور قومی خیالات سے متاثر ہوئے اور قومی خدمت کا شوق اُن کے دل میں پیدا ہوا۔ اس ملاقات کے چند سال بعد جب وہ سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں علی گڑھ تبدیل ہو کر آئے تو سرسید کی صحبت اور خیالات سے اُن کو مستفید ہونے کا زیادہ موقع ملا، اور اُن کے کام میں شرکت کی رغبت پیدا ہوئی۔

سائنٹفک سوسائٹی میں شرکت

چنانچہ سب سے پہلے سرسید کے جس قومی کام میں اُن کو شرکت کا موقع ملا وہ سوسائٹی کا کام تھا۔ ۱۲ جنوری ۱۸۶۶ء کو وہ سوسائٹی کے رفیق اور ۱۲ فروری ۱۸۶۷ء کو معاون مقرر ہوئے۔ اُن کی شرکت محض اعزازی یا رسمی نہ تھی بلکہ فرائض ملازمت ادا کرنے کے بعد جس قدر وقت بچتا تھا اس کا اکثر حصہ وہ سوسائٹی کے کام میں صرف کرتے اور ایک تنخواہ یاب ملازم کی طرح کام کرتے تھے۔ اُن کا زیادہ وقت تہذیب الاخلاق انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور پریس کے کام میں صرف ہوتا تھا، اور اُن کی محنت کی وجہ سے سرسید کا بوجھ بہت کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔

ایک کتاب کا ترجمہ

اسی زمانہ میں جب کہ وہ علی گڑھ تبدیل ہو کر آ گئے تھے، اور سوسائٹی کا کام کرتے تھے، اُنھوں نے ایک انگریزی کتاب "فرنچ ریوولوشن اینڈ نپولین" کو اُردو میں منتقل کرنا چاہا، چنانچہ اپنے دو دوستوں، منشی گلزاری لال اہلکار دفتر ڈپٹی انسپکٹر مدارس اور بابو

۱؎ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی فرماتے ہیں کہ "قحط کا انتظام سید احمد خاں بہادر کے سپرد تھا، منشی مشتاق حسین محرر تھے، اُس وقت ایک دوسرے سے ملا۔ یہ واقعہ خود نواب وقار الملک مرحوم نے مجھ سے بیان کیا تھا۔"

گنگا پرشاد، سرشتہ دار انگریزی عدالت ججی کی مدد سے کام شروع کر دیا۔ یہ کام اکثر گرم راتوں میں ۹ اور ۱۱ بجے کے مابین ہوتا تھا۔ یہ دونوں صاحب لفظی ترجمہ بتاتے۔ اور مولوی مشتاق حسین اس کو سلیس عبارت میں اپنے الفاظ میں لکھتے، اس طریقہ سے یہ ترجمہ تین مہینہ میں ختم ہوا، اور ۱۸۷۱ء میں نول کشور پریس لکھنؤ سے سرگزشت نپولین بوناپارٹ کے نام سے شایع ہوا اور اس کے بعد بھی بار بار چھپتا رہا۔ گورنمنٹ ممالک مغربی و شمالی نے اس کتاب کو پسند کر کے اکتوبر ۱۸۷۳ء میں مترجمین کو سو روپیہ انعام عطا کیا۔

کتاب کے دیباچہ میں اُنھوں نے ظاہر کیا ہے کہ اس کا مطالعہ ہر شخص کے لیئے مفید اور عبرت و بصیرت کا باعث ہے۔ نیز یہ کہ :-

"یہ بات بھی اس کتاب سے بہت اچھی طرح ثابت ہوتی ہے کہ ماؤں کے تعلیم یافتہ ہونے سے اولاد کی تعلیم بہت خوبی اور آسانی سے ہو سکتی ہے"

کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان کا انعامی رسالہ

انگلستان سے واپس آ کر ۱۸۷۰ء میں سر سید نے بنارس میں ایک کمیٹی قایم کی جس کا نام "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" تھا۔ اس کمیٹی کا مقصد یہ تھا کہ وہ :-

"جہاں تک ہو سکے اس بات کے دریافت کرنے میں کوشش کرے کہ سرکاری

۱؎ مولوی سید معین الدین صاحب شاہجہاں پوری نے "نپولین اعظم" کے نام سے جو ضخیم کتاب پانچ جلدوں میں "جوزیف ایبٹ" کی انگریزی کتاب "لائف آف نپولین" سے اردو میں ترجمہ کی ہے، وہ قطعی طور پر مولوی مشتاق حسین صاحب کی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے۔ ترجمہ کے زمانہ میں وہ مسلسل طور پر مترجم کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، ورنہ اس کام کا سرانجام مشکل تھا، مترجم نے دیباچہ میں نواب صاحب کا ایک خط بھی شائع کیا ہے۔ سید معین الدین صاحب کی دوسری کتاب "اورنگ زیب" بھی نواب صاحب کی بدولت ترجمہ ہوئی، اور اُن ہی کے نام مصنف نے اس ترجمہ کو معنون کیا ہے۔"

(بقیہ حاشیہ)

کالجوں اور اسکولوں میں مسلمان طالب علم کس لیے کم پڑھتے ہیں۔ علوم قدیمہ انہیں
کیوں گھٹ گئے، اور علوم جدیدہ کیوں نہیں رواج پاتے۔ اور جب یہ تمام موانع
ٹھیک ٹھیک دریافت ہو جائیں تو ان کے رفع کرنے کی تدبیریں دریافت کرے
اور ان تدبیروں پر عملدرآمد کرنے میں کوشش کرے۔"[1]

غرض اس کمیٹی کی طرف سے ایک انعامی اشتہار شائع کیا گیا، تین انعام ۵۰۰۔
۳۰۰ اور ۱۵۰ کے تجویز کیے گئے، اور لوگوں کو ترغیب دی گئی کہ مسلمانوں کے موانع تعلیم
پر بحث کر کے اُن کے رفع کرنے کی تدبیر بتائیں۔ میعاد معینہ کے اندر ۳۲ مضامین سرسید کو موصول
ہوئے، ان میں ایک رسالہ مولوی مشتاق حسین کا بھی تھا، جو دوسرے نمبر پر قرار دیا
گیا اور اُن کو تین سو روپیہ انعام ملا۔

اس رسالہ کا اصلی مسودہ جو خود مولوی مشتاق حسین کے ہاتھ کا خفی قلم سے لکھا ہوا
ہمارے سامنے موجود ہے ۴۸ صفحے کا ہے، جس کو انھوں نے ۱۴ اگست ۱۸۷۱ء کو لکھنا شروع
کیا اور ۳۰ اگست کو مکمل کر لیا، یہ رسالہ چار حصص اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔

(۱) پہلے حصہ میں گورنمنٹ اسکولوں اور کالجوں کے متعلق مسلمانوں کے نقطہ نظر سے
بحث کی ہے، اور یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں کے بچے کیوں ان درس گاہوں میں کافی تعداد میں
داخل ہو کر فائدہ حاصل نہیں کرتے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے متعدد واقعات بیان کر کے بہت سے
جزئیات پر بحث کی ہے۔

(۲) دوسرے حصہ میں تحصیلی اور حلقہ بندی مکتبوں پر بحث کی ہے، اور اسی سلسلہ میں
مروجہ نصاب پر نہایت معقولیت سے نکتہ چینی کی ہے۔

(۳) تیسرے حصہ میں اس امر پر بحث کی ہے کہ علوم قدیمہ کی تعلیم مسلمانوں میں کیوں
گھٹ گئی ہے۔ اس حصہ کو انھوں نے نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ علوم قدیمہ کی تعلیم پر تاریخی

---

[1] حیاتِ جاوید طبع سوم ص ۱۱۶

بحث کرنے کے علاوہ، مروجہ علوم اُن کے طریقہ تعلیم اور نقائص پر بڑی خوبی سے بحث کی ہے، یہ حصہ تمام وکمال پڑھنے کے لایق ہے۔

(۴) چوتھے حصّہ میں اس امر پر بحث کی ہے کہ علوم جدیدہ نے مسلمانوں میں رواج کیوں نہیں پایا، انھوں نے تمام اسباب پر تفصیلی بحث کی ہے اور جو کچھ لکھا ہے نہایت دلچسپ اور شگفتہ طریقے سے لکھا ہے۔

"خاتمہ" میں انھوں نے ایک مسلسل و مفید بحث اس مسئلہ پر کی ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم کس طریقہ سے اور کن اصول پر ہونا چاہیئے یہ بحث نہایت ضروری اور اکثر مدارج تعلیم پر حاوی ہے، اور جو تجویزیں انھوں نے پیش کی ہیں وہ عملی حیثیت سے نہایت مفید ہیں۔

غرض پورا رسالہ پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ ہر چند صرف ۱۰ روز کی محنت کا نتیجہ ہے لیکن وہ اس پر پہلے سے کافی غور وفکر کر چکے تھے، اور تعلیمی تحریک میں سرسید کے ساتھ اُن کی شرکت محض رسمی نہ تھی۔ سرسید نے اس رسالہ پر مفصل ریویو بھی کیا ہے۔ سرسید نے یہ تمام مضامین بصورت کتاب چھاپکر شائع کئے تھے۔

مجلس خزینۃ البضاعت کی رکنیت

جب یہ طے پاگیا کہ ایک اسلامی دار العلوم قایم کیا جائے تو سرسید نے ایک کمیٹی اس غرض سے قایم کی کہ اس مقصد کے لئے جابجا چندہ جمع کرے، اس کا نام "مجلس خزینۃ البضاعت لتاسیس مدرسۃ المسلمین" تھا۔ سرسید نے مولوی مشتاق حسین کو بھی ممبر مقرر کیا اور ۱۴ شعبان ۱۲۸۹ھ کو ممبری کی باقاعدہ سند اُن کو عطا کی۔ مولوی مشتاق حسین نے بحیثیت ایک ممبر کے پوری توجہ سے کمیٹی کا کام کیا، علی گڑھ کے علاوہ گورکھپور اور اعظم گڑھ وغیرہ اضلاع میں بھی اس کام کے لئے گئے۔

مقام دار العلوم کا انتخاب

مدرسہ کے قیام کا فیصلہ ہو جانے کے بعد یہ بحث پیش آئی کہ

یہ مدرسہ کس شہر میں قایم کیا جائے۔ لوگ مختلف الرائے تھے، مولوی مشتاق حسین نے بھی اِس بحث کے متعلق ایک مفصل خط سر سید کو لکھ کر یہ خواہش کی کہ اس کو اخبار میں شائع کر دیا جائے اور دوسرے لوگوں کے خیالات بھی اسی طرح شائع کیئے جائیں تاکہ لوگوں کو صحیح رائے قایم کرنے کا موقع ملے۔

اُنھوں نے قرب وجوار کے مختلف شہروں کی عام حالت پر بحث کر کے علی گڑھ کو ترجیح دی اور مختلف دلائل اس کے متعلق پیش کیئے، اگرچہ یہ سب دلائل زیادہ مضبوط نہیں ہیں لیکن اُس وقت کے حالات اور سر سید کے رجحان طبع کے لحاظ سے یہی مناسب تھا جو اُنھوں نے تجویز کیا۔

کمیٹی اشاعتِ تعلیم کی خدمت

اسی زمانہ میں انھوں نے اشاعت تعلیم کے متعلق ایک اور مفید خدمت انجام دی جیسا کہ وہ خود تعلیمی کمیشن میں شہادت دیتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں بیان کرتے ہیں:

"۱۸۶۶ء میں جب کہ ہمارے اضلاع میں تعلیم کی کمیٹیاں قایم ہوئیں تو میں ضلع علی گڑھ کی کمیٹی کا ایک ممبر مقرر ہوا، اور کچھ عرصہ کے بعد مجکو بطور ایک سکرٹری یا اسسٹنٹ سکرٹری کے اس میں کام کرنا پڑا۔ اس عرصہ میں میں نے سرکاری اور خانگی مکاتب کو کافی غور کے ساتھ مختلف اوقات میں اور متعدد موقعوں پر ملاحظہ کیا ہے، میں بہت سے دیہات میں خاص اسی مطلب سے گیا ہوں، اور دیہات میں جو سرکاری اور خانگی مکاتب ہیں، اُن کو معائنہ کیا ہے، میرے معائنہ مدارس کی تعداد کم وبیش غالبًا ایک سَو کے قریب ہوگی۔

کمیٹی کے اجلاسوں میں ہمیشہ مجھ کو اس تعلیم پر غور و بحث کرنے کا موقع ملا ہے جو ضلع علی گڑھ میں سرکاری یا دیسی طریقہ پر جاری تھی، ۱۸۶۸ء کی کارروائی

کے لحاظ سے لوکل گورنمنٹ نے میرا خاص شکریہ جو گزٹ میں مشتہر ہوا ہے اس مطلب سے ادا کیا کہ تمام ضلع میں ہمیں نے سب سے زیادہ تعلیم کے کاروبار میں اپنا شوق ظاہر کیا تھا۔"

مسٹر بیرکالے جج نے بھی اُن کی خدمات کا ان الفاظ میں اعتراف کیا کہ :۔

" نیٹو ارا کین اور خصوصًا جائنٹ سکریٹری مشتاق حسین منصرم عدالت خفیفہ کوئل نے کام پر خاص توجہ کی اور اپنے وقت کا اچھا خاصہ حصہ اس پر صرف کیا۔"

سرسید کا اعتراف

اگرچہ اس زمانہ میں متعدد با اثر اصحاب سرسید کی تعلیمی تحریک کے حامی تھے، لیکن جو لوگ حقیقی طور پر اُن کے دست و بازو کا کام دیتے تھے وہ مولوی مہدی علیخان اور مولوی مشتاق حسین تھے، جو اپنے وقت روپیہ، اور قابلیت سے اُن کی تحریک کو پورا فائدہ پہونچاتے تھے، دوسری طرف پبلک میں مخالفت کا طوفان برپا تھا اور سرسید پر زبردست حملے کیئے جاتے تھے، اور اُن کے ساتھ اُن کے دوست بھی بدنام کیئے جاتے تھے، اسی زمانہ میں سرسید نے یکم محرم سنہ ۱۲۹۰ھ (مطابق ۱۸۷۳ء) کے تہذیب الاخلاق میں ایک مضمون "حالِ خود دیارانِ خود" کے عنوان سے شائع کیا، جس میں لکھتے ہیں :۔

" اب ہمارے محبوب مہدی علی خاں اور ہمارے عزیز مشتاق حسین کا حال سُنو، یہ ہمارے دونوں دوست ایسے ہیں جن کا حال کچھ چھپا نہیں ہے، مولوی مہدی علی کا علم اس کی ذاتی خوبیاں اُس کی پیاری پیاری باتیں، اُس کی سچی ایمان داری، اُس کی فصیح تقریر اس قابل ہیں کہ اگر ہماری قوم کے دل کی آنکھیں اندھی نہ ہوتیں تو اُس کے نام پر فخر کیا کرتے، منشی مشتاق کی ذاتی نیکی اور نہایت سخت دینداری بے ریا عبادت، سچی خدا پرستی، غایت تشدد سے نماز روزہ، اور احکام شریعت کی پابندی جو درحقیقت بے مثل ہے، اس لایق تھی کہ اگر ہماری قوم پر خدا کی خفگی

نہ ہوتی تو اس سے مسلمانی کو فخر سمجھتے، مگر خدا نے ایسا اپنا غضب ہماری قوم پر نازل کیا ہے کہ ایک رائے، یا ایک مسئلہ، یا ایک آبائی رسم و رواج کے اختلاف کے سبب ایک کو نہایت حقارت سے حواری، جس سے اشارہ عیسائی کا رکھا ہے، اور دوسرے کو ملحد کا خطاب دیا ہے، کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذباً ۰

مگر ہمارے ان دونوں دوستوں کو خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ اُن کو بعوض سچائی اور دینداری کے یہ خطاب اپنی قوم سے ملے ہیں، جن کی وہ بہتری چاہتے ہیں ؎

نیک باشی و بدت گوید خلق
بہ کہ بد باشی و نیکت گویند"

غرض اوائل ۱۸۷۵ء تک وہ پورے عزم سے سرسید کے ساتھ کام کرتے رہے، اس کے بعد اُن کی تحریک سے حیدر آباد چلے گئے، لیکن وہاں سے بھی بحیثیت ایک ممبر کے تمام معاملات کے متعلق پابندی سے اپنی رائے بھیجتے تھے، اور بقدر استطاعت ہر فنڈ میں چندہ بھی دیتے تھے۔

بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی

۱۸ سال کے بعد جب وہ پہلی دفعہ امیر کبیر کی مخالفت کی وجہ سے حیدرآباد سے علیحدہ ہوئے، تو اُن کو پھر قومی خدمت کے لیے کسی قدر فرصت ہاتھ آگئی اس زمانہ میں کالج کے بورڈنگ ہاؤس کی حالت قابل اطمینان نہیں تھی لہٰذا انتظام اور نگرانی کے لیے ایک ایسے پختہ کار شخص کی ضرورت تھی، جو مضبوط ارادہ کے ساتھ کام کر سکے اس بنا پر سرسید کی تحریک اور مینجنگ کمیٹی کی تجویز سے یہ قرار پایا کہ :-

"جناب مولوی مشتاق حسین صاحب ممبر کمیٹی خزنیۃ البضاعت و ممبر مینجنگ کمیٹی مدرسۃ العلوم خاص بورڈنگ ہاؤس میں سکونت اختیار کریں، اور بورڈروں کے ساتھ بورڈنگ روم ہی میں کھانا کھایا کریں۔"

اس تجویز کے بعد سرسید نے بورڈنگ ہاؤس میں یہ اطلاع بھیجی کہ :-

"تمام بورڈروں کو یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ مولوی محمد مشتاق حسین صاحب ایک رکن یعنی ممبر اعلیٰ منیجنگ کمیٹی کے ہیں، اور تمام اختیارات سزا و اخراج طالب علم کے بورڈنگ ہاؤس میں سے جو قواعد بورڈنگ ہاؤس میں مندرج ہیں اور جو کمیٹی کو یا سکرٹری کو حاصل ہیں اُن سب کی تعمیل و اجرار کا اُن کو اختیار کامل حاصل ہے، پس ان تمام سزاؤں کے دینے اور انتظامات کے کرنے کے مجاز و مختار ہیں جو قواعد بورڈنگ ہاؤس میں مندرج ہیں۔"

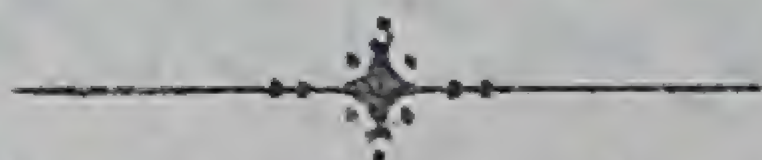
غرض جولائی ۱۸۷۹ء سے انھوں نے بورڈنگ کا انتظام شروع کیا اور کم و بیش تین سال تک جب کہ وہ دوبارہ حیدر آباد گئے برابر اس کام میں مصروف رہے۔ اس زمانہ میں اُنھوں نے جو جدید و دلچسپ انتظامات کیے[1] اس زمانہ طلبہ کو آج تک یاد ہیں۔

اِس انتظام کے سلسلہ میں کبھی کبھی سرسید سے اُن کا اختلاف بھی ہو جاتا تھا، اور ایسی صورت میں وہ نہایت آزادی سے اپنی رائے پر اصرار کرتے تھے، چنانچہ ایک دفعہ کسی رئیس زادہ سے جو بورڈر تھا ایک سخت قصور سرزد ہوا، جس کی سزا یہ دی گئی کہ اُس کو چند وقت تک نہایت ذلت سے دوسرے بورڈروں سے علیحدہ اور دور بٹھا کر کھانا دیا گیا اور جرمانہ بھی کیا گیا، لیکن سرسید نے اس سزا کو بالکل ناکافی سمجھا اور اس بات پر اصرار کیا کہ اس طالب علم کو جسمانی سزا دی جائے اور ذلیل کر کے بورڈنگ ہاؤس اور مدرسے سے خارج کیا جائے۔ لیکن مولوی مشتاق حسین نے اس کو منظور نہیں کیا اور سرسید کو لکھا کہ :-

"رئیس زادوں کے نالائق ہونے اور پاجیانہ خصلت رکھنے میں کیا شبہ ہے اگر وہ اشرافانہ خصلت رکھتے ہوتے تو پھر رونا ہی کیا تھا مگر ہم کو جو کام سپرد ہے

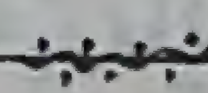
[1] بورڈنگ کی نگرانی کے زمانہ میں مولوی مشتاق حسین صاحب کا جو طرزِ عمل تھا وہ اس کتاب کے اخلاقی حصہ میں بیان کیا جائے گا۔ (ناشر)

وہ صرف یہی نہیں ہو کہ صرف اُن لوگوں کے ساتھ معاملت رکھیں جو شریفانہ خصلت رکھتے ہوں تو آپ مجکو بتایئے کہ کون سے رئیس خاندان کے لڑکے ہیں جو شریفانہ خصلت رکھتے ہیں، پس اگر آپ اپنی رائے پر اصرار کرنا چاہتے ہیں تو مدرسہ کو بند کر دیجئے، کیونکہ فی صدی دس بھی رئیسوں کے لڑکے بمشکل نکلیں گے جن کو اشراف کہہ سکتے ہوں۔"



اعترافِ خدمات

۱۸۸۰ء میں ایک بورڈنگ ہاؤس کے افتتاح کی تقریب کے موقع پر جو تقریریں کی گئیں اُن میں مولوی محمد سمیع اللہ خاں اور خواجہ محمد یوسف نے مولوی مشتاق حسین کی محنت اور حسن انتظام کی تعریف کی، اس کے بعد ۱۸۸۲ء میں تعلیم مذہبی کی ایک رپورٹ میں اُن کی عمدہ نگرانی اور انتظام کا اعتراف کر کے شکریہ ادا کیا۔



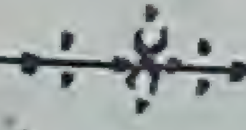
مضامین تہذیب الاخلاق

بورڈنگ کی نگرانی اور انتظام کے علاوہ سرسید کے مشہور رسالہ **تہذیب الاخلاق** کا اہتمام بھی اُن کے متعلق تھا لیکن وہ انتظامی اعانت کے علاوہ قلمی اعانت بھی کرتے تھے، چنانچہ سرسید اپنے ایک مضمون میں جو "غلط فہمی" کے عنوان سے اگست ۱۸۷۹ء کے تہذیب الاخلاق میں شایع ہوا لکھتے ہیں :-

"ہمارے دوست اپنے اپنے خیالات کے مالک ہیں وہ جو کچھ تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں وہ اُنھیں کے خیالات ہیں، ہمارے دوست مولوی مشتاق حسین خدا پناہ میں رکھے وہ کٹے صاحب اتقا ہیں کہ شاید کوئی دوسرا ہوگا۔ ہم اُن کو سر منڈے، ٹخنہ کھلے، گٹے پڑے بھائی کہتے ہیں، اور شاید ہمارے ان طعنوں کے لفظوں سے اُن کے دل میں بے انتہا محبت کا اثر پیدا ہوتا ہوگا، اور بورڈنگ ہاؤس مدرسۃ العلوم میں جس بات کا اُن کو سب سے بڑا اہتمام ہے

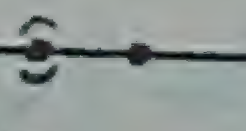
وہ یہ ہے کہ تمام طالب علم نماز جماعت میں حاضر ہوں، نماز کے بعد حاضری لیجاتی ہے، اور غیر حاضری جرم قرار پاتا ہے، اُن کے خیالات اس زمانہ کے کٹّے مسلمانوں کےسے خیالات ہیں اور شاید ہمارے ایک مسئلہ کو بھی نہیں مانتے، مگر سیاہ درون نہیں اور یہی بزرگ تہذیب الاخلاق میں سب سے زیادہ مضامین لکھتے ہیں۔"

لیکن تعجب ہے کہ تہذیب الاخلاق میں جو مضامین مولوی مشتاق حسین کے نام سے شائع ہوئے ہیں اُن کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ممکن ہے کہ بعض مضامین دوسروں کے نام سے شائع ہوئے ہوں۔



سرسید کی یادگار کی تحریک

۱۸۸۱ء میں حاجی محمد اسمٰعیل خاں رئیس دتاولی نے سرسید کی یادگار قایم کرنے کی تحریک کی اور اس مقصد پر بحث وگفتگو کرنے کے لیئے علی گڑھ میں ایک جلسہ منعقد کیا، جس میں سرسید کے اکثر احباب اور دوسرے معزز مسلمان شریک تھے، مباحثہ کے بعد یہ تجویز طے پائی کہ ایک کمیٹی یادگار کا چندہ جمع کرنے کے لیئے قایم کی جائے۔ اور مولوی مشتاق حسین اس کے سکرٹری بنائے جائیں، چنانچہ کمیٹی قایم ہوئی اور مولوی مشتاق حسین نے باقاعدہ طور پر سرگرمی سے کام شروع کیا۔ اور خود بھی دو سو روپیہ دیکر چندہ میں شرکت کی اور کمیٹی کی تمام کارروائی اور چندہ کی کیفیت انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شایع کرتے رہے۔ اس تحریک نے یہاں تک ترقی کی کہ سرسالار جنگ اعظم نے بھی ایک معقول رقم چندہ میں عطا کی۔



ٹرسٹیز بل کا معرکہ

۱۸۸۲ء میں مولوی مشتاق حسین کو سرسالار جنگ نے دوبارہ حیدرآباد بلایا، اب اگرچہ وہ علی گڑھ سے دور تھے لیکن مالی واخلاقی اعانت سے غافل نہ تھے، اور تمام معاملات کے متعلق اپنی رائیں بھی بھیجتے تھے جو عموماً طویل غور وفکر کا نتیجہ ہوتی تھیں، سرسید بھی اُن کی رائے کی وقعت کرتے اور اُن کی خدمات کا اعتراف کرتے تھے، باہمی اعتماد کی یہ کیفیت

تھی کہ سرسید جس فنڈ کے متعلق جس قدر چندہ چاہتے اُن کے نام لکھ کر اطلاع دے دیتے تھے کہ تمھارے نام پر اس قدر چندہ لکھ دیا گیا ہے روپیہ بھیجدو، اور مولوی مشتاق حسین بلا تامّل اسکی تعمیل کرتے تھے، سرسید سے زیادہ کسی کی عظمت اُن کے دل میں نہ تھی اس لیئے وہ اُن کے تمام احکام کی تعمیل اپنا فرض سمجھتے تھے، لیکن ۱۸۸۹ء میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ اُن کو سرسید سے اختلاف کرنا پڑا، اور اختلاف بھی نہایت شدید۔

یہ زمانہ اُن کے لیئے نہایت کشمکش کا تھا، ایک طرف سرسید کی محبت، عظمت، دیرینہ تعلقات اور احسانات کا یہ تقاضا تھا کہ وہ سرسید کی رائے اور مرضی سے اختلاف نہ کریں، لیکن صداقت ضمیر اور آزادی رائے، اس کو مقتضی تھی کہ وہ سرسید کی شخصیت پر قومی مفاد کو ترجیح دیں، یہ درحقیقت ایک سخت امتحان کا موقع تھا جس سے عہدہ برآ ہونا مشکل تھا، اُن کے احباب اگرچہ اُن کی استقامت اور آزادی رائے سے واقف تھے تاہم کسی کو بھی یہ اُمید نہ تھی کہ وہ سرسید سے اختلاف کی جرأت کرینگے۔ لیکن جب موقع آیا تو لوگوں نے دیکھا کہ وہ فضائل اخلاق کے لحاظ سے کس بلند مقام پر ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ابتدا میں کالج کا انتظام ایک کمیٹی سے متعلق تھا جو "کالج فنڈ کمیٹی" کے نام سے قایم تھی، لیکن کاروبار کی ترقی کے ساتھ ساتھ دستور العمل میں بھی تغیر و تبدل ہوتا رہا اور مختلف اغراض کے لیئے متعدد کمیٹیاں بنائی گئیں، لیکن جب رفتہ رفتہ کاروبار نے اور ترقی کی طلبہ کی تعداد اور کالج کی جائداد میں اضافہ ہوا تو سرسید نے خیال کیا کہ اس وسیع کاروبار کا ایک معمولی کمیٹی کی نگرانی میں رہنا موزوں نہیں، لہذا اُنھوں نے مناسب سمجھا کہ مروجہ قانون کے ماتحت جدید قواعد ترتیب دے کر کالج کی جائداد کے لیئے ٹرسٹی مقرر کیئے جائیں اور ایسا مفصل دستور العمل بنایا جائے جو تمام انتظامی جزئیات پر حاوی ہو، تاکہ کالج کی بنیاد مستحکم ہو جائے، اور یہ اطمینان ہو جائے کہ جن اُصول پر کالج قایم کیا گیا ہے آیندہ بھی انہی اُصول پر قایم رہیگا۔

غرض ۱۸۸۹ء میں سرسید نے یہ دستور العمل شائع کیا، اور اُس کی کاپیاں تمام ممبرون

کے پاس بغرض حصول آراء بھیجی گئیں، مولوی محمد سمیع اللہ خاں بہادر سی، ایم، جی نے جو ابتدا سے سرسید کے شریک کار و مددگار تھے، اس مسوّدہ کی بعض دفعات سے اختلاف کیا، خصوصاً اس دفعہ سے کہ سید محمود جائنٹ سکرٹری مقرر کئے جائیں، اور سرسید کے بعد لائف آنریری سکرٹری مقرر ہوں، چند اور سربرآوردہ ٹرسٹی بھی اس اختلاف میں شریک ہو گئے، اور اختلاف نے بڑھکر مخالفت کی صورت اختیار کر لی، فریقین کی طرف سے نہایت شر انگیز مضامین اور رسالے شائع ہوئے، اور تمام ملک میں ایک طوفان برپا ہو گیا، سرسید نے بھی غصہ اور جوش کی حالت میں اپنے مخالفین پر حملہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور جو کچھ اُن سے بن پڑا وہ کیا۔

مولوی مشتاق حسین کا اختلاف

مولوی **مشتاق حسین** بھی اس معاملہ میں سرسید سے مختلف الرائے تھے، لیکن از راہِ ادب کھلم کھلا اختلاف کرنا پسند نہیں کرتے تھے اس لیے ابتدا میں اُنھوں نے پرائیوٹ طور پر یہ کوشش کی کہ سرسید بالفعل مسئلہ جانشینی کو ملتوی کر دیں، اور اس کا فیصلہ آیندہ زمانہ میں قوم پر چھوڑ دیں، وہ اُن کی وفات کے بعد جس کو مناسب سمجھیگی مقرر کر دیگی، لیکن سرسید اس زمانہ میں مخالفین کے طرزِ عمل سے مشتعل ہو رہے تھے اُن پر کسی تحریر کا کچھ اثر نہ ہوا، اُنھوں نے مولوی مشتاق حسین کو جواب دیا کہ :-

"سب سے اوّل مجکو یہ بات صاف صاف کہدینی چاہیئے کہ جانشینی کا معاملہ اب اس حد سے گزر گیا ہے کہ اس میں ترمیم ہو سکے، اب وہ ملتوی نہیں رہ سکتا یا اِدہر ہو گا یا اُدہر، آپ اُس سے اختلاف کریں مجھ کو بلاشبہ افسوس ہو گا، مگر آپ کی نسبت اور کوئی خیال بجز اس کے کہ آپ کی یہی رائے تھی میں ہرگز نہیں کر سکنے کا اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ جب ووٹ گنے جاوینگے، آپ کا ووٹ بھی مخالف جانب رکھ دیا جاویگا۔

ذرا مجکو یہ بات سمجھا تو دو کہ **سید محمود** کا تقرر خواہ ضروری تھا یا نہ تھا یا قبل از وقت تھا، مولوی **سمیع اللہ** خاں صاحب کو اس قدر شورش کرنیکی

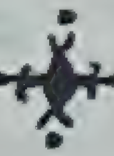
کیا وجہ ہے؟ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے جو کچھ نسبت سید محمود کے لکھا، بلاشبہ آپکے دل کو تکلیف ہوئی ہوگی جیسا کہ آپنے لکھا ہے، مگر اب کیا آپ اس کو قبول کرینگے کہ عملی طور پر اُن کی تحریر کی تصدیق کریں۔

یورپین اسٹاف کی نسبت اُن کی طمانیت کے لیئے جو آپ قواعد بنانا چاہتے ہیں سید محمود کا تقرر اُن کے مانع نہیں ہے، مع ہذا قواعد سے کام نہیں چلتا، کام آپس کے سلوک سے چلتا ہے، قواعد حقوق کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ روزمرہ کا کام نہیں چلا سکتے، قواعد جو بنائے گئے ہیں اُس میں پرنسپل کو کوئی ایسے اختیارات نہیں دیئے گئے ہیں جن کی نسبت مولوی سمیع اللہ خاں لکھتے ہیں کہ کون ممبر ہے جو اس بات کو پسند کریگا کہ بورڈنگ ہاؤس ایک عیسائی کے ہاتھ میں رہے، مولوی سمیع اللہ خاں کا ایک ایک لفظ شرارت اور خبث طینت سے بھرا ہوا ہے، میں اُن کا ذکر کرنا یا اُن کی نسبت کچھ لکھنا نہیں چاہتا، لیکن اگر آپ کا یہ خیال ہو کہ کسی طرح مسئلہ جانشینی سید محمود کو چھوڑ دیا جائے تو اس خیال کو دور کر دیجئے۔ اگر ووٹ کثرت سے برخلاف اس کے فرض کرو ہوں تو میں مدرسہ کو چھوڑ دونگا، ایک کام کیا تھا نہ چل سکا۔

آپ کا یہ خیال کہ آپ رخصت لیکر آئیں اور کچھ اصلاح کریں بالکل غلط خیال ہے، میں نے مولوی سمیع اللہ خاں کے ساتھ وہ برتاؤ کیا کہ شاید کوئی شخص جسمیں ذرا بھی نفسِ انسانی ہو نہیں کر سکتا۔ لیکن اب مجھ سے نہیں ہو سکتا اگر کسی مجلس میں وہ اور میں جمع ہو جاوینگے تو آپ سن لینگے کہ وہ معاملات پیش آئے جو یا جی سے یا جی اور شہدوں سے شہدوں میں بھی نہیں ہوتے، اور کیا عجب ہے کہ دونوں فوجداری کی حوالات میں تشریف لیجاویں۔

میں قبول کرونگا کہ تمام نالائقی میری ہے، بہتر، میں ہی نالائق، یا جی، جو کچھ

کہو، سو سہی، آپ کو میری طبیعت کا حال معلوم ہو گیا ہو گا، بس آپ کو اگر مسودہ مرتبہ کو بجنسہ منظور کرنا ہی کیجئے، نہ منظور کرنا ہی نہ کیجئے، زیادہ تحریر سے مجھے رنج پہنچانا ضرور نہیں، اس وقت میرا دل نہیں چاہتا کہ نسبت چندہ آسمانِ منزل کے آپ کی تحریر کا جواب لکھوں پھر کسی وقت اُس کی نسبت لکھونگا۔"



اِس خط کے بعد بھی سلسلۂ مراسلت جاری رہا اور مولوی مشتاق حسین نے پوری کوشش کی کہ سرسید اس ارادہ سے باز آئیں، مگر وہ سید محمود کے تقرر کو کالج کے لیے مفید سمجھتے تھے اور پرنسپل بلکہ تمام یورپین اسٹاف اُن کا ہم خیال تھا، اور مولوی سمیع اللہ خاں کی دل آزار مخالفت نے اُن کو برہم و آشفتہ کر دیا تھا اِس لیئے وہ اپنی رائے تبدیل کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ اِسی زمانہ میں مولوی مشتاق حسین نے مسٹر بک پرنسپل سے بھی مفصل خط و کتابت کی، مگر وہ بھی بے سود ثابت ہوئی، لیکن مولوی مشتاق حسین چونکہ دیانتہً سرسید کی اس رائے سے اختلاف رکھتے تھے، اس لئے جب وہ پرائیوٹ طور پر اس معاملہ کے سلجھانے میں ناکامیاب رہے تو اُنھوں نے ایک پمفلٹ شایع کیا، یہ پہلا موقع تھا کہ سرسید سے پبلک طور پر اُن کو اختلاف کرنا پڑا۔

پمفلٹ کے چند فقرے اس موقع پر نقل کیئے جاتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:۔

(۱) سید صاحب یہ تو قبول کرینگے کہ جو محبت اور فکر اُن کو اپنی قوم کی نسبت ہے، اُس سے بہت زیادہ محبت اور فکر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کی تھی، سید صاحب کے سامنے صرف ایک کالج کا انتظام ہے، اور آنحضرت صلعم کے سامنے اس قدر بڑے مذہب کا انتظام تھا لیکن میں اسی عقیدہ اہلِ سنت و الجماعت کے ساتھ جو میرا اور سید صاحب کا یکساں ہے، اُنکی متوجہ اس باب میں چاہتا ہوں کہ آخر نبیؐ نے کیا کیا، یہی کیا کہ خلافت کا مسئلہ اُمت ہی پر چھوڑا، اور خدا جو ایسے جمہوری کام میں ایسی ولی عہدیوں کے نتیجہ سے بخوبی واقف تھا، اُس نے بھی کوئی وحی نبیؐ کو اس باب میں نہیں بھیجی کہ اپنے جانشین کا معاملہ نبیؐ کو اپنے سامنے

طے کرنا چاہیئے ۔

(۲) یہ فقرہ جو اب میں لکھتا ہوں کبھی بھی نہ لکھتا اگر مجکو خوف نہوتا کہ میرے دلائل جو میں اوپر بیان کرتا ہوں صرف اسی قدر کہنے سے غلط ثابت ہو جائیں کہ سید صاحب نے بھی خلافت کے اس مسئلہ کو اُمت ہی پر چھوڑا ہی جس کو اُنھوں نے اس کے تصفیہ کے لئے کالج کمیٹی کے ممبروں کے سامنے رکھ دیا اور یہ کہہ دیا کہ اخیر تصفیہ ممبروں کی کثرت رائے پر منحصر ہے، مگر یہ عذر صحیح نہوگا سید صاحب نے کم از کم اس قدر کوشش تو ضرور کی ہی کہ یہ مسئلہ اُن کے سامنے ہی طے ہو جائے حالانکہ اس قدر بھی اُن کے اعلیٰ درجہ کے مناسب نہ تھا کہ جس کی ہم سب لوگ ابتدا سے قدر کرتے چلے آتے ہیں کیونکہ آنکھوں کی مروّت اور پیٹھ پیچھے کی بات میں بہت فرق ہوا ہو وقت یہ بات ممکن ہی کہ جو لوگ سید محمود صاحب کو سکرٹری کے عہدہ کے قابل نہ بھی سمجھتے ہوں وہ سید صاحب کی مروّت سے اقبال کرلیں، سید صاحب کے بعد یہ احتمال جاتا رہیگا، اس وقت جو فیصلہ ہو گا وہ بالکل آزادی کا فیصلہ ہو گا، جو اس شخص کے لئے بھی کہ جس کے حق میں فیصلہ ہو البتہ ایک عزت کی بات ہو گی ۔

(۳) پھر واقعات یہ ہیں کہ صرف اسی پر قناعت نہیں کی گئی کہ مروّت سے ہی کام نکل سکے بلکہ اس سے زیادہ کارروائی ہوئی ہی، میں نے بچشم خود سید صاحب کی وہ تحریر بھی دیکھی ہی، اور سید صاحب نے اُس کو مخفی بھی نہیں رکھا ہی، کوئی دقیقہ اس بات کے لئے اُٹھا نہیں رکھا گیا کہ رائے دینے والے سید محمود کے حق میں رائے دیں، رائے دینے والوں کو یہاں تک خوف دلایا گیا کہ اگر وہ سید صاحب کی تجویز سے اتفاق نہ کرینگے تو سید صاحب صرف سکرٹری کے عہدے سے ہی استعفا نہ دینگے بلکہ جو مدرسہ کے متعلق اس وقت ہوا ہی اس سب کو ملیا میٹ کر کے رکھدینگے ۔ ان تحریروں کا اثر رائے دینے والوں پر یہ تھا کہ وہ سمجھے کہ اگر ہم سید صاحب کے خلاف مزاج کوئی رائے دیتے ہیں، وہ سید صاحب کی بے انتہا ناراضی برداشت کیئے بغیر ممکن نہیں ہی ۔ پھر ان میں کوئی تھا کہ سید صاحب کی مروّت اس پر غالب نہ تھی، اور اس بات سے تو شاید

کوئی بھی خالی نہ ہوگا کہ جس کے دل میں سید صاحب کی عظمت کا ادب ملحوظ نہ ہو، اور اس قسم کا دباؤ ڈالا گیا ہو تو نتیجہ جو ہو سکتا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے مجھ کو اپنے ایسے دوست معلوم ہیں جنھوں نے مسودہ کے پڑھنے کی تکلیف نہیں اُٹھائی اور یہ کہہ کر کہ سید صاحب قوم کے بڑے خیر خواہ ہیں، اور بہت بڑے دانشمند ہیں، اُنھوں نے جو کیا ہوگا اس میں کچھ مصلحت ہوگی، تمام مسوّدوں کی نسبت آنکھ بند کر کے ووٹ دے دیا، خیر یہاں تک بھی پردہ ڈھکا ہوا تھا مگر میں ان صاحبوں سے بھی واقف ہوں کہ جنھوں نے سید صاحب سے کہا کہ "یہ آپ کیا غضب کرتے ہیں" اور اس کا جواب اُن کو ایسے لفظوں میں ملا کہ وہ ڈر گئے اور سمجھے کہ اگر اقرار نہیں کرتے تو سید صاحب کے ساتھ اپنی قدیمی دوستی اور وضع داری کو قایم نہیں رکھ سکتے اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ کر کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں نا انصافی ہے اُنھوں نے سید صاحب کی ہاں میں ہاں ملا دی اور ووٹ دے دیا کہ سید صاحب کے بعد سید محمود سکرٹری مقرر کر دیئے جائیں یہ میں کسی چھوٹے آدمی کی طرف اشارہ نہیں کر رہا ہوں بلکہ ایسے بڑے درجہ والوں اور مشہور قابلیت والوں اور لیاقت والے لوگوں کی داستان بیان کر رہا ہوں کہ اگر اُن کا نام لوں تو فارسی میں ایک اور انگریزی میں تین سطریں اُن کا نام اور خطاب لکھنے کے لئے درکار ہوں، اس سے زیادہ کون سا نامناسب طریقہ کام میں لایا جا سکتا ہے، اور کیونکر ایسے ووٹوں کی بنیاد پر ایسے بڑے مسئلہ کا تصفیہ ہو سکتا ہے۔

(۴) میری خود کبھی ہمت نہ پڑتی کہ میں اس آزادی سے اپنی رائے لکھتا، اگر مجکو یہ خوف نہ ہوتا کہ ایک دن مرنا ہے اور خدا کے سامنے اپنے اعمال کا جواب بھی دینا ہے اگر ایک خدا کا گناہ ہو جائے تو ممکن ہے کہ اُس سے توبہ کریں، اور وہ اپنی رحیمی سے بخشدے، انسانوں کے متعلق اگر ایک دو کی نسبت کچھ خطا ہو جائے، تو اُن سے معذرت کر کے صفائی حاصل کر سکتے ہیں لیکن قوم و ملک کا گنہگار کس کس سے اور کہاں کہاں تک اپنا گناہ بخشواتا پھریگا، تمام عمر بھی اگر صرف ہو جائے تو عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ سید صاحب نے بے شک اس درجہ کالج کے لئے

سید محمود صاحب کے انتخاب کو مفید خیال کیا کہ اس کے حاصل کرنے میں اُنھوں نے جائز و ناجائز دونوں ذریعوں سے کام لینے کو مباح کر دیا ہی مگر مجکو امید ہی کہ اگر سید محمود صاحب اس تفصیل کے ساتھ ان واقعات پر مطلع ہونگے تو وہ خود خیال کرینگے کہ جو انتخاب ایسے ذریعوں سے ہوا ہو وہ عزت کا انتخاب نہیں ہی۔"

لیکن مولوی مشتاق حسین کا یہ اختلاف بے اثر رہا۔ ٹرسٹیز بل پاس ہو گیا اور اُس نے باضالطہ طور پر قانون کی صورت اختیار کر لی، اور مولوی سمیع اللہ خاں اور اُن کے پارٹی کے لوگ ناراض ہو کر کالج سے بالکل علیحدہ ہو گئے، لیکن بقول مولنا حالی۔

"نواب انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین نے کہ وہ بھی اس اختلاف میں شریک تھے بل پاس ہو جانے کے بعد اُس کو بسر و چشم قبول اور منظور کر لیا، اور کالج کے پہلے سے بھی زیادہ حامی و مددگار بن گئے۔"



حیدر آباد سے کالج کی امداد

۱۸۸۲ء میں سر سید حیدر آباد کا ایک کامیاب سفر کر چکے تھے، اب کالج کی ضرورتیں اور زیادہ بڑھ گئی تھیں، کام وسیع ہو گیا تھا تعمیرات کا سلسلہ بھی جاری تھا، اس لیئے سر سید نے ۱۸۹۱ء میں دوبارہ حیدر آباد کا ارادہ کیا، اس زمانہ میں نواب انتصار جنگ کو حیدر آباد میں پورا عروج و اقتدار حاصل تھا، لیکن بعض لوگوں کا خیال تھا کہ جانشینی کے معاملہ میں اُن کے اور سر سید کے درمیان جو بے لطفی پیدا ہو چکی ہی، شاید اس کی وجہ سے وہ کالج کی اعانت سے پہلو تہی کریں، لیکن واقعات نے ثابت کر دیا کہ باوجود شدید اختلاف رائے کے وہ کالج کے پہلے سے زیادہ ہوا خواہ ہیں۔

غرض جنوری ۱۸۹۱ء میں سر سید نے اُن کو لکھا کہ:-

"اس خبر کو سنکر کہ میں نے پھر ارادہ ایک دفعہ حیدر آباد آنے کا کیا ہی مجھ تعجب نہوگا ضرورت اس بات پر مجبور کرتی ہی کہ خیالات کے پورا کرنے پر گو کہ وہ

خام ہی کیوں نہ ہوں کوشش کی جاوے، کالج میں روز بروز غیر متوقع ترقی ہوتی جاتی ہے، جس کے سبب اضافہ اخراجات ایک امر لازمی، اور اب بغیر اس کے کہ لا کلاس قایم کی جاوے چارہ نہیں ہے۔

دوسرے نظام میوزیم کا تعمیر ہو جانا صرف امداد گورنمنٹ نظام، اور اُمرائے سلطنت نظام کی امداد سے ضرور ہے، اِس کے لیے چندہ کھول کر در بدر بھیک مانگتے پھرنا قوم اور گورنمنٹ نظام دونوں کے لیئے نامناسب ہے، ان دونوں اُمور کے لیئے میں وہاں آکر حضور نظام سے معروض عرض کرونگا، اگر ملازمت نصیب ہوئی، اور نواب سر آسمان جاہ سے بھی ہر طرح توجہ اور عنایت کی توقع ہے اور آپ اور مخدومی نواب عماد الملک پرائیوٹ سکرٹری بھی ضرور توجہ فرمائینگے اور اگر خدا کی مرضی ہوگی تو مطلب ضرور حاصل ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ گورنمنٹ نظام جو امداد کالج کی بالفعل کرتی ہے اس کو دُگنا کردے اور علاوہ اس کے گورنمنٹ نظام اور نیز اُمرائے سلطنت نظام، نظام میوزیم کی تعمیر کا چندہ پورا کردیں، جس کی تعداد ۵۰ ہزار روپیہ کی ہونی چاہیئے۔"

اس خط کے پہونچنے پر نواب انتصار جنگ نے اُن کو ایک مفصل تار دیا جس میں منجملہ اور اُمور کے یہ بھی لکھا کہ :-

"اِس مرتبہ آپکے حیدر آباد آنے سے سب سے زیادہ خوشی مجھ کو ہوگی اور بے شک ایک ایسی کوشش کالج کے واسطے ہونی چاہیئے، نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے، میں نے آپ کا خط بھی ہز اکسلنسی کو دکھلا دیا، جس میں ہز اکسلنسی سے کوئی سوال نہیں تھا، ——— میری رائے یہ ہے کہ آپ ہز اکسلنسی کو اپنے ارادہ سے براہ راست مطلع کریں جو غالباً ہز ہائنس کی اطلاع کے بعد بطور اپنے مہمان کے آپ کو بلا وینگے، اور جب تک وہ آپ کو نہ بلائیں آپ کا

یہاں آنا آپکے درجے کے مناسب نہو گا۔"

اِس کے بعد بھی سلسلہ مراسلات جاری رہا اور معاملات طے ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ جب اعلیٰحضرت کی خدمت میں ڈیپوٹیشن کی باریابی اور اڈریس کا پیش کرنا طے ہوگیا، اڈریس کی ترتیب اور کاسکٹ وغیرہ کی تیاری کا اہتمام خود نواب انتصار جنگ نے حیدرآباد میں کیا۔

سرسید معہ اپنی پارٹی کے بھوپال ہوتے ہوئے اوائل ستمبر میں حیدرآباد پہنچ گئے اور ۱۱ ستمبر ۱۸۹۱ء کو ڈیپوٹیشن اعلیٰحضرت کی بارگاہ میں باریاب ہوا، اور اڈریس پیش کیا گیا۔ نواب عماد الملک بہادر پرائیوٹ سکرٹری نے اعلیٰحضرت کی طرف سے جواب دیا، ۱۲ ستمبر کو نواب سر آسماں جاہ نے سرسید کو اطلاع دی کہ اعلیٰحضرت نے کالج کے ماہوار عطیہ میں جو ایکہزار تھا اضافہ فرماکر دوہزار کر دیا۔

اِس کے علاوہ نواب انتصار جنگ نے یہ کوشش بھی کی کہ نظام میوزیم کے لیے نقد چندہ جمع کیا جائے، چنانچہ وہ ۱۳ ستمبر کو بذریعہ اسپیشل ٹرین سرسید کو ورنگل لے گئے، جہاں وہ چار سال تک صوبہ دار رہ چکے تھے اور اب تک عام رعایا و حکام پر اُن کا اثر باقی تھا، غرض ورنگل کے لوگوں نے ۲۴ ہزار پانسو روپیہ کی رقم سرسید کی خدمت میں پیش کی۔

خود نواب انتصار جنگ نے ایک ہزار روپیہ سکہ حالی کے علاوہ جو چندہ میں دیئے تھے، پانسو روپیہ نقد بطور نذرانہ دعوت سرسید کی خدمت میں پیش کیے، غرض ڈیپوٹیشن کو اُمید سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی اور سرسید کی غیر معمولی عزت کی گئی، نواب انتصار جنگ کی اس کوشش سے سرسید بہت اثر پذیر ہوئے، وہ ۲۴ ستمبر کو حیدرآباد سے روانہ ہوئے اور الہ آباد پہونچکر انھوں نے ۲۷ ر کو حسب ذیل خط شکریہ کا لکھا۔

"عزیزی و مکرمی نواب وقار الملک بہادر،

میں کل بخیریت یہاں پہونچا، حیدرآباد میں جو کچھ ہوا وہ صرف آپ کی عنایت آپ کی کوشش، آپ کی سعی، آپ کی توجہ، مختصرا یہ کہ آپ کی ذات سے ہوا،

اُس کا شکریہ کسی طرح ادا نہیں ہو سکتا، جس قدر چندہ باقی رہ گیا ہے، بغیر آپ کی توجہ اور کوشش کے انجام نہیں پا سکتا اُمید ہے کہ آپ اس کی طرف توجہ خاص مبذول فرمائیں، جس قدر روپیہ وصول ہوتا جاوے، بنک میں جمع ہو، اور فہرست اور رسید بنک وقتاً فوقتاً میرے پاس روانہ ہوتی رہے۔"

گورمنٹ نظام کی امداد میں اضافہ کرانے کے علاوہ انھوں نے زمانہ قیام حیدرآباد میں دوسرے طریقوں سے بھی مختلف اوقات میں کالج کی مدد کی، مثلاً آسمان منزل کی تعمیر کے لیئے اُنھوں نے کثیر چندہ فراہم کیا، اور خود بھی معقول رقم دی، اسی طرح جب راجہ امیر حسن خاں صاحب تعلقہ دار محمود آباد (اَوَدھ) نے پچاس روپیہ ماہانہ کی اعانت جو وہ کالج کو دیتے تھے بند کردی تو نواب انتصار جنگ نے یہ کوشش کی کہ حیدرآباد کے چند عہدہ دار آپس کے مستقل چندہ سے اس نقصان کی تلافی کردیں کالج کی مسجد کے لیئے بھی اُنھوں نے معقول چندہ دیا اور دوسروں سے دلایا چنانچہ خود سرسید ایک خط میں اُن کو لکھتے ہیں:-

"آپ کی عنایت اور ہز اکسلنسی سر آسماں جاہ کی فیاضی سے کرسی تک مسجد بن گئی اُس پر عارضی دیواریں بنا کر چھپر ڈال دیا، اور آرام سے نماز ہونے لگی۔"

غرض مختلف اوقات میں جس قدر فنڈ کالج میں کھلے مثلاً تعمیر اسٹریچی ہال اور محمود منزل یا چندہ لا کلاس اور یادگار سرسید وغیرہ سب میں اُنھوں نے معقول چندہ دیا، اور جب کوئی موقع کالج کو فائدہ پہونچانے کا ہاتھ آیا اُنھوں نے اُس کو ضائع نہیں کیا۔

نواب انتصار جنگ کی یادگار

نواب وقار الملک کی یہ خدمات اس قدر نمایاں تھیں کہ سرسید کو کالج میں اُن کی یادگار قایم کرنے کا خیال پیدا ہوا، اور حقیقت تو یہ ہے کہ چونکہ اس قسم کی یادگاروں سے ہمیشہ کالج کی عمارات میں کچھ نہ اضافہ ہو جاتا تھا، اور جس شخص کی یادگار قایم کی جاتی تھی اُس کے مخصوص احباب فراخ حوصلگی سے چندہ دیتے تھے، اس لیئے سرسید

کالج کے فائدے کے لیئے ہمیشہ اس قسم کی یادگاروں کی تحریک کرتے رہتے تھے، غرض ٹرسٹیوں کے ایک اجلاس میں یہ رزولیوشن پیش ہوا۔

"بلحاظ ان کوششوں اور ہمدردیوں کے جو نواب وقار الدولہ وقار الملک مولوی مشتاق حسین انتصار جنگ بہادر نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی نسبت کی ہیں اس کے شکریہ میں اُن کی کوئی مستقل یادگار مدرستہ العلوم میں قایم کی جائے"

اس رزولیوشن کے پیش ہونے پر سر سید نے فرمایا:-

"نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین نے بلحاظ قومی ہمدردی کے جو بیش بہا خدمات کالج کی کی ہیں وہ آپ سب صاحبوں کو معلوم ہیں، اُنھوں نے اپنی جیب خاص سے متعدد دفعہ زرِ کثیر بطور سبکرپشن کالج کو عطا کیا ہے، اُن کے خاص عطا کیئے ہوئے روپیہ سے ایک پختہ بورڈنگ ہاؤس کالج کی عمارتوں میں بنایا گیا ہے، اسکول کا بڑا ہال اور مسجد مدرسۃ العلوم جس قدر کہ اب تک تعمیر ہوئی ہے جو نواب سر آسماں کی بے نظیر فیاضی کی یادگار ہے اس میں بھی اور نیز آسمان منزل کا چندہ فراہم ہونے میں مولوی مشتاق حسین کی سعی و کوشش کا بہت بڑا حصہ ہے، حال میں جو ڈپوٹیشن حیدر آباد میں گیا اُس کے تمام اغراض و مطالب کو مولوی مشتاق حسین نے باحسن وجوہ بحضور عالی ہز ہائنس نظام و ہز ایکسلینسی سر آسماں جاہ مدار المہام کی خدمت میں پہنچایا، جس کا نتیجہ ایسی فیاضی کی صورت میں ظاہر ہوا کہ جس کی نظیر مسلمانوں کی فلاح و بہتری کے کاموں میں نہیں پائی جاتی ہے۔

علاوہ اس کے اُن کی ذاتی و جسمانی محنت جو اُنھوں نے مدرسۃ العلوم میں کی ہے، کسی طرح فراموش ہونے کے قابل نہیں ہے، مدت تک اُنھوں نے بذاتِ خود بورڈنگ ہاؤس میں سکونت اختیار کی اور بورڈنگ ہاؤس کی

نگرانی کا مشکل کام انجام دیا، پس اُن کے یہ تمام احسانات اس قابل ہیں کہ اُن کی ایک مستقل یادگار مدرستہ العلوم میں قایم کی جائے"

اس کے بعد سر سید نے کالج کی مجوزہ اور زیر تعمیر عمارات کی تفصیل بیان کرکے ایک مجوزہ عمارت کو بطور یادگار تعمیر کرنے کے لیئے نامزد کیا، اور شریک اجلاس ٹرسٹیوں کی رائے سے یہ تجویز قرار پائی کہ:-

"جس عمارت کا ذکر سکرٹری نے کیا ہے وہ عمارت بیادگاری احسانات نواب وقار الملک کے **مشتاق منزل** کے نام سے موسوم کی جائے، اور اس کی تعمیر کے لیئے چندہ جمع کرنے کی مناسب تدبیریں عمل میں لائی جائیں"

اس عمارت کی تعمیر تو سر سید ہی کے زمانہ میں شروع ہوگئی تھی لیکن تکمیل اُسوقت ہوئی جب کہ نواب وقار الملک کالج کے آنریری سکرٹری ہوئے کیونکہ اس زمانہ میں مدارج تعلیم بڑھ جانے سے کالج کو متعدد کمروں کی ضرورت تھی، اور کالج کے سلسلۂ عمارات میں یہ نامکمل عمارت بدنما معلوم ہوتی تھی - یہ کالج کے سلسلہ عمارات میں مہدی منزل کی جواب میں اسٹریچی ہال کے جانب غرب، مسجد کے متصل واقع ہے، اور لکچر روم کے طور پر استعمال ہوتی ہے-



کالج کے انتظامی معاملات میں سرسید سے اختلاف

اور

مطالبۂ اصلاحات

نواب وقار الملک نے ۱۸۹۲ء میں حیدرآباد سے آکر اپنے وطن امروہہ میں قیام کیا، یہاں آکر اُن کو اپنے خانگی افکار و آلام میں اس طرح مبتلا ہونا پڑا کہ علی گڑھ جانے کا زیادہ موقع نہیں ملا، تاہم بحیثیت ایک ٹرسٹی کے وہ کالج کے تمام معاملات بلکہ انتظامی جزئیات میں پورا حصہ لیتے رہے اور اپنی قدیم عادت کے مطابق کسی کی شخصیت کا لحاظ کیے بغیر آزادی سے رائے دی، اور بروقت ضرورت پورے زور کے ساتھ اصلاح کا مطالبہ کیا۔

اس زمانہ میں کالج کے معاملات و انتظامات کی حالت قابلِ اطمینان نہ تھی، اگرچہ کالج کا کاروبار وسیع پیمانہ پر پہنچ گیا تھا، لیکن سرسید کے انحطاطِ عمر کا زمانہ تھا اس کے علاوہ بعض خانگی افکار اور کبر سنی نے اُن کو اور زیادہ مضمحل کر دیا تھا، نہ اب وہ زیادہ کام انجام دے سکتے نہ ہر شعبہ کی پوری نگرانی کر سکتے تھے، جانشینی کے معاملہ سے قرب و جوار کے اکثر ٹرسٹی برداشتہ خاطر اور بعض کھلم کھلا مخالف ہو چکے تھے، اور ٹرسٹی اپنے اپنے مشاغل میں مصروف تھے، اس لیے اُن کو عام طور پر ٹرسٹیوں سے بھی کوئی عملی مدد نہیں ملتی تھی، اس کے ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ یورپین اسٹاف پر سرسید کو حد سے زیادہ اعتماد تھا، ان حالات کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ کالج کے معاملات میں اسٹاف کا اثر غیر معمولی طور پر بڑھ گیا اور مسٹر بک پرنسپل تمام انتظامات پر حاوی

ہو گئے تھے، اور اُن کا اقتدار اس حد تک پہنچ گیا کہ اکثر ٹرسٹی اُن سے اختلاف کی جرأت کرنے میں تامل کرتے تھے۔

اسی زمانہ میں سرسید نے بورڈنگ ہاؤس کا پورا انتظام اور حساب کتاب بھی پرنسپل کے متعلق کر دیا، اور عام طریق عمل یہ ہو گیا کہ اکثر اہم معاملات صرف سرسید اور پرنسپل کی باہمی تجویز سے طے ہو جاتے تھے اور ٹرسٹیوں کو صرف ضابطہ کی اطلاع دے دی جاتی اور اجلاس میں اُن کی منظوری حاصل کر لی جاتی تھی، یہاں تک کہ سرسید نے اپنی رائے سے متعدد ٹرسٹی منتخب کرلیئے اور بعد کو ضابطہ کی منظوری حاصل کر لی۔ اگرچہ قواعد وضوابط موجود تھے لیکن وہ سب سرسید کی رائے اور اقتدار کے مقابلہ میں بے اثر تھے، سنجیدہ مزاج اور عاقبت اندیش ٹرسٹی اِن حالات سے مضطرب تھے لیکن سرسید کی عظمت وادب کی وجہ سے لب کشائی کی جرأت نہیں کرتے تھے، اس کے علاوہ سرسید کے مزاج میں غصّہ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اگر کوئی ٹرسٹی کبھی کچھ کہنے کی جرأت کرتا بھی تھا تو وہ بُری طرح جھڑک دیا جاتا تھا۔

نواب وقار الملک کی جُرأت، آزادی رائے، اور راست بازی کا سب کو اعتراف تھا، اِس لیئے باخبر ٹرسٹیوں کی نظریں اُن کی طرف اُٹھتی تھیں، اور اُن کے بے تکلف احباب برابر یہ لکھتے رہتے کہ جس طرح بھی ممکن ہو اصلاح کی کوشش کیجئے ورنہ کالج کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ خاص خاص احباب اُن کو یہاں کے حالات سے اطلاع بھی دیتے رہتے تھے، اور یہ تو سب کا اصرار تھا کہ اب مداخلت ناگزیر ہے، چنانچہ مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"محمڈن کالج کی نسبت ضرور ضرور کچھ سوچئے، سید صاحب کو نرمی کے ساتھ لکھئے مولوی مہدی علی صاحب کو لکھیئے کہ خلوت میں سید صاحب کو سمجھائیں، میرا کہنا یا لکھنا تو مؤثر نہیں ہو سکتا، لیکن آپ کی حالت میری سی نہیں خیال کی جاتی ہے، گو آپ بھی مشتبہ ضرور ہیں"۔

حاجی محمد اسمٰعیل خاں (ٹرسٹی) جو سرسید کے ساتھ ابتدا سے قومی خدمات میں شریک تھے پریشان ہو کر لکھتے ہیں :۔

"علی گڑھ کے حالات حد سے گزر گئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنون ایک سے دوسرے کو بھی سرایت کرتا ہے یعنی بہت سے لوگ مجنون ہو گئے ہیں۔"

اس کے بعد چند خاص واقعات بیان کر کے لکھتے ہیں :۔

"یہ سچ ہے کہ سرسید خود بہت پریشان ہیں مگر جو بات سید محمود ایجاد کرتے ہیں آخر کار مقبول و منظور ہوتی ہے اور وہی کام اجرا کیا جاتا ہے، میں نے تو سید صاحب کے یہاں جانا ترک کر دیا، کیونکہ یا تو ان کی رائے میں شریک ہو، اور کارروائی پر دستخط کرو، اور نہیں تو سید محمود کی گالیاں کھاؤ، اور غصہ کرو تو جوتی پیزار کرو۔"

پھر لکھتے ہیں :۔

"میں اپنی نسبت ششں و پنج میں ہوں کہ آیا استعفا دے کر الگ ہو جاؤں یا نام کاٹے جانے کا انتظار کروں، آپ کی کیا رائے ہے۔"

نواب محسن الملک بھی کالج کے معاملات میں نواب وقار الملک کے ہم آہنگ تھے لیکن وہ سرسید کو ناراض کرنا اور معاملات کو آخری حد تک پہونچانا پسند نہیں کرتے تھے، اور یہ مروت یا مداہنت اُن کا عام طرز عمل تھا، لیکن بایں ہمہ انھوں نے کسی قدر نرمی سے سرسید کو اس طرف متوجہ کرنا چاہا مگر اُن کی کوشش بے نتیجہ ثابت ہوئی، اس لیئے وہ خاموش ہو گئے اس زمانہ میں اُنھوں نے نواب وقار الملک کو جو خطوط لکھے ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ حالات نے اُن کو کس قدر مایوس و افسردہ بنا دیا تھا، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"میں جب تک علی گڑھ میں رہا، کالج کے معاملات سے درحقیقت غفلت نہیں کی، مگر کیا کیجئے کہ کوئی بات نہ چلی، نہ کسی بات کو سید صاحب نے مانا، دو تین مرتبہ تو

ایسا اتفاق ہوا کہ مجھے بھی سخت رنج ہوا اور سید صاحب کو بھی نہایت غصہ آیا، اور میں نے ٹرسٹی ہونے سے استعفا دینے کا ارادہ ظاہر کردیا مگر سید صاحب کی ذاتی حالت نے مجھے پھر اس ارادہ سے باز رکھا، اُن پر آج کل ایسے صدمے ہیں اور انکی طبیعت بلحاظ صحت کے ایسی خراب ہے کہ میں نے اس پر رنج دینا مناسب نہ جانا، انکی حالت نہایت رحم کے قابل ہے اور جہاں تک ہو اُن کو رنج دینے سے پرہیز کرنا ضروری ہے، اگر اُن کی یہ خاص حالت نہ ہوتی تو آپ یقین جانیے کہ میں ایک روز کے لیے بھی ٹرسٹی رہنا گوارا نہ کرتا، اُن کی رائے اس درجہ میری رائے سے مخالف ہے کہ گویا دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، اور میری رائے میں جو کچھ نقصان کالج کو ہو رہا ہے وہ اُن کی رائے کی غلطی اور ضد کا نتیجہ ہے، اور میرے نزدیک اس کالج کا سنبھلنا اور مسلمانوں کی نظروں میں پھر معزز اور پسندیدہ ہونا مشکل ہے۔

....

جہاں جہاں میں گیا اور جن جن سے ملا اُن کو شاکی پایا، اور ان تمام باتوں کو میں نے اچھی طرح سید صاحب کے گوش گزار کردیا اور آیندہ کے لیے اُن کو متنبہ بھی کیا، مگر انھوں نے کسی بات پر توجہ نہ کی؛

ٹرسٹی اوّل تو حقیقت میں کچھ کرتے نہیں، اور جو کچھ کرتے ہیں وہ عارضی طور پر، اس لیے سید صاحب تمام ٹرسٹیوں کی طرف سے ناامید ہوگئے ہیں اور وہ سوائے اس کے کچھ چارہ نہیں دیکھتے کہ کل انتظام کالج کا **انگریزی اسٹاف** کے سپرد کردیا جائے، چنانچہ وہ ایسا ہی کرتے جاتے ہیں، اور میں بھی باوجود اس بات کے جاننے کے کہ ایسی صورت میں یہ کالج مسلمانی کالج نہ رہیگا، اور جو خصوصیت اس کو ہے وہ جاتی رہیگی، کوئی چارہ نہیں دیکھتا جس سے کالج کی خصوصیت بھی قایم رہے اور انتظام میں بھی خلل نہ آئے، ٹرسٹی جب خود کچھ کرتے نہیں، اور جو کرنے والے ہیں وہ علی گڑھ

میں رہتے نہیں، اور انگریزی اسٹاف کے ہاتھ میں کام نہ دیا جائے تو پھر کام کیوں کر چلے۔

یہ تو ظاہر ہی کہ سید صاحب سے اب خود کچھ ہو نہیں سکتا، سید محمود سے توقع نہیں ہم اور آپ اپنے افکار میں مبتلا اور علی گڑھ سے غیر حاضر، پھر کیا جائے تو کیا کیا جائے، سید صاحب کو جس قدر کالج کا خیال ہی وہ دوسرے کو ہو نہیں سکتا، اُنھوں نے اپنے نزدیک کالج کی بہبودی اسی میں خیال کی ہی کہ کل کام انگریزی اسٹاف کے ہاتھ میں دیدیا جائے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ گو ہمارے کالج کا اسٹاف نہایت عمدہ اور لایق اور مسلمانوں کا خیر خواہ اور اپنے فرایض کا دل سے ادا کرنے والا ہی مگر غیر قوم اور غیر مذہب کے آدمی سے گو وہ کیسا ہی خیر خواہ اور نیک نیت ہو وہ اُمید نہیں ہو سکتی جو اپنے ہم مذہب اور ہم قوم سے، اور اس لیئے کچھ شبہ نہیں کہ آخر میں یہ کالج ایک انگریزی کالج ہو جائیگا، اور کوئی وجہ امتیاز اور ترجیح کی باقی نہ رہیگی۔

مگر اس کے ساتھ آپ کا یہ کہنا بھی نہایت صحیح ہی کہ اب سکوت بھی ٹرسٹیوں کو کالج سے بے دخل کرتا جاتا ہی، اور کالج کا انتظام اُن کے ہاتھ سے نکل رہا ہی، اس لیئے کم سے کم یہ بات ضرور ہی کہ اپنی رائے ظاہر کرنے میں تامل نہ کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو نرم لفظوں میں اپنا خیال ظاہر کر دیا جائے، اس لیے میں نے آپ سے پچھلے خط میں پوچھا ہی کہ بجٹ کی کیفیت پر کیا کیا ریمارک کرنے کے لائق ہیں آپ کے جواب آنے پر میں نے اپنی رائے لکھنی ملتوی رکھی ہی، میں بورڈنگ ہاؤس کے حساب کی نسبت ضرور لکھونگا کہ انگریزی حساب کی ہر کتاب کا ترجمہ اُردو میں رکھا جائے اور اُس پر بہت زور دونگا۔ کوئی مانے یا نہ مانے، اور کیا باتیں لائق لکھنے

کے ہیں اُس سے جلد اطلاع دیجئے۔"

اسی طرح کے متعدد خطوط ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہی کہ معاملات اب اس حد تک پہنچ گئے تھے کہ سر سید کے احباب جو آغازِ کار سے اُن کے شریک تھے مداخلت کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔

نکتہ چینی کا آغاز

غرض سب سے پہلے نواب وقار الملک نے انتظامی معاملات کے متعلق نکتہ چینی کی ابتدا کی، اور اعتراض وجواب کا سلسلہ مدّت تک جاری رہا، اس موقع پر صرف بعض اختلافات کا تذکرہ کیا جاتا ہی۔

سرسید نے بورڈنگ کا حساب کتاب پرنسپل کے متعلق کر دیا تھا، اور تمام حسابات انگریزی میں رکھے جاتے تھے، نواب وقار الملک نے سرسید کو توجہ دلائی کہ بلحاظ ضرورت اور سہولت، حساب کتاب کا اُردو میں رکھنا مناسب ہی، لیکن سرسید نے نہ مانا، اُنھوں نے مکرر خط لکھا اور زور دیا کہ جب ایک دفعہ یہ تجویز ہو چکی ہی کہ حساب، اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں رکھا جائے تو اب اس میں تامل کرنے کی کوئی وجہ نہیں، اُنھوں نے یہ بھی لکھا کہ:

"بہت زیادہ قابل افسوس بات تو اس موجودہ حالت میں یہ ہی کہ بورڈنگ کا حساب کتاب آپ کی نگرانی سے بالکل خارج ہوا جاتا ہی جس پر حقیقت اس وقت تک تمام ملک کا بھروسہ تھا، پس خدا کے لئے ایسی غلطی نہ فرمائیے اور ٹرسٹیوں کے لئے اور بورڈروں کے اولیا کے لئے جو کسی وقت بورڈنگ ہاؤس میں آکر اُس کے حسابوں کو دیکھنا چاہیں اس کا موقع باقی رہنے دیجئے اور اُس کو ناممکن نہ ہونے دیجئے۔"

سرسید اس خط کو پڑھکر بہت ناخوش ہوئے اور اُنھوں نے جواب لکھا کہ:-

"پہلے ایسے شخص کو تجویز کرلو جو اپنی تمام ضروریات کو چھوڑ کر دن رات

بورڈنگ ہاؤس کے حساب میں مصروف ہو، اُس شخص کو یہ کہنے کا حق ہے کہ حساب صرف انگریزی میں ہو، یا صرف اُردو میں، یا انگریزی و اُردو دونوں میں، لیکن جب کوئی ایسا شخص موجود نہیں ہے، تو اس امر میں اُن لوگوں کو جو اس کام میں مصروف نہیں ہیں نصیحتیں کرنا کچھ مفید نہیں ہے۔ لڑکوں کے مربیوں کے پاس برابر حساب اُردو میں جاتا ہے، اُن کو کوئی مقام شکایت نہیں ہے، غرضکہ میں ایسے لوگوں کی باتوں پر جو دُور بیٹھے ہوئے کہا کرتے ہیں کہ یہ ہونا چاہیئے اور وہ ہونا چاہیئے، توجہ نہیں کرسکتا، البتہ جو لوگ اس کام میں مصروف ہیں وہ جان سکتے ہیں کہ کیا کیا مشکلات درپیش ہیں، اور کیونکر حل ہونی چاہئیں وہ جو کچھ کہیں اور صلاح دیں وہ بلاشبہ توجہ کے لائق ہے۔"

اس خط کے بعد نواب وقار الملک باضابطہ طور پر اس مسئلہ کو معرض بحث میں لائے اور اُنھوں نے اس خط پر بحث کرتے ہوئے لکھا:۔

"اور یہ جو اس عنایت نامہ میں ارشاد ہوا ہے کہ (پہلے کسی ایسے کام کرنے والے شخص کو تجویز کرو جو اپنی ضروریات چھوڑ کر الخ) اس کی نسبت گزارش یہ ہے کہ وہ آدمی تو وہی ہوگا جو ٹرسٹیز کمیٹی کا سکرٹری ہوگا، اور گو وہ اپنے تمام کاروبار چھوڑ کر تو نہیں (جن کو جناب آنریری سکرٹری صاحب نے بھی نہیں چھوڑا ہے) لیکن ہاں کالج کے کاموں کو اپنا ایک مقدم اور ضروری کام سمجھ کر انجام دیگا، مگر اُس آدمی کی تلاش ہو تو کیونکر ہو، اس کی تلاش کے سب راستے تو جناب سید صاحب قبلہ نے خود ہی بند کر دیئے، مادام الحیات وہ خود لائف سکرٹری ہیں (اور ہماری سب کی دعا ہے کہ خدا کرے وہ دیرگاہ زندہ اور تندرست رہیں) اور اپنے بعد کے لیئے وہ بہت کچھ لڑ اور جھگڑ کر اپنے صاحبزادہ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کی ولی عہدی پر ٹرسٹیوں سے بیعت لے چکے ہیں، بس

اب بالفعل تو حق کارگزاری انہی دونوں بزرگوں کے درمیان دائر ہے، تیسرا کوئی تلاش ہو تو کیونکر ہو"

اس کے بعد انھوں نے منبرداران نتائج کو بیان ہے جو سرسید کے اس خط سے نکلتے ہیں اور اُن پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔

"اب ٹرسٹی صاحبان کو ان مذکورہ بالا اُمور پر غور کرنا اور ان کو فیصل کرنا چاہیے، میری جو رائے اِن میں سے ہر ایک کی نسبت ہے اس کو میں عرض کرتا ہوں، امر اوّل یعنی جناب سید صاحب قبلہ کا حسابات بورڈنگ ہاؤس سے محض بے تعلق ہو جانا ایک ایسا امر ہے جس سے عام لوگوں کے اطمینان کو بہت صدمہ پہنچے گا، اس وقت تک کی حالت یہ ہے کہ تمام وہ لوگ جو اپنے بچوں کو بورڈنگ ہاؤس میں بھیجتے رہتے ہیں اُن کے اطمینان کا زیادہ تر دار و مدار جناب سید صاحب پر رہا ہے نہ کہ پرنسپل پر یا بر سر پر، گو کہ وہ دونوں کیسی ہی دلسوزی اور دلچسپی سے اپنے فرائض کو انجام دیتے ہوں۔

اس کے بعد چند اور اُمور پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"قوانین و قواعد کا مجموعہ تیار ہو گیا ہے، ٹرسٹیز مقرر ہو گئے ہیں، اُن کی کمیٹی کی رجسٹری باضابطہ عمل میں آگئی ہے، گورنمنٹ کی نگرانی بھی بعض اہم مطالب کی نسبت قائم ہو گئی ہے، اور بعد ایک سیلاب عظیم کے جس میں سوا لاکھ روپیہ پانی پھر گیا، کمیٹی کے حسابات اور سکریٹری کے دفتر کی حالت بھی بہ نسبت پہلے کے اب شاید درست حالت میں آگئی ہے، اب یہ وقت نہیں رہا کہ کمیٹی کا سکریٹری ایک ایسا شخص ہو جو اختیارات تو معمول سے بہت زیادہ رکھتا ہو اور ذمہ داریوں کے برداشت کرنے کی اُس میں قوت نہ ہو اور کمیٹی کے ممبر اُس کی بزرگی اور عظمت اور اُس کی گزشتہ خدمات اور احسانات اور دوسری قسم کی خوبیوں اور

اُسی کے ساتھ اُس کی غصیلی اور پُر ضد طبیعت کے لحاظ سے کسی واجبی سے واجبی بات کو بھی جو اُس کی اپنی ایک اکیلی مرضی کے برخلاف ہو آزادانہ اُس کے سامنے پیش کرنے کی بہت کم جراءت کرتے ہوں، اور اگر کسی نے ایسی جراءت کی بھی تو اُس کو جناب ممدوح کی بزرگانہ جھڑکیوں کی برداشت کرنے کے لیئے جو بلاشبہ غرور اور کینہ کی آمیزش اور آلایش سے بالکل پاک اور صاف ہوتی ہیں ہمیشہ تیار رہنا پڑا ہے۔"

اس کے بعد اُنھوں نے بورڈنگ کی ہر شعبہ پر تفصیلی اعتراضات کیئے ہیں جن کا ذکر یہاں ضروری نہیں۔



آنریری سکرٹری کے اختیارات پر بحث

سرسید نے باختیار خود چند معزز اصحاب کو کالج کا ٹرسٹی مقرر کر دیا اور ایجنڈا شائع کرتے وقت امور اطلاعی کے ذیل میں ٹرسٹیوں کو اِس واقعہ کی معمولی طریقہ سے اطلاع دے دی نواب وقار الملک نے اس طریق عمل کو ناجائز قرار دیا اور اپنی یادداشت میں باضابطہ لکھا کہ :-

"جناب آنریری سکرٹری صاحب نے اس دعا کے ساتھ کہ مجکو دفعہ ۱۴ مجموعہ قواعد و قوانین ٹرسٹیان کی موجب ایسا اختیار حاصل ہے، بغیر اس کے کہ پیشتر سے کوئی منظوری موجودہ ٹرسٹیوں سے لی ہو، بعض نئے شخصوں کو باختیار خود کالج کا ٹرسٹی ہونے کی عزت بخشی، یہ کاغذات جس وقت میرے پاس آئے تھے تو اُن پر میں نے صرف اس قدر لکھ دیا تھا کہ " اطلاع ہوئی اور یہ کہ ان صاحبان کے ٹرسٹی مقرر کرنے کے لیئے اس سے زیادہ باعزت طریقہ بھی کام میں لایا جا سکتا تھا۔" اور اب کہ ٹرسٹیوں کے باضابطہ اجلاس میں جناب آنریری سکرٹری صاحب اپنی اس کارروائی کو ایک باضابطہ اور قانونی کارروائی کا لباس پہنانا چاہتے ہیں، میں

اس کی نسبت صاف کہونگا کہ جناب ممدوح نے جو کچھ اس باب میں کیا ہے وہ محض خلاف قانون ہے، اور ہرگز بھی مجموعہ قواعد و قوانین ٹرسٹیان کی دفعہ ۱۴۰ کی رو سے اُن کو ایسا اختیار حاصل نہیں ہے، اور اس بُری طرح سے جناب ممدوح نے اگر اُن صاحبوں کے نام نامی جن میں سے ایک بھی، غالباً اس جھگڑے کی حالت میں اپنا ٹرسٹی ہونا پسند نہ کریگا، ٹرسٹیوں کی فہرست میں داخل کیئے تو اس سے جناب ممدوح ایک بنیاد سخت ناگوار جھگڑوں کی قایم کرینگے، ایسے حضرات ہرگز بھی قانوناً ہمارے کالج کے ٹرسٹی متصوّر نہونگے، اور جو فیصلہ کہ اُن کی آرار کی شمول سے غلبۂ رائے کا فیصلہ سمجھ کر عمل میں لایا جائیگا وہ صریح ایک ناجائز فیصلہ متصور ہوگا، اور اس بات کے تصفیہ کے لیئے کہ وہ جائز فیصلہ ہے یا ناجائز، ٹرسٹیز کمیٹی کے اجلاس کے کمرہ کے بالاخانہ پر ایک کمرہ اور بھی ہے جہاں دیوانی عدالتیں بال کی کھال نکال کر سامنے رکھ دیتی ہیں۔

اس موقع پر قبل اس کے کہ میں کچھ اور آگے بڑھوں اُن جملہ معزز حضرات سے جن کے ٹرسٹی مقرر ہونے کی نسبت صرف جناب آنریری سکرٹری صاحب کی ایک ناموزوں کارروائی کی وجہ سے یہ بحث شروع ہو گئی ہے، میں اپنی دلی معذرت عرض کرتا ہوں، میں خوب جانتا ہوں کہ اس فہرست میں اکثر ایسے ایسے اسمائے گرامی شامل ہیں جن پر تمام قوم کو فخر ہے اور یہ بحث ہرگز بھی اُن بزرگوں کی ذاتیات سے متعلق نہیں ہے اور اُن سے میں معافی چاہتا ہوں"

اس کے بعد اُنھوں نے دفعہ[1] ۱۴۰ پر بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ آنریری سکرٹری نے

---

[1] دفعہ ۱۴۰ "کسی معاملہ میں جس میں سکرٹری کی یہ رائے ہو کہ کالج کے مطالب کے لیئے فوراً کارروائی کی ضرورت ہے اور جس میں ٹرسٹیوں کی منظوری پہلے سے حاصل کرنی ممکن نہ ہو سکرٹری ٹرسٹیوں کی طرف سے اُس کام یا کاموں کے کرنے کا مجاز ہوگا کہ جن کو وہ خود جائز طور سے کر سکتے ہوں اور اس کام کے اغراض کے واسطے ٹرسٹیوں کی

اپنے اختیارات کا بلا ضرورت استعمال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں :-

"دفعہ ۴۰ قواعد و قوانین ٹرسٹیان کو میں بلفظہ حاشیہ پر نقل کرتا ہوں یہ ایک معمولی دفعہ ہے اور اُنہی معمولی اختیارات کا اُس میں بیان ہوا ہے جس قسم کے اختیارات ذمہ دار اعلیٰ افسروں کو اکثر حاصل ہوا کرتے ہیں اُس میں کوئی خاص ندرت ہمارے جناب آنریری سکرٹری صاحب کے واسطے نہیں رکھی گئی ہے، اور جن اختیارات کا اس دفعہ میں ذکر ہے اُن میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس سے جناب آنریری سکرٹری صاحب کی یہ کارروائی جائز قرار پا سکے۔

اختیارات مندرجہ دفعہ محولہ بالا مشروط ہیں اس پر کہ :-

(۱) اول کالج کے مطالب کے لئے فوری کارروائی کی ضرورت ہو۔

(۲) دوم ٹرسٹیوں کی منظوری پہلے سے حاصل کرنی ممکن نہ ہو، مہربانی سے جناب ممدوح اول سمجھائیں تو کہ کالج کی ایسی کونسی ضرورت اٹک گئی تھی جو بغیر اِن جدید ٹرسٹیوں کے فوری تقرر کے رفع نہیں ہو سکتی تھی یا پہلے سے ٹرسٹیوں کی منظوری حاصل کرنے میں کون امر مانع اور حائل تھا، کیا خدانخواستہ کوئی غدر پڑنے والا تھا، یا ڈاک لٹنے لگی تھی یا ریلیں ٹوٹ گئی تھیں؟ آخر تھا کیا؟ جو ٹرسٹیوں کو بالائے طاق رکھ کر اس قدر گھبراہٹ سے کام لیا گیا۔ قانون کا مطلب قانون کے الفاظ اور اصلی واقعات کے تابع ہوا کرتا ہے، وہ کسی کے خوابوں یا کسی کے ضعف قلب اور دل کی کمزوریوں کا تابع نہیں ہوا کرتا، جناب آنریری سکرٹری

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۱۲) طرف سے کسی خرچ کے اُٹھانے کا مجاز ہوگا، جو اُس کے نزدیک ضروری متصور ہو۔

مگر شرط یہ ہے کہ کسی ایسے معاملہ میں سکرٹری حتی الامکان بہت جلد ٹرسٹیوں کے روبرو ایک مفصل رپورٹ اُن صورتوں کی پیش کریگا جن میں اُس نے اس طرح پر عمل کیا ہو معہ کیفیت اُن وجوہات کے جن کی بنا پر اُس نے اس قسم کی کارروائی ضروری خیال کی ہو۔"

نے اگر کوئی پریشان خواب دیکھا تھا یا اپنی ضعیفی اور تفکرات میں کسی وقت جناب ممدوح کو خود بخود یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ میری زندگی میں اب بہت تھوڑا وقت باقی رہ گیا ہے اور جو کچھ مجکو کرنا چاہیئے وہ میں آج ہی کرلوں تو ان خوابوں وغیرہ سے مجموعہ قوانین کی تعبیرات پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا۔

آنریری سکرٹری کو خودمختاری سے باز رکھنے کی ضرورت

جناب آنریری سکرٹری صاحب کی اس کارروائی میں اگر اس وقت مزاحمت نہ کی جاے تو پھر وہ کون سی قوت اُن کو اس بات کے لیئے مانع ہو گی کہ کالج کے جس قدر پرامیسری نوٹ اور زرِ نقد اور کتب خانہ اور دوسرا سامان جو اُن کے اختیار میں ہے اس کو وہ اسی دفعہ ۱۴۰ کے حوالہ سے ایک ہی دن میں کسی شخص کو یہ کہہ کر بخش دیں کہ اُس نے کالج کے کاموں میں مجکو بہت مدد دی تھی اور

---

۱ سرسید نے اگست ۱۸۹۷ء کی روداد بجٹ میٹنگ میں لکھا تھا کہ :-

"جنوری ۱۸۹۷ء میں میری طبیعت جادۂ اعتدال سے زیادہ منحرف ہو گئی تھی، اور بہ سبب پیرانہ سالی کے مجھے اندیشہ تھا کہ علالت طبع کا کیا انجام ہو گا اور چونکہ کالج میرا قایم کیا ہوا ہے، اور تمام ٹرسٹی جو مقرر ہوئے وہ سب میری تجویز سے ہوئے، اس لیے کالج کے آیندہ استحکام اور بہبودی کے لیئے جس کا مجھ سے زائد شاید کسی کو خیال ہو مجھ کو ضرور معلوم ہوا کہ ٹرسٹیوں کے عہدہ جات خالی کو اپنی زندگی میں ایسے ٹرسٹیوں سے معمور کردوں جن سے مجھ کو اُمید ہے کہ میرے بعد بھی کالج کی بہبودی کی فکر رکھینگے، اس سے بموجب اس اختیار کے جو مجھ کو حسب دفعہ ۱۴۰ قواعد و قوانین ٹرسٹیان تہا بنظر سود و بہبود کالج کے بحیثیت لیف آنریری سکرٹری کی ان تمام امور کے کرنے کا حق حاصل ہے جو مجموعاً ٹرسٹیان کالج کرسکتے ہیں، اس کے مطابق میں نے ۱۲ صاحبوں کو ٹرسٹی

مجکو اب اپنی زندگی کا ایک دن کے لیئے بھی کچھ بھروسہ نہیں ہی، لہذا پہلے سے ٹرسٹیوں کی منظوری حاصل کرنے کا موقع نہیں تھا، یا کون شخص پھر اُن کو اس بات سے روک سکتا ہی کہ دفعہ ۰ ہم اکے سلح خانہ میں سے وہ ایک خونخوار خنجر لے کر آناً فاناً تمام موجودہ ٹرسٹیوں کا قلع و قمع کردیں اور ایک خط نسخ اُن سب نالائقوں کے نام پر کھینچ دیں، اور اُن کی جگہ دوسرے لائق اور ایسے فرشتہ خصلت ٹرسٹی اپنے اختیار سے مقرر کریں جن کا سوائے آمنّا اور صدّقنا کے اور کوئی وظیفہ نہ ہو۔"

جب یہ یادداشت جس کا صرف ایک حصہ ہم نے نقل کیا ہی ٹرسٹیوں کی نظر سے گزری تو مختلف رائیں قایم کی گئیں، نواب محسن الملک نے یہ تو تسلیم کیا کہ جو کچھ لکھا گیا ہی وہ صحیح ہی۔ لیکن طرز تحریر کو ناپسند کیا اور نواب وقار الملک کو لکھا کہ:۔

"آپ نے نہایت سخت اور نہایت رنج دینے والے فقرے لکھے ہیں اور بہت بڑا حملہ سید صاحب پر کیا ہی ———— یہ میں نہیں کہتا کہ آپ اپنی رائے بدل دیتے یا اُسے ظاہر نہ کرتے مگر دوسرے لفظوں میں اور ملائم طور پر اسی مضمون کو لکھ سکتے تھے، بعض مقامات پر تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ آپ نے کچھ بھی خیال سید صاحب کا نہ کیا۔"

اس کے بعد دوسرے خط میں لکھتے ہیں:۔

"بھلا آپ اپنی بات سے ہٹنے اور دوسرے کی بات ماننے والے ہو۔ آپ کیا سید صاحب سے کم ہو، تحریر تو سخت ہی اور ضرور سخت ہی ہاں اس واجبیت اور ناواجبیت

(بقیہ نوٹ ص ۴۱۴) مقرر کیا، اور فی الفور اس کارروائی کی اطلاع بذریعہ تحریر کے جملہ ٹرسٹیوں کو دی، کیونکہ میری حالت ایسی تھی کہ جنوری ۱۸۹۸ء تک زندہ رہنے کی مجکو اُمید نہیں تھی۔"
نواب وقار الملک نے اس موقع پر سرسید کی مندرجۂ بالا تحریر کی طرف اشارہ کیا ہی۔ (ندوی)

پر بحث ہو سکتی ہے میرے لکھنے کا مطلب صرف یہ تھا کہ ہمارے آپکے تعلقات سید صاحب سے ایسے ہیں کہ اُن کے دل کا خیال رکھنا اور اُن کی موجودہ تکلیفات کو پیش نظر رکھنا ضرور ہے ——— آپ کی تحریر میں بعض مقامات پر اُن کی ذات پر حملہ پایا جاتا ہے، اور دیکھنے میں اچھا معلوم نہیں ہوتا، آپنے برادرِ من یہاں تک تو لکھ دیا کہ تم سے کام نہیں ہو سکتا تو چھوڑ دو اور اللہ اللہ کرو، اس سے بڑھ کر اور کیا لکھتے۔ خیر میں اگر دفتر کے دفتر سیاہ کروں آپ کب ماننے والے ہو اس لئے اسے جانے ہی دو نفس مطلب کی سنو۔

میری خانگی تحریروں کا بھی مختصر اور رنج دینے والا جواب آیا، ہے کہ اگر تمہارا ایسا خیال ہے کہ یہ باتیں کالج کے لئے مضر ہیں تو خیر اگر خدا کی مرضی یہی ہے تو سوائے صبر کے کیا علاج ہے، میں نے خانگی تحریروں کے بعد ضابطہ کی تحریر کی تھی سنا ہے کہ آپ کی اور میری دونوں تحریریں اجلاس میں پڑھی گئیں دفعہ ۴۰ کی نسبت میری اور آپ کی رائے سوائے موسیٰ خاں کے سب نے غلط ٹھہرائی، خصوصاً مولوی نذیر احمد صاحب نے۔

مجھے ایک خانگی تحریر سے معلوم ہوا کہ موجودہ ٹرسٹیوں کے نکال دینے کا بھی اختیار سکرٹری کو اس دفعہ کی رو سے حاصل سمجھا گیا ہے، ہم کو تو اس کا خوف نہیں ہے نہ ٹرسٹی رہنا چاہتے ہیں، آپ کو ہو تو ہو، مگر یہ بات ضرور ہے کہ جب تک ٹرسٹی ہیں، جو بات کالج کے حق میں سخت مضر سمجھینگے، ادب سے نہایت نرمی سے عرض کر دینگے وہ بھی آیندہ کی احتیاط کے لیئے نہ اس امید سے کہ اُس کا سید صاحب پر کچھ اثر ہوگا۔ اور اس میں شک نہیں ہے کہ کالج کی موجودہ حالت اور موجودہ انتظام قابل اطمینان نہیں

لے سر سید بجٹ میٹنگ کی روداد میں لکھتے ہیں کہ کارروائی پر محسن الملک و مشتاق حسین نے اعتراض کیا، حاجی موسیٰ خاں نے کہا کہ دفعہ ۱۳، ۱۵، ۱۶، ۷، قواعد و قوانین ٹرسٹیان جو متعلق تقرر ٹرسٹیان ہیں وہ دفعہ ۴۰ قواعد و قوانین ٹرسٹیان سے مستثنے ہیں اسلیئے تقرر ٹرسٹیان کا اختیار نہ تھا ۱۲

ہی اور اس سے کالج کو نقصان پہونچا اور پہنچے گا۔"

مولوی محمد سمیع اللہ خاں نے یادداشت کو ہر لحاظ سے پسند کیا، اور اُن کو لکھا:۔

"کل شام کی ڈاک میں مجکو آپ کی بے نظیر یادداشت ملی، چونکہ مجکو اس کا اشتیاق تھا فوراً ہی کھول کر میں نے اوّل سے آخر تک اُس کو پڑھا، ایسی دلچسپ تھی کہ اس کے چھوڑنے کو اس وقت تک دل نہ چاہا جب تک کہ تمام نہ کرلیا، مغرب کی نماز کو بھی دیر ہوگئی۔

دفعہ ۲۰ کو جب میں نے پڑھا تو بے اختیار مجکو ہنسی آگئی تھی اور وہ ہنسی دفعہ ۳۲ کے خاتمہ تک کسی طرح نہیں تھمتی تھی، اگر اُس وقت میں اپنے کمرہ میں تنہا نہ ہوتا، تو معلوم نہیں دیکھنے والے مجکو کیا کہتے، کیا کہوں کہ کیسی عمدہ طرح سے رزم و بزم کو نباہا ہی، اور کیسا نرم و گرم دکھایا ہی، آپ کی مسلمہ صدق بیانی و آزادی منصفانہ ہر جگہ سے جلوہ گر ہی، لیکن اس کا بھی کچھ جواب نہیں، کوئی کچھ ہی کہے من لاگا۔"

لیکن نواب وقار الملک کی یہ یادداشت جب بجٹ میٹنگ میں پیش ہوئی تو سر سید نے اُس پر سخت نکتہ چینی کی اور اُن کی اکثر تجویزوں کو غلط قرار دیا، اس کے علاوہ مرزا عابد علی بیگ کی تحریک اور شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب کی تائید سے اجلاس میں حسب ذیل رزولیوشن نواب وقار الملک کے برخلاف پاس ہوا۔

"ٹرسٹیوں کی یہ میٹنگ نواب وقار الملک مولوی محمد مشتاق حسین صاحب کی اس طرز تحریر کو جو اُنھوں نے اپنی رائے لکھنے میں سکرٹری اور ٹرسٹیوں کے حق میں استعمال کی ہی، آزردگی کے ساتھ ناپسند کرتی ہی۔"

نواب وقار الملک نے اس اجلاس کے بے ضابطہ طرز عمل پر بھی نکتہ چینی کی اور یہ بتایا کہ معدودے چند ہم خیال ٹرسٹیوں کا یہ فیصلہ اُن ٹرسٹیوں کے لئے جنھوں نے میری یادداشت نہیں دیکھی حجت نہیں

ہو سکتا، اور اس پر بھی اعتراض کیا کہ اجلاس کی روداد کے ساتھ میری یادداشت شائع نہیں کی گئی تاکہ دوسرے ٹرسٹیوں کو بھی جو اجلاس میں شریک نہیں تھے رائے قایم کرنے کا موقع ملتا۔

لیکن نواب وقار الملک کی اس جدوجہد کا بھی سرسید پر کوئی اثر نہ ہوا، خود نواب وقار الملک بھی یہ سمجھتے تھے کہ سرسید اپنی رائے تبدیل نہ کرینگے لیکن بحیثیت ایک ٹرسٹی کے وہ اپنی اصلی رائے ظاہر کرنا ضروری سمجھتے تھے، جیسا کہ وہ خود سرسید کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"اگر مجکو یہ یقین ہوتا کہ اب ور زیادہ عرض کرنا کالج کے لئے مفید ہوگا تو مجھ کو وہ طریقہ معلوم ہو جس سے میری اس گزارش پر توجہ اور اس پر مباحثہ کرنے کے لیئے آپ مجبور ہوتے، لیکن مجھکو معلوم ہو کہ اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا لہذا اب میں اس قصہ کو طول دینا نہیں چاہتا، اور اسی لیئے میں نے اپنا یہ مسلک اختیار کر رکھا ہو کہ برا یا بھلا جو کچھ میری سمجھ میں آتا ہو، میں اُس کو اپنا فرض سمجھ کر ایک دفعہ آپکے سامنے نہایت ادب کے ساتھ پیش تو کر دیتا ہوں، پھر اس کے بعد آپ جانیں اور آپ کا دین و ایمان۔

پہلا عریضہ جو میں نے گزرانا تھا وہ بلا شبہ بالکل ایک خانگی عریضہ تھا، مگر جب میں نے دیکھا کہ اس صاف معاملہ میں بھی آپ اپنی معمولی ضد سے کام لینا چاہتے ہیں، تو میں نے اُن لوگوں کے اعتراضات کے لحاظ سے جو کہتے ہیں کہ ٹرسٹی کچھ توجہ نہیں کرتے دوسرے عریضہ میں اسی مضمون کو مدلل طور سے بحیثیت ایک ٹرسٹی کے پیش کر دیا، اور اس تکلیف دہی کے ساتھ بھی مجکو اس بات کا یقین تھا کہ اب جو آپکے قلم سے ناں نکل گئی تو خدا ہی ہو جو اس کی جگہ ہاں نکلے۔"

نواب وقار الملک کے اس اختلاف اور روک ٹوک کا یہ نتیجہ نکلا کہ سرسید اور زیادہ برہم ہو گئے اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ حاجی محمد اسمٰعیل خاں نے نواب وقار الملک کو علی گڑھ کے حالات لکھتے ہوئے یہ اطلاع دی کہ:۔

"آپ کا نام ٹرسٹیوں کی مدد سے بموجب اختیارات سکرٹری خارج کیا جائیگا"

چار پانچ روز ہوئے سرسید خود تشریف لائے، اور میں نے عرض کیا کہ بہت ہی بے جا یہ کارروائی ہے جو ہونے والی ہے، آپ کے نام کے خارج کرنے کا خود انھوں نے فرمایا کہ سید محمود پیچھے پڑے ہیں، جس کے جواب میں، میں نے کہا کہ بہت ہی بے جا ہوگا، باقی اور باتوں کو میں لوگوں کی زبانی سنتا ہوں مگر مجکو یقین ہے کہ سچ ہونگی یعنی مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب کے نام کا کتبہ نکالا جانا جو حد سے زیادہ نالائق اور بخس کام ہوگا، اُن کی خدمات فراموش نہیں ہو سکتیں"۔

لیکن نواب وقار الملک پر جو سرسید کی طرح غیر متاثر طبیعت رکھتے تھے اس دھمکی کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا، اس لیے انھوں نے اپنے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی، اور یہ اختلافات سرسید کی وفات تک جاری رہے، جن کی تفصیل غیر ضروری ہے، تاہم سرسید کے نام نواب وقار الملک کے سب سے آخری خط کا ایک حصہ نقل کیا جاتا ہے جو انھوں نے ایک بے ضابطگی کے متعلق لکھا تھا تفصیلی نکتہ چینی کے بعد آخر میں لکھتے ہیں :-

"قوم نے آپ کو بہت ہی فراخ حوصلگی کے ساتھ جو وسیع اختیارات سپرد کیئے ہیں وہ اس اُمید سے سپرد کیئے تھے کہ آپ اُن سے قوم کو فائدہ پہونچائینگے، برخلاف اس کے اب روز بروز یہ دیکھا جارہا ہے کہ آپ اُن اختیارات کے ذریعہ سے قوم کو اُس کے واجبی حقوق سے محروم کر رہے ہیں، اور قانون اب صرف ایک آلہ آپ کی مرادوں کے پورا کرنے کے لیئے رہ گیا ہے، قانون میں گو کہیں ذکر نہ ہو مگر کانسل ٹرسٹین کے اجلاس معہ اپنی مکمل رودادکے اُسی قانون کی عملداری میں نمودار ہوجاتے ہیں، اور جب آپ اپنے بھتیجے کو اسسٹنٹ سکرٹری کا عہدہ دلانا چاہتے ہیں تو اُس کے لیئے بے تکلف یہ دلیل کام میں لاتے ہیں کہ قانون میں کہیں اسسٹنٹ سکرٹری کے عہدہ کے لیئے ممانعت نہیں ہے۔ لیکن جب کوئی ٹرسٹی ایسی کوئی بات پیش کرتا ہے جو

آپ کی ذاتی مرضی کے برخلاف ہو تو اُس کو یہ جواب ملتا ہو کہ قانون میں کوئی صریح اجازت دکھلانی چاہیئے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

معاملات اب صبر کی حد سے باہر ہو گئے ہیں اور میں اب اس بحث کو اس اطلاع پر ختم کرتا ہوں کہ میرا اپیل اب قوم کے سامنے پیش ہو گا۔ آپ سے اب زیادہ کچھ عرض کرنا عبث ہو"

اِس خط میں اُنھوں نے قوم کے سامنے اپیل پیش کرنے کا جو ارادہ ظاہر کیا ہو، یہ محض دھمکی نہ تھی بلکہ ایک مخصوص جماعت نے اس کا پورا ارادہ کر لیا تھا، جیسا کہ خود نواب وقار الملک اپنی ۱۹۰۷ء کی ایک یادداشت کے آخر میں جو شائع ہو چکی ہو لکھتے ہیں :۔

"اِن حالات کو دیکھ کر وہ لوگ جن کو قوم کا زیادہ درد تھا بہت فکر میں پڑ گئے تھے اور باہم سرگوشیاں ہونے لگی تھیں، اور بالآخر باوجود سرسید مرحوم و مغفور کے اُن اقتدارات اعظم اور عظمت و جلال کے جس کی دوسری نظیر شاید مدت تک نہ ملیگی، بعض ٹرسٹیوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب ہم کو صرف اپنی قوم کی بہبودی کا خیال مدنظر رکھنا چاہیئے، اور جناب مرحوم و مغفور کی مروت کو قوم کے مقابلہ میں بالائے طاق رکھنا چاہیئے۔

مضامین کا ایک سلسلہ روزانہ پیسہ اخبار لاہور میں چھاپنا تجویز ہوا تھا جو گمنام نہ ہوتا بلکہ اُس پر ایسے لوگوں کے دستخط ثبت ہوتے جیسے کہ نواب محسن الملک اور شمس العلماء مولوی خواجہ الطاف حسین حالی، اور ایک یہ خاکسار مشتاق حسین اور مجھ کو اس وقت اچھی طرح یاد نہیں رہا غالباً آنریبل حاجی محمد اسمٰعیل خاں بہادر کے دستخطوں کا بھی ان مضامین پر ثبت ہونا تجویز ہو گیا تھا، اِن مضامین کے ذریعہ سے یہ بات ثابت کرنی مقصود تھی کہ کالج کے قیام سے جو اصل مقصد تھا اب جناب مرحوم و مغفور اپنے ہاتھ سے اُس کو برباد کر رہے ہیں، اور ٹرسٹیوں اور قوم کو چاہیئے کہ وہ جناب مرحوم کی

اِس خود مختاری کو روکے اور کالج کو تباہی سے بچائے۔

پہلا نمبر اس سلسلۂ مضامین کا میں نے اپنے قلم سے لکھا تھا، اور نواب محسن الملک بہادر اور شمس العلمار مولوی حالی صاحب کی خدمت میں جو غالبًا اس وقت علی گڑھ ہی میں تشریف رکھتے تھے، دستخطوں کے لیے بھیجا گیا تھا کہ دفعتًا جناب مرحوم و مغفور کی رحلت کی خبر پہونچی، اور میں نے فورًا نواب محسن الملک کو تار دیا کہ وہ مضمون واپس کر دیں کیونکہ اب ہمارے دلوں میں جناب ممدوح کی خوبیوں اور بے نظیر عمدہ اوصاف کے سوا اور کوئی خیال باقی نہیں ہے۔ چنانچہ اُسی وقت سے اُن مضامین کا سلسلہ ترک کر دیا گیا بلکہ دلوں سے بھی اُس شکایت کو نکال دیا گیا۔ اور اس وقت بھی صرف کالج کے فوائد کی غرض سے اس کو ظاہر کیا گیا ہے۔"

غرض باہمی اختلاف اور کش مکش کا زمانہ شباب تھا کہ مارچ ۱۸۹۸ء میں سر سید کی وفات نے دفعتًا ہوا کا رُخ بدل دیا اور بہت سے جدید مسائل غور و بحث کے لیے ٹرسٹیوں کے سامنے آ گئے۔

سرسید کی وفات انتظامی پیچیدگیاں اور مشکلات

اگرچہ سرسید کی جانشینی کا معاملہ خود اُن کی زندگی میں طے ہو چکا تھا، اور ہر شخص کو معلوم تھا کہ سید محمود آنریری سکریٹری ہو نگے لیکن یورپین اسٹاف کو یہ خطرہ تھا کہ مبادا ٹرسٹی ۱۸۸۹ء کے فیصلہ کو منسوخ کر دیں، اور مولوی محمد سمیع اللہ خاں سکریٹری شپ کے اُمیدوار بنکر سامنے آجائیں، اس لیئے اُنھوں نے سید محمود کے عہدہ کو مستحکم کرنے پر خاص توجہ کی۔ سید محمود نے بھی مسٹر بک پرنسپل کے اختیارات میں اضافہ کیا، اور اُن کو کالج کا رجسٹرار بھی بنا دیا۔

اِسی زمانہ میں ٹرسٹیوں کے باہم اختلافات پیدا ہو گئے، اور قریباً تمام مقامی ٹرسٹیوں کو ان جھگڑوں میں مبتلا ہونا پڑا، سب سے زیادہ کش مکش مختلف عہدوں کے حاصل کرنے کے لیئے تھی، جو عناد کی حد تک پہنچ گئی تھی، اور مختلف پارٹیاں بن گئی تھیں جو ایک دوسرے کی تخریب کے درپے تھیں یورپین اسٹاف نے بھی ان جھگڑوں میں فریقانہ حیثیت اختیار کر لی تھی، اور وہ کھلّم کھلّا ایک پارٹی کا جانبدار تھا۔

نواب وقار الملک ان حالات سے نہایت افسردہ خاطر تھے اور باہمی اختلاف اور اسٹاف کی خود مختاری کو کالج کے لیے خطرناک سمجھتے تھے، اِس لیے وہ کسی پارٹی کے ساتھ شامل نہوئے بلکہ حتی الامکان اختلافات کو مٹانے کی کوشش کی چنانچہ جب سید محمد احمد خاں نے (جن کو سرسید نے اپنی وفات سے کچھ مدت پہلے اسٹنٹ سکریٹری بنا دیا تھا) مسٹر بک اور نواب محسن الملک کے خلاف ایک پمفلٹ شائع کرنا چاہا تو اُنھوں نے روکا مگر یہ کوشش بے نتیجہ رہی۔

نواب وقار الملک نے اس موقع پر جو پُر احتیاط طریقہ اختیار کیا تھا اُس کا کچھ اندازہ اُس خط سے ہوتا ہے جو جنوری ۱۸۹۹ء میں اُنھوں نے سید محمود کے نام لکھا، اس زمانہ میں وہ علی گڑھ آئے ہوئے تھے، چلتے وقت بغیر سید محمود سے رخصتی ملاقات کیئے روانہ ہو گئے، سید محمود نے

اُن کو شکایتی خط لکھا کہ یہ طریقہ آپ کے قدیم طرز عمل کے خلاف ہے۔ اِس کے جواب میں لکھتے ہیں:-

" سب سے اول میں اپنی اُس روز کی غیر حاضری کی معذرت عرض کرنا اپنا ضروری فرض سمجھتا ہوں، اور اُس کی معافی چاہتا ہوں، اور یہ نہیں ہے کہ جو کچھ میں اسوقت کر رہا تھا اور آپ سے بغیر ملے ہوئے وطن کو واپس آ رہا تھا اُس کی نسبت میں یہ سمجھتا نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں لیکن آپ مجھ سے بہتر واقف ہیں کہ بعض اوقات وہ باتیں جائز ہو جاتی ہیں جو عام وقتوں میں جائز نہیں ہوتیں۔ اُس وقت کی حالت یہ تھی کہ میں سمجھتا تھا کہ اگر میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونگا تو یہ یقینی امر ہے کہ آپ مجکو واپس نہ آنے دینگے اور اُس وقت میرا وہاں سے واپس نہ چلا آنا عام کی نگاہوں میں مجکو اُس کارروائی کی مشورت میں شریک کیئے دیتا تھا جو سید محمد احمد خاں صاحب نے اپنے پمفلٹ متعلقہ شکایات مسٹر آرچبالڈ اور نواب محسن الملک کی اشاعت کے متعلق اختیار کی تھی، اور جس کو میں نے حتی الامکان روکنے کی کوشش کی تھی اور یہ میں اپنے لیئے پسند نہیں کرتا تھا کہ جس کارروائی کا میں فی الحقیقت مخالف تھا، پبلک میں اُس کا شریک مشورہ سمجھا جاتا لہذا کوئی چارہ کار اُس وقت میرے لیئے اس کے سوا نہ تھا کہ میں اُس وقت آپ کی رخصتی ملاقات نہ کرنے کی ندامت برداشت کروں۔"

سعی اصلاح

غرض نواب وقار الملک نے جب یہ دیکھا کہ عہدوں کے لیئے جو کشمکش جاری ہے وہ ناموزوں حد تک ترقی کر گئی ہے، تو اُنھوں نے یہ چاہا کہ بالفعل عہدہ داروں کے انتخاب و تقرر کا معاملہ ملتوی کر دیا جائے تاکہ ٹرسٹیوں کو اطمینان سے اُن معاملات پر غور کرنے کا موقع مل سکے۔ حسن اتفاق سے اسی زمانہ میں ٹرسٹیوں کے مجموعہ قواعد و قوانین کی ترمیم کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ اور جدید آنریری سکرٹری (سید محمود) اس کے متعلق ایجنڈا جاری کرنے والے تھے، اِس موقع سے فائدہ اٹھا کر اُنھوں نے حسب ذیل خط سید محمود کو لکھا، اور یہ خواہش کی کہ اُن کی تحریر ایجنڈے کے ساتھ ٹرسٹیوں کے پاس بھیجدی جائے:-

(الف) جنوری ۱۸۹۹ء کے سالانہ جلسہ میں قانون کی ترمیم کا مسئلہ ملتوی رکھا جائے، اور اپریل ۱۸۹۹ء میں بطور ملتویہ جلسہ سالانہ کے کوئی تاریخ اس کے لیئے مقرر کی جائے تاکہ ٹرسٹیوں کو کافی طور سے کارروائی کا وقت ملے، اور سکرٹری کے دفتر میں بھی اطمینان کے ساتھ کارروائی ہو سکے۔

(ب) شخصی انتخابات اور تقررات کا تصفیہ عہدوں پر یعنی پریسیڈنٹ و سکرٹری و جائنٹ سکرٹری و اسسٹنٹ سکرٹری و رجسٹرار و عہدہائے بورڈ آف منیجمنٹ اور دوسرے اسی قسم کے عہدوں پر جو دیگر انتظامی کمیٹی ہائے کالج سے متعلق ہوں اس کے بعد ہونا چاہیئے جب کہ مجموعہ قواعد و قوانین کی ترمیم عمل میں آکر دوسرا مجموعہ قواعد و قوانین کارروائی کے لیئے موجود ہو جائے۔

میری ان تحریکوں کے وجوہ بہت صاف ہیں، تحریک الف کے متعلق حقیقت یہ ہے کہ جناب ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر مرحوم و مغفور کی حیات تک جن کو ہماری بدقسمتیوں نے اور زیادہ عرصہ تک ہم میں رہنے نہ دیا ملک اور قوم کا بلکہ ٹرسٹیوں کا بھی جس قدر بھروسہ کالج کے متعلق تھا، وہ جناب مرحوم و مغفور کی ذات پر تھا نہ کہ اس مجموعہ موجودہ قواعد پر، اور اسی لیئے جس قدر نقصانات کہ اس مجموعہ میں ہیں، اُن پر لوگوں کو کافی طور پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا، اور جناب مرحوم و مغفور کے بعد سے جو وقت کہ اس وقت تک گزرا، اگرچہ وہ کہنے کے لیئے ناکافی وقت نہیں تھا، مگر جس طریقہ میں کہ یہ وقت صرف ہوتا رہا ہے اُس کے لحاظ سے میں جرأت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ابھی تک بھی ہم لوگوں کو کافی طور سے اس اہم مسئلہ پر غور و خوض کا موقع نہیں ملا۔ یہاں تک کہ بعض ٹرسٹیوں کی طرف سے جو ترمیمیں قانون پر اس وقت تک پیش ہوئی ہیں اور جہاں تک کہ اُن پر مجھ کو علم ہوا ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بھی ناکافی ہیں، مثلاً ہمارے موجودہ قانون میں یہ بہت بڑا نقص ہے کہ ہم اپنی کارروائیوں کے وقت مباحثہ کے فوائد اور تبادلہ خیالات کے منافع سے بالکل محروم ہیں، اور کسی ترمیم پر جو کسی تحریک کی نسبت پیش ہوئی ہو ہمارے

ہاں علی گڑھ سے باہر کے ٹرسٹیوں کو (اور انہی کی تعداد زیادہ ہے) ووٹ دینے کا موقع نہیں ملتا، یا یہ کہ شخصی انتخابات و تقررات کے وقت جب کہ مہذب دنیا مخفی ووٹ کے طریقہ کو پسند کرتی چلی جاتی ہے ہم اپنے مجموعہ قوانین کی رو سے کھلا ہوا ووٹ پیش کرنے پر مجبور کیئے گئے ہیں، اور پھر ہمارے وہ ووٹ عام اطلاع کے لیئے روئدادوں اور اخباروں میں مشتہر کیئے جاتے ہیں، جس سے خواہ نخواہ بھی باہم رنجوں کی بنیاد قایم ہوتی ہے، اور یہ دونوں نقص ایسے نقص ہیں کہ جب قانون کی ترمیم ہونے لگے، تو سب سے پہلے اُن کی اصلاح ہونی چاہیئے لیکن پیش شدہ ترمیمات میں کوئی ترمیم بھی ایسی نہیں ہوئی ہے جس سے یہ نقصانات رفع ہوتے ہوں، پھر ایسی ترمیمیں بار بار نہیں ہوا کرتیں، اور جناب سر سید صاحب مرحوم کا کالج پر سے نہیں قوم کے سر پر سے اُٹھ جانا ایک ایسا عظیم واقعہ ہے کہ بہت سے لوگ تو اب تک اس کی وجہ سے حیرت میں پڑے ہوئے ہیں، اور اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا ہوگا اور کیا کرنا چاہیئے، فرید محنت کے ذریعہ سے یہ تمام کارروائیاں اطمینان کے ساتھ ہو سکیں گی، اور جس قدر اور ترمیمیں اور اصلاحیں ٹرسٹیوں کی طرف سے پیش ہونے والی ہیں اُن سب کے لیئے وقت مل جائیگا۔

دوسری تحریک (حرف ب) کی وجہ بھی صاف ہے یعنی جب تک کہ قانون میں یہ طے نہ ہو جائے کہ آیندہ کون کون سے عہدے کمیٹی ٹرسٹیان اور بورڈ آف منیجمنٹ اور دیگر کمیٹیہائے ماتحت میں قایم رہینگے، اور اُن کی کیا ذمہ داریاں اور کیا کیا اختیارات ہونگے اس وقت تک اُن عہدوں کے لیئے کسی شخص خاص کا نام پیش ہونا صرف خلاف اُصول ہی نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ سے بہت سی پیچیدگیاں اور باہم بہت سی رنجشیں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔"

عملی خدمت کا ارادہ اِسی سلسلہ میں اُنھوں نے کالج کی ناقابل اطمینان حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے حسب ذیل الفاظ میں کالج کے لیئے اپنی خدمات بھی پیش کی ہیں۔

"میں اس بے اطمینانی اور اس خواہش سے بھی غافل نہیں ہوں جو نہ صرف ٹرسٹیان کالج میں بلکہ قوم اور ملک میں پھیل رہی ہے، اور موجودہ حالت کو لوگ اطمینان

کی نظر سے نہیں دیکھتے، اور اس بات کے خواہشمند ہیں کہ کوئی مطمئنہ حالت پیدا ہو، اور ایسی حالت میں جو کچھ کہ میرے امکان میں ہو وہ یہ ہو کہ میں اپنی خدمات کو آنریبل سید محمود صاحب لائف آنریری سکرٹری کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، میں آمادہ ہوں کہ جب تک ہمارا قانون از سرِ نو ایک مکمل صورت اختیار کرے اور کمیٹی کے مجوزہ عہدوں پر تقررات عمل میں آجائیں اپنا قیام علی گڑھ کالج ہی کے پاس اختیار کروں اور آنریبل **لائف آنریری سکرٹری** صاحب کو ان کے کاموں میں مدد دوں، میں اپنے لیے کوئی خاص پوزیشن نہیں چاہتا نہ اب اور نہ آئندہ بلکہ کالج کے ٹرسٹی اور سید محمود صاحب کے ایک قدیمی نیازمند اور قوم کے ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت اس طرح کام کرنے کی غرض سے میرے لیے بالکل کافی ہے، اور میرے و کالج کے لیے یہ کوئی نئی بات بھی نہیں ہے، برسوں تک میں اسی طرح جناب سر سید صاحب مرحوم و مغفور کے ساتھ کام کرتا رہا ہوں، اور اگر میری یہ خدمات اسی چند مہینہ کے لیے قابلِ تشفی اور اطمینان بخش متصور ہوں تو مجھ کو اُمید ہے کہ دیگر مخدوم ٹرسٹی صاحبان بھی خوشی سے اُس مہلت کو منظور کرینگے جس کے واسطے میں نے موجودہ حالت میں تحریک کی ہے۔"

سید محمود کی سکرٹری شپ سے علٰحدگی اور نواب وقار الملک کی رائے

سید محمود کو مندرجہ بالا خط لکھنے کے بعد ایسے حالات پیش آئے کہ نواب وقار الملک کی رائے بدل گئی اور اُن کو یہی مناسب معلوم ہوا کہ آنریری سکرٹری اور دوسرے عہدہ داروں کے انتخاب کا معاملہ جلد سے جلد طے ہو جائے، چنانچہ اس خط کے قریباً دو ہفتہ بعد جب اُنھوں نے ۳۱ دسمبر ۱۸۹۹ء کے سالانہ اجلاس ٹرسٹیز کالج کے لیے اپنی رائے لکھی تو پہلے تو اس میں یہ بتایا کہ کون کون سے ٹرسٹی کن عہدوں کے اُمیدوار اور کس قسم کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اس کے بعد

اُنھوں نے لکھا کہ :-

"یہ حالت اُن پیش شدہ جدید قواعد کی ہے، جو تمام تر شخصی خیالات سے مملو ہیں اور میں تو ہرگز بھی اپنی اس تحریک کو واپس نہ لیتا کہ شخصی انتخابات سے پہلے عہدوں کے اختیارات اور ذمہ داریوں کا تصفیہ قانون میں ہو جانا چاہیئے، مگر مجبوری ہے کہ آنریبل سید محمود صاحب باوجود اپنی ہر ایک قسم کی خواہش اور کوشش کے بھی اپنی ناساز اور طوالت پسند طبیعت سے مجبور ہیں، اور سکرٹری کے دفتر کے فرایض کو رسمی طور پر اور چند مہینہ کے لیئے بھی اور دوسروں کی مدد سے بھی نہیں چلا سکتے اور اس لیئے کالج کے مقاصد کی غرض سے میں نے اس کو ضروری خیال کیا کہ سکرٹری کے عہدہ پر جس قدر جلد بھی ممکن ہو کسی کا تقرر ہو جانا چاہیئے۔"

یہ تنہا نواب وقار الملک کی رائے نہیں تھی بلکہ اس زمانہ میں ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ قریباً تمام سربرآوردہ ٹرسٹی آنریبل سید محمود کے بجائے کسی دوسرے کو سکرٹری مقرر کرنا چاہتے تھے، البتہ اکثر لوگوں کا یہ خیال ضرور تھا کہ سید محمود کے حقوق اور خدمات کے لحاظ سے اُن کو کوئی اور معزز عہدہ دیا جائے جس میں زیادہ ذمہ داریاں نہ ہوں، لیکن اُن کا اعزاز علی حالہ قایم رہے، چنانچہ پریسیڈنٹ کا عہدہ اُن کے لیئے تجویز کیا گیا، جو جنوری ۱۸۹۵ء کے اجلاس میں منظوری کے لیئے پیش ہونے والا تھا، نواب وقار الملک اس معاملہ کے متعلق بھی ایک خاص رائے رکھتے تھے جو اُن کے الفاظ میں حسب ذیل ہے :-

"جناب آنریبل جے جے ڈی لاٹوش صاحب بہادر بالقابہ کی تشریف آوری علی گڑھ کے زمانہ میں جبکہ اُن ٹرسٹیوں کی جو علیگڑھ میں موجود تھے، ایک پرائیویٹ میٹنگ ہوئی تھی اور جس میں آنریبل سید محمود صاحب کی پریسیڈنسی کا مسئلہ پیش ہوا تھا تو میں نے اس سے اختلاف کیا تھا اور میرے اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ آنریبل سید محمود صاحب کا مزاج اس قدر طوالت پسند واقع ہوا ہے کہ جس میٹنگ میں وہ پریسیڈنٹ ہونگے اُس کی کارروائی میں تکلیف دہ طوالت ہوگی اور اُس سے

کام میں ہرج واقع ہوگا لیکن اسی کے ساتھ میری یہ رائے ضرور تھی کہ اُن کے حقوق اور خدمات سے چشم پوشی نہ کی جائے، اُن کے لیئے کوئی ایسا عہدہ تجویز کیا جائے جو منزلت میں پریسیڈنٹ کے عہدہ سے بھی فائق تر ہو یہاں تک کہ اُن کو وزیر بنا دیا جائے تو بھی مجکو عذر نہیں ہی یا کوئی اور عہدہ خاص اُن کے لیئے قانون میں تصنیف کیا جائے جس سے اُن کے حقوق و خدمات کا ٹرسٹیوں کی طرف سے اعتراف ہوتا ہے، اور نیز جس کے ذریعہ سے جناب آنریبل سید محمود صاحب کا تعلق مستقل طور سے کالج کے ساتھ قایم رہے اور اپنی بے نظیر اور خداداد قابلیت سے جو کچھ کام کہ وہ کالج کیواسطے کرنا چاہیں وہ کر سکیں اور قوم بہ شکرگزاری اُس سے متمتع ہوتی رہے اور جب اس آخر الذکر حیثیت سے وہ کوئی کام کالج کے لیئے کرینگے تو ظاہر ہی کہ وہ اس قسم کا کام ہوگا کہ خواہ کتنی ہی دیر میں ہو اُس کی وجہ سے کالج کے روزانہ کام میں کچھ ہرج نہ ہوگا۔

لیکن جب میں نے دیکھا کہ باقی جملہ ٹرسٹیان موجودہ وقت پریسیڈنسی کے عہدہ ہی کو اُن کے لیئے پسند کرتے ہیں تو میں نے بھی اپنی رائے پر اصرار چھوڑ دیا جو مجارٹی کے سامنے محض ایک بے فائدہ سی بات تھی، اور اب بھی اگرچہ میری اصلی رائے تو وہی ہی جو میں اوپر بیان کر چکا ہوں، لیکن جہاں تک مجکو معلوم ہوا ہی چونکہ جناب سید محمود صاحب اور دیگر حضرات ٹرسٹیز اور نیز گورنمنٹ اُن کے لیئے لائف آنریری پریسیڈنٹ ہی کے عہدہ کو مناسب سمجھتی ہی تو مجکو اُس میں عذر نہیں ہی، اور میں دعا کرتا ہوں کہ وہ اس عہدہ کے فرایض کو کامیابی کے ساتھ انجام دیں اور مجکو بہت خوشی ہوگی یہ دیکھ کر کہ جو کچھ میں نے خیال کیا تھا وہ غلط تھا۔

غرض ۳۱ر جنوری ۱۸۹۹ء کو ٹرسٹیوں کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا، اور خلیفہ سید محمد حسین صاحب وزیر پٹیالہ کی تحریک اور ۵۳ ووٹوں کی تائید سے سید محمود سکرٹری شپ سے علیحدہ ہو کر پریسیڈنٹ مقرر ہوئے اور نواب محسن الملک آنریری سکرٹری تجویز کیے گئے، نواب وقار الملک نے اگرچہ اجلاس میں ان تجاویز سے کوئی اختلاف نہیں کیا، لیکن وہ بدستور اپنی رائے پر قایم رہے، اور چند روز کے تجربہ کے بعد ثابت ہو گیا کہ اُن کی رائے صحیح تھی، کیونکہ کچھ مدت بعد سید محمود صاحب کو اس عہدہ سے علیحدہ کرنے کی تجویز بھی زیر بحث آئی، اور اس علیحدگی کے متعلق ۵۵ ٹرسٹیوں کی منظوری حاصل ہو گئی۔

نواب وقار الملک نے اجلاس میں سید محمود کے متعلق اپنی گزشتہ رائے کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا:-

"یہ تھی میری رائے آنریبل سید محمود کے عہدہ پریسیڈنٹی کی نسبت، اور افسوس ہے کہ مجکو وہ خوشی حاصل نہ ہو سکی جس کی میں نے اپنے مذکورہ بالا فقرہ کے آخر میں تمنا کی تھی اور بدقسمتی سے وہی سب کچھ مع شیئ زائد ثابت ہوا جس کا مجکو اسوقت خطرہ تھا۔ میں آج کے اجلاس سے دو روز پیشتر علی گڑھ آیا ہوں اور اس کی زیادہ تر غرض یہی تھی کہ اس عرصہ میں بذات خود میں جناب ممدوح کی حالت صحت کو غور سے دیکھتا رہا ہوں اور اس تمام ذاتی تجربہ کے بعد میں بافسوس تمام پیش شدہ تحریک سے اپنے آپ کو متفق پانے میں مجبور ہوں یعنی کہ آنریبل سید محمود پریسیڈنٹی کے عہدہ سے علیحدہ کیے جائیں میں نے جناب ممدوح کو یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی ناسازی طبیعت کی بنیاد پر خود اس عہدہ سے دستکش ہوں جس کے بعد کامل یقین ہے کہ ٹرسٹی اُن کے لیے نہایت خوشی سے کوئی اور زیادہ معزز عہدہ تجویز کرینگے، لیکن اس کوشش میں مجکو کامیابی نہیں ہوئی۔

باایں ہمہ بعد اس کے کہ جناب ممدوح پریسیڈنٹی کے عہدہ سے علیحدہ کیے

جائیں آیندہ کے لیئے اُن کی نسبت میری رائے پھر دہی ہے جو میں اپنی گزشتہ سال کی یادداشت کے مذکورہ بالا فقرہ ۲ میں بیان کرچکا ہوں یعنی یہ کوئی اور معزز تر عہدہ اُن کے لیئے تجویز کیا جائے اسی موقع پر میں یہ بھی بیان کردینا چاہتا ہوں کہ سید محمود صاحب کے خلاف دو تحریکیں ہمارے سامنے پیش ہوئی ہیں ایک مسٹر تھیوڈر مارلسین صاحب پرنسپل کی طرف سے اور دوسری نواب محسن الملک بہادر آنریری سکرٹری کی طرف سے اور دونوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اگر سید محمود صاحب عہدہ آنریری پریسیڈنٹی سے علیحدہ نہ کیئے گئے تو وہ اپنے اپنے عہدوں کو چھوڑ دینگے ہیں ان دونوں تحریکوں کی نسبت جنھوں نے کالج میں قدم رکھنے سے پہلے اس بات کو ظاہر کردیا کہ وہ اپنی تحریک کی منظوری کے بدون پرنسپلی کا عہدہ قبول کرنے سے قاصر رہینگے یہ ایک شریفانہ کارروائی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے اس معاملہ میں جو رائے دی ہے وہ اس بنیاد پر مبنی نہیں ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو کون شخص اپنا عہدہ چھوڑ دیگا اور کون نہیں۔

ایک مسٹر مارلسین نہیں پچاس مارلسین، اور ایک نواب محسن الملک بہادر نہیں، سو محسن الملک بھی ایسی دھمکی دیتے اور اُنکے ساتھ کالج اور اسکول کا تمام اسٹاف، اور اسکول اور کالج کے تمام طلبہ اور بورڈر بھی اس قسم کی دھمکی میں شریک ہوتے، مگر سید محمود کی حالت صحت، درست ہوتی اور کالج کا کام وہ میری دانست میں اچھی طرح کرسکتے ہوتے تو میں ایک دفعہ اسکول و کالج، اور بورڈنگ ہاؤس کا بالکل خالی ہوجانا پسند کرتا، بہ نسبت اس کے کہ اس قسم کے دباؤ کی وجہ سے میں سید محمود صاحب

لہ نواب صاحب کی جس تحریر سے ہم نے یہ عبارت نقل کی ہے وہ اُن کے ہاتھ کی لکھی ہوتی نہیں، انداز سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نقل کرنے والے سے کچھ سہو نقل عبارت میں ہوا ہے اور کوئی لفظ لکھنے سے چھوٹ گیا ہے۔

(ندوی)

کے خلاف کوئی رائے دیتا، لیکن کیا کیا جائے کہ جناب ممدوح کی حالت صحت ہی
کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ ہم کو بہ مجبوری محض کالج کے فائدے کی غرض سے اُن کو عہدۂ
لائف آنریری پریسیڈنٹ سے سبکدوش کرنے کی رائے دینی پڑی ہے۔"

غرض کثرت رائے سے آنریبل سید محمود پریسیڈنٹی کے عہدہ سے ہٹا کر وزیٹر بنائے گئے جو محض ایک اعزازی عہدہ تھا۔

جدید پریسیڈنٹ کے انتخاب کا معاملہ

اب جدید پریسیڈنٹ کے انتخاب کا مسئلہ زیر بحث آیا، جس کے لئے نواب ممتاز الدولہ فیاض علی خاں صاحب کا نام پیش کیا گیا جو ضلع بلند شہر اور علی گڑھ کے ایک ممتاز رئیس تھے اور کالج سے خاندانی تعلق رکھتے تھے۔ نواب وقار الملک نے اس موقع پر زبردست اختلاف کیا اور اس پر اصرار کیا کہ جو اختیارات سید محمود کو اُن کی مخصوص قابلیت اور شخصیت کی بنا پر حاصل تھے، وہ کسی دوسرے پریسیڈنٹ کو نہ دیئے جائیں اُنھوں نے طویل بحث کر کے متعدد دلائل سے ثابت کیا کہ انتظامی سہولت کے لحاظ سے یہ اختیارات آنریری سکرٹری (نواب محسن الملک) کو دیئے جائیں۔ اُن کی رائے تھی کہ سرسید مرحوم نے اپنی نظیر دکھلا کر قوم میں ایک ایسا معزز عہدہ پیدا کر دیا ہے جس کے متعلق مختصر لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک طرف تو وہ قوم کا پولیٹکل لیڈر رہے اور دوسری طرف گورنمنٹ کا معتمد علیہ، اور اس دُہرے اعتماد کی وجہ سے جو فوائد کہ اس سے قوم و ملک کو پہنچ سکتے ہیں وہ محتاج بیان نہیں ہیں اور اب ہماری سب سے بڑی دانشمندی اس میں ہے کہ اس عہدہ کو اپنے میں برقرار رکھیں، اور وہ صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے آنریری سکرٹری پر کامل بھروسہ کریں اور اُن کے اختیارات کی قطع برید کر کے اُن کو ایسا بے دست و پا نہ کر دیں جس سے وہ خود کالج کے انتظاموں میں بسا اوقات اپنے آپ کو قاصر سمجھیں جیسا کہ ابھی حال میں ایک موقع پر ہو چکا ہے، اور جس کو آیندہ ایک دوسری بحث میں اسی وقت بیان کرنے کو ہوں۔

اصلاح گھر سے شروع ہوا کرتی ہے، اور خود کالج کے کاروبار کے ذریعہ سے یہ ثابت ہونا چاہیئے کہ کالج کمیٹی کے سکرٹری کا عہدہ کس قدر معزز اور باعتبار عہدہ ہے، جس قدر عظمت وشان ایک ایسے عہدہ کے ساتھ وابستہ ہوگی اسی قدر اس عہدہ دار کی آواز زیادہ پُراثر ہوگی۔ جس قدر احتیاط بھی کہ درکار ہے وہ سکرٹری کے انتخاب کے وقت ہے۔ مگر بعد اس کے کہ کسی کو سرسید صاحب مرحوم کا جانشین مان لیا جائے، پھر اُس پر اعتماد نہ کرنا اور قانون کے ذریعہ سے اس کی روک تھام کرنا خلاف اُصول ہے انتخاب کی غلطی انتخاب سے درست ہوا کرتی ہے، اور قانون کی غلطی قانون سے انتخاب کی غلطی کو قانون سے درست کرنے کا خیال ایک خیال ہے جس سے انتظامی کل کی کبھی درستی نہیں ہو سکتی۔"

باوجود نواب وقار الملک کے اُصولی اختلاف کے نواب فیاض علی خاں بہادر اپنی وجاہت کی بدولت پریسیڈنٹ مقرر ہو گئے البتہ اب لائف کا لفظ پریسیڈنٹ کے نام سے خارج کر دیا گیا، اور ایک معینہ مدت کے لیئے یہ انتخاب عمل میں آیا۔



سلیکٹ کمیٹی کی تحریک اور ترمیم قانون میں سعی

ٹرسٹیوں کے قواعد وقوانین کا مجموعہ سرسید کی زندگی میں ۱۸۹۳ء چھاپا گیا تھا، اس کے بعد مختلف اوقات میں خود سرسید کے زمانہ میں اس میں ترمیم ہوتی رہی اور اُن کی وفات کے بعد جنوری ۱۸۹۹ء کے اجلاس میں بہت زیادہ ترمیم ہوئی، لیکن اس ترمیم شدہ مجموعہ کے دوبارہ چھپنے کی نوبت نہ آئی، اور ابھی اس میں اور اصلاح وترمیم کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ چنانچہ ۳۰ جنوری ۱۹۰۰ء کے اجلاس میں حسب ذیل تجویز پاس ہوئی:۔

نواب وقار الملک، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، مرزا عابد علی بیگ صاحب، محمد موسیٰ خاں صاحب	یہ جلسہ ایک سلیکٹ کمیٹی مقرر کرتا ہے، جس میں مندرجہ حاشیہ ممبر اور نواب وقار الملک بہادر اُس کے سکرٹری ہونگے یہ سلیکٹ کمیٹی موجودہ مجموعہ قواعد وقوانین ٹرسٹیان پر

اوّل سے آخر تک غور کرے اور جو امور اس مجموعہ میں ترمیم و اصلاح کے قابل ہوں
اُن کو پیش کرے اور سب کمیٹی مجاز ہوگی کہ جس ٹرسٹی کو مناسب سمجھے سلیکٹ کمیٹی میں
بطور ممبر کے شریک کرے۔"

اس تجویز کے منظور ہو جانے کے بعد نواب وقار الملک نے نواب محسن الملک سے یہ خواہش کی کہ چونکہ اس وقت کوئی مکمل اور اصلاح شدہ مجموعۂ قوانین مکرر غور کرنے کے لئے ٹرسٹیوں کے ہاتھ میں چھپا ہوا موجود نہیں ہے، لہٰذا،

"مہربانی فرما کر وہ ایک مجموعہ قواعد و قوانین ٹرسٹیان اس وقت تک کی ترمیمات
کے لحاظ سے ازسرِ نو چھپوا کر ٹرسٹیوں میں اول تقسیم فرمائیں اس کے بعد مجوزہ سلیکٹ
کمیٹی کو البتہ کارروائی کا موقع ملیگا۔"

چنانچہ **نواب محسن الملک** نے ازسرِ نو یہ مجموعہ معہ مفصّل فہرست کے شایع کر دیا، اور ماہ مئی میں **نواب وقار الملک** نے ایک مطبوعہ خط تمام ٹرسٹیوں کے نام بھیجکر یہ درخواست کی کہ وہ جن دفعات میں اصلاح و ترمیم کی ضرورت محسوس کرتے ہوں، اُس سے دو مہینہ کے اندر اطلاع دیں، لیکن صرف ۶ ٹرسٹیوں نے اپنی رائے سے اطلاع دی۔

اِسی زمانہ میں اُن کو معلوم ہوا کہ آنریبل سید محمود صاحب بھی سلیکٹ کمیٹی میں شرکت کرنے کے لئے تیار ہیں لہٰذا وہ بھی شریک کیئے گئے اس کے بعد ۲۵ ر اپریل ۱۹۰۱ء کو سلیکٹ کمیٹی کے ایک اجلاس میں سید محمود صاحب سلیکٹ کمیٹی کے پریسیڈنٹ اور سید محمد احمد خاں اسسٹنٹ سکریٹری بنائے گئے۔

اگرچہ سید محمود صاحب کی خاص حالت اور ناسازی طبع کی وجہ سے اُن کے ساتھ مسلسل کام کرنا مشکل تھا، تاہم نواب وقار الملک نے حتی الامکان ان کو کام پر راغب کیا، اور اس ضرورت سے بار بار علی گڑھ و سیتاپور گئے، اس کے علاوہ اُنھوں نے چند اور قابل ٹرسٹیوں کو بھی سلیکٹ کمیٹی کا ممبر بنایا، اور جون ۱۹۰۱ء میں سید محمود صاحب کے پاس سیتاپور میں قریباً

ایک ماہ رہ کر سلیکٹ کمیٹی کے متعدد اجلاس منعقد کیئے، اور بڑی محنت سے اصلاح و ترمیم کا کام انجام دیا۔ اکتوبر سنہ ۱۹۰۱ء میں نواب وقار الملک نے بعض مصالح سے سلیکٹ کمیٹی کے عہدہ سے استعفاء دیدیا، اور مرزا عابد علی بیگ صاحب اُن کی جگہ سکریٹری مقرر ہوئے۔ انھوں نے نومبر سنہ ۱۹۰۱ء میں اصلاح قوانین کے متعلق ایک مفصل رپورٹ پیش کی۔ اس کے بعد سید محمود صاحب پریسیڈنٹ سلیکٹ کمیٹی نے دسمبر سنہ ۱۹۰۱ء میں ایک یادداشت شائع کی جس میں نواب وقار الملک کی خدمات کا اعتراف کیا، غرض اکثر قانونی ترمیمات اجلاس سالانہ میں منظور کی گئیں، اور اس طریقہ سے خود بخود بہت سی چیزوں کی اصلاح ہو گئی۔

ایک جدید دشواری کا مقابلہ

کالج ابھی پرانی مشکلات سے عہدہ برآ نہیں ہوا تھا کہ اس کو ایک جدید دشواری کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اسی زمانہ میں سر انٹونی مکڈانل کی گورنمنٹ نے ہندی کے متعلق اپنا مشہور رزولیوشن صادر کیا، جس کے ممالک متحدہ کے مسلمانوں میں ایک عام اضطراب پیدا ہو گیا، چونکہ اس زمانہ میں علی گڑھ مسلمانوں کا سیاسی مرکز بھی تھا، اور کالج کا سکریٹری مسلمانوں کا سیاسی رہنما سمجھا جاتا تھا، اس لیئے نواب محسن الملک نے مسلمانوں کی عام رائے سے متاثر ہو کر اس ایجیٹیشن میں حصہ لیا جو اس رزولیوشن کے خلاف ملک میں برپا تھا، یہاں تک کہ لکھنؤ کے ایک عام جلسہ میں اس کے متعلق ایک معرکۃ الآراء تقریر کی۔ سر انٹونی میکڈانل کو یہ امر گراں گزرا اور انھوں نے کالج کے پرنسپل مسٹر مارسین کے ذریعہ سے نواب محسن الملک کو متنبہ کیا کہ وہ اس ایجیٹیشن میں حصہ نہ لیں اس تنبیہ سے برداشتہ خاطر ہو کر نواب محسن الملک نے سکریٹری شپ سے استعفا دے دیا، اس پر لفٹنٹ گورنر کو اور زیادہ برہمی پیدا ہوئی اور انھوں نے مسٹر مارسین کے ذریعہ سے ٹرسٹیوں کو اطلاع دی کہ :-

"استعفے کا منظور کرنا یا نہ کرنا ٹرسٹیوں کا کام ہے لیکن موجودگی ان تعلقات کے جو گورنمنٹ اور مدرسۃ العلوم کے درمیان قایم ہیں، یہ امر ٹرسٹیوں کے معتمد

ریپریزنٹیٹو کے مناسب نہیں کہ بغیر اس کے کہ ٹرسٹیوں کی رائے سے گورنمنٹ کو مطلع کیا جائے وہ ایک باضابطہ ایجٹیشن کا بانی مبانی ہو جو گورنمنٹ کی ایک تجویز کے خلاف کی گئی ہو۔"

اسی سلسلہ میں سرسید کی پالیسی کا ذکر کرنے کے بعد لکھا:۔

"یہ امر نہایت نامستحسن ہے کہ وہ لوگ جو سرسید احمد کے کام کو جاری رکھنا چاہتے ہیں یا جو اُن کے قایم مقام ہونے کی کوشش کرتے ہیں گورنمنٹ پر اعتماد اور بھروسہ کرنے کی پالیسی چھوڑ دیں۔"

اس ناگوار چٹھی کے بعد یہ معاملہ اور زیادہ پیچیدہ اور معرکۃ الآرا بن گیا، نواب وقارالملک کو اصولاً اس پر اصرار تھا کہ استعفا واپس لیا جائے، اور چونکہ درصورت نواب محسن الملک کے استعفا واپس نہ لینے کے اُن کا نام بھی سکرٹری کے عہدہ کے لیئے پیش کیا گیا تھا، اس لیئے اُنھوں نے بالکل مجبوری کی صورت میں جب کہ کوئی شخص بھی اس عہدہ کو قبول نہ کرے اور نواب محسن الملک کسی طرح استعفا واپس لینے پر آمادہ نہ ہوں، اپنی منظوری اس عہدہ کے لیئے ظاہر کر دی تھی لیکن آخر میں صاف لکھ دیا تھا کہ:۔

"لیکن پھر میں وہی عرض کرونگا جو اول کر چکا ہوں کہ میرا انتخاب کوئی صحیح انتخاب نہ ہوگا۔"

غرض اُن کی تمام تر کوشش یہی تھی کہ نواب محسن الملک اپنا استعفا واپس لیں، ابھی یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ سرانٹونی میکڈانل کا دورِ حکومت ختم ہو گیا اور سرجیمس لاٹوش اُن کے جانشین ہوئے، اُن کو کالج سے اور مسلمانوں کی تعلیمی ترقی سے ایک گونہ دلچسپی تھی، اُن کے عہد میں بھی یہ مسئلہ پیش ہوا۔ نواب وقارالملک نے ہز آنر سے ملاقات کی، اور نواب محسن الملک کی دست کشی کے وجوہ و اسباب بیان کر کے مشکلات پر توجہ دلائی۔

بہرحال مارچ ۱۹۰۲ء میں ہز آنر نے کالج آنے کا ارادہ ظاہر کیا، اور نواب سر محمد فیاض علیخاں

کے ذریعہ سے عام ٹرسٹیوں خصوصاً **نواب محسن الملک** اور **نواب وقار الملک** کو مطلع کیا کہ اس موقع پر وہ اُن سے ایک پرائیوٹ ملاقات کرینگے۔

غرض ہز آنر آئے اور گفتگو ہوئی، اُنھوں نے صاف طور پر ظاہر کردیا کہ گورنمنٹ کسی کی آزادی کو نہیں روکتی، اس پر نواب محسن الملک دوبارہ کام کرنے پر آمادہ ہوگئے، اور نواب وقار الملک نے ہز آنر کے اس منصفانہ رویہ پر شکریہ ادا کیا، اور یہ ناگوار معاملہ بخیر وخوبی ختم ہوگیا۔



نواب محسن الملک سے اختلاف

نواب محسن الملک اور **نواب وقار الملک** کی طبائع، طریق عمل اور پالیسی میں ہمیشہ سے اختلاف تھا، چنانچہ حیدرآباد کے زمانہ قیام میں اس اختلاف کی وجہ سے بعض اوقات باہمی بے لطفی تک نوبت پہنچ گئی، لیکن کالج کے معاملات میں ۱۹۰۴ء تک کوئی ایسا اہم اختلاف پیش نہیں آیا جو قابل تذکرہ ہو، لیکن ۱۹۰۴ء جب کہ مسٹر ماریسن بعض وجوہ سے کالج کو چھوڑنے والے تھے: اُنھوں نے یہ چاہا کہ اپنے جانشین کا انتخاب اپنے سامنے ہی کرجائیں چنانچہ اُنھوں نے بہ خیال خود ایک بہترین شخص یعنی ایک سینیر پروفیسر مسٹر کارنا کا نام پیش کیا۔

آنریری سکرٹری نے کسی قدر تردد وتامل کے بعد ایک حد تک اس سفارش کو منظور کرلیا، مگر جب مسٹر کارنا کی نامزدگی کی خبر شائع ہوئی تو پبلک نے اُس کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ نواب وقار الملک نے بھی اس انتخاب سے اختلاف کیا۔ پہلے اُنھوں نے پرائیوٹ طور پر آنریری سکرٹری کو یہ مشورہ دیا کہ وہ مسٹر کارنا کا انتخاب نہ کریں، لیکن جب اُن کا رجحان اسی طرف پایا، اور یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ مسٹر کارنا کا انتخاب ہوجائیگا، تو اُنھوں نے پوری قوت کے ساتھ باقاعدہ اختلاف شروع کردیا، اور اکثر ٹرسٹیوں کو اپنا ہم آہنگ بنالیا، اخباروں میں بھی مسٹر کارنا کے معاملہ پر بحث چھڑ گئی۔ اولڈ بوائز نے بھی مخالفت کا اظہار کیا، غرض اس معاملہ نے ایک

خاص شورش پیدا کردی، اصلی بنائے اختلاف یہ تھی کہ طلبہ کے ساتھ مسٹر کارنا کا طرز عمل سخت اور ناقابل اطمینان تھا، اور مختلف مواقع پر اُنھوں نے لڑکوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا تھا جو ناقابل برداشت تھا، اور جس سے اُن کے غرور حکومت اور تعصب کا اظہار ہوتا تھا۔

نواب وقار الملک نے ۲۲ راگست ۱۹۰۴ء کو ایک مفصل خط بھی ٹرسٹیوں کے نام روانہ کیا، اس خط میں اُنھوں نے یہ بتایا ہو کہ کالج قایم کرنے سے سرسید کا مقصد کیا تھا، اور مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق وہ کس قدر بلند نصب العین رکھتے تھے۔ لیکن

"اب ان مقاصد کے متعلق مسٹر کارنا کی وسیع نظر پر غور کیجئے، ایک عرصہ میں اُن کی یہ رائے رہی کہ علی گڑھ کو صرف ہائی اسکول تک رکھنا مناسب ہے، اور ایک موقع پر اُنھوں نے فرمایا کہ انگلش تعلیم کی بہ نسبت مسلمانوں کو نعلبندی کی تعلیم زیادہ فائدہ بخش ہوگی"۔

مسٹر کارنا کی بد دماغی کی حالت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"بورڈنگ ہاؤس کے ملازموں سے اُنھوں نے فرمایا کہ تمھاری عشا اور صبح کے وقت کی اذان سے مجکو بہت تکلیف ہوتی ہی، اگر تم اس کو بند نہ کروگے، تو میں تمھارے نماز کے چبوترے کو اُکھاڑ کر پھینکدونگا"۔

"بارہ وفات کی تعطیل جو کالج میں ہمیشہ ہوتی تھی اُنھوں نے بند کی اور جب نواب محسن الملک بہادر کی ہدایت سے طلبہ نے اُن کے بنگلہ پر جاکر اُن سے تعطیل کی درخواست کی، تاکہ اُن کو مجلس میلاد شریف منعقد کرنے کے واسطے وقت ملے تو اُن کے ساتھ وہ نہایت درشتی سے پیش آئے"۔

اس کے بعد مسٹر کارنا کی غیر ہر دل عزیزی کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"پُرانے کامیاب طالب علم جن پر کالج فخر کر سکتا ہی، اور جو ہمارے بعد کالج کے اصلی محافظ اور اُس کے متولی ہونگے اُن میں سے بھی جس قدر لوگ اس عرصہ میں مجھ سے

ملے ہیں سب کو بلا اختلاف اور بلا استثنا کسی ایک کے بھی میں نے اس موقع پر مسٹر کارنا کے خلاف پایا ہے، اور علی العموم ہر ایک کے نزدیک مسٹر کارنا کی پرنسپلی کالج کے حق میں سخت خطرناک مسئلہ ہے۔"

اسی خط میں ایک اور موقع پر لکھتے ہیں :۔

"اور اب جو غیر ہر دل عزیزی مسٹر کارنا کو حاصل ہوئی ہے اُن کی مسلسل بد اخلاقیوں کا ثمرہ ہے اور جس نے ثابت کر دیا ہے کہ اُن کا نیچر ہی کچھ اس قسم کا واقع ہوا ہے۔"

ایک طرف تو یہ حالت تھی، دوسری طرف مسٹر ماریسن پوری قوت سے مسٹر کارنا کی حمایت کر رہے تھے، اُنھوں نے نواب محسن الملک کو متعدد پرزور چٹھیاں لکھیں جو چھاپ کر ٹرسٹیوں کے پاس بھیجی گئیں۔ نواب وقار الملک نے مسٹر مارسین کے ان دلائل پر بھی تنقید کی جو مسٹر کارنا کی تائید میں ان چھٹیوں میں پیش کیئے گئے تھے، اور اس طرز عمل پر نکتہ چینی بھی کی، جو نواب محسن الملک نے اس موقع پر اختیار کیا تھا۔ لیکن یہ سب کارروائیاں بصیغہ راز تھیں جو ٹرسٹیوں کے حلقہ تک محدود تھیں، اخبارات میں بحث چھیڑنا اُنھوں نے پسند نہیں کیا، لیکن با ایں ہمہ لوگوں کو اُن کے اختلاف کا حال معلوم تھا، اس لیئے اولڈ بوائز اور دوسرے مسلمانوں کے بکثرت خطوط تائید و حمایت میں اُن کے پاس آتے تھے۔

نواب وقار الملک اور اکثر سر برآوردہ ٹرسٹیوں کی یہ رائے تھی کہ مسٹر مارسین کی جگہ پر کوئی قابل شخص انگلستان سے بلایا جائے لیکن خود مسٹر مارسین کو اس تجویز سے اختلاف تھا، اور نواب محسن الملک کو یہ عذر تھا کہ ہر چند کوشش کی گئی لیکن انگلستان میں کوئی شخص ہمارے کام کے لایق نہیں ملا۔ اس پر بعض لوگوں نے چند ایسے قابل انگریزوں کے نام پیش کیئے جو ہندوستان کے سر رشتہ تعلیم میں موجود تھے اور جن کا تجربہ مسلم تھا، لیکن فرضی مشکلات پیش کر کے ان لوگوں کو بھی ڈرا دیا گیا، تاکہ مسٹر کارنا کے لیئے راستہ صاف ہو جائے۔

چونکہ اکثر سر برآوردہ ٹرسٹیوں سے نواب وقار الملک کی خط و کتابت اس مسئلہ پر

جاری تھی، خصوصاً مولنٰنا حالی اس معاملہ میں پورے طور پر اُن کے ہم آہنگ تھے، اور دہلی وغیرہ کے ٹرسٹیوں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کر رہے تھے، اس لیئے اُنھوں نے مولانا حالی کو ایک مفصل خط بصیغہ راز اسی زمانہ میں لکھا جو کالج کے واقعات کے سلسلہ میں خاص اہمیت رکھتا ہے، اِس لیئے اس کے بعض حصے اس موقع پر نقل کیئے جاتے ہیں۔ نواب صاحب لکھتے ہیں:-

"جناب سید جعفر حسین صاحب نے جناب کا والا نامہ رقمزدہ ۱۳ ستمبر جو ان کے نام تھا اُس کا پہلا حصہ متعلق مشر کا رنا میرے دیکھنے کو بھیجا ہے۔ جو کوشش کہ کالج کے اس اہم مسئلہ کے متعلق جناب نے فرمائی اور فرما رہے ہیں وہ کچھ نئی نہیں ہے، کالج اور قوم دونوں ہمیشہ اس کے مشکور رہے ہیں لیکن ایک خاص مضمون بہت ہی کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اگر جناب سر سید مرحوم و مغفور ایک مہینہ بھی اور زندہ رہتے تو جناب اور نواب محسن الملک بہادر اور خاکسار کے دستخطوں سے ایک یادداشت ٹرسٹیوں میں جاری ہو رہی چلی تھی کہ کالج کی خبر لیں اور اس کو یورپین اسٹاف کے ہاتھوں میں چلے جانے سے روکیں۔

میں جو اب کی مرتبہ علی گڑھ گیا تھا تو نواب محسن الملک بہادر کو میں نے وہ واقعہ یاد دلایا کہ جس سے میری غرض یہ تھی کہ ایک تو وہ وقت تھا کہ جب وہ اس مقصد کے واسطے سر سید کی بھی پروانہ کرتے تھے، یا آج وہ دن ہے کہ آپ خود اس سے زیادہ غلطیاں کر رہے ہیں، اور دوسروں کو اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ کالج کو اور قوم کو اسی قسم کے نقصان سے محفوظ رکھنے کے واسطے آپ کے خلاف کوشش کریں، جناب نے جو کچھ کہ ازراہِ دوراندیشی ارشاد فرمایا ہے وہ ضرور قابل غور ہے اور اس کے علاوہ عالی جناب نواب محسن الملک بہادر جو ایک بات فرماتے ہیں وہ بھی توجہ کے قابل ہے، اور وہ یہ کہ اگر یورپین اسٹاف ہم سے بددل ہو جائے اور انگلستان و ہندوستان میں اُس کا غل مچا دے کہ علی گڑھ کالج میں کوئی قاعدہ

وہ اُصول باقی نہیں ہے اور سٹر حاکموں کی حکومت وہاں برداشت کرنی پڑتی ہے تو پھر آیندہ کسی یوروپین پروفیسر کا میسر آنا بھی مشکل ہے، لیکن اس کے ساتھ اب یہ بات دیکھنے کے قابل ہے کہ اس وقت ان خیالات کو کہاں تک وقعت دینی چاہیئے۔

مسٹر ماریسن کی نسبت اوّل تو آپ یقین کریں کہ جس روز سے کالج میں بائبل کی تعلیم بند کرنے اور مشنری لیڈیز کی مزاحمت کا واقعہ پیش آیا ہے، جس کی اطلاع غالباً جناب کو مفصل ہوئی ہوگی، اُس روز سے مسٹر ماریسن وہ پہلے سے مسٹر ماریسن نہیں رہے ہیں اور اب اُن کی اخلاقی حالت طلبہ کے ساتھ یہ ہے کہ اپنی کوٹھی پر طلبہ کو آنے کی اُنھوں نے قطعی ممانعت کردی ہے اُن کو اس گزشتہ مزاحمت سے سخت برہمی پیدا ہوگئی ہے اور علی گڑھ میں جو ٹرسٹی ہر وقت بود و باش اور وہاں سے تعلق رکھتے ہیں اُنکی متفقہ اور قطعی رائے یہ ہے کہ مسٹر کارنا اور دوسرے اسٹاف کے طبائع کی موجودہ حالت مسٹر ماریسن کی اس متبدلہ کیفیت کے اثر سے ہے، اور اب جو دن کہ مسٹر ماریسن کے تشریف لے جانے کے باقی ہیں خدا کرے کہ وہ خیر و عافیت سے بسر ہوجائیں، اور شکریوں کے نعروں ہی میں رخصت ہوں ورنہ بہت اندیشہ ہے کہ آیندہ اس ۵-۶ مہینے کے عرصہ میں وہ واقعات پیش نہ آجائیں جس سے علانیہ کشمکش پیدا ہوجائے اور بے لطفی ترقی کرجائے۔ نواب محسن الملک بہادر کی حالت یہ ہے کہ جیسے کوئی شخص ایک فرضی ہوّے کی شکل خود ہی بنجائے اور پھر خود ہی اس سے بچوں کو ڈرائے، اُن کی تمام ترکارروائی اس معاملہ میں صاف بتا رہی ہے کہ وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں اُس کی غایت صرف یہ ہے کہ مسٹر ماریسن کو وہ خوش رکھیں"۔

اس کے بعد انگلستان سے کسی شخص کے انتخاب پر بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"مسٹر ماریسن کہتے ہیں کہ کارنا واپس چلے جائینگے، پھر قبول ہے ان کو جانے دو ان کے قایم مقاموں کا ملنا مشکل نہ ہوگا بشرطیکہ فیصلہ جلد ہو اور آپ خوب غور سے

دیکھئے کہ نواب صاحب اس کو لیت ولعل میں ڈال رہے ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ قانوناً انتخاب کا حق صرف آنریری سکرٹری کو ہے، ٹرسٹی صرف یہ کرسکتے ہیں کہ اس انتخاب کو نامنظور کردیں اس کے بعد دوسرا انتخاب صرف میں ہی کرسکتا ہوں، ٹرسٹی اپنی طرف سے کوئی نام پیش کرکے اس کی منظوری نہیں حاصل کرسکتے۔ لیکن بڑی خیریت یہ ہے کہ اُن کی **سکرٹری شپ** کی میعاد اسی آیندہ سالانہ جلسہ تک ہے اور اُن کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ ٹرسٹیوں کو یہ حق تو ہے کہ وہ اس سالانہ جلسہ میں انھیں کو آیندہ کے لیے منتخب نہ کریں۔"

اس کے بعد چند اشخاص پر بحث کرکے لکھتے ہیں :-

"اب ذرا اس موقع پر اس پر بھی غور کیجئے کہ مسٹر ماریسن نے کارنا کے واسطے کیسی غیر معمولی کوشش کی سب سے پہلے تو اُنھوں نے **مسٹر آرنلڈ** کو جب وہ لاہور ہی میں تھے روکا اور اُن کو صاف لکھدیا کہ تم سے پرنسپلی کا کام نہ چلیگا، اور ان سادہ مزاج مگر شریف انسان نے اس کو قبول کرلیا۔

نواب محسن الملک بہادر سے جب اس پر علی گڑھ میں گفتگو ہوئی تو وہ اب قبول کرتے ہیں کہ آرنلڈ صاحب کا وہ جواب اصلی اور دلی نہ تھا، بلکہ محض مارنسین صاحب کے اثر سے تھا، اب غور فرمائیے کہ وہی آرنلڈ صاحب ہیں کہ جن کو سارا جہان اس پرنسپلی کے لیئے موزوں تجویز کررہا ہے اور اُن کے آنے کی دعائیں مانگ رہا ہے اِلّا ایک مارسین۔"

اِس کے بعد اسی قسم کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ **مسٹر کیری** پرنسپل بریلی کالج کو بھی مسٹر مارسین نے اسی طریقہ سے روکا۔ پھر لکھتے ہیں :-

"بہر حال کچھ بھی ہو، مسٹر مارسین کی رائے کو اس معاملہ میں ایک آزاد رائے کی وقعت نہیں دی جاسکتی خصوصاً جب کہ اُن کو اس بات کے اظہار کے وقت کچھ بھی

خدا کا خوف نہ ہوا کہ مسٹر کارنا سے بہتر اب دنیا جہان میں کوئی موزوں شخص کالج کو نہ ملیگا۔"

اِس کے بعد نواب محسن الملک کے بیان کیئے ہوئے خطرات کا تذکرہ اور تردید کرکے لکھتے ہیں :-

"اور اگر یہ خطرات سب صحیح ہیں تو بکرے کی ماں کب تک خیر منائیگی، ذلّت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے، اور میں تو اُس وقت تک ٹرسٹی ہوں جب تک مجھے یہ اطمینان ہے کہ ٹرسٹیوں کی مجارٹی قابل اطمینان ہے اور جس روز یہ اطمینان خدانخواستہ اُٹھا اُس دن کالج جائے اور نواب محسن الملک اور مسٹر مارین جائیں اور مسٹر کارنا، اللہ اللہ خیر سلّا۔"

نواب وقار الملک کی اس جد وجہد اور پُرزور اختلاف کا یہ نتیجہ نکلا کہ مسٹر مارین اپنی کوشش میں ناکام رہے، مسٹر کارنا کا انتخاب نہ ہوسکا، اور مسٹر آرچبولڈ پرنسپل مقرر ہوئے۔



اسٹرائک اور کمیشن تحقیقات

مسٹر کارنا کا معاملہ طے ہوجانے کے بعد **نواب وقار الملک** اپنی عادت کے مطابق بدستور کالج کے کام میں پوری توجہ سے مصروف رہے اور اُن کی رائے اور مشورہ سے بہت سی اصلاحات عمل میں آئیں، لیکن اوائل ۱۹۰۷ء تک کوئی خاص واقعہ ایسا پیش نہیں آیا جو قابل تذکرہ ہو۔ البتہ ۱۹۰۷ء میں کالج میں **اسٹرائک** ہوگئی جس کے اسباب کی تحقیق کے لیئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی، اس کمیٹی کے ایک ممبر نواب وقار الملک بھی تھے۔ انھوں نے اس موقع پر دوسرے ممبروں سے علیحدہ ایک **رپورٹ** تیار کی، جس میں انھوں نے بعض امور میں اپنے رفقائے کار سے اختلاف کیا، اور آیندہ کے لیئے مختلف اصلاحی تجاویز پیش کیں، اور اسی سلسلہ میں ڈسپلن کے متعلق اپنے حسب ذیل خیالات ظاہر کیئے:-

"مجھ کو یہ بھی بیان کردینا ضرور ہے کہ بہت عرصہ سے ہم سنتے چلے آتے ہیں

کہ فلاں معاملہ پر اس لیے زور دینا مناسب نہیں کہ کہیں یورپین اسٹاف بددل ہو کر کالج نہ چھوڑ دے، اور اب طلبہ کی اس حال کی شورش سے ہمارے لیے ایک تازہ دھمکی یہ پیدا ہوئی ہے کہ کہیں طلبہ اسٹرائک نہ کر دیں اس قسم کے حالات کے لحاظ سے میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم کو اپنا انتظام کافی احتیاط اور غور کے ساتھ منصفانہ اور صحیح اُصولوں پر قایم کرنا چاہیئے، اور اُس کے بعد ہم کو ڈسپلن پر مضبوطی سے قایم رہنا چاہیئے، اور ہر ایک نقصان کو برداشت کرنے کے واسطے جو ڈسپلن قایم رکھنے کی غرض سے عائد ہو، ہم کو تیار رہنا چاہیئے، عام ازیں کہ طلبہ کی طرف سے ایسی دھمکی کوئی ہو یا اسٹاف کی طرف سے یا ٹرسٹیز کی طرف سے میں انتظام کو ضعیف اور کمزور دیکھنے کی بہ نسبت، کالج اور بورڈنگ ہاؤس کے کمروں کا خالی دیکھنا اہون سمجھتا ہوں۔"

جب **تحقیقاتی کمیشن** اپنا فیصلہ سُنا چکا تو اُس کے بعد مئی ۱۹۰۷ء میں ٹرسٹیوں کی ایک **اسپیشل میٹنگ** منعقد ہوئی، جو مختلف وجوہ سے نہایت اہم تھی، نواب محسن الملک اس زمانہ میں علیگڑھ میں موجود نہ تھے، چونکہ اُس سے کچھ مدت پہلے اسٹرائک کے سلسلہ میں بعض ناگوار واقعات پیش آچکے تھے، اور اسی زمانہ میں نواب محسن الملک نے اپنا استعفا سر جان ہیوٹ کے اصرار سے واپس لیا تھا، جو اُنھوں نے اسٹرائک کے بعد برداشتہ خاطر ہو کر پیش کیا تھا، اس لیے قدرتاً اجلاس میں ان ناگوار واقعات اور نواب محسن الملک کا ذکر مختلف حیثیت سے بار بار آیا اور اُن کے عام طرز عمل پر نکتہ چینی کی گئی۔

اسی سلسلہ میں صاحبزادہ **آفتاب احمد خاں** صاحب نے یہ واقعہ اجلاس کے سامنے پیش کیا کہ ایک مرتبہ میں نے یہ کوشش کی تھی کہ نواب وقار الملک بہادر بحیثیت آنریری جوائنٹ سکرٹری علی گڑھ میں رکھے جائیں تاکہ وہ نواب محسن الملک کے ساتھ ملکر کام کریں نواب محسن الملک نے اس کو

بخوشی منظور کر لیا تھا، اور میری تحریک پر چند سر برآوردہ ٹرسٹیان نے نواب وقار الملک کو بہ اصرار اس پر آمادہ بھی کیا، لیکن اُنھوں نے مجکو جواب دیا کہ وہ نواب محسن الملک بہادر کے ساتھ کام نہیں کر سکتے اس کے بعد صاحبزادہ صاحب نے فرمایا کہ:۔

"سب کو معلوم ہے کہ سر سید کے انتقال سے اور اس وقت تک یعنی ۹ سال سے مجکو کالج کے تمام اہم معاملات سے خاص تعلق رہا ہے اور نواب محسن الملک کے ہمراہ کام کرنے کی مجکو ابتدا سے عزت حاصل ہے، تجربہ کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ کن وجوہ سے نواب وقار الملک بہادر نے نواب محسن الملک کے ساتھ کام کرنے سے انکار کیا لیکن گو ایک حد تک اُن کے وجوہ کو میں تسلیم کرتا ہوں تاہم وہ نواب وقار الملک بہادر کے علی گڑھ میں قیام نہ کرنے اور بغیر کوئی عہدہ قبول کئے کام نہ کرنے کے لیئے کافی نہیں ہیں میرے خیال میں اگر وہ یہاں کام کرتے اور علیحدہ رہکر کالج کے کاموں میں حصہ لیتے تو یقیناً کالج کو بے انتہا فائدہ پہنچاتے اور بہت سے نتائج جن پر آج ہم افسوس کرتے ہیں غالباً پیدا نہ ہوتے۔"

اس کے بعد نواب محسن الملک کی پالیسی پر بحث کرتے ہوئے بیان کیا کہ:۔

"نواب محسن الملک بہادر کا طرز کارروائی اور اُن کے اُصول اس قسم کے ہیں کہ خود اُن سے مطمئن نہیں ہیں۔"

نواب وقار الملک نے صاحبزادہ صاحب کی تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"اپنی ذات کے متعلق کہ کیوں میں نواب محسن الملک کے ساتھ کام نہیں کر سکتا، اس وقت میں کچھ نہ کہونگا، کیونکہ نواب محسن الملک یہاں موجود نہیں، اگر موجود ہوتے تو میں کہتا۔"

اگرچہ اس موقع پر نواب وقار الملک نے نواب محسن الملک کے طریقہ کارروائی پر کوئی خاص نکتہ چینی نہیں کی، لیکن اسی اجلاس میں پیش کرنے کے لئے اُنھوں نے جو اپنی مفصل و مدلل یادداشت لکھی اس میں جا بجا نہایت آزادی اور سختی سے نکتہ چینی کی تھی، اور خصوصیت کے ساتھ اُن کی اس کمزوری پر اظہار ناپسندیدگی کیا تھا کہ وہ یورپین اسٹاف کے مقابلہ میں نامناسب نرمی سے کام لیتے ہیں، چنانچہ وہ کہتے ہیں:۔

"کالج کے لغت میں ڈسپلن اب صرف طلبہ کے دبائے رکھنے کا نام ہے

اسٹاف ڈسپلن کے شکنجہ سے بالکل بری ہے۔"

دوسرے موقع پر لکھتے ہیں :-

"سب سے زیادہ رونا اسی بات کا ہے کہ باوجود ایسے ہنگامۂ عظیم اور ایک طویل طویل شہادت کے جس کا ہر حرف جناب ممدوح کے سامنے قلمبند ہوا ہے پھر بھی اُنکی طرزِ کارروائی میں ایک سرِمو فرق نہیں آیا اور اُن کی کمزوری کی آئندہ بھی اگر یہی حالت ہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ کمیشن کی یہ تمام تر کارروائی و محنت و کوشش سب ضائع و برباد ہوئی رکھی ہے۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں :-

"مسٹر کارنا کا جو معاملہ اس سے قبل ہو چکا ہے اُس میں ٹرسٹیوں کو ایک اچھا خاصہ معرکہ آنریری سکرٹری صاحب کے مقابلہ میں سر کرنا پڑا تھا، اور بالآخر ٹرسٹیوں نے مسٹر کارنا کو جن کو پرنسپل بنانے میں آنریری سکرٹری صاحب نے اپنی پوری قوت صرف کر دی تھی، پرنسپل ہونے سے روکا اور اگر ٹرسٹی اُس وقت ایسا نہ کرتے تو جو ہنگامہ کالج میں اس وقت ہوا وہ اب سے بہت پہلے ہو چکا ہوتا، اور اگر یہ سب کچھ صرف اختلاف رائے کی وجہ سے ہوتا تو میں اول شخص ہوں جو اس پر کوئی نکتہ چینی کرتا، لیکن جب کسی کارروائی میں کوئی پالیسی برتی جائے، اور کسی اصول کا خیال نہ رکھا جائے تو اُس سے ضرور شکایتیں پیدا ہوتی ہیں۔

میں متواتر دیکھتا ہوں کہ ہمارے معزز آنریری سکرٹری کسی ایسی کارروائی سے جو یورپین اسٹاف کی مرضی کے خلاف ہو، بیحد جی چُراتے ہیں، کوشش بہت کرتے ہیں کہ اُن کی رائے سنی جائے، لیکن جب نہیں سنی جاتی تو پھر یہ جُرأت نہیں کرتے کہ اُس معاملہ کو اپنے اختیار سے فیصل کریں یا ٹرسٹیوں کے سامنے تصفیہ کے لئے پیش کریں اور آزادی سے اپنی رائے دیں

اور اگر میرے اس کلیہ کے خلاف کوئی نظیر جناب ممدوح کی کارروائیوں میں بتلائی جائے تو اُس کو میں اعجاز سے کم نہ سمجھونگا، اور اگر مجھ سے خواہش کی جائے تو جو کچھ میں نے عرض کیا ہی اُس کے ثبوت میں اسقدر مثالیں پیش کرسکتا ہوں جو ایک مستقل رسالہ کی صُورت اختیار کرلینگی"۔

غرض اس زمانہ میں ایسے حالات پیدا ہوگئے تھے کہ اکثر لوگوں کی یہ خواہش تھی کہ کوئی مضبوط کیرکٹر اور پختہ عزم وارادہ کا شخص علی گڑھ آکر قیام کرتے تاکہ نواب محسن الملک کی کمزوریوں کی کسی قدر تلافی ہوسکے، لیکن نواب وقار الملک کے علاوہ ان اوصاف کا اور کوئی شخص موجود نہ تھا، اس لئے انہی پر لوگوں کی نظریں پڑتی تھیں، مگر وہ اپنی خانگی مشکلات اور دوسرے وجوہ سے علی گڑھ آنے پر آمادہ نہ تھے، اگرچہ بعض بدگمان طبیعت والے یہ شبہ کرتے تھے کہ وہ خود سکرٹری ہونا چاہتے ہیں۔

ٹرسٹیوں کے اجلاس منعقدہ ماہ مئی کے بھی بعد لوگوں کی زبانوں پر اور ایک حد تک اخبارات میں بھی کالج کے ان معاملات کا تذکرہ رہا چنانچہ جولائی ۱۹۰۳ء میں ایک اخبار کے نامہ نگار نے بمبئی میں نواب محسن الملک سے ملاقات کی اور نواب وقار الملک کے متعلق متعدد سوالات کئے جن میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ کیا وہ آپ کی جگہ خود سکرٹری بننا چاہتے ہیں؟ نواب محسن الملک نے مفصل جواب دیتے ہوئے اس خیال کی تردید کی، اور فرمایا کہ:۔

"وہ کبھی سکرٹری ہونے کے خواہاں نہیں ہیں اگر کوئی ایسا وقت آبھی جائے کہ لوگ اُن کے سکرٹری بنائے جانے پر اصرار کریں تو شاید بہت ہی مجبوری اور کالج کی ہمدردی کے خیال سے وہ منظور کرلیں ورنہ اُن کو سکرٹری شپ کے منظور کرنے میں عذر ہوگا، اور یہ محض میرا خیال ہی نہیں ہی بلکہ پچھلے واقعات سے اس کا بین ثبوت ملتا ہے، مجھے رنج ہوتا ہی جب لوگ ایسی بدگمانی

اُن کی نسبت مشہور کرتے ہیں"

اسی سلسلہ میں نامہ نگار نے اُن نکتہ چینیوں کے متعلق سوال کیا جو نواب وقار الملک نے اُن پر کی تھیں، اس پر اُنھوں نے فرمایا کہ :-

"مقتضائے بشریت مجھے اس کا رنج ہوا ہی مگر میں یقین کرتا ہوں کہ جو کچھ اُنھوں نے لکھا گو کیسا ہی سخت لکھا ہی، مگر ذاتی مخالفت یا رنج کی وجہ سے نہیں لکھا بلکہ اپنے نزدیک قوم اور کالج ہی کے فائدہ کی غرض سے لکھا ہوگا، اس لیے میں اُن کی گالیوں کو بھی اُن کی نیک نیت پر خیال کر کے اپنے لیے تنبیہ اور ہدایت سمجھتا ہوں"

نواب وقار الملک نے جب اخبار میں یہ مکالمہ پڑھا تو ایک طویل مضمون اگست ۱۹۰۰ء میں اخبار میں شایع کرایا، جس میں نواب محسن الملک اور کالج کے معاملات کے متعلق اپنے خیالات نہایت تفصیل سے ظاہر کیے، اور اس سوال کا جواب بھی دیا کہ وہ علی گڑھ میں رہ کر نواب محسن الملک کو کالج کے کاروبار میں کیوں مدد نہیں دیتے۔

وہ اپنے تفصیلی جواب کے سلسلے میں لکھتے ہیں :-

"واقعہ یہ ہی کہ میرے نزدیک میرا علی گڑھ میں جا کر رہنا گو کہ وہ آنریری سکرٹری کو مدد دینے ہی کی غرض سے ہو بجائے مفید ہونے کے کالج کے حق میں مضر ہی، میری موجودگی علی گڑھ کے زمانہ میں میری نظر کالج کے ہر ایک کام پر ہوگی، اور جو نقصان مجکو اس میں دکھائی دینگے اُن میں مجھ کو اُن ٹرسٹیوں اور ممبران اسٹاف سے گفتگو کا موقع ملیگا جو علی گڑھ میں تشریف رکھتے ہیں اور ممکن نہیں، بلکہ یہ یقین سمجھنا چاہیئے کہ ایسے معاملات بھی پیش آئینگے جن میں آنریری سکرٹری صاحب سے میرا شاید اختلاف ہوگا، اور جو نقصانات نظر آئینگے اُن میں بکثرت وہ اُمور ہونگے جو آنریری سکرٹری کی بے خبری یا کمزوری کا نتیجہ ہونگے

اور اس طرح پر ایک سلسلہ ناگوار نکتہ چینی کا قائم ہو جائیگا، اور میرا گھر گویا ایک زبردست مورچہ آنریری سکرٹری کے خلاف سمجھا جانے لگیگا، جہاں وہ تمام لوگ جمع ہوا کرینگے، جو میری رائے سے متفق ہونگے، اور مجارٹی یقیناً میری طرف ہو گی اور اس طرح پر پارٹی فیلنگ کا خاصہ نقشہ جم جائیگا، جو کالج کے حق میں بے انتہا مضرت بخش ہو گا۔"

اس کے بعد اُنھوں نے متعدد واقعات بیان کرکے اس معاملہ کے ہر پہلو پر تفصیلی بحث کی ہے، اور اسی سلسلہ میں اپنا ایک دلچسپ تجربہ بیان کیا ہے، لکھتے ہیں:-

اِنہی مشکلات کے لحاظ سے جن سے خود نواب محسن الملک بہادر سب سے زیادہ واقف ہیں اور اتفاقاً کبھی کبھی خود اس کا اقرار بھی فرماتے ہیں جناب ممدوح نے اب سے چند سال قبل مجھ سے ارشاد فرمایا اور اس پر حد سے زیادہ زور دیا کہ کاموں کو اب تقسیم کرنا چاہیئے اور مجھ سے فرمایا کہ آنریری سکرٹری ٹرسٹیان کے عہدہ کا کام جس سے کالج کا اندرونی کام مراد ہے تم مجھ سے بہتر کر سکتے ہو عہدہ آنریری سکرٹری کا تم لو اور کانفرنس اور سر سید میموریل فنڈ کا کام جس میں باہر جانا، اور جلسے کرنا اور چندہ وصول کرنا ہے یہ کام میں تم سے بہتر کرونگا یہ دونوں کام میرے پاس رہیں، جناب ممدوح کے ارشاد سے مجکو بھی اتفاق تھا، اور دوسرے اکثر دوستوں نے بھی اس کو پسند کیا، یہاں تک کہ یہ تجویز ایجنڈے میں داخل ہوئی اور ایک سالانہ اجلاس میں ٹرسٹیوں کے سامنے رکھی گئی اور نواب محسن الملک بہادر نے آنریری سکرٹری کے عہدہ سے استعفا بھی پیش کر دیا، اور میرے اوپر زور دیا کہ اب علی گڑھ میں رہنے کی غرض سے جلد مجکو علی گڑھ آنا چاہیئے، اور اس لیئے مکان کے قریب ہی دوسرا مکان میرے واسطے تجویز بھی کر لیا، اور میں بھی جب اپنے وطن امروہہ

سے اس سالانہ جلسہ کی شرکت کی غرض سے چلا تو ریلوے اسٹیشن پر ایک پوری مال گاڑی کا انتظام کرتا گیا تاکہ اپنا ضروری اسباب ایک ساتھ علی گڑھ کو منتقل کرسکوں اور جب علی گڑھ پہنچا تو جلسہ میں شریک ہونے کے قبل نواب محسن الملک بہادر نے مجھ سے فرمایا کہ چل کر وہ مکان دیکھ لو جو تمہارے لیئے میں نے تجویز کیا ہے اس کا جو جواب اس وقت میں نے دیا حقیقت میں وہ تھا تو محض مذاق کے طور پر لیکن بعض اوقات مذاقیہ کلمات بھی واقعات پر مبنی ہوجاتے ہیں، میں نے جواب میں عرض کیا ذرا اور ٹھیریئے، جلسہ سے لوٹنے کے بعد دیکھنا بہتر ہوگا۔

جلسہ جب منعقد ہوا، اور ٹرسٹیان موجون اجلاس اور غیر موجون اجلاس کے ووٹوں کو شمار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ایک دو ٹرسٹیوں کے سوا باقی جملہ ووٹ اس امر کے تھے کہ نواب محسن الملک بہادر کا استعفا منظور ہونے کے بعد مشتاق حسین کا تقرر عہدہ آنریری سکرٹری پر عمل میں آئے، اور گویہ کام اُس اجلاس کا نہ تھا لیکن معلوم ہوچکا تھا کہ اس پر بھی کہ کانفرنس کا کام بحیثیت سکرٹری اور سرسید میموریل فنڈ کا کام بحیثیت پریسیڈنٹ نواب محسن الملک بہادر کے پاس رہیگا اپنی باری میں میں نے اجتناب کیا، اور جو کچھ بیان کیا وہ قریبًا یہ تھا کہ پبلک عام طور پر نواب صاحب ممدوح کے کالج سے علحدہ ہونے کو پسند نہیں کرتی، لہٰذا ٹرسٹیوں کو بھی جو پبلک کے گویا وکیل ہیں وہی پہلو اختیار کرنا مناسب ہے، جو پبلک کی مرضی کے مطابق ہے، دوسرے اکثر ٹرسٹیوں نے بھی، اس قسم کی گفتگو کی جو درحقیقت مستعفی ہونے والے عہدہ دار کے جذبات کا جس نے چند سال گزشتہ میں کالج کی خدمات بغیر کسی معاوضہ کے انجام دی تھیں، ایک سنجیدہ اعتراف تھا، مگر جلسہ کا اختتام اس پر ہوا کہ نواب محسن الملک بہادر نے اپنا استعفا عہدہ آنریری سکرٹری سے واپس لیا، اور مجھ کو کوئی ضرورت نہ اُن کے مجوزہ مکان کے دیکھنے کی باقی رہی، نہ ریلوے

مال گاڑی کے انتظام کی "مُردن موقوف و مقبرہ مسمار" اور میں نے کبھی
اس کے بعد جناب ممدوح سے اس کی شکایت نہ کی کہ اگر یہی منظور تھا تو اس تماشہ
کی ضرورت ہی کیا تھی"۔



آنریری سکرٹری کے عہدہ کا معاملہ

اسی مضمون میں اُنھوں نے آزادی اور صاف بیانی کے ساتھ اس مسئلہ پر بھی بحث کی ہے کہ کیا وہ آنریری سکرٹری کا عہدہ قبول کر سکتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

مجھ سے لوگ دریافت کرتے ہیں کہ اگر نواب محسن الملک بہادر نے کالج کے اندرونی انتظام کی ذمہ داری سے سبکدوشی چاہی جس سے مراد یہ ہے کہ آنریری سکرٹری کے عہدہ کو انھوں نے چھوڑ دیا اور کانفرنس و سرسید میموریل فنڈ کو صرف اپنے ہاتھ میں رکھنا کافی سمجھا تو آیا میں آنریری سکرٹری کے عہدہ کو قبول کروں گا؟ اس کے متعلق کسی قدر توضیح کر دینا مناسب سمجھتا ہوں،

چند سال قبل جب معزز ٹرسٹی حضرات نے میرے آنریری سکرٹری ہونے پر اتفاق فرمایا تھا، میرا بیان یہ تھا کہ انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے مجھ کو مشکلات پیش آئینگی، نیز میری مالی حالت اور دوسرے ذاتی مشکلات بھی اس سے مانع ہیں کہ میں اپنے وطن کو چھوڑ دوں اور علی گڑھ آ کر رہوں، جس کے بدون سکرٹری کے عہدہ کا کام انجام نہیں دیا جا سکتا ہے، اور سن و سال کے لحاظ سے بھی اتنی بڑی ذمہ داری کے کام کا برداشت کرنا آسان نہیں ہے، بااین ہمہ اگر ٹرسٹی صاحبان نے میرے ہی ضعیف کندھوں پر اس بوجھ کو رکھنا پسند کیا تو میں اپنی ہر ایک مشکل اور ضرورت کو نظر انداز کر دینے اور کالج کی خدمت بجالانے کے لئے آمادہ ہونگا، لیکن دوسرے کسی اُمیدوار کے مقابلہ میں اپنے واسطے ووٹ حاصل کرنے کی

کوشش کرنے سے اور مقابلہ کے اکھاڑے میں کودنے سے میں معافی چاہونگا۔"

اس کے بعد اُنھوں نے بیان کیا ہی کہ :-

"یہ جواب میں نے چند سال پہلے دیا تھا، اور اب خانگی ضروریات اور مالی مشکلات میں اور اضافہ ہوگیا ہی اور اب بھی میں آنریری سکرٹری کے عہدہ کے لئے خود خواہشمند نہیں ہوں نہ کسی دوسرے اُمیدوار کے مقابلہ میں اپنے واسطے ووٹ جمع کرنے کی کوشش کرنا گوارا کرونگا، لیکن با ایں ہمہ اگر معزز ٹرسٹی حضرات مجھ ہی سے یہ خدمت لینا پسند کریں اور میری کسی مشکل کا خیال نہ فرمائیں تو یہ بھی مجھ سے نہ ہوسکیگا کہ میں کالج کو لاوارثی کی حالت میں چھوڑ دوں۔"

نواب محسن الملک کی وفات اور بحث و اختلاف کا خاتمہ

آخر اگست ۱۹۰۷ء میں نواب وقار الملک کا یہ مضمون شائع ہوا، اور ابھی لوگ ان معاملات پر بحث و گفتگو میں مصروف تھے کہ دفعتاً ۱۶ ستمبر ۱۹۰۷ء کو نواب محسن الملک نے شملہ پر وفات پائی، جس نے تمام مباحث کا خاتمہ کردیا، اور اب قوم کی اشک آلود آنکھیں نواب وقار الملک کی طرف اُٹھنے لگیں، اور تمام ملک نے متحدہ الکلمہ ہوکر یہ مطالبہ کیا کہ سرسید اور نواب محسن الملک کی جانشینی کا منصب اُن کو عطا کیا جائے، اخبارات میں، تعزیت کی مجالس میں، پرائیویٹ صحبتوں میں غرض ہر جگہ یہی تذکرہ تھا کہ نواب وقار الملک سے زیادہ اور کوئی شخص اس عہدہ کے لئے موزوں نہیں۔

نواب وقار الملک کا آنریری سکرٹری کے عہدہ پر انتخاب

ایک اسپیشل اجلاس ٹرسٹیوں کا ۱۵ ر دسمبر ۱۹۰۷ء کو منعقد ہوا، قایم مقام آنریری سکرٹری (خان بہادر محمد مزمل اللہ خاں صاحب) نے بیان کیا کہ انتخاب سکرٹری کی بابت کل ۴۱ ووٹ بعد جاری کرنے اجنڈا کے موصول ہوئے ہیں، لیکن اکثر صاحبوں نے قبل اجنڈا کے جو تحریک نواب صاحب ممدوح (وقار الملک) کے سکرٹری مقرر کیئے جانے کے بارہ میں بھیجی تھی اس کو کافی سمجھ کر دوبارہ ووٹ نہیں بھیجے اس طرح پر سمجھنا چاہیئے کہ اور بھی بہت سے ووٹ موصول ہوئے ہیں، بہر حال جو ووٹ موصول ہوئے ہیں وہ سب منظوری کے ہیں، لہذا اب حاضرین کے ووٹ لیئے جائیں۔

اس پر نواب وقار الملک بہادر نے بیان کیا کہ یہ معاملہ چونکہ میری ذات خاص کا ہے، اور میں اجلاس میں موجود ہوں اس لیئے ممکن ہے، بلکہ ظن غالب ہے کہ بعض حاضرین صرف لحاظ سے ووٹ منظوری کے دیدیں، اس لیئے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ حسب قاعدہ بلیٹ کے ذریعہ سے ووٹ لیئے جائیں۔ چنانچہ باوجود مخالفت حاضرین کے نواب صاحب کے اصرار پر بذریعہ بلیٹ کے ووٹ لیئے گئے تو سب منظوری کے تھے، اس لیے بالاتفاق حسب ذیل رزولیوشن پاس ہوا۔

"نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب انتصار جنگ حسب قاعدہ
نمبر ۴۵ د، ۴۸ تین سال کے لیئے آنریری سکرٹری ٹرسٹیان مدرستہ العلوم
علی گڑھ مقرر کیئے گئے۔"

اس کے بعد نواب وقار الملک بہادر نے اپنے انتخاب کی بابت ٹرسٹیوں کا شکریہ ادا کیا، اور فرمایا کہ:-

"مجکو شرکت کانفرنس وغیرہ کے لیئے کراچی جانا ہے اس لیئے میں وسط جنوری سے پہلے چارج نہیں لے سکتا، اُس وقت تک خان بہادر محمد مزمل اللہ خاں صاحب

بدستور کام کرتے رہیں۔"

اس ضابطہ کی کارروائی کے بعد دوسرے روز ۱۶ ردسمبر کو اسٹریچی ہال میں ایک شاندار جلسہ منعقد ہوا، جس میں طلبہ اساتذہ اور ٹرسٹی شریک تھے، مسٹر آرچبولڈ پرنسپل نے ایک مختصر تقریر کے بعد اس انتخاب کا اعلان کیا، اور خان بہادر محمد مزمل اللہ خاں صاحب قایم مقام آنریری سکرٹری نے ایک دلچسپ تقریر کرتے ہوئے نواب وقار الملک کے اس عہدہ پر منتخب ہونے کا ذکر کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ:-

خان بہادر محمد مزمل اللہ خاں صاحب کی تقریر کا ملخص

نواب محسن الملک کی وفات حسرت آیات کے وقت سے ہندوستان کے تمام مسلمان نہایت آرزو اور دلی جوش سے یہ صدائیں بلند کر رہے تھے کہ نواب وقار الملک بہادر مدرستہ العلوم کے آنریری سکرٹری منتخب کیے جائیں، ہندوستان بھر کے اسلامی اخباروں میں یہ چرچا تھا کہ نواب وقار الملک بہادر سے بہتر کوئی شخص اس عہدہ کے لیے موزوں نہیں ہے۔

ہر صوبہ میں جابجا متعدد جلسے اس رائے کے اظہار کے لیے کیے گئے، اور ہندوستان کے ہر گوشہ سے مسلمانوں نے اس مضمون کے تار بھیجے کہ اُن کے سوا کوئی اور شخص اس جلیل القدر قومی منصب پر مقرر نہ کیا جائے، بہت سے خطوط اسی مضمون کے ٹرسٹیان مدرستہ العلوم کو وصول ہوئے، بہت سی اسپیچیں اسی موضوع پر دی گئیں، بہت سے مضامین اسی بحث پر چھاپے گئے، بہت سے کارٹون اسی معاملہ کے متعلق اخباروں میں شائع کیے گئے، غرض کہ تمام قوم نے ہم آہنگ اور ہم رائے ہو کر بہت جوش و خروش اور نہایت شد و مد سے اس خواہش کا اظہار کیا نواب وقار الملک بہادر نواب محسن الملک مرحوم کے جانشین قرار دیئے جائیں۔

نہایت خوشی اور مسرت کا مقام ہے کہ قوم کی متفقہ خواہش آخر کار پوری ہوئی اور اُن کی مجموعی تمنا بر آئی۔ ۱۵۔ دسمبر کو ٹرسٹیان مدرستہ العلوم نے جو اجلاس کیا اور جس میں خود نواب وقار الملک بہادر شریک تھے اس میں بلا کسی اختلاف کے سب ٹرسٹیوں نے یہ رائے دی کہ نواب صاحب ممدوح

آنریری سکرٹری کے عہدہ پر مقرر کیئے جائیں۔

نواب وقار الملک کا جواب اور طلبہ کو تنبیہ

نواب وقار الملک نے جواب دیتے ہوئے اُن عمدہ خیالات کا شکریہ ادا کیا جو اُن کی نسبت ظاہر کیئے گئے تھے اور اپنی حالت صحت اور عمر، اور اس عظیم الشان ذمہ داری کے احساس کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ کہا کہ :-

"میں اس وقت وعدہ نہیں کرتا کہ میں کیا کرونگا، اور کیا نہ کرونگا، اور میرے کام کرنے کے نتائج کیا ہونگے؟ البتہ مجھ کو اپنے احباب ٹرسٹیوں اور کالج اسٹاف سے اُمید ہے کہ وہ اور میں مل جلکر کام کرینگے، اور وہ مجھے پوری طرح مدد دینگے، اور اس طرح قوم کی جو خدمت مجھ سے بن آئے، اُس کے لیئے میں ہمہ تن حاضر ہوں۔"

تقریر کے آخر میں رقت آمیز لہجہ میں کہا کہ :-

لہ نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی فرماتے ہیں کہ :-
"سید محمود مرحوم کے معاملات کی یکسوئی کے بعد جب سکرٹری کے انتخاب کا مسئلہ پیش آیا تو کالج کے ایک کچے بنگلہ میں ایک مجلس شوریٰ ہوئی اُس میں ٹرسٹی اور پرنسپل وغیرہ شریک تھے، نواب محسن الملک مرحوم کا انتخاب فریق غالب نے پہلے سے تجویز کر لیا تھا، اسی پر رائے کا اتفاق یا کثرت مطلوب تھی، جلسہ میں رائیں لی گئیں تو باستثنائے ایک کے سب کی سب نواب محسن الملک مرحوم کے حق میں تھیں، ایک میری نواب وقار الملک مرحوم کے واسطے تھی، دونو نواب صاحب اُس جلسہ میں شریک تھے، مجھ کو نواب محسن الملک مرحوم کی وہ نگاہ تعجب خوب یاد ہے جس سے اظہار رائے کے بعد انھوں نے میری جانب دیکھا تھا، بہرحال انتخاب نواب محسن الملک مرحوم کا ہوا، جب نواب وقار الملک مرحوم سکرٹری ہوئے تو میری پہلی ملاقات کالج کی مسجد میں ہوئی، بعد نماز حوض کے کنارہ پر قبلہ رخ باتیں کرنے کے واسطے بیٹھ گئے اثنائے گفتگو میں فرمایا، دس برس پہلے جس رائے کا اظہار ہوا تھا اُس کا ظہور اب ہوا" ۱۲

(مسلم ودی)

"مجھ کو نہ ٹرسٹیوں کی طرف سے کوئی اندیشہ ہے، کیونکہ وہ ایک روشن خیال مُسلمانوں کا گروہ ہے، اور نہ اسٹاف کی طرف سے کسی طرح کا اندیشہ ہے، کیونکہ وہ بھی تجربہ کار اہلِ علم کی ایک جماعت ہے بلکہ جو کچھ اندیشہ ہے وہ ان طلبہ (طلبائے مدرسۃ العلوم کی طرف اشارہ کرکے) کی طرف سے ہے، ایک زمانہ پہلے جب کہ بورڈنگ ہاؤس کا انتظام چند سال تک میرے ہاتھ میں تھا اُس وقت کی بہ نسبت میں اس وقت طلبہ کے مذہبی خیالات میں بہت سُستی دیکھتا ہوں اور سب سے بڑی ڈسپلن یہ ہے جس کو قایم کرنا ضروری ہوگا۔ میں یہ شکایت اس وقت غیروں کے سامنے نہیں کرتا، بلکہ تمھاری شکایت (طلبہ کی طرف اشارہ کرکے) خود تمھارے سامنے کرتا ہوں میں اس وقت صاف صاف اور علی الاعلان کہتا ہوں کہ میں اس طرح ڈسپلن کی خلاف ورزی کی برداشت نہ کرسکونگا۔

میں مدرسۃ العلوم کے بورڈنگ ہاؤسوں کے تمام کمروں کا خالی دیکھنا بہ نسبت اس کے زیادہ پسند کرونگا کہ اُن میں نافرمان اور ضابطہ کی پابندی نہ کرنے والے طلبہ آباد ہوں، اس سے زیادہ مجھے اس وقت کچھ اور کہنا نہیں ہے۔"

اس کے بعد نواب وقار الملک کانفرنس کے اجلاس کی شرکت کے لیئے کراچی تشریف لے گئے۔

کانفرنس کا اجلاس اور نواب وقار الملک کے تقرر پر اظہار مسرت

۲۷۔ دسمبر ۱۹۰۷ء کو کانفرنس کا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا اور میاں محمد شفیع بیرسٹر ایٹ لا لاہور نے سب سے پہلا رزولیوشن حسب ذیل الفاظ میں پیش کیا:۔

"یہ کانفرنس مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے ٹرسٹیوں کو مبارک باد دیتی ہے کہ اُنھوں نے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی متفقہ رائے کا لحاظ کرکے نواب وقار الملک بہادر کو مدرسۃ العلوم کا آنریری سکرٹری منتخب کیا، اس

کانفرنس کی رائے میں نواب صاحب سے بہتر کوئی شخص نواب محسن الملک مرحوم کی جانشینی
کے لئے نہیں مل سکتا تھا، کانفرنس کو نواب صاحب کی ذات پر کامل اعتماد ہے اور اس کو
کامل اُمید ہے کہ مدرستہ العلوم اُن کے زمانہ سکرٹری شپ میں ترقی کریگا۔"

اس رزولیوشن پر محرک کے علاوہ مسٹر محمد علی بی اے (آکسن) شیخ عبد القادر صاحب بیرسٹرایٹ لا، منشی محبوب عالم صاحب اڈیٹر پیسہ اخبار لاہور، آنریبل شیخ صادق علی صاحب وزیر خیرپور سندھ وغیرہ نے بڑے جوش وخروش سے تقریریں کیں، اور تقریروں کے درمیان میں پنڈال کے ہر گوشہ سے خوشی اور مسرت کے نعرے برابر بلند ہوتے رہے اور رزولیوشن پورے جوش سے بالاتفاق پاس ہوا۔

رزولیوشن کے پاس ہوجانے کے بعد نواب وقار الملک بہادر اپنی کرسی سے اُٹھے، اور حاضرین کو معلوم ہوا کہ وہ آبدیدہ ہو رہے ہیں، اُنھوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:۔

"جناب صدر انجمن و بزرگانِ قوم! جو عزت بھرے الفاظ مجھ ناچیز کی نسبت آپ سب صاحبوں نے استعمال کیئے ہیں اور جس گرمجوشی سے آپنے مبارکباد دی ہے، اور جو رزولیوشن میری نسبت اس اجلاس نے پاس کیا ہے اور جو تقریریں اس رزولیوشن پر بعض حضرات نے کی ہیں اُن کے شکریہ کے لیئے میرے پاس مطلق الفاظ نہیں ہیں، اور میری زبان آپ صاحبوں کی عزت افزائی کی شکر گزاری میں، بالکل قاصر ہے، جب تک اس رزولیوشن کے متعلق تقریریں ہوا کیں میرا خون برابر خشک ہوتا رہا، مجھے یقین ہے کہ اس رزولیوشن کے پیش کرنے اور پاس کرنے میں کانفرنس کا بہت سا قیمتی وقت ناحق ضائع ہوا، (چاروں طرف سے نہیں نہیں کی آوازیں آئیں) ہر حال میں آپ سب صاحبوں کی محبت اور عنایت کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس امر کی درخواست کرتا ہوں کہ آپ نہایت خشوع وخضوع سے خداوند عالم کی درگاہ میں دعا کریں کہ جو توقعات آپنے مجھ ناچیز سے کی ہیں وہ پوری

ہوں اور مدرستہ العلوم ترقی وکامیابی کی اُس بلندی پر پہونچے جس پر اُس کا پہونچنا تمام قوم کو مدِ نظر ہی۔"

مسلم لیگ کے صدر کا اظہارِ مسرت

مسلم لیگ کا دوسرا سالانہ اجلاس بھی اس سال کراچی میں تھا، اس کے پریسیڈنٹ سر آدم جی پیر بھائی نے اپنی افتتاحی اسپیچ میں کہا:۔

"اب نواب صاحب مرحوم (نواب محسن الملک) کے جانشین نواب وقار الملک بہادر بنائے گئے ہیں اس تقرر کی دانشمندی اور خوبی اس امر سے عیاں ہی کہ وہ تمام قوم کے اتفاق رائے سے ہوا ہی، میں مرحوم نواب صاحب کی دستار خلافت کے لائق موجودہ جانشین سے بہتر کسی کو نہیں جانتا، اُن کی گزشتہ جانفشانیاں صرف قوم کے لیئے ظہور میں آئی ہیں میری رائے میں مسلمانانِ ہند کو اس امر پر اپنے تئیں مبارکباد دینی چاہیئے کہ نواب وقار الملک بہادر نے مدرستہ العلوم کی سکرٹری شپ کا کام اپنے ذمہ لیا ہی۔"

مولانا حالی پریسیڈنٹ کانفرنس کی رائے

شمس العلماء مولانا حالی نے سلسلہ تقریر میں فرمایا:۔

صاحبو! فی الواقع نواب محسن الملک کا اس وقت دنیا سے اُٹھ جانا ہندوستان کے مسلمانوں کے لیئے عموماً اور اس کانفرنس کے لیئے خصوصاً ایک ایسا صدمہ تھا کہ اگر خدا کی مہربانی ہمارے شامل حال نہ ہوتی تو اس کی تلافی امکان سے خارج تھی، مگر میں تمام ممبران کانفرنس کو مبارکباد دیتا ہوں کہ قوم نے بالاتفاق نواب مرحوم کا جانشین ایک ایسے معزز و محترم شخص کو منتخب کیا ہی، جس کی ذات سے مرحوم کے بعد مسلمانوں کو وہی اُمیدیں ہیں جو سر سید کے بعد نواب محسن الملک مرحوم کی ذات سے تھیں، یہ عجب اتفاق ہی کہ ہندوستان کے تمام اسلامی اخبار، تمام اسلامی انجمنیں اور تمام ٹرسٹیان محمڈن کالج بغیر کسی استثناء کے اس بات پر متفق ہو گئے

کہ بجائے نواب صاحب مرحوم کے محمڈن کالج اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا آنریری سکرٹری نواب وقار الملک بہادر انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین صاحب کو بنایا جائے اور یہ اتفاق اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ یہ انتخاب قوم کے حق میں، کالج کے حق میں اور اس کانفرنس کے حق میں خدا کی رحمت، ثابت ہوگا، کیونکہ مخبر صادق علیہ وآلہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے مارأہ المسلمون حسناً فھو عند اللہ حسنٌ۔ یعنی جس بات کو تمام مسلمان بہتر سمجھیں وہی خدا کی نزدیک بھی بہتر ہے

نواب محسن الملک کی وفات اُن کے بعد نواب وقار الملک کی جانشینی پر بالکل اس شعر کا مضمون صادق آتا ہے ؎

عید رمضاں آمد و ماہِ رمضاں رفت
صد شکر کہ ایں آمد و صد حیف کہ آں رفت

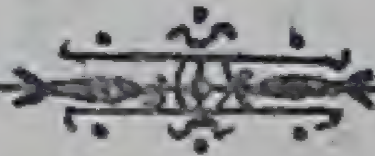
نواب وقار الملک نے اجلاس کانفرنس سے فراغت کے بعد ۱۱ر جنوری ۱۹۰۸ء کو کالج کے سکرٹری شپ کا چارج لیا، اور حسن اتفاق سے اُسی روز بارانِ رحمت کا نزول ہوا، جو ایک مبارک فال ہے۔

وائسرائے کی آمد اور نواب کا خطاب

۲۲ اپریل ۱۹۰۸ء کو لارڈ منٹو وائسرائے اور گورنر جنرل ہند کالج کے معائنہ کے لئے تشریف لائے، ٹرسٹیوں نے اڈیرس پیش کیا، جس کے جواب میں جناب ممدوح نے ایک شفقت آمیز اسپیچ دی، جس میں پہلے تو اس امر پر اظہار افسوس کیا کہ وہ نواب محسن الملک مرحوم کے زمانہ میں یہاں نہ آسکے جس کی مرحوم کو خاص آرزو تھی اس کے بعد آپ نے سرسید کی شاندار خدمات اور کالج کی تعلیم و تربیت کی تعریف کی، آخر میں ٹرسٹیوں کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

"مجھے ایک لفظ کہنے کی آپ ذرا اجازت دیں، آپ کے سکرٹری مولوی مشتاق حسین نے نواب محسن الملک کی جگہ لی ہے، میں اُن کی اہم ذمہ داریوں اور ضروری کام کے ہجوم کو خوب جانتا ہوں اس لیئے مجھے یقین ہوتا ہے کہ میں اُن کو نواب کا خطاب دے کر جو اُن کے ممتاز پیشرو کو ایک مدید زمانہ سے حاصل تھا، علی گڑھ والوں کی عام تمنا کو پورا کردوں"۔

اگرچہ نواب وقار الملک کی ذات اس خطاب سے مستغنی تھی اور وہ زمانہ دراز سے نواب کے خطاب سے ممتاز تھے، تاہم انھوں نے گورنمنٹ کے اس خطاب کو شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔



محسن الملک میموریل فنڈ

نواب وقار الملک نے سکرٹری ہونے کے بعد محسن الملک میموریل کے قیام کے متعلق خاص کوشش کی چنانچہ ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے پریسیڈنٹ خود نواب وقار الملک اور سکرٹری خان بہادر محمد مزمل اللہ خاں صاحب رئیس بھیکم پور قرار پائے، اس کمیٹی کی طرف سے ایک باقاعدہ اعلان شائع کیا گیا جس میں نواب محسن الملک کے قومی خدمات کا اظہار کر کے قوم سے اُن کی یادگار قایم کرنے کے لیئے چندہ کی اپیل کی گئی۔

اس کے بعد سر جان ہیوٹ لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ کے کالج میں آنے کے موقع پر ہز آنر کی تقریر سے جس میں گورنمنٹ کی طرف سے بھی امداد کی اُمید دلائی گئی تھی، چندہ کا آغاز ہوا، اور قریبًا ایک لاکھ نو ہزار کا اعلان کیا گیا، اُس کے بعد امرتسر کی کانفرنس میں چندہ کی تحریک ہوئی، اور پرجوش تقریروں کے ساتھ عطیات کا اعلان کیا گیا، اور لوگوں نے مقامی کمیٹیاں بنانے کے وعدے کیئے۔ لیکن قحط و گرانی اور مسلمانوں کی عام بےحسی کی وجہ سے کوئی معقول کامیابی نہیں ہوئی۔ بمشکل تمام صرف ۳۲ ہزار روپیہ وصول ہوا، جس سے صاحب باغ کی زمین خریدی گئی اور وہ بورڈنگ نواب محسن الملک کے نام سے موسوم ہوا، اگرچہ عام طور سے صاحب باغ کے نام سے مشہور رہی۔

نواب وقار الملک اور پرنسپل کا اختلاف اور اس کا نتیجہ

کالج کے ابتدائی دور میں اگرچہ یورپین اسٹاف کی شرکت عمل سے گراں قدر فائدہ حاصل ہوا، مثلاً کالج کے وقار میں اضافہ ہوا اور اس کا تعلیمی معیار بلند ہو گیا، انتظامی حیثیت سے کالج کو امتیاز حاصل ہوا، انگلستان اور یورپ میں ناموری حاصل ہوئی اور گورنمنٹ کی توجہ اس کی طرف بڑھ گئی، لیکن بااین ہمہ اس میں بھی شبہ نہیں کہ یورپین اسٹاف نے ہمیشہ ایک خاص پالیسی کو ملحوظ رکھا، اور اپنا اثر و اقتدار بڑھانے، اور کاروبار کے تمام جزئیات پر حاوی ہونے کی کوشش کی، اور ایک لمحہ کے لیئے بھی اپنے ذاتی منافع اور مقاصد کو نظر انداز کرنا گوارا نہ کیا، بلکہ ان میں سے بعض نے تو ایسے غیر محسوس طریقہ سے اپنا اقتدار بڑھایا کہ مدت تک کسی کو احساس بھی نہ ہوا۔

یہ نفوذ و اقتدار نامعلوم طریقہ پر سر سید ہی کے زمانہ سے شروع ہو چکا تھا، یہاں تک کہ خود سر سید کی زبردست شخصیت بھی آخر میں یورپین اسٹاف کے اقتدار سے مرعوب و متاثر ہو گئی تھی، اور نواب محسن الملک کے زمانہ میں تو اس حالت نے یہاں تک ترقی کی کہ آنریری سکرٹری اور ٹرسٹیز کی جماعت برائے نام رہ گئی اور اصلی قوت و طاقت پرنسپل اور یورپین اسٹاف کے ہاتھ میں آ گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ناگفتہ بہ واقعات پیش آئے، جن کا تذکرہ یہاں غیر ضروری ہے۔

سر سید کی وفات کے بعد مسٹر بک نے اپنے اقتدار کو بہت بڑھا لیا تھا، اور ان کے بعد رفتہ رفتہ مسٹر ماریسن نے بھی اپنا اثر بڑھانا شروع کیا، یہاں تک کہ آخری زمانہ میں ان کا اقتدار اس قدر بڑھ گیا تھا کہ جس کی کوئی نظیر کالج کی تاریخ میں اس سے پہلے نہیں ملتی اور یہ سب کچھ ان کے پولیٹکل دماغ کا نتیجہ تھا۔

ایک تجربہ کار مسلمان اخبار نویس نے اُن کے متعلق صحیح ریمارک کیا تھا کہ :-

"قدرت نے اُن کو معلم سے زیادہ ایک مدبّر کے قوائے ذہنی عطا کیے تھے۔ اور بعض اعلیٰ مدبرین کی طرح وہ کسی قدر خود رائے بھی واقع ہوئے تھے اس لیئے ایک طرف اُنھوں نے مسلمانوں کے قومی مرکز تعلیم کی پرنسپلی کو اپنی ترقی مراتب کا زینہ بنایا اور دوسری طرف انتظامات کالج میں بعض اوقات ٹرسٹیوں کی حکمراں جماعت کے مسلمہ اختیارات کو ماننے سے انکار کیا، اُن دونوں باتوں کے متعلق خوش قسمتی سے ایک طرف اُن کو لارڈ کرزن جیسے بلند نظر وائسرائے کی خدمت میں رسائی حاصل ہو گئی اور دوسری جانب کالج میں نواب محسن الملک مرحوم جیسے سکرٹری ملے، جو شخصی مروّت کے برتاؤ کو کبھی کبھی کمزوری کی حد تک پہنچا دیتے تھے، ان دونوں باتوں سے "مسٹر" (بعد ازاں سر) مارلیسن نے خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا اور ایک طرف لارڈ کرزن کے ایما سے طلبائے کالج کا ایک وفد ایران بھیجا[1] جس سے علی گڑھ کالج کے مقاصد کے بجائے گورنمنٹ آف انڈیا کی ڈپلومیٹک اغراض کو زیادہ مدد پہنچنی متصور تھی اور دوسری جانب عطائے وظائف کا نہایت

---

[1] یہ وفد اگست ۱۹۰۳ء میں گیا اور اکتوبر میں واپس آیا۔ وفد نے چند روز بوشہر میں قیام کیا پھر شیراز گیا، اور وہاں کے مشہور و معروف گورنر علاء الدولہ کے دربار میں حاضر ہو کر اڈریس پیش کیا، اور اپنا مقصد ظاہر کیا، اس وفد کے چار ارکان تھے۔

(۱) میر ولایت حسین صاحب بی اے سکنڈ ماسٹر، جو امیر الوفد تھے، اور اب ایجوکیشنل کانفرنس کے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ ہیں
(۲) مولوی جلال الدین حیدر صاحب ایم اے جو اسکول میں ماسٹر تھے، اور اب چیفس کالج لاہور میں ہیں۔
(۳) سید ابو محمد صاحب ایم اے جو آج کل مراد آباد میں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔
(۴) جمیل احمد صاحب مرحوم جو تھرڈ ایر کے طالب علم تھے، وفد کے ساتھ گیارہ ایرانی طالب علم آئے، اُن میں ایک شاہی خاندان سے تھا، یعنی شہزادہ موئد السلطنت کا بیٹا تھا گویا وفد کامیاب واپس آیا۔ (رنداوی)

اہم کام جو ہمیشہ سے سکرٹری سے متعلق تھا، اس کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا، لارڈ
کرزن نے ان کی اعلیٰ لیاقت کی قدردانی کا اظہار انھیں امپیریل کونسل کا
ممبر نامزد کرکے کیا، جس سے بالواسطہ علی گڑھ کالج کی بھی عزت افزائی ہوئی لیکن کالج
میں اُن کی اقتدار پسندی و خود رائی نے طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا کردیں۔"

مسٹر ماریسن کے جانشین مسٹر آرچبولڈ مقرر ہوئے، جو ایک تعلیم یافتہ جنٹلمین تھے لیکن اسٹاف کی قدیم آزادانہ روایات سے وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے، اور رفتہ رفتہ اُن میں بھی خود مختاری اور تمکنت کی شان پیدا ہوگئی، یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۰۷ء میں ایک معمولی سے واقعہ پر اسٹرائک تک نوبت پہنچی اور ایک ہنگامہ برپا ہوگیا، جس کا نتیجہ کالج کے حق میں برا نکلا۔

یہ حالات تھے جب کہ نواب وقار الملک کالج کے آنریری سکرٹری مقرر ہوئے، وہ کوئی ناتجربہ کار شخص نہ تھے، اسٹاف کے طرز عمل کی گزشتہ تاریخ سرسید کے زمانہ سے اب تک اُن کے پیش نظر تھی، اور وہ خوب جانتے تھے کہ اسٹاف کو ارکان حکومت اور سررشتہ تعلیم کے اعلیٰ عہدہ داران پر پورا اعتماد ہے کہ بروقت ضرورت وہ اُن کی حمایت کرینگے، وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ موجودہ حالت میں یہ موزوں نہ ہوگا کہ پرنسپل اور اسٹاف کے معاملات میں خواہ مخواہ مداخلت کی جائے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ جو حالت مدت سے قایم ہے وہ بدستور جاری رہے، اور آنریری سکرٹری کو جو قوم کی طرف سے کالج کا ذمہ دار افسر ہے کسی قسم کا اختیار حاصل نہ رہے۔

اختلاف کا آغاز چونکہ نواب وقار الملک نے کالج کے معاملات میں ہمیشہ آزادانہ رائے کا اظہار کیا تھا، اس لیئے اُن کے خیالات عام طور پر لوگوں کو معلوم تھے، اور اسٹاف کے بعض ممبر سرسید کے زمانہ سے یہ دیکھتے چلے آتے تھے کہ وہ اسٹاف کی غیر معتدل آزادی کو پسند نہیں کرتے اس بنا پر ابتدا ہی سے اُنھوں نے جدید آنریری سکرٹری کے طرز عمل کو مشتبہ نظروں سے دیکھنا شروع کیا، لیکن آنریری سکرٹری کے حزم و احتیاط کی وجہ سے

اسٹاف کو کوئی موقع برہمی و شورش کا نہیں ملا۔ لیکن آخر کار ۱۹۰۹ء میں اس کا وقت آگیا۔

واقعہ یہ ہے کہ ۲۲ر فروری ۱۹۰۹ء کو سر جان ہیوٹ لفٹننٹ گورنر کالج کے معائنہ کے لیے تشریف لائے، ایڈریس کے جواب میں آپ نے جو طویل اسپیچ دی، اُس میں یہ بھی کہا کہ "اسٹاف ضرورت کی مقابلہ میں کم ہے"۔ مقصد یہ تھا کہ اسٹاف میں اضافہ کیا جائے۔ ہز آنر کے تشریف لے جانے کے بعد، نواب وقار الملک نے پرنسپل سے ٹائم ٹیبل طلب کیا، اور اُس کے دیکھنے کے بعد پرنسپل (مسٹر آرچبولڈ) سے یہ خواہش کی کہ وہ مہربانی کر کے ایک ایسا ٹائم ٹیبل بنائیں جس میں پرنسپل کے علاوہ (جن کے متعلق اور کام بھی ہے) ہر ایک پروفیسر کے روزانہ چار پیریڈ، اور اسسٹنٹ پروفیسروں کے پانچ پیریڈ قایم کریں۔ ایک پیریڈ ۵۰ منٹ کا سمجھا جاتا ہے، آنریری سکرٹری کی یہ خواہش قواعد یونیورسٹی کے مطابق تھی، وہاں ہر پروفیسر کے متعلق ہفتہ میں ۲۴ پیریڈ رکھے گئے ہیں جو اتوار کا دن نکال کر ۶ روز میں ۲۴ پیریڈ یعنی ۴ پیریڈ روزانہ ہوتے ہیں۔

پرنسپل نے آنریری سکرٹری کی رائے سے اختلاف کیا، اُنھوں نے کہا کہ انگلش پروفیسروں کے لیئے، بجائے چار پیریڈ کے صرف تین پیریڈ رہنے چاہئیں، اس کے علاوہ اُنھوں نے آنریری سکرٹری کی اس تجویز کو مداخلت پر محمول کیا، اور یہ لکھا کہ دفعہ ۲۶۱ قانون ٹرسٹیان کے بموجب کام کے گھنٹوں کا مقرر کرنا پرنسپل کا کام ہے، آنریری سکرٹری نے جواب دیا کہ "یہ امر کہ کون پروفیسر کس گھنٹہ میں، کس کلاس کو کس مضمون کی تعلیم دے بیشک پرنسپل کا کام ہے اور دفعہ ۲۶۱ کا یہی مقصد ہے نہ یہ کہ پرنسپل کو یہ اختیار ہو کہ وہ جس قدر چاہیں کسی پروفیسر سے کام لیں اور جس قدر نہ چاہیں نہ لیں، یہ تو جو شخص کسی کو تنخواہ دیتا ہے وہ اس کا مجاز ہوگا، آخر میں اُنھوں نے یہ بھی لکھ دیا کہ وہ اس کے لیئے تیار ہیں کہ یہ معاملہ تصفیہ کے لیئے ٹرسٹیوں کے سامنے پیش کر دیں۔

اِس کے علاوہ بعض دوسرے اُمور میں بھی اختلاف ہوا، مثلاً ایک پروفیسر کے الاؤنس کا معاملہ تھا جو بے قاعدہ طور پر طلب کیا جاتا تھا، اسی طرح ایک طالب علم کے اخراج کا معاملہ تھا جس کے متعلق بعض خاص وجوہ سے آنریری سکرٹری نے کیفیت طلب کی تھی، پرنسپل نے ان

سب امور کو آنریری سکرٹری کی ناجائز دست اندازی قرار دیا۔

پرنسپل کا استعفا اور آنریری سکرٹری

غرض ۲۰ مارچ ۱۹۰۹ء کو پرنسپل نے آنریری سکرٹری کے پاس اپنا استعفا اس بنا پر پیش کر دیا کہ اُن کے اختیارات میں مستقل طور پر مداخلت کی پالیسی برتی جاتی ہے، اور یہ لکھا کہ وہ تعطیل کلاں کے ختم پر کالج کو چھوڑ دینگے، اور بلا انتظار جواب ہز آنر پیٹرن کالج کو بھی اپنے استعفے کی اطلاع کر دی، آنریری سکرٹری کو اس پر سخت حیرت ہوئی اور اُنھوں نے لکھا کہ:-

"مہربانی سے آپ اُن واقعات کی تفصیل سے مجکو مطلع کیجیے جن کی وجہ سے آپ اس قدر بد دل ہو گئے ہیں تاکہ میں خود بھی اُن پر غور کروں، اور ضرورت ہو تو پریسیڈنٹ صاحب اور ٹرسٹیوں کے سامنے پیش کروں"

پرنسپل نے آنریری سکرٹری کی اس چٹھی کا تو کوئی جواب نہیں دیا، لیکن ۲۲ مارچ ۱۹۰۹ء کو اُنھوں نے انگلش اسٹاف کے ممبروں کا ایک خط آنریری سکرٹری کے پاس بھیجا جو ۱۲ مارچ کا لکھا ہوا تھا، انگلش اسٹاف نے لکھا تھا کہ:-

"ہم نے نہایت دلی افسوس کے ساتھ سُنا کہ آپ کو اپنے عہدہ پرنسپلی سے استعفا دینے کی ضرورت پیش آئی لیکن اُس ضرورت پر تاسف کرتے ہوئے جس کی وجہ سے آپ کو یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا، ہم کو اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آنریری سکرٹری کی جانب سے مستقل طور پر دست اندازی کے اُس طرزِ عمل نے جو کہ ایک سے زیادہ مواقع پر خلاف قانون ہوا ہے آپ کی اس کارروائی کو لابدی کر دیا ہے، کالج کے نفع کے خیال سے ہم کو باایں ہمہ اُمید ہے کہ یہ معاملہ دوستانہ طریقہ سے اب بھی طے ہو جائیگا، جو کہ اس بات کی پختہ ضمانت ہوگی کہ آیندہ اِنسٹی ٹیوشن کا انتظام قابل اطمینان رہیگا ورنہ ہم یہ خیال کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ ایسی اشد ضرورت لاحق ہو گئی ہے جو دفعات ۱۳۹ د

۱۸۶۱ قوانین ٹرسٹیان کے بموجب کارروائی کی طلب ہی"
دفعات کا حوالہ دینے سے اسٹاف کا مقصد یہ تھا کہ گورنمنٹ کی مداخلت اور دست اندازی کا وقت آگیا ہی، یہ گویا ایک قسم کی دھمکی تھی، آنریری سکرٹری نے انگلش اسٹاف کا خط پڑھنے کے بعد دوبارہ پرنسپل کو ایک خط لکھا اور اُس میں "مستقل مداخلت" اور "بے ضابطہ مداخلت" کی مثالیں طلب کیں، اور یہ لکھا کہ انگلش اسٹاف نے اپنے نوٹ میں مداخلت کا جو الزام لگایا ہی اُس کی توضیح ضروری ہی، اُنھوں نے صاف طور پر لکھدیا کہ:-

"اگر مجکو یہ معلوم ہو کہ میری کسی بے ضابطہ مداخلت سے کوئی جائز شکایت پیدا ہوئی ہی تو میں نہایت خوشی اور آمادگی سے اس کی ضروری تلافی جو کچھ بھی میرے امکان میں ہو کرونگا"

پرنسپل نے بھی اس خط کے جواب میں ایک طویل خط لکھا اور اُس میں اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہی کہ:-

"کالج کے اندرونی معاملات میں پرنسپل کو سب سے اعلیٰ درجہ کا اور انتہائی اختیار ہونا چاہیے خصوصاً ڈسپلن کے متعلق، داخلہ کے بارہ میں اور ترقی کے معاملہ میں نیز اس امر میں کہ اسٹاف کتنے گھنٹے پڑھائے، اُس کا اختیار پوچھ گچھ سے بالاتر ہونا چاہیے"

آخر میں اپنی خود مختارانہ حیثیت کو اس طرح واضح کیا کہ:-

"اگر مجکو دو گھوڑوں کی جوڑی میں سے صرف ایک ہو کر رہنا ہی تو میں سمجھتا ہوں کہ میں بحیثیت پرنسپل کے اپنا فرض انجام نہیں دے سکتا، اور بلاشبہ جیسا کہ میں نے آپ کو سمجھا دیا ہی، سوائے ایک رسم پوری ہو جانے کے اور کوئی ضرورت یا کام پرنسپل کا مطلق معلوم ہی نہیں ہوتا"

ابھی آنریری سکرٹری نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ ۲۵ مارچ کے پانیر میں

ان اختلافات کے متعلق ایک نوٹ شائع ہوا، جس کا انداز کسی قدر مخالفانہ اور تشویش انگیز تھا۔ آنریری سکرٹری نے اس خیال سے کہ مسلمانوں میں اس واقعہ سے کوئی اضطراب پیدا نہ ہو، فوراً پانیر اور بعض دیگر انگریزی، اردو اور گجراتی اخبارات میں تار دیدیے، اور اختصار کے ساتھ صحیح واقعہ بیان کر کے لوگوں کو یہ اطمینان دلا دیا کہ

"امید ہے کہ تمام معاملات بخوش اسلوبی طے ہو جائینگے اور کالج کا کام اُسی مستعدی اور سرگرمی سے اب بھی چل رہا ہے اور چلتا رہیگا، جیسا کہ اس گوار نزاع سے پہلے چلتا تھا۔"

آنریری سکرٹری نے تمام خط وکتابت کی نقل ہز آنر کو جو کالج کے پیٹرن ہیں بھیجدی، اور ایک اطلاع بصیغہ راز ٹرسٹیوں کے نام بھیجی جس میں اختصار کے ساتھ تمام واقعات بیان کیے گئے تھے، اور صاف طور پر یہ ظاہر کر دیا تھا کہ :۔

"اگر کبھی وہ وقت آیا کہ اسٹاف نے اپنی شکایتوں کی فہرست ٹرسٹیوں کی توجہ کے لیے پیش کی تو اُس وقت میں بھی اُن بعض اہم ترین شکایتوں کو ٹرسٹیز کے سامنے پیش کروں گا جو مجھکو اُس طریقہ کی نسبت ہیں، جس سے وہ اپنی خدمات کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور جن کے لحاظ سے میرے دل کو بھی بہت تکلیف پہنچتی رہی ہے، اور جن کو زبان پر لانے سے میں نے اب تک برابر احتیاط کی ہے، مگر بہرحال اب ضرورت ہے کہ ایک دفعہ مضبوطی کے ساتھ اس کا فیصلہ ہونا چاہیئے کہ آیندہ کام کیونکر چل سکتا ہے۔"

اُنھوں نے واقعات بیان کرنے کے بعد صاف طور پر اپنا یہ خیال ظاہر کر دیا کہ :۔

"واقعات ہماری طرف ہونے چاہئیں، اور اس کے بعد ہم کو مطلق پروا نہ کرنی چاہیئے کہ انجام کیا ہوگا۔ صداقت کا انجام ہمیشہ اچھا ہی ہوگا۔"

لیکن ابھی یہ تحریر شاید سب ٹرسٹیوں کے پاس پہنچی بھی نہ ہوگی کہ کالج کے پیٹرن سر جان ہیوٹ

لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور پریسیڈنٹ کالج کے ذریعہ سے آنریری سکرٹری کو اور ڈائرکٹر کے ذریعہ سے پرنسپل کو لکھنؤ طلب کیا، جو ٹرسٹی لکھنؤ میں قیام پذیر تھے اُن کو بھی بلایا اور ۲۹ مارچ کو مجلس مشاورت منعقد ہوئی، آنریری سکرٹری نے تحریراً اور بالمشافہ یہ ظاہر کیا کہ جو بحث پیدا ہوگئی ہے وہ کالج کے قانون اور اس کی بنیاد پر اثر ڈالتی ہے اور اس کو صرف ٹرسٹی ہی طے کر سکتے ہیں اور اس مقصد کے لئے میٹنگ منعقد ہونے والی ہے اور چونکہ ابھی ٹرسٹیوں نے اس مسئلہ پر غور نہیں کیا لہذا ہز آنر کی مداخلت کا وقت ابھی نہیں آیا ہے، اور ہز آنر سے مشورہ کرنا قبل از وقت ہے، مگر ہز آنر نے اس کو قبول نہیں کیا۔ اس لئے مشورہ کی گفتگو شروع ہوئی۔

ہز آنر کے استفسار پر پرنسپل نے اپنی شکایتیں پیش کیں۔ مثلاً

(۱) آنریری سکرٹری، طلبہ کی شکایات بطور اپیل سنتے ہیں۔

(۲) داخلہ طلبہ کے متعلق مداخلت کرتے ہیں۔

(۳) یہ چاہتے ہیں کہ اگر کوئی طالب علم ڈسپلن کی بنا پر خارج کیا جائے تو ان سے مشورہ کر لیا جائے

(۴) ٹرسٹیان کالج کا یہ حق سمجھتے ہیں کہ وہ اس امر کا فیصلہ کریں کہ پروفیسروں کو روزمرہ کتنے گھنٹے تعلیم دینا چاہئے۔

(۵) بلا مشورہ پرنسپل ملازمت کے اُمیدواروں سے (اسٹاف میں ملازمت کے لئے) خط و کتابت کرتے ہیں، اور اُن لوگوں کا تقرر کر لیا جاتا ہے۔

(۶) یورپین اسٹاف پر اعتماد نہیں کرتے۔

(۷) مسٹر ٹول کو ایام رخصت میں نگرانی کا الاونس نہیں دیتے۔

(۸) عام طور پر انتظامی حالت ابتر ہے، کمیٹیوں کے جلسے نہیں ہوتے اور اس وجہ سے اسکیموں کے جاری کرنے میں تاخیر ہوتی ہے۔

آنریری سکرٹری نے تمام شکایات کا تفصیلی جواب دیا، اور وضاحت کے ساتھ اپنی

مشکلات کو بتایا، فریقین کا بیان سنکر ہز آنر نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔ بعض معاملات میں اُنھوں نے سکرٹری کے طرزِ عمل کو صحیح قرار دیا، اور اسٹاف کے جائنٹ نوٹ پر افسوس ظاہر کیا، لیکن اختیارات کے معاملہ میں اُنھوں نے پرنسپل کی پُرزور طریقہ سے حمایت کی، اور اُس کو کالج کا مطلق العنان حکمراں قرار دیا۔

اس مجلس مشورہ کی ایک مکمل یادداشت ہز آنر کے ایما سے آنریبل ڈیلا فوس ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے تیار کی، اور خود نواب وقارالملک نے بھی ایک مفصل یادداشت مرتب کی ان دونوں یادداشتوں میں بعض مقامات پر کسی قدر اختلاف بھی تھا۔



نواب صاحب کا طرز عمل بعد ملاقات ہز آنر

گورنمنٹ ہاؤس سے واپس آنے کے بعد نواب صاحب نے اُن ٹرسٹیوں کے اصرار سے جو لکھنؤ میں موجود تھے دوسرے روز (۳۰ مارچ ۱۹۰۹ء کو) ہز آنر کے پرائیویٹ سکرٹری کے نام ایک چٹھی لکھی جس میں اس امر پر ہز آنر کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہ جناب ممدوح نے کالج کے معاملات میں دلچسپی کا اظہار کیا یہ بھی لکھا کہ :-

"مجھ کو جو خود بھی سب سے زیادہ ہز آنر پیٹرن کالج کے احسانات کا شکر گزار ہوں جو کچھ عذر تھا وہ اس بنیاد پر نہیں تھا کہ بلحاظ موجودہ قواعد و قوانین ٹرسٹیان اور یونی ورسٹی ایکٹ کے حضور ممدوح کے ارشادات میں کوئی عذر ہی، اُن ارشادات کے تسلیم کرنے میں، نہ اُس وقت مجکو کوئی عذر تھا نہ آیندہ ہو سکتا ہی، اور میں ہز آنر کو یقین دلاتا ہوں کہ جو کچھ ہز آنر نے ارشاد فرمایا، اُس کو دوسرے ٹرسٹیوں کے ذہن نشین کرنے میں سب سے زیادہ میں خود حصہ لونگا۔"

میرا جو اصلی مقصد اس وقت کی گزارشات سے تھا وہ صرف یہ تھا کہ

کہ پرنسپل اور آنریری سکرٹری دونوں کے باہم ایسے مستحکم دوستانہ تعلقات ہونے چاہئیں کہ ایک دوسرے کو اپنی مفید صلاح و مشورہ سے مدد پہونچا سکیں اور کام اچھی طرح چلے لیکن اگر پرنسپل اس کی قدر نہیں کرتے تو وہ جانیں اور اُن کا کام۔“

چٹھی کے آخر میں نواب صاحب نے یہ بھی لکھا کہ:۔

”میں یہ چٹھی علی گڑھ پہنچ کر اور لوکل ٹرسٹیز سے مشورہ کرکے لکھنا چاہتا تھا اور اُس وقت میں یہ رائے بھی دینا چاہتا تھا کہ اگر پرنسپل صاحب اپنا استعفا واپس لے لیں تو ہم کو ایسٹر کی تعطیلوں میں کانسٹی ٹیوشن میٹنگ کا طلب کرنا بھی ضرور نہ ہوگا بلکہ امور طے شدہ کو ٹرسٹیوں کی کسی آیندہ میٹنگ کے امور اطلاعی میں درج کیا جائے جس کی یادداشت اُن ٹرسٹیوں کے دستخط سے جو اس گفتگو کے وقت موجود تھے منسلک ہذا ہے۔ لیکن نواب آنریبل پریسیڈنٹ اور سر راجہ صاحب اور راجہ نوشاد علی خاں صاحب اور مسٹر محمد رفیق صاحب کا مشورہ یہی ہوا کہ چٹھی ابھی بھیجدی جائے لہذا ابھی سے بھیجتا ہوں اور میں آج ۱۲ بجے علی گڑھ کو روانہ ہوتا ہوں۔“

مجلس مشورہ

یہ چٹھی لکھ کر نواب صاحب علی گڑھ روانہ ہوگئے، جہاں ۱۲ر اپریل سنہ ۱۹۰۹ء کو ٹرسٹیوں کا ایک جلسۂ مشورہ منعقد ہوا، جس میں نواب صاحب نے پرنسپل اور اسٹاف کی شکایات کے متعلق تمام واقعات تفصیل سے بیان کیے، نیز لکھنؤ میں ہز آنر سے جو گفتگو ہوئی تھی وہ بھی ٹرسٹیوں کے سامنے بیان کی، اور آنریبل نواب ممتاز الدولہ سر محمد فیاض علی خاں بہادر پریسیڈنٹ نے اُن اہم مطالب پر ٹرسٹیوں کو مطلع کیا، جو ہز آنر کی ملاقات کی یادداشت مرتبہ مسٹر ڈیلافوس (ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم) میں درج تھے۔ اس کے بعد صاحبزادہ آفتاب احمد خاں

سلہ (آیندہ صفحہ پر)

صاحب نے جلسہ کے سامنے ایک مفصل تقریر کی۔

صاحبزادہ صاحب نے اس تقریر میں سب سے پہلے کالج اور گورنمنٹ کے تعلقات پر بحث کی اور یہ بتایا کہ گورنمنٹ نے کس طرح مختلف موقعوں میں کالج کی مدد کی ہے لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ گورنمنٹ سے ہمیشہ خوشگوار تعلقات قایم رکھیں، اس کے بعد انگلش اسٹاف کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے، مسٹر بک، مسٹر آرنلڈ، اور مسٹر مارکسین کے واقعات بیان کیے اور بتایا کہ کالج کی تعلیم و تربیت میں جو خصوصیات ہیں اُن میں انگلش اسٹاف کا کس قدر حصہ ہے، اسی سلسلہ میں آپ نے ان تعلقات کی نوعیت اور ضرورت پر تفصیلی بحث کر کے فرمایا کہ:۔

"ایسی حالت میں ہم لوگوں کا جو یہاں رہتے ہیں اور جن کے ذریعہ سے باہر کے ٹرسٹی اور قوم، کالج کے معاملات کے متعلق رائے قایم کرتی ہے، ان کا فرض ہے کہ جب کوئی ایسی کارروائی ہو جس سے ہمارے خیالات میں گورنمنٹ کے طرز عمل یا انگلش اسٹاف کی وفاداری کی نسبت فرق پیدا ہو تو فوراً اُس کی اصلاح کی کوشش کرنا چاہیئے۔"

ان خیالات کے ظاہر کرنے کے بعد آپ نے نہایت وضاحت سے تازہ واقعات کو مسلسل طریقہ سے بیان کرتے ہوئے آخر میں فرمایا کہ:۔

"دوسرے روز آنریری سکرٹری صاحب نے جو کچھ فیصلہ ہوا تھا، اس کے متعلق ٹرسٹیان موجودہ لکھنؤ کے اتفاق سے ایک یادداشت مرتب کر کے ہز آنر کے حضور میں بھیجی، اور جو کچھ اس یادداشت میں درج تھا اُس کی نسبت اپنا ذاتی اتفاق ظاہر کیا، اس کے متعلق آنریری سکرٹری صاحب نے آج کے جلسہ میں فرمایا ہے کہ وہ اس معاملہ کے متعلق علی گڑھ آکر اور لوکل ٹرسٹیز سے مشورہ کرنے کے بعد کچھ لکھنے والے تھے، لیکن دیگر ٹرسٹی

(نوٹ صفحہ ۴۶۹) ۱؎ مسٹر ڈیلافوس کی یادداشت پر نواب صاحب نے مفصل تبصرہ کیا ہے، اور اس یادداشت کے

صاحبان موجودہ لکھنؤ کے اصرار سے وہ اس چٹھی کے لکھنے پر مجبور ہوئے اور اس کا اشارہ اُنھوں نے اس چٹھی میں بھی کر دیا ہے۔ لیکن با ایں ہمہ اسقدر عرض کرنے کی اجازت چاہونگا کہ جب کہ وہ ۲۹ تاریخ کو صاف عرض کر چکے تھے کہ یہ معاملہ اوّل ٹرسٹیوں کے روبرو پیش ہونا چاہیئے' اس کے بعد رضامندی دینا ضرور غلطی ہوئی (آنریری سکرٹری نے اپنی اس غلطی کو تسلیم کیا)۔ بہرحال یہ کل واقعات ہیں جو میں نے آپکے سامنے عرض کر دیئے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان اُصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جو میں نے بطور تمہید کے بیان کیئے ہیں' یہ کارروائی کیا اہمیت رکھتی ہے' اور اس کا آیندہ کیا اثر پڑیگا' اور پرنسپل صاحب اور انگلش اسٹاف نے اس کارروائی کو جس طریقہ سے کیا' اور اس کے متعلق جو طرز اختیار کیا' اور ہز آنر نے اس میں جو حصہ لیا اس کی نسبت ہم کو کیا رائے قرار دینا چاہیئے "۔

اس تقریر کے بعد جلسہ میں بحث شروع ہوگئی' مثلاً سر علی امام بالقابہ گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ :-

" جو کچھ لکھنؤ میں ہوا ہے میں اُس کو زیادہ اندیشہ ناک نہیں سمجھتا' ہم کو ذرا ہمت اور استقلال سے کام لینا چاہیئے' اب میری تجویز یہ ہے کہ ٹرسٹیوں کی ایک میٹنگ کی جائے' اور جو رزولیوشن ہم پاس کریں' وہ ہز آنر ہیٹرن کے پاس بھیجے جائیں' برائے اطلاع' مگر اس مستقل ارادہ کے ساتھ کہ ان کا نفاذ ضرور ہوگا "۔

اِس بحث و گفتگو کے بعد نواب صاحب نے دریافت فرمایا کہ :-

(بقیہ نوٹ ص ۴۷۰) جو غلط فہمیاں پیش ہو سکتی تھیں اُن سب کو خوبی سے دور کر کے اصل حقیقت واضح کر دی ہے' نواب صاحب نے یہ نوٹ بعد کو ٹرسٹیوں کے سامنے پیش کیا۔ (رندوی)

"پرنسپل صاحب کی واپسی استعفا کا کیا جواب دوں۔ میری رائے یہ ہی کہ بسلسلہ اپنی پچھلی چٹھی کے ہز آنر کو لکھوں کہ اب جو یادداشت آئی ہے اُس کے لحاظ سے اب میں اپنے کو اس قابل نہیں پاتا کہ ٹرسٹیوں کو ترغیب دلا سکوں"۔

ٹرسٹیوں نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ ایسا ہی کریں، اس کے بعد ٹرسٹیوں نے تمام کاغذات اور وہ خط و کتابت دیکھی جو گزشتہ ایام میں آنریری سکرٹری اور پرنسپل کے درمیان ہوئی تھی اور جس کو بنائے نزاع کہا جاتا ہے، اور پرنسپل کے استعفے اور اُس کے وجوہ پر غور کیا، اور آخرکار پریسیڈنٹ صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ ہز آنر سے اس بات کی اجازت حاصل کریں کہ لکھنؤ کے جلسہ ملاقات کے متعلق جن اہم مطالب کا ذکر اس وقت آنریبل پریسیڈنٹ صاحب نے فرمایا ہے وہ جملہ ٹرسٹیوں کے سامنے پیش کیے جائیں تاکہ ٹرسٹی ان کی نسبت اپنی رائے قایم کرسکیں۔

اس جلسہ مشورت سے کچھ پہلے لکھنؤ سے واپسی پر پرنسپل نے نواب صاحب کو حسب ذیل اطلاع دی۔

مائی ڈیر نواب صاحب! لکھنؤ سے واپسی پر میں نے معاملہ پر غور کرکے ہز آنر کو حسب ذیل خط لکھا:۔

"ڈیر سر جان ہیوٹ! کل جو کچھ آپ نے فرمایا، میں نے اس پر غور کیا اور میں اپنا استعفا واپس لینے پر رضامند ہوں، بشرطیکہ ٹرسٹیان اور آنریری سکرٹری اُن تجاویز کو منظور کرلیں، جو آپ نے اپنی اسپیچ میں آنریری سکرٹری و پرنسپل کے باہمی تعلقات کے متعلق امور زیر بحث و دیگر معاملات کی نسبت کی تھی، میری رائے میں یہ تجاویز آئندہ کارروائی کے لیے اصل اُصول ہیں"۔

"اس پر ہز آنر نے نہایت مہربانی سے مجھ کو جواب دیا ہے کہ آپ نے ان تجاویز کو پہلے ہی منظور کرلیا ہے، اور یہ اُمید ظاہر کی ہے کہ آئندہ تمام کام بخیر و خوبی ہوتا

رہیگا میں آپ کو یہ اس لیئے لکھتا ہوں کہ شاید ہز آنر نے خود آپ کو اطلاع نہ دی ہو جیسا کہ میرا خیال تھا کہ وہ آپ کو اطلاع دینگے"

آرچبولڈ

نواب صاحب کی مراسلت ہز آنر سے

چونکہ علی گڑھ آنے کے بعد حالات بدل گئے تھے، اور مسٹر ڈیلافوس کی مرتبہ یادداشت ملاقات نے معاملہ کی نوعیت میں تغیر پیدا کر دیا تھا، اس لیئے نواب صاحب نے اس چٹھی کا جواب ملتوی رکھا، اور جلسہ مشورت کے دوسرے روز ہز آنر کے پرائیویٹ سکرٹری کے نام حسب ذیل چٹھی لکھی :-

"مائی ڈیر سر! ہز آنر کی اطلاع کی غرض سے میں پرنسپل صاحب کی چٹھی کی نقل ملفوف کرتا ہوں جو اُن کے استعفے کی واپسی کے متعلق ہے، میں نے ابھی تک پرنسپل صاحب کی اس چٹھی کا کوئی جواب نہیں بھیجا کیونکہ جو یادداشت طے شدہ اُمور کی میں نے ۲۰ مارچ کو لکھنو سے ہز آنر کے ملاحظہ اور منظوری کے لیئے بھیجی تھی اور جس کے متعلق میں نے پھر آپ کی خدمت میں یاد دہانی بھی کی اس کا جواب مجکو ابھی تک نہیں ملا اور آنریبل سر محمد فیاض علی خاں بہادر پریسیڈنٹ کالج کے پاس جو کاغذات اس معاملہ کے متعلق آنریبل مسٹر ڈیلافوس کے پاس سے پہونچے ہیں اُن کے خاص خاص مطلب کے لحاظ سے میں بہت ادب سے یہ عرض کرنیکی اجازت چاہتا ہوں کہ ان میں بعض امور ایسے بھی ہیں جن کے قبول کرنے میں مجھ کو تامل ہے، ٹرسٹیوں سے اُن کو پاس کرانے کی غرض سے میں کارروائی میں کوئی حصہ نہ لے سکونگا، نواب پریسیڈنٹ صاحب نے اس کے متعلق جو کچھ کارروائی کی ہے اُس کی اطلاع جناب ممدوح نے ہز آنر کے حضور میں علیحدہ کر دی ہے"

اس کے بعد نواب صاحب نے پرنسپل کو ایک چٹھی لکھی اور مندرجہ بالا خط کی نقل بھی اُن کو بھیجدی اس پر مسٹر آرچبولڈ نے نواب صاحب کو لکھا :-

"آپکے خط کا نہایت ممنون ہوں اور بہت افسوس ہو کہ آپ ہز آنر شیرن کالج کی تجاویز منظور کرنے کی کوئی صورت نہیں دیکھتے مجھ کو خیال تھا کہ آپنے ان تجاویز کو منظور کر لیا ہو، لیکن اب درحقیقت یہ معاملہ ٹرسٹیان کی میٹنگ کے انعقاد تک ٹلا ہے۔"

ہز آنر نے بھی نواب صاحب کے خط کا مفصل جواب دیا جس میں پہلے تو نواب صاحب کی مرتبہ یادداشت ملاقات کو نامکمل اور غیر صحیح بتایا اور تمثیلاً یادداشت کے چند غیر صحیح جملوں کا حوالہ دیا، اس کے بعد یہ لکھا کہ :-

"مجھ کو افسوس ہو کہ یادداشت کارروائی میں جو نواب سر محمد فیاض علی خاں پریسیڈنٹ ٹرسٹیان کے پاس ہو آپ کے نزدیک ایسے معاملات ہیں جنکو منظور کرنے میں آپ کو تامل ہو، اگرچہ آپ کے خط مورخہ ۳۰ مارچ سے میں یہ سمجھا تھا کہ آپنے تمام جو کچھ کہ میں نے کہا تھا منظور کر لیا، اگر آپ مجھکو مطلع کریں کہ کون سے معاملات آپ منظور نہیں کرتے تو میں زیادہ واضح طور سے سمجھ سکونگا، لیکن فی الحال میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نہیں سمجھا کہ وہ کیا معاملات ہیں۔"

اسی کے ساتھ ہز آنر نے نواب محمد فیاض علی خاں پریسیڈنٹ کو بھی ایک چٹھی لکھی اور یہ خواہش کی کہ آنریری سکرٹری رام نگر آکر ہز آنر سے ان معاملات کے متعلق ملاقات کریں، لیکن آنریری سکرٹری نے موجودہ حالت میں ہز آنر سے ملاقات کرنا مناسب نہیں سمجھا اور جواب لکھا کہ :-

"ہز آنر یقین فرمائیں کہ میں اپنے آپ کو جناب ممدوح کی خدمت میں سلام کو حاضر کرنا ایک خاص عزت و عنایت تصور کرتا ہوں، لیکن آج کل کے معاملہ پر نظر کر کے مجھے بہتر اس کے کہ میں ہز آنر کی خدمت میں حاضر ہوں یہ

عرض کرنا اپنا فرض معلوم ہوتا ہے کہ ایک کافی حد تک جناب عالی کے مربیانہ خیالات کا اظہار ہو چکا ہے اور ٹرسٹیز کو بھی عنقریب اُن پر مطلع ہونے کا موقع ملیگا جو یقین ہے کہ کافی غور کے بعد کوئی مناسب رائے قایم کرینگے، اور مجھ کو اُمید ہے کہ وہ ایک ایسی سنجیدہ رائے ہوگی کہ جناب عالی بھی اُس سے غالباً مطمئن ہو سکینگے، یہ ممکن ہے کہ اس وقت میں کسی معاملہ میں ہز آنر کے حضور میں اپنی کسی ذاتی رائے کا اظہار کروں اور اُس کے بعد جماعت ٹرسٹیان کے تبادلہ خیالات کے بعد مجھ کو اپنی رائے بدلنے کی ضرورت پڑے اور یہ کچھ اچھا نہوگا۔"

اس کے جواب میں ہز آنر کے پرائیویٹ سکرٹری نے اطلاع دی کہ:۔

"اب ہز آنر آپ کو ملاقات کے لیے رام نگر آنے کی تکلیف نہ دینگے اُمید ہے کہ آپ بخیریت تمام ہونگے"۔

اسی سلسلہ میں ہز آنر نے نواب فیاض علی خاں صاحب کو بھی ایک خط لکھا کہ:۔

"جیسا کہ میں پہلے آپ سے کہہ چکا ہوں میں نے معلوم کر لیا تھا کہ نواب مشتاق حسین نے رام نگر آنا نہیں چاہتے، اور اب اُن کا ۱۹ تاریخ کا خط بھی میرے پاس آگیا اس خط میں نواب صاحب نے میری اس درخواست کا کہ جو یادداشت آپ کے پاس بھیجی گئی تھی اُس میں کس امر سے اُن کو اختلاف ہے مجکو بتائیں کوئی جواب نہیں دیا، اور چونکہ لکھنؤ کی میٹنگ کے بعد یہ پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ جو کچھ میں نے کہہ دیا ہے، اس سے اُن کو اتفاق ہے لہذا میں اس خط کو قطعاً اطمینان بخش نہیں خیال کر سکتا ہوں"۔

نواب فیاض علی خاں نے ہز آنر کی اس چٹھی کی نقل نواب وقار الملک کو بھیجدی،

دوسری مجلس مشورہ اور اظہار رائے

اس کے بعد ٹرسٹیوں کا ایک اور جلسہ مشورہ ۲۷، ۲۸، ۲۹، اپریل کو بہاسو ہاؤس میں منعقد ہوا، آنریری سکرٹری نے ہز آنر کی رائے (مندرجہ روئداد مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۰۹ء متعلق ملاقات ہز آنر بمقام گورنمنٹ ہاؤس لکھنؤ) پیش کی جس کو ٹرسٹیوں نے

غور سے سُنا، اور یہ رائے قایم کی کہ یہ معاملہ پہلے ٹرسٹیوں کے سامنے پیش ہونا چاہیئے تھا لیکن جبکہ ہز آنر نے اُن اُمور پر رائے ظاہر کردی ہے تو ٹرسٹیوں کا فرض ہے کہ وہ حزم و احتیاط کے ساتھ اُس پر غور کریں اور اُس کے ساتھ ہی کالج اور قوم کی بہبودی کا بھی لحاظ رکھیں، چنانچہ ٹرسٹیوں نے تمام معاملات پر غور و بحث شروع کی جس کا ماحصل اختصار کے ساتھ حسب ذیل ہے:-

(۱) ٹرسٹیوں نے قوانین کے مطابق پرنسپل کے اقتدار و اختیار کو تسلیم کیا، مگر یہ نہیں مانا کہ آنریری سکرٹری کو جو اُن کا قایم مقام ہے یہ اختیار نہو کہ وہ طلبہ کے داخلہ کی نامنظوری کے متعلق پرنسپل سے کچھ دریافت نہ کر سکے، کیونکہ سکرٹری اپنی قوم سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں اور مُسلمان اُن کو اپنا وکیل سمجھتے ہیں اور یہ اُمید کرتے ہیں کہ اگر اُن کے لڑکوں کا داخلہ کسی موقع پر کالج میں نہ ہو تو اُن کو وجوہ سے اطلاع دی جائے۔

(۲) ٹرسٹیوں نے یہ تسلیم کیا کہ ترقی کا معاملہ ہز آنر کی رائے کے مطابق بالکل پرنسپل کے اختیار میں ہے۔

(۳) ٹرسٹیوں نے ہز آنر کی اس رائے کو تسلیم کیا کہ یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آنریری سکرٹری کو یورپین اسٹاف پر اعتماد نہیں۔

(۴) ہز آنر کے اس رائے کے متعلق کہ:-

"انگریزی خیال کے مطابق پرنسپل کو مانند ایک جہاز کے کپتان کے مان لینا لازمی ہے، اور اس لیئے ایک پرنسپل کی کسی کاروائی کے خلاف حکمران جماعت کے سامنے تقریباً کبھی اپیل نہیں جاتا۔"

ٹرسٹیوں نے پوری تفصیل سے بحث کی، قانوناً ٹرسٹیوں کے حقوق بتائے آنریری سکرٹری کی پوزیشن واضح کی اور بتایا کہ وہ ٹرسٹیوں کا قایم مقام اور قوم کا لیڈر ہے، اور پرنسپل کے اقتدار کا دائرہ خواہ کتنا ہی وسیع کیوں نہو وہ کالج کا سب سے بڑا افسر نہیں ہو سکتا، بلکہ ٹرسٹیوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے مسلّمہ قایم مقام کے ذریعہ سے اُس کی نگرانی و رہنمائی کریں، نیز یہ کہ جہاں تک محض

اطلاع حاصل کرنے کا تعلق ہے ہر مسلمان کو اس کا حق ہے کہ جب چاہے کالج کے انتظام کے کسی حصہ کے متعلق اطلاع حاصل کرے اس لیئے کہ یہ دار العلوم تمام قوم کی ملکیت ہے ایسی صورت میں یہ کہنا کہ آنریری سکرٹری کسی امر کے متعلق اطلاع طلب نہیں کر سکتے یا انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ ایک ایسی بات ہے کہ جس کا نہ سمجھنا آسان ہے، نہ تسلیم کرنا، آنریری سکرٹری اس کے نہ صرف مجاز ہیں کہ پرنسپل یا کسی دوسرے افسر سے انتظام کالج کے متعلق ہر امر میں اطلاع طلب کریں، بلکہ اُن کا فرض ہے کہ ایسا کریں، ورنہ کیونکر وہ اپنے منصب کی ذمہ داریوں کو پورا کر سکتے ہیں۔

ٹرسٹیوں نے یہ رائے بھی قایم کی کہ اگر پرنسپل کو جہاز کے کپتان سے تشبیہ دی جائے جب بھی ٹرسٹیوں کا یہ خیال ہے کہ وہ کمپنی جو جہاز کی مالک ہے، اور جو کپتان کو مقرر کرتی اور مشاہرہ دیتی ہے، اسکو اس اطلاع کے حاصل کرنے کا اختیار و حق ہے کہ وہ کپتان اپنا کام کیونکر انجام دیتا ہے اور اُس کا برتاؤ جہاز کے مسافروں کے ساتھ کیسا ہے، اور اپنے ماتحتوں پر کیونکر قابو رکھتا ہے، ان سب اُمور سے واقف ہونا نگرانی اور انتظام کے لیئے ضروری ہے، گو کپتان کے خلاف اپیل نہ کی جا سکتی ہو، مگر کوئی کمپنی کپتان کے افعال پر عام نگہداشت رکھنے کے اختیار سے اپنے آپ کو محروم نہیں کر سکتی۔

غرض ٹرسٹیوں نے اس امر پر بہت زور دیا کہ ان کو اپنے قایم مقام یعنی آنریری سکرٹری کے ذریعہ سے ہر قسم کی اطلاع حاصل کرنے اور نگرانی رکھنے کا حق حاصل ہے۔

(۵) ٹرسٹیوں نے ہز آنر کی اس رائے کو پسند کیا جو انھوں نے آنریری سکرٹری اور طلبہ کی ملاقات کے معاملہ پر گفتگو کرتے ہوئے ظاہر کی تھی کہ:-

> پرنسپل اور طلبہ کے درمیان مداخلت کرنا اُن کے منصب کا کوئی جزو نہیں ہے، بلکہ پوری احتیاط کے ساتھ اس سے احتراز کر کے اُنھیں ظاہر کر دینا چاہیئے کہ وہ پرنسپل کے اختیارات کی تائید اپنا فرض سمجھتے ہیں۔"

لیکن اس کے ساتھ ہی ٹرسٹیوں نے اپنے قومی کالج اور آنریری سکرٹری کی مخصوص

حالت اور طلبہ کے والدین کی خواہش کے لحاظ سے یہ ضروری قرار دیا کہ طلبہ، آنریری سکرٹری کی خدمت میں حاضر ہوا کریں۔ اُنھوں نے یہ رائے قایم کی کہ اگر طلبہ کو آنریری سکرٹری سے ملنے کی اجازت نہ دی جائے تو عملاً اس سے مُسلمانوں کے مرکزی قومی کالج اور ایک گورنمنٹ کالج میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا، اور اس سے قومی کالج کو نقصان پہنچیگا۔

(۶) لکھنؤ کے جلسہ مشورہ میں گفتگو کے وقت ہز آنر نے موجودہ پرنسپل اور آنریری سکرٹری کو دو ہندوستانی پہلوانوں سے تشبیہ دی تھی جو ابتدا میں ایک دوسرے سے دور رہ کر منھ بنائے اور جسم کو حرکت دیتے ہیں بغیر اس کے کہ ایک دوسرے سے قریب آکر مڈبھیڑ کریں۔

اس تشبیہ کو ٹرسٹیوں نے ناپسند کیا اور یہ رائے ظاہر کی کہ :۔

"وہ اس تمثیل کو آنریری سکرٹری اور پرنسپل دونوں کے اعلیٰ مرتبہ اور عہدہ کے لئے مناسب نہیں سمجھتے، جن کی پوزیشن ہندوستان کے مسلمانوں کی نگاہ میں بہت اہم ہے، ٹرسٹیان موجودہ کو اندیشہ ہے کہ کم از کم ہندوستانی خیال کے مطابق اس تمثیل سے آنریری سکرٹری کے دل کو تکلیف پہنچی ہوگی، جنھوں نے سوائے اس کے کچھ نہیں کیا کہ کالج اور قوم کے مقاصد کی حفاظت میں کوشش کرکے اپنا فرض منصبی ادا کیا، اور جس کے لیئے ٹرسٹی اور قوم اُن پر کامل اعتماد و بھروسہ کرتے ہیں۔"

(۷) ٹرسٹیوں نے طلبہ کے داخلہ کے معاملہ پر مختلف حیثیات سے طویل بحث کرکے یہ طے کیا کہ پرنسپل طلبہ کے داخلہ کی نامنظور شدہ درخواستیں بلا طلب آنریری سکرٹری کے پاس بھیجدیا کریں، اُنھوں نے بتایا کہ آنریری سکرٹری درخواست دہندوں کی حالت اور پوزیشن کو پرنسپل سے بہتر جانتے ہیں، اُن کی مفصل تحریروں سے والدین کو اطمینان ہوجاویگا، بہ نسبت اس کے کہ پرنسپل کے دفتر سے باضابطہ مراسلت کی جائے۔

(۸) اسٹاف کے تقرر اور تعداد کے معاملہ کو جلسہ نے ٹرسٹیوں کا فرض قرار دیا کیونکہ اس کا اثر کالج کی مالی حالت پر پڑتا ہی، البتہ ہر ممبر اسٹاف کے لیئے اس کے کام کا حصہ مقرر کرنا پرنسپل کا کام ہی، غرض اس مسئلہ کے متعلق قانونی دفعات کے مطابق طویل بحث ہوئی، اور تمام جزئیات پر نظر کرکے ٹرسٹیوں نے مبسوط فیصلہ قلمبند کیا۔

(۹) ٹرسٹیوں نے ہز آنر کی اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کہ مینجنگ کمیٹی کو پرنسپل کی کارروائی پر اعتراض کا حق ہی لیکن مداخلت کا حق نہیں یہ ظاہر کیا کہ وہ محض ایک مینجنگ کمیٹی کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ کالج کی حکمراں جماعت بھی ہیں، جن پر قانوناً اس ٹرسٹ کی پوری ذمہ داری ہی، اور وہ قوم کے سامنے براہِ راست جوابدہ ہیں، لہذا اصل نگرانی ٹرسٹیوں کے اختیار میں ہوگی جو بذریعہ آنریری سکرٹری عمل میں آئیگی۔

(۱۰) ٹرسٹیوں نے اس معاملہ پر بھی تفصیلی بحث کی کہ ہر پروفیسر کے کام کی مقدار کیا مناسب ہوگی اور وہ کون تجویز کریگا۔

(۱۱) ہز آنر نے لکھنؤ کی ملاقات میں یہ بھی یاد دلایا تھا کہ جو طلبہ کی شورش (۱۹۰۷ء میں) ہوئی تھی وہ ایک حد تک آنریری سکرٹری مرحوم کی اُس مداخلت کا نتیجہ تھی جو اُنھوں نے پرنسپل کے اختیارات میں کی، ٹرسٹیوں نے تفصیلی بحث کرکے ہز آنر کی اس رائے سے اختلاف کیا، اور بتایا کہ شورش کے کمیشن کے سامنے کسی نے یہ وجہ بیان نہیں کی، نہ کمیشن نے اپنی آخری رپورٹ میں اُس کو شورش کا سبب قرار دیا۔

(۱۲) مذکورۂ بالا امور کا فیصلہ کرنے کے بعد ٹرسٹیوں نے اس طرز عمل اور طریق کارروائی پر بحث کی جو پرنسپل نے اختیار کیا تھا۔ یہ بحث نہایت طویل و مفصل اور قانون ٹرسٹیان کی بہت سی دفعات پر مشتمل ہی۔ ٹرسٹیوں نے ابتدائے نزاع سے لکھنؤ کی ملاقات تک تمام واقعات مسلسل طریقہ سے بیان کرکے اُن پر بحث کی ہی، اُنھوں نے اس بات کو ناپسند کیا کہ پرنسپل نے دفعتاً استعفا پیش کردیا، اور ٹرسٹیوں کو تین چار روز پہلے یہ اطلاع ہوئی کہ پرنسپل اور آنریری سکرٹری کے

مابین اختلاف ہے، اُنھوں نے یہ بھی ناپسند کیا کہ پرنسپل نے ہز آنر کو ان معاملات کی اطلاع دی، حال آں کہ قانوناً اُن کو اپنا معاملہ آنریری سکرٹری کی معرفت ٹرسٹیوں کے سامنے پیش کرنا چاہیئے تھا تاکہ ٹرسٹیوں کو اُن کی اور اسٹاف کی شکایات پر غور کرنے اور فیصلہ دینے کا موقع ملتا۔ اگر یہ فیصلہ پرنسپل کی مرضی کے مطابق نہ ہوتا تو اُن کو اختیار تھا کہ پھر جو کارروائی چاہتے کرتے، لیکن بدقسمتی سے باقاعدہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا اور اس وجہ سے یہ سخت دقت پیدا ہوگئی جس نے ٹرسٹیوں کو نہایت مشکل اور نازک حالت میں ڈال دیا، اور باوجود آنریری سکرٹری کی اس درخواست کے کہ وہ ان واقعات کی تفصیل بتائیں جن کی وجہ سے اُنھوں نے استعفا دیا ہے، (تاکہ آنریری سکرٹری خود بھی اس پر غور کریں اور اگر ضرورت ہو تو پریسڈنٹ اور ٹرسٹیوں کے سامنے پیش کریں) پرنسپل نے ایسا نہیں کیا۔

ٹرسٹیوں نے اسٹاف کے متحدہ نوٹ پر بحث کی اور اس کو خلاف قاعدہ قرار دیا، اور اس طرز عمل کو نازیبا تصور کیا، فیصلہ کے آخر میں خاتمہ کے طور پر ٹرسٹیوں نے یہ قلمبند کیا کہ:-

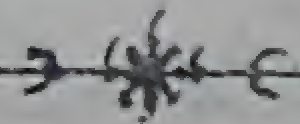
"ٹرسٹی ہز آنر پیٹرن اور ممبران یورپین اسٹاف کو نہایت پُر اثر طریقہ سے یقین دلاتے ہیں کہ یہ تمام واقعات اُن کے لیئے بہت زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوئے ہیں اور نیز یہ کہ اُمور زیر بحث پر اپنی رائے قائم کرنے میں اُنھوں نے ہر وقت یہ بات مد نظر رکھی ہے کہ ایسی نازک حالت میں جیسی کہ اس وقت پیدا ہوگئی ہے، چاہے کوئی بھی اُس کا ذمہ دار کیوں نہو، خود اُن کے اغراض کو مضرت پہونچانے والی ہوگی۔

. . . .

ٹرسٹیوں کو خوف ہوگیا ہے کہ کالج کے معاملات میں جو موجودہ دقت اور نزاع پیدا ہوگئی ہے، وہ اُن کی محنت شاقہ کے پھلوں کو بالکل برباد اور اس کالج کی عمدہ روایات کے اثر کو زائل کردیگی۔

ٹرسٹیوں کو افسوس ہے کہ ان مشکلات کے رفع کرنے کے واسطے اُن کو کوئی

موقع اپنے اختیارات کو کام میں لانے یا اپنے فرائض کو انجام دینے کا دیئے بغیر یورپین اسٹاف نے ایسا راستہ اختیار کر لیا جس سے ٹرسٹیوں کی شہرت کو کیا بحیثیت جماعت حکمراں کے اور کیا بلحاظ مقرر کنندگان اسٹاف کے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، اور جسکی وجہ سے پاینیر میں ایک پریشان کن اور مبالغہ آمیز کیفیت شایع ہوئی جس سے تمام بہی خواہان کالج کو بے چینی اور اندیشہ پیدا ہو گیا، کالج کی گزشتہ تاریخ سے اچھی طرح ظاہر ہو سکتا ہے کہ ٹرسٹیوں نے یورپین اسٹاف کی خوشنودی اور رضامندی کو ہمیشہ اس انسٹی ٹیوشن کی کامیابی کے لیئے ضروری سمجھا ہے، لیکن موجودہ جھگڑے میں جو روش پرنسپل اور یورپین اسٹاف نے اختیار کی وہ بدقسمتی سے مصالحت کے طریقہ سے اس قدر دور اور تمام روایات کالج کے ایسی صاف طور سے مخالف ہے کہ ٹرسٹیوں کو اپنی مرضی کے خلاف اپنی رائے صاف ظاہر کرنا لازم ہوا تاکہ آیندہ کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے"۔



اسی موقع پر کانسل ٹیشن میٹنگ کی تجویز سے یہ قرار پایا کہ مسٹر ڈیلافوس کی مرتبہ یادداشت اور اس میٹنگ کی مذکورۂ بالا یادداشت مع جملہ کاغذات متعلق استعفا چھاپ کر ٹرسٹیوں کے پاس بھیجے جائیں، اور ایک **اسپیشل میٹنگ** کی تاریخ مقرر کر کے جملہ ٹرسٹیوں کے ووٹ معاملات زیر بحث اور آیندہ کے طریقہ کارروائی کی نسبت طلب کیئے جائیں، چنانچہ ۳۱ جولائی اسپیشل میٹنگ کے لیئے مقرر کی گئی۔

اس میٹنگ کے بعد نواب صاحب نے ہز آنر کو ایک طویل چٹھی لکھی جس میں منجملہ اور امور کے یہ بھی لکھا کہ:۔

اکثر ٹرسٹیان موجودہ میٹنگ نے میرے اوپر اعتراض کیا کہ جب تک ٹرسٹیوں نے باقاعدہ اُن نزاعی اُمور کی نسبت فیصلہ نہیں کیا تھا جو پرنسپل اور آنریری سکرٹری

کے باہم پیدا ہو گئے ہیں تم نے کیوں اُس مشورہ کو قبول کیا جو ہز آنر پنسپل کالج کی طرف سے دیا گیا تھا۔"

پھر اپنے جواب کا تذکرہ کر کے لکھتے ہیں:-

"میں نے اُن معترضین سے یہ بھی کہا کہ میں نے کُل ٹرسٹیوں کی طرف سے رضامندی نہیں دی جن کو اختلاف ہو اُن کے لیے راستہ کھلا ہوا ہے، اور اب کاغذات آخری فیصلہ کے لیے ٹرسٹیوں کے سامنے پیش ہونے والے ہیں، اُس وقت ہر شخص کو اپنی رائے کے اظہار کی آزادی ہوگی .... ۲۹ مارچ کی چٹھی میں نے زیادہ تر دیگر ٹرسٹیان موجودہ گورنمنٹ ہاؤس کے اصرار سے لکھی ورنہ میں اس کو لوکل ٹرسٹیز کے مشورہ کے بدون بھیجنا نہیں چاہتا تھا، لیکن معترضین نے میرے جوابوں کو قبول نہیں کیا اُنھوں نے کہا کہ گو وہ تمہاری ذاتی رائے ہو لیکن پھر بھی جماعت ٹرسٹیان کے پریزیڈنٹ کو مناسب نہ تھا کہ وہ اپنی ذاتی رائے سے اس قسم کے معاملات کے متعلق اتفاق کرتا، اور بہت زیادہ گفتگو کے بعد مجھ کو بھی اُن کا اعتراض واجبی معلوم ہوا اور میں نے اُس وقت جلسہ کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اُن سے معافی مانگی۔"

اس کے بعد اُنھوں نے ۱۲ اپریل اور اُس کے بعد والی میٹنگ کا تذکرہ کیا اور یہ اطلاع دی کہ تمام کاغذات چھپ رہے ہیں اور اسپیشل میٹنگ ہونے والی ہے، اس کے بعد رام نگر نہ آنے کے وجوہ بیان کیے اور بیان کیا کہ اگر میں وہاں آکر ہز آنر سے گفتگو کرتا، اور اُن کے دلائل کا قائل ہو کر اُن کی رائے سے اتفاق کرتا، تو پھر ٹرسٹیوں کا وہی اعتراض وارد ہوتا جس کے متعلق ابھی حال میں معافی مانگ چکا ہوں، اور اگر اتفاق نہ کرتا، تو یہ سوء ادب تھا۔ آخر میں لکھا کہ میٹنگ کی کارروائی اور تمام کاغذات بعد طبع ہز آنر کی خدمت میں بھیجے جائیں گے، اس کے بعد شکریہ پر چٹھی کو ختم کیا۔

ملک کی عام رائے

اس فتنہ کے آغاز میں جب لوگوں کو پانیر کے ذریعہ سے یہ معلوم ہوا کہ اسٹاف اور آنریری سکرٹری کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا، تو عام طور پر تشویش پیدا ہو گئی اور جب رفتہ رفتہ تمام واقعات پبلک کے سامنے آئے، اور یہ محسوس ہوا کہ کالج میں آنریری سکرٹری اور ٹرسٹیوں کا اقتدار خطرہ میں ہے، اور اس کی قومی حیثیت فنا ہو جانے کا اندیشہ ہے تو ایک عام برہمی پھیل گئی، اسلامی اخبارات نے آنریری سکرٹری کی تائید وحمایت میں پُر زور مضامین لکھے، تمام اطرافِ ہند میں جلسے منعقد ہوئے اور تائیدی رزولیوشن پاس ہوئے اور ٹرسٹیوں سے یہ خواہش کی گئی کہ وہ استقلال کے ساتھ قومی امانت کی حفاظت کریں متعدد مقامات پر جلسوں میں نہایت جوش کا اظہار کیا گیا اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر کہ ٹرسٹی کمزوری دکھا رہے ہیں اُن پر ملامت کا ووٹ پاس کیا گیا اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ اسٹاف کو فوراً موقوف کر دیا جائے، جلسوں کے علاوہ اکثر سربرآوردہ مسلمانوں اور کالج کے بہی خواہ دوستوں نے آنریری سکرٹری کو تائیدی تار وخطوط بھیجکر اُن کی پوزیشن مستحکم کی یہاں تک کہ ہندوستان کے باہر انگلستان وغیرہ میں جو مسلمان مقیم تھے انھوں نے بھی پرزور طریقہ سے آنریری سکرٹری کی حمایت میں آوازیں بلند کیں، اور شاید یہ پہلا موقع تھا کہ کالج کے اس اختلاف نے تمام ملک میں ایک عام جوش اور ایجیٹیشن کی صورت پیدا کر دی، ہم ان واقعات کو اگر اختصار کے ساتھ لکھیں جب بھی ایک رسالہ تیار ہو جائے، اس لیئے ضروری اشارات پر قناعت کی جاتی ہے لیکن اس سے بھی ناظرین کو یہ اندازہ ہوگا کہ اس واقعہ نے ملک میں کیا حالت پیدا کر دی تھی۔

بمبئی کا کشف الاخبار ۲۰ جون ۱۹۰۹ء کو لکھتا ہے:۔

"علی گڑھ کالج میں اسٹاف اور ٹرسٹیوں کے درمیان جو ناگوار اختلاف پیدا ہوا ہے وہ اگر جلدی سے فیصل نہ ہو گیا تو اس کا نتیجہ نہایت ہی برا ہوگا، اصل بات یہ ہے کہ موجودہ سکرٹری نواب مشتاق حسین صاحب نواب محسن الملک

کی طرح سے خوشامدی اور چاپلوس نہیں ہیں اسٹاف کی اطاعت پسند نہیں کرتے،
اور اس بارہ میں ہم انھیں ہرگز ہرگز موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے، بات یہ ہی
کہ یورپین اسٹاف کا دماغ نواب محسن الملک کی خوشامدوں سے آسمان پر پہنچ گیا
ہی ——— اب مسلمانوں میں خودداری کا مادّہ پیدا ہوگیا ہی،
اور وہ اس بات کو ہرگز ہرگز گوارا نہیں کرسکتے کہ ہمارے نوکر ہم پر حکمرانی کریں
کالج مسلمانوں کا کالج ہی، اور وہ جس طرح چاہیں اس کا کاروبار چلائیں"۔

۱۴ جولائی کا وکیل "قومی جہاز خطرہ میں" کے عنوان سے ایک طویل مضمون کے سلسلہ میں
لکھتا ہے:-

"۳۰ جولائی ۱۹۰۹ء مسلمانوں کی قسمت کے فیصلہ کا دن قرار پایا ہی، جو بالکل
سر پر آگیا ہی اگر مسلمانوں میں زندہ رہنے کی خواہش ہی، اگر اُن میں غیرت وحمیت
ہی، اگر وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں اُن کی قومیت کے رہے سہے نشانات
گورنمنٹ انگلشیہ کے زیرِ سایہ محفوظ رہیں تو اُن کو چاہیئے کہ اس موقع کو ہاتھ سے
نہ دیں اور حسبنا اللہ ونعم الوکیل کہہ کر کھڑے ہوجائیں"۔

اس کے بعد مشورہ دیا ہی کہ تمام مسلمانانِ ہند جابجا جلسے کرکے اپنے مسلمہ لیڈر نواب
وقار الملک پر کامل اعتماد ظاہر کریں، اور اُن کی شاندار قومی خدمات کا اعتراف کریں۔

اسی طرح تمام اسلامی اخبارات نے جوش وخروش کا اظہار کیا اور ۹۰ سے زیادہ جلسوں
کی اطلاع آنریری سکرٹری کو موصول ہوئی جو مختلف مقامات پر منعقد ہوئے تھے، ۳ جلسے مسلمانوں
کے اسی سلسلہ میں لندن میں بھی منعقد ہوئے، ان تمام جلسوں میں متحد الکلمہ ہوکر مسلمانوں نے
یہ خواہش ظاہر کی کہ آنریری سکرٹری کا اقتدار کالج پر قایم رہنا چاہیئے، نیز یہ کہ آنریری سکرٹری
قوم کے مسلمہ لیڈر رہیں اور لوگ اُن کے اعتماد پر اپنے بچوں کو کالج بھیجتے ہیں، خود حیدرآباد کے
مسلمانوں نے بھی ایک عام جلسہ کرکے یہ اعلان کیا کہ نواب وقار الملک ہمارے مسلمہ لیڈر ہیں اور

اور اُن کا وسیع اقتدار کالج پر قایم رہنا چاہیئے۔

۲۶ر جولائی کو لندن سے ہزہائنس سر آغا خاں، سید امیر علی اور میجر سید حسن بلگرامی نے تار دیا کہ:۔

"ہم زور کے ساتھ تائید کرتے ہیں اُس کارروائی کی جو وقار الملک کالج کی آزادی قایم رکھنے کے لیئے کر رہے ہیں، ہم کو اُن پر پورا اعتماد ہے۔"

تار کے علاوہ میجر سید حسن اور سید امیر علی نے خطوط لکھ کر مفید مشورے دیئے اور آنریری سکرٹری کی تائید کی۔

نواب صاحب ڈھاکہ نے تار دیا کہ:۔

"مسلمانان مشرقی بنگال بہ نیابت پراونشل محمڈن ایسوسی ایشن مشرقی بنگال و آسام، نیز راقم بحیثیت پریسیڈنٹ ایسوسی ایشن مذکور و بحیثیت ٹرسٹی علی گڑھ کالج پرنسپل کی شکایات کو برداشت کرنے سے معذور ہیں، اور ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ سکرٹری کو اختیار اور نگرانی بدستور حاصل رہے اور وہ طلبہ سے وقتاً فوقتاً ملتے رہیں اور اگر سکرٹری کے اختیارات میں کچھ کمی کی گئی تو ہم مجبور ہونگے کہ علی گڑھ کالج سے ترک تعلق کرلیں، آیندہ طلبہ کا بھیجنا موقوف کردیں اور جس امداد کا وعدہ کیا گیا ہے اُسے بند کردیں۔"

اسی طرح کے سینکڑوں خطوط و تار آنریری سکرٹری کو تمام اطراف ہند سے وصول ہوئے، اور ہز ہائنس سر آغا خاں و سید امیر علی نے براہِ راست ہز آنر کو بھی مفصل خط لکھا جس میں آنریری سکرٹری کے اوصاف بیان کرنے کے بعد یہ بھی صاف صاف لکھدیا کہ کالج تمام تر آنریری سکرٹری اور ٹرسٹیوں کے ہاتھ میں رہنا چاہیئے۔

ہز آنر کی معذرت

مجلسِ شوریٰ کی یادداشت اور دوسرے کاغذات پہنچنے پر ہز آنر نے ایک طویل چھٹی کالج کے پریسیڈنٹ نواب سر فیاض علی خاں صاحب کو لکھی اور یہ اجازت دی کہ

کہ وہ اس کو چھاپ کر ٹرسٹیوں کے پاس بھیج سکتے ہیں اس چٹھی کے صرف نہایت ضروری حصّے یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

ابتدا میں ہز آنر نے اعتراف کیا کہ ۲۹ مارچ کو انھوں نے جو رائیں ظاہر کیں، وہ قوانین کالج کی دفعہ ۱۴ کے مطابق صرف مشورہ کی حیثیت رکھتی ہیں، اس کے بعد ہز آنر نے اس خط وکتابت کی نقل کی ہے جو ان کے اور پرنسپل کے درمیان ہوئی، اس کے بعد انھوں نے لکھا کہ:۔

"مجھ کو یہ بات قطعی معلوم ہوتی ہے کہ اگر ٹرسٹی صاحبان پرنسپل کی اس قسم کی خط وکتابت پیٹرن سے پسند نہیں کرتے تو انھیں چاہیے کہ ان کو منع کر دیں۔"

اس کے بعد ہز آنر نے اس امر پر اظہار افسوس کیا کہ اسٹاف نے اپنا مشترکہ نوٹ واپس نہیں لیا، انھوں نے لکھا کہ:۔

"اسٹاف کا یہ اشارہ کرنا کہ فلاں قسم کے معاملات گورنمنٹ کی دست اندازی کے قابل ہیں گستاخی کی حد تک جا پہنچتا ہے۔"

سابق آنریری سکرٹری کی مداخلت کے متعلق جو اشارہ ہز آنر نے کیا تھا اور ٹرسٹیوں کو ناگوار گزرا تھا، ہز آنر نے اس کی توجیہ کی اور لکھا کہ:۔

"وہ نکتہ چینی جو روداد کی مد ۱۴ میں اس معاملہ کے متعلق کی گئی ہے وہ بالکل صحیح ہے اور میں افسوس کرتا ہوں کہ یہ الفاظ اسی صورت میں ظاہر ہوئے جیسے کہ وہ لکھے ہوئے تھے۔"

ہز آنر نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس امر پر بھی اظہار افسوس کیا کہ انھوں نے پرنسپل اور آنریری سکرٹری کو دو ہندوستانی پہلوانوں سے تشبیہ دی، اور بتایا کہ اس تشبیہ سے ان کا کیا مقصد تھا، اور آخر میں لکھا کہ:۔

"میں امید کرتا ہوں کہ پریسیڈنٹ صاحب اب ٹرسٹی صاحبان اور آنریری سکرٹری کو میری طرف سے یقین دلا دینگے کہ جب کہ میں نے ایسی تشبیہ دی جس کو

میں بے ضرر خیال کرتا تھا تو میرا منشا ہرگز ایسی بات کہنے کا نہ تھا جس سے آنریری سکریٹری کی دل آزاری ہو۔"

اِن تمام اُمور پر بحث کرنے کے بعد آخر میں ہز آنر نے عام بدگمانی کو رفع کرنے کے لیے صاف صاف لکھا:۔

"اخباروں میں مجھے یہ دیکھنے سے افسوس ہوا کہ کسی قدر یہ خیال پھیل رہا ہے کہ گورنمنٹ کی یہ خواہش ہے کہ ایم اے او کالج کو سرکاری بنائے میں ٹرسٹیوں کو یقین دلاتا ہوں کہ میری خواہش یا ارادہ سے زیادہ اور اس معاملہ میں اور کچھ نہیں ہے۔

کالج کی ترقی محض اس بات پر منحصر ہے کہ مثل ماضی کے وہ آئندہ بھی ایسا ہی افادہ گاہ تعلیمی رہے کہ جس کی حیات و بقا اور عزم و ہمت صرف مسلمانوں کی جماعت کی خود دو کوشش اور سعی پر مبنی رہے اور اس افادہ گاہ تعلیمی کو سرکاری بنانے کا ارادہ یا کوشش کرنا نقصان سے مملو ہوگا، اور ایسا نقصان سے مملو ہوگا کہ میں خود اس میں کوئی حصہ لینا پسند نہ کرونگا، موجودہ دشواریوں کی حالت میں میرا بیچ میں پڑنا اس نیت سے نہ تھا کہ میں کالج کے انتظام میں مداخلت کروں مجکو تو صرف اسی بات سے تحریک ہوئی کہ اگر مجھ سے ممکن ہو تو میں ٹرسٹی صاحبان کو مدد دوں"

اسپیشل میٹنگ ہز آنر کی چٹھی موصول ہونے کے بعد آنریری سکریٹری نے ۳۱ جولائی کے اجلاس خاص کا ایجنڈا جاری کیا جس میں تمام اُمور کو تفصیل و وضاحت سے لکھدیا، اور اس چٹھی پر ہز آنر کا شکریہ بھی ادا کیا۔ اِسی زمانہ میں خان بہادر محمد مزمل اللہ خاں صاحب آگرہ تشریف لے گئے وہاں ہز آنر سے ملاقات ہوئی، واپس آکر جناب ممدوح نے یہ تجویز پیش کی کہ ٹرسٹی آخری فیصلہ سے پہلے ایک ورڈ پوٹیشن ہز آنر کی خدمت میں لے جائیں، اور ۳۱ جولائی کے جلسہ میں

پرنسپل کے استعفے وغیرہ کی کارروائی ملتوی کرکے صرف ووٹ شمار کرلیئے جائیں آنریری سکرٹری نے تحریرًا اس تجویز پر رائیں طلب کیں تو جو رائیں موصول ہوئیں وہ سب تائید میں تھیں اس بناء پر اُنھوں نے ہزآنر سے ڈپوٹیشن پیش ہونے کی تاریخ بھی طے کرلی، لیکن جب ۳۱ رجولائی کو اجلاس میں یہ معاملہ پیش ہوا تو اس پر سخت اختلاف واقع ہوا، بعض سربرآوردہ ٹرسٹیوں نے ڈپوٹیشن کی تجویز کو ناپسند کیا اور اس کو فضول بتایا، لیکن جب صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب اور خان بہادر محمد فضل اللہ خان صاحب نے پرائیوٹ طور پر اجلاس کے سامنے تمام واقعات بیان کیئے تو یہ تجویز منظور کرلی گئی، اور یہ قرار پایا کہ ۹ ر اگست کو ہزآنر کے سامنے ڈپوٹیشن پیش ہو، اور یہ اجلاس بالفعل ملتوی ہوکر ۲۲ ر اگست کو مکرر منعقد ہو۔

ہزآنر کی خدمت میں ڈپوٹیشن کا جانا

۹ ر اگست ۱۹۰۹ء کو آٹھ[1] ٹرسٹیوں کا ایک ڈپوٹیشن ہزآنر کی خدمت میں بمقام لکھنؤ پیش ہوا، اور اڈریس پیش کیا، ہزآنر نے نہایت اطمینان بخش اور حوصلہ افزا جواب دیا، اور باضابطہ جواب کے علاوہ ڈپوٹیشن کے ممبروں سے دیر تک زبانی گفتگو کی جس میں بہت سے امور زیر بحث آئے، اور ہزآنر نے ہر معاملہ پر نہایت شفقت آمیز طریقہ سے گفتگو کی جس سے ٹرسٹیوں کو بہت کچھ اطمینان ہوا۔

اڈریس اور اُس کا جواب دونوں نہایت طویل ہیں، اس لیئے ہم اُن کو نظرانداز کرتے ہیں، اڈریس میں ہزآنر کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اس ڈپوٹیشن کو نہایت اہم قرار دیا گیا تھا، اور یہ کہا گیا تھا کہ "کل قوم کی قوم کے مستقبل کا دار و مدار اسی پر ہے"۔ اس کے بعد کالج کے بعض مقاصد بیان کرکے ہزآنر کے ۲۴ مئی کے مراسلہ کا شکریہ ادا کیا گیا تھا، اس کے بعد کالج کی ڈسپلن

---

[1] یہ آٹھ ارکان وفد حسب ذیل تھے:-

(۱) صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب (۲) خان بہادر محمد فضل اللہ خان صاحب (۳) راجہ نوشاد علی خان صاحب مرحوم تعلقہ دار (۴) شیخ عبداللہ صاحب بی اے ایل ایل بی (۵) حاجی محمد موسیٰ خان صاحب (۶) محمد حامد علی خان صاحب (مرحوم) بیرسٹر (۷) حافظ وحیدالدین صاحب رئیس میرٹھ (۸) نواب وقار الملک بہادر آنریری سکرٹری

سر سید کے مقاصد، اور گورنمنٹ کے ساتھ اتحادِ عمل کی ضرورت پر بحث کی گئی تھی، ان سب امور کے بعد دفعہ وار تمام مختلف فیہ مسائل اور معاملہ زیر نظر پر رائے کا اظہار تھا، اڈریس کے اس حصہ میں ہندوستان کی پولٹکل حالت کی طرف بھی اشارے کیئے گئے اور ہز آنر کے لطف و عنایت کے شکریہ پر اڈریس ختم کیا گیا۔

ہز آنر نے بھی اپنے جواب میں تمام مختلف فیہ امور پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے، نہایت خوبی سے دلچسپ انداز میں آنریری سکرٹری اور پرنسپل کے حدود و اختیارات پر بحث کی، اور اکثر امور میں ٹرسٹیوں کی رائے سے اتفاق کیا، آخر میں یورپین اسٹاف کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے یہ نصیحت کی کہ :-

"آپ کو ہر ایک ایسے خیال سے پرہیز کرنا ہوگا کہ جس کے سبب سے اسٹاف اس حیثیت کو پہنچ جائے کہ کسی اولوالعزم شخص کی رغبت کے لائق نہ رہے، یہ خیال کرنا کہ مشکلات کبھی پیدا نہونگی فضول ہے، البتہ ہم آہنگی کو بدستور پھر قایم کر دینے کے لیئے کوئی نہ کوئی طریقہ ہمیشہ موجود و میسر ہوگا، بشرطیکہ ذاتی محسوسات کو ہر مفید کام کے ماتحت کیا جائے۔"

ہز آنر کے جواب کے بعد آنریری سکرٹری کی خواہش پر صاحبزادہ **آفتاب احمد خانصاحب** نے موزوں الفاظ میں ہز آنر کا شکریہ ادا کیا، اور ڈپوٹیشن کی کارروائی بخیر و خوبی ختم ہوئی۔

اسپیشل میٹنگ کا دوبارہ منعقد ہونا

۳۱ر جولائی ۱۹۰۹ء کا ملتوی شدہ اجلاس ۲۲ر اگست کو دوبارہ منعقد ہوا، آنریری سکرٹری نے ڈپوٹیشن کی مفصل کیفیت ٹرسٹیوں کے سامنے بیان کی اور ہز آنر نے پرائیوٹ طور پر جو گفتگو ارکان وفد سے کی تھی وہ بھی نقل کی۔ ٹرسٹیوں نے تمام حالات سُن کر ہز آنر کا شکریہ ادا کیا اور پھر کامل غور و مباحثہ کے بعد آخری فیصلہ حسب ذیل الفاظ میں صادر کیا:

فیصلہ ٹرسٹیان متعلق معاملات کالج

ٹرسٹیوں کی ملتوی شدہ میٹنگ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۲ راگست ۱۹۰۹ء میں اُن تمام اہم اُمور کا فیصلہ کر دیا جو کہ پرنسپل کے استعفے سے تعلق رکھتے تھے اور جو کہ ٹرسٹیوں کے سامنے گزشتہ چار ماہ سے پیش تھے ٹرسٹیوں نے اس اعلان میں جو انھوں نے ۳۱ر جولائی کو اپنی پالیسی کی بابتہ مشتہر کیا تھا اس امر کو پورے طور پر ظاہر کر دیا تھا کہ اُن کی اس پالیسی میں جو کالج کی بابتہ برسوں سے چلی آرہی ہے کسی قسم کا تغیر و تبدل واقع نہیں ہوا لیکن اُسی کے ساتھ ہی انھوں نے اس بات کا پورا ارادہ کر لیا ہے کہ کالج کے اغراض و فوائد میں وہ کسی قسم کا نقصان نہیں آنے دینگے اس لیئے انھوں نے نہایت غور و خوض کے ساتھ اُن اُمور زیر بحث کے جو اس مسئلہ کے متعلق تھے ہر پہلو پر نظر کی جانچا اور کامل غور کے بعد مفصلۂ ذیل تصفیہ کیا:

۲- اس سوال کے متعلق کہ آنریری سکرٹری کو اس بات کا اختیار حاصل ہے یا نہیں کہ وہ پرنسپل سے اُن اُمور کے متعلق جن کو کہ پرنسپل صرف اپنے اختیار میں سمجھتے ہیں کسی امر کے متعلق کوئی اطلاع حاصل کر سکیں ٹرسٹیوں نے فیصلہ کیا کہ حسب قاعدہ نمبر (۱۱۹ و ۱۲۰) قواعد و قوانین ٹرسٹیان آنریری سکرٹری ٹرسٹیوں کا جو کالج کی حکمراں جماعت ہیں سب سے اعلیٰ افسر کار رکن ہے۔ اس حیثیت سے نہ صرف اُس کو یہ استحقاق ہے کہ کالج کے انتظامی اُمور کے متعلق وہ کسی قسم کی اطلاع پرنسپل یا دوسرے افسروں سے حاصل کرے بلکہ ایسا کرنا اُس کا فرض ہے کیونکہ وہ ٹرسٹیوں کا خاص قایم مقام اور اُن کی جائداد کا ذمہ دار اور اُن کے معاملات کا نگراں اور منتظم ہے۔

۴- پرنسپل کی اس شکایت کے متعلق کہ آنریری سکرٹری طلباء سے ملتے اور اُن کی شکایت کو بطور کورٹ اوف اپیل کے سنتے ہیں، ٹرسٹیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ آنریری سکرٹری کو نہ صرف اس بات کا استحقاق ہے بلکہ اپنے عہدہ کی حیثیت سے اس بات پر مجبور ہے کہ وہ طلباء سے ملتا اور اُن کے خیالات سے براہِ راست واقف ہوتا رہے اور طلباء کو نہ صرف آنریری سکرٹری سے ملنے کی اجازت ہونی چاہیئے بلکہ اُن سے ملنے کی ترغیب دینی چاہیئے تاکہ اُن کے اثر صحبت سے طلباء متمتع ہو سکیں - اس کے ساتھ ہی ٹرسٹی کبھی اس بات کو روا نہ رکھینگے کہ اُن اُمور میں

جن کا تعلق ڈسپلن سے ہو کسی قسم کی دست اندازی کی جائے یا اسٹاف کے خلاف بطور جج کے کوئی شکایت سنی جائے۔

۴۔ پرنسپل کے اس دعوے کے متعلق کہ حسب قاعدہ نمبر (۲۵۵) قواعد و قوانین ٹرسٹیان طلبار کا کالج میں داخلہ کلیتاً پرنسپل کے اختیار میں ہو، ٹرسٹیوں نے فیصلہ کیا کہ جہاں تک داخلہ افراد کا تعلق ہو اُس کا اختیار پرنسپل ہی کو ہو۔ لیکن ہر سال اس بات کا فیصلہ کہ اس خاص سال میں کسقدر طلبار کالج میں داخل کیئے جائینگے ہر سال کے شروع میں آنریری سکرٹری اور پرنسپل کو ملکر بمشورہ سنڈیکیٹ اور بعض ممبران اسٹاف کے جیسے کہ سینیر ٹیوٹر ہیڈ ماسٹر اور پراکٹر ہیں کرنا چاہیئے۔ اس کے متعلق ٹرسٹیوں نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ پرنسپل اُن تمام درخواستوں کو جنکو وہ نامنظور کریں سکرٹری کے پاس لازمی طور سے بھیجدیا کریں۔

۵۔ پرنسپل کے اس دعوے کے متعلق کہ حسب قواعد و قوانین کالج ممبران اسٹاف کے کام کی مقدار معین کرنے میں ٹرسٹیوں کو کچھ حق مداخلت نہیں ہو۔ ٹرسٹیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ حسب قواعد نمبر (۱۰۸) قواعد و قوانین کے اسٹاف کی تعداد کا مقرر کرنا ٹرسٹیوں کا فرض ہو۔ لیکن یونیورسٹی کے اُن قواعد کی پابندی کے ساتھ جو کہ لکچروں کے متعلق یونیورسٹی نے بنائے ہیں اور اس فرض کے ادا کرنے کے لیئے ہر ایک ممبر اسٹاف کے کام کی مقدار کا تعین ازبس لازمی اور ضروری ہو ٹرسٹیوں کے اسٹاف کی تعداد معین کرنے کے بعد ٹائم ٹیبل کا بنانا اور کام کا ہر ممبر اسٹاف کو سپرد و تقسیم کرنا حسب قاعدہ نمبر (۲۶۱) پرنسپل سے متعلق ہوگا۔

۶۔ پرنسپل کی اس کارروائی کے متعلق کہ اُنھوں نے اپنے استعفے کے مسئلہ کو ہز آنر نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کے حضور میں براہ راست پیش کردیا، ٹرسٹیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ پرنسپل یا کسی ممبر اسٹاف کے لیئے براہ راست ہز آنر پٹیرن کالج یا صاحب ڈائرکٹر بہادر و زیٹر کالج سے کسی امر میں جو متعلق انتظامی معاملات کالج کے ہو خط و کتابت کرنا ہرگز مناسب نہیں ہو۔

۷۔ یورپین اسٹاف کے اُس جائنٹ نوٹ (یعنی مشترکہ چٹھی) کے متعلق جس میں اُنھوں

نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ اُن کے خیال میں موجودہ حالت کالج کی ایسی پہونچ گئی ہے کہ گورنمنٹ کو دست اندازی کرنی چاہیئے" ٹرسٹیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ یورپین اسٹاف کو ایسی تحریر کا لکھنا ہرگز مناسب نہ تھا اور اب اُن کو چاہیئے کہ اس تحریر کو واپس لیں۔

۸۔ پرنسپل کے استعفے کے متعلق ٹرسٹیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ بلحاظ اس طرز کے جو پرنسپل نے اختیار کیا ہے ٹرسٹیوں کو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ پرنسپل کے استعفے کو افسوس کے ساتھ منظور کریں اس لیئے اُن کا استعفے یکم نومبر ۱۹۰۹ء سے منظور کیا جاتا ہے۔

۹۔ ٹرسٹی اس کو اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اُس دلی شکرگزاری کو معرض تحریر میں لائیں جو وہ حضور ہز آنر پیٹرن کالج کے مشوروں اور اُس حقیقی امداد کے متعلق محسوس کرتے ہیں۔ حضور ممدوح نے نہایت الطاف و مہربانی کے ساتھ اُن تمام اہم معاملات کے بخوش اسلوبی طے پا جانے کے لیئے فرمائی ہے۔ حضور ممدوح کی عنایت و توجہ کو تمام قوم ہمیشہ ہمیشہ نہایت سچی احسان مندی کے ساتھ یاد رکھیگی۔

ٹرسٹیوں کے فیصلے پر پانیر کی رائے

ٹرسٹیوں کے اس فیصلہ پر ۲۶ راگست کے پانیر نے حسب ذیل نوٹ شائع کیا:-

"آج کے اخبار کے کسی دوسرے کالم میں ہم ٹرسٹیان مدرستہ العلوم علی گڑھ کے اُس فیصلہ کو درج کرتے ہیں جس کا تعلق اندرونی انتظامات کے سوالات سے ہے جو پرنسپل کے استعفے نے پیدا کر دیئے ہیں۔

ان اہم اُمور کے مُباحثے نے چند ماہ تک طول کھینچا جن کے باعث کالج کے پیٹرن (سرپرست) ہز آنر ٹرسٹی صاحبان اور دیگر عام لوگ بہت تشویش میں رہے ہے۔ امور متنازعہ فیہ کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ اُن کا بڑا تعلق پرنسپل اور آنریری سکرٹری کے تعلقات سے ہے۔ جو ٹرسٹیوں کا خاص قایم مقام

ہی اور بلحاظ اوس پوزیشن کے جو اُس نے اختیار کی ہی ٹرسٹیوں کے لیے سوائے ازیں چارہ کار نہیں کہ پرنسپل کا استعفا منظور کرلیں۔ اس نامسعود مناقشہ کے حُسن وقبح کا بالفعل ہم بیان کرنا نہیں چاہتے اور نہ ہم ٹرسٹی صاحبان کے فیصلہ کی تنقیح وتفصیل سے اس وقت بحث کرینگے۔ لیکن یہ امر بخوبی نظر آتا ہی کہ پرنسپل اور آنریری سکرٹری کے اختیارات کی قبل ازیں کوئی صاف صاف تعریف وتحدید موجود نہ تھی جس وجہ سے اختلاف رائے کی صورت میں کبھی نہ کبھی بدمزگی پیدا ہوجانے کا اندیشہ یقینی تھا۔

علی گڑھ کالج کے پرنسپل کی پوزیشن ایک خاص شکل تھی اور ایک مخصوص ذمہ داری اس سے متعلق ہی اور یہ شکل اُن نہایت خاص وغیر معمولی قسم کے تعلقات کی وجہ سے جو بانی کالج اور پہلے پرنسپلوں میں رہی تھی فی زمانہ اور بھی بڑھ گئی ہی۔ اب چونکہ کالج کی حیثیت بڑھ کر ایک بڑی اسلامی درسگاہ کی ہوگئی ہی اور اُس کا انتظام ٹرسٹیوں کی ایک جماعت کے ہاتھ میں ہی جو کم وبیش قوم کی قایم مقامانہ حیثیت رکھتی ہی۔ اس لیئے ضروری ولازمی ہی کہ پرنسپل اور آنریری سکرٹری کے علیحدہ علیحدہ اختیارات کی صاف صاف تشریح وتعریف ہوجائے، اگر حال کی پیش آمدہ بحث ومباحثہ سے یہ نتیجہ مثمر ہوسکے تو ہم سمجھینگے کہ بحث بالکل فضول ورائیگاں نہ گئی۔

ٹرسٹیوں نے صاف صاف الفاظ میں جس میں شک وشبہ کی گنجایش نہیں اعلان کردیا ہی کہ وہ کالج کے اغراض وفوائد کے بدستور قایم وبرقرار رکھنے اور اُن کی حفاظت پر ہمیشہ مستعدی کے ساتھ آمادہ رہینگے اور یہ کہ اُن کی اغراض کی تعمیل کے لیئے پرنسپل اور یورپین اسٹاف کے اثر کو باقی رکھنا ضروری ہی اب یہ دیکھنا باقی ہی کہ ٹرسٹیوں کے اعلیٰ افسر کارکُن کے تعلقات

کے لحاظ سے پرنسپل کی پوزیشن کی جدید تشریح و توضیح کا نتیجہ و اثر کیا ہوتا ہے۔ آیا ٹھیک اس طرز کے لوگ جو درکار ہیں اس ازبس اہم عہدہ کی طرف راغب ہوتے رہینگے تاہم اگر اس پوزیشن کی ایسی صاف صاف تشریح و تعریف جیسی کہ اب کی گئی ہے پیشتر ہی کردی گئی ہوتی تو یقین نہیں ہوتا کہ جو افسوسناک نقیض حال میں پیش ہوئی ہے کبھی اُس کی نوبت نہ آتی۔

پرنسپل کے استعفے کا فیصلہ ۲۲ اگست کے اجلاس میں کافی غور و مباحثہ کے بعد حسب ذیل رزولیشن پاس ہوا:-

"ٹرسٹیان کالج اُس طریقہ پر جو اختیار کیا گیا اور اُن حالات پر جو اس عرصہ میں پیش آئے افسوس کے ساتھ مسٹر آرچبولڈ کا استعفا یکم نومبر ۱۹۰۹ء مجبوراً منظور کرتے ہیں اور اُن کی آسایش کے لیئے دفعہ ۲۲۵ قوانین و قواعد ٹرسٹیان کے اثر سے اُن کو مستثنےٰ کرتے ہیں۔

(اس استثنا سے پرنسپل صاحب کو زمانہ تعطیل کلاں کی سالم ماہوار ملسکیگی")

اس رزولیشن کے منظور ہو جانے کے بعد آنریری سکرٹری نے اُس خط کا مسودہ پیش کیا جو پرنسپل کو استعفے کی منظوری کے متعلق لکھا جائیگا۔ ٹرسٹیوں نے اس کو منظور کیا۔ اس خط کی ابتدا میں گزشتہ چار پانچ ماہ کے واقعات، اور پرنسپل کی خودمختاری کی خواہش پر مختصر بحث کر کے یہ لکھا تھا کہ:-

اب ہم اُس مقام پر آپہنچے ہیں جہاں سے دو راہیں پھٹتی ہیں یعنی اُصول اور پالیسی کی باہم کشمکش، جس کا آپ بھی اوّل خط میں ذکر کرتے ہیں، آپ کی رائے اب اس قدر بیّن ہوگئی ہے کہ موجودہ سسٹم کے تحت میں کام کرنا آپ کے لیئے ناممکن ہوگیا ہے، اس صورت حالات نے ٹرسٹی صاحبان کو بہت تکلیف دی اور پریشان کیا کیونکہ اس کالج کے پرنسپل اور اسٹاف کے ساتھ ٹرسٹیوں کے تعلقات کی تاریخ

میں یہ ایک جدید اور عدیم المثال صورت ہی، لیکن ٹرسٹیان خواہ کسی قدر آپ کے فیصلہ اور قصد مصمم کی نسبت افسوس محسوس کریں اور خواہ کالج کے لیئے یہ امر کسی درجہ خطرناک ہو صورت موجودہ میں وہ کوئی چارہ نہیں دیکھتے، سوائے اس کے کہ آپ کا استعفا منظور کرلیں، جسے وہ نہایت گہرے دلی رنج اور حقیقی افسوس کے ساتھ منظور کرتے ہیں"۔

اِس کے بعد یہ اطلاع دی گئی تھی کہ ٹرسٹیوں نے آپ کو دفعہ ۲۲۵ کے اثر سے مُستثنیٰ کردیا ہی۔

جدید پرنسپل کا تقرر

مسٹر آرچ بولڈ کے مستعفی ہوجانے کے بعد ایک جدید یورپین پرنسپل کے تقرر کی ضرورت تھی، بعض لوگوں کا خیال تھا کہ انگلستان سے کوئی لایق شخص بُلایا جائے، لیکن حالات وواقعات نے اب نواب صاحب کو بہت زیادہ محتاط بنادیا تھا، اس لیئے اُنھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ کالج کے یورپین اسٹاف میں سے سینیر ممبر مسٹر ٹول کو پرنسپل بنائیں، بشرطیکہ وہ ٹرسٹیوں کی پالسی کو منظور کریں، چنانچہ نواب صاحب نے لوکل ٹرسٹیز کے مشورہ سے مسٹر ٹول کو ایک مفصّل چٹھی لکھی جس میں اپنے خیالات صاف صاف لکھدیئے، اور بتادیا کہ پرنسپل سے ہم کن چیزوں کے متوقع ومتمنی ہیں، مسٹر ٹول نے اپنے جواب میں تمام باتوں کو قبول کیا، اُسی زمانہ میں اسٹاف نے اپنا وہ مشترکہ نوٹ بھی جس پر بہت کچھ طوفان برپا ہوا تھا واپس لیا، اِن مراحل کے طے ہوجانے کے بعد ابتداءً مسٹر ٹول کا تقرر امتحاناً دو سال کے لیئے سالم تنخواہ ایک ہزار ماہوار پر منظور ہوا، اور خدا خدا کرکے اس ہنگامہ کا خاتمہ ہوا۔

قوم کی طرف سے اظہارِ اطمینان

ہم نے حتی الامکان اس واقعہ کے متعلق تمام واقعات کو نہایت اختصار سے بیان کیا ہی، اور بہت سے واقعات قلت گنجایش کی وجہ سے نظرانداز کردیئے ہیں، اس لیے شاید ناظرین اس واقعہ کے متعلق ٹرسٹیوں کی خدمات کا صحیح اندازہ نکرسکیں لیکن جو مراسلات وکاغذات اس معاملہ کے متعلق ہمارے نظر سے گزرے اُن کے دیکھنے سے یہ

اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر و بیشتر ٹرسٹیوں نے اس موقع پر نہایت استقامت سے کام لیا، خصوصاً صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی خدمات اس معاملہ میں نہایت مہتم بالشان ہیں جب نواب صاحب لکھنؤ میں ہز آنر سے ملاقات اور وعدہ کر کے واپس آئے تو علی گڑھ پہنچنے پر سب سے پہلے صاحبزادہ صاحب ہی نے نواب صاحب کو اس لغزش پر آگاہ کیا، اور پھر معاملات نے نیا رنگ اختیار کیا جو آخر کار کالج کے لئے مفید ثابت ہوا، اور ٹرسٹیوں کے فیصلہ پر عام طور پر اطمینان کا اظہار کیا گیا۔

معاملات کا تصفیہ ہو جانے کے بعد لوگوں نے نواب صاحب کو مبارکباد کے خطوط لکھے اخبارات نے اظہار اطمینان کیا، لسان العصر خان بہادر اکبر حسین صاحب اکبرؔ[ل] مرحوم نے اس واقعہ کی تاریخ "وقارِ عظیم" سے نکالی، جو نواب حاجی محمد اسمٰعیل خاں کو نہایت ناگوار گزری، اُن کے نزدیک یہ براہِ راست گورنمنٹ اور انگریزوں پر حملہ تھا۔ ۱۳۲۷

بہر حال یہ غالباً پہلا موقع ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان سے انگلستان تک ہم آہنگ ہو کر اپنی متحدہ آواز سے گورنمنٹ کو اس معاملہ پر متوجہ کیا۔ اور اُس میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی۔

ٹرسٹیان کالج کی پالیسی کا اعلان

اِسی زمانہ میں جب کہ مسٹر آرچ بولڈ کا معاملہ چھڑا ہوا تھا، بعض حلقوں میں یہ خیالات ظاہر کئے گئے کہ علی گڑھ پارٹی نے اپنے پولیٹکل خیالات میں تبدیلی پیدا کر دی ہے، جس کا مطلب یہ تھا کہ گورنمنٹ پر اعتماد کرنے اور اشتراک عمل کی جو پالیسی تھی وہ اب باقی نہیں چونکہ یہ امر واقعہ کے خلاف تھا، اس لئے ٹرسٹیوں نے باضابطہ طور پر ایک اعلان شائع کر کے یہ غلط فہمی رفع کی اور بتایا کہ گورنمنٹ سے کسی معاملہ میں اختلاف کرنا بے اعتمادی کا ہم معنی نہیں ہے"

ل جب یہ معاملہ چھڑا ہوا تھا اکبر مرحوم نے ایک دوست کو پرائیوٹ خط میں حسب ذیل شعر لکھا تھا ؎

کالج کے در پہ لکھدے کوئی آب گولڈ سے ۔۔۔ خم ہو سکے نہ سکرٹری آرچ بولڈ سے

اکبر مرحوم یہ شعر لکھ کر فرماتے ہیں کہ "آرچ اور خم کی رعایت قابل لحاظ ہے"۔ ندوی

سرسید اور نواب محسن الملک کے زمانہ میں بھی اس قسم کے واقعات پیش آچکے ہیں۔
اس اعلان میں یہ بتایا گیا کہ :-

"وہ (ٹرسٹیان) اچھی سمجھتے ہیں کہ اسٹاف کی امداد اور درستی دیہ کالج کی روایات قایم رکھنے کے لیئے نہایت ضروری ہی، پس اُن کی کارروائی کا جو فرض کے سچّے اور اعلیٰ احساس سے اثر پذیر ہی، کچھ اور مطلب بتانا سخت بدیدانہ اور نامناسب اور سراسر ناجائز ہی"

اس اعلان نے اُن بدگمانیوں کو دور کر دیا جن کا قایم رہنا اس وقت کے حالات کے لحاظ سے کالج کے لیئے اچھا نہ تھا۔



اصلاحات و انتظامات

نواب صاحب کے زمانہ میں کالج میں بہت سی اصلاحات اور جدید انتظامات عمل میں آئے مثلاً دفتر کی تہذیب و ترتیب، پابندیِ اوقات، نظام عمل کی تبدیلیاں، جدید اساتذہ کا تقرر، دینیات کا خاص انتظام، قوانین کی ترتیب و اصلاح، پریس و انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی ترقی، کاروبار کی مختلف شعبوں پر تقسیم، اور مقامی ٹرسٹیوں کو کام میں شرکت کا موقع دینا، سنڈیکیٹ کا قیام، ٹرسٹیوں کی تعداد میں اضافہ، اساتذہ کے حقوق و مدارج ترقی کا تعین، اور ان کو ٹریننگ میں بھیجنے کا انتظام جدید عمارات کی تعمیر، سائنس اسکول کی ترقی، غرض اسی قسم کی متعدد اصلاحیں ہوئیں اور انتظامی تغیرات عمل میں آئے، جن کے لکھنے کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے اس لیے ہم بہ نظر اختصار صرف چند اصلاحات اور انتظامات کا تذکرہ کرتے ہیں، یہ سب کو معلوم ہے کہ جب وہ کسی کام کو اپنے ہاتھ میں لیتے تھے تو اس کے تمام جزئیات پر حاوی ہونے کی کوشش کرتے تھے، اور وہ کام اس قدر وسعت اختیار کر لیتا تھا کہ اس پر قابو رکھنا صرف انھیں کا کام تھا۔ دفتر کی تہذیب و اصلاح کا ان کو خاص تجربہ تھا، اور ایک خاص قسم کا پُر احتیاط طریقہ وہ کاروبار کے متعلق رکھتے تھے، کالج میں آنے کے بعد انھوں نے یہی طریقے اختیار کیے، لیکن ان دفتری اصلاحات اور جزئیات کا تذکرہ اس موقع پر کچھ ضروری نہیں معلوم ہوتا۔

قیام سنڈیکیٹ کالج کے ٹرسٹیوں کا اجلاس عموماً سال میں دو دفعہ ہوتا تھا جس میں تمام اہم اُمور کا تصفیہ ہو جاتا تھا، قانوناً اس اجلاس کا ایجنڈا کافی مدت پہلے شائع کرنا ضروری تھا، لیکن کالج میں کوئی ایسی کمیٹی نہ تھی جو فوری ضرورتوں کے وقت اہم اُمور کا فیصلہ کر سکے۔

اگرچہ بورڈ آف منیجمنٹ اور فنانس کمیٹی کے نام سے دو کمیٹیاں موجود تھیں لیکن اُن کے اختیارات محدود تھے، آنریری سکرٹری کو دفعہ ۱۴۰ کی رُو سے بوقت ضرورت کچھ اختیارات حاصل تھے لیکن اُن سے بھی پورا کام نہیں چلتا تھا، اور اگر عام ٹرسٹیوں سے رائے لی جائے تو اُس کے لیئے ضابطہ کے لحاظ سے ۳۵ دن پہلے اطلاع دینا لازم تھا، لیکن اہم معاملات اس قدر مدت تک مؤخر نہیں کیئے جا سکتے تھے، اس بنا پر مدت سے ایک مختصر لیکن با اختیار کمیٹی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں جو سلیکٹ کمیٹی قایم ہوئی اُس نے بھی اس ضرورت کو محسوس کیا، اُس کے بعد سنہ ۱۹۰۷ء میں جب طلبہ کی شورش کے بعد کمیشن بیٹھا تو اُس نے بھی سنڈیکیٹ کے قیام کو ضروری خیال کیا۔

۲۶ مئی سنہ ۱۹۰۷ء کو ٹرسٹیوں کی اسپشل میٹنگ میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے قیام سنڈیکٹ کی ضرورت پر ایک مدلل تقریر کی اور تمام جزئیات پر تفصیلاً بحث کر کے بتایا کہ سنڈیکیٹ کے ہاتھ میں کون کون سے کام ہونگے اور اُس کو کیا اختیارات حاصل ہونگے نواب وقارالملک نے صاحبزادہ صاحب کی تقریر کی پوری تائید کی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ صاحبزادہ صاحب ایک مکمل اسکیم پیش کریں، چنانچہ یہ تجویز سالانہ اجلاس پر ملتوی کی گئی، جو جنوری سنہ ۱۹۰۸ء میں منعقد ہوا اور راجہ محمد مزمل اللہ خانصاحب جائنٹ سکرٹری نے اس اجلاس کا ایجنڈا شایع کرتے وقت لکھا کہ:۔

"مُہذب ممالک میں جس قدر بڑے انسٹی ٹیوشن ہیں، خواہ تعلیمی ہوں یا تجارتی اُن میں ایک اگزکٹو (منتظم) کمیٹی ضرور ہوتی ہے جو مقامی ضروریات اور روزانہ واقعات کی بنا پر جو اُمور پیش آتے رہیں اُن کا انتظام کرتی ہے تمام یونیورسٹیوں میں مجلس سنڈیکیٹ اسی قسم کی ضروریات انجام دینے کے لیئے ہوتی ہے۔"

اس کے بعد بتایا تھا کہ کالج کا کام چونکہ روز بروز بڑھتا جاتا ہے لہذا یہاں بھی ایک منتظم کمیٹی کی ضرورت ہے، سالانہ اجلاس میں جب یہ مسئلہ پیش ہوا تو ۳۰ جنوری سنہ ۱۹۰۸ء سے یکم فروری تک اس پر مباحثہ رہا۔ کچھ ٹرسٹی اس بنا پر مخالف تھے کہ اس سے ٹرسٹیوں کے اختیارات محدود

ہوجائینگے، نواب محمد مزمل اللہ خاں صاحب اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے اپنی مدلل تقریروں سے اس غلط فہمی کو دُور کیا اور بعض ٹرسٹیوں کی تحریک پر یہ بھی منظور کیا گیا کہ ہر ٹرسٹی بشرطیکہ وہ علی گڑھ میں موجود ہو سنڈیکیٹ کے اجلاس میں شریک ہو سکتا ہے، بعض ٹرسٹیوں نے یہ بحث بھی چھیڑی کہ سنڈیکیٹ کے قیام سے آنریری سکرٹری کے اختیارات محدود ہوجائینگے، اس آنریری سکرٹری نے فرمایا کہ:۔

"دفعات پر غور کرنے کے بعد نفس اسکیم پر رائے دی جائے اور مجکو اپنے اختیارات کے کم ہونے کی کچھ بھی پروا نہیں ہے بشرطیکہ کام کے آسانی سے اور جلد انجام پانے میں کوئی خلل واقع نہو۔"

اس کے بعد سنڈیکیٹ کی اسکیم اجلاس میں پیش ہوئی اور یہ قرار پایا کہ اس کی ہر ہر دفعہ پر سلسلہ وار بحث کی جائے، چنانچہ طویل مباحثہ اور ترمیم و اضافہ کے بعد اسکیم کا مسودہ پاس کیا گیا، اور تہذیب و ترتیب کے لیئے ایک سب کمیٹی کے سپرد کیا گیا، سب کمیٹی نے اپنی ایک رپورٹ کے ساتھ یہ مسوّدہ مکمل کرکے بھیجدیا۔

یہ مسودہ خاصہ طویل ہے، اس کی بعض دفعات کا ماحصل جو نظام عمل و تقسیم کار سے تعلق رکھتا ہے ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

(۱) مجوزہ سنڈیکیٹ کے ممبروں کی تعداد ۱۵ سے ۱۷ تک تجویز کی گئی۔

(۲) آنریری سکرٹری ٹرسٹیان مدرسۃ العلوم، سنڈیکیٹ کا آنریری سکرٹری قرار دیا گیا۔

(۳) ممبروں کا انتخاب تین سال کے لیئے تجویز کیا گیا۔

(۴) اسکول اور کالج کے انتظام، جائداد، عمارات، بورڈنگ ہاؤس، پریس، باغات وغیرہ کے متعلق سنڈیکیٹ کو خاص اختیارات دیئے گئے، جن کی تحدید و تفصیل مختلف دفعات میں بیان کردی گئی، مثلاً سنڈیکیٹ کو منظور شدہ بجٹ کے علاوہ ایک ہزار روپیہ خرچ

کرنے کا اختیار دیا گیا۔

(۵) پرنسپل یا آنریری سکرٹری کی رپورٹ پر سو روپیہ تک کے ملازمین کی موقوفی یا تنزل کا حق بھی سنڈیکٹ کو دیا گیا، اسی طرح ہر شعبہ کے متعلق خاص اختیارات دیئے گئے۔ جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

یہ بھی طے ہوا کہ سنڈیکیٹ کا اجلاس اُس زمانہ میں جب کہ کالج کھلا ہوا ہو، ہر مہینہ کے آخری یکشنبہ کو ہوا کریگا، اور اجلاس خاص اشد ضرورت کے موقع پر ہر وقت ہو سکیگا، ٹرسٹی کو یہ حق دیا گیا کہ وہ جب چاہے سنڈیکیٹ کے اجلاس میں شریک ہو کر رائے دے، مع چیرمین کے پانچ ممبروں کا کورم قرار دیا گیا، جو تمام اختیارات عمل میں لانے کے مجاز ہونگے اسی طرح کے اور اُمور طے ہوئے جو روز مرّہ کے انتظامات سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس کے بعد ۲۰ دسمبر ۱۹۰۸ء کے اجلاس میں سنڈیکیٹ کے ۱۶ ممبروں کا انتخاب ہوا اور جولائی ۱۹۰۹ء میں سنڈیکیٹ نے کام شروع کیا۔

ٹرسٹیوں کی تعداد میں اضافہ

سنڈیکٹ قایم ہو جانے کے بعد یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ٹرسٹیوں کی تعداد میں عام طور پر، خصوصاً لوکل ٹرسٹیوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے، کیونکہ سنڈیکیٹ کے ممبروں کا انتخاب زیادہ تر لوکل ٹرسٹیوں ہیں سے ہونا مناسب تھا اس لیے کہ وہی فوری ضرورتوں کے وقت سنڈیکیٹ کے اجلاس میں شریک ہو سکتے تھے، دُور رہنے والے ٹرسٹیوں کا انتخاب اس لئے فضول تھا کہ سنڈیکٹ کی کارروائی میں پراکسی یا تحریری ووٹ کا قاعدہ نہیں رکھا گیا تھا، اس بنا پر نواب صاحب کی یہ خواہش تھی کہ ٹرسٹیوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔

نواب صاحب یہ بھی چاہتے تھے کہ مقامی ٹرسٹی کالج کے کاروبار میں عملاً بھی حصہ لیں۔ اس کی صورت اُنھوں نے یہ تجویز کی کہ کام کے مختلف شعبے سنڈیکٹ کے ممبروں کے متعلق کر دیئے جائیں تاکہ کاروبار میں آسانی ہو، ان سب ضرورتوں کو محسوس کر کے اُنھوں

نے یہ معاملہ جنوری ۱۹۰۹ء کے سالانہ اجلاس ٹرسٹیان میں پیش کیا، ان وجوہ کے علاوہ اُنھوں نے یہ بھی لکھا کہ:۔

"کالج کا دائرہ قریباً تمام ہندوستان پر محیط ہے تمام صوبوں سے اُس کے تعلقات وابستہ ہیں، ہر صوبہ میں، اور ہر با اثر طبقہ میں اُس کے ٹرسٹی موجود ہونے چاہئیں، لیکن ٹرسٹیوں کی موجودہ محدود تعداد کی وجہ سے وہ مقصد اکثر حاصل نہیں ہونے پاتا اور بہت سے ایسے نامور بزرگوں کے ناموں سے کالج کے ٹرسٹیوں کی فہرست خالی نظر آتی ہے جن کی شرکت کالج کے لیے بے انتہا مفید ہے، اور عدم شرکت نہ صرف بدنما اور مضر بلکہ منتظمین کالج کے لیے باعث ندامت ہے"

اس کے بعد اُنھوں نے مختلف صوبوں کے بہت سے لائق و سربرآوردہ مسلمانوں کا تذکرہ کرکے اس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ اُن لوگوں کو ہم اب تک اپنے کالج کا ٹرسٹی نہ بنا سکے۔ اِسی سلسلہ میں اُنھوں نے لاسلیکٹ کمیٹی کی تجویز اضافہ ٹرسٹیان اور مروجہ قانون کی دفعات پر تفصیلی بحث کرکے یہ خواہش کی کہ قانون ٹرسٹیان میں ترمیم کرکے ٹرسٹیوں کی تعداد بجائے ۸۰ کے ۱۲۰ قرار دی جائے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ اول سال میں صرف ۲۰ جدید ٹرسٹی منتخب کیے جائیں اور اُس کے بعد ہر سال پانچ جدید ٹرسٹیوں کا اضافہ ہوتا رہے۔

اِس موقع پر نواب صاحب نے ایک اور بحث بھی چھیڑی کہ مجلس خزینۃ البضاعۃ جو ابتدا میں سرسید نے قایم کی تھی وہ درحقیقت ٹرسٹیز کمیٹی کے قایم مقام تھی، اسی مجلس کا نام بعد کو کالج فنڈ کمیٹی رکھا گیا، اِس مجلس کے ممبروں کے نسبت قواعد میں صاف طور پر بیان کیا گیا تھا کہ وہ مادام الحیات کمیٹی کے ممبر رہینگے، اس کے بعد جب ٹرسٹیز سسٹم قایم ہوا تو یہ ضرور تھا کہ اُن سب ممبروں کو ٹرسٹی بنایا جاتا، لیکن ایسا نہیں کیا گیا اور اُن لوگوں کے حق میں ناانصافی کی گئی آنریبل سید محمود نے بھی لاسلیکٹ کمیٹی میں اپنے اسپیچ میں فرمایا تھا کہ:۔

"اُن لوگوں نے کالج کے ساتھ بے اعتنائی نہیں برتی بلکہ کالج نے اُن کے

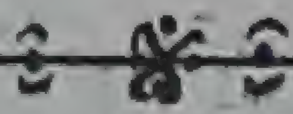
ساتھ بے اعتنائی برتی۔"

اس بناء پر نواب صاحب نے یہ خواہش کی کہ کالج فنڈ کمیٹی کے جو سات ممبر اس وقت زندہ ہیں پچاس کے اضافہ میں اُن کو بھی شامل کر لیا جائے۔

جب ۳۱ر اکتوبر ۱۹۰۹ء کو ٹرسٹیوں کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تو اختلاف و مباحثہ کے بعد حسب ذیل تجویز پاس ہوئی:

"ٹرسٹیوں کی تعداد ۸۰ سے کم اور ۱۲۰ سے زیادہ نہ ہوگی، لیکن شرط یہ ہے کہ وقت نفاذ دفعہ ہذا کے ایک سو بیس تعداد ٹرسٹیان میں سے جس قدر عہدے ٹرسٹیوں کے خالی پائے جائیں اُن میں سے تیرہ ٹرسٹی سے زائد سال اول میں اور اُس کے بعد آئندہ کسی سال پانچ ٹرسٹی سے زائد مقرر نہو سکیں گے مگر یہ شرط اُس خالی عہدے کے پُر کرنے سے متعلق نہو گی جو موجودہ ٹرسٹیوں میں سے کوئی جگہ خالی ہو۔"

لیکن نواب صاحب کی یہ تجویز کہ کالج فنڈ کمیٹی کے باقی ماندہ، ممبر بھی ٹرسٹی بنائے جائیں، منظور نہ ہو سکی۔



قرضِ حسنہ

سب سے پہلے نواب صاحب نے ۱۹۰۱ء میں یہ تجویز پیش کی کہ :-

"اب جو مالی امداد طلبہ کو اُن کے افلاس یا اُن کی کم استطاعتی کی وجہ سے وظیفہ کی شکل میں دی جاتی ہے وہ قرضِ حسنہ کی شکل میں دیجائے اس سے دو فائدے ہونگے، سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوگا کہ موجودہ وظیفہ جو درحقیقت خیرات کا دوسرا نام ہے اس کا خوگر شریف مسلمانوں کو نہ بنانا چاہیئے، ہمارے بڑے بڑے فصیح مقرر اور خاص کر جناب آنریبل سید مرحوم و مغفور اپنی پبلک اسپیچوں میں برابر اس بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ مسلمان جو مسجد کی روٹیاں کھا کھا کر

تعلیم حاصل کرتے ہیں اُن کے خیال میں وسعت اور دل میں فیاضی اور سیر چشمی پیدا ہی نہیں ہو سکتی اور اگر یہ سچ ہے تو اس وقت موجودہ وظیفہ کے ذریعہ سے اسی تنگ دلی اور دوں ہمتی کا بیج ہم اپنے نوجوان انگریزی خواں طالب علموں کے دلوں میں بو رہے ہیں، اور یہ امر یقینی ہے کہ جن باہمت لوگوں نے وظائف کے واسطے کالج میں جائدادیں وقف کی ہیں، اُن کو اس میں کوئی بھی عذر نہ ہوگا کہ اُن کی فیاضی کا استعمال کالج میں قرض حسنہ کی صورت میں ہو جس سے نوجوان شریف اگر بدقسمتی سے مفلس یا کم استطاعت مسلمانوں کی غیرت، اور حمیت کی بھی حفاظت ہو جاتی ہے۔"

لیکن اس وقت اُن کی یہ تجویز منظور نہ ہو سکی، کیوں کہ بعض ٹرسٹیوں نے یہ اعتراض کیا کہ قرض کیونکر وصول ہوگا، اور یہ کہ اگر تقاضا کیا جائے گا تو بُرا اثر طلبہ کو جو دلچسپی کالج سے ہے وہ باقی نہ رہیگی، مگر جب ۱۹۰۷ء میں طلبہ نے شورش کی تو دوبارہ یہ معاملہ پیش ہوا کہ جو مالی امداد طلبہ کو وظیفہ کے طور پر دیجاتی ہے وہ آیندہ "قرض حسنہ" کے طور پر دیجائے۔

اس موقع پر نواب صاحب نے یہ تحریک بھی کی کہ:۔

"امدادی وظائف کا تعلق فوراً آنریری سکریٹری سے کر دیا جائے جو پرنسپل صاحب کی سفارش پر بھی کافی طور سے خیال رکھینگے اور اپنی کارروائیوں میں جو ٹرسٹی اُن کے قریب موجود ہونگے اُن سے مشورہ اور مدد لیتے رہینگے۔"

چنانچہ مئی ۱۹۰۷ء کے اسپیشل اجلاس میں حسب ذیل تجویز منظور ہوئی:

"وظیفہ امدادی جو غیر مستطیع طالب علموں کو دیا جاتا ہے وہ قرض حسنہ کے نام سے دیا جائے اور اُس کا دینا اور حساب رکھنا آنریری سکرٹری ٹرسٹیان مدرسۃ العلوم سے متعلق ہو۔"

یہ تجویز منظور تو ہو گئی لیکن اس کا نفاذ خود نواب صاحب کے زمانہ میں ہوا، اس زمانہ میں وظائف

کا تعلق آنریری سکرٹری سے ہو گیا، کچھ مدت بعد بعض لوگوں کی رائے سے بجائے "قرضِ حسنہ" کے صرف "قرض" کا لفظ رہ گیا اور اس قرض نے باضابطہ صورت اختیار کر لی۔ اس تغیر کے بعد ان وظائف یا قرض کے دینے کی مقدار بھی بڑھ گئی! اور نواب صاحب نے اپنے زمانہ میں طلبہ کو نہایت فیاضی سے وظائف دیئے۔

کالج میں یونانی مطب کا انتظام

۱۹۰۸ء میں شمس العلما خواجہ الطاف حسین صاحب حالی نے تحریک کی کہ کالج کے طلبہ کے لیے یونانی علاج کا انتظام کیا جائے اور اس کے مصارف کے لیے سو روپیہ ماہوار منظور کئے جائیں، نواب صاحب نے سالانہ بجٹ کی ترتیب کے وقت یہ رقم بھی بجٹ میں داخل کی لیکن ۶ ستمبر ۱۹۰۸ء کو جب بجٹ فنانس کمیٹی میں پیش ہوا تو صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے اس سے اختلاف کیا، اور سلسلہ تقریر میں یہ بھی فرمایا کہ :-

"یہاں حکیم اور ڈاکٹر دونوں کو جمع کرنا مصلحت کے خلاف ہوگا، دو تھوک قایم ہو جائینگے، ایک یونانی والا، اور ایک ڈاکٹری والا، یہ مسئلہ اس قدر نازک ہے کہ اس میں اجتماع ضدین کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا"

نواب صاحب نے یہ بتانے کے بعد کہ بہت سے طلبہ یونانی علاج پسند کرتے ہیں اور اس ضرورت سے ان کو شہر جانا پڑتا ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ ڈاکٹر اور طبیب دونوں کے تقرر کی حالت میں کسی جھگڑے کا پیدا ہونا ضروری نہیں، جابجا یونانی علاج کا انتظام ہو رہا ہے، مختلف مقامات پر میونسپلٹیاں اپنے علاقوں میں طبیب مقرر کر رہی ہیں۔

طویل مباحثہ کے بعد نواب صاحب کے علاوہ چاروں ممبروں نے یونانی علاج کا خرچ بجٹ میں رکھنے سے انکار کر دیا، اس پر نواب صاحب نے اس خرچ کو بجٹ سے خارج کر دیا، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ظاہر کر دیا کہ وہ بجٹ میٹنگ میں اس مسئلہ کو بدستور ٹرسٹیوں کے تصفیہ کے لیے پیش کرینگے چنانچہ اُنھوں نے بجٹ میٹنگ کا ایجنڈا شائع کرتے وقت اس معاملہ کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا اور اس کی ضرورت ثابت کی۔ حاذق الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب اور شمس العلما

مولوی محمد ذکاءاللہ صاحب وغیرہ بھی اس تجویز کے زبردست حامی تھے، لیکن اب بھی بہت سے ٹرسٹیوں نے شدید اختلاف کیا اور طرح طرح کے خطرات ظاہر کیے اور اس سلسلہ میں یونانی طب پر بھی حملے کیے۔ نواب صاحب نے مکرر اس نکتہ چینی کا جواب دیا اور لکھا کہ :-

"کالج میں یونانی مطب قایم کرنے سے یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ڈاکٹری کے معالجہ پر اطمینان نہیں ہے، نہ ڈاکٹری طریقہ معالجہ پر یونانی طریقہ معالجہ کو اس تحریک کے ذریعہ سے کسی قسم کی فوقیت دینی مقصود ہے، یہ کام اُن علماء کا ہے جو دونوں طریقہ علاج سے واقفیت رکھتے ہوں، اس وقت تو سادہ مقصد اس جدید انتظام سے یہ پیش نظر ہے کہ جو طلبہ ابتداء سے یونانی معالجہ کے خوگر رہے ہیں اور اب اُن کو مرض کی حالت میں شہر جانا پڑتا ہے، یہ تکلیف اُن پر سے رفع ہو جائے، اور کالج ہی میں اُن کو قابل اطمینان طبیب اور دوا میسر ہو سکے طلبہ کا عام طور پر بھی شہر میں زیادہ آمد و رفت کرنا کالج کے طریقہ تربیت کے خلاف ہے۔"

مقصد کے واضح کر دینے کے بعد انھوں نے تمام اعتراضات کا جواب دیا ہے اور بتایا ہے کہ یونانی طریقہ علاج کا جاری کرنا کالج کے حق میں مفید ہوگا۔

۲۰ دسمبر ۱۹۰۸ء کے اجلاس میں یہ مسئلہ طے نہ ہو سکا لیکن ۳۱ جنوری ۱۹۰۹ء کے سالانہ اجلاس ٹرسٹیان میں طبیب اور عملہ کا تقرر منظور ہوا، اور کالج میں یونانی علاج کا صیغہ قایم ہو گیا جو سالہا سال تک جاری رہا۔

انگریزی طریقہ علاج کو ترقی

اگر ایک طرف نواب صاحب یونانی طبیب کے تقرر پر زور دے رہے تھے تو دوسری طرف انگریزی طریقہ علاج کی ترقی سے بھی غافل نہ تھے۔ کالج میں ابتدا سے ایک ہاسپٹل اسسٹنٹ رہتا تھا، جو بالکل کافی سمجھا جاتا تھا لیکن نواب صاحب کے زمانہ

میں طلبہ کی تعداد بڑھ گئی، اور متعدد بورڈنگ ہاؤس قایم ہو گئے تھے، اس لیے ایک ڈاکٹر کے اضافہ کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، اس کے ساتھ نواب صاحب کا یہ خیال بھی تھا کہ :۔

"دوسرا ڈاکٹر اسسٹنٹ سرجن کے درجہ کا ہونا چاہیئے، جس کے علاج پر زیادہ اطمینان اور بھروسہ ہو سکے، اور دو افسروں میں تقسیم ہو کر کام بھی کچھ ہلکا ہو جائے۔"

اِس لیئے اُنھوں نے ایک اسسٹنٹ سرجن کی تنخواہ ماہ ۲۵۰ ماہوار بجٹ میں رکھی، جنوری ۱۹۰۹ء کے سالانہ اجلاس میں یہ رقم منظور کی گئی اور یہ طے ہوا کہ دو سو روپیہ ماہوار تک کا ایک اسسٹنٹ سرجن مقرر کیا جائے، اور بجٹ میں جو ماہ ۲۵۰ کی رقم درج ہے وہ قایم رہے، تاکہ جس قدر روپیہ تنخواہ سے بچے وہ ہسپتال کی دوسری ضروریات میں صرف کیا جائے، چنانچہ ایک اسسٹنٹ سرجن کا تقرر عمل میں آیا۔



فیلوشپ کا قیام

دسمبر ۱۹۱۰ء میں **نواب صاحب** نے یہ تحریک پیش کی کہ :۔

"مدرسۃ العلوم جیسی درسگاہ میں متعدد فیلوشپ کا نہ ہونا ایک بہت بڑی کمی ہے اور جتنی فیلوشپ قایم ہوتی جائیں اتنے ہی قدم یونیورسٹی کی طرف بڑھینگے۔"

اِس کے بعد اُنھوں نے **فیلوشپ** کے قیام کے فائدے اور اُس کی نوعیت بیان کی۔ چنانچہ ۳۱ر جنوری ۱۹۱۱ء کے سالانہ اجلاس میں ایک عہدہ فیلوشپ کا علم کی کسی شاخ کے اندر تحقیقات کی غرض سے منظور کیا گیا۔

اُمیدوار کے لیئے یہ تجویز ہوا کہ وہ حتی الامکان **محمدن کالج** کا ایم اے، ہو اور جو کام وہ کرنا چاہتا ہے، اُس کی اسکیم اپنی درخواست فیلوشپ میں بیان کرے، وظیفہ کی مدّت تین سال قرار دی گئی جو پرنسپل اور آنریری سکریٹری کی سفارش پر پانچ سال تک بڑھ سکتی ہے

اُمیدوار پر یہ بھی لازم کیا گیا کہ وہ ہر سشن میں کم از کم ۳/۴ مدت کالج میں رہے، اور اپنی تحقیقات کے نتائج سنڈیکیٹ کے سامنے پیش کرے، جو منظور ہونے کی حالت میں کالج کے صرف سے اور اُس کی نگرانی میں شائع ہونگے۔

اسی طرح چند اور شرائط بھی تھے جن کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے، اس تجویز کے منظور ہوجانے کے بعد ایک عمدہ فیلوشپ کا قائم ہوگیا۔



دینیات کا وظیفہ

مُسلمانوں کی ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ جدید تعلیم یافتہ اشخاص جو زمانہ حال کی ضرورتوں سے واقف ہیں اعلیٰ درجہ کی مذہبی تعلیم عربی زبان کے ذریعہ سے حاصل کریں تاکہ اپنے گروہ کی عمدہ طریقہ سے رہ نمائی کرسکیں بلکہ بروقت ضرورت اسلام کی صیحح تعلیم **یورپ** تک پہنچا سکیں، چنانچہ نواب وقارالملک نے اپنے زمانہ میں یہ تجویز کیا کہ کسی گریجویٹ کو جو مذہبی تعلیم حاصل کرنیکا ذوق رکھتا ہو، کالج سے دینیات کی تعلیم کے لئیے وظیفہ دیا جائے، غرض مئی سنہ ۱۹۱۱ء میں پچاس روپیہ ماہوار کا وظیفہ تین سال کے لئیے منظور کر کے ایک گریجویٹ کو **دیوبند** بھیجا گیا، لیکن اس کے بعد جب اُن کا عہد ختم ہوگیا تو پھر یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا اور خود یہ انتخاب بھی کچھ موزوں نہیں ثابت ہوا۔



اسپیشل کلاس کی تجویز

کالج کے قیام سے پہلے **سرسید** نے کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم کے سامنے ایک موقع پر اپنے سلسلہ تقریر میں بیان کیا تھا کہ:-

"ہم مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی ہے جو گورنمنٹ کے اعلیٰ اعلیٰ عہدوں کے حاصل کرنے اور انتظام گورنمنٹ میں شامل ہوکر دنیوی عزت حاصل کرنے اور اپنے ملک کو فائدہ پہنچانے کی آرزو رکھتی ہے، ایک جماعت ایسی ہے کہ اسکو گورنمنٹ کے عہدے حاصل کرنے کا کچھ خیال نہیں ہے بلکہ وہ اپنی قوتِ بازو سے

بذریعہ تجارت یا اجرائے کارخانہ جات کے اپنی معاش پیدا کرنے کی خواہشمند ہو، ایک جماعت ایسی ہو کہ وہ صرف اپنی جائداد اور اپنے علاقہ جات کی درستی اور اپنے روزمرہ کی زندگی کے امورات کو بخوش اسلوبی انجام دینے کی آرزو رکھتی ہو، ایک جماعت ایسی ہو کہ وہ علوم و فنون کو حاصل کرے اور ان میں واقفیت کامل حاصل کرنا پسند کرتی ہو، ایک جماعت ایسی ہو کہ اس کو ان تمام چیزوں سے چنداں تعلق نہیں ہو بلکہ وہ بلحاظ اپنی میعاد کے علوم دین میں دستگاہ کامل حاصل کرنا اور اسی میں اپنی زندگی بسر کرنا چاہتی ہو اور ایک جماعت عوام الناس کی ہو جن کے لئے کسی قدر عام تعلیم کا ہونا ضروری ہو، بااین ہمہ ہر ایک کو اپنی اولاد کی نسبت یہ خواہش ہو کہ اس کے عقائد مذہبی بھی درست رہیں اور وہ ادائے فرائض مذہبی سے بھی غافل نہو جائے، پس جب کہ ہم تمام مسلمانوں کی تعلیم کا طریقہ قرار دیتے ہیں تو ہم کو ایسی تجویز کرنی چاہیئے جس سے تمام مقاصد مذکورہ اور نیز دیگر مقاصد جو تعلیم سے متعلق ہیں حاصل ہوں۔

جب آپ ان مقاصد پر غور فرمائینگے جن میں سے امور معظمہ کو میں نے ابھی بیان کیا تو آپ یقین کرینگے کہ کسی قوم کو یہ سب مقاصد جب تک وہ خود ان مقاصد کو حاصل کرنے پر مستعد نہو حاصل نہیں ہو سکتے، پس ہم کو اپنے تمام مقاصد کے انجام کو صرف گورنمنٹ ہی پر منحصر نہ رکھنا چاہیئے۔ بلکہ یقین کرنا چاہیئے کہ ان تمام مقاصد کا گورنمنٹ سے حاصل ہونا غیر ممکن اور مانند ممتنع بالذات کے ہو پس اس وقت ہم کو دو قسم کی تجویزیں کرنی چاہئیں، ایک کامل اور پوری دینی سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم تک جو ہمارے تمام مقاصد کو پورا کر سکیں اور جن میں ہم کو گورنمنٹ سے اس کی تعلیم کرانے کی کچھ خواہش نہو بلکہ ہم کو خود اپنی سعی اور کوشش سے آپ اس کا انجام کرنا مدنظر ہو۔ دوسری تجویز ہم کو

اس بات کی کرنی چاہیئے کہ جب تک ہم اس اوّل تجویز کو انجام دیں یا اس کے
انجام دینے کے لائق ہوں کیوں کر فائدہ اٹھائیں اور ہمارے متعدد مقصدوں سے
جون جون سا مقصد تعلیم معینہ گورنمنٹ سے حاصل ہو سکتا ہے اُس کو ہم کیونکر
حاصل کریں"۔

یہ سر سید کا ابتدائی خیال تھا، لیکن جب اسکول اور کالج قایم ہوا تو اس پر عمل نہ ہو سکا صرف یونی ورسٹی کی ڈگریاں حاصل کرنا پیش نظر رہا، لیکن نواب وقار الملک جو ابتدا سے آزاد تعلیم کے حامی تھے، اُنھوں نے ہمیشہ یہ خیال پیش نظر رکھا کہ جو لوگ سرکاری ملازمت کے خواہشمند نہیں ہیں اُن کے لیئے مخصوص تعلیم کا انتظام ہونا چاہیئے، چنانچہ سنہ ۱۹۰۴ء کی ایجوکیشنل کانفرنس (منعقدہ لکھنؤ) میں بڑی کوشش اور مباحثہ کے بعد یہ رزولیوشن پاس کرایا:-

"اس کانفرنس کی رائے میں جن طلبہ کا مقصد تعلیم سے یہ نہیں ہے کہ اس کے
ذریعہ سے وہ کوئی سرکاری ملازمت، یا وکالت، یا کوئی اور ایسا پیشہ اختیار
کرینگے جس میں یونیورسٹی یا اور کسی سررشتہ تعلیم کی سند درکار ہوتی
ہے، اُن کی تعلیم کے واسطے یونیورسٹیوں اور سرکاری سررشتہ تعلیم کے
باہر انتظام ہونا چاہیئے"۔

اس تجویز سے اندازہ ہوتا ہے کہ تعلیم کے متعلق کس قسم کی وسعت اُن کے پیش نظر تھی، لیکن جب وہ خود کالج کے آنریری سکرٹری ہوئے تو ابتدا میں مالی مشکلات کی وجہ سے اس پر توجہ نہ کر سکے، مگر چند سال بعد اپریل سنہ ۱۹۱۱ء میں اُنھوں نے سنڈیکیٹ میں یہ مسئلہ پیش کیا کہ اُن طلبہ کے لیئے جن کے مربی یونیورسٹی کی ڈگری اپنے بچّوں کے لیئے ضروری نہیں سمجھتے مگر بورڈنگ ہاؤس میں مثل دوسرے بورڈروں کے بدستور ٹیوٹوریل سسٹم کے ماتحت رکھنا چاہیئے ہیں، نیز اسکول کے طلبہ کے لیئے اسپشل کلاس کھولے جائیں۔ سنڈیکیٹ نے

کافی غور کے بعد فیصلہ کیا کہ اس قسم کی کلاسیں جس قدر جلد ممکن ہو کھول دیجائیں اور جو طلبا ان کلاسوں میں تعلیم پانا چاہیں اُن کو ان کلاسوں میں منتقل کر دیا جائے، اور ان سے مناسب حد تک زیادہ فیس لیجائے تاکہ زائد مصارف ادا ہو سکیں، اور اگر اس پر بھی کچھ روپیہ کی ضرورت باقی رہے تو آنریری سکرٹری و ممبر صاحب فنانس اُس کے واسطے تعلیمی بجٹ کے علاوہ روپیہ بہم پہنچانے کا انتظام کریں۔

عملی کارروائی اور ترتیب قواعد کے لیئے ایک کمیٹی بنا دی گئی جس میں ہیڈ ماسٹر، پرنسپل اور بعض پروفیسر و ممبر صاحب تعلیمات و فنانس شریک کیئے گئے اور قرار پایا کہ یہ سب اصحاب ضروری قواعد تیار کر کے سنڈیکیٹ میں پیش کریں، لیکن اسی زمانہ میں ایک طرف تو یونیورسٹی کی تحریک نے تمام کام کرنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا دوسری طرف نواب وقار الملک اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے کالج سے دست کش ہو رہے تھے اور آخر کار چند ماہ بعد کامل طور پر سبکدوش ہو گئے اس لیئے ان تجاویز پر عمل نہ ہو سکا اور کالج ایک مفید تجربہ سے محروم رہ گیا۔



کالج کے وزیٹر اور مہمان

ابتدا سے کالج نے دولت مند تجار، اُمرا، اور والیان ملک کی توجہ اور مالی اعانت سے فائدہ اُٹھایا ہے اور اس کی ترقی کا راز بجائے عام چندہ کے ان بلند رتبہ ہستیوں کی فیاضی میں مضمر ہے۔ عموماً یہ ہوتا رہا ہے کہ بڑے بڑے لوگ کالج کے معائنہ کے لیئے آتے تھے جن کا پرجوش خیر مقدم کیا جاتا تھا، اور عام طور پر اُن کی یہ آمد کالج کے لیے مادی حیثیت سے مفید ہوتی تھی، نواب وقار الملک کا عہد بھی معزز مہمانوں کی رونق افروزی کے لحاظ سے ممتاز رہا، چنانچہ ہز ایکسلنسی لارڈ منٹو، ہز آنر سر جان ہیوٹ، ہز آنر مسٹر پورٹر (لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ) آنریبل سر راس کیپل کے، سی ایس آئی، چیف کمشنر صوبہ سرحدی، ہز ہائنس میر صاحب خیرپور سندھ، ہر ہائنس بیگم صاحبہ فرماں روائے بھوپال، ہز ہائنس مہاراجہ صاحب کشمیر، ہز ہائنس نواب صاحب رامپور، ہز ہائنس سر آغا خاں، مہاراجہ صاحب

در بھنگہ، **نواب صاحب** ڈھاکہ، آنریبل مسٹر **فاضل بھائی**، سیٹھ **عبدالکریم عبدالشکور** جمال رنگون، مسٹر **گے جی گپتا** ممبر انڈیا کونسل اور دوسرے ممتاز مشاہیر نے مختلف اوقات میں کالج کا معائنہ کیا، اور ان میں سے متعدد اصحاب کالج کے مہمان ہوئے اور قریباً سب نے نواب وقار الملک کی محنت، دل سوزی اور شاندار قومی خدمات کا عمدہ الفاظ میں اعتراف کیا، ان سب اصحاب کی آمد کا خوش اسلوبی سے استقبال کیا گیا، اور اڈریس دیئے گئے جن کا حوصلہ افزا جواب محترم مہمانوں نے دیا، بخوفِ طوالت ہم ان تمام تفصیلات کو نظر انداز کرتے ہیں۔

پرنس حمیداللہ خاں کا داخلہ علی گڑھ کالج میں

جلیل القدر اُمراء اور والیانِ ملک کے بچے عام اسکولوں اور کالجوں میں نہیں پڑھتے، اُن کے لیے پنجاب اور راجپوتانہ وغیرہ میں چیفس کالج اعلیٰ پیمانہ پر قایم ہیں، اسی وجہ سے ابھی تک علی گڑھ کالج میں اس طبقہ کا کوئی طالب علم کالج میں داخل ہونے کے لیے نہیں آیا تھا۔ لیکن نواب **وقار الملک** کے عہد میں کالج کی شہرت اور منزلت اس درجہ تک پہنچی کہ عُلیا حضرت **بیگم صاحبہ** بھوپال خود علی گڑھ تشریف لائیں اور اپنے فرزندِ اصغر **نواب زادہ حمید اللہ خاں** بہادر کو بطور ایک طالب علم کے کالجیٹ اسکول میں داخل کرایا، اور ممدوح مسلسل چند سال تک تعلیم میں مشغول رہے یہاں تک کہ "بی اے" کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد کالج چھوڑا۔

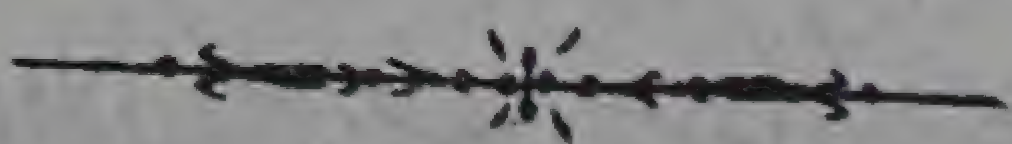
علی گڑھ کالج میں پرنس ممدوح کا داخلہ درحقیقت اُس اعتماد و اطمینان کی بنا پر تھا، جو ہر ہائنس کو نواب وقار الملک کی ذات پر تھا، جیسا کہ علیا حضرت نے بالمشافہ صاف الفاظ میں آنریری سکرٹری سے ظاہر بھی کر دیا تھا۔ غرض پرنس کے داخلہ کا مادّی و اخلاقی اثر کالج کے لیئے نہایت مفید ہوا، چنانچہ اس کے بعد **دولت آصفیہ** کے اُمرائے پائیگاہ کے صاحبزادے کالج میں داخل ہوئے اور آئندہ کے لیئے یہ واقعہ ایک عمدہ مثال ثابت ہوا۔

عمارات کی تکمیل و تعمیر نواب صاحب کے زمانہ میں عمارات کی تعمیر و تجدید کا کام بھی کچھ کم نہیں ہوا، جس طرح کالج کا کام ترقی کرتا جاتا تھا، اور طلبہ و پروفیسروں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی جدید عمارات کی تعمیر اور نامکمل عمارات کی تکمیل کی ضرورت بھی محسوس ہوتی جاتی تھی، بورڈنگ ہاؤس لکچر روم، اور اسٹاف کے مکانات کی ضرورت ناگزیر تھی، چنانچہ عمارات کے سلسلہ میں پہلے آرنلڈ ہاؤس تیار ہوا، اس کے بعد **بک منزل، مشتاق منزل** وغیرہ اختتام کو پہنچیں جن کی تعمیر سے کالج کے سلسلہ عمارات کا درمیانی حصہ مکمل اور خوشنما ہوگیا۔

اِن عمارات کے علاوہ ہز اکسلنسی لارڈ منٹو وائسرائے کی یادگار کے طور پر ایک وسیع عمارت کی تعمیر شروع ہوئی جس کا نام ہز اکسلنسی کے نام پر "منٹو سرکل" تجویز کیا گیا، یہ عمارت چار بلاکوں پر منقسم ہے، پہلا بلاک ۱۹۰۹ء میں تعمیر ہوگیا، دوسرے تین بلاکوں کا سنگِ بنیاد رکھا گیا جو رفتہ رفتہ تعمیر ہوئے۔

جس زمانہ میں "سٹڈنس یونین کلب" تیار ہوا تھا، طلبہ کی تعداد محدود تھی، اب ہز ہائنس نواب صاحب رامپور کے عطیہ اور دیگر مدات سے اس کا نہایت شاندار ہال تعمیر کیا گیا جو ہز ہائنس کے نام پر **حامد ہال** سے موسوم ہوا۔

صدر دروازے کے مغربی جانب متعدد کمرے تیار کیے گئے جو لا کلاس کے لیے ضروری سمجھے گئے تھے، اس کے علاوہ ڈیوٹی ۵ فی صدی شرح منافع پر روپیہ قرض لے کر ہندوستانی اسٹاف کے لیے متعدد مکانات تعمیر کیے گئے جو کرایہ پر دیے جاتے تھے، اسی زمانہ میں وِلڈ لو ابز لاج کی تعمیر شروع ہوئی جس کا سنگِ بنیاد خود نواب **وقار الملک** بہادر نے اپنے ہاتھ سے رکھا، قدیم عمارات کی اصلاح و تجدید کا سلسلہ بھی جاری رہا تاکہ وہ اصلی حالت پر قائم رہیں، اسی طرح تعمیر شدہ عمارات کے باقی ماندہ حصوں کی تکمیل بھی کی گئی، غرض اُن کا عہد تعمیرات کے لحاظ سے بھی قابلِ توجہ رہا۔



گورنمنٹ سے مالی اعانت اور بعض حقوق کی درخواست

نواب وقار الملک نے جب کالج کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا تو کالج کی وسعت اور روز افزوں ضرورتوں نے اُن کو وسائل آمدنی کے بڑھانے پر متوجہ کیا۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں آخر جون ۱۹۰۸ء میں اُنھوں نے ہز آنر سے بمقام نینی تال ملاقات کی اور یہ کہا کہ

"کالج کی حالت بہت کچھ مالی مدد کی محتاج ہے جس میں علاوہ اس ۳۲ ہزار سالانہ مالی مدد کے جو حضور کی گورنمنٹ سے عنایت ہوتی ہے، گورنمنٹ آف انڈیا یا دیگر صوبجات سے بھی ہم کو مدد ملنی چاہیئے۔ کیوں کہ ہمارا کالج صرف کسی ایک صوبہ کا کالج نہیں ہے بلکہ تمام صوبوں کا کالج ہے، اُس میں ہر صوبہ کے مسلمان طالب علم تعلیم کے لیئے آتے ہیں اور کالج کی حیثیت ایک امپیریل کالج کی ہے۔"

ہز آنر نے نہایت توجہ سے یہ گفتگو سُنی اور وعدہ کیا کہ جب آنریری سکرٹری اس درخواست کے ساتھ شملہ کا قصد کریں تو ہز آنر بھی وائسرائے سے سفارش کرینگے، اِس کے بعد جب اگست میں دُوسری دفعہ نواب وقار الملک اور نواب **سر فیاض علی خاں** نے ہز آنر سے ملاقات کی تو یہ خواہش ظاہر کی کہ صرف آنریری سکرٹری کے شملہ جانے کے بجائے یہ مناسب ہوگا کہ ٹرسٹیوں کا ایک ڈپوٹیشن مذکورۂ بالا درخواست کے ساتھ ہز اکسلنسی وائسرائے کی خدمت میں بمقام شملہ حاضر ہوا۔

اِسی سلسلہ میں نواب وقار الملک نے کالج کی مالی حالت بھی تحریری صورت میں ہز آنر کے سامنے پیش کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ

۱۸ ہزار روپیہ سالانہ کی بالفعل ہم کو اور ضرورت ہے، اور یہ درخواست کی کہ جو ۳۲ ہزار روپیہ سالانہ صوبہ کی گورنمنٹ سے عنایت ہوتے ہیں اُس میں بھی اضافہ کیا جائے، ہز آنر نے ڈپوٹیشن کی تجویز کو بطور ٹرسٹیوں کے ایک پرائیویٹ ڈپوٹیشن کے پسند کیا اور یہ فرمایا کہ وہ خود بھی اسکی تائید کرینگے، یہ اُمید بھی دلائی کہ جس وقت اس صوبہ کی گورنمنٹ قحط کی مشکلات سے نجات

پائیگی تو کالج کی موجودہ گرانٹ میں اضافہ کی طرف بھی توجہ کریگی۔

اس کے بعد بھی ہز آنر نے ایک موقع پر کالج کی امپریل حیثیت کا اعتراف کیا، یعنی جب فروری ۱۹۰۹ء میں کالج کے معائنہ کے لئے آئے تو ٹرسٹیوں کے ایڈرس کے جواب میں سلسلہ تقریر میں یہ بھی فرمایا کہ:۔

"اگرچہ آپ کا کالج اس صوبہ میں واقع ہے اور اس کے تعلقات بھی اس صوبہ کی گورنمنٹ سے ہیں مگر بمقابلہ پراونشل تعلیم گاہ ہونے کے وہ امپریل تعلیم گاہ کہلانے کا زیادہ مستحق ہے"۔

غرض ستمبر ۱۹۰۸ء میں ہز اکسلنسی وائسرائے کی خدمت میں ایک مفصّل درخواست بھیجی گئی۔ ڈیپوٹیشن کی اجازت بھی طلب کی گئی، ہز آنر نے سفارش بھی کی لیکن وائسرائے کے پرائیوٹ سکرٹری نے ۲۹ ستمبر کو جواب دیا کہ:۔

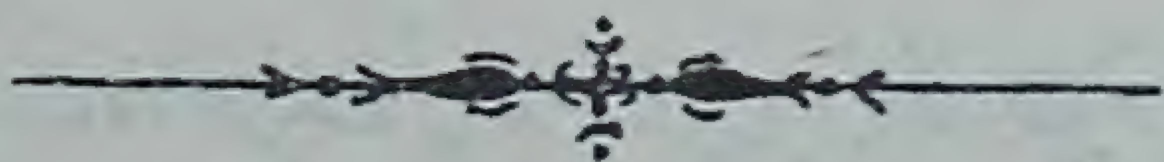
"میں نے وائسرائے کی خدمت میں جملہ کاغذات پیش کر دیئے، اور میں حسب الارشاد اطلاع دیتا ہوں کہ ٹرسٹیوں کی درخواست پر حضور والا نہایت توجہ سے غور فرمائینگے، چونکہ مجوزہ میموریل میں جو مراتب مذکور ہوئے ہیں وہ نہایت اہم ہیں لہٰذا کچھ تھوڑا وقت ضرور گزرے گا، قبل اس کے کہ میں آپ کو کوئی معین جواب دے سکوں"۔

اس کے بعد ۱۱ اکتوبر کو ہز اکسلنسی کے پرائیوٹ سکرٹری نے نواب وقار الملک کو حسب ذیل خط لکھا:۔

مائی ڈیر نواب صاحب! بسلسلہ اپنے خط مورخہ ۲ ستمبر میں اب یہ تحریر کرتا ہوں کہ وائسرائے نے بہت غور سے آپ کے خط کے ساتھ ملفوفہ کاغذات اور اُن کی مندرجہ درخواستوں پر توجہ فرمائی بطور اس کے نتیجہ کے میں حسب ہدایت آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ وائسرائے کو افسوس ہے کہ وہ اپنے تئیں اس

ڈپوٹیشن کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں پاتے جس کے ہز اکسلنسی کی خدمت میں حاضری کا ٹرسٹیان مدرستہ العلوم نے مہربانی سے مشورہ دیا ہے۔ آپ کے میموریل کے اغراض کے ساتھ لارڈ منٹو کو پوری ہمدردی ہے لیکن اس امر کے متعلق جو معلومات سردست اُن کو حاصل ہے اُس کے لحاظ سے وہ اُن مضامین خاص پر جو اُس کاغذ میں درج ہیں رائے ظاہر نہیں کر سکتے۔

قبل اس کے کہ وائسرائے کے پاس کافی معلومات فیصلہ قطعی کے واسطے بہم پہنچے لوکل گورنمنٹ سے کچھ پوچھنا ضروری ہوگا ان وجوہ سے ہز اکسلنسی کا خیال ہے کہ ٹرسٹیوں کو بصورت ایک ڈپوٹیشن کے ذاتی طور پر حاضری کی تکلیف دینا مناسب نہیں لیکن مجھے حسب ہدایت یہ کہنا ہے کہ مدرستہ العلوم مسلمانان کی اشد ضروریات نظر انداز نہ ہونگی"۔



اسی سلسلہ میں ہز آنر کے ایما سے دسمبر ۱۹۰۸ء میں آنریبل مسٹر ڈیلافوس ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم علی گڑھ آئے اور منجملہ دیگر اہم اُمور کے اس مسئلہ پر بھی ٹرسٹیوں سے گفتگو کی اور یہ خیال ظاہر کیا کہ ٹرسٹیان کالج جو کالج کی امپریل حیثیت کے لحاظ سے **گورنمنٹ آف انڈیا** نیز ہر صوبہ کی گورنمنٹ دونوں سے مالی امداد کے خواستگار ہیں یہ صحیح نہیں یا تو اُن کو مختلف لوکل گورنمنٹوں سے مدد مانگنا چاہیئے یا صرف امپریل گورنمنٹ سے، غرض موجودہ ٹرسٹیوں کے مشورہ سے اس ملاقات کی جو یادداشت مرتب کی گئی اُس میں یہ قلمبند کیا گیا کہ:۔

بہ نظر مقامی ضروریات دیگر صوبجات کے یہ مناسب خیال کیا گیا کہ ہز اکسلنسی وائسرائے کی خدمت میں جو ایڈریس پیش کیا جانا تجویز ہوا ہے اُس کے مسودہ میں اس قدر ترمیم کردیجائے کہ امداد صرف گورنمنٹ ہند اور گورنمنٹ صوبجات متحدہ سے طلب کی جائے"۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب اس مشورہ میں شریک نہ تھے جب ممدوح کو ان واقعات کی اطلاع ہوئی تو نواب وقار الملک کو ایک باضابطہ خط لکھا اور طے شدہ امور کے متعلق استفسارات کے سلسلہ میں یہ بھی دریافت کیا کہ :-

"جو درخواست گورنمنٹ ہند سے کی گئی ہے کہ وہ اس کالج کو دوسرے صوبوں کی گورنمنٹوں سے مدد دلوائے یا اُن کی طرف سے خود گورنمنٹ ہند عطا فرمائے وہ اس بنا پر کی گئی تھی کہ چونکہ یہ کالج دوسرے صوبوں کے مسلمان طلبہ کو تعلیم دیتا ہے اس لیے اُس کو دوسرے صوبوں سے مدد کا استحقاق ہے اب جب کہ یہ درخواست واپس لی جاتی ہے تو کیا جس بنا پر وہ کی گئی تھی وہ بھی واپس لی جاتی ہے یعنی جو دعویٰ میموریل میں کیا گیا تھا اُس کو بھی واپس لیا جاتا ہے اور اگر صراحتاً واپس نہیں لیا جاتا تو کیا اس ترمیم سے یہ نتیجہ اب یا آئندہ کبھی نکل سکتا ہے"۔

نواب وقار الملک نے دوسرے استفسارات کا جواب دیتے ہوئے اس سوال کے جواب میں لکھا کہ :-

"یادداشت کے فقرہ نمبر ۴ کی بحث میں جو سوال کیا گیا ہے اُس کا جواب یہ ہے کہ جس بنیاد پر دوسرے صوبوں کی مالی امداد کی استدعا کی گئی تھی وہ بنیاد بجائے خود قائم ہے اور اس کو واپس نہیں لیا گیا بات یہ ہے کہ ہم نے اس بنیاد پر کہ ہمارا کالج دوسرے صوبوں کے طلبہ کو بھی تعلیم دیتا ہے دوسرے صوبوں کی گورنمنٹوں سے مدد کی درخواست کی تھی اور امپیریل گورنمنٹ سے بھی لیکن چونکہ اب یہ مناسب بلکہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ ہر ایک صوبہ میں اسلامی کالج قایم ہوں اور دوسرے صوبوں کی گورنمنٹوں کو اپنے اپنے صوبہ میں اُن کالجوں کو مالی مدد دینی ہوگی، لہٰذا صوبوں کی گورنمنٹوں سے ہم نے اپنے کالج کے لیئے مدد مانگنی مناسب نہیں سمجھی بلکہ صرف امپیریل گورنمنٹ سے مذکورہ بالا بنیاد

پر مدد کا مانگنا ہم نے کافی سمجھا ہے، اور یہی مناسب بھی تھا اور ہماری امداد
کی درخواست امپریل گورنمنٹ کے سامنے پیش ہے اور ہم کو ہز آنر ٹرین کالج کی
مدد اور امپریل گورنمنٹ کی فیاضی سے امید ہے کہ ہم کو اس میں کامیابی
ہوگی، اور ہز آنر نے اپنی ۲۲ر فروری کی اسپیچ میں اس بات کے صاف صاف
فرمادینے سے کہ یہ کالج بمقابلہ پراونشل تعلیم گاہوں کے امپریل تعلیم گاہ کہلانے
کا زیادہ مستحق ہے ہمارے مذکورہ بالا امداد کے دعویٰ کو بہت زیادہ قوی
کردیا ہے جس کے لحاظ سے تمام ہی خواہان کالج کو دل سے ہز آنر کا ہمیشہ مشکور
ہونا چاہیے"۔

اس جواب کے بعد بھی بحث کا سلسلہ جاری رہا، اور ٹرسٹیوں کی اسپیشل میٹنگ منعقدہ ۱۳ر
جولائی ۱۹۰۹ء نے صاحبزادہ صاحب کی تحریک سے بکثرت آرا پہلی تجویز کو قایم رکھا چنانچہ
حسب ذیل رزولیوشن پاس ہوا:

"جو مسودہ میموریل گورنمنٹ آف انڈیا میں ٹرسٹیان کالج کی
کی طرف سے سال گزشتہ میں بھیجا گیا اس میں جو درخواست کی گئی تھی کہ دوسرے
صوبوں کی گورنمنٹیں ہمارے کالج کی اس بنیاد پر مدد کریں کہ ان صوبوں کے
مسلمان طلبہ کو اس کالج میں تعلیم و تربیت دیجاتی ہے، اس درخواست کو
یادداشت مذکور کے نمبر ۵ میں واپس لیا گیا ہے لیکن اس درخواست کا
واپس لینا اصل اغراض و مقاصد کالج کے منافی ہے لہٰذا اس کو واپس
نہ لیا جائے"۔

یہ رزولیوشن پاس تو ہو گیا لیکن نواب وقارالملک کو اب بھی اختلاف رہا، انھوں
نے چاہا کہ اجلاس کے سامنے اس کے برخلاف وجوہ و دلائل پیش کریں مگر اس اجلاس میں ایسے
اہم امور درپیش تھے کہ موقع نہ ملا، لیکن انھوں نے اس کے بعد سب سے پہلے ہی موقع پر ٹرسٹیان

کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۵ جنوری سنہ ۱۹۱۰ء میں اس معاملہ کو دوبارہ پیش کیا، اور ایک مفصل تمہید کے بعد لکھا کہ :-

"۳۱ جولائی کے منظورشدہ رزولیوشن میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ دیگر مختلف لوکل گورنمنٹوں سے مالی امداد کا واپس لینا اصل اغراض و مقاصد کالج کے برخلاف ہے میری سمجھ میں اُس کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی، اگر اسی کے ساتھ یہ بھی تجویز ہوا ہوتا کہ گورنمنٹ آف انڈیا سے مدد نہ چاہی جائے اور صرف مختلف لوکل گورنمنٹوں سے مدد کی درخواست کی جائے تب البتہ جو رزولیوشن پاس ہوا وہ ایک اُصول پر تو مبنی ہوتا لیکن جب کہ گورنمنٹ آف انڈیا سے اسی بنیاد پر مدد مانگی جاتی ہے کہ ہمارے کالج میں مختلف صوبوں کے طلبہ تعلیم پارہے ہیں تو لوکل ٹرسٹیوں اور صاحب ڈائرکٹر بہادر نے جو تجویز کی وہ کیونکر کالج کے مقاصد کے خلاف ہوگی، کالج کے مقاصد سے مراد منظورشدہ رزولیوشن میں یہی ہے کہ اس کی امپیریل حیثیت قایم رہے اور اُس میں گورنمنٹ آف انڈیا سے مدد چاہنے کی حالت میں کوئی فرق نہیں آتا، اور میں نے جو ٹرسٹی صاحبان کو دوبارہ تکلیف دی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ منظورشدہ رزولیوشن نے مجکو سخت مشکل میں ڈال دیا ہے میں اگر اس رزولیوشن کی تائید میں صاحب ڈائرکٹر بہادر یا گورنمنٹ میں کوئی تحریر کرتا ہوں تو اُس کے لیے اپنے پاس کافی دلائل نہیں پاتا، اور ایسے بڑے محکموں کو بدون کافی وجوہ ظاہر کیے ہوئے کوئی بات لکھ دینی کسی طرح موزوں نہیں ہے۔

الغرض مجکو اُمید ہے کہ ٹرسٹی صاحبان مزید غور کے بعد ۳۱ جولائی کے رزولیوشن کو منسوخ فرماکر یادداشت ملاقات لوکل ٹرسٹیز و صاحب ڈائرکٹر بہادر کا فقرہ ۶ بدستور قایم رکھینگے"۔

نواب وقارالملک کی اس تحریر پر ٹرسٹیوں نے مکرر غور کیا اور آخرکار حسب ذیل

رزولیوشن پاس ہوا:-

"رزولیوشن نمبر ۲ اسپیشل میٹنگ ٹرسٹیان منعقدہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۹ء کو منسوخ کیا جائے اور ایڈریس میں ایسی ترمیم کردیجائے کہ کالج کی مرکزی حیثیت پر اُس سے کچھ اثر نہ پڑے"۔

پوری اُمید تھی کہ گورنمنٹ آف انڈیا سے اس موقع پر کالج کو معقول رقم ملیگی لیکن ایسا نہیں ہوا، جون ۱۹۱۰ء میں گورنمنٹ ہند نے مالی حالت کی کمزوری کے عذر پر کسی گرانٹ کے نہ دینے پر افسوس ظاہر کیا، اور اسی سلسلہ میں یہ رائے بھی ظاہر کی کہ:-

"گورنمنٹ ہند مختلف صوبجات کی معمولی ضروریات کو علی گڑھ کے انداز پر وہاں لوکل کالجوں کے قیام سے پورا ہوتے ہوئے دیکھنا زیادہ پسند کرتی ہے، اور اس کو اُمید ہے کہ اس قسم کے کالجوں کے قیام کی توقع اُمید معقول کے دائرہ سے باہر نہیں ہے، مع ہذا گورنمنٹ تسلیم کرتی ہے کہ علی گڑھ فارغ التحصیل مسلمان گریجوئیٹوں کی تعلیم کا بخوبی مرکز رہ سکتا ہے اور یہ کہ اس صورت میں بھی اس کی مسلمانی حیثیت سے (امپریل کیرکٹر) قایم رہیگا"۔

دیگر سوالات جن کا ٹرسٹیوں نے تذکرہ کیا ہے ہائی کورٹوں، یونیورسٹیوں اور لوکل گورنمنٹ کے تعلق کے ہیں، تاہم خاص خاص صورتوں میں جو دشواریاں پیش آئیں اُن کے متعلق عرضداشتوں پر غور کرنے کے لیئے گورنمنٹ ہند آمادہ رہیگی"۔

گورنمنٹ کا عطیہ

اس جواب کے بعد امپریل گورنمنٹ کی امداد سے مایوسی ہوگئی، تاہم نواب **وقار الملک** نے ۱۹۱۰ء میں اس مقصد نیز دوسرے قومی اغراض کے لیئے **شملہ** کا سفر کیا۔ وہاں پہنچکر گورنمنٹ آف انڈیا کے ممبروں، لفٹنٹ گورنر پنجاب اور ممبر ریلوے بورڈ جو وائسرائے کی کونسل کے رکن تھے، اور سر **ہارکورٹ بٹلر** سے جو ممبری تعلیم پر نامزد ہوچکے تھے اور ممبر

مال سے خصوصیت کے ساتھ ملاقاتیں کیں، اور عرضداشت کا مقصد اور امداد کا استحقاق ان سب لوگوں کے ذہن نشین کیا، وائسرائے سے بھی ملاقات کی، لیکن بعض وجوہ سے بالفعل اس جد وجہد کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، البتہ لارڈ منٹو کے جانشین، لارڈ ہارڈنگ کی گورنمنٹ نے ۱۹۱۱ ۱۲ء کے بجٹ کی بچت سے جو ایک معقول رقم ہندوستان کی تعلیمی ضروریات پر خرچ کرنا منظور کیا تھا، اس میں سے دو لاکھ روپیہ یکمشت مرحمت کیا، اور آئندہ امداد دینے کا معاملہ بجٹ کی حالت پر منحصر رکھا۔

عام مالی امداد

امپریل گورنمنٹ سے گرانٹ حاصل کرنے کی کوشش کے علاوہ نواب وقار الملک نے مالی امداد حاصل کرنے کے لیئے اور تدابیر بھی اختیار کیں، ہندوستان کے مختلف حصص کے سفر کئے، والیان ملک کے درباروں میں حاضر ہوئے، اُمرا و عام مسلمانوں سے چندہ کی درخواست کی، مثلاً ہز ہائنیس **نواب صاحب** رامپور کی خدمت میں جاکر کالج کی ضرورتیں ظاہر کیں، چنانچہ ممدوح کی سفارش سے گوالیار سے ایک لاکھ روپیہ کی ایک گراں قدر رقم حاصل ہوئی، اس کے علاوہ عُلیا حضرت فرماں روائے بھوپال کے حضور میں اپنی ضرورتیں عرض کیں، چنانچہ **سرکار عالیہ** نے خاص توجہ فرماکر بدفعات کالج کے مختلف شعبوں کی نہایت فیاضی سے اعانت فرمائی اور اپنے فرزند اصغر کو تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیجا، اسی زمانہ سے علیا حضرت کو علی گڑھ کی تعلیمی تحریک سے مستقل تعلق پیدا ہوگیا جو بفضلہ تعالیٰ اب تک قائم ہے اور مسلم یونیورسٹی سرکار عالیہ کی شاہانہ فیاضی سے برابر متمتع ہوتی رہتی ہے۔

والیان ملک کے علاوہ آپ نے پنجاب و برہما کے سفر میں مسلمان امرا و تجار کو بھی کالج کی اعانت پر توجہ دلائی، اگرچہ اُن کی جد وجہد کا زمانہ مختصر تھا کیونکہ اس کے بعد **مسلم یونیورسٹی** کی تحریک شروع ہوگئی جس میں اُن کو خصوصیت کے ساتھ مصروف ہونا پڑا، اور اس زمانہ میں جو چندہ علاوہ یونیورسٹی کے نام سے ملا جو کالج کے سلسلہ سے الگ تھا، اس لیے مخصوص طور پر کالج کے لیئے

زیادہ چندہ حاصل نہ ہوسکا، تاہم مالی حیثیت سے اُن کا زمانہ ناکامیاب نہیں رہا۔
حسب ذیل فہرست سے (جو اگرچہ بالکل مکمل نہیں ہے) یہ اندازہ ہوگا کہ مالی حیثیت سے اُن کا عہد یقیناً کامیاب رہا۔

(۱)	امپیریل گورنمنٹ	دو لاکھ یکمشت	عام اغراض کیلئے
(۲)	ہز ہائنس مہاراجہ گوالیار	ایک لاکھ	؍
(۳)	گورنمنٹ ممالک متحدہ	۲۰ ہزار	
(۴)	ہز ہائنس مہاراجہ کشمیر	دو ہزار پانسو	
(۵)	ہز ہائنس نواب صاحب رامپور	۱۰ ہزار	توسیع یونین کلب
(۶)	ہز ہائنس نواب صاحب جوناگڈھ	۱۲ ہزار	جوناگڈھ ہوسٹل
(۷)	سر راجہ صاحب محمود آباد	۱۰ ہزار	تعمیر منٹو سرکل
(۸)	سر راجہ تصدق رسول خانصاحب جہانگیر آباد	۴۰ ہزار	تعمیر منٹو سرکل
(۹)	سردار یار محمد خاں بہادر وزیر جاورہ	۴۰ ہزار	تعمیر منٹو سرکل
(۱۰)	سیٹھ عبدالکریم عبدالشکور جان برادرس رنگون	۵۲ ہزار ۴ سو ۲۵	تعمیر منٹو سرکل
(۱۱)	نواب کرنل محمد عبید اللہ خاں بہادر سی، ایس آئی بھوپال	۵۰ ہزار	تعمیر منٹو سرکل
(۱۲)	راجہ صاحب نانپارہ	۵۰ ہزار	تعمیر منٹو سرکل
(۱۳)	ہز ہائنس نواب صاحب جوناگڈھ	۸ ہزار	پرنٹنگ پریس
(۱۴)	ایضاً	۵ ہزار	ٹکنیکل فنڈ
(۱۵)	آنریبل فاضل بھائی وغیرہ	۲ ہزار	وظائف حرفتی
(۱۶)	ہر ہائنس سرکار عالیہ فرمانروائے بھوپال	۵ ہزار (سالانہ)	
(۱۷)	ہز ہائنس میر صاحب خیرپور سندھ	۶ ہزار	
(۱۸)	سردار یار محمد خاں وزیر جاورہ	۳ ہزار ۸ سو ۴۰	جاگیر موروثی

(۱۹)	نواب سر سلیم اللہ خاں صاحب ڈھاکہ	۲ ہزار ۴ سو	سالانہ وقف
(۲۰)	نواب عظمت علی خاں صاحب کرنال	"	"
(۲۱)	صفیۃ النساء صاحبہ و مولوی فضل حق صاحب بچھرایوں مرادآباد ۳ ہزار		"
(۲۲)	سیٹھ عبدالشکور جمال برادرس	۱ ہزار ۲ سو	"
(۲۳)	ہز ہائنس آغا خاں	۴ ہزار	سالانہ اضافہ
(۲۴)	محسن الملک میموریل فنڈ	۳۲ ہزار	یکمشت

گویا بصورت نقد چھ لاکھ سے زیادہ روپیہ وصول ہوا، اعانت دوامی کی مد میں ۱۰۸۰ر سالانہ مقرر ہوا، اور صمہ ۱۸ر سالانہ کی موقوفہ جائداد حاصل ہوئی، یہ تمام رقوم علاوہ اس مستقل و معین عطیات اور ذرائع آمدنی کے ہیں جو ان کے عہد میں بھی بدستور موجود تھے، ان اعداد سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کا عہد مالی حیثیت سے ناکامیاب نہیں۔

چندہ مسلم یونیورسٹی

ان عطیات کے علاوہ جو کالج کو حاصل ہوئے، ان کے عہد میں مسلم یونیورسٹی کو جولائی سنہ ۱۹۱۲ء تک مسلم یونیورسٹی فنڈ میں ۲۶ لاکھ ۸۱ہزار ۵ وصول ہوئے، اور اس کے علاوہ جو روپیہ پراونشل کمیٹیوں کی تحویل میں تھا، اس کی تعداد ۔۔۔ تھی، یہ رقوم اگرچہ براہ راست کالج کے لیے نہ تھیں لیکن درحقیقت کالج ہی کو ترقی دے کر یونیورسٹی بنانے کے لیے تھیں، اور ظاہر ہے کہ عہد برطانیہ کی تاریخ ہند میں یہ پہلا موقع تھا کہ خالص تعلیمی اغراض کے لیے مسلمانوں نے اس قدر روپیہ فراہم کر دیا۔



آمدنی و خرچ

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ نواب وقار الملک کے عہد میں کالج کا خرچ بہت بڑھ گیا لیکن یہ تو قدرتی بات تھی جیسے جیسے کام کا دائرہ وسیع ہوتا گیا خرچ بھی بڑھتا گیا، اور کالج کی روز افزوں ترقی اور ناگزیر ضروریات کی حالت میں یہی ہونا بھی چاہیئے تھا، چنانچہ خود نواب وقار الملک نے ۳ ستمبر سنہ ۱۹۰۸ء کو فنانس کمیٹی میں اپنے زمانہ کا پہلا بجٹ پیش کرتے وقت جن خیالات کا اظہار کیا،

اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس معاملہ کے متعلق اُن کا کیا اصول تھا، اُنھوں نے سلسلہ تقریر میں کہا:۔

"ہماری حالت صرف اُس شخص کی سی نہیں ہے جس کو اپنے اخراجات اپنی آمدنی کی حد کے اندر محدود رکھنے چاہییے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ یا تو کالج کی روز افزوں ترقی کو ہمیں روک دینا چاہیے اور یا اس کے مناسب ضروریات کو بہم پہنچانا چاہیے، اور اس طرح پر جس قدر کمی داخل ہیں رہے، اُس کے واسطے جو تدبیر بھی مناسب ہو وہ اختیار کی جائے بھیک مانگنے کی ضرورت ہو تو بھیک مانگی جائے، لیکن ضروریات کو کسی نہ کسی طرح پورا کرنا ہوگا،

آپ سب واقف ہیں کہ نواب محسن الملک مرحوم و مغفور کے وقت میں مرحوم مغفور پر اکثر یہ اعتراض ہوتا تھا کہ وہ اخراجات کو بہت بڑھاتے جاتے ہیں، لیکن مجھکو اندیشہ ہے کہ میرے زمانہ کا یہ پہلا ہی بجٹ دیکھ کر جس میں باوجود آمدنی کم ہونے کے میں نے بعض جدید اخراجات بھی قایم کیئے ہیں اور بعض میں اضافوں کی سفارش کی ہے ٹرسٹی صاحبان کو "رحمت بر بناش اول" نہ کہنا پڑے، لیکن میں نے اصلی ضرورت کا خیال رکھا ہے دوسری طرف میں آمدنی بڑھانے کی کوشش سے بھی غافل نہیں رہا ہوں"۔

بے شبہ اُنھوں نے ابتدا ہی سے آمدنی بڑھانے کی کوشش کی اور اس میں کامیابی بھی ہوئی لیکن جب آغاز ۱۹۱۱ء سے مسلم یونیورسٹی کے لیئے چندہ کی تحریک ہوئی، تو کالج کے عام اور غیر معین چندے قریباً بند ہو گئے اور لوگوں نے جو کچھ دیا یونیورسٹی کو دیا، تاہم کالج روز افزوں ترقی کرتا رہا، اور اُس کو ایسی مالی مشکلات پیش نہیں آئیں جو لاینحل ہوں۔

نماز کی تاکید اور مذہبی تعلیم کا خاص خیال

نواب وقار الملک نے مذہب کی آغوش میں تربیت پائی تھی، اس بنا پر مذہب کی عظمت اور مذہبی احکام کی پابندی مدۃ العمر اُن کا نصب العین رہا،

کالج کے طلبہ کے متعلق بھی ابتدا سے وہ نماز اور جملہ مذہبی احکام کی پابندی ضروری سمجھتے تھے سرسید کے زمانہ میں جب کہ ایک دفعہ بورڈنگ کی نگرانی اُن کے متعلق کی گئی تو انھوں نے ان چیزوں کا خاص طور پر لحاظ رکھا، اس کے بعد جب آنریری سکریٹری ہوئے تو بھی جہاں تک اُن سے ممکن ہوا طلبہ کی اصلاح اور اُن کی مذہبی تعلیم و تربیت کے لیے کوشش کی اور باوجود اپنی نرم مزاجی کے اس معاملہ میں کسی قسم کی مروت یا مداہنت کو جائز نہیں رکھا، جب کبھی وہ نماز یا مذہبی احکام کی پابندی کے متعلق طلبہ کو نصیحت کرتے تھے یا کچھ لکھتے تھے تو اُن کے ایک ایک لفظ سے جوش مذہبی اور دل سوزی کا پتہ چلتا تھا۔

ایک دفعہ اُنھوں نے طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ :۔

آج یہاں آنے سے میری غرض آپ لوگوں سے کچھ کہنے کی ہے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ نماز کے متعلق کچھ آپ لوگوں سے کہوں، نماز کی خوبی، اُس کا وجوب، اُس سے اخلاق حسنہ کی اصلاح اور تقویت کا بیان کرنا اس وقت مقصود نہیں یہ کام جناب مولوی صاحب[1] قبلہ اور ہمارے مولٰنا[2] کا ہے۔

یہ دونوں صاحب مجھ سے زیادہ عمدہ اور انسب طریقہ سے آپ کو بتا سکتے ہیں لیکن یہ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس امر کی نگہبانی کہاں تک میری اپنی ذمہ داریوں میں سے مہتم بالشان ہے، آپ یہاں کس غرض سے آتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ تعلیم اخلاق کی اصلاح، اور آداب حاصل کرنے کے لیے، میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کی توجہ اُمور دینی کی طرف مائل کروں، میں کسی خاص شخص سے نہیں کہتا بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ آپ میں سے ہر ایک اپنے کو مخاطب سمجھے میں یہ جانتا ہوں کہ آپ میں سے ایک معقول تعداد روزہ نماز کی پابند ہے، اور اُمید کرتا ہوں کہ آپ ایسے ہی ہونگے، لیکن یہ معلوم کرکے مجھے افسوس ہوا ہے کہ کچھ لوگ مسجد میں شریک نماز

---

[1] مولوی عباس حسین صاحب [2] مولوی عبداللہ صاحب انصاری

نہیں ہوتے، حقیقت میں یہ بات قابل افسوس ہے، آپ جانتے ہیں کہ زمانہ تغیر پذیر ہے، پرانوں کی جگہ نئے آتے ہیں، قومی عمارت کے پرانے ستون رخصت ہوتے جاتے ہیں اور اب یہ بار آپ کو اپنے کاندھوں پر اٹھانا پڑیگا، یہ زمانہ آپ کی تحصیل کا ہی وہ زمانہ ہے کہ آپ اس آئندہ وقت کے لیئے تیار ہوں، کوشش کیجیے اور سخت کوشش کہ آپ مسلمانوں کے لیئے اعلیٰ درجہ کا نمونہ ہوں، وہ روش اختیار کیجیے ایسے پاک و صاف مذہبی طریقہ پر چلیئے کہ مسلمان آپ پر پورا بھروسہ رکھیں، حقیقت میں آپ کسی طرح قومی لیڈر نہیں ہو سکتے اگر اسلامی شعار کے آپ پابند نہیں ہیں یہ لال لال ٹوپیاں یہ کالے کالے کوٹ پبلک جلسوں میں کانفرنس کے پنڈال میں تو بہت دکھائی دیں، اور کس قدر جائے افسوس ہے کہ اُن کی تعداد مسجد میں کم ہو، الفرض! اکی پُکار تو بہت ہے لیکن سب سے مقدم جو فرض مسجد کا ہے وہی نہوا تو سب ہیچ ہے۔

ایک بات میں اور کہنا چاہتا ہوں کہ جرمانہ کا جو قاعدہ غیر حاضری نماز پر تھا میں نے اُس کو منسوخ کر دیا، اکثر لوگ معترض ہیں کہ جرمانہ کا ایک ڈر تھا اب وہ بھی نہ رہا، فی الحقیقت یہ اعتراض بہت درست ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح نماز کا ایک استہزا ہوتا ہے، مگر یہ نہ خیال کرنا چاہیئے کہ غیر حاضری مسجد کے لئے اب کوئی سزا نہیں ہے، سزا ہے! اور وہ یہ ہے کہ جو صاحب حاضر مسجد نہونگے اور پابند نماز نہونگے اُن کو کالج سے علیحدہ ہو جانا پڑیگا، میں اسے کسی طرح جائز نہیں رکھتا کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کرے۔"

ایک اور موقع پر اُنھوں نے نماز کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کیئے ہیں قاری سرفراز حسین دہلوی نے جو کالج کے اولڈ بوائے بھی ہیں ستمبر ۱۹۰۸ء میں ایک مضمون شائع کیا، جس کا عنوان تھا "اسلام انگریزی خواں مسلمانوں میں" نواب صاحب نے اس مضمون کے ایک فقرہ پر ایک نوٹ لکھا

جو اگرچہ کسی قدر طویل ہی تاہم آج بھی ایسا ہی ضروری اور مفید ہی جیسا کہ پہلے تھا:۔

قاری سرفراز حسین نے لکھا تھا کہ:۔

"اگر فقرائے کاملین اور علمائے شرع متین کا ساز ہد و تقویٰ اور پابندی صوم و صلوٰۃ ہم میں نہیں ہی تو خدا کے سامنے تھوڑا بہت سُرخ رُو ہونے کا ذریعہ ہمارے پاس یہ ہی کہ ہم قومی (سلک) نیک کاموں کی بُنیاد ڈال رہے ہیں اور انکی تکمیل کی کوشش کرتے ہیں، عُرسوں میں ہم شریک نہیں ہوتے تو کانفرنسوں میں تو جاتے ہیں۔"

نواب صاحب اس کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"عدم پابندی صوم و صلوٰۃ کی جو معذرت انگریزی خواں طلبہ کی طرف سے قاری صاحب نے فرمائی ہی وہ جناب ممدوح کے لیئے مکرر غور کے قابل ہی، فرائض کا بدل نوافل سے نہیں ہو سکتا، نماز روزہ اور دیگر فرائض جو اسلام نے مسلمانوں پر عاید کیئے ہیں انکو تو ادا ہی کرنا چاہیئے، وہ ایسی چیز نہیں ہی جس کا کسی قیمت سے کچھ بدل ہو سکے۔ اس کے ترک سے جو نفرت عام مسلمانوں کے دل میں ان انگریزی خواں نوجوانوں کی طرف سے پیدا ہوتی ہی اُس کا الزام خود ان نوجوانوں پر ہی۔ نماز کا وقت آگیا ہی اور مسلمان نماز پڑھنے کے لیئے کھڑے ہوئے ہیں اور نماز کے وقت میں زیادہ گنجایش نہیں ہی، مثلاً نماز مغرب کا وقت ہی اور ہمارے یہ نوجوان جنٹلمین جنکو خدا اچھے خاصی طرح بدستور کرسیوں پر ڈٹے ہوئے سگار سگرٹ سے شوق فرما رہے ہیں، یا چہل قدمی کر رہے ہیں اُن کی اس حرکت سے جو رنج، اور غم و غصہ مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہی وہ ایک فطری امر ہی اور خدا نہ کرے کہ مسلمانوں کی مذہبی فیلنگ ایسی سرد پڑ جائے کہ اُن کو ایسی باتوں کا احساس ہی نہ رہے۔

میری غیبت میں ایک صاحب ایک قومی چندہ کی غرض سے میرے وطن امروہہ کو تشریف لے گئے تھے، اور ایک صاحب نے اُن سے چندہ دینے کا وعدہ کیا تھا اُس کی یاد دہانی کے لیے جب صاحب موصوف اُن کے پاس تشریف لے گئے تو اُس وقت مغرب کا وقت آگیا تھا، سب لوگوں نے مغرب کی نماز پڑھی لیکن ہمارے وکیل قوم ٹس سے مس نہ ہوئے نماز سے فارغ ہونے کے بعد جب اُن صاحب خانہ سے چندہ کی یاد دہانی کی گئی تو اُنھوں نے صاف انکار کر دیا، ایک بہت معتبر اور معزز شخص مجھ سے اس روایت کے ناقل تھے اور کہتے تھے کہ میں اس چندہ میں ساعی ہوا تھا لیکن محصل چندہ کی اس حرکت سے مجکو بھی سخت ندامت برداشت کرنی پڑی، آخر میں نے اُن کو سمجھایا کہ آپ تو اس قومی کام کے لیے چندہ دیتے ہیں نہ کہ ان محصل صاحب کو، مگر اُن کی نفرت کم نہوئی، اور آخر بمشکل اُن سے دو روپیہ وصول کیئے گئے، جس کے معنی یہ تھے کہ گویا میری ذات کو اُنھوں نے دو روپیہ دئیے نہ کہ قومی کام میں، اور وہی امروہہ تھا جہاں اُسی قریب زمانہ میں اٹاوہ اسلامیہ ہائی اسکول کے طلبہ کا ڈپوٹیشن آیا اور ساٹھ روپیہ کے قریب آسانی سے وصول کر کے لے گیا، اور لوگ اُن کی پابندی نماز وغیرہ سے خوش ہوئے۔

تھوڑے ہی دنوں کے بعد میں نے اُن وکیل قوم کا ایک نوٹ ایک اخبار میں پڑھا جس میں اُنھوں نے اہل امروہہ و مرادآباد اور رامپور و بریلی کی بے توجہی کی شکایت کی ہے کہ وہ قومی کاموں میں دلچسپی نہیں لیتے، لیکن کیا خاک کوئی دلچسپی لے جب کہ آپ حضرات ہی دلچسپی نہیں لینے دیتے، اور اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اب تک جو ہماری قوم، قومی کاموں میں دلچسپی لینے سے قاصر رہی ہے وہ زیادہ تر اسی قسم کی غلطیوں کا نتیجہ ہے ورنہ جناب سرسید احمد خاں مرحوم و مغفور نے جیسے عمدہ کام کی بنیاد ڈالی تھی اور جو بے ریا دلسوزی

مرحوم و مغفور نے اس میں ظاہر کی تھی اس کے لحاظ سے چاہیئے تھا کہ قوم کامل دلچسپی کے ساتھ اُس میں مدد کرتی، لیکن افسوس کہ ایسے مفید کام میں اکثر سعی کرنے والوں کو جب لوگوں نے نماز، روزہ سے بے پروا پایا تو قوم کا دل اُن سے رک گیا' اور جو کامیابی ہونی چاہیئے تھی اُس کا سواں حصہ بھی نہ ہوئی' اور آج بھی جو مشکل بحیثیت آنریری سکرٹری کالج، قوم کو متوجہ کرنے میں پیش آئی ہے وہ زیادہ تر اپنے کالج کے نوجوان طلبہ کی طرف سے ہے جن کو میں کامل اطمینان کے ساتھ کالج کے بہترین نمونہ کے طور پر قوم کے سامنے پیش کرنے سے قاصر بلکہ شرمندہ ہوں لعل اللہ یحدث بعد ذٰلک امرا۔

قوم کو الزام دینا بہت آسان ہے اور الزامی جوابوں سے ہر کوئی اپنا دل خوش کر سکتا ہے، لیکن کسی وقت تو ہم کو اپنی غلطیوں پر بھی غور کرنا چاہیئے' ان نوجوانوں میں سے اگر کسی نے درحقیقت یہ سمجھ لیا ہے کہ نماز، روزہ میں جو غفلت ہوتی ہے اُس کے مواخذہ میں خدا کے سامنے تھوڑا بہت سرخرو ہونے کا ذریعہ ہمارے پاس یہ ہے کہ ہم قومی نیک کاموں کی بنیاد ڈال رہے ہیں تو وہ حضرات یقین رکھیں کہ یہ محض ایک شیطانی وسوسہ ہے، اور اس سے توبہ کریں اور خداوند تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہیں' وہ ارحم الراحمین ہے' اُس کی رحمت وسیع ہے مگر اسکو سبق نہ پڑھائیں وہ تمہارے ان بے ہودہ سبقوں کا محتاج نہیں ہے وہ اپنی مصلحتوں کو آپ ہی خوب جانتا ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے زیادہ آپ حضرات قومی نیک کاموں کی بنیادیں قایم کرنے والے نہیں ہیں' کس کو اُن میں سے اس کے معاوضہ میں نماز معاف ہوئی تھی' جس قدر معافیاں نماز میں ہو سکتی تھیں وہ شرع میں خود موجود ہیں' اگر وضو میں اندیشۂ ضرر ہے تیمم کر لو، اگر پانی میسر نہیں تو تیمم کر لو' کھڑے نہیں ہو سکتے

تو بیٹھ کر پڑھو، بیٹھ نہیں سکتے تو لیٹ کر پڑھ لو، پڑھ نہیں سکتے تو اشاروں سے ادا کر لو، مگر ادا ضرور کرو، اور جب بالکل ہوش نہ رہے تو اس وقت تم پر کوئی تکلیف نہیں، لیکن آپ تو اپنے آپ کو دنیا بھر سے زیادہ ہوشیار سمجھنے پر بھی نماز روزہ سے پہلو تہی کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمان آپ کو عزیز رکھیں ؎

این خیال ست و محال ست و جنوں

آپ کیا مسلمانوں کو درست کرینگے، پہلے اپنے آپ کو درست کرلو، ڈیوٹی پر آپ جان دیتے ہیں لیکن فرض کے معنی بھی تو ڈیوٹی ہی کے ہیں، فاین تذھبون۔"

اس مضمون سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ احکام شریعت کی پابندی وہ کس قدر ضروری سمجھتے تھے، لہذا اُنھوں نے اپنے عہد میں اس کا خاص اہتمام کیا، پہلے نماز میں صرف تین وقت کی حاضری لی جاتی تھی لیکن اُنھوں نے پانچوں وقت کی حاضری لازم کردی جو بعض طلبہ کو گراں گزری، چنانچہ مسٹر آرچبولڈ پرنسپل نے ٹرسٹیوں کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۰۸ء میں ٹرسٹیوں کو اس معاملہ کی طرف متوجہ کیا اور کہا کہ :-

"اب تک طلبہ کو تین وقتوں (یعنی ظہر و عصر و مغرب) کی نماز میں حاضر ہونا اور جماعت سے نماز ادا کرنا لازم ہے لیکن موجودہ آنریری سکرٹری بجائے تین وقتوں کے پانچ وقت کی حاضری لازم قرار دیتے ہیں (یعنی صبح و عشاء بھی) اور میں سمجھتا ہوں کہ طلبہ کو اس میں تکلیف ہوگی اور وہ عذر کرینگے"

لیکن پرنسپل کو اجلاس نے بتایا کہ :-

"مذہب اسلام کے مطابق مسلمان طلبہ پر پانچوں وقت کی نماز فرض ہے اور طلبہ کو اس میں عذر کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے"

"مسجد یا دوسرے جو مواقع نماز کے لئے تجویز کئے گئے ہوں وہاں حاضر ہو کر نماز ادا کرنا ضرور ہے"

اس پر پرنسپل صاحب کو اطمینان ہو گیا، اور نواب وقار الملک نے اپنی تجویز کے مطابق نماز کا انتظام جاری رکھا، جو انتظام اُنھوں کیا تھا اُس کو خود رپورٹ ترقی تعلیم میں اس طرح بیان کیا ہے:-

چونکہ تمام بورڈنگ ہوسوں کے طالب علموں کو کالج کی مسجد میں آ کر
ایک جگہ نماز ادا کرنا دشوار تھا، اس لیے ہر بورڈنگ ہاؤس میں
ایک کمرہ خاص نماز پڑھنے کے لیئے علٰحدہ کر دیا گیا ہے، اور ایک
ایک مؤذن اور پیش امام بھی مقرر کیا گیا ہے، اور کالج کے جو بورڈنگ
ہاؤس مسجد کے قریب تھے اُن کے طلبہ مسجد میں نماز پڑھتے
ہیں اور موجودہ آنریری سکرٹری کے وقت میں بجاے تین وقت
کے اب پانچوں وقت نماز کے اوقات میں طلبہ کی حاضری لی جاتی
ہے، اور پانچوں وقت اُن کا نماز میں حاضر ہونا لازم کر دیا گیا ہے۔

نماز کے علاوہ اُنھوں نے دینیات کی تعلیم کی طرف بھی خاص توجہ کی اور اُس میں کامیابی کو لازم قرار دیا، لیکن باوجود اس کے اُن کو کالج کی مذہبی حالت پر اطمینان نہ تھا، اور وہ اپنی مسلمہ راست بازی کی وجہ سے کبھی پبلک کو یہ باور کرانا پسند نہیں کرتے تھے کہ کالج کی مذہبی حالت قابل اطمینان ہے۔

چنانچہ ایک موقع پر ۲۰ اپریل ۱۹۱۰ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں دینیات کے نصاب تعلیم پر بحث کرتے ہوئے اُنھوں نے صاف لکھ دیا:-

"در حقیقت میں خود اپنے آپ کالج کی مذہبی تعلیم و تربیت
کی طرف سے ابھی تک مطمئن نہیں ہوں اور موجودہ حالت میں اُس پر
اطمینان ظاہر کرنا پبلک کو دھوکا دینا ہے۔"

"میں مقر ہوں کہ نصاب تعلیم دینیات کالج کافی نہیں ہے اور
بہت کچھ ناکافی ہے"



نواب وقار الملک کا عہدہ آنریری سکرٹری سے استعفا

نواب وقار الملک نے جب کالج کے آنریری سکرٹری کا عہدہ قبول کیا تو اُس وقت اُن کی عمر قریباً ۷۰ سال کی تھی، اور اُن کو کام کرتے اور پرمشقت زندگی بسر کرتے ہوئے نصف صدی ہو چکی تھی، ضرورت تھی کہ پچاس برس کی مسلسل محنت کے بعد اب وہ آرام کریں اور امن وعافیت کے ساتھ اپنے وطن اور کنبہ میں زندگی بسر کریں لیکن ہماری قوم میں قحط الرجال ہی۔ اس لئے جب نواب محسن الملک کی وفات کے بعد قرعۂ فال اُن کے نام نکلا تو از سرِ نو کمر بستہ ہو کر خدمت کے لئے حاضر ہو گئے، وہ خود کہتے ہیں۔

"میرے لئے کام کرنے کا وقت درحقیقت گزر چکا ہی، عمر انحطاط پر ہے قویٰ کمزور ہو گئے ہیں اور بعض عوارض بھی لاحق ہیں، میرا وقت مکان پر رہنے اور آرام و استراحت کرنے کا ہی، مگر میرے عذرات کی سماعت، میرے دوستوں اور بزرگوں نے نہیں فرمائی اور انھوں نے مجھکو مجبور کیا کہ میں اس ذمہ داری کے عظیم الشان کام کو قبول کروں، مجبوراً میں نے اس بوجھ کو اپنے کندھوں پر اٹھایا۔"

کالج کے آنریری سکرٹری کا عہدہ محض اعزازی عہدہ نہیں، بلکہ کام بھی کرنا پڑتا ہی، خصوصاً جو شخص نواب وقار الملک کی طرح کام کا خوگر اور فرض شناس ہو اُس کے کام کا کون اندازہ کر سکتا ہی۔ بہرحال انھوں نے قریباً ۳ سال تک اس جوش اس انہماک کے ساتھ کام کیا کہ اُن کی صحت پر خوفناک اثر پڑا لہذا ۱۹۱۰ء کے وسط میں جب اُن کے عہد کی مدت ختم ہونے میں صرف چند ماہ رہ گئے تھے انھوں نے بعض احباب سے تذکرہ کیا کہ اب آیندہ کسی اور شخص کا انتخاب میری جگہہ پر کیا جائے، اور یہ چاہا کہ اپنے اس ارادہ کو پبلک میں مشتہر کر دیں، لیکن احباب مانع آئے، مگر اخبارات میں کسی طرح یہ خبر مشتہر ہو گئی

کہ نواب صاحب ۶ مہینے بعد استعفا دینے والے ہیں، اس خبر کے مشتہر ہوتے ہی طرح طرح کی خیال آرائیاں شروع ہوئیں بدگمانیاں پھیلیں، بعض اشخاص یہ سمجھے کہ شاید کسی اندرونی اختلاف یا نارضامندی کی بنا پر دستکش ہونا چاہتے ہیں، ان خیالات کا ملک پر برا اثر پڑا، لہذا نواب صاحب نے یہ ارادہ کرلیا کہ اصلی واقعات پبلک پر ظاہر کردیں چنانچہ انھوں نے ۶ ستمبر کو ایک مضمون شایع کیا، جس میں تفصیل کے ساتھ اپنی صحت کی خرابیاں اور مجبوریاں بیان کیں اور بتایا کہ میرا سن اب ۷۱ سال سے زیادہ کا ہے جو ایسے اہم فرائض ادا کرنے کے لئے موزوں نہیں ہے، اسی سلسلہ میں لکھا۔

"پہلے کی بہ نسبت اب میں چھ گھنٹہ مستقل کام کرنے کے بعد ہی تھک جاتا ہوں اور بھی بعض تکلیفیں محسوس ہوتی ہیں اور زیادہ کام کرنے کو جی نہیں چاہتا، لیکن عہدہ کے فرایض اُس وقت بھی کمربستہ ہونے پر مجبور کرتے ہیں جب کہ میں تھک کر آرام کی تلاش میں پلنگ پر لیٹا ہوتا ہوں، اور یہ قوانین قدرت کا مقابلہ ہے، جس میں کسی کو بھی کامیابی نہیں ہوتی ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے یہ بیان کیا کہ میں نے یہ تمام مجبوریاں خان بہادر نواب محمد مزمل اللہ خاں صاحب جائنٹ سکرٹری سے بیان کیں اور طویل بحث و گفتگو کے بعد

"آخر الامر نواب جائنٹ سکرٹری صاحب نے مفصلہ ذیل باتوں پر اپنی رضامندی ظاہر فرمائی ہے۔

(الف) بہ استثنائے ایسے کسی کام کے جس کو میں خود ضروری سمجھکر اپنی فرصت کے لحاظ سے انجام دوں تمام کام جائنٹ سکرٹری صاحب کے سامنے پیش ہوں اور وہ اُس میں جس کو آنریری سکرٹری کے سامنے پیش کرنا مناسب سمجھیں پیش کریں اور باقی کاموں کو خود انجام دیں۔

(ب) کالج کے متعلق تمام جلسوں اور کمیٹیوں میں جہاں آنریری سکرٹری کی شرکت ضرور یا مناسب ہے آنریری سکرٹری کی طرف سے وہ شریک ہوں گے

اور جن جلسوں میں آنریری سکرٹری بھی شریک ہوسکے اُن میں بھی جائز ہوگا کہ سکرٹری کی خدمت کو جناب ممدوح ہی انجام دیں۔

(ج) ذاتی ضروریات یا کالج کی ضروریات کے لحاظ سے جب مجھ کو ضرورت ہو میں باہر جاسکوں اور نواب جائنٹ سکرٹری کام کرتے رہیں۔

(د) کمیٹیوں اور جلسوں کا انتظام اور انتظام قیام مہمانان بھی نواب جائنٹ سکرٹری بہادر اپنے ہی متعلق رکھیں گے۔

(ہ) دفتری کاروبار کی جس قدر ذمہ داری ہے وہ سب نواب جائنٹ سکرٹری صاحب سے متعلق رہے گی مشتاق حسین اُس کا ذمہ دار نہ ہوگا۔

مذکورۂ بالا طریقہ میں ذمہ داریوں سے بری رہنے کے بعد اگر قوم مجھ سے کالج میں کام لینا چاہتی ہے تو میں نہایت خوشی سے خدمت گزاری کے لئے حاضر ہوں بلکہ اُس وقت کالج کے متعلق اہم منصوبوں کے سوچنے اور اسکیمیں تیار کرنے کے واسطے مجھکو زیادہ وقت مل جائے گا، جس کے لئے اب تک وقت نہیں ملتا تھا"

اس کے بعد انھوں نے بتایا ہی کہ اس طریقہ کار کا تجربہ کیا جارہا ہی اور چند مہینہ کے تجربہ کے بعد ٹرسٹیوں کے سامنے قطعی تصفیہ کے لئے پیش ہوسکے گا، ان تمام واقعات کے بیان کرنے کے بعد مضمون کا خاتمہ حسب ذیل الفاظ پر کیا ہی۔

اس غرض سے کہ میرے اس مضمون سے کسی قسم کی غلط فہمی واقع نہو مجھ کو بیان کردینا ضروری ہی کہ قوم آیندہ آنریری سکرٹری کے عہدہ کے واسطے کسی تازہ دم اور انگریزی خواں ٹرسٹی کو منتخب کرے تاکہ باری باری سے لوگ چند چند سال تک اس قومی خدمت کو انجام دے کر چلتے ہاتھ پاؤں اس نہایت درجہ محنت کے کام سے سبکدوش ہوسکا کریں کالج کو آنریری سکرٹریوں کا مقررہ

بنانا کچھ ضرور نہیں ہی، مع ہذا جب کوئی شخص زیادہ عرصہ تک کام کر چکتا ہی تو جدید اصلاحوں کی اُمنگ بھی اُس میں باقی نہیں رہتی یا کم ہو جاتی ہی لہذا جہاں تک ممکن ہو آیندہ انتخاب میں نئے شخص کا تقرر مناسب ہو گا۔

ورنہ اشخاص خاص کے لئے خاص خاص دفعات کا قانون میں داخل کرنا قوم پر ایک دھبہ ہی کہ اس قدر عرصہ تک تعلیمی جدوجہد کے بعد بھی قوم میں اس درجہ قحط الرجال ہی، حالاں کہ بلحاظ قابلیت اور ضروری ثروت کے قحط الرجال نہیں ہی۔"

اس مضمون کے شائع ہونے کے بعد ۸ ستمبر ۱۹۱۱ء کو ٹرسیٹوں کا اجلاس بجٹ میٹنگ منعقد ہوا، اور ٹرسیٹوں نے نواب صاحب سے باصرار درخواست کی کہ عہدہ سکرٹری شپ دوبارہ تین سال کے لئے قبول فرمائیں، اسی جلسہ میں ٹرسیٹوں نے آیندہ سالانہ اجلاس کیلئے ایک رزولیوشن مُرتب کیا اور سب نے اس پر دستخط کئے، یہ رزولیوشن حسب ذیل ہی۔

"بہ لحاظ اُن مسلسل خدمات قومی کے جو باوجود پیرانہ سالی وہجوم امراض و تفکرات اور تکالیف قلبی و مشکلات کے نواب مشتاق حسین وقار الملک بہادر بعہدہ آنریری سکرٹری ٹرسٹیان گزشتہ تین سال میں انجام فرماتے رہے ہیں، اور بہ لحاظ اُس ترقی کے جو اس عرصہ میں کالج کے اندرونی انتظامات میں نمایاں طور پر ہوتی رہی ہی اور بلحاظ اس بے نظیر اعتماد کے جو تمام مسلمانان ہند کو جناب ممدوح کی دین داری، استقلال، تدبر، راستبازی و آزادہ روی اور صلح پسندی پر مسلسل رہا ہی ٹرسٹیان مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ کی رائے ہی کہ حضور ممدوح باوجود اپنی مشکلات اور تکالیف کے ٹرسٹیان مدرسۃ العلوم کا آنریری سکرٹری آیندہ تین سال کی مزید میعاد کے واسطے رہنا منظور فرما کر قوم اور ٹرسٹیان کو ممنون و مشکور فرمائیں۔"

بجٹ میٹنگ کے چند ماہ بعد ۱۳ جنوری ۱۹۱۱ء کو ٹرسیٹوں کا سالانہ اجلاس منعقد ہونے والا تھا، قاعدہ کے مطابق یہ رزولیوشن بھی منظوری کے لئے ایجنڈے میں رکھا گیا، لیکن نواب صاحب نے اس پر ایک طویل نوٹ بطور کیفیت لکھا، جس کے چند فقرے ہم نقل کرتے ہیں وہ اس رزولیوشن پر اظہار شکر گزاری کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"میں ٹرسٹی صاحبان کا اُن کی اس مہربانی اور حسن ظن کے لحاظ سے جس قدر شکریہ ادا کروں کم ہی اور میں اس یقین دلانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ اگر میں موجودہ سہ سالہ کے اختتام کے بعد بھی آنریری سکرٹری کے عہدہ کی ذمہ داری کو برداشت کر سکتا تو قوم کی اس قدر افزائی کے مقابلہ میں اُس سے انکار کرنے کو کفران نعمت سمجھتا اور ہرگز اُس سے پہلو تہی نہ کرتا لیکن افسوس ہی کہ واقعات اور حالات اب اس کی مطلق اجازت نہیں دیتے"

اس کے بعد انھوں نے شملہ جا کر بیمار پڑ جانے اور وہاں سے آکر پھر مسلسل بیمار رہنے کا ذکر کیا ہی اور ذاتی کاروبار میں نواب محمد مزمل اللہ خاں کی مصروفیت کا ذکر کرکے لکھا ہی۔

"لیکن افسوس ہی کہ قدرت کے زبردست ہاتھ نے اس ورق کو اُلٹ کر یہ ثابت کر دیا کہ ہم لوگوں نے جو تجویز کام چلانے کی کی تھی وہ کافی نہ تھی۔ جو انتظام دوستوں کے مشورہ سے تجویز کیا تھا اس کو قدرت نے حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہی، قدرت نے بتلا دیا ہے کہ اس وقت جس قسم کی بیماری اور دشواری مجھکو پیش آئی، یہ آیندہ بھی پیش آسکتی ہی۔

اس قسم کا کوئی عارضی انتظام جیسا کہ تجویز کیا گیا تھا، ایک ایسے بڑے انسٹی ٹیوشن کے متعلق (جیسا کہ خدا کے فضل سے کالج ہی) کوئی مآل اندیشی کا کام نہیں ہی اور اب ہر طرح ضرورت ہی کہ جو کوئی انتظام بھی آیندہ کے واسطے کیا جائے وہ ایسا ہو جو مستقل و مکمل طور پر قابل عمل ہو، یا دوسرے لفظوں

ہیں یہ کہ کسی دوسرے شخص کا انتخاب عہدہ آنریری سکرٹری کے واسطے

کیا جائے۔"

غرض ۳۱ جنوری ۱۹۱۱ء کو ٹرسٹیوں کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا، سب نے بالاتفاق نہایت اصرار کے ساتھ نواب وقار الملک کے آیندہ ۳ سال کے لئے آنریری سکرٹری کا عہدہ قبول کرنے کے لئے عرض کیا، جس کو مجبوراً انھوں نے منظور فرمایا۔ چنانچہ حسب ذیل رزولیوشن پاس ہو۔

"نواب وقار الملک وقار الدولہ مولوی مشتاق حسین صاحب انتصار جنگ

بہادر آیندہ تین سال کے لئے ابتدائے یکم فروری ۱۹۱۱ء لغایت ۳۱ جنوری

۱۹۱۴ء عہدہ آنریری سکرٹری مدرسۃ العلوم پر مقرر کئے جاتے ہیں۔"

اگرچہ نواب وقار الملک دوبارہ اس عہدہ پر مقرر کر دیئے گئے مگر یہ سب کو معلوم تھا کہ وہ بوجہ علالت و پیرانہ سالی زیادہ کام نہیں کر سکتے، لیکن قانون میں اس قسم کا کوئی قاعدہ نہ تھا کہ وہ اپنے فرایض منصبی کا کوئی حصہ دوسروں کو تقسیم کر دیں، اس لئے ٹرسٹیوں کی کثرت رائے سے دفعہ ۴۶ قانون ٹرسٹیان میں حسب ذیل اضافہ کیا گیا۔

(۱) نواب مشتاق حسین صاحب آنریری سکرٹری کو اختیار ہو گا کہ وہ جس وقت چاہیں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو کلاً یا جزواً کسی عرصہ کے واسطے جائنٹ سکرٹری کو سپرد کر دیں۔

(۲) نواب صاحب موصوف کو اختیار ہو گا کہ جائنٹ سکرٹری صاحب کے اتفاق رائے سے اپنے کاموں میں سے کسی کام کو جائنٹ سکرٹری کے علاوہ کسی اور ممبر سنڈیکیٹ کو کسی عرصہ کے واسطے سپرد کریں۔

(۳) نواب صاحب موصوف کو اختیار ہو گا کہ اپنے عہدہ کے کاموں میں سے جن کاموں کو جس وقت چاہیں خود انجام دیں، یہ انتظام بظاہر اطمینان بخش تھا، لیکن نواب وقار الملک جو ہمیشہ سے کام کے خوگر تھے محض نمایشی اور اعزازی طور پر کسی عہدہ پر رہنا نہیں چاہتے تھے اس لئے جب انھوں نے دیکھا کہ اب ان کی صحت کام کرنے کی اجازت نہیں دیتی تو قریباً

ایک سال بعد پھر علیحدگی کا قصد کیا چنانچہ جب ۱۳ جنوری ۱۹۱۲ء کے سالانہ اجلاس کا ایجنڈا شائع ہونے لگا تو انھوں نے مکرر اپنا استعفا پیش کیا، اور ایک مفصل نوٹ لکھ کر بتایا کہ

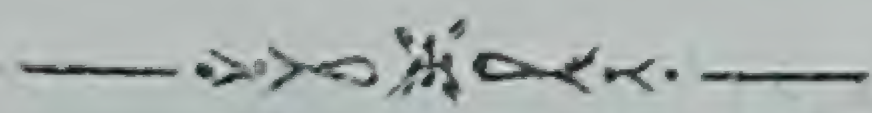
"جو حالت میری صحت کی گزشتہ سالانہ جلسہ کے زمانہ میں تھی اب اس سے بھی خراب ہوگئی ہی اور اس حالت میں ایسے عہدہ کے نہایت اہم اور نازک فرایض کا بار اپنے اوپر رکھنا میرے لئے ایک طرف بمنزلہ اقدام خودکشی کے ہی اور دوسری طرف خود عہدہ کے کاموں میں بھی اُس سے خلل واقع ہوتا ہی اور جو تجویزیں کہ گزشتہ سالانہ جلسہ میں قانونی ترمیم کے ذریعہ سے اختیار کی گئی تھیں، اور جو اختیارات دوسرے ٹرسٹی صاحبان سے کام میں مدد لینے کے لئے براہ الطاف ٹرسٹی صاحبان نے مجھکو بخشے تھے، جس کے ادائے شکریہ کے واسطے میں الفاظ نہیں پاتا، وہ تجربہ کے بعد کچھ مفید ثابت نہیں ہوئے اور اب یہ امر یقینی اور قطعی ہی کہ جب تک مکمل طور پر اس عہدہ کے تمام تر فرائض کسی خاص شخص پر نہ رکھے جائیں گے اس وقت تک کام نہ چلے گا۔"

بالفعل میں درخواست کرتا ہوں کہ ٹرسٹی صاحبان اپنے سالانہ جلسہ میں حسب ذیل ایک رزولیوشن پاس کرکے مجھکو موقع دیں کہ میں آزادی اور اطمینان کے ساتھ کچھ آرام لوں جس کا میں لگاتار چار برس کی محنت کے بعد اپنی ۷۳ سال کی موجودہ عمر میں مستحق ہو چکا ہوں۔"

اس کے بعد انھوں نے اپنی علیحدگی کے متعلق ایک رزولیوشن کا مسودہ پیش کیا۔ لیکن اس پر بھی ٹرسٹیوں کی جو رائیں آئیں وہ زیادہ تر اس رزولیوشن کے مخالف تھیں، چنانچہ آنریبل سر راجہ محمد علی محمد خان بہادر بالقابہ نے لکھا کہ

"نواب مشتاق حسین صاحب کو ہرگز سبکدوش نہ ہونا چاہیئے۔ ہم لوگ ہرگز اس

غیر محفوظ طریقہ کو پسند نہ کریں گے ہمیں نواب صاحب کی ہمدردی قومی اور
ہمت مردانہ سے اُمید ہی کہ وہ فی الحال اپنے قصد کو ملتوی رکھیں گے۔"
اور اُن کے ایک دیرینہ سال دوست خان بہادر مولوی سیّد فریدالدین صاحب نے
تو یہاں تک لکھ دیا کہ
"میں کسی طرح مستعفی ہونا نواب مشتاق حسین صاحب کا منظور نہیں کرتا،
اُن کی پیدایش ۱۲۵۷ھ کی ہی اور میری پیدایش ۱۲۴۳ھ کی ہی مجھ سے
پندرہ سال چھوٹے ہیں میرے ہوش وحواس اور صحت جسمانی درست
ہے اُن کی صحت درست نہونے کا بیان غلط ہی۔"



بہرحال ۱۴ جنوری ۱۹۱۲ء کو ٹرسٹیوں کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا، اور یہ معاملہ پیش کیا گیا اور تمام موجودہ ٹرسٹیوں نے بالاتفاق نواب وقار الملک کی عمدہ خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے، اُن سے اصرار کیا کہ وہ اپنا استعفا واپس لیں اور پریسیڈنٹ نے باشندگان علی گڑھ کا ایک خط پڑھ کر سُنایا جس میں نہایت زور مگر ادب سے نواب وقار الملک بہادر کے استعفے کی نامنظوری کی درخواست تھی اور اجازت چاہی گئی تھی کہ ڈپوٹیشن کو کوئی وقت دیا جائے کہ وہ جلسہ کے سامنے حاضر ہو، مسٹر محمد علی آکسن نے ایک پُرزور تقریر کی اور بتایا کہ اس وقت نواب صاحب کا علیحدہ ہونا مضر ہوگا دوسرے ٹرسٹیوں نے بھی یہی خیالات ظاہر کیے، آخر کار حسب ذیل رزولیوشن بالاتفاق پاس ہوا۔

(۱) خان بہادر نواب محمد مزمل اللہ خاں صاحب کا تقرر عہدہ آنریری جائنٹ سکرٹری پر تین سال کے واسطے یکم فروری ۱۹۱۲ء سے لغایت آخر جنوری ۱۹۱۵ء عمل میں آئے۔

(۲) آنریری سکرٹری بموجب مرممہ ضمن (ج) نمبر ا دفعہ ۴۶ قواعد وقوانین ٹرسٹیان کی خان بہادر محمد مزمل اللہ خاں صاحب جائنٹ سکرٹری کو اپنے عہدہ کے کاموں کو مع کل ذمہ داری ہائے عہدہ آنریری سکرٹری سُپرد کردیں اور بموجب مرممہ ضمن ۳ دفعہ ۴۶ کے اُن کو اختیار ہوگا کہ جو کام خود کرنا چاہیں خود کریں۔

اس پر آنریری سکرٹری نے کہا کہ میں جلسہ کا نہایت شکریہ ادا کرتا ہوں اور میں جلسہ کو اطلاع دیتا ہوں کہ یکم فروری ۱۹۱۲ء سے آنریری سکرٹری کے عہدہ کا کام مع تمام ذمہ داریوں کی آنریری جائنٹ سکرٹری صاحب کو سپرد کر دیا جائے گا، اگرچہ اس انتظام کے ذریعہ سے نواب وقار الملک کو تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا گیا تھا۔ لیکن بایں ہمہ اُن کو ایک حد تک کام کرنا پڑتا تھا حالاں کہ اُن کی صحت کام کرنے کی مطلق اجازت نہیں دیتی تھی، تاہم جس طرح ممکن ہوا چند ماہ تک کام کیا لیکن جب بالکل مجبور ہو گئے تو آخر کار ٹرسٹیوں کا ایک اسپیشل اجلاس ۳۱ رجولائی ۱۹۱۲ء کو طلب کیا اس موقع پر انھوں نے تمہید کے بعد ایجنڈے میں لکھا کہ

"مجھکو نواب خان بہادر صاحب ممدوح سے بے شک بہت زیادہ مدد ملی جس کا میں خاص طور پر مشکور ہوں لیکن بایں ہمہ میری صحت روز بروز زیادہ خراب ہوتی گئی اور ہوتی جا رہی ہے اور اب وہ وقت آگیا ہے، بلکہ اُس وقت کو آئے ہوئے بہت عرصہ گزر چکا ہو کہ مجھکو اب اس عہدہ کے فرائض سے کلیتہً سبکدوش ہونا چاہیئے"

اس کے علاوہ انھوں نے اسی سلسلہ میں جدید آنریری سکرٹری کے تقرر کے متعلق بھی اپنے خیالات تفصیل سے ظاہر کئے، غرض ۲۱ رجولائی ۱۹۱۲ء کو رامپور حامد ہال میں ٹرسٹیوں کا اجلاس منعقد ہوا، اور کوئی چارہ نہ دیکھکر سب نے بالاتفاق نواب صاحب کا استعفا منظور کیا چنانچہ حسب ذیل رزولیوشن پاس کیا گیا۔

"ٹرسٹیان کالج نہایت افسوس اور حسرت کے ساتھ کمال مجبوری کی حالت میں عالیجناب نواب وقار الدولہ وقار الملک انتصار جنگ مولوی حاجی محمد مشتاق حسین خاں صاحب بہادر آنریری سکرٹری کے استعفے کو جناب ممدوح کے نہایت اصرار کی وجہ سے جو جناب ممدوح نے بلحاظ اپنی ضعیف العمری اور ناتندرستی کے متعدد مرتبہ پیش فرمایا ہی منظور کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ

اللہ تعالیٰ جناب ممدوح کو دیر گاہ صحت و تندرستی کے ساتھ زندہ و سلامت رکھے تاکہ ٹرسٹیان کالج اور اور تمام قوم جناب عالی کے نہایت قیمتی اور واجب الاحترام مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں۔

اور جیسا کہ خود جناب موصوف نے وعدہ بھی فرمایا ہے ٹرسٹیان کالج توی امید رکھتے ہیں کہ عالیجناب ممدوح ہمیشہ اپنی دلی اور عمیق دلچسپی معاملات قومی اور کالج میں بدستور قایم رکھکر ٹرسٹیان اور سکرٹری کالج کی مدد اور رہنمائی فرماتے رہیں گے' اگرچہ عالیجناب ممدوح کی مدّت العمر کی قومی خدمات' اور خدمات کالج کیا بحیثیت ٹرسٹی اور کیا بحیثیت آنریری سکرٹری ایسی عظیم الشان اور غیر محدود ہیں کہ اُس کی شکر گزاری ہماری قوت امکانیہ سے بالاتر اور عالیجناب موصوف کی ذات ایسی تعریفوں اور شکر گزاریوں سے بالاتر و برتر ہے لیکن ہم اس امر کو اپنا فرض محسوس کرتے ہیں کہ اس موقع پر حضور ممدوح کی شکر گزاری خدمات قومی کو تمام ٹرسٹیان کالج و تمام مسلمان قوم کی طرف سے بکمال ادب ادا کریں اور اس واقعہ کو قلمبند کر کے اپنا فرض ادا کریں اور یہ بھی تحریر کریں کہ کالج کو جس درجہ پر ہر اعتبار سے ترقی اور اعتماد عام کی حالت میں جناب ممدوح نے اس وقت چھوڑا ہے وہ اُس سے بدرجہا زیادہ ہے جب کہ جناب ممدوح نے اس کا چارج بحیثیت آنریری سکرٹری لیا تھا''

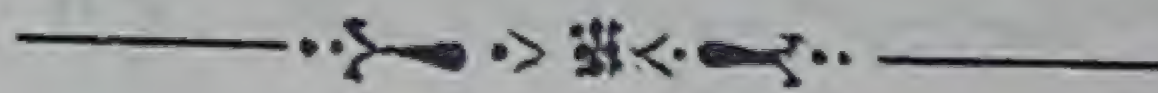


وزیرٹشپ کالج سے علحدہ ہونے کے بعد اگرچہ نواب وقار الملک کی صحت اور زیادہ ابتر ہو گئی تھی' تاہم جہاں تک اُن سے بن آتا تھا وہ بحیثیت ٹرسٹی کالج کی کچھ نہ کچھ خدمت انجام دیتے رہتے تھے بلکہ دوسرے قومی معاملات میں بھی عملاً حصّہ لیتے تھے' کالج میں انھوں نے اپنی شاندار خدمات کی جو یادگار چھوڑی تھی اُس سے مقامی ٹرسٹی خصوصیت کے ساتھ متاثر تھے' چنانچہ حاجی محمد موسیٰ خاں

صاحب کی تحریک اور خان بہادر نواب محمد مزمل اللہ خاں کی تائید سے ٹرسٹیوں کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۶ جنوری ۱۹۱۳ء میں تجویز پیش کی گئی، اور ٹرسٹیوں نے حسب ذیل رزولیوشن پاس کیا۔

"ٹرسٹیان کالج نواب وقار الملک بہادر کی شاندار اور مخلصانہ قومی خدمات کا اعتراف کر کے بطور اظہار احسان مندی کے عہدہ وزیٹری مدرسۃ العلوم علی گڑھ اُن کو آفر (پیش) کرتے ہیں۔"

اس اجلاس میں نواب وقار الملک بھی بحیثیت ٹرسٹی شریک تھے، لیکن جب اس رزولیوشن کے پیش ہونے کا وقت آیا تو وہ باہر تشریف لے گئے تاکہ ٹرسٹی اُن کی شخصیت اور موجودگی سے متاثر ہو کر آزادانہ اظہار رائے میں تکلّف نہ کریں۔



کالج کی خدمات پر مختصر تبصرہ

نواب وقار الملک کی سکرٹری شپ کا زمانہ قریباً ساڑھے چار سال ہی، اسی مدّت میں ایسا زمانہ بھی گزرا جب کہ وہ مختلف اوقات میں بیمار ہوئے اور کام نہ کر سکے، اس کے علاوہ اسی زمانہ میں اُن کو مسلم لیگ۔ مسلم یونیورسٹی اور دوسری قومی تحریکات میں بھی (جن کا بیان آیندہ آئے گا) عملاً حصّہ لینا پڑا، اُن کو طرح طرح کی دشواریاں پیش آئیں اور مشکلات کا بھی مقابلہ کرنا پڑا با ایں ہمہ اُن کا عہد ہر پہلو سے کامیاب رہا، انھوں نے ہر موقع پر مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا، اور ہر موقع پر اپنے مشہور عزم و استقلال سے کام لیا۔

جب انھوں نے آنریری سکرٹری کا عہدہ قبول کیا اس وقت کالج کی کیا حالت تھی؟ اس کا اندازہ اخبار آبزرور لاہور (۱۹۰۹ء) کے ایک مضمون سے ہوگا، جس کے بعض حصّے بحوالہ اخبار وکیل اس موقع پر نقل کئے جاتے ہیں۔

آبزرور کی رائے | نواب محسن الملک کے بعد کالج کے سب سے زیادہ نامور ٹرسٹی جناب نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب ان کے جانشین ہوئے مولوی صاحب موصوف (جن کو اب گورنمنٹ سے بھی نواب کا خطاب مل گیا ہی) ٹرسٹیوں کے نامزد کردہ نہیں بلکہ مسلمانوں کے انتخاب کئے ہوئے ہیں ان کو قوم کی متفقہ آواز نے انتظام کالج اور مسلمانان ہند کی لیڈری کی باگ اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے طلب کیا اور ان کے انتخاب کی ٹرسٹیوں نے تصدیق کر دی، اس لئے وہ اپنے فرایض پر زیادہ آزادی اور زیادہ طاقتور ارادہ کے ساتھ فائز ہوئے، کام کا چارج لینے کے بعد اُن کو پتہ لگا کہ پچھلے منتظمین کے زمانہ میں کالج کی پیچیدہ مشنری کے پُرزے زنگ آلود

ہوگئے ہیں، کالج کے کئی عہدوں کا وہ پہلا سا وقار باقی نہیں رہا ہے، یا وہ عہدے ہی برطرف ہوگئے ہیں اور کئی دوسرے مناصب نے نامناسب اقتدار حاصل کرلیا ہے۔ سکرٹری اور اُس کے رفقاء کا اختیار معاملات کالج میں محض برائے نام رہ گیا ہے اور پرنسپل اور اُن کے اسٹاف کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے جو اپنے اختیارات کو اکثر غیر مصلحت اندیشانہ، خود سرانہ طریق پر استعمال کرتے ہیں نواب صاحب کو جو کام درپیش تھا وہ کوئی آسان نہ تھا مگر اپنی انتظامی قابلیت، ذہانت اور نصف صدی کے وزارتی کام کے تجربہ سے مدد لے کر انھوں نے ثابت کر دکھایا کہ وہ اس کام کو انجام دینے کی پوری لیاقت رکھتے ہیں، کالج کے ہر صیغہ میں ایک گہری تحقیقات جو اب تک جاری ہے زیر عمل آئی اور سارے کام کو از سرِ نو تقسیم کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا، بہت سی جدید تبدیلیاں رائج ہوئیں اور نئے عہدے قایم اور پُرانے موقوف کیے گئے، ان باتوں سے گاہے ماہے بے چینی کے آثار ظاہر ہوئے، مگر نواب صاحب اپنی حسن تدبیر سے ان پر غالب آتے رہے، جب انتظامی اصلاح کا کام خاصہ آگے بڑھ گیا تو آئینی اصلاح پر نظر ڈالی گئی۔ اس میں پہلے سے کہیں زیادہ دقتوں کا سامنا ہوا کیوں کہ انتظامی اصلاح کا اثر تو صرف افراد پر پڑتا تھا، اور آئینی اصلاح حکومت کالج کے اصول پر موثر ہوتی تھی، اب پرنسپل اور اُن کے اسٹاف کی مرضی ایک نئی طاقت کی وجہ سے جو سابق آنریری سکرٹری کے اپنے اختیارات چھوڑ دینے کے باعث پیدا ہوئی تھی اور جسے وقت نے مزید قوت بخش دی تھی کالج کے قوانین پر بالا تھی آنریری سکرٹری نے اپنے فرایض اور انصاف کا خیال کرکے اس ناجائز غلبہ کو روکا اور پرنسپل اور اُن کے اسٹاف کو نئے سر سے قانون کا پابند

بنانا چاہا، پرنسپل نے اپنے حاصل کردہ اختیارات جو وہ اتنے عرصہ سے
بلا روک ٹوک استعمال کر رہے تھے چھوڑنے سے انکار کیا اور آنریری سکرٹری
نے ناواجب طریقہ پر نہ دینا چاہا، پس کالج کو اس زبردست پیچیدگی سے
واسطہ آپڑا جو اس وقت ہماری گہری توجہ کا محتاج ہے۔"

پرنسپل سے اختلاف کا جو نتیجہ نکلا وہ اس کتاب میں ایک موقع پر تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔

ٹائمز آف انڈیا کا ریمارک | ٹائمز آف انڈیا (بمبئی) نے ایک لیڈنگ آرٹکل میں ان معاملات پر بحث کرنے کے بعد لکھا۔

"ہمیں خوشی ہے کہ علی گڑھ کالج کی تاریخ میں جو ایک نازک وقت آگیا تھا
اُس کا خاتمہ ہو گیا، اور ہمیں اس امر سے اتفاق ہے کہ اس سے نیک نتائج کا
نہ صرف کالج پر بلکہ اُس آیندہ آنے والی جماعت پر نہایت عمدہ اثر پڑے گا
جس کی بہترین اُمیدیں اس کالج کی ترقی و بہبودی سے وابستہ ہیں ۔۔۔۔۔۔
ٹرسٹیوں اور اسٹاف اور گورمنٹ کے تعلقات آج ایسی محفوظ و مامون بنیاد
پر قایم ہیں کہ گزشتہ دس سال سے ایسے کبھی نہ ہوئے تھے۔"

اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نواب وقار الملک کے زمانہ میں جو واقعہ پیش آیا، اُس نے اگرچہ کچھ مدت تک کالج کے بہی خواہوں کو پریشان رکھا، لیکن اُس سے بہتر نتائج پیدا ہوئے اور اُس فتنۂ خوابیدہ کا خاتمہ ہو گیا جس کی طرف سے ہر وقت خطرہ رہتا تھا صرف یہی نہیں بلکہ حدود و اختیارات کی توضیح نے کالج کی قومی خصوصیت کو اور زیادہ نمایاں کر دیا، یہ سب کچھ نواب وقار الملک کی شخصیت کی بدولت ہوا جو تنہا نہیں تھے بلکہ قوم کی اجتماعی طاقت اُن کے ساتھ تھی اور یہ اُن کے زبردست کیرکٹر کا نتیجہ تھا کہ اُن کی زبان و قلم کو قوم کی ترجمانی کا منصب حاصل ہو گیا تھا۔

اخبار محمڈن مدراس کا تبصرہ | اخبار محمڈن مدراس نے جو خیالات نواب وقار الملک کی خدمات کے متعلق ظاہر کئے ہیں اُن میں مسلمانوں کی عام رائے کی عمدہ طریقہ سے ترجمانی کی ہے۔ اس کے بعض فقرے اس موقع پر نقل کئے جاتے ہیں۔

"ہندوستان کے مسلمانوں میں بہت کم ایسے سیاست داں اور مصلحان قوم ہیں جو قابل تبدیل مشرق کے مستقبل کو ایک عمدہ سانچے میں ڈھالنے کے لئے کوشاں ہیں، ایسے ایک لیڈر کا کم ہونا قوم کی بدقسمتی کی علامت ہے، اس کی مثال نواب مشتاق حسین وقار الملک کی علی گڑھ کالج کی سکرٹری شپ سے کنارہ کشی ہے، جو چند روز ہوئے اُن کی علالت اور کبر سنی کے باعث وقوع میں آئی ہے، نواب صاحب ایسے سن کو پہونچ گئے ہیں کہ ان کو اب یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کا قایم مقام اب ان سے کوئی کم عمر شخص ہونا چاہیئے جو کالج، یونیورسٹی، اور مسلم لیگ کے کام کو اپنے ہاتھ میں لے اور اس کام کو اس منزل تک پہونچانے کی کوشش کرے جو پیش نظر ہے۔"

اس کے بعد اُن کے حیدر آباد کے کارناموں کا تذکرہ کر کے لکھتا ہے۔

"جب اُن کے وتنکش ہونے کا زمانہ آ پہونچا تو انھوں نے اپنی ساری دلچسپی بانی کالج کے ایک قدیم شاگرد کے طور پر علی گڑھ کو منتقل کر دی اور مہدی علی و دیگر لیڈران کی تحریک کے ساتھ مل کر اپنی ساری کوششیں کالج کی ترقی اور اصلاح کے لئے وقف کر دیں، جس کا نتیجہ اُس کی موجودہ حالت ہے۔"

پھر مسلم لیگ کے متعلق بحث کرنے کے بعد لکھتا ہے۔

"اُن کا زمانہ سکرٹری شپ مختصر رہا ہے لیکن انتظام کی اہمیت اور قوم کے آسودہ حال طبقہ سے روپیہ وصول کرنے کے لئے وہ خصوصیت کے ساتھ ایک نمایاں کارنامہ ہے، اور جس کی وجہ سے کالج ایک مستقل اور مستحکم بنیاد پر قایم

ہوگیا یہ کالج بہت جلد ایک یونیورسٹی کی شکل میں منتقل ہونے والا ہے اور اس کے حصول کے لئے نواب صاحب نے زبردست کوششیں کی ہیں لیکن نہایت افسوس کا مقام ہی کہ اپنی کبرسنی اور علالت کے باعث وہ کام سے دستکش ہوگئے ہیں جس میں اُن کی شخصیت نہایت موثر تھی، اگرچہ عملاً اُنھوں نے پبلک لائف سے قطع تعلق کرلیا ہی تاہم جن مسائل کا کہ مسلمانوں کی فلاح سے تعلق ہی ان سب میں نواب صاحب سے مشورہ حاصل کرنے کی ضرورت ہی اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ وہ اپنے دانشمندانہ مشورہ سے اپنی قوم کو محروم نہ فرمائیں گے۔"

ایک معزز مقامی ٹرسٹی کا بیان

شیخ عبداللہ صاحب بی اے ایل ایل بی، کالج کے پرانے ٹرسٹی اور ابتدا سے سنڈیکیٹ کے ممبر ہیں، اُن کو سالہا سال تک نواب وقارالملک کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہی، نواب صاحب کے دستکش ہونے کے بعد انھوں نے ایک مفصّل مضمون شایع کیا تھا جس کے بعض حصّے اس موقع پر نقل جاتے ہیں، اس سے اندازہ ہوگا کہ اُن کے ساتھ کام کرنے والے اُن کے متعلق کیا رائے رکھتے تھے۔

"نواب صاحب کا کالج سکرٹری شپ کا زمانہ بہت کامیاب زمانہ ہی، نواب صاحب اپنے کام اور اوصاف حمیدہ کی وجہ سے قوم کے سب سے بڑے لیڈر اس زمانہ میں تسلیم کئے گئے، مسلمانوں کو اس وقت جس قدر اعتماد نواب وقارالملک پر ہی اور کسی پر نہیں ہی اس اعتماد کی وجوہ بہت سی ہیں مگر منجملہ اُن کے مفصلہ ذیل وجوہ بھی ہیں۔

(۱) نواب صاحب کے متعلق یہ عام رائے ہی کہ وہ قومی خدمت خالص قومی ہمدردی سے کرتے ہیں اور اُن کو قومی خدمت میں شمہ برابر بھی ذاتی

(۲) نواب صاحب قدرتاً قومی ترقی کے متعلق اُسی قسم کے خیالات رکھتے ہیں جو جمہور کے خیالات ہیں اس لئے اُن کی رائے میں اور جمہور اہل اسلام کی رائے میں کبھی کوئی اختلاف واقع نہیں ہوا۔

(۳) نواب صاحب فی زماننا اخلاق محمدی کا ایک عمدہ نمونہ ہیں، وہ کبھی کسی کو غلط اُمید نہیں دلاتے، ادنیٰ سے ادنیٰ انسان سے بھی بڑی عزت اور اخلاق سے پیش آتے ہیں کبھی کسی کا دل نہیں دُکھاتے کام کرکے کسی پر احسان نہیں جتلاتے بلکہ احسان کرکے بھول جاتے ہیں، دوسروں کی تکلیف اور مصیبت کا اُن کو خیال رہتا ہے، اپنی وضع کے پابند ہیں۔

(۴) فرایض مذہبی کی نہایت سختی سے تعمیل کرتے ہیں۔

(۵) دوسروں کے آرام کے لئے اپنے اوپر تکلیف گوارا کرتے ہیں۔

کالج کے سکرٹری شپ کے زمانہ میں نواب صاحب کا اخلاقی پہلو ہر وقت ہمارے سامنے رہا ہے اور ہر دیکھنے والے پر اُس کا اچھا اثر ہوا ہے۔ معاملات میں وہ عادتاً جزئیات پر زیادہ تر توجہ دیتے ہیں اصولی امور کے فیصل کرنے میں زیادہ تاخیر کرتے ہیں، زمانہ حال کی اسکول ڈسپلن میں تادیب و جو اُستاد کے وہ زیادہ حامی نہیں ہیں جس طالب علم کے متعلق قصور کا یقین ہوجاتا ہے اُس کو سختی سے سزا دینا پسند کرتے ہیں مگر کسی طالب علم کا قصور ثابت کرنے کے لئے ایک پوری مسل کا مرتب ہونا اشد ضروری سمجھتے ہیں، یہاں تک کہ بعض وقت اس ضابطہ پوری کی وجہ سے تادیب کا اثر فوت ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

کسی کے راز کی امانت کی ذمہ داری اپنے اوپر لینا پسند نہیں کرتے بعض وقت کسی ممبر سنڈیکیٹ نے کسی معاملہ میں اُن کو بصیغہ راز کوئی تحریر بھیجی تو

انھوں نے بصیغہ راز اُس کو دوسرے ممبروں میں مشتہر کیا، کیوں کہ اُن کا خیال تھا کہ ممبران سنڈیکیٹ اور ٹرسٹیاں سے حتی الوسع کوئی چیز راز کے طور پر نہ رکھی جائے، اس وصف کی وجہ سے بعض ایسے لوگوں کو جو چھوٹی چھوٹی باتوں کو دوسروں سے چھپاتے، اور بے حقیقت باتوں کو اہمیت دینے کے عادی تھے بہت مایوسی ہوتی تھی، مگر نواب صاحب کے اس رویہ کی وجہ سے ممبروں کے اور اُن کے باہمی تعلقات پر اچھا اثر ہوتا رہا اور کسی کو یہ خیال نہ ہوتا تھا کہ نواب صاحب اور فلاں ممبر میں کوئی خاص راز داری ہے یا وہ کسی کی خاص جنبہ داری کر رہے ہیں۔

نواب صاحب میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اشارۃً کنایۃً بھی کسی دوسرے آدمی کو کسی بات کا ملزم و متہم قرار نہیں دیتے، آج کل ہمارے رفاموں، مقرروں، اخبار نویسوں اور نامہ نگاروں میں یہ ایک عام فیشن ہوگیا ہے کہ وہ اپنی تقریروں و تحریروں میں دوسروں پر جہاں تک اُن سے بن پڑتا ہے الزام لگانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے، اوّل تو نام لیکر بُرا بھلا کہتے ہیں ورنہ یہ الفاظ تو ہر شخص کے ورد زبان ہیں مسلمان کچھ نہیں کرتے، ممبران حمایت اسلام یا ٹرسٹیان ایم اے او کالج، یا ممبران فلاں انجمن قومی مقاصد کا کچھ لحاظ نہیں رکھتے، نام و نمود کی باتیں کرتے ہیں وغیرہ مگر ہمارے مخدوم نواب صاحب کی تحریریں یا تقریریں میں نے آج تک کوئی خاص یا عام شکایت نہ دیکھی اور نہ سُنی۔

. . . .

وہ ۲۱ جولائی سنہ ۱۹۱۲ء کو عہدہ سکرٹری شپ سے علیحدہ ہوئے یکم اگست تک علی گڑھ میں رہے دل اس بات کو گوارا نہیں کرتا تھا کہ ہم یہ خیال کریں

کہ اب وہ ایم اے او کالج کے سکرٹری نہیں رہے یکم اگست ۱۹۱۲ء کو ڈھائی بجے دن کی گاڑی سے تشریف لے گئے۔

قبل روانگی کے اپنا کل سامان مع اہل وعیال کے امروہہ روانہ کرچکے تھے، کالج ان دنوں بند ہی ممبران اسٹاف اور اکثر لوکل ٹرسٹیان غیر حاضر تھے ورنہ سینکڑوں آدمی اُن کی رخصت کے وقت ریلوے اسٹیشن پر موجود ہوتا صرف ۶۰-۷۰ آدمی جو علی گڑھ میں موجود تھے وہی رخصت کرنے کو اسٹیشن پر آئے۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب اور خاکسار اور چند دیگر احباب مکان پر حاضر ہوئے اور اُن کے ہمراہ اسٹیشن پر آئے اُس روز خصوصیت سے زیادہ ضعیف معلوم ہوتے تھے ایک ٹانگ میں تکلیف تھی، چلا بھی ٹھیک نہیں جاتا تھا، مگر با ایں ہمہ علی گڑھ سے علحدگی کے رنج کو اپنے وقار کے پردہ میں چھپائے ہوئے تھے۔ ایک بڑا آدمی ایک بڑے کام سے علحدہ ہوکر رخصت ہو رہا تھا، ہمارا دل اُس وقت کی عجیب کیفیت کو کبھی نہ بھولے گا۔



مختلف الخیال اصحاب کے ان بیانات سے اندازہ ہوتا ہی کہ کالج کے لئے اُن کا عہد کیسا کامیاب وشاندار تھا اور اُن کے زمانہ میں قوم کا رُجحان کالج کی طرف کس قدر بڑھ گیا، لیکن یہ ترقی ورُجحان بے وجہ نہ تھا مناسب معلوم ہوتا ہی کہ اس موقع پر اختصار کے ساتھ کسی قدر اُن اسباب و وجوہ پر بحث کی جائے جو اُن کے عہد میں کالج کی نیکنامی وشہرت کا باعث ہوئے۔

(۱) نواب وقارالملک شدت کے ساتھ مذہبی احکام کے پابند تھے اور اُن کی دیانت داری راستبازی، مستقل مزاجی اور مخلصانہ قومی خدمات نے پہلے سے مسلمانوں کو گرویدہ کر رکھا تھا اُن کے محاسن اخلاق مثلاً تحمل، بُردباری، تواضع وخاکساری، استقامت وآزادیِ رائے

سے پبلک پہلے سے متاثر تھی، اُن کی گزشتہ زندگی بالکل بے داغ تھی، لہٰذا جب وہ بحیثیت آنریری سکرٹری کالج منظرِ عام پر آئے تو پبلک کے لئے کوئی اجنبی شخص نہ تھے، قوم اُن سے واقف بھی اور وہ قوم سے اور یہی سبب ہی کہ قوم نے اُن کو متحد الکلمہ ہو کر اس عہدہ کی لئے پیش کیا تھا، اس لئے جب انھوں نے کالج کا کام اپنے ہاتھ میں لیا تو کالج بھی اُن کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا، دفعتاً پبلک کا اعتماد کالج پر بڑھ گیا، اس کے علاوہ لوگوں کو یہ حسنِ ظن بھی پیدا ہوا کہ اُن کی توجہ سے طلبہ کی مذہبی و اخلاقی حالت کی اصلاح ہو گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا انھوں نے نماز کا خاص انتظام کیا، مذہبی[1] تعلیم و تربیت پر پوری توجہ کی، اخلاقی نگرانی کا بندوبست کیا، مختلف اوقات میں علماء کو وعظ کے لئے بُلایا، ایک عالم کا مستقل تقرر کیا، اس کے علاوہ پرائیوٹ ملاقاتوں میں ہمیشہ طلبہ کو مفید نصائح کرتے رہے، انھوں نے طلبہ میں ایک قسم کا قومی و مذہبی احساس پیدا کیا اور اسلامی جذبات کو نشو و نما کا موقع دیا چنانچہ جنگ طرابلس و بلقان کے موقع پر طلبہ نے جس مذہبی جوش اور ایثار کا اظہار کیا وہ انھیں کے فیض تربیت کا کرشمہ تھا۔

ان حالات نے علماء کو بھی کالج کی طرف متوجہ کر دیا، اور علماء کی وجہ سے عام مسلمان بھی متوجہ ہوئے جن پر علماء کا خاص اثر تھا، سرسید کے زمانہ میں اُن کی صلابتِ مزاج اور مذہبی آزادی کی وجہ سے مذہبی گروہ کالج سے بیزار تھا، اور عوام بے تعلق، اس لئے سرسید کا تمام زمانہ مخالفت اور کش مکش میں گزرا، نواب محسن الملک کا زمانہ البتہ پرسکون تھا۔ وہ ایک نرم مزاج، مروت پسند، صلح جو طبیعت کے شخص تھے، اُن کی خوش تدبیری، جادو نگاری، اور سحر بیانی نے مخالفت کے

---

[1] مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی فرماتے ہیں کہ:۔

"نواب محسن الملک نے مذہبی حقیقی پابندی کالج میں قائم کرنے کا احساس کیا تھا۔ دینیات کی کمیٹی از سرِ نو مرتب کی میرا تجربہ ہی کہ عملاً بہت سا کام مذہبی پابندی کا اُن کے عہد میں ہوا، مثلاً پہلے رمضان مبارک میں بے تکلف ڈائننگ ہال گرم ہوتا تھا اُن کے عہد میں یہ بدعت موقوف ہوئی۔ سوائے ڈاکٹری تصدیق کے کسی کو کھانا دن کو نہیں ملتا تھا، علانیہ پان سگریٹ کا استعمال دن کے اوقات میں ممنوع ہوا۔

جوش کو بہت کچھ سرد کر دیا، لیکن مذہبی گروہ پھر بھی پہلو تہی کرتا رہا اور عام مسلمان بھی عملاً متوجہ نہیں ہوئے، لیکن نواب وقار الملک کی مذہبی زندگی اور اسلامی معاشرت نے علما، کو بھی اپنا گرویدہ کر لیا۔ اور عام مسلمانوں نے سرسیدؔ کی اس تعلیمی تحریک میں عملاً حصہ لیا، چنانچہ جب مسلم یونیورسٹی کی تحریک شروع ہوئی تو کوئی مخالف آواز بلند نہیں ہوئی، مسلمانوں کے ہر طبقہ نے اس کا خیر مقدم کیا علماء نے اس کی تائید کی اور مجلس **ندوۃ العلماء** نے تو مالی اعانت سے بھی دریغ نہیں کیا، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُن کے عہد میں کیسی زبردست تبدیلی واقع ہو گئی تھی، یہ سب کامیابی درحقیقت اُن کی زبردست شخصیت کا نتیجہ تھا اور اُن کی شخصیت کو مذہبی روح نے بلند کر دیا تھا۔

بعض لوگ اُن کے عہد کی کامیابی یا ناکامیابی کا اندازہ کرنے کے لئے مالی اعداد کی تلاش و جستجو کرتے ہیں لیکن یہ کوئی صحیح معیار نہیں، دیکھنا تو یہ ہے کہ اُن کے زمانہ میں کالج کی اخلاقی طاقت ملک میں کس قدر بڑھ گئی اور اُس کے اعتماد و اثر میں کس قدر اضافہ ہوا، اور پھر اُس سے کیسے مفید و مستقل نتائج پیدا ہوئے۔ کالج کوئی تجارتی کمپنی نہیں ہے کہ جس کی ترقی کا اندازہ صرف مالی اعداد سے کیا جائے، البتہ جب کوئی قومی انسٹی ٹیوشن قوم کا اعتماد حاصل کر لیتا ہے تو مالی حیثیت سے بھی ناکامیاب نہیں رہتا، مسلم یونیورسٹی کو جو تھوڑی مدت کے اندر لاکھوں روپیہ مل گیا وہ بہر حال اسی اعتماد ہی کا نتیجہ تھا۔

(۲) ایک خصوصیت اُن کے عہد کی یہ ہے کہ اُنھوں نے کالج کو قوم کی تمام اُمیدوں کا مرکز بنا دیا، ایک طرف تو اُنھوں نے تمام معاملات میں قوم کی ترجمانی کی، دوسری طرف اپنے طرزِ عمل سے پبلک کو یہ باور کرایا کہ کالج ایک **قومی سرمایہ** ہے اس لئے ہر مسلمان کو اُس کے متعلق مشورہ دینے اور اُس کے کاروبار پر نکتہ چینی اور اعتراض کرنے کا حق حاصل ہے، چنانچہ اُن کا یہ طرزِ عمل تھا کہ جو لوگ خانگی طور پر یا اخبارات کے ذریعہ سے اُن کو کوئی مشورہ دیتے، اس پر وہ نہایت فراخ دلی سے غور کرتے تھے، اکثر اوقات سخت نکتہ چینیاں بھی کی جاتی تھیں۔ ایسے موقع پر وہ بعض دوسرے قومی کام کرنے والوں کی مانند اعتراض یا نکتہ چینی کو حقارت یا بے پروائی

کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، بلکہ تحمل و وقار کے ساتھ اس پر غور کرتے اور اس کے بعد یا تو اس کو قبول کر لیتے یا معقول و مناسب جواب دے کر معترض کو پورے طور پر مطمئن کر دیتے۔

انھوں نے ابتدا ہی میں وضاحت سے بتا دیا تھا کہ اُن کا طرزِ عمل اس معاملہ میں کیا ہوگا اور چند بار اپنے مضامین میں ان خیالات کا اعادہ کیا، چنانچہ ایک مرتبہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک مضمون کے سلسلہ میں لکھا۔

"آخر میں اس قدر مجھ کو اور بھی لکھنا ہے کہ جس قدر نکتہ چینیاں کالج کے انتظامات کے متعلق ہوئی ہیں اور ہوں گی اُن کو میں کالج کے حق میں مفید اور بے انتہا مفید سمجھتا ہوں اور اُن بہی خواہان قوم کا شکر گزار ہوں جو کالج کو اپنا سمجھ کر اپنے مفید مشوروں سے مدد دیتے ہیں، اور حقیقت میں اُن کے مفید مشوروں کو نکتہ چینی سے تعبیر کرنا ہی غلطی ہے وہ اپنا قومی فرض ادا کرتے ہیں۔"

ایک اور موقع پر ۱۹۰۶ء میں خواجہ غلام الثقلین کے جواب میں لکھتے ہیں:

"کالج کو میں قوم کا کالج سمجھتا ہوں اور اپنے آپ کو نہ صرف ٹرسٹیوں کا سکرٹری بلکہ کالج کے معاملات میں قوم کا سکرٹری سمجھتا ہوں، اور کوئی نکتہ چینی جو میری کارروائی کی نسبت کیجائے اُس کو ہمیشہ میں نے اپنے کام میں ایک قسم کی مدد سمجھا ہے، گو یہ ضرور نہیں ہے کہ جو کچھ نکتہ چینی کی جائے اس کو میں قبول بھی کروں۔"

اسی طرح متعدد مواقع پر انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے چنانچہ جب ۱۹۰۷ء کی شورش طلبہ کے متعلق بعض ذمہ دار اصحاب نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ شورش اخبارات کے فتنہ انگیز مضامین کا نتیجہ ہے تو انھوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ اگر یہ نکتہ چینیاں غلط تھیں تو منتظمین کا فرض تھا کہ وہ ان کا جواب دیتے، اور حقیقت واقعہ ظاہر کر دیتے۔

مضامین کے علاوہ خطوط اور مراسلات کے جواب میں بھی وہ ان مراتب کا لحاظ رکھتے

تھے، تمام خطوط پوری توجہ سے پڑھتے۔ لوگوں کی شکایت پر غور کرتے اور اُن کا اطمینان بخش جواب دیتے۔ اس بارہ میں اُن کا جو طرزِ عمل تھا انھوں نے اس کو خود ایک موقع پر واضح الفاظ میں بیان کیا ہی۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۰۹ء کو فنانس کمیٹی کا اجلاس تھا آمد و صرف کا موازنہ (سالانہ بجٹ) پیش ہوا واقعی آمدنی سے خرچ زیادہ تھا شیخ عبداللہ صاحب ممبر فنانس نے مصارف کی مدّات پر بحث کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ آنریری سکرٹری کے دفتر کا خرچ بھی بہت بڑھ گیا ہی، اس کے جواب میں نواب وقار الملک نے فرمایا:

"میرے معزز دوست شیخ محمد عبداللہ صاحب نے صرف بجٹ کے اعداد و شمار سے بحث کی ہی اور دکھلایا ہے کہ خرچ کس طرح رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے لیکن اُس کے ساتھ جب تک اس بات پر بھی غور نہ کیا جائے کہ رفتہ رفتہ کام بھی کس قدر بڑھ گیا ہی اُس وقت تک اخراجات کی بیشی پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

دفتر کے کام کا مجھکو ذاتی تجربہ ہی اور میری **نصف صدی** دفتر کے کاموں کے تجربہ میں گزری ہی لیکن مجھ کو اس میں کچھ عذر نہیں ہی کہ کوئی ایک ٹرسٹی صاحب یا چند ٹرسٹی صاحبان میرے دفتر کے کام اور عملہ کی تعداد پر غور کریں، اُس وقت اُن ٹرسٹی صاحبان کو کام کی مقدار کے متعلق صرف موصولہ و مجاریہ کی تعداد ہی پر غور کرنا نہو گا، اُن کو یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ میرے وقت میں کام کی نوعیت کا کیا حال ہی، یہ ضرور کہا جاتا ہی کہ میرے مزاج میں طوالت ہی اور میری تحریریں جو بہت زیادہ خود میرے قلم کی ہوتی ہیں زیادہ طویل ہوتی ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہی کہ میں اپنے مخاطب سے اگر کسی امر میں اختلاف کرتا ہوں یا اُس سے کوئی خواہش کرتا ہوں اور اُس پر کوئی ذمہ داری عائد کرتا ہوں تو اُس کو بدلائل مطمئن کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں، بجائے اس کے کہ تحکمانہ لہجہ میں اور اخلاق کو بالائے طاق

رکھ کر ایک دو صفحے کے مضمون کو آدھی سطر ایک سطر میں ختم کر دوں، اور اگر میں پوری طرح اپنی مراسلت میں اخلاق سے کام نہ لوں تو اس کا بہت خراب اثر ان سب لوگوں کی طبیعت پر پڑے گا، جن کے ساتھ مجھے مراسلت رہتی ہے، اور اُن کی دلچسپی میں فرق آجائے گا، جو میں اُن میں اپنے کالج کے ساتھ پیدا کرنا اور اُس کا قائم رکھنا چاہتا ہوں، ٹرسٹیوں کے علاوہ اکثر سربرآوردگان اور ہمدردانِ قوم کے ساتھ مراسلت کرتے وقت میں اپنے آپ کو اُن کا بھی سکرٹری ہی سمجھتا ہوں۔

میں ہر ایک عملہ کے کام کی تعداد کو گو ہر روز خود نہیں دیکھتا ہوں، لیکن جس قدر کام اُن کا میری نگاہ سے گزرتا رہتا ہے اُس کے لحاظ سے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بہت زیادہ کام کرتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خلاصہ یہ کہ خرچ اگر چار چند بڑھا ہے تو کام دہ چند بڑھ گیا ہے۔"

اس پر شیخ محمد عبداللہ صاحب نے فرمایا کہ :۔

"اگر آنریری سکرٹری صاحب کو اس بارہ میں اطمینان ہے تو اُن کے اطمینان پر ہم کو بھی اطمینان ہے۔"

نواب وقار الملک نے اپنے طریقۂ مراسلت کے متعلق جو کچھ کہا وہ حرف بحرف صحیح ہے اُن کے خطوط دیکھنے سے اِس کا صحیح طور پر اندازہ ہوتا ہے۔

ایک دفعہ کسی اہلکار نے ایک خط کے جواب میں کسی قدر تحکمانہ انداز اختیار کیا جب وہ خط دستخط کے لئے اُن کے سامنے پیش ہوا تو فرمایا۔

"یہ قومی خدمت کا دفتر ہے اور آپ اس کو محکمہ بناتے ہیں میں ایسی تحکم آمیز عبارت پر دستخط نہیں کروں گا۔"

یہ ظاہر ہے کہ وہ تمام خطوط اپنے ہاتھ سے نہیں لکھ سکتے تھے، ضابطہ کے خطوط کا جواب عموماً دفتر کے اہلکار لکھتے اور اُن کے سامنے دستخط کے لئے پیش کرتے تھے، لیکن اکثر ایسا ہوتا تھا کہ

وہ ان خطوط پر دو چار جملے اپنے قلم سے بھی لکھدیتے تھے جس سے مخاطب پر اچھا اثر پڑتا تھا اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ میرے ساتھ خصوصیت کا برتاؤ کیا گیا۔



(۳) ایک خصوصیت نواب وقارالملک کے زمانہ کی یہ ہی کہ انھوں نے ہمیشہ پارٹی فیلنگ سے اپنے کو محفوظ رکھا اور جو پارٹیاں اُن کے زمانہ سے پہلے کالج میں قایم ہو گئی تھیں اُن کے توڑنے کی کوشش کی جیسا کہ وہ خود صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی ایک یادداشت کے جواب میں لکھتے ہیں۔

"میرا طرز کارروائی یہ ہی کہ جس وقت سے میں نے آنریری سکرٹری کی حیثیت سے کالج میں قدم رکھا میں نے بالاعلان اس کو ظاہر کر دیا کہ میں پارٹی فیلنگ کو پسند نہیں کرتا، اور نہ صرف ٹرسٹیوں کی پارٹی میں اس فیلنگ کے پھیلنے کو میں روکونگا بلکہ اولڈبوائز کی پارٹی فیلنگ کو بھی میں حتی الامکان کمزور کرنے کی کوشش کرونگا میں نے صاف یہ بھی کہدیا کہ میں اپنے گرد و پیش ہیڈکوارٹر میں بھی کوئی پارٹی قایم کرنا نہیں چاہتا۔

میں نے ہر ایک موافق رائے کو نہایت آزادی اور ٹھنڈے دل کے ساتھ سُنا اور جس کی رائے میرے نزدیک کالج کے مقاصد کے لحاظ سے مفید تھی اُس سے میں نے اتفاق کیا اور جس کی رائے کو میں نے کالج حق میں مفید نہ سمجھا اُس سے میں نے اختلاف کیا اور اس طرح پر بسا اوقات یہ ہوتا رہا کہ کسی صاحب کی ایک رائے کے ساتھ مجھ کو اتفاق تھا اور اُن کی رائے سے اختلاف۔ . . . . اس طریقہ کارروائی سے اگرچہ مجھکو مفید اور سنجیدہ رایوں کے قایم کرنے میں بہت آزادی اور آسانی حاصل رہی ہی اور میں نے اپنے آپ کو کسی پارٹی فیلنگ میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھا ہی ———"

"اولڈ بوائے حضرات کے جلسوں میں بھی میں برابر شریک ہوتا رہا اور پرائیوٹ وپبلک طریقوں سے میں نے ان کو ہمیشہ پارٹی فیلنگ کے نقصانات سمجھائے اور بعض اہم مواقع پر میں نے اُن کو ایسی کارروائیوں سے باز رکھا اور اُن کی رایوں کو بدلوایا، جن سے پارٹی فیلنگ کو قوت ہوتی تھی اور دونوں پارٹیوں کو ایک نگاہ سے دیکھا جس سے اُن کو یقین ہوگیا کہ جو کچھ میں اُن سے کہتا ہوں کالج کے بہترین مقاصد کے لحاظ سے کہتا ہوں نہ کسی پارٹی کے اثر سے۔

میرے اس طرز کارروائی سے (جس سے میں اپنے گرد کوئی خاص پارٹی نہ قایم کرسکا) خود مجھکو مشکلات برداشت کرنی پڑی ہیں۔ مگر صراط مستقیم سے بہتر کوئی دوسرا راستہ آسان بھی نہیں ہی۔"

بے شبہ جیسا کہ نواب وقارالملک نے بیان کیا ہی اُن کا طرز عمل ہمیشہ صاف اور بے لوث اور شبہ سے بالاتر رہا، اور اسی طرز عمل کی بدولت آخرکار انھوں نے ہر جماعت کا اعتماد حاصل کیا۔

مندرجۂ بالا امور کے علاوہ اُن کے کیرکٹر کی اور بھی خصوصیات ہیں، جو کالج کے کاروبار کے سلسلہ میں ہر موقع پر نمایاں ہوتی تھیں لیکن بخوف طوالت ہم تفصیلی بحث سے احتراز کرتے ہیں۔

نواب وقارالملک کے عہد زریں پر نکتہ چینیاں

انسان کا کوئی کام سہو وخطا سے خالی نہیں، اس لئے بالکل ممکن بلکہ یقینی ہی کہ نواب صاحب نے بھی کالج کے سکریٹری شپ کے زمانہ میں غلطیاں کی ہوں، اپنے زمانہ میں وہ کالج میں سب سے زیادہ مصروف اور کثیرالاشغال شخص تھے اور اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ وہ صرف کالج کے آنریری سکریٹری نہ تھے بلکہ اپنے عہد میں مسلمانان ہند کے سب سے زیادہ ممتاز لیڈر بھی تھے اور اُن کی ذات تمام مسلمانوں کی اُمیدوں کا مرکز تھی، اس بنا پر اُن کو کالج کے کام کے علاوہ جو بجائے خود ایک وسیع مستقل اور نازک کام ہے، قوم کی تمام تعلیمی، سیاسی، مذہبی واخلاقی تحریکوں میں عملاً حصہ لینا پڑتا تھا، وہ اپنے ہاتھ سے اُن

خطوط کا جواب دیتے تھے جو اطراف ہند سے اُن کے پاس آتے تھے، مضامین لکھتے تھے، تقریریں کرتے تھے، قوم کے سربرآوردہ اصحاب سے ملاقات کرتے تھے اور بروقت ضرورت ہندوستان کے مختلف مقامات کا دورہ کرتے تھے یہاں تک کہ قومی ضرورتوں سے انھوں نے ہندوستان کے باہر برہما تک کا سفر کیا، کالج کا کام اور کام کرنے والوں کی نگرانی اس کے علاوہ ہی اور پھر کالج کا کام بھی اس طریقہ سے کہ تمام جزئیات پر نظر رکھتے تھے اور کوئی چیز اُن کے دائرہ معلومات سے باہر نہیں رہتی تھی، حیرت ہی کہ وہ اتنا کام پوری توجہ و سکون کے ساتھ کیوں کر انجام دیتے تھے، خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ عمر ۷۰ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔

ایسے مصروف و کثیر الاشغال شخص سے کسی غلطی کا ہو جانا بالکل ممکن بلکہ قرین قیاس ہی لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ جن چیزوں کو غلطی سے تعبیر کیا جاتا ہی وہ صحیح ہو، ہماری یہاں نکتہ چیں عموماً وہ لوگ ہوتے ہیں جو خود کسی کام میں عملاً حصّہ نہیں لیتے، دوسروں پر نکتہ چینی کرنا سب سے بڑی قومی خدمت سمجھتے ہیں اور چوں کہ خود اُن کے ہاتھ میں کوئی کام نہیں ہوتا اس لئے دوسروں کی نکتہ چینی سے محفوظ رہتے ہیں، اس کے علاوہ اُن مشکلات کا اندازہ بھی نہیں کرسکتے جو کام کرنے والوں کو پیش آتی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ذمہ دار اشخاص بھی اپنے کام کو چمکانے کے لئے پچھلے کام کرنے والوں کے طرزِ عمل پر نکتہ چینیاں کرتے ہیں۔

چنانچہ نواب وقار الملک پر بھی اُن کے کام کرنے کے زمانہ میں اور اُن کے دستکش ہونے کے بعد نکتہ چینیاں کی گئیں لیکن وہ تارِ عنکبوت سے زیادہ وقیع نہیں ثابت ہوئیں اور جب انھوں نے اپنے طرزِ عمل کے وجوہ بیان کئے تو ہر شخص کو اطمینان ہو گیا، لیکن اُن کے سبکدوش ہو جانے کے بعد جب سالانہ بجٹ تیار ہوا، اور اُس کے متعلق رپورٹ مرتب ہوئی تو مبہم الفاظ میں کسی قدر دبی زبان سے اُن کی فنانشل قابلیت پر الزام لگایا گیا اور یہ ظاہر کیا گیا کہ انھوں نے اپنے اختیارات کا غلط استعمال کر کے امانت کا روپیہ کالج کے دوسرے مقاصد پر صرف کر دیا، اور طلبہ کو قرض حسنہ دینے میں ضرورت سے زیادہ فیاضی کا اظہار کر کے فنڈ کو تہی مایہ بنا دیا۔

چوں کہ ان اعتراضات سے پبلک کی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا اندیشہ تھا اس لئے نواب صاحب نے اس کا معقول اور مفصّل جواب شائع کیا جس کو ہم بخوف طوالت نظر انداز کرتے ہیں، جواب کا ماحصل یہ تھا کہ امانت کا روپیہ مختلف بورڈنگ ہاؤسوں اور اسٹاف کے مکانات کی تعمیر میں قرض لے کر صرف کیا گیا جس سے کالج کی ضروریات بہت کچھ حل ہوگئیں اور رقوم کی امانت کو بھی کسی قسم کا نقصان نہیں پہونچا، کیوں کہ قرض اس شرط پر لیا گیا تھا کہ زیر تعمیر مکانات کی کرایہ کی آمدنی سے مناسب شرح پر امانت فنڈ میں منافع کا روپیہ جمع ہوتا رہیگا جو گورنمنٹ پرامیسری نوٹوں کی شرح سے کسی حالت میں کم نہیں بلکہ بعض صورتوں میں اس سے زیادہ ہی، گویا جو روپیہ بیکار پڑا ہوا تھا وہ ایسے کام میں لگایا گیا جس سے ایک طرف تو کالج کی ضرورتیں رفع ہوئیں، دوسرے آمدنی کی ایک صورت پیدا ہوگئی، اسی سلسلہ میں انھوں نے یہ بھی ظاہر کردیا کہ یہ جو کچھ کیا گیا ممبر فنانس اور سنڈیکیٹ کی منظوری سے کیا گیا۔

اِس کے بعد انھوں نے قرض حسنہ اور انجمن الفرض کے فنڈ پر بحث کرتے ہوئے لکھا۔

"پبلک جو اس کام میں طلبہ کو چندہ دیتی ہو وہ اس خیال سے نہیں دیتی کہ اس سے ایک مستقل فنڈ قایم کیا جائے اور اس فنڈ کے منافع سے طلبہ کو ماہانہ اخراجات میں مدد دی جائے بلکہ اُن کا مقصد یہ ہوتا ہو کہ جو کچھ وہ دے رہی ہیں وہ اُن کی قوم کے ہونہار بچّوں پر صرف کیا جائے جس کے بدون وہ اپنے بچّوں کی تعلیم کی تکمیل نہیں کر سکتے، لہٰذا اگر کالج کے منتظم کالج کے خزانہ میں اس مد کا کچھ روپیہ جمع ہونے کے باوجود کسی مستحق طالب علم کو مدد دینے سے انکار کریں تو کیا اُن کی ایسی کارروائی جائز ہوگی؟ اور جو مالی مشکل اب اس فنڈ میں پیش آگئی ہی اُس کا علاج اگر کچھ ہی تو یہی ہے کہ کوشش کے ساتھ ہمدردانِ قوم کو توجہ دلائی جائے اور اُن سے اس خاص غرض کے واسطے سال بسال چندہ وصول کیا جائے جس کے اب وہ خوگر بھی ہوگئے ہیں۔"

مسلم یونیورسٹی کی تحریک



ایک آزاد محمڈن یونیورسٹی کا قائم کرنا ابتدا سے سر سیّد کا نصب العین تھا، اُن کا خیال تھا کہ جب تک مسلمانوں کی تعلیم گورنمنٹ کی مداخلت سے کلیتہً آزاد اور خود مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ ہوگی، مسلمانوں کو پورا فائدہ نہ پہنچے گا۔ ۱۸۷۳ء میں سر سید کے نامور فرزند سید محمود مرحوم نے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق جو اسکیم شائع کی تھی وہ سر سید کے خیالات کا آئینہ ہے، اسکیم میں بیان کیا گیا ہے کہ:

"جب تک کہ ہم ایسی حاجتوں کی نسبت بھی جو ہماری ذاتی باتوں سے متعلق ہیں، (جیسی کہ تعلیم) گورنمنٹ پر بھروسہ کریں گے تو درحقیقت اس شئے کے حاصل کرنے کی توقع کرتے ہیں جس کا حاصل کرنا بالکل ناممکن ہے، سب سے عمدہ مدارس تعلیم علوم کے یورپ میں بالکلیہ یا قریب اُس کے اُس ملک کی گورنمنٹ کی مداخلت اور انتظام سے علٰحدہ ہیں۔"

اس کے بعد کہا گیا ہے:

"یہ بات قریباً ناممکن ہے کہ برٹش گورنمنٹ ہماری حاجتوں کو جو تعلیم و تربیت سے تعلق رکھتی ہیں پورا پورا سمجھے یا اُن کا کامل طور سے بندوبست کر سکے"

"اگر کچھ روپیہ کی مدد گورنمنٹ ہم کو دے گی تو ہم کو گورنمنٹ کی نگرانی کرنے پر کچھ عذر نہ ہوگا۔ بشرطیکہ ہمارے انتظام میں کچھ مداخلت نہ ہو، گورنمنٹ کی مربیانہ اور فیاضانہ مدد سے ہم اپنی تدبیر کو بہ نسبت اس کے جو گورنمنٹ موجودہ حالت میں کر سکتی ہے بہت زیادہ آسانی اور کامیابی سے انجام کو پہنچا سکتے ہیں۔"

اسی طرح ۱۸۸۲ء میں ایجوکیشن کمیشن میں شہادت دیتے ہوئے سرسید نے کہا:

"جب تک خود لوگ اپنی تعلیم کا تمام اہتمام اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے اُس وقت تک مناسب طور پر اُن کی تعلیم کا ہونا ممکن نہیں ہے، پس ملک کے لئے یہ زیادہ تر مفید ہوگا کہ گورنمنٹ تعلیم کا تمام اہتمام لوگوں پر چھوڑ دے اور خود اس میں دست اندازی سے بالکل علیحدہ ہو جائے۔"

سرسید نے جا بجا اپنے لکچروں میں بھی یہی خیالات ظاہر کئے ہیں اور بتایا ہے کہ مسلمانوں کو ایک آزاد یونیورسٹی کی ضرورت ہے، جس کا انتظام خود مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو، سرسید کی وفات کے بعد اُن کے رفقاء کا بھی یہی نصب العین رہا، چنانچہ اُن کی وفات کے چند ماہ بعد دسمبر ۱۸۹۸ء میں کانفرنس کا جو سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا اُس میں محمڈن یونیورسٹی کی ضرورت پر زبردست تقریریں ہوئیں اور رزولیوشن پاس کیا گیا اور مسلمانوں سے اس مقصد کے لئے دس لاکھ روپیہ کا مطالبہ کیا گیا۔ ۱۹۱۰ء تک یہ تحریک آہستہ آہستہ نشو و نما حاصل کرتی رہی، کانفرنس کے ہر اجلاس میں اس پر زور دیا جاتا تھا۔ دوسری طرف کالج بھی آہستہ آہستہ ترقی کرتا اور یونیورسٹی سے قریب تر ہوتا جاتا تھا، لیکن ابھی تک کوئی پُر زور اور عام تحریک یونیورسٹی کے قیام کے لئے شروع نہیں ہوئی تھی یہاں تک کہ نواب وقار الملک کے عہد میں بمصداق ؎

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

ہز ہائنس سر آغا خاں بالقابہ[1] منظر عام پر نمایاں ہوئے اور جناب ممدوح نے ۲۴ نومبر ۱۹۱۰ء کو یورپ (فرانس) سے نواب وقار الملک کو حسب ذیل خط لکھا:

"مائی ڈیر نواب صاحب! آپ کے مہربانی نامہ کو میں نے غور کے ساتھ پڑھا بعد پورے غور کرنے کے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایک مرکزی تحریک آغاز

---

[1] ہز ہائنس کو منظر عام پر آئے ہوئے کچھ عرصہ ہو چکا تھا مسلم ڈیپوٹیشن شملہ کے وہ ہیڈ تھے۔ اُن کا نمایاں ہونا محسن الملک کے کارناموں میں سے ایک کارنامہ ہے۔

کرنی چاہیئے، جس کے دائرہ میں تمام دیگر تحریکیں جو سائنس اسکول اور یونیورسٹی کے واسطے ہیں، آجائیں اور یہ بادشاہ حال کی تشریف آوری کالج کی یادگار میں ہو نیز بادشاہ کے آئندہ سال تشریف لانے اور تخت سلطنت پر جلوس فرمانے کی یادگار ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم نے تین مختلف فنڈز کے لئے چندہ طلب کیا، یعنی ایک لارڈ منٹو کے واسطے، ایک بادشاہ کی تخت نشینی کے متعلق اور کچھ یونیورسٹی کے لئے، تو ہماری کوششیں تقسیم ہو کر شاید کچھ نہ رہیں۔ ایک نے وردار کمیٹی ہز ہائنس نواب صاحب رامپور کی سرگردگی میں بنائی جائے اور دیگر نوابانِ ذی مرتبت کی، تاکہ تمام ہندوستان میں دورہ کرے اور کالج کو یونیورسٹی کے درجے پر پہنچانے کے لئے کوئی کوشش اٹھا نہ رکھے، اگر ایسی تحریک اٹھائی گئی، تو ایک میں اس کے لئے پچاس ہزار روپیہ دینے کے واسطے آمادہ ہوں، آپ تمام اسکیم میرے ہندوستان پہنچنے تک تیار کر رکھیں تاکہ کام شروع ہو سکے۔ میں ۲۰ دسمبر کو بمبئی پہنچ جاؤں گا۔ — آپ کا نہایت صادق

آغا خاں"

ناگپور کانفرنس میں یونیورسٹی کی تحریک

اس خط نے سب کے دلوں میں ایک تازہ امید اور ولولہ پیدا کر دیا، چنانچہ چند روز بعد دسمبر ۱۹۱۰ء میں جب ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ناگپور میں منعقد ہوا تو آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے حسب ذیل رزولیوشن پیش کیا:

"اس کانفرنس کی رائے میں اس ملک کے مسلمانوں کی حقیقی ترقی اور کامل بہبودی اُن کی اعلیٰ تعلیمی ترقی پر منحصر ہے جس کے لئے مجوزہ مسلم یونیورسٹی کا قیام ازبس ضروری ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ قوم کی اس دیرینہ تجویز کی تکمیل کے لئے عملی تدبیر اختیار کرنے میں پوری سعی کی جائے۔"

یہ رزولیوشن درحقیقت ہزہائنس سر آغا خاں پیش کرنے والے تھے، جو ناگپور تشریف لے آئے تھے، لیکن ایک شب پہلے وہ دفعتاً علیل ہو گئے۔ اس لئے صاحبزادہ صاحب نے ایک پُرزور تقریر کے ساتھ پیش کیا، آخر میں ہزہائنس سر آغا خاں کا ایک خط پڑھ کر سنایا جس میں جناب ممدوح نے بوجہ علالت اجلاس میں نہ شریک ہونے پر معذرت کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا تھا کہ آئندہ سال ملک معظم جشن تاجپوشی کے لئے ہندوستان تشریف لانے والے ہیں، لہذا اس موقع سے فائدہ اٹھا کر شہنشاہ معظم کی یادگار کے طور پر مسلمانوں کو یونیورسٹی قائم کرنا چاہئیے، اس مقصد کے لئے آپ نے ۲۰ لاکھ روپیہ کی ضرورت ظاہر کر کے ایک لاکھ روپیہ خود عطا کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔

متعدد اصحاب نے جو مختلف صوبوں کے قائم مقام تھے صاحبزادہ صاحب کے رزولیوشن کی تائید کی اور اس کے بعد چندہ کا اعلان ہوا جس کی مقدار آٹھ ہزار سے کسی قدر زیادہ تھی۔

محمدن یونیورسٹی کی تکمیل کے لئے کمیٹی کا قائم ہونا

اجلاس کانفرنس کے بعد ۱۰ جنوری ۱۹۱۱ء کو علی گڑھ میں نواب وقار الملک کی کوٹھی اور اُن کی زیر صدارت تکمیل محمدن یونیورسٹی کی تجاویز پر غور کرنے کے لئے ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں یہ قرار پایا کہ ایک مستقل کمیٹی تکمیل یونیورسٹی کے لئے قائم کی جائے اور اس کا نام "کمیٹی تکمیل محمدن یونیورسٹی" رکھا جائے، ہزہائنس سر آغا خاں بالقابہ اس کمیٹی کے پریسیڈنٹ اور صوبہ کے سر برآوردہ لیڈر اور ممتاز اصحاب وائس پریسیڈنٹ مقرر کئے گئے، کمیٹی کے آنریری سکرٹری نواب وقار الملک قرار پائے اور جائنٹ سکرٹری خان بہادر نواب محمد مزمل اللہ خاں، حاجی محمد موسیٰ خاں، شیخ محمد عبداللہ صاحب اور مسٹر شوکت علی بی اے تجویز کئے گئے، ملک کی تمام مشہور و سر برآوردہ انجمنوں اور تعلیم گاہوں کے عہدہ دار اور مجلس انتظامی کے ارکان اس کمیٹی کے ممبر قرار دئے گئے نیز تمام اسلامی اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر، کونسلوں اور ڈسٹرکٹ و میونسپل بورڈوں کے ممبر اور وکلاء و بیرسٹر، مسلمان زمیندار و تاجر اور علماء و مشائخ بھی کمیٹی کے ممبر تجویز کئے گئے۔

محمدن کالج کے رجسٹرار صاحب خزانچی بنائے گئے، اور یونیورسٹی کا سرمایہ جمع کرنے کے لئے بنک آف بنگال تجویز ہوا، نیز ایک مینجنگ کمیٹی مقرر کی گئی اور اس کے لئے ممبروں کا انتخاب ہوا، یہ بھی طے ہوا کہ ہر صوبہ میں ایک پراونشل کمیٹی مقرر کی جائے جو سنٹرل کمیٹی علی گڑھ کے ماتحت کام کرے۔

مذکورۂ بالا تجاویز کے علاوہ اور بہت سی تجویزیں جو روپیہ کی فراہمی، دفتری انتظام اور یونیورسٹی کے اغراض و مقاصد کی اشاعت کے متعلق تھیں پاس ہوئیں اور ایک مختصر کمیٹی اس غرض سے مقرر کی گئی کہ وہ چندہ کے لئے وفود کی ترتیب و انتظام کے متعلق غور کرے

اس جلسہ میں یہ بھی تجویز ہوا کہ نواب وقار الملک کی جانب سے چندہ کے لئے ایک اپیل مختلف زبانوں میں شائع کی جائے اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کانفرنس کی طرف سے مسلم یونیورسٹی کے متعلق ایک پمفلٹ شائع کریں۔

نواب صاحب نے آخر جنوری ۱۹۱۱ء میں ایک پُر زور و پُر اثر اپیل شائع کی جس میں آپ نے بتایا کہ سرسید اور نواب محسن الملک آخر دم تک اس مقصد کے لئے ساعی رہے اور اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان ان بزرگوں کی دیرینہ آرزو پوری کریں اور دربار تاج پوشی سے پہلے ۲۰ لاکھ روپئے جمع کر دیں، اُنھوں نے بتایا کہ تمام مسلمان والیانِ ملک ہماری مدد کے لئے آمادہ ہیں اور ہز ہائنس سر آغا خاں ہندوستان کے بڑے بڑے مقامات پر ڈپوٹیشن لے کر جائیں گے، اسی سلسلہ میں اُنھوں نے اُن تمام تجاویز سے جو طے پائی تھیں پبلک کو آگاہ کیا اور یہ طریقہ اُنھوں نے آخر دم تک رکھا کہ وہ یونیورسٹی کے متعلق تمام چھوٹی چھوٹی باتوں کی بھی پبلک کو اطلاع دیتے رہتے تھے۔ اوائل فروری میں اُنھوں نے ایک اور پرجوش اعلان شائع کیا۔ جس کے آخر میں لکھا کہ:

"میرے بھائیو! میری آخری عمر کی صرف ایک بڑی تمنا یہ ہے کہ اب تم میں سے ہر ایک شخص اپنا یہ فرض سمجھ کر کہ اسلامی یونیورسٹی کو آ سے

مکمل کرنا ہے اپنی پوری کوشش چندہ کی فراہمی میں صرف کرے اور تاجپوشی کے مبارک جشن سے پہلے کم از کم ۲۰ لاکھ روپیہ فراہم کرکے اپنی قومی زندگی کا عملی ثبوت دیدے۔"

اس کے بعد ۱۶ر فروری ۱۹۱۱ء کو ایک کمیٹی کانسٹیٹیوشن کے مرتب کرنے کے لئے قائم کی گئی جس کے پریسیڈنٹ آنریبل سر راجہ صاحب محمود آباد اور سکرٹری شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی منتخب ہوئے، اُنھوں نے کانسٹی ٹیوشن کے خاص خاص عنوانات کا مسوّدہ تیار کرکے ایکٹ اور اسٹیچیوٹس کی صورت میں جمع کردیا، اس کے بعد کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کا پہلا جلسہ ۱۵ و ۱۶ر اپریل ۱۹۱۱ء کو علی گڑھ میں منعقد ہوا، تاکہ اُس مسوّدہ پر غور کرے، اس جلسہ میں ایک ڈیوٹیشن اس غرض سے ترتیب دیا گیا کہ آنریبل مسٹر بٹلر (ممبر تعلیمات گورنمنٹ ہند) سے غیر سرکاری طور پر گفتگو کرے، اس جلسہ کے چند روز بعد ڈاکٹر سید علی بلگرامی کا انتقال ہوگیا اور اُن کی جگہ پر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے سکرٹری مقرر ہوئے۔

ممبر تعلیمات کی خدمت میں ڈپوٹیشن کا جانا

۱۶ر مئی ۱۹۱۱ء کو مجوزہ ڈپوٹیشن جس میں علاوہ نواب صاحب اور آنریبل سر راجہ صاحب کے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب بھی تھے، آنریبل ممبر تعلیمات سے ملا اور مسودہ جو کانسٹی ٹیوشن کمیٹی نے مرتب کیا تھا اُن کے سامنے پیش کیا اور مفصل گفتگو کی۔

ڈپوٹیشن کی ملاقات اور گفتگو بصیغہ راز تھی، دوسری طرف پبلک کو حالات معلوم کرنے کا اشتیاق بلکہ اصرار تھا، اس بنا پر نواب وقار الملک نے ۷ر جون ۱۹۱۱ء کو ایک اعلان شائع کیا جس میں لکھا کہ:

"کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کا جو اجلاس وسط اپریل میں ہوا تھا اور تین دن کے

۱؎ یہ مسودہ ۹ر اگست ۱۹۱۱ء کو بطور ضمیمہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ساتھ شائع کیا گیا تھا۔

غور و بحث کے بعد جو امور باتفاق رائے یا کثرت سے طے ہوئے تھے، اُن کے لحاظ سے نیز شملہ ڈپوٹیشن کو شملہ میں پرائیویٹ طور سے جو موقع بعض گفتگوؤں کا ملا اور جو تحریری رائیں ہمدردانِ قوم نے بھیجی ہیں اُن سب کے لحاظ سے اصلی مسودہ ترمیم ہو کر از سرِ نو مرتب کیا جا رہا ہی جو عن قریب طبع ہو کر ہر صوبہ کے ممبروں کی خدمت میں (اور نیز ٹرسٹی صاحبان کالج کی خدمت میں) طلب رائے کی غرض سے بھیجا جانے والا ہی، رائیں موصول ہونے پر کانسٹیٹیوشن کمیٹی کے اجلاس کی ایک اور تاریخ مقرر ہو کر مسودہ آخری صورت اختیار کرے گا اور اس قابل ہو جائے گا کہ جانچ کے لئے پبلک کے سامنے پیش ہو سکے۔"

غرض شملہ کے مباحثہ کو مدنظر رکھ کر ڈپوٹیشن کے ممبروں نے ایک نیا مسودہ تیار کیا جو اوائل اگست میں شائع کیا گیا۔ اس مسودہ کی تیاری میں مولوی عزیز مرزا صاحب کو بھی شامل کر لیا گیا تھا۔

ممبر تعلیمات کا مراسلہ

جس زمانے میں مسودہ پر نظر ثانی کی کارروائی جاری تھی، آنریبل مسٹر بٹلر بالقابہ نے آنریبل سر راجہ صاحب (پریسیڈنٹ مسلم یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی) کے نام ۳۱ جولائی کو ایک خط لکھا۔ چونکہ یونیورسٹی کی تحریک کے سلسلہ میں یہ خط ایک خاص حیثیت رکھتا ہی۔ لہٰذا اس موقع پر اُس کا نقل کرنا بے جا نہ ہوگا۔ آنریبل ممدوح لکھتے ہیں:

"مائی ڈیر راجہ صاحب! آخر ماہ مئی گزشتہ میں آپ مع نواب مشتاق حسین آنریری سکرٹری محمدن اینگلو اورینٹل کالج، مسٹر آفتاب احمد خاں اور ڈاکٹر ضیاء الدین، علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز کے متعلق مجھ سے غیر ضابطہ طور پر ملنے تشریف لائے تھے۔ آپ نے فصیح و بلیغ زبان میں محمدن اینگلو اورینٹل کالج کی گزشتہ تاریخ اور موجودہ حالت بیان کر کے بتایا تھا کہ نتائج سر سید احمد خاں کی دوربینی کے عین مطابق نکلے ہیں۔ اور یہ کہ کالج

نہ صرف آپ کی قوم کے لئے بلکہ سلطنت کے لئے بھی نہایت مفید ثابت ہوا ہے
آپ نے بتایا تھا کہ کالج کو اُس کے مشہور بانی نے جن اصول پر قائم کیا تھا
اُن سے منحرف ہوئے بغیر وہ اپنے بانی کی موت کے بعد سے بہت زیادہ
بڑھ گیا ہی۔ جب ۱۸۹۸ء میں سر سید احمد خاں کا انتقال ہوا ہی تو کالج میں
تقریباً ۱۴۹ طالب علم تھے، اب تقریباً ۵۰۰ ہیں۔ اُس وقت اسٹاف میں
تین یورپین پروفیسر تھے۔ اب ۷ ہیں۔ اُس وقت آمدنی ۷۰ ہزار تھی۔ اب
۲ لاکھ ۱۲ ہزار کے قریب ہی۔ ۱۸۹۸ء میں کالج میں تقریباً کل صوبجات متحدہ
اور پنجاب ہی کے طالب علم تھے: اب اُس میں ہر حصۂ سلطنت ہند کے اور
اور ایران کے اور دیگر ممالک کے قائم مقام موجود ہیں۔ ۱۸۹۸ء کی بہ نسبت
لکچر کے کمروں اور بورڈنگ ہاؤسوں کی تعداد تقریباً سہ گنی ہو گئی ہی، اور
اور اس عرصہ میں سر سید احمد خاں کا کام جاری رکھنے کے لئے ۲۶ لاکھ سے
کم روپیہ جمع نہیں کیا گیا۔ مسلمانوں کے لئے علی گڑھ میں یونیورسٹی قائم کرنا
ایک خواب تھا۔ جو اُن کی عمر کے آخری ایام میں سر سید کے خیالات پر چھایا
رہتا تھا۔ آپ نے اُن فوائد کا بھی ذکر کیا تھا جو یونیورسٹی آپ کی قوم کو پہنچائیگی
نیز اُس ناکافی قائم مقامی کا جو موجودہ یونیورسٹیوں میں آپ کی قوم کو حاصل ہی
اور اُس جوش کا جو ہر درجہ کی تعلیم کے لئے آپ کی قوم کے اندر یونیورسٹی
سے پیدا ہو جائے گا۔ آپ نے اُس تفوق کو بھی ثابت کیا تھا جو ایک تعلیم
دینے والی یونیورسٹی کو ایک محض امتحان لینے والی یونیورسٹی پر حاصل ہی
اور مذہبی تعلیم اور السنۂ مشرقیہ کی حفاظت اور ضرورت کو ذہن نشین کیا تھا
آپ نے بیان کیا تھا کہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج نے اپنے بانی کی اغراض کو
پورا کرنے کے لئے بہت کچھ کیا ہی، مگر اب وقت آ گیا ہی کہ اس انسٹی ٹیوشن کے

دائرہ اور افادہ کو وسعت دی جائے اور اُس اسکیم کو مکمل کیا جائے جو بانی کالج کے مدنظر تھی۔ مجوزہ یونیورسٹی کے کانسٹی ٹیوشن کے متعلق آپ کی یہ خواہش تھی کہ وہ اُسی کالج کے بنیادی اصول پر ہو جس سے کہ یونیورسٹی پیدا ہوگی'' اور یہ کہ ایک طرف تو برٹش گورنمنٹ کو اُس پر کامل اعتماد ہو اور دوسری طرف ہندوستان کی اسلامی جماعت کو اُس پر پورا بھروسا ہو۔

اس معاملہ پر ہم نے غیر ضابطہ طور پر گفتگو کی تھی' اور میں نے آپ کی خواہشات کو گورنمنٹ ہند کے روبرو پیش کرنے کا ذمہ لیا تھا۔ یہ فیصلہ ہوا تھا کہ آگے بڑھنے سے پہلے یہ متیقن ہو جانا چاہیئے کہ آیا حضور ملک معظم کے وزیر ہند ''علی گڑھ میں ایک یونیورسٹی کا قائم ہونا پسند فرمائیں گے یا نہیں۔ لیکن میں آپ کو اور آپ کی کمیٹی کو مسرت کے ساتھ اطلاع دیتا ہوں کہ گورنمنٹ ہند اور حضور ملک معظم کے وزیر ہند یونیورسٹی کا قائم ہونا منظور فرمالیں گے، بشرطیکہ (اول) آپ کی کمیٹی یہ دکھا سکے کہ آپ کے ہاتھ میں اس مقصد کے لئے کافی سرمایہ موجود ہے اور (دوسرے) یہ کہ مجوزہ یونیورسٹی کا کانسٹی ٹیوشن تمام وکمال گورنمنٹ ہند اور حضور ملک معظم کے وزیر ہند کے لئے'' قابل منظوری ہو۔

میری تجویز یہ ہے کہ اب آسان طریقہ یہ ہوگا کہ آپ کی کمیٹی ایک مالی بیان مرتب کرے اور جو چندہ آپ نے جمع کیا ہے اور سرمایہ اور دوامی اخراجات کا آپ نے جو تخمینہ کیا ہے اُن کو مع اُن تجاویز کے جو آپ کی کانسٹیٹیوشن کے متعلق ہیں، بتائے اُس وقت میں خوشی کے ساتھ اُن کے متعلق آپ سے اور آپ کی کمیٹی کے ڈپوٹیشن سے گفتگو کرونگا اور صاحب وزیر ہند اور گورنمنٹ ہند کے فیصلہ سے وقت مناسب پر آپ کو مطلع کروں گا۔ اگر آخری طور پر یونیورسٹی قائم کرنے کا فیصلہ ہو جائے تو امپریل لیجیسلیٹو کونسل میں بل پیش کرنا ضروری ہوگا۔ گورنمنٹ ہند بخوشی آپ کی

کمیٹی کے ڈپوٹیشن کے مشورہ سے مسودہ قانون تیار کرے گی۔ اس وقت یہ معلوم کرسکنا ممکن نہیں ہی کہ اس اسکیم کی تکمیل میں کتنا عرصہ درکار ہوگا۔ اس کا انحصار اس کافی سرمایہ پر ہی جو آپ اپنے پیش نظر مقصد کے لئے فراہم کریں اور اُن تجاویز پر جو آپ کی کانسٹی ٹیوشن کے متعلق ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایجوکیشنل ڈپارٹمنٹ میں کوئی تاخیر نہ ہوگی اور جس مدد اور مشورہ کی آپ کی کمیٹی کو ضرورت ہوگی، وہ خوشی سے دیا جائے گا۔ مگر اس میں شبہہ نہیں کہ اس معاملہ کو آخر کار حضور ملک معظم کے وزیر ہند سے رجوع کرنا پڑیگا، جنھوں نے اپنے سامنے آخری صورت میں پیش ہونے والی تجویز کی ہر تفصیل کے متعلق اپنے اختیار کو محفوظ رکھا ہی۔"

نواب صاحب کا طرز عمل اور ایک یادداشت

کانسٹی ٹیوشن کا مسودہ شائع ہونے سے پہلے ملک میں طرح طرح کے خیالات پھیلے ہوئے تھے اور تاخیر نے بدگمانیاں پیدا کردی تھیں۔ نواب صاحب نے اس زمانۂ تاخیر میں متعدد مضامین لکھے، اخبارات کی نکتہ چینی کا جواب دیا اور لوگوں کو اطمینان دلایا کہ قومی حقوق کا پورا تحفظ کیا جائے گا، اس کے بعد جب ۹ اگست کو مسودہ شائع ہوا تو اس کے ساتھ ہی مسودہ کے متعلق اُنھوں نے اپنی ایک یادداشت بھی شائع کی جس میں مسودہ کے متعلق وضاحت سے بحث کرکے اپنی رائے بھی ظاہر کردی۔

اس وقت حالت یہ تھی کہ پبلک کو یہ توقع تھی کہ یونیورسٹی گورمنٹ کی مداخلت سے قریباً آزاد ہوگی۔ لوگوں نے طرح طرح کی اُمیدیں دلوں میں قائم کر رکھی تھیں۔ لیکن ظاہر ہی کہ یہ سب اُمیدیں کیوں کر پوری ہوسکتی تھیں۔ اس لئے نواب صاحب نے ہمیشہ یہ احتیاط رکھی کہ پبلک کو زیادہ اُمیدیں نہ دلائی جائیں چنانچہ مسودہ شائع ہونے سے پہلے اُنھوں نے ایک موقع پر اخبار وکیل کے جواب میں لکھا کہ:

" قوم کو ضرورت سے زیادہ توقع دلانا خلاف مصلحت ہی، یونیورسٹی کا دینا

نہ دینا بالکل گورنمنٹ کے اختیار میں ہے اور جب تک کہ گورنمنٹ سے اس کے متعلق
منظوری اور ہمارے اختیارات کی تشریح نہ ہو جائے اُس وقت تک پبلک کے سامنے
کچھ کہنا بہت ہی قبل از وقت ہوگا۔"

اسی طرح مسودہ کی اشاعت سے پہلے اُنھوں نے اپنے مختلف مضامین میں اُن مشکلات کی طرف اشارہ کر دیا تھا جو مسودہ کی ترتیب میں درپیش تھیں۔ اس کے بعد جب مسودہ شائع ہوا تو اُنھوں نے قدرتاً یہ محسوس کیا کہ پبلک اس کو اپنی توقعات سے کمتر پائے گی۔ لہذا اپنا بیان شائع کرنا ضروری سمجھا تاکہ لوگ ان مشکلات کو پیشِ نظر رکھیں۔

نواب صاحب کا یہ بیان مسلم یونیورسٹی کی تدریجی تاریخ کے سلسلہ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے ہم اس کو تمام و کمال نقل کرتے ہیں جو حسب ذیل ہے:

"(۱) جس مسودہ کانسٹی ٹیوشن کا مدت سے انتظار کیا جا رہا تھا وہ اب ممبران کانسٹی ٹیوشن کمیٹی اور ٹرسٹیان کالج کے ملاحظہ اور اظہار رائے کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس موقع پر میں مناسب سمجھتا ہوں کہ مسودہ کے بعض اہم مطالب کے نسبت کچھ عرض کروں۔ اب تک جن خیالات کا اظہار پبلک کی طرف سے اخباروں اور خطوط کے ذریعے سے ہوا ہے اُن میں جس قسم کے شبہات اور خطرات ظاہر کئے گئے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اس مسودہ کے ملاحظہ کے بعد وہ رفع ہو جائیں گے۔

(۲) سب سے پہلے ہم سب کو یہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ اس وقت ہندوستان کی یونیورسٹیاں گورنمنٹ کے اپنے ہاتھ میں ہیں اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ گورنمنٹ ہم کو ایک یونیورسٹی عنایت کرے تو اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ جو حقوق گورنمنٹ کی جانب سے موجودہ یونیورسٹیوں کے سند یافتہ طلبہ کو حاصل ہوتے ہیں وہی ہماری مسلم یونیورسٹی کے سند یافتہ طلبہ کو بھی حاصل ہوں، اس حالت میں گورنمنٹ ضرور پہلے سے اس بات پر غور کرے گی کہ کیا بلحاظ اس اعتماد کے جو مسلم یونیورسٹی کے کام کرنے والوں پر ہونا

چاہیے اور کیا بلحاظ مسلم یونیورسٹی کے قواعد وضوابط کے اور کیا بلحاظ اس کی مالی حالت کے مسلم یونیورسٹی کے پاس ایسا ذخیرہ موجود ہے جس پر گورنمنٹ اطمینان کر سکے کہ مسلم یونیورسٹی کے سند یافتہ طلبہ کم از کم ایسی ہی قابلیت رکھیں گے اور ایسے ہی قابل اعتماد ہوں گے جیسے موجودہ گورنمنٹی یونیورسٹیوں کے طلبہ۔

(۳) دوسری طرف ہم لوگ بھی بالکل برسرِ حق ہوں گے اگر اس بات کی خواہش کریں کہ گورنمنٹ کو ہر قسم کا ضروری اطمینان دلانے کے بعد ہم کو بھی ایک ایسی واجبی آزادی حاصل ہونی چاہیئے جو مجوزہ یونیورسٹی کو عام کی نگاہ میں باوقعت ثابت کرے، اور اس کے چلانے والوں کے بھی اعزاز کے منافی نہ ہو۔

ان دونوں مشکلات پر پوری طرح غور کرنے کے بعد میں ملک کو مبارکباد دیتا ہوں کہ جہاں تک کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے امکان میں تھا، ہم ایک ایسی مسودہ کے بنانے میں اس وقت کامیاب ہوگئے ہیں جس سے دونوں قسم کی مذکورۂ بالا مشکلات حتی الامکان رفع ہوگئی ہیں، لیکن ابھی تک ہم لوگ بھی اس بات کے لئے آزاد ہیں کہ اگر اس مسودہ میں کسی واجبی ترمیم کی ضرورت ہو تو اس کو مسودہ میں داخل کریں اور گورنمنٹ کے وہ حکام بھی (جن سے اس وقت تک پرائیویٹ طور پر کچھ گفتگو کی عزت حاصل ہوئی ہے) آزاد ہیں کہ جس کو وہ مناسب نہ سمجھیں اس کے متعلق مزید اصلاح و ترمیم کی فرمائش کریں۔

(۴) سب سے بڑا خیال جو مسلمان پبلک کو ہے (اور جو حقیقت مسلمانوں کے لئے اور اسلامی یونیورسٹی کے لئے) جانِ سخن ہے، وہ ہماری مذہبی تعلیم و تربیت ہے اور اس مسودہ کے ناظرین دیکھیں گے کہ اس کی نسبت مسودہ میں ہر جگہ کافی حفاظت کی گئی ہے، مذہبی تعلیم و تربیت کی منتظم جماعتیں علیحدہ تجویز کی گئی ہیں، جو تمام تر علمائے مذہب کے تحت انتظام ہوں گی، جن کا نام فیکلٹی دینیات ہے۔ سنی اور شیعہ یہی دو سب سے بڑے گروہ ہندوستان کے مسلمانوں میں ہیں اور ان دونوں گروہوں کے علماء

کی شرکت اُن جماعتوں میں اسی طرح لازمی ہی جس طرح آج کالج میں کمیٹی دینیات اہل سنت وجماعت و امامیہ اثنا عشریہ ہیں۔

(۵) اعلیٰ حکمران جماعت جس طرح اب تک کالج میں صرف مسلمانوں سے مرکب ہی، اسی طرح آیندہ بھی یہ اعلیٰ حکمرانی صرف مسلمان ٹرسٹیوں کے ہاتھ میں رہنے کے واسطے مسودہ میں تجویز کی گئی ہی اور جس قدر اس وقت مسلمان ٹرسٹی کالج میں ہیں وہ سب کے سب بطور کورٹ آف ٹرسٹیز کے یونیورسٹی کی اعلیٰ جماعت حکمراں متصور ہوں گے۔

(۶) جس طرح اس وقت ٹرسٹیوں کا سنڈیکیٹ صرف مسلمان ٹرسٹیوں سے مرکب ہی، اسی طرح آیندہ یونیورسٹی میں بھی وہ جماعت ازنام "کونسل" کورٹ آف ٹرسٹیز کے ماتحت۔ بطور ایک کارپرداز جماعت کے صرف ٹرسٹیز (یعنی مسلمان ممبروں) سے مرکب ہوگی۔

(۷) ہمارے موجودہ قانون کالج میں روزمرہ کے انتظامات کالج و بورڈنگ ہاؤس و ڈسپلن اور نصاب تعلیم تجویز کرنے کی غرض سے بورڈ آف مینجمنٹ اور کمیٹی مدبران تعلیم السنہ مختلفہ وعلوم دینیہ قائم ہیں اور اُن میں مختلف مذاہب کے علماء اور منتظمین شامل ہیں۔ اسی طرح موجودہ مسودہ میں ایک جماعت ازنام سینٹ قائم کی گئی ہی۔ جو بہ تحت نگرانی کورٹ اور کونسل اپنے فرائض کو مراتب مندرجہ بالا کی نسبت عمل میں لائے گی اور جس طرح کورٹ آف ٹرسٹیز کے ماتحت ایک مختصر جماعت ٹرسٹیان کی ازنام کونسل تجویز ہوئی ہی، اسی طرح سینٹ کے ماتحت ایک مختصر جماعت ممبران سینٹ کی روزمرہ کی کارروائی کی غرض سے ازنام سنڈیکیٹ بنائی گئی ہی، اور یہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ سب سے اعلیٰ جماعت کورٹ آف ٹرسٹیز ہے جو صرف مسلمانوں سے مرکب ہی۔

(۸) "چانسلر" اور "وائس چانسلر" کی نسبت بھی لوگوں کو بہت خیال ہی کہ کون مقرر ہوتا ہی، موجودہ یونیورسٹیوں میں چانسلر صوبہ کے اعلیٰ حکام ہوتے ہیں جن کو اختیار ہی کہ سینٹ میں اپنی تجویز سے فی صدی ساٹھ، ستر اور کہیں اس سے بھی زیادہ ممبر مقرر کرتے ہیں اور وائس چانسلر کو بھی وہی اپنی رائے سے مقرر کرتے ہیں، چونکہ ہماری یونیورسٹی کسی خاص صوبہ سے متعلق نہیں ہی، بلکہ اس کا تعلق ہندوستان کے کل صوبوں سے ہی لہٰذا یہ ہر طرح قرینِ مصلحت سمجھا گیا ہی کہ حضور وئیسرائے کو اس یونیورسٹی کا چانسلر بنایا جائے اور سینٹ میں ۵ ممبر اُن کی طرف سے داخل کرنے تجویز ہوئے ہیں۔ وائس چانسلر کی نسبت ناظرینِ مسودہ یہ دیکھیں گے کہ وہ کورٹ کے ممبروں میں سے کوئی شخص ہوگا اور کورٹ ہی اس کو منتخب کرے گا اور اس لئے اس کا ہمیشہ مسلمان ہونا لازمی ہی، چانسلر کی پیشگاہ سے اُن کے تقرر کی منظوری ہوگی۔

اگر یہ تجویزیں گورنمنٹ سے منظور ہو جائیں، تو اس سے زیادہ معتدل کارروائی اور کوئی ہو نہیں سکتی، وائس چانسلر ہی کورٹ آف ٹرسٹیز کا سکرٹری ہوگا اور کونسل و سینٹ کا پریسیڈنٹ۔

سینٹ میں کافی تعداد کورٹ آف ٹرسٹیز کے قائم مقاموں اور مسلمان ممبروں کی داخل کی گئی ہی اور خاص کر علما کے گروہ میں سے بھی اس میں ممبر تجویز کئے گئے ہیں۔

(۹) ہمارے قدیم مشرقی علوم کی جماعت علحدہ تجویز کی گئی ہی، جس میں لازمی طور پر ایک کافی تعداد علما کی شریک ہوگی اور اگر خدا کے فضل و کرم سے مسلمانوں کو یہ یونیورسٹی مل گئی تو لوگ دیکھیں گے کہ پھر ایک دفعہ نئے سرے سے ہمارے قدیم علوم زندہ ہوتے ہیں، بڑے بڑے نامی عالم حدیث، تفسیر، فقہ، ادب اور مختلف علوم و فنون کے یونیورسٹی کے احاطہ میں دکھائی دیں گے اور اُن کے فیضِ صحبت سے ہمارے نوجوان طلبہ مستفیض ہونگے۔

(۱۰) حضور والیسرائے اگر چانسلر کے عہدہ کو قبول فرمالیں، تو اس سے نہ صرف یونیورسٹی کا اعتماد ہی بہت زیادہ بڑھ جائے گا۔ بلکہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ہر گونہ مایۂ افتخار ہوگا، اسی طرح تمام صوبوں کے اعلیٰ حکام کی ہمدردی کا بھی ہماری یونیورسٹی کی نسبت قائم رہنا بہت ضروری ہی اور اس لئے ان اعلیٰ حکام کے واسطے بھی اکس افیشیو "ریکٹر" کا ایک عہدہ تجویز کیا گیا ہی، اور ہمارے والیانِ ریاست جو یونیورسٹی کے ساتھ دل چسپی رکھتے ہیں، وہ بھی حضور والیسرائے کی منظوری کے بعد (جس سے اس انتخاب کی ایک خاص عظمت و وقعت قائم ہوتی ہی) یونیورسٹی کے "ریکٹر" مقرر کئے جائیں گے اسی طرح دوسرے وہ معتقد رحضرات جو بلحاظ اپنی قومی خدمات، اور دل چسپی کے جو وہ تعلیمی معاملات میں رکھتے ہیں، اُن کے واسطے وزیٹر کا عہدہ اس مسودہ میں داخل کیا گیا ہی، یہ تقررات بھی حضور ویسرائے کی منظوری سے عمل میں آئیں گے بعض اور فقرات کی نسبت بھی حضور چانسلر کی منظوری مناسب سمجھی گئی ہی، جس کی نسبت مجھے اندیشہ ہی کہ بعض ناظرین شاید اُس کو یونیورسٹی کی آزادی کے خلاف تصور کریں، لیکن واقعہ یہ ہی کہ چانسلر کے ہاتھ میں یہ اختیار ہونے سے منتظمان یونیورسٹی کی کارروائی بہت زیادہ محفوظ ہو جاتی ہی، ملک میں جو حالت شورش کی ہی اور جس قسم کے گورنمنٹ کی بدخواہی کے حالات کبھی کبھی ظہور میں آتے رہتے ہیں اور اس ضرورت سے گورنمنٹ کو اپنے جو ذرائع معلومات وسیع رکھنے پڑتے ہیں، اُن معلومات کے لحاظ سے گورنمنٹ کو جو موقع افراد خاص کے رویہ کے متعلق واقعات کے معلوم ہونے کا ہی وہ یونیورسٹی کے منتظموں کو حاصل نہیں ہی، لہذا گورنمنٹ کے لئے ایسا قابو موجود رہنا خود ہماری حفاظت کا ذریعہ ہوگا، اگر گورنمنٹ کی پاس ہمارے کسی ملازم کے برخلاف کچھ واقعات موجود ہیں تو وہ اس سے ہم کو مطلع کریں گے اور ہم ایسے لوگوں کو اپنے انتظام میں شریک کرنے سے باز رہیں گے۔ دوسرے اکثر مواقع پر چانسلر کے واسطے ایک اختیار ویٹو کا بھی تجویز

کیا گیا ہی یہ اختیار جہاں تک کہ اس کا تعلق قواعد و ضوابط سے ہی آج بھی ہمارے قانون کی رو سے، اس صوبہ کی لوکل گورنمنٹ کو حاصل ہی آیندہ وہ اختیار صوبہ کی گورنمنٹ سے منتقل ہو کر حضور وائسرائے پر بحیثیت چانسلر منتقل ہو جاتا ہی، اسی طرح بعض اور مواقع پر بھی حضور چانسلر کے واسطے ویٹو کا اختیار مسودہ میں درج ہی، یہ اختیارات درحقیقت گورنمنٹ آف انڈیا کے شاہی اختیارات کا ایک جزو ہیں جس سے ہم کو کسی بدگمانی میں مبتلا ہونا نہیں چاہیئے اور آج جو اختیارات بہت سے معاملات کے متعلق ہمارے موجودہ قواعد و قوانین کالج میں لوکل گورنمنٹ کو حاصل ہیں اور ٹرسٹیان کالج پابند ہیں کہ لوکل گورنمنٹ کے مشوروں کے مطابق تعمیل کریں یا تعمیل نہ کر سکنے کے وجوہ گورنمنٹ میں پیش کریں قریباً قریباً وہی سب اختیارات موجودہ حضور چانسلر کی طرف منتقل ہو گئے ہیں اور یہ بھی خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ گورنمنٹ جب یونیورسٹی کے انتظاموں پر اس درجہ اپنا اعتماد ظاہر کرے کہ وہ اپنی یونیورسٹیوں کے گریجوائٹوں اور ہماری یونیورسٹی کے گریجوائٹوں میں کوئی فرق و امتیاز باقی نہ رکھے تو اس کا حق ہی کہ اس قسم کے اختیارات (جو عملاً ہمیشہ بہت کم اور نہایت اہم ضرورتوں کے وقت کام میں لائے جاتے ہیں) اپنے ہاتھ میں رکھے۔

(۱۱) بالآخر میں یہ نہیں کہتا کہ موجودہ مسودہ بالکل ایک مکمل حالت میں ہی صرف یہ کہتا ہوں کہ جو مفید صلاحیں اور مشورے اس مسودہ کے متعلق دیئے جائیں گے اُن پر کمیٹی (جس کے اجلاسوں کی تاریخیں ۱۸ - ۱۹ - ۲۰ اگست سنہ ۱۹۱۱ء بمقام لکھنؤ مقرر ہیں) بہت توجہ کے ساتھ غور کرے گی اور جو اصلاح مناسب معلوم ہو گی اس کا قبول کرنا کمیٹی اپنا فرض سمجھے گی۔

(۱۲) مسودہ میں اکثر جگہ تکرارات پائے جائیں گے نیز بعض جگہ ناظرین خیال کریں گے کہ فلاں مضمون پہلے آنا چاہیئے تھا فلاں بعد میں، لیکن اس قسم کی اصلاح اس آخیر شخص

چھوڑ دی گئی ہے جو بطور ایک مستند واقف فن کے ان قواعد وضوابط کو مرتب کرے گا۔"

کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے اجلاس

اس کے بعد کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کا دوسرا جلسہ ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱ اگست کو لکھنؤ میں منعقد ہوا اور جدید مسودہ مباحثہ کے بعد کمیٹی نے منظور کیا۔ بعد ازاں کمیٹی کے ممبروں کا ایک ڈپوٹیشن شملہ گیا جس نے ۲۳ ستمبر سنہ ۱۹۱۱ء کو یہ مسودہ باضابطہ طور پر آنریبل ممبر تعلیمات کی خدمت میں پیش کیا، انھوں نے کمیٹی کے غور کے لئے چند مشورے پیش کئے اور یہ خواہش ظاہر کی کہ اس سے پہلے کہ بل امپیرل کونسل میں پیش ہو، ریگولیوشن انھیں دکھائے جائیں، چنانچہ کانسٹی ٹیوشن کمیٹی نے اپنے تیسرے اجلاس میں جو (شملہ پر منعقد ہوا) ان مشوروں پر بحث کی اور دو سب کمیٹیاں[1] بائی لاز اور ریگولیوشن تیار کرنے کے لئے بنائیں۔

نواب صاحب کے مخصوص خیالات

شملہ سے واپسی کے بعد سب کمیٹیوں نے اپنا کام شروع کیا اور چند روز بعد ریگولیشنز (قواعد وضوابط کا مسودہ) تیار ہوا اور یہ قرار پایا کہ اس مسودہ اور دوسرے امور پر غور کرنے کے لئے، ۲، ۳، ۴ جون سنہ ۱۹۱۲ء کو کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کا چوتھا جلسہ لکھنؤ میں منعقد کیا جائے۔ یہ مسودہ اس وقت نواب صاحب کے زیر غور تھا اور وہ حسب عادت پوری توجہ سے اس کے مطالعہ میں مصروف تھے کہ دفعتاً ان پر فالج کا اثر ہوا جس نے دماغ کو سخت صدمہ پہنچایا، ابتدا میں انھوں نے اس خبر کو مشتہر نہیں کیا، چند روز بعد طبیعت ذرا سنبھلی مگر دماغ کی حالت اب بھی اس قابل نہ تھی کہ وہ مسودہ پر غور کر سکیں یا کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کیلئے لکھنؤ جا سکیں لیکن جو تعلق خاطر ان کو یونیورسٹی کے مسئلہ سے تھا اس نے مجبور کیا کہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے اپنے خیالات قوم تک پہنچا دیں، چنانچہ اسی علالت کی حالت میں ایک مضمون لکھا،

---

[1] بائی لاز سب کمیٹی کے سکرٹری صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب اور ریگولیشنز سب کمیٹی کے سکرٹری ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب بنائے گئے، (ندوی)

ابتدا میں اپنی معذوری اور علالت کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

" اب یہ وہ وقت ہے جب کہ میں نہایت افسوس کے ساتھ یونیورسٹی کے قواعد و ضوابط پر غور اور بحث کرنے سے گویا دائمی مفارقت اختیار کرتا ہوں اور اب اس موقع پر چند الفاظ کا بزرگانِ قوم کی خدمت میں صاف صاف عرض کر دینا اپنا آخیر اور نہایت اہم فرض سمجھتا ہوں اور ایسی حالت میں اگر مجھ سے کوئی امر خلاف رازداری بھی سرزد ہوتا ہو تو میں اس کی معافی چاہتا ہوں۔ کیوں کہ قوم کو اصلی حالت سے بے خبر رکھنا یہ اس سے بھی زیادہ گناہ ہے۔

واقعات یہ ہیں کہ ابتدا سے اس وقت تک جن دوستوں کے ہاتھ میں قواعد و ضوابط کے مسودات کا مرتب کرنا رہا ہے۔ انھوں نے ہمارے قومی مقاصد کی بہ نسبت اسٹاف کی اغراض کو اپنے مسودات میں زیادہ ملحوظ رکھا ہے لیکن ان سے زیادہ تعلیمی معاملات میں دوسرا کوئی تجربہ کار اور واقف کار شخص (جو اپنا اس قدر وقت اس کام میں دے سکتا) موجود بھی نہیں تھا اور فی الواقع انھوں نے اس کام میں بہت ہی زیادہ محنت برداشت کی جس کے لحاظ سے وہ ہر طرح شکریہ کے مستحق ہیں اور جو نقصانات کہ ان کے مسودات میں تھے ان کی نسبت ان لوگوں نے جن کو قومی مقاصد کا لحاظ زیادہ تھا یہ خیال کر لیا تھا کہ بالفعل وہ کل خیالات معرض تحریر میں تو آجانے چاہئیں جو ان تجربہ کار اور لائق مصنفینِ مسودات کے نزدیک ضروری ہیں۔ اس کے بعد پھر دوسرے لوگ جب ان پر غور کریں گے تو ان کو اعتدال کی حالت میں لے آئیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اسٹیٹوٹس (جن کا تصفیہ اس سے پہلے کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے سامنے ہو چکا ہے) ان کے متعلق یہی عمل ہوا، اور بعد بہت عریض و طویل مباحثات کے مسودہ نے ایک اعتدال کی صورت اختیار کی گو کہ میں جرأت کے ساتھ اب بھی یہ عرض کرنے کی معافی چاہتا ہوں کہ قومی مقاصد کے

لحاظ سے اب بھی اس میں بعض اہم سقم رہ گئے ہیں مگر پھر بھی جو کچھ ہو گیا ہی بسا غنیمت ہی
گزشتہ کمیٹیوں اور مباحثات کے وقت میں نے اپنے آپ کو بالکل اپنی قوم کے وکیل کی
حیثیت سے قائم رکھا اور کتنے ہی اصحاب نے بھی اور خاص کر جناب آنریبل سر
راجہ صاحب محمود آباد نے جہاں تک ممکن تھا اپنے قومی مقاصد کو محفوظ رکھنے
میں پوری کوشش کی - مجھے کسی ممبر کمیٹی کے متعلق بھی یہ عرض کرنے کا حق نہیں ہی کہ
انھوں نے قومی مقاصد کی پوری حفاظت نہیں کی بلکہ میں بلا عذر یہ تسلیم کرنے کے لئے
موجود ہوں کہ ہر ایک نے جو رائے دی وہ نہایت نیک نیتی کے ساتھ دی اور اسی طرح
میں مصنفینِ مسودات کی نیتوں پر بھی کوئی حملہ کرنا ناانصافی میں داخل سمجھتا ہوں -
لیکن نیک نیتی سے کسی رائے کا دینا اور بات ہی اور اس رائے کا قومی مقاصد کے
واسطے مفید یا مضر ہونا بالکل جداگانہ امر ہی - ممکن ہی کہ میں جو رائے رکھتا ہوں وہ
قوم کے حق میں مضر ہو اور جن کی رائے میری رائے سے خلاف ہو ان ہی کی رائے
قوم کے حق میں مفید ہو - لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ جب اختلافات موجود
ہوں تو معاملات بہت ہی زیادہ غور کے محتاج ہوں گے اور قوم کا یہ فرض ہی کہ جب
اُن کا ایک ایسا وکیل جو کالج کے آنریری سکرٹری کی پوزیشن میں تھا کمیٹی سے
علٰحدہ ہوتا ہی تو آئندہ بزرگان قوم بہت زیادہ اپنے حقوق کی حفاظت کا خیال کریں -

رگیولیشنز کا مسودہ انگریزی جو غور کے لئے چھاپا گیا ہی اور ممبران کمیٹی کی
خدمت میں بھیجا گیا ہی اور جس کے تصفیہ کے لئے ۳ رجون کی تاریخ مقرر ہی اور لکھنؤ
میں کمیٹی منعقد ہونے والی ہی ، اس پر جہاں تک مجھکو غور کرنے کا موقع ملا ہی - وہ بہت
زیادہ اصلاح کا محتاج ہی اور جو کچھ اس میں اس وقت درج ہی اگر بدقسمتی سے وہی
اخیر وقت تک قائم رہ جائے تو میں صاف یہ رائے دوں گا کہ ایسی یونیورسٹی کو ہمیں
دور ہی سے سلام کرنا چاہیئے ، جس کے رگیولیشنز کے ذریعے سے ہم اپنی اس

آزادی کو بھی کھو بیٹھیں گے جو آج ہم کو علی گڑھ کالج کی موجودہ حالت اور موجودہ قانون کی بموجب حاصل ہے۔"

اسی سلسلہ میں اُنھوں نے یہ بھی بیان کیا کہ۔

"میں نے کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے پریسیڈنٹ (سر راجہ صاحب محمود آباد) سے یہ درخواست کی ہے کہ وہ چند ایسے ممبروں کو کانسٹی ٹیوشن کمیٹی میں شامل کریں جن کو قوم اپنا قائم مقام تسلیم کرتی ہو اور وہ بھی اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوں"

اس کے بعد اُنھوں نے قوم کو راجہ صاحب پر اعتماد کرنے اور اُن کی پوزیشن کو مضبوط و مستحکم بنانے کی صلاح دی ہے، تاکہ

وہ مسلم یونیورسٹی کے واسطے ایک ایسا نظام گورنمنٹ سے حاصل کر لینے میں کامیاب ہوں جو ایک طرف گورنمنٹ کے اطمینان کا موجب ہو اور دوسری طرف ہماری واجبی حقوق کی پوری حفاظت ہوتی ہو۔

اس کے بعد معذرت کرتے ہیں کہ:

"مجھکو اندیشہ ہے کہ ممبر صاحبان کانسٹی ٹیوشن کمیٹی میں سے شاید کسی صاحب کو میری یہ گزارش ناگوار گزرے اور بدقسمتی سے ایسا ہو تو میں اُن بزرگوں کی خدمت میں اپنی اس جسارت کی بہت بہت معافی چاہتا ہوں، میں نے جو کچھ عرض کیا ہے نہایت مجبوری کی حالت میں عرض کیا ہے، ایک طرف جب قوم کی کشتی طوفاں میں آئی ہوئی ہو، تو جو کچھ بھی کوشش ممکن ہے وہ اُسی کے بچانے میں صرف کی جا سکتی ہے اور جبکہ اُس کشتی کا بچانا ہمارا سب کا متفقہ مقصد ہے، تو مجھکو اُمید ہے کہ کوئی بھی ہم سے میرے اس جسارت پر بُرا نہ مانے گا۔

آخر میں گورنمنٹ کے طرز عمل اور قوم کے مطالبات پر بحث کرنے کے بعد کانسٹی ٹیوشن کے ممبروں اور کالج کے ٹرسٹیوں کو اتحاد عمل کی صلاح دی ہے، پھر قوم کو روپیہ فراہم کرنے کی ترغیب

دے کر لکھا ہے۔

جو کچھ میں نے اس وقت قوم کے سامنے کانسٹی ٹیوشن کا مسئلہ پیش کیا ہے اور قوم سے خواہش کی ہے کہ کانسٹی ٹیوشن اور ریگیولیشنز اور بائی لاز کو اس طرح مرتب کرنا چاہیئے جو قوم کے مقاصد کے لئے ضروری ہو، اُس کا صاف صاف عرض کر دینا میرا فرض تھا، ہمارا کام ہے کہ ہم قوم کے سامنے واقعات کو صحیح صحیح طور سے پیش کریں،،

سر راجہ صاحب کا علی گڑھ آنا اور مسودہ پر مباحثہ

جب سر راجہ صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ نواب صاحب لکھنؤ کے جلسہ میں شریک نہیں ہو سکتے تو ۲۵ مئی ۱۹۱۲ء کو وہ خود لکھنؤ سے تشریف لائے کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے چند قانون دان ممبر بھی جناب ممدوح کے ہمراہ تھے، راجہ صاحب کے علاوہ نواب صاحب کی درخواست پر نواب حاجی محمد اسحٰق خاں صاحب بھی میرٹھ سے آگئے فوراً ایک مخصوص جلسہ خان بہادر نواب محمد مزمل اللہ خاں صاحب کی کوٹھی پر منعقد ہوا، علاوہ باہر کے متعدد اصحاب کے مقامی ٹرسٹی بھی اس جلسہ میں شریک ہوئے۔ دو روز تک یہ جلسہ جاری رہا، نواب صاحب نے ریگیولیشنز کے مسودہ اور بعض دوسرے امور کے متعلق جو سرسری یادداشت مرتب کی تھی، پیش کی، جس پر بڑی سرگرمی سے مباحثہ ہوا، اس کے علاوہ بعض دوسرے ممبروں نے بھی بحث طلب امور پیش کئے جن پر غور کیا گیا، چنانچہ مسودہ میں جابجا ترمیم عمل میں آئی اور قرار پایا کہ جو کچھ اس جلسہ میں طے ہوا ہے، لکھنؤ میں کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے جلسہ میں پیش کیا جائے۔

لکھنؤ کا اجلاس

اس کے بعد لکھنؤ میں جلسہ منعقد ہوا، متعدد ممبر شریک تھے، تحریری رائیں بھی باہر سے آئی تھیں، مسودہ پر خوب بحث ہوئی اور سو سے زیادہ مقامات پر ترمیم عمل میں آئی اور قرار پایا کہ یہ مسودہ اخبارات میں پبلک کی اطلاع و طلب رائے کے لئے شائع کیا جائے۔ دینیات کے نصاب تعلیم اور انتظامات کے متعلق بھی ایک سب کمیٹی کا تقرر منظور ہوا جس میں سُنّی اور شیعہ علماء شریک ہونگے اور اُن کی تجاویز کے مطابق مسودہ میں ترمیم ہوگی۔

گورنمنٹ کا افسوسناک اعلان اور ایجی ٹیشن

لکھنؤ کے جلسہ سے پہلے اور اُس کے بعد بھی طرح طرح کی افواہیں مشہور تھیں

کہ گورنمنٹ مسلم یونیورسٹی کو الحاق کا حق نہ دے گی، نواب صاحب نے اپنے مضامین میں، ان خیالات کو بے بنیاد بتایا اور لکھا کہ ابھی گورنمنٹ نے اس قسم کا کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے، لیکن دفعتاً جولائی ۱۹۱۲ء کے آخری عشرہ میں شملہ سے حسب ذیل سرکاری اعلان شائع ہوا،

"یہ قطعی طور پر فیصلہ ہو گیا ہے کہ علی گڑھ اور بنارس کی یونیورسٹی کا دائرہ (اثر) اُسی مقام تک محدود ہو جس میں کہ وہ (یونیورسٹی) قائم ہو"

یہ اعلان برقی رو کی طرح تمام ہندوستان میں پھیل گیا، مایوسی و بد دلی نے لوگوں میں جوش و غصہ پیدا کر دیا اور چندہ کی رفتار دفعتہً رُک گئی، نواب صاحب کے قیام کا علی گڑھ میں یہ آخری ہفتہ تھا، وہ کالج سے دست کش ہو چکے تھے اور وطن کی روانگی کا قصد کر رہے تھے، صحت اچھی حالت میں نہ تھی، اس اعلان نے ان کو بے حد متاثر کیا، انھوں نے ایک طویل مضمون قوم کی رہ نمائی کے لیے لکھا۔ اُس مضمون میں اُنھوں نے صاف طور پر لکھدیا کہ:

"میری رائے تو یہ ہے کہ باوجود گورنمنٹ کے اس اعلان کے مسلمانوں کو بدستور اپنی خواہش پر قائم رہنا چاہیے اگر آج ہم اس پر رضامندی دے دیں تو کل کو خود ہمارے ہاتھ کٹے جاتے ہیں اور ہماری آیندہ نسلیں جو عدم الحاق کے نقصانات سے متاثر ہوں گی وہ ہمارے اوپر لعنت بھیجیں گی کہ ہم نے ایک ایسے انتظام کو قبول کر کے اپنی نسلوں کو یونیورسٹی کے فوائد سے محروم کر دیا"

اس وقت چونکہ گورنمنٹ نے عدم الحاق کے وجوہ نہیں بیان کیے تھے، اس لئے اُنھوں نے گورنمنٹ سے وجوہ کا مطالبہ بھی کیا ہے اور اُس کے بعد لکھا ہے۔

یہ بات مدت سے محسوس ہوتی چلی آرہی ہے کہ گورنمنٹ غریبوں کو اعلیٰ تعلیم سے روکتی ہے، تعلیم کے مصارف کا روز بروز بڑھتا جانا اس بات کی صاف دلیل ہے اور اب یہ حال کا حکم سونے پر سہاگہ کا کام دیتا ہے"

تمام اسلامی اخبارات اس معاملہ میں نواب وقار الملک کے ہمنوا تھے اور عام رائے یہی تھی

کہ غیر الحاقی یونیورسٹی مسلمانوں کے لئے مفید نہیں ہے، معاملہ از سر نو غور و توجہ کا محتاج تھا اس لئے ایک اور جلسہ کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کا ۱۱، ۱۲ اگست ۱۹۱۲ء کو لکھنؤ میں قرار پایا تاکہ گورنمنٹ کمیونک نے حالت میں جو تبدیلی پیدا کر دی ہے اس پر غور کرے۔

جلسہ سے ایک روز پہلے گورنمنٹ کا ایک مراسلہ تار کے ذریعے سے مسٹر راجہ صاحب محمود آباد کو ملا جو ۹ اگست ۱۹۱۲ء کو شملہ سے چلا تھا، اس مراسلہ میں تمہید کے بعد بیان کیا گیا تھا کہ:

"ہز مجسٹی کے وزیر ہند نے کامل غور کے بعد فیصلہ کر دیا ہے کہ مجوزہ یونیورسٹی کو یہ اختیار نہ ہو کہ جس مقام پر وہ قائم ہو اس سے باہر الحاق کر سکے"

اس کے بعد یہ ظاہر کیا ہے کہ سر سید بھی مقامی یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے، پھر چند دلائل الحاق کی مضرت پر بیان کئے ہیں اور اسی سلسلہ میں اعتراف کیا ہے کہ:

"ہز مجسٹی کے وزیر ہند اور گورنمنٹ ہند تسلیم کرتے ہیں کہ اس سے قوم (مسلمانان) کو مایوسی ہوگی۔ لیکن ان کو یقین ہے کہ آگے چل کر اس سے اس کو بہترین فوائد حاصل ہوں گے"

اس کے بعد کانسٹی ٹیوشن پر توجہ کی ہے اور لکھا ہے کہ:

"مجوزہ کانسٹی ٹیوشن کے اندر معتد بہ ترمیم کرنی ضروری ہوگی، صاحب وزیر ہند نے فیصلہ کر دیا ہے کہ

(۱) حضور وائسرائے چانسلر نہوں۔

(۲) یہ کہ یونیورسٹی اپنا چانسلر خود انتخاب کرے

(۳) اور یہ کہ جو اختیارات چانسلر کو تفویض ہوئے ہیں ان کو گورنر جنرل باجلاس کونسل کام میں لائیں۔

(۴) یہ ضروری ہے کہ نصاب تعلیم، تربیت اور امتحانات کے متعلق کل معاملات

ماہرین تعلیم کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں۔

(۵) سینیٹ کے قائم مقاموں کے لئے کچھ جگہیں کونسل میں محفوظ رکھنی چاہئیں۔

آخر میں یہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ:

"ہز مجسٹی کے وزیر ہند کانسٹی ٹیوشن کے متعلق مع اس کی جملہ تفصیلات کے اور علی الخصوص یونیورسٹی کی جماعت ہائے ترکیبی کے درمیان تقسیم اختیارات کے متعلق اپنے فیصلہ کو ہنوز محفوظ رکھتے ہیں"

مراسلہ کے آخر میں یہ بھی ظاہر کر دیا گیا تھا کہ:

'یہ یونیورسٹی آئندہ علی گڑھ یونیورسٹی کے نام سے موسوم ہو گی'

اس مراسلہ نے مایوسی میں اور اضافہ کر دیا۔ غرض ۱۱، ۱۲ ر اگست کو جلسہ منعقد ہوا، قریباً ہر صوبہ کے قائم مقام موجود تھے اور اخبارات کے قائم مقاموں کو بھی شرکت کی اجازت دی گئی تھی، سب سے پہلے سر راجہ صاحب نے ایک پر زور تقریر کی اور فرمایا کہ:

"ہمارا نصب العین الحاقی یونیورسٹی رہی ہے، ہم نے مقامی یونیورسٹی کا کبھی خیال بھی ذہن میں نہیں آنے دیا، اب بھی ہم الحاقی یونیورسٹی کی تائید میں ہیں اور رہیں گے ہم برابر کوشش کرتے رہیں گے کہ ہمیں الحاق کا حق ملے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب نے تار اور خطوط پڑھ کر سنائے ان میں ہز ہائینس سر آغا خاں کا تار بھی تھا، نواب وقار الملک اور علامہ شبلی نعمانی کی رائیں بھی سنائی گئیں جو الحاق کی تائید میں تھیں۔ آخر میں مسئلہ الحاق پر مباحثہ ہوا قریباً تمام ممبر الحاق کے موید تھے۔ مختلف صوبوں کے قائم مقام ممبروں نے تقریریں کیں اور آنریبل میاں محمد شفیع نے پنجاب کے مسلمانوں کا یہ پیام پہنچایا کہ اگر مقامی یونیورسٹی منظور کی گئی تو کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے ممبروں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔ آنریبل فخر الدین (بانکی پور) نے فرمایا کہ پنجاب کے مسلمانوں کے جو خیالات آنریبل میاں محمد شفیع نے ظاہر

گئے ہیں وہی خیالات ہماری مسلمانوں کے ہیں اُن کا پیغام بھی یہ ہی کہ اگر تم نے قوم کی آواز کی پروانہ کی اور مقامی یونیورسٹی لے لی تو وہ تمھارے خلاف عدالتی کارروائی کریں گے۔

ان پرجوش تقریروں کے بعد حسب ذیل رزولیوشن پاس ہوئے۔

(۱) یہ کمیٹی ممبر تعلیم کے تار پر نظر ڈالتے ہوئے، افسوس کرتی ہی کہ وہ اپنے موجودہ قانون اساسی میں مجوزہ مسلم یونیورسٹی کو محدود و مقامی بنانے کی نسبت کوئی دفعہ بڑہانے کے ناقابل ہی، کمیٹی کی رائے ہی کہ وہ گورنمنٹ سے مزید عرض معروض کرے، تاکہ وہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کر سکے،

(۲) یہ کمیٹی وزیر ہند کے اس فیصلہ پر اپنی نارضا مندی کا اظہار کرتی ہی کہ والسیرائے مجوزہ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر نہ ہوں، نیز کمیٹی مزید رنج کے ساتھ وزیر ہند کے اس فیصلہ سے اتفاق کرنے کے ناقابل ہی کہ تمام اختیارات جو چانسلر کو دیئے گئے تھے وہ ویسرائے باجلاس کونسل کو منتقل کر دیئے جائیں۔

(۳) یہ کمیٹی وزیر ہند کے اس فیصلہ پر نہایت رنج و افسوس کرتی ہی کہ "مسلم یونیورسٹی" آئندہ سے "علی گڑھ یونیورسٹی" کے لفظ سے تعبیر کی جائے کیوں کہ یہ فیصلہ مسلمانوں کے عام جذبات کے بالکل برخلاف ہی۔

(۴) اس کمیٹی کی رائے ہی کہ ان رزولیوشنوں کی نقل مع خط سر ہارکورٹ بٹلر مسلم یونیورسٹی فونڈلیشن کمیٹی کے پاس اس غرض سے روانہ کی جائے کہ وہ مناسب کارروائی کرے، نیز کمیٹی قرار دیتی ہی کہ ایک علحدہ عریضہ گورنمنٹ ہند کی خدمت میں روانہ کیا جائے کہ وہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرے۔

(۵) آنریبل سر ہارکورٹ بٹلر ممبر تعلیم کے خط کے مندرجہ ذیل حصہ پر نظر کرتے ہوئے کہ (الف) مجوزہ یونیورسٹی کے اندرونی تعلقات میں بہت سی تبدیلیاں کرنی لازمی ہوں گی (ب) یونیورسٹی کے مختلف صیغوں کے تقسیم اختیارات کے باب میں

آیندہ بحث کی جائے گی (ج) وزیر ہند کو یونیورسٹی کے قانون اساسی کی تمام تفصیلات کے باب میں جو اس خط میں طے شدہ نہیں ہیں، اختیار مطلق حاصل ہوگا۔ خاص کر مختلف کمیٹیوں کے اختیارات کی تقسیم کے باب میں، یہ کمیٹی قابل اطمینان نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ضروری سمجھتی ہو کہ گورنمنٹ سے دریافت کیا جائے کہ وہ مسلم یونیورسٹی کے موجودہ قانون اساسی کے کس حصہ پر اعتراض کرتی ہے تاکہ کمیٹی اُس حصہ پر دوبارہ غور کرے،

اس کارروائی کے بعد ایک سب کمیٹی چھ[1] اصحاب کی مقرر کی گئی جو سر ہارکورٹ بٹلر کے خط کے جواب کا مسودہ کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کی طرف سے تیار کرے، یہ مسودہ دوسرے روز ۱۲ اگست کے اجلاس میں پیش ہوا اور خفیف ترمیمات کے بعد یہ منظور ہوا کہ ممبر صاحب تعلیمات کی خدمت میں بھیجدیا جائے، چنانچہ اجلاس کے بعد یہ مراسلہ[2] ۱۴ اگست کو روانہ کردیا گیا،

نواب صاحب کی جدید اسکیم

مذکورۂ بالا اجلاس کے بعد ملک میں ایک قسم کا ایجی ٹیشن پھیل گیا تھا، اخبارات میں بھی یہی ایک مسئلہ زیر بحث تھا، نواب صاحب اس زمانہ میں کالج کی خدمت سے دست کش ہو کر تبدیل آب و ہوا کے لئے دیرہ دون آئے ہوئے تھے یہاں آنھوں نے یونیورسٹی کے متعلق ایک اسکیم تیار کی جو اخبارات کے علاوہ ایک رسالہ کی صورت میں بھی ۴۰ صفحے پر شائع ہوئی اور اُس کا انگریزی ترجمہ بھی چھاپا گیا، اسکیم کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں وزیر ہند کی تجاویز پر بحث کرکے اس کو مسلمانوں کے لئے مضر بتایا ہے اور الحاقی یونیورسٹی کی ضرورت ثابت کرکے مسلمانوں کو جد وجہد جاری رکھنے کی تاکید کی ہے۔ دوسرے حصہ میں آنھوں نے یہ بحث کی ہے کہ اگر کافی غور و مباحثہ اور کوشش کے بعد بھی گورنمنٹ سے معاملہ طے نہ ہوا اور آزاد

---

[1] یہ چھ اصحاب حسب ذیل تھے (۱) آنریبل میاں محمد شفیع (۲) آنریبل مسٹر مظہر الحق (۳) آنریبل نواب عبد المجید (۴) مسٹر وزیر حسن (۵) مسٹر محمد علی آکسن (۶) نواب محمد اسحٰق خاں

[2] طوالت کے خیال سے مراسلہ نقل نہیں کیا گیا،

یونیورسٹی کا قیام ناممکن نظر آئے تو جو روپیہ یونیورسٹی کے لئے جمع ہوا ہی اُس کا بہترین مصرف گیا ہوسکتا ہی، پوری اسکیم پڑھنے کے لائق ہی۔ لیکن ہم بوجہ عدم گنجائش اس کے ضروری حصے درج کرتے ہیں۔

وزیر ہند نے مسلم یونیورسٹی کا نام علی گڑھ یونیورسٹی تجویز کیا تھا اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

یونیورسٹی کے نام کی نسبت اس قدر عرض کرنا کافی معلوم ہوتا ہی کہ جس وقت سے سکرٹری آف اسٹیٹ کا دفتر قائم ہوا ہی اُس وقت سے لے کر آج تک شاید کبھی ایسی غلط پالیسی کا اظہار حضور ممدوح کی طرف سے نہ ہوا ہو گا جس سے تکلیف تو ساڑھے اکتیس کروڑ رعایا کے دلوں کو پھونچی ہو اور نفع ایک رتی کے برابر بھی نہ ہوا ہو اگر مقامی ہی یونیورسٹی قائم کرنا مقصود تھا تو بھی رعایا کے دلوں کو اس قدر سخت تکلیف پھونچائے بغیر دونوں یونیورسٹیوں کا نام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی" اور" بنارس ہندو یونیورسٹی" ہوسکتا تھا۔ مسلم یونیورسٹی کا جس قدر مسودہ کانسٹی ٹیوشن اس وقت تک ہم نے آنریبل ممبر صاحب تعلیمات کی خدمت میں پیش کیا ہی اس میں یہ صاف صاف بیان ہوچکا ہی کہ یونیورسٹی کے دروازے تمام قوموں اور مختلف مذاہب کے واسطے کھلے ہوئے ہوں گے۔ فرق صرف یہ ہو گا کہ مسلمانوں کے سوا ہم کسی دوسرے اہل مذاہب کی مذہبی تعلیم کا انتظام اپنے ہاں نہ کرسکیں گے۔ اس صاف صاف صراحت کے بعد یہ اندیشہ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ مسلم یونیورسٹی ہونے کی حالت میں ہم اپنے دوسرے ابناء وطن پر اپنی یونیورسٹی کا دروازہ بند تو نہ کردینگے۔ مسلمانوں نے یہ بخل کبھی نہیں کیا خود اپنی حکومتوں کے شباب میں ہماری یونیورسٹیوں کے دروازے تمام دنیا کے واسطے کھلے ہوئے تھے اور آج بھی جہاں جہاں ہماری درسگاہیں ہیں ان میں ہم کوئی فرق مسلم اور غیر مسلم میں نہیں کرتے۔ ہمارا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج جس دن سے قائم ہوا ہی۔ اُس میں باوجود اسلامی خصوصیت کے جو لفظ "محمڈن"

سے ظاہر ہے، ہندو، پارسی، عیسائی یہودی طلبا بھی مسلمان طلبا کے ساتھ ساتھ تعلیم پا رہے ہیں اور اگر آج ہم اپنی یونیورسٹی میں سے "مسلم" کے لفظ کو خارج کرنے پر رضامند ہو جائیں تو کل کو یہ کس قدر اَنمل بے جوڑ بات معلوم ہونے لگے گی کہ یونیورسٹی میں تو اسلام کا کوئی تعلق نہ ہو اور اس کے کالج محمڈن کالج کہلائیں اور کیا تعجب ہے کہ اس وقت حضور سکرٹری آف اسٹیٹ ہم سے ہمارے ہر دل عزیز کالج کے نام کی اصلاح کی بھی خواہش کریں اور آج وہ زمانہ نہیں ہے کہ ہم گورنمنٹ کے افسروں کی رائے کو صحیفہ آسمانی سمجھ کر بے چون و چرا تسلیم کریں گے۔ برٹش گورنمنٹ کو اپنی یہ خوبی بھولنی نہیں چاہیئے کہ اس کی بنیاد قوت اور طاقت پر نہیں ہے، بلکہ عدل اور انصاف پر ہے۔ کوئی دلیل سکرٹری آف اسٹیٹ نے اس موقع پر بیان نہیں کی کہ کن وجوہ سے وہ ہماری قومی یونیورسٹی سے ہماری مذہبی جھلک کو علیٰحدہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی دلیل ہے تو ہم سب مشکور رہوں گے کہ اس کو بیان فرمایا جائے۔"

اس کے بعد انھوں نے مسئلہ الحاق پر تفصیلی بحث شروع کی ہے اور وزیر ہند نے رزیڈنشل سسٹم کی قدر و قیمت کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے تھے اس کے متعلق لکھا ہے کہ :

"ہماری یونیورسٹی بھی ہندوستان ہی میں ہوگی۔ جہاں بہت مدت سے سرکاری یونیورسٹیاں بھی موجود ہیں۔ جن میں سے ایسے ایسے لائق اور قابل اشخاص نکلے ہیں جن پر ہندوستان جس قدر فخر کرے وہ بجا ہے۔ تو اب یہ کیا ضرور ہے کہ صرف مجوزہ مسلم یونیورسٹی ہی کے واسطے ایسی سخت قیدیں اور شرطیں قائم کی جائیں جن سے اس یونیورسٹی کے افادہ کا دائرہ بہت ہی محدود ہو جائے اور دوسری تمام یونیورسٹیاں اُن قیود و شرائط سے آزاد چھوڑ دی جائیں۔ اس قسم کی ترجیحات بلا مرجح کا اثر ملک کے طبائع پر بُرا پڑتا ہے اور لوگ خیال کرنے لگتے ہیں کہ یہ تمام خیالی وجوہ صرف اس لئے تراشے گئے ہیں کہ ہماری مجوزہ یونیورسٹی سے معدودے چند طلبا کے سوا عام طور پر پبلک کو مستفیض

ہونے کا موقع نہ ملے، ورنہ اس کی کیا وجہ ہوگی کہ گورنمنٹ اپنی یونیورسٹیوں میں کچھ اصلاح نہیں کرتی۔ اور جس قدر خوبیاں ممکن ہیں وہ سب ہمارے ہی لیے ضروری خیال کرتی ہے۔ حالانکہ ترقی کا عام اصول جیسا کہ ترقی کے نام سے ظاہر ہے ہمیشہ یہ ہے کہ ابتدا ابتدا میں جس قدر فوائد بھی بہ آسانی حاصل ہونے ممکن ہوتے ہیں ان پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ اُن میں ترقی ہوتی رہتی ہے۔ اس اصول پر اگر ازراہِ انصاف عمل کیا جائے تو گورنمنٹ کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی قدیمی یونیورسٹیوں میں اصلاح اور ترقی کی طرف توجہ کرے۔ اُس کے بعد جب ہمارا وقت آئے گا اور ہمارا کاروبار اچھی طرح جاری ہو جائے گا۔ تب رفتہ رفتہ ہم بھی ہر ایک قسم کی ترقی کے وسائل مہیا کر سکیں گے۔"

عدم الحاق کے متعلق وزیر ہند کے تمام دلائل پر تبصرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اس موقع پر میں پھر صدق دل سے اس بات کا اعتراف کرتا ہوں اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں اور جملہ ممبرانِ کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کا یہی خیال رہا ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے بھی بلاشبہ مسلمانوں کی ضروریات اور ان کی مشکلات کے ساتھ ابتدائے امر میں پوری ہمدردی کو ملحوظ رکھا۔ مگر حال میں حضور سکرٹری آف اسٹیٹ نے جو فیصلہ نافذ فرمایا ہے وہ ضرور اس قسم کا فیصلہ ہے جس میں گورنمنٹ کی تمام خواہشات اور ضروریات و مشکلات کی یک طرفہ حفاظت تو کر لی گئی ہے۔ لیکن رعایا کی مشکلات اور ان کی ضروریات کی طرف کسی قسم کی ہمدردی کا اظہار نہیں کیا گیا۔ بلکہ یہ کہنا بھی مبالغہ میں داخل نہیں ہے کہ اُن سے بالکل بے پروائی برتی گئی ہے اور کسی قسم کا احساس ہماری فیلنگس کو صدمہ پہونچنے کے متعلق نہیں کیا گیا اور اس بات کی بھی مطلق پروا نہیں کی گئی کہ حضور شہنشاہ معظم نے جو مفید اثر اپنی تشریف آوری ہندوستان سے رعایا کے دلوں میں پیدا کیا تھا۔ اس کو صدمہ نہ پہنچ جائے۔ ان ہی بالادست افسروں کی موجودگی میں جو حضور شہنشاہ معظم کی تشریف آوری کے وقت حکمراں تھے

پالیسی کا ایسا انقلاب تعجب سے خالی نہیں جس سے یہ قیاس کرنا بے محل نہ ہوگا کہ گورنمنٹ نے ایک وقت میں جو چیز دینی چاہی تھی اب وہ اس کا دینا رعایا کو مناسب نہیں سمجھتی اور ایسے اسباب پیدا کئے جاتے ہیں جس سے ہم لوگ تنگ آکر اور مایوس ہو کر ایسی یونیورسٹی کے لینے ہی سے عذر کریں"

ان مباحث کے خاتمہ پر انھوں نے قوم کو یہ مشورہ دیا ہی کہ آیندہ دسمبر (۱۹۱۲ء) میں لکھنؤ میں ایجوکیشنل کانفرنس اور مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ ہونے والے ہیں اس موقع پر اہل الرائے مسلمان جمع ہوں گے، اُس وقت یونیورسٹی کا معاملہ بھی پیش کیا جائے، انھوں نے اپنی رائے محفوظ رکھی ہی، لیکن ۱۱، ۱۲ر اگست کے اجلاس میں کانسٹی ٹیوشن کمیٹی نے جو طے کیا تھا اُس کو پسند کیا ہی،

اسکیم کے دوسرے حصے میں انھوں نے ایک جدید تخیل جامعہ اسلامیہ کا پیش کیا ہی جو گورنمنٹ کے چارٹر کا منت کش نہ ہوگا۔ وہ کہتے ہیں کہ :

"میں چند ماہ پہلے تک جب تک کہ چارٹر کا مل جانا بہت کچھ ممکن تھا۔ اس سوال کو حتی الامکان باین خیال ٹالتا رہا کہ اس قسم کے مباحثات شروع ہونے کے بعد نفس مطلب سے لوگوں کی توجہ ہٹ جائے گی اور روپیہ کے جمع ہونے میں خلل واقع ہوگا، لیکن گورنمنٹ کے پریس کمیونک اور سر ہار کورٹ بٹلر بالقابہ کے مراسلہ مورخہ ۹ر اگست کے مشتہر ہونے کے بعد اب بحث کا ٹالنا ناممکن ہی ... ... جن لوگوں نے بانی کالج کی اسکیم کو پڑھا ہی وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ سر سید مرحوم و مغفور کا منشا کالج کے قائم کرنے سے صرف یہ نہیں تھا کہ چند امیدوارانِ ملازمت اُس کے ذریعے سے ڈگریاں حاصل کریں اور گورنمنٹ کی ملازمتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں، بلکہ اُن کا مقصد اس سے بہت اعلیٰ وارفع تھا"

اسی سلسلہ میں بعض دوسرے معاملات اور کالج کے مقاصد پر بحث کرنے کے بعد کہتے ہیں

"لیکن چونکہ گورنمنٹ کی طرف سے ہم کو یونیورسٹی ملنے میں دقت پیش آئی ہے۔ لہذا میری یہ رائے ہے کہ اب ہم کو اپنی تعلیم کا پروگرام بدل دینا چاہیے یعنی اب تک جو یہ خیال تھا کہ علی گڑھ کالج ترقی کرکے "آل انڈیا مسلم یونیورسٹی" بن جائے گا اور اس یونیورسٹی کے ذریعے سے ہم اپنی ہر قسم کی قومی تعلیمات کا انتظام کر سکیں گے اس کی جگہ اب ہم کو یہ کرنا چاہیے کہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے واسطے اپنی ایک علیحدہ "جامعہ اسلامیہ" (قومی دار العلوم) خود قائم کریں اور جو سرمایہ مسلم یونیورسٹی کے واسطے جمع ہوا ہے اور ہو رہا ہے وہ اس جامعہ اسلامیہ کے سپرد کیا جائے جو باستثناء ضروری اخراجات متعلق تعمیرات کے باقی فنڈ کا صرف منافع خرچ کرنے کی مجاز ہو اور اصل فنڈ کو محفوظ رکھے۔"

اس کے بعد انھوں نے نہایت تفصیل و وضاحت سے جامعہ اسلامیہ کی ضرورت، خصوصیات اور طرز تعلیم پر بحث کی ہے۔ جس کو ہم نظر انداز کرتے ہیں، اُن کی رائے ہے کہ جامعہ اسلامیہ میں تمام علوم کی تعلیم اُردو زبان میں ہو اور انگریزی بطور زبان ثانی کے پڑھائی جائے۔ اس بحث کے سلسلہ میں وہ ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ کسی موقع پر ایک جرمن عالم اُن کے ہم سفر تھے، انھوں نے ہندوستان کی تعلیمی ترقی کا ذکر سن کر بجنوری صاحب سے دریافت کیا کہ یہ تعلیم کس زبان میں دی جاتی ہے اور جواب میں یہ معلوم کرکے کہ انگریزی زبان کے ذریعے سے تعلیم دی جاتی ہے۔ انھوں نے بہت زور کے ساتھ کہا کہ یاد رکھو ہزار برس میں بھی ہندوستان تعلیم یافتہ نہیں ہو سکتا، جب تک کہ خاص اپنی مادری زبان میں تعلیم کا انتظام نہ کیا جائے گا۔

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:

"ہمارے وہ بچے جو آیندہ ملازمت کا طوق اپنی گردن میں ڈالنے والے نہیں ہیں وہ کیوں ریاضیات انگریزی میں پڑھیں؟ کیوں جغرافیہ انگریزی میں حفظ کریں

کیوں تاریخ انگریزی میں پڑھنے کی زحمت برداشت کریں؟ سائنس کے غریب آلات ہرگز یہ نہیں کہتے کہ اُن کا استعمال صرف یورپ کی زبانوں کے ذریعے سے سکھایا جا سکتا ہے، وہ بسر و چشم اس کے لئے حاضر ہیں کہ مسلمان اُن کا استعمال اپنی مادری زبان کے ذریعے سے سیکھیں"

سب کے آخر میں کہتے ہیں:

یہ کوئی مکمل اسکیم نہیں ہے، بلکہ صرف ایک ابتدائی خیال ہے اور امید ہے کہ جب دیگر بزرگانِ قوم اس کو بہ نظرِ اصلاح ملاحظہ فرمائیں گے تو اُس وقت یہ اسکیم اس قابل ہو سکے گی کہ اس کو بسہولت عملی جامہ پہنایا جا سکے"

فاؤنڈیشن کمیٹی کا ایک ایک اہم اور تاریخی اجلاس

نواب صاحب کی مندرجہ بالا اسکیم نومبر ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی اور اخبارات میں ازسرِ نو مباحثہ چھڑ گیا، لیکن نتیجہ بحث کے لئے ہر شخص دسمبر کا انتظار کر رہا تھا، کانسٹی ٹیوشن کمیٹی نے اگست کے اجلاس میں معاملات کا فیصلہ فونڈیشن کمیٹی پر منحصر کر دیا تھا، لہٰذا اس کمیٹی کا جلسہ طلب کیا گیا۔ لیکن اس کمیٹی کا نظام نہایت وسیع اور ممبروں کی تعداد ہزار ہا تھی اور ان سب کا جمع کرنا ممکن نہ تھا، اس بنا پر یہ تجویز کیا گیا کہ ہر ہر ضلع میں فاؤنڈیشن کمیٹی کے جو ممبر ہیں وہ اپنے اپنے ضلع میں جلسہ کر کے زیادہ سے زیادہ دو ممبروں کو بطور نمایندہ منتخب کر کے لکھنؤ کے جلسہ میں بھیجیں اور اسی طرح تمام انجمنیں اور جماعتیں ایک ایک نمایندہ اپنی طرف سے نامزد کریں۔

چونکہ عام طور پر لوگوں کو یہ خیال تھا کہ فاؤنڈیشن کمیٹی کا فیصلہ قطعی ہوگا، لہٰذا ہر خیال کے لوگ یہ کوشش کر رہے تھے کہ اُن کے ہم خیال زیادہ سے زیادہ تعداد میں فاؤنڈیشن کمیٹی کے اجلاس میں شریک ہو کر فریقِ ثانی پر غلبہ حاصل کریں، اس کے علاوہ یہ بدگمانی بھی پھیلی ہوئی تھی کہ کالج کے ٹرسٹی اور کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے ممبر قومی اغراض و مطالبات کی پروا نہیں کرتے، اس بنا پر یہ کوشش شروع ہو گئی تھی کہ وہ تمام اشخاص جو

قانوناً فاونڈیشن کمیٹی کے ممبر ہو سکتے ہیں اجلاس میں شریک ہو کر غلبہ آراء سے فتح حاصل کریں۔

مذکورۂ بالا حالات کے ماتحت ۲۷ دسمبر ۱۹۱۲ء کو فاونڈیشن کمیٹی کا اجلاس قیصر باغ کی بارہ دری میں زیر صدارت ہز ہائنس نواب صاحب رامپور شروع ہوا۔ قوم کے تمام سربر آوردہ اصحاب مع نواب وقار الملک اجلاس میں شریک تھے، مختلف اضلاع سے نمائندے آئے تھے، لیکن جب اجلاس شروع ہوا تو ہر قسم کے لوگ اندر داخل ہو گئے، کسی کے لئے روک ٹوک نہیں رہی۔ شیخ محمد عبداللہ صاحب لکھتے ہیں۔

"لکھنؤ کے مدارس کے نوجوان، پر اشتعال خیالات کے سیلاب میں بہ بہ کر قیصر باغ کی بارہ دری سے آ آکر ٹکراتے تھے اور اپنے سامنے ایک کھلا راستہ دیکھ کر اندر گھس جاتے تھے"

مسٹر محمد علی آکسن کا بیان ہے[۵۱] کہ:

بارہ دری میں ہر کہ دمہ موجود تھا حتیٰ کہ ہمارے کالجوں اور اسکولوں کے طلبہ بھی موجود تھے جن کو بہت ہی ترشں نظر سے دیکھا جاتا ہے"

ان حالات کا نتیجہ یہ تھا کہ سارا دن جلسہ میں ایک عجیب شور و ہنگامہ برپا رہا، جو شخص ذرا بھی ایک خاص فریق کی رائے کے خلاف کچھ بولنا چاہتا تھا لوگ شور کر کے اس کو فوراً بٹھا دیتے تھے پرانے پرانے لیڈر حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے اور دم بخود تھے میجر سید حسن بلگرامی کے ایک رزولیوشن نے جس میں انھوں نے چانسلر کے غیر محدود اختیارات کو خلاف مصلحت قرار دیا تھا جلسہ میں بہت گرما گرمی پیدا کر دی، نواب صاحب کہتے ہیں:

یہ مباحثہ آخر وقت تک بھی اس روز ختم نہ ہوا اور ختم جلسہ کے وقت معلوم ہوتا تھا کہ مانحن فیہ مسائل اس قدر مشکل اور پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ آیندہ اجلاس میں بھی ان کا سلجھنا دشوار ہوگا،

---

۵۱ کامریڈ مورخہ ۴ جنوری ۱۹۱۳ء

شیخ محمد عبد اللہ صاحب کا بیان ہے کہ:

"شام کو جب جلسہ برخاست ہوا تو ہر شخص کی وہی حالت تھی جو کسی سخت جنگ کے بعد جانبین کے افسر و پیادہ کی ہوتی ہے۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ کسی طور پر اب اس آفت کا خاتمہ ہو۔"

ایک بڑی معرکۃ الآرا بحث یہ درپیش تھی کہ ایک ڈپوٹیشن مرتب ہو جو وائسرائے کے پاس جاکر مسلمانوں کے مطالبات پیش کرے۔ اب سوال یہ تھا کہ اس ڈپوٹیشن کے ممبر کون کون صاحب ہوں اور ڈپوٹیشن کے اختیارات کیا ہوں، اسی طرح چانسلر کے اختیارات کا مسئلہ زنجیر پا بن رہا تھا، غرض پہلا اجلاس بغیر کسی فیصلہ اور نتیجہ کے ختم ہوگیا، دوسرے روز کانفرنس کا اجلاس تھا، اس لئے فونڈیشن کمیٹی کا دوسرا اجلاس ۲۹ کو قرار پایا، اس درمیانی وقفہ میں کارکن قوتیں برابر اپنا کام کرتی رہیں، یہاں تک کہ ۲۸ و ۲۹ دسمبر کی درمیانی شب میں صبح کے اجلاس میں پیش کرنے کے لئے ایک رزولیوشن مرتب کیا گیا۔ اس کے بعد ڈپوٹیشن کے ممبروں کی ایک فہرست اس غرض سے مرتب کی گئی کہ فونڈیشن کمیٹی سے اس کی منظوری لی جائے۔ اس فہرست کی ترتیب میں نواب وقار الملک بھی شریک تھے، لیکن نواب صاحب کے اٹھ جانے کے بعد ایک مختصر صحبت میں ایک بجے شب کے بعد یہ فہرست بدل دی گئی، کانسٹی ٹیوشن کی کمیٹی کے ممبروں اور ٹرسٹیوں کے نام اس فہرست سے خارج کردیئے اور باہمی سمجھوتہ سے لوگوں نے یہ طے کرلیا کہ مختلف الخیال لیڈر برابر برابر کی تعداد میں ڈپوٹیشن کے ممبر نامزد ہوں، اب صبح ہوئی اجلاس منعقد ہوا لیکن اس اجلاس کا رنگ دوسرا تھا۔ نہ جوش[1] و ہنگامہ تھا نہ بحث و تکرار، تمام

---

[1] فاونڈیشن کمیٹی کے اس اجلاس کا دلچسپ تماشا میں نے بچشم خود دیکھا ہے، علامہ شبلی نعمانی بھی اس اجلاس میں شریک تھے اُن پر ان واقعات کا جو اثر پڑا اس کو دوسرے روز ایک نظم میں ادا کیا جو حسب ذیل ہے۔

یہ فیض ہے جماعتِ احرار کا ضرور | اب قوم کو جو شخص پرستی سے عار ہے
آزادیٔ خیال کا جو کچھ کہ ہے اثر | یہ سب اُنھیں کے فیض کا منت گزار ہے

کارروائی بڑے سکون کے ساتھ عمل میں آئی۔ ڈپوٹیشن کے ممبروں کی فہرست سنائی گئی اور منظور ہوئی عام حاضرین کو خصوصاً جو ہنگامہ آرائی کے منتظر تھے، حیرت تھی کہ کیا واقعہ ہی آخرِ کار بدگمانیاں

(بقیہ صفحہ ماقبل)

لیکن یہ دیکھنا ہے کہ یہ عزم، یہ ترنگ
ہے دیرپا کہ جوششِ جنونِ بہار ہے

اب کے جو لکھنؤ میں دکھایا گیا سماں
سچ پوچھئے تو مضحکۂ روزگار ہے
دیکھا یہ پہلے دن، کہ ہر اک گوشۂ بساط
میدان رزم و عرصۂ گیر و دار ہے
غل ہے کہ وہ مقدمۃ الجیش آگیا
اب انتظارِ فوج یمین و یسار ہے
احرار کی صفوں کی صفیں ہیں جمی ہوئی
مجلس تمام، عرصۂ کارزار ہے
اسٹیج پر ہر ایک بپھرتا ہے اس طرح
گویا حریفِ رستم و اسفندیار ہے
ہاتھ اٹھ رہے ہیں یا علَمِ فتح ہے بلند
چلتی ہوئی زبان ہے یا ذوالفقار ہے
ہر نوجواں ہے نشۂ آزادگی میں مست
جو ہے وہ حریت کا سرِ پُرخمار ہے
احرار کہہ رہے ہیں نہ مانیں گے ہم کبھی
وٹو کا ویسرائے کو کیا اختیار ہے
الحاق گر نہیں ہے تو ہر سعی ہے عبث
مسلم کا لفظ خاص ہمارا شعار ہے
جو والیانِ ملک کہ تھے زیبِ انجمن
سب دم بخود سے تھے کہ یہ کیا خلفشار ہے

یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں
نے وہ خروش، نے جوش، نہ وہ گیرودار ہے
ٹوٹی ہوئی صفیں ہیں علم سرنگوں ہیں سب
بازوئے تیغ گیر جو تھا رعشہ دار ہے
"سازش" کا ایک جال بچھایا ہے ہر طرف
ہر شخص اس کی فکر میں مصروفِ کار ہے
سرمستیاں ہیں دورِ قدح ہائے راز کی
ہر شخص "حکمتِ عملی" کا شکار ہے

جو بات کل تلک سببِ ننگ و عار تھی
وہ آج مایۂ شرف و افتخار ہے
جس بات پر کہ نعرۂ نفریں بلند تھے
اب وہ قبولِ خاطرِ ہر ذی وقار ہے
کل کہہ چکے ہیں کیا؟ یہ نہیں اب کسی کو یاد
اب نکتہ ہائے زیرلبی پر مدار ہے
خود آپ اپنے ہاتھ سے کھائی ہے گو شکست
کہتے ہیں پھر "یہ فتح مبیں یادگار ہے"

حیران تھے عوام کہ کیا ماجرا ہے یہ
یہ کیا دورنگیٔ چمنِ روزگار ہے
"احرار کا طریقِ عمل ہے اگر یہی
پھر کامیابیوں کا عبث انتظار ہے"

(محمد اکرام اللہ خاں ندوی)

پیدا ہوئیں اور یہ بات زبانوں پر آئی کہ لیڈروں نے باہم سازش کرلی اور پبلک کو دھوکہ دیا یعنی رات کو خفیہ طور پر سمجھوتہ کرکے صبح کو ضابطہ کی رسم پوری کردی اور لوگوں کو احمق بنایا پبلک کے علاوہ وہ لوگ بھی مشتعل ہوئے جو اس سے پہلے ممبر تعلیمات کے پاس ڈپوٹیشن لے کر جا چکے تھے، اور اس معاملہ میں اپنے تجربہ و واقفیت اور پوزیشن کے لحاظ سے بجا طور پر اس کے مستحق تھے کہ آیندہ بھی وہ یونیورسٹی کے متعلق مشورہ و گفتگو میں شریک کئے جائیں لیکن اُن کو ڈپوٹیشن سے بالکل علٰحدہ رکھا گیا۔

نواب صاحب کی ایک پر اثر تحریر اور عام ہیجان

اجلاس کے بعد اخبارات نے ان معاملات پر مضامین لکھے۔ ذمہ دار اشخاص نے نکتہ چینیاں کیں، نواب صاحب کے لئے یہ حالت نہایت تکلیف دہ تھی، وہ فونڈیشن کمیٹی کے سکرٹری تھے، اجلاس میں موجود تھے اور جدید ڈپوٹیشن جس کے تقرر پر نکتہ چینیاں ہو رہی تھیں اُن کے روبرو مرتب ہوا تھا، اس لئے بدگمان لوگوں کو اس شبہ کا موقع تھا کہ وہ بھی اس سازش میں شریک ہیں، اس بنا پر یہ ضروری تھا کہ وہ پبلک کو مطمئن کریں، چنانچہ اُنھوں نے ایک مفصل مضمون لکھا جو ۵ رفروری ۱۹۱۳ء کو شائع ہوا اس مضمون کی ابتدا میں اُنھوں نے خود لکھا ہی کہ:

"میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں ہی کہ بعض اہم واقعات پر جو پردہ پڑا ہوا ہی اُس کو اُٹھاؤں"

اور اُنھوں نے ایسا ہی کیا کہ صحبت نیم شبی کے تمام واقعات ایک ایک کرکے ظاہر کردیئے اور اُس کے ساتھ ہی وہ تمام مجبوریاں اور معذوریاں بھی وضاحت سے بیان کردیں جن کی وجہ سے ان کو اجلاس میں خاموش رہنا پڑا، یہ معذوریاں حقیقی اور واقعی تھیں لیکن اس پر بھی اُنھوں نے صاف صاف لکھدیا کہ:-

بایں ہمہ اگر قوم کے نزدیک میرے عذرات کافی نہیں تو اپنی خطا کا اقرار کرتا ہوں اور اُمید ہی کہ قوم میری اس معذرت کو مہربانی سے قبول کرکے مجھے معاف فرمائیگی

خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ اس قسم کی خطاؤں کے سرزد ہونے کا کوئی موقع
میری طرف سے غالباً آیندہ پیش آنے والا نہیں"

اس معذرت کے بعد انھوں نے نہایت پرحسرت الفاظ میں اپنے امراض و عوارض کا اور علی گڑھ پہنچکر دوبارہ فالج میں مبتلا ہو جانے کا ذکر کیا ہی اور پبلک کو بتایا ہی کہ۔

"آیندہ میں پبلک جلسوں یا صلاح و مشورہ کی صحبتوں میں ہی شریک ہونے سے معذور نہ رہوں گا بلکہ غالباً تحریر کے ذریعے سے بھی اب مجھے اپنے خیالات کے ظاہر کرنے کا موقع نہ ملے گا اور اس لئے میری ذات پر قوم کو اگر کچھ تھوڑا بہت بھروسا تھا تو اُس سے بھی اب قطع نظر کرنی چاہئیے اور جو کچھ کرنا چاہئیے خود سوچ سمجھ کر کرنا چاہئیے"

اس کے بعد اُنھوں نے ڈپوٹیشن کی ترتیب و تنظیم اور اختیارات کے متعلق اور آیندہ طریق عمل کے متعلق قوم کو بہت سے مفید مشورے دیئے ہیں اور اپنے مضمون کو ان الفاظ پر ختم کیا ہی:

"اب آخر میں یہ خاکسار اپنی ناتندرستی کی وجہ سے اور اپنے طبی مشیروں کے مشورہ سے اس قسم کے جلسوں اور دماغی کاموں میں شریک ہونے سے معافی چاہتا ہی اور پبلک سے اس التماس دعا کے ساتھ رخصت ہوتا ہی کہ خداوند تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنے اس عاصی گنہگار کا خاتمہ بخیر کرے اور جو دن میری زندگی کے باقی ہوں اُن میں اپنی قوم کی کامیابیوں کی خوشی کی خبریں سنتا رہوں اور یہی خوشیاں میرے لئے غذائے روح کا کام دیں گی"

اس مضمون کا نہایت زبردست اثر پڑا، خود مسلم یونیورسٹی کمیٹی کی حالت نازک ہو گئی نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو جدید ڈپوٹیشن[1] منتخب ہوا تھا اُس کے تمام ممبروں نے یکے بعد دیگرے

---

[1] اس ڈپوٹیشن کے متعلق ایک لطیفہ قابل تذکرہ ہی، لیڈروں کی مفاہمت سے پہلے جب اجلاس میں ڈپوٹیشن کا معاملہ زیر بحث تھا تو ایک لیڈر نے جو جماعت احرار سے تعلق رکھتے تھے اور جن کی قابلیت و آزادی

(بقیہ برصفحہ آیندہ)

استعفا دیدیا، گویا یہ تجویز ہی کالعدم ہوگئی، اخبارات نے نہایت پرجوش مضامین نواب صاحب کی تائید میں لکھے۔ آنریبل سر راجہ صاحب نے ایک کھلی چھٹی نواب صاحب کے نام شائع کی اور اس میں یہ لکھا کہ بعض واقعات اس مضمون میں صحیح نہیں ہیں اور جن لوگوں کے طرز عمل پر نواب صاحب

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

رائے مسلم تھی، اس ڈپوٹیشن کی ترتیب اور اختیارات پر ایک زبردست تقریر شروع کردی، لوگوں نے نعرہ ہائے تحسین وآفریں بلند کئے، یہ رنگ دیکھ کر اسپیکر کا نام بھی وفد میں داخل کرلیا گیا، اس کے بعد وہ دفعتاً خاموش ہوگئے، نواب صاحب نے بھی اپنے مضمون میں اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ حسن ظن ظاہر کیا ہے کہ غالباً جناب ممدوح اس لئے خاموش ہوگئے کہ اب ان کو بحیثیت ایک ممبر ڈپوٹیشن کے ممبروں کے سامنے اپنے خیالات ظاہر کرنے کا اطمینان سے موقع ملے گا، لیکن علامہ شبلی نعمانی نے جو اس موقع پر اجلاس میں موجود تھے، اس واقعہ کی سچی تصویر کھینچ کر حقیقت کو بالکل بے نقاب کردیا ہے۔ فرماتے ہیں،

تھی سفارت کی جو تجویز بظاہر موزوں
اہل مجلس بھی بظاہر نظر آتے تھے خموش

دفعتہً دائرۂ صدر سے اٹھا ایک شخص
جس کی آزادیِ تقریر تھی غارت گر ہوش

اس نے اس زور سے تجویز یہ کی رد و قدح
چونک اٹھے وہ بھی جو بیٹھے ہوئے تھے پنبہ بگوش

اہل مجلس نے جو بدلا ہوا دیکھا انداز
ڈر ہوا یہ کہ کہیں اور نہ بڑھ جائے یہ جوش

صدرِ محفل نے بلا کر اسے آہستہ کہا
کہ "تو ہم شامل وفد ستی و این مایہ مجوش"

بادۂ جام سفارت سے مرد افگن تھا،
ایک ہی جرعہ میں وہ شیر جری تھا خاموش

اب نہ وہ طرزِ سخن تھا نہ وہ آزادیِ رائے
نہ وہ ہنگامہ طرازی تھی نہ وہ جوش و خروش

جس کی تقریر سے گونج اٹھتا تھا اجلاس کا ہال
اب وہ ایک پیکر تصویر تھا بالکل خاموش

سخت حیرت تھی کہ ایک ذرۂ خاکستر تھا
وہ شرارہ جو ابھی برق سے تھا دوش بدوش

دیکھتے ہیں تو حرارت کا کہیں نام نہیں
ہوگیا شعلۂ سوزندہ بھڑک کر خس پوش

اہل ثروت سے یہ کہہ دو کہ مبارک ہو تمہیں
للہ الحمد ابھی ملک میں ہیں رائے فروش

(محمد اکرام اللہ ندوی)

نے نکتہ چینی کی تھی اُن کو بری الذمہ قرار دیا اور آخر میں یہ درخواست کی کہ ۲۲ مارچ کو مسلم یونیورسٹی[1] کمیٹی کی ایک اہم کمیٹی منعقد ہونے والی ہے اُس میں نواب صاحب جس طرح ممکن ہو شریک ہوں

"تاکہ وہ لوگ جن پر آں جناب نے سخت ترین الزامات لگائے ہیں نہ صرف آں جناب کے سامنے اپنی صفائی پیش کریں بلکہ اُن غلط فہمیوں کو بھی دور کریں جو جناب کے ذہن عالی میں ہیں"

سر راجہ صاحب بالقابہ کا یہ خط نواب صاحب کو عین جلسے کے روز ملا، اس کے علاوہ اُن کی حالت سفر کے قابل نہیں تھی، اس لئے اُنھوں نے معذرت کا ارجنٹ تار بھیجدیا اور جواب میں لکھا کہ

"میرے مضمون مندرجہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۵ فروری میں جو جو سہو یا خطا ہوئی ہو اس کی ایک یادداشت قلمبند فرمائی جائے جس کے دیکھنے کے بعد اگر مجکو اطمینان ہو گیا کہ مجھ سے کچھ غلطیاں ہوئی ہیں تو میں بلا تامل اپنی غلطیوں کا اعتراف کردں گا، ورنہ جو کچھ حقیقت ہو گی وہ عرض کروں گا،

اس کے بعد لکھا کہ:

نیز میں آپ کو اور آپ کے ذریعے سے پبلک کو اس یقین دلانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ کسی ایک متنفس کا دل دُکھانا بھی میں کبھی گوارا نہیں کرتا (جس کی طرف جناب سر راجہ صاحب بالقابہ کے والا نامہ میں اشارہ کیا گیا ہے) نہ کہ چند بزرگان قوم کا، لیکن جب دوسری طرف میرے نزدیک تمام قوم کے اہم ترین مقاصد خطرہ کی حالت میں تھے تو میں نہ صرف قوم کا بدخواہ بلکہ خدا کا بھی گنہگار ہوتا اگر واقعات کو پردہ اخفا میں رکھتا اور اب جب کہ یہ معاملات پبلک کے سامنے آگئے ہیں تو انشاء اللہ کچھ زیادہ وقت نہ گزرے گا۔ جو ہر ایک منصف شخص پوری طرح مطمئن

---

[1] فاؤنڈیشن کمیٹی نے اپنے اجلاس میں ایک مسلم یونیورسٹی کمیٹی مقرر کی تھی اور اس کے ممبر بھی منتخب کرلئے گئے تھے یہ ممبر درحقیقت ڈپوٹیشن کے ممبر تھے جو وِلیسرائے کے پاس جانے کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔

ہو جائے گا کہ واقعات کی حقیقت کیا تھی"

نواب صاحب کی تحریر کے خلاف جواب کی تیاریاں

۲۲ مارچ کو کمیٹی کا جو درحقیقت ڈپوٹیشن کے ممبروں سے مرکب تھی اجلاس ہوا۔ اور کمیٹی کے ممبروں نے یہ رائے قائم کی کہ نواب صاحب کے مضمون کے اندر بہت سے بے بنیاد اور غلط فہمی پیدا کرنے والے بیانات شامل ہیں اور اس بنا پر کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ :

مذکورہ بالا واقعات کی وجہ سے جو حالت پیدا ہوگئی ہے اُس کا لحاظ کرتے ہوئے کمیٹی محسوس کرتی ہے کہ اس رزولیوشن کے ذریعے سے جس سے کہ کمیٹی قائم ہوئی تھی جو خدمت کمیٹی کے سپرد کی گئی تھی اُس کے متعلق کوئی مزید کارروائی کرنا غیر مناسب ہوگا اور کمیٹی افسوس کے ساتھ قرار دیتی ہے کہ فونڈیشن کمیٹی کو اس فیصلہ کی اطلاع دی جائے تاکہ جو کارروائی اس کو مناسب معلوم ہو وہ کرے"

ڈپوٹیشن کے ممبروں نے یہ بھی ارادہ کیا کہ نواب صاحب کے مضمون کا جواب شائع کیا جائے تاکہ ان ممبروں کے متعلق قوم کو جو سوءظن پیدا ہوگیا ہے وہ رفع ہو، چنانچہ کمیٹی نے بذریعہ تار اخبارات کو اطلاع دی کہ سربرآوردہ لوگوں کے دستخط سے جواب شائع ہوگا، بعد کو مسٹر محمد علی آکسن، میجر سید حسن بلگرامی اور کچھ اور بزرگانِ قوم جواب لکھنے پر مامور کئے گئے، لیکن نتیجہ ہیچ، جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، کمیٹی کالعدم ہوگئی، ڈپوٹیشن کا خاتمہ ہوگیا، اور یہ سب انقلاب نواب صاحب کے ایک مضمون نے پیدا کر دیا۔

فونڈیشن کا دوبارہ اجلاس اور نواب صاحب کا آخری پیام

ان واقعات کے چند روز بعد نواب حاجی محمد اسحٰق خاں آنریری سکرٹری نے راجہ صاحب اور نواب صاحب سے مشورہ کرکے دوبارہ فونڈیشن کا جلسہ علی گڑھ میں طلب کیا جو ۲۶ و ۲۷ جولائی ۱۹۱۳ء کو منعقد ہوا، نواب صاحب علالت و پیرانہ سالی کی وجہ سے اس جلسہ میں شریک نہ ہو سکے لیکن انھوں نے ایک مفصل پیام بھیجا یہ پیام بہت طویل ہے جس میں یونیورسٹی کے تمام معاملات پر مفصل بحث کرکے مفید مشورے دیے ہیں منجملہ اور امور کے

اُنھوں نے یہ رائے بھی دی ہی کہ اس موقع پر فونڈیشن کمیٹی سے چند باتوں کی منظوری حاصل کی جائے۔

(۱) اوّل یہ کہ یونیورسٹی کے منافع سے ہم اپنی قوم کے نوجوانوں کو (جہاں تک فنڈ میں گنجائش ہو) اعلیٰ تعلیم کی غرض سے ابھی سے یورپ وغیرہ کو بھیجدیں۔

(۲) کالج کو ترقی دینے کی غرض سے جس جس تعلیم کا اضافہ کرنا کالج میں مناسب ہو اس کے واسطے سرمایہ کے منافع سے بقدر گنجائش روپیہ خرچ کیا جا سکے۔

(۳) ایک مناسب رقم عمارتوں کے واسطے بھی فنڈ میں سے خرچ کرنے کی اجازت حاصل کرلی جائے۔

اسی سلسلہ میں اُنھوں نے یہ رائے بھی دی ہی کہ فونڈیشن کمیٹی کے ممبروں کو متعین کرلیا جائے اور یہ کہ فونڈیشن کمیٹی کی طرف سے ایک مینجنگ کمیٹی کام کرنے کے واسطے مقرر کی جائے اور اس کمیٹی کے لئے ضروری قواعد مرتب کرلئے جائیں اور اس کے اختیارات صاف صاف معین ہو جائیں۔

اس کے بعد اُنھوں نے ڈپوٹیشن کی ضرورت، ترتیب اور اختیارات کے متعلق اپنی رائے بیان کی ہی اور پھر مطالبات کے سلسلہ میں تین ۳ چیزوں کو خصوصیت کے ساتھ بیان کیا ہی۔

(۱) یہ کہ یونیورسٹی کے نام میں سے لفظ مسلم یا محمڈن کا عزیز ترین وجود چھوڑ دینا مسلمان گوارا نہیں کر سکتے۔

(۲) بالفعل یونیورسٹی کو اسکولوں کے الحاق کی ضرورت ہے اور یہ کہ زمانہ مابعد میں جب کہ قوم مختلف کالج قائم کرنے پر آمادہ ہو۔ گورنمنٹ اُن کے الحاق کے معاملہ پر غور کرنے کا وعدہ کرے۔

(۳) گورنمنٹ کے اختیارات کا مسئلہ، وہ کہتے ہیں کہ:

"اختیارات کا مسئلہ بھی جان سخن ہی اور جو کچھ فونڈیشن کمیٹی اس کے متعلق تجویز کرے اس کی ترمیم کا اختیار بھی ڈپوٹیشن کو بغیر منظوری فونڈیشن کمیٹی کے نہ ہونا چاہیئے۔ اور امید ہی کہ فونڈیشن کمیٹی اس بات کو ملحوظ رکھے گی کہ گورنمنٹ کو یونیورسٹی کے اندرونی انتظام میں بہت زیادہ اختیارات کا حاصل ہونا جناب سرسید صاحب مرحوم و مغفور اور آنریبل سید محمود صاحب مرحوم مغفور کے اصول کے بالکل منافی ہی اور فی نفسہ بھی یونیورسٹی کے انتظام میں مخل ہوگا۔

اور اسی اختیارات کی بحث میں قطعی طور پر اس بات کو طے کر دینا چاہیئے کہ چانسلر کے اختیارات گورنر جنرل باجلاس کونسل کو کسی حالت میں تفویض نہ کئے جائیں۔"

مضمون کے خاتمہ پر نشتر کا ئے اجلاس کو اُن کی ذمہ داری محسوس کرا کر کہتے ہیں :

یاد رکھو کہ گورنمنٹ مراد ہی اُس کے حکام سے، اور حکام ادلتے بدلتے رہتے ہیں کسی کی رائے کچھ ہوتی ہی اور کسی کی کچھ۔ اور بعض اوقات منصف حکام مزید غور کے بعد اپنی رائے خود بدل دیتے ہیں۔ لہٰذا ہمارے حکام اگر آج ایک بات کو منظور نہیں کرتے تو ممکن ہی کہ آیندہ کسی وقت وہی بات منظور ہو جائے۔ لیکن اگر آج ہم نے کسی ایسے امر کو منظور کر لیا جو ہمارے حق میں مفید نہیں تو گویا اپنے ہاتھ ہم نے خود کاٹ دیئے اور آیندہ اُس کے خلاف ہم کو مانگنے کا کوئی حق نہ رہے گا۔ اور بالفرض اس وقت اگر گورنمنٹ نے ہماری گزارشات کو منظور نہ کیا اور ایک موزون و مناسب یونیورسٹی ہم کو نہ ملی تو بھی ہمارا کچھ نقصان نہیں ہی۔ ہم اپنے کالج کو اُس حد تک برابر ترقی دیتے رہیں گے جس حد تک وہ ترقی کر سکتا ہی، اور اپنی عام تعلیم کا انتظام ہم گورنمنٹ سے آزاد رہ کر ایسی خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ کر سکیں گے جو گورنمنٹ کی بخشی ہوئی یونیورسٹی کی حالت میں ہم ہرگز نہیں کر سکتے۔

درد کا حد سے گزرنا ہی دوا ہو جانا"

فونڈیشن کمیٹی کے ممبروں کے پاس نواب صاحب کا پیام پہنچا اور قریب قریب یہ تمام امور زیر بحث آئے، کمیٹی نے متعدد رزولیوشن پاس کئے اور اسکولوں اور کالجوں دونوں کے الحاق کا حق طلب کیا، یہ بھی طے پایا کہ وسیرائے کو بحیثیت چانسلر اُس سے زیادہ اختیارات نہ تفویض کئے جائیں جو اس وقت کالج کے قواعد کے لحاظ سے صوبہ متحدہ کے لفٹنٹ گورنر کو بحیثیت پیٹرن حاصل ہیں، یہ بھی قرار پایا کہ ۵۰ ممبروں کا ایک ڈپوٹیشن وسیرائے کے پاس جائے۔ کمیٹی نے ان ممبروں کو بہ تعداد مناسب ہندوستان کے تمام صوبوں سے تجویز کیا، کمیٹی نے یہ بھی طے کر دیا کہ مسلم یونیورسٹی کا سرمایہ محفوظ رہے۔ لیکن منافع اس

مقصد کے لئے صرف کیا جا سکے گا کہ کالج کو ترقی دے کر یونیورسٹی کے پیمانہ پر پہنچایا جائے ان سب امور کے علاوہ کمیٹی نے یونیورسٹی کا عملی کام شروع کرنے کی غرض سے ایک جماعت بنام مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن قائم کی جس کے دو سو ممبر مقرر کئے گئے اور انتخاب کا طریقہ بھی تجویز کیا گیا، جو رزولیوشن اجلاس میں پاس ہوئے تھے اُن کی تعمیل کرنا ایسوسی ایشن کا فرض قرار دیا گیا اور یہ بھی طے پایا کہ ایسوسی ایشن اپنے کاروبار کے لئے قواعد بنائے، اس کے علاوہ ایسوسی ایشن کو یہ بھی اختیار دیا گیا کہ وہ اپنی جماعت میں سے ۴۰ ممبروں کی ایک سب کمیٹی مقرر کرے، جو یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن کے مسودہ کی ترمیم وتکمیل کرے، اسی طرح کی چند اور ضروری تجویزیں پاس کرنے کے بعد فونڈیشن کمیٹی نے اپنا اجلاس ختم کیا۔

اس کے بعد یونیورسٹی کے سلسلہ میں جو کچھ ہوا اس کا تعلق نواب وقار الملک کے زمانہ سے نہیں ہے۔ اب وہ اپنی علالت و پیرانہ سالی کی وجہ سے عملاً دستکش ہو گئے تھے اور جنگ کی وجہ سے خود یونیورسٹی کے معاملات بھی معلق رہے، یہاں تک کہ ہندوؤں نے گورنمنٹ کی پیش کردہ شرائط پر یونیورسٹی لے لی۔ جس کے چند سال بعد ۱۹۲۰ء میں مسلمانوں کو بھی یونیورسٹی ملی مگر اس کو بیرونی کالجوں یا اسکولوں کے الحاق کا حق نہیں دیا گیا!

عام تعلیمی خدمات

علی گڑھ کالج مسلمانوں کی مرکزی تعلیم گاہ ہے، اور اس کا دائرہ اثر نہایت وسیع ہے، لہٰذا اِس کی ترقی و استحکام کی کوشش کرنا درحقیقت پوری قوم کی تعلیمی خدمت ہے، کالج کی بنیاد ۱۸۷۵ء میں رکھی گئی اُس زمانہ سے ۱۹۱۲ء تک نواب صاحب برابر کسی نہ کسی حیثیت سے کالج کی خدمت کرتے رہے، بلکہ ۱۹۱۲ء کے بعد بھی جب تک اُن کی صحت قایم رہی یونیورسٹی کے سلسلہ میں انھوں نے علی گڑھ کی خدمت میں دریغ نہیں کیا، اور حقیقت تو یہ ہے کہ کالج کے متعلق اُن کی تعلیمی خدمات کا سلسلہ ۱۸۷۵ء سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔

۱۸۷۱ء میں جب کہ کمیٹی خازن البضاعۃ پہلے سے قایم ہو چکی تھی، اور سرسید کالج قائم کرنے کے لئے چندہ جمع کر رہے تھے، مولوی مشتاق حسین نے جو اس وقت صرف ۶۰ روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے، یکم جون ۱۸۷۱ء کو ایک خط سرسید کے نام لکھا کہ:-

"میری عزت اور میرا فخر ہوگا اگر آپ میری ایک تنخواہ جس کی تعداد ۶۰ روپے ہے میری طرف سے کمیٹی خازن البضاعۃ میں جمع فرمائیں، ——— یہ بہت ہی ناچیز رقم ہے جو ایسے بڑے کام میں، میں پیش کرتا ہوں، ——— میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اولاد کی تقریب اور خصوصاً مکتب کی تقریب میں جو روپیہ فضول صرف ہوتا ہے، اُس صرف کو روکا جائے، اور اُس میں سے ایک بڑا حصہ اس کمیٹی کو دیا جایا کرے۔"

اِس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کالج کے ساتھ اُن کا تعلق کس قدر قدیم تھا، لیکن با ایں ہمہ اُن کی تعلیمی خدمات کا دائرہ علی گڑھ تک محدود نہیں تھا، ہندوستان میں جہاں کہیں بھی تعلیمی کام ہوتا تھا وہ عملاً اُس کی اعانت کرتے اور تمام قومی و مذہبی مدارس کی اصلاح و ترقی میں حصہ لیتے تھے۔ علی گڑھ

کے حلقہ کے باہر اُنھوں نے جو تعلیمی خدمات انجام دی ہیں اُن سب کا احاطہ کرنا مشکل ہی، لہٰذا خاص خاص خدمات کا اس موقع پر تذکرہ کیا جاتا ہی۔

علی گڑھ کی تعلیمی کمیٹی میں شرکت

مولانا حالی حیات جاوید میں لکھتے ہیں :۔

"سنہ ۱۸۶۶ء میں سرسید کی تحریک سے زمینداران علی گڑھ نے ایک درخواست گورنمنٹ میں بھیجی کہ جب علاوہ جمع مالگزاری کے ایک روپیہ واسطے خرچ تعلیم کے ہم سے لیا جاتا ہی تو قرین انصاف یہ ہی کہ تعلیم کے انتظام اور نگرانی اور اخراجات میں ہم لوگوں کو بھی دخل دیا جائے، اور ہر ضلع میں ایک تعلیمی کمیٹی قایم ہو جس میں حکام ضلع اور افسران سررشتہ تعلیم کے علاوہ ضلع کے رئیس اور زمیندار بھی شامل ہوں نواب لفٹنٹ گورنر نے اوّل امتحاناً ضلع علی گڑھ اور اٹاوہ میں تعلیمی کمیٹیوں کا ہونا منظور کیا۔ اور آخرکار تمام اضلاع شمال و مغرب میں تعلیمی کمیٹیاں مقرر ہو گئیں"۔

مولوی مشتاق حسین بھی علی گڑھ کمیٹی کے ایک سرگرم ممبر اور رکن اسسٹنٹ سکرٹری تھے جو قریباً ۵ سال تک کام کرتے رہے، وہ مدارس کا معائنہ کرتے، طلبہ کا امتحان لیتے، مدارس کی ضروریات پر مفصل رپورٹیں لکھتے کمیٹی کے تمام جلسوں میں شریک ہوتے۔ اور جملہ مباحث میں آزادی سے حصہ لیتے تھے، چنانچہ اُنھوں نے اپنے ضلع بلکہ قرب وجوار کے اضلاع میں قریباً سو مدارس کا معائنہ کیا اور اپنی رپورٹوں میں اُن کے حسن و قبح پر حکام کو توجہ دلائی، اور خود سررشتہ تعلیم کی خود مختاری اور غلط کاری پر آزادی سے نکتہ چینیاں کیں، لیکن جب حکام متوجہ نہ ہوئے تو اُنھوں نے باوجود سرکار ملازم ہونے کے عام طور پر اخبار میں ان امور پر بحث کی، چنانچہ ۲ نومبر سنہ ۱۸۷۳ء کو اخبار سیٹفک سوسائٹی علی گڑھ میں "تعلیم کی کمیٹیاں اور سررشتہ تعلیم" کے عنوان سے ایک مفصل مضمون شائع کیا، اور تمام نقائص تفصیل سے بیان کیے، اس مضمون کے چند جملے مثالاً نقل کیے جاتے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں :۔

"کمیٹی کے اختیارات اور ذمہ داریاں کچھ ایسی بے ڈھنگی ہو رہی ہیں کہ سات برس کے تجربہ کے بعد بھی آج تک مجھ کو کوئی اصول اُس کا معلوم نہیں ہوا، کبھی میں یہ دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت خفیف امر بھی افسران سررشتہ تعلیم کے حضور سے بغیر مشورہ کمیٹی کے طے نہیں ہوتا اور کبھی یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایسے بڑے کام جن کو کمیٹی بھی کئی مہینوں کے غور و فکر کے بعد کر سکتی حکام بالا دست سررشتہ تعلیم کے حضور سے ایک لمحہ کے لمحہ میں ایسی صفائی کے ساتھ طے ہو جاتے ہیں کہ کمیٹی سے اُن میں ایک بات بھی نہیں پوچھی جاتی۔"

مکاتب کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"ڈپٹی انسپکٹر صاحب نے مدرسوں اور مکتبوں میں سے اور کچھ راہ چلتے حرف آشنا لوگوں کو ادھر اُدھر سے اسّی مدرس بھرتی فرمائے، اور ان خوبیوں کے ساتھ وہ اسّی مدرسے حکماً جاری ہو گئے، جب وہ خراب خستہ مدرس اپنے اپنے مدرسہ میں گئے تو وہاں اور مشکل پیش آئی، کہیں مدرسے کے لیے مکان نہ ملا کہیں لڑکے پڑھنے کو نہ آئے، کہیں دیہات والوں نے اس لیئے اُن سے نفرت کی کہ یہ "از غیبی گولہ" ہماری بغیر مرضی اور درخواست کے کہاں سے آ گرا، غرض کوئی مدرس واپس آ گیا، کسی نے ہاتھ پیر پیٹ کر آٹھ دس لڑکے دیہات والوں کی خوشامد کر کے برائے نام اکھٹے کر لیئے اور اپنے آپ کو سید اور برہمن جتلا جتلا کر اپنی نوکریوں کو قائم رکھا۔"

اسی سلسلہ میں ان مکاتب و مدارس کے متعلق بہت سے دلچسپ اور مضحکہ انگیز حالات بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں :۔

"اب اگر کمیٹی کے ممبروں کو شطرنج کے مہروں سے نسبت دی جائے،

تو کچھ نامناسب نہ ہوگا، ـــــــ اور میرے نزدیک اگر آئندہ موجودہ طریقہ
میں کوئی تبدیلی نہ ہو تو اس کمیٹی سے کچھ فائدہ نہیں، ناحق ہم لوگوں کا وقت ضائع
ہوتا ہے، اور صاحب ڈائرکٹر اور صاحب انسپکٹر کے دفتروں میں بھی خط و کتابت کی
طوالت ہوتی ہے۔"

اس کے بعد اُنھوں نے ممبروں کو آمادہ کیا ہے کہ اس اس قسم کے اختیارات گورنمنٹ سے طلب
کریں اور اگر ہمارے مطالبات منظور نہوں تو:۔

"اس رات دن کے قصہ کو ختم کرکے ممبروں کو آرام سے گھر بیٹھنا چاہیئے اور سررشتہ
تعلیم کی تمامتر آقائی، حکام سررشتہ تعلیم کے یدقدرت میں جس طرح سے اب تک چلی آتی
ہے، آیندہ بھی ویسے ہی اُن کے غیر محدود اختیار میں رہے، بالخیر و شما بسلامت۔"

مولانا حالی کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کمیٹیوں میں ہندوستانی ممبر یورپین حکام اور افسروں
کے سامنے آزادی اور جرأت سے اظہار رائے نہیں کر سکتے تھے اس وجہ سے یہ کمیٹیاں کچھ زیادہ مفید
نہیں ثابت ہوئیں، چنانچہ خود سرسید نے ایک یادداشت میں تسلیم کیا کہ :۔

"جس غرض سے یہ کمیٹیاں قایم ہوئی تھیں، وہ اُن کے قیام سے پوری نہیں ہوئی
کیونکہ یورپین ممبر، ہندوستانی ممبروں کو ایک مخالف فریق سمجھتے ہیں جن کو شکست
دینا اپنا قدرتی حق جانتے ہیں اور ہندوستانی ممبر کمیٹی میں اُن موم کی مورتوں کی
مانند معلوم ہوتے ہیں جو میڈم ٹساڈ کی نمائش گاہ میں تھیں۔"

مدرسہ دیوبند کی اعانت

نواب بشیر الدولہ سر آسمان جاہ کے عہدِ وزارت میں جب کہ وہ معتمد مال گزاری
تھے، وزیر ممدوح نے شملہ کا سفر کیا۔ نواب وقار الملک بھی ہمراہ تھے، دیوبند کے اسٹیشن پر کارکنانِ
مدرسہ نے سپاس نامہ پیش کیا، جب وفد رخصت ہونے لگا تو نواب وقار الملک نے سر آسمان کی منظوری
سے سو روپیہ ماہوار کی امداد کا اعلان کیا جس میں زمانہ مابعد میں اضافہ بھی ہوتا رہا، اس کے علاوہ وہ خود

بھی مختلف اوقات میں اپنی ذاتِ خاص سے مدرسہ کی مالی و اخلاقی اعانت کرتے رہے۔

ندوۃ العلماء کی اعانت ورکنیت

مجلس ندوۃ العلماء ۱۳۱۱ھ میں قایم ہوئی، اُس وقت حضرت مولنٰا محمد علی صاحب اُس کے ناظم (سکرٹری) تھے، نواب صاحب کے مولنٰا ممدوح سے ذاتی تعلقات تھے، باہم سلسلہ مراسلت جاری تھا، اور تعلیمی و مذہبی اُمور پر مشورہ بھی رہتا تھا، اس لحاظ سے وہ گویا آغاز کار سے ندوۃ العلماء کی تحریک میں شریک تھے، لیکن باضابطہ تعلق ۱۳۲۲ھ سے پیدا ہوا جب کہ وہ اس کی مجلس انتظامی کے رُکن منتخب ہوئے، اس وقت سے ندوہ کے معاملات سے پوری دلچسپی لینے لگے، لیکن جب کالج سے قطع تعلق کیا، تو بوجہ علالت و پیرانہ سالی ندوہ کے فرایض رکنیت ادا کرنے سے معذوری ظاہر کی اور یہ تحریک کی کہ بجائے میرے نواب محمد اسحٰق خاں صاحب (جو اب کالج کے آنریری سکرٹری مقرر ہو چکے تھے) رکن انتظامی مقرر کیے جائیں، رکنیت سے علٰحدہ ہونے کے بعد بھی مالی اعانت برابر کرتے رہے۔

وقف کرنال کے مقدمہ میں ندوہ نے محض نواب صاحب کی تحریک و مشورہ سے شرکت کی اور پریوی کونسل میں مقدمہ لڑانے کے مصارف برداشت کیے، خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس مقدمہ میں پوری کامیابی ہوئی اور معقول سالانہ آمدنی ندوہ کو حاصل ہو گئی۔

سر انٹونی مکڈانل لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ جب ندوہ کے مخالف ہو گئے تو نواب صاحب نے اس بدگمانی کے رفع کرنے کی خاص کوشش کی بلکہ یہ چاہا کہ مکڈانل صاحب کے جانشین کو کالج میں جو ایڈرس دیا جانے والا تھا اُس میں ندوہ کا بھی خصوصیت سے ذکر کیا جائے، لیکن نواب محسن الملک[۱] اور چند دوسرے ٹرسٹی کسی مصلحت سے اس پر آمادہ نہ ہوئے۔

---

[۱] نواب محسن الملک نے اس سلسلہ میں نواب وقار الملک کو حسب ذیل خط لکھا تھا:-

"متعلق ندوہ کے جو کچھ آپ نے لکھا ہے ایک لحاظ سے نہایت مفید ہو کہ جو غلطی بھلی گورنمنٹ کو ندوہ کی نسبت ہوئی ہو وہ بتائی جائے اور علماء کے گروہ کی نسبت جو غلط اشتباہ پیدا کیا گیا ہے وہ دور کیا جائے، اور اس طریقہ سے اس معزز جماعت کو اپنی طرف مائل کیا جائے، مگر اسی کے

نواب صاحب دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تعلیم و تربیت سے یہاں تک متأثر تھے کہ جس زمانہ میں وہ کالج کے آنریری سکرٹری تھے انھوں نے اپنے فرزند صاحبزادہ مشتاق احمد سلمہ کو ندوہ کے دارالعلوم میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا، لیکن چند روز بعد صاحبزادہ موصوف علالت اور جسمانی کمزوری کی وجہ سے طبی مشورہ کے مطابق لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور ہوئے ورنہ دارالعلوم ندوہ ہی میں اپنی تعلیم کی تکمیل کرتے۔

ندوہ کی تعلیم کو وہ جس حیثیت سے پسند کرتے تھے، اس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے ۲ر ستمبر ۱۹۰۲ء کو مولانا محمد مسیح الزماں خاں صاحب شاہجہاں پوری (استاد اعلیٰ حضرت نظام خلد آشیاں) کو لکھا ہے۔ کالج کے بعض معاملات کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"میرا قصد اس موسم میں نینی تال کا نہیں ہے، ندوۃ العلماء کے متعلق ہز آنر کو بھی اطمینان دلانے کی ضرورت ہے کہ ملک میں ایک ایسے دارالعلوم اور اس قسم کی کوشش کی ضرورت ہے، اور ان کو مناسب موسم میں دارالعلوم میں تشریف لانے کی تکلیف دی جائے۔"

"علی گڑھ کالج کے لئے گورنمنٹ نے یہ منظور کیا ہے کہ ایک یورپین پروفیسر عربی کی تعلیم کے لئے بلایا جائے جس کی تنخواہ گورنمنٹ دیگی، اور وظائف کالج کے مسلمان ہندو دیں، بی اے کی تعلیم کے بعد ایم اے عربی میں یہاں

(بقیہ نوٹ ص ۶۰۸) ساتھ دوسرا پہلو بھی غور کے لائق ہے کہ آیا ٹرسٹیوں کو اپنے ایڈرس میں اس قسم کی وکالت کرنا موزوں ہوگا یا نہیں؟"

اس کے بعد لکھتے ہیں:۔

میں نے مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی (رئیس حبیب گنج) سے ذکر کیا وہ تو اس خیال کو بہت پسند کرتے ہیں مگر اور ٹرسٹی جن سے ذکر آیا اس سے متفق نہیں ہیں، اور بعض تو بالکل خلاف ہیں۔"

کے علوم حاصل کریں لہٰذا اعتراض یہ ضرور کرینگے کہ علی گڑھ کالج میں بھی اب اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہوگی، ضرورت کیا ہے کہ ندوہ علیحدہ قائم رہے؟

"اس کا جواب یہ ہے کہ علی گڑھ کالج میں قریباً قریباً وہی لوگ تعلیم پاتے ہیں جو وکالت یا سرکاری نوکری کے خواہشمند ہیں اور ابھی ایک بڑا گروہ مسلمانوں میں وہ بھی ہے جو وکالت اور نوکری کے سوا اپنی اولاد کو دوسرے کاروبار، زمینداری و تجارت وغیرہ میں مصروف رکھنا چاہتا ہے، اُن کے لیے ندوہ کے سوا دوسرا کوئی ذریعہ عمدہ تعلیم و تربیت کا نہیں ہے، اور اُن کو یونیورسٹی کی قیود میں مبتلا کرنا کچھ ضرور نہیں ہے۔ یہ لوگ تمام علوم عربی و اردو میں حاصل کرینگے اور صرف زبان انگریزی سیکھینگے، ابتدائی دنیوی و دینی تعلیم[1] .... اور اس کے بعد پھر وہ انگریزی کالج میں بہت زیادہ کامیابی کے ساتھ تعلیم پاسکیگا"

یہی خیالات انھوں نے ۱۹۰۶ء کے اجلاس کانفرنس منعقدہ ڈھاکہ میں ظاہر کیے۔ نواب محسن الملک نے ندوۃ العلماء کی حمایت میں رزولیوشن پیش کیا تھا، نواب وقار الملک نے پرزور الفاظ میں اس کی تائید کی پہلے انھوں نے بتایا کہ ہماری قوم میں بعض طبقے ایسے ہیں جو یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنا نہیں چاہتے یا اُن کے لیے موزوں نہیں۔

اس کے بعد کہا کہ:-

"اس بڑے شریف مگر مفلس گروہ کے لیے اس کے بعد اعلیٰ طبقہ کے خاص گروہ کے لیے کونسی ایسی درسگاہ قوم میں موجود ہے جو اُن کی آرزوؤں کو پورا کر سکتی ہے، اور اگر ہے تو وہ کہاں ہے؟ میں کہتا ہوں کہ وہی ہے، اور وہی ہے جو دارالعلوم ندوہ کے نام سے موسوم ہے۔

---

[1] یہاں پر خط کرم خوردہ ہے۔

ندوہ نے دونوں فرقوں اور خیال والوں کی تعلیم کا انتظام کرنا چاہا ہے، وہ بڑی گروہ کے لیئے بھی ہے اور چھوٹے کے لیئے بھی، اس میں شک نہیں کہ ابھی تک وہ امیدیں اُس سے پوری نہیں ہوئیں جن کا ذکر ہو رہا ہے، لیکن کیوں نہیں پوری ہوئیں؟ اس کا جواب یہی ہے کہ جس بڑے گروہ کے لیئے وہ قایم کیا گیا، اُس نے توجہ نہیں کی اور یہ قصور ندوہ کا نہیں خود ہمارا ہے۔"

انگریزی مدارس میں مذہبی تعلیم کے لیئے جدوجہد

اگرچہ نواب وقار الملک مغربی تعلیم کے زبردست حامی تھے، اور اُس کو مسلمانوں کی دنیوی فلاح و مادّی ترقی کا ذریعہ خیال کرتے تھے، لیکن چونکہ وہ قولاً و عملاً ایک راسخ العقیدہ و پابند مذہب مسلمان تھے، اس لیئے مذہبی تعلیم و تربیت کو مسلمانوں کی فلاح اُخروی کے لیئے نہایت ضروری سمجھتے تھے، وہ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی مذہبی بیگانگی سے نہایت افسردہ و متاثر تھے اور جب کبھی اس کے متعلق اُن کو لکھنے یا کچھ کہنے کا موقع ملتا تھا تو نہایت آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے، اُن کی یہ عادت مشہور تھی کہ اگر اُن کو کسی شدید مخالف کے جواب میں بھی کچھ لکھنا ہوتا ہے تو ہمیشہ نہایت نرم و معتدل الفاظ میں لکھتے ہیں، لیکن باوجود اس کے جب کبھی وہ انگریزی خواں نوجوانوں کی مذہبی غفلت پر کچھ لکھتے تھے، تو اُن کے ایک ایک لفظ سے مذہبی جوش کا پتہ چلتا تھا۔

وہ ہمیشہ سے انگریزی خواں طلبہ کے لیئے مذہبی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے، چنانچہ جب ۱۸۷۱ء میں سرسید کے سوالات کے جواب میں اپنا مشہور انعامی رسالہ لکھا تو اُس میں بھی انگریزی مدارس میں مُسلمان طلبہ کی قلت پر بحث کرتے ہوئے لکھا:۔

"ان سرکاری مدارس میں لڑکوں کا مذہبی اخلاق جس طرح برخراب ہوتا ہے وہ نہایت خطرناک ہے۔"

اسی سلسلہ میں وہ اُن مسلمانوں کا جو سرکاری مدارس میں تعلیم نہیں پاتے مقابلۃً ذکر کر کے

لکھتے ہیں :-

"لیکن میں اس موقع پر اُن ناخدا ترس مسلمانوں کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتا جن کی بدولت یہ اعتراض عائد ہو رہا ہے تاہم مختصراً اس قدر بیان کرنا ضرور چاہتا ہوں کہ وہ ظالم مسلمان بھی تذکرۂ بالا افعال کو گناہ سمجھ کر کرتے ہیں اور سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں جو بداخلاقی پیدا ہوتی ہے اُس کا اثر اس قدر قوی ہوتا ہے اور طالب علموں کی طبیعتیں اس قدر ڈھیٹ ہو جاتی ہیں کہ اُن میں اس قدر صلاحیت بھی باقی نہیں رہتی کہ گناہ کو گناہ سمجھیں، نماز کو وہ بالکل لغو سمجھتے ہیں، روزہ کو فاقہ سے بدتر جانتے ہیں۔

میں جو کیفیت سرکاری مدارس کی دیکھتا ہوں، مجھ کو سخت حیرت ہے کہ جس قدر تھوڑے بہت مسلمان اب ان مدرسوں میں پڑھتے ہیں وہ بھی کیونکر پڑھتے ہیں۔"

اس سے اندازہ ہوگا کہ وہ اسلامی تعلیم گاہوں کی ضرورت زیادہ تر اس بنا پر سمجھتے تھے کہ اُن میں مذہبی تعلیم و تربیت کا انتظام بخوبی ممکن ہے، لیکن اسقدر اسلامی تعلیم گاہیں کہاں، اس لیئے مسلمان عموماً سرکاری مدارس میں پڑھتے ہیں جہاں مذہبی تعلیم و تربیت کا مطلق انتظام نہیں، وہ مدت سے اس خامی کو محسوس کر رہے تھے اس لیئے جب حیدر آباد سے آخری دفعہ واپس آئے تو سب سے پہلے اسی طرف توجہ کی۔

۱۸۹۲ء میں **ایجوکیشنل کانفرنس** کا سالانہ اجلاس **دھلی** میں منعقد ہوا، مختلف صوبجات ہند کے اکثر تعلیم یافتہ اور اصحاب الرائے مسلمان شریک تھے، اُس وقت نواب صاحب نے حسب ذیل رزولیوشن پیش کیا :-

"اِس کانفرنس کے نزدیک ہر مقام کے مسلمانوں پر جہاں گورنمنٹ اسکول یا کالج ہیں یہ بات فرض ہے کہ جو مسلمان طالب علم گورنمنٹ کالجوں اور اسکولوں

میں پڑھتے ہیں اُن کی مذہبی تعلیم کا کوئی بندوبست کریں"۔

اس تجویز کو پیش کرتے ہوئے اُنھوں نے ایک پُرمغز اور مدلل تقریر کی اور سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم جاری کرنے کی جو صورتیں ممکن ہیں ایک ایک کرکے بیان کیں، پھر اُن دشواریوں کا حوالہ دیا جو اس معاملہ میں سنگ راہ رہیں، اس کے بعد سلسلہ تقریر میں یہ بتایا کہ :۔

"میری اسکیم یہ ہے کہ گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ پنجاب و ممالک مغربی و شمالی و اودھ میں اجازت دے کہ جو گھنٹے سکنڈ لینگوج کے لیئے ہیں، ہفتہ میں دو دفعہ اُن میں آدھے آدھے گھنٹہ میں مذہبی تعلیم دیجائے اِس کے پابند ہونے کا مستحکم انتظام کرنا ہمارا کام ہونا چاہیئے، چندہ کرنا چاہیئے جو مدارس کے انتظام کے لیئے کافی ہو"۔

سرسید بھی اجلاس میں موجود تھے، اُن کو اصلی تجویز سے اختلاف نہیں تھا لیکن نواب وقارالملک نے جب اپنی تقریر میں گورنمنٹ سے درخواست کرنے کا ذکر کیا تو وہ سخت برہم ہوئے اور اپنی تقریر میں بہت کچھ جوش کا اظہار کرتے ہوئے اس اسکیم کو ناموزوں قرار دیا، دیر تک اختلاف و مباحثہ رہا، آخر میں نواب وقارالملک نے سب اعتراضات کا جواب دیا اور رزولیوشن کثرت رائے سے پاس ہوا، لیکن رزولیوشن پاس ہونا درحقیقت کوئی قابل توجہ چیز نہیں، ہماری قومی انجمنیں ہزاروں رزولیوشنوں کا مدفن ہیں، اصلی کام تو یہ ہے کہ کسی تجویز کے پاس ہوجانے کے بعد اُس کے عمل میں لانے کے لیئے خاص تدابیر اختیار کی جائیں اور کوشش کی جائے۔

نواب وقارالملک نے کانفرنس سے آنے کے بعد اس کے لیئے کوشش شروع کردی، لوکل گورنمنٹ اور گورنمنٹ ہند سے مراسلت کی جس کا سلسلہ مہینوں جاری رہا، اسی سلسلہ میں نینی تال گئے وہاں مدت تک قیام کیا اور ڈائرکٹر و لفٹننٹ گورنر سے ملاقاتیں کرکے اپنی تجویز کی اہمیت ذہن نشین کی، نینی تال ہی سے اُنھوں نے مئی ۱۸۹۴ء میں اُردو اور انگریزی میں اپنی اسکیم ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع کی، اُردو پمفلٹ ۲۷ صفحہ کا ہے اور بہت مفصل و مدلل ہے، بخوف طوالت اُس کے دلائل اس

موقع پر نقل نہیں کر سکتے البتہ آخری سطور جن میں مطالبات کا ماحصل ہے، لکھی جاتی ہیں۔

نواب صاحب لکھتے ہیں :-

"میری اسکیم میں گو متعدد صفحے سیاہ ہوئے ہیں اور اس میں مشکلات اور پیچیدگیاں بھی دکھلائی دیتی ہیں، مگر وہ سب اس لیئے ہیں کہ میں گورنمنٹ میں کوئی ایسی اسکیم پیش کرنا نہیں چاہتا جو صرف مسلمانوں کے لیئے ہو ورنہ جہاں تک مسلمانوں کو اس اسکیم سے تعلق ہے، وہ بہت ہی مختصر ہے، اور ان نہایت مختصر الفاظ میں بیان ہو سکتی ہے :-

(۱) مسلمانوں کا جو گروہ مذہبی تعلیم کا خواہشمند ہو وہ اپنی تعلیم کا خرچ خود برداشت کرے۔

(۲) ہفتہ میں ۲ روز نصف گھنٹہ سکینڈ لینگویج میں سے مذہبی تعلیم کے لیئے دیدیا جائے۔

(۳) مدرستہ العلوم مسلمانان علی گڑھ (کالج اور اسکول) کا کورس جو سنیوں کے لیئے علیحدہ ہے اور شیعوں کے لیئے علیحدہ اس صوبہ کے لیئے مسلمانوں کا مذہبی کورس ہو"

نواب صاحب کی یہ جد وجہد ضائع نہیں گئی چنانچہ ۶ جولائی ۱۸۹۵ء کو لوکل گورنمنٹ کے سکریٹری کی طرف سے ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم کو حسب ذیل حکم پہونچا۔

"ہز آنر لفٹننٹ گورنر وچیف کمشنر نے عام طور پر آپ کی رائے سے اتفاق کرتے وقت یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ مذہبی تعلیم کی اسکیم کو جو نواب مشتاق حسین نے مرتب کی ہے، کسی قدر ترمیم شکل میں امتحاناً جاری کیا جائے لہذا آپ امروہہ ہائی اسکول ضلع مراد آباد میں اس کو امتحاناً جاری کرنے کا انتظام کریں، اور چھ مہینہ کے بعد آپ ایک رپورٹ کریں جس میں بالتخصیص

آپ اس بات پر توجہ کریں کہ جو طلبہ ہفتہ میں دو مرتبہ نصف نصف گھنٹہ سکنڈ لینگوج میں شریک نہیں رہے وہ اپنے دوسرے ہم کلاس طلبہ سے اس میں کسقدر پیچھے رہ گئے ہیں، اس امر کے متعلق مجکو یہ تبلا دینا چاہیئے کہ نواب مشتاق حسین اس پر زور دیتے ہیں کہ مشن اسکولوں میں بدون اس کے کہ دنیوی تعلیم کو کوئی قابل لحاظ نقصان پہونچے، مذہبی تعلیم جاری ہو، اور ان کا یہ کہنا بھی غالباً درست ہو کہ در آں حالے کہ لڑکے مذہبی تعلیم کے لیئے وقت سے پہلے آنا یا بعد کو ٹھیرا رہنا پسند نہ کرینگے وہ غیر وقتوں میں اس وقت کی کمی کا بدل کر دینگے، (جو مذہبی تعلیم کی وجہ سے) ان کے ہاتھ سے نکل جائیگا، اور کوئی مشکل جو اس وقفہ کی وجہ سے پیدا ہو جو لڑکوں کی مذہبی تعلیم سے واپس آکر دوبارہ اسکول میں شریک ہونے تک ہوگا، اس کے رفع کرنے کے لیئے یہ مناسب خیال کیا گیا ہو کہ جہاں تک ممکن ہو سکنڈ لینگوج کا گھنٹہ سب سے آخر میں رکھا جائے۔"

اس کے بعد دفعہ وار وہ طریقہ اور شرائط بیان کیئے گئے ہیں جن کے مطابق تعلیم دی جائیگی، اس حکم کے موصول ہونے پر ڈائرکٹر نے ۹ ستمبر ۱۸۹۶ء کو ایک سرکلر کے ذریعہ سے جس میں جملہ ضروری تفصیلات بھی بیان کر دی تھیں، مذہبی تعلیم کی اجازت دیدی، نواب صاحب نے امروہہ میں ایک جلسہ کر کے باقاعدہ طور پر وہاں کے اسکول میں مذہبی تعلیم کا افتتاح کیا، اور اپنے خرچ سے ایک مدرس مقرر کر دیا۔

۱۹۰۲ء میں نواب صاحب نے یونی ورسٹی کمیشن میں جو شہادت دی اس میں اسکیم کے آغاز و عملی نتائج کے متعلق بھی بعض واقعات بیان کیئے ہیں وہ کہتے ہیں۔

"اس اسکیم کے پیش ہونے کے بعد اول سال سر چارلس کراسویٹ کی گورنمنٹ نے اس پر اپنے افسروں سے مفصل رائے طلب کی، دوسرے سال ان رایوں کے موصول ہونے کے بعد آنریبل ایلن کیڈل صاحب بہادر قایم مقام

لفٹننٹ گورنر کی گورنمنٹ نے پیش شدہ اسکیم کے مطابق امروہہ ہائی اسکول میں امتحاناً مذہبی تعلیم کے جاری ہونے کی اجازت دی۔ اسکول میں مسلمان اور ہندو دونوں تعلیم پاتے ہیں اور مسلمانوں میں سنی و شیعہ دو فریق ہیں، ان گروہوں میں سے مسلمان سنی فرقہ نے اپنے لڑکوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام ہائی اسکول میں کیا۔

گورنمنٹ نے چھ مہینے کے امتحان کے بعد اس کے نتیجہ کی نسبت رپورٹ طلب کی اس رپورٹ میں تسلیم کیا گیا کہ جن طلبہ نے مذہبی تعلیم میں وقت صرف کیا ہے اُنکی سکنڈ لینگوج میں کوئی کمی ان طلبہ کے مقابلہ میں نہیں ہوئی جنھوں نے مذہبی تعلیم نہیں پائی اور دوسرے یہ کہ مذہبی تعلیم کی وجہ سے کسی قسم کا کوئی نزاع طلبہ کے مختلف گروہوں میں پیدا نہیں ہوا، اس رپورٹ کے پیش ہونے پر سر انٹونی مکڈانل کی گورنمنٹ نے دونوں صوبجات متحدہ کے واسطے عام طور پر اس تجویز کو منظور کیا، اور ۲۰ دسمبر ۱۸۹۶ء کو ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن نے مذہبی تعلیم کے متعلق ایک سرکلر خاص سرکلر نافذ کیا۔"

اس کے بعد اُنھوں نے اسکیم کی بعض خوبیاں اور اس پر عملدرآمد کی کیفیت بیان کر کے کہا:۔

"اب تک دیگر اضلاع میں اس اسکیم کا عملدرآمد نہیں ہو سکا۔ امروہہ میں حسن اتفاق سے ہائی اسکول کے بہت قریب ایک مسجد اس کام کے لیئے مل گئی اور شاہ جہاں پور کے موجودہ مکان ہائی اسکول میں کسی قدر گنجائش نکل آئی ہے۔"

دسمبر ۱۸۹۶ء کے اجلاس کانفرنس منعقدہ میرٹھ میں نواب محسن الملک کی تحریک سے اس اسکیم کی منظوری پر گورنمنٹ کا شکریہ ادا کیا گیا، اس میں شک نہیں کہ نواب صاحب کو اپنی جد و جہد میں کامیابی ہوئی لیکن مسلمانوں نے اسکیم سے کچھ بھی فائدہ نہیں اُٹھایا، نہ کہیں مذہبی تعلیم کا انتظام کیا، گویا اس کے متعلق سر سید کا یہ خیال کہ مسلمان کچھ بھی نہیں کرینگے پورا ہوا۔

دیہاتی تعلیم پر ایک مفید یادداشت

۱۸۹۶ء میں جب کہ گورنمنٹ کی توجہ عام اور ابتدائی تعلیم پر مبذول تھی نواب صاحب نے اپنے وسیع تجربہ اور دیہاتی معاشرت سے واقفیت کی بنا پر ایک مبسوط و مدلل یادداشت پیش کی جس کا مقصد یہ تھا کہ بغیر مصارف کے بڑھائے دیہات میں تعلیم کو وسعت و عمومیت حاصل ہو، وہ لکھتے ہیں:۔

"دیہاتی تعلیم کو صرف دیہاتی ضرورتوں تک محدود رکھا جائے، اور اس خیال کو یک قلم ترک کر دیا جائے کہ دیہاتی اسکول قصبات کے مڈل اسکولوں کے لیئے فیڈر کا کام دیں۔

دیہاتی باشندوں کی ضرورتوں کے لحاظ سے اس قدر کافی ہے کہ وہ اپنی زبان میں سادہ سادہ خطوط لکھ سکیں اور اُن کو پڑھ سکیں، حساب بقدر ضرورت مع اس قدر اضافہ کے کہ منہ سے اور رقمیں اُن کو ہندی اور اردو و انگریزی تینوں قسم کے سکھلا دیئے جائیں اور پیمائش صرف اس قدر کہ وہ کھیتوں کا رقبہ اور اُن کی جمع صحیح صحیح دریافت کر سکیں تاکہ چالاک پٹواریوں، زمینداروں اور اُن کے کارندوں کے ہاتھ سے اُن کی جان بچ سکے۔

بعض چھوٹے چھوٹے نقشے تفنن طبع کے طور پر اُن کو سمجھائے جائیں اور ضروری ضروری جغرافیائی اور تاریخی رسالے اُن کی زبان میں صرف اس لیئے مہیا رہیں کہ جب اُن میں اپنی زبان میں خط و کتابت کی استعداد پیدا ہو جائے تو وہ اُس کو اپنے شوق سے مطالعہ کر سکیں اُن کو ایک جزو تعلیم، اور امتحان کا ایک سبجکٹ نہ قرار دیا جائے، اُن کو خوبصورت خوبصورت کاپیوں کے مرتب کرنے کی جس سے ایک معائنہ کرنے والے افسر کا دیکھتے ہی دل خوش ہو جائے تکلیف نہ دی جائے جس کے واسطے باپ کو چند پیسوں کا زائد صرف برداشت کرنا بھی بسا اوقات ناگوار ہوگا، اس کی جگہ وہی پرانا طریقہ جو اُن کے دیسی مکتب

میں اب بھی جاری ہے یعنی کہ لکڑی کی ایک تختی سیاہ روغن کی جس پر سینٹھے کے قلم اور ہنڈول سے وہ اپنا کام بخوبی نکال لیتے ہیں، مناسب ہے۔"

اس کے بعد اُنھوں نے بتا دیا ہے کہ تعلیم کا عام پیمانہ یہی ہونا چاہیئے۔ ہاں اگر کوئی خاص متمول شخص اپنے لڑکوں کو زیادہ تعلیم دینا چاہے تو وہ بطور خود اُس کا بندوبست کر سکتا ہے، یا مخصوص حالات کے ماتحت کسی مقام پر ہائی اسکول قایم ہو سکتا ہے، لیکن عام دیہاتی تعلیم کو بکھیڑے میں ڈالنا مناسب نہیں اس کے بعد لکھتے ہیں :-

"جب اس طرح پر تعلیم کا پیمانہ دیہاتی اسکولوں میں گھٹا دیا جائے تو میری دانست میں ایک متوسط استعداد کا لڑکا چھ سات برس کی عمر سے اگر ہر روز تین گھنٹہ تعلیم میں صرف رکھا جائے تو چھ برس میں وہ بخوبی تمام اپنی مجوزہ تعلیم کی تکمیل کر سکتا ہے۔"

اس کے بعد وہ دیہاتی تعلیم کے لیئے صرف تین گھنٹہ کا وقت تجویز کر کے کہتے ہیں :-

"اس وقت جو دیہاتی طلبہ مثل شہری طلبہ کے اپنا پورا وقت تعلیم میں صرف کرتے ہیں دیہاتی زندگی کے لیئے بجائے فائدہ رساں ہونے کے سخت مضر ثابت ہو رہا ہے جو لوگ دیہاتی طرز زندگی سے واقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ دیہاتی بچے جیسے جیسے زیادہ عمر کے ہوتے جاتے ہیں اُسی اُسی قدر وہ اپنے بڑوں کے ساتھ گھریلو پیشہ اور کاروبار میں شریک ہوتے جاتے ہیں اور اس سے اُن کو آبائی پیشوں ہی کی وہ تعلیم حاصل نہیں ہوتی جس کے وہ ہماری کتابی تعلیم کی بہ نسبت زیادہ محتاج ہیں بلکہ اپنے بچوں کی شرکت کاروبار سے اس مفلس گروہ کو بہت بڑی مدد پہونچنے لگتی ہے؟

ایک کاشتکار کا پانچ برس کا بچہ چھوٹی سی لکڑی ہاتھ میں لیئے ہوئے، اپنے جانوروں کو گھروں سے جنگل کی طرف لے جاتا ہوا اور گھانس چراتا ہوا دیکھا

جاتا ہے، اور اُن کا سات آٹھ برس کا بچہ بے تکلف اپنے مویشی کو کسی تالاب یا ندی کے کنارہ پر پانی پلاتا ہے اور اپنی عمر کے مناسب ماں، باپ کے ساتھ ہر ایک کام میں شریک ہو جاتا ہے"

اِس کے بعد لکھتے ہیں :۔

"اگر ہم اُن کا تمام وقت تعلیم میں گھیر لینگے، تو وہ ان تمام باتوں سے محروم ہو جائینگے، اور جوان ہو کر صرف نوکریوں کے متلاشی ہونگے اور ہل کندھے پر رکھنے کو اور ہتھوڑا البسولا ہاتھ میں لینے کو اپنی عزت نوشت و خواند کے خلاف سمجھنے لگینگے، اور اپنے شریف ترین آبائی پیشوں کو اور دیہاتی پر مشقت و محنت آبائی زندگی کو خیرباد کہیں گے، اور اس کا ہم روز اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں۔

یہ افسوسناک نتیجہ تعلیم کی وجہ سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ ایک مدت دراز تک بچوں کو پیشہ کے کاروبار سے علیحدہ کر لینے اور صرف تعلیم میں مصروف رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے"۔

اِسی بحث کو تفصیلاً بیان کر دینے کے بعد آخر میں در دیگر کہتے ہیں :۔

"اگر تعلیم کی مقدار میں کمی نہ بھی کی جائے تو بھی تعلیم کی مدت کو بڑھا کر روزانہ تعلیم کے وقت کو ضرور اس لئے گھٹا دینا چاہیئے کہ بچوں کو ہر روز اپنے پیشوں میں مصروف رہنے کا موقع ملے"۔

اِسی تجویز کے سلسلہ میں اُنھوں نے شہر کی اُس آبادی کو بھی شامل کیا ہے، جو شہر کے کنارہ پر ہے، اور بیرون شہر زراعت کرتی ہے، نیز وہ اہلِ حرفہ اور مزدور پیشہ اشخاص جو شہر کے ہر ایک حصّہ میں منتشر طور پر آباد ہیں۔

اِس کے بعد اُنھوں نے ایسے لڑکوں کے لیے جو مزدوری، معماری، نجاری یا ملازمت

کرتے ہیں نائٹ اسکولوں کے قائم کرنے پر زور دیا ہے کیوں کہ اُن کو دن میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں مل سکتا۔

مذکورۂ بالا تجاویز کے علاوہ اور مفید تجویزیں بھی یادداشت میں بیان کی گئی ہیں، اور یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ ان تجاویز پر عمل کرنے سے مصارف میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔



یونیورسٹی کمیشن میں شہادت

۱۸۸۲ء اور ۱۹۰۲ء میں گورنمنٹ ہند نے تعلیمی کمیشن مقرر کیے دونوں دفعہ نواب صاحب نے بھی شہادت دی، پہلے کمیشن میں من جملہ اور سوالات کے ایک سوال طلبہ کی صحت کے متعلق بھی تھا، اس کے جواب میں اُنھوں نے نہایت تفصیل سے اُن تمام خرابیوں کو ظاہر کیا جو امتحان کے مقررہ موسم اور طریق تعلیم سے پیدا ہوتی ہیں اور اس سلسلہ میں اپنے ذاتی تجربات بھی بیان کیے۔

۱۹۰۲ء کے کمیشن میں اُنھوں نے تعلیم کو دماغ میں ٹھونسنے کے متعلق نہایت تفصیلی بحث کی ہے، اور اس سے طلبہ کی صحت پر جو اثر پڑتا ہے اُس کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔

"یہ وہ عام شکایت ہے کہ اس ملک کے گریجویٹ اکثر اپنی تعلیم پر اپنی تندرستی کو قربان کر چکے ہیں، مسلسل مطالعہ سے اُن کے جسم اور دل و دماغ اور بصارت کمزور ہو جاتی ہے، حوصلہ مندی اور روشن ضمیری اُن میں پیدا نہیں ہوتی، اور بہت کم اُن میں اس قابل ہوتے ہیں جو آیندہ کاروباری دنیا میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل کریں، اور یہ سب کچھ اُن ناقص طریقہائے تعلیم کی وجہ سے ہے جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ تعلیم کو طلبہ کے دماغ میں ٹھونستے ہیں"

اِس کے بعد اس خرابی پر بحث کی ہے کہ ایک مضمون میں فیل ہو جانے سے طلبہ تمام مضامین میں فیل سمجھے جاتے ہیں، اور پھر اُن کو از سرِ نو تمام مضامین میں تیار ہونا پڑتا ہے، جس کا دماغ پر

مضر اثر پڑتا ہے، اس بنا پر انھوں نے رائے دی ہے کہ:۔

" یہ طلبہ کا اختیاری امر ہونا چاہیئے کہ خواہ وہ مختلف مضمونوں میں ایک ہی ساتھ امتحان دیں، خواہ بتدریج، اور ناکامیاب طلبہ کا امتحان اُن ہی مضامین میں لیا جائے جن میں کہ وہ ناکام رہے ہیں۔"

پھر انھوں نے مختلف وجوہ بیان کر کے ایف اے کے درجہ کو قطعاً توڑ دینے کی ضرورت ظاہر کر کے یہ رائے دی ہے کہ بی اے کی خواندگی کو مناسب طریقہ سے چار رسالوں پر تقسیم کر کے کالج کے پرنسپلوں کو اختیار دینا چاہیئے کہ وہ ہر سال ڈپارٹمنٹل طور پر طلبہ کو ترقی دے سکیں، یونیورسٹی صرف فورتھ ایئر طلبہ کا امتحان بی اے میں لیا کرے۔

اس کے بعد تاریخ کو حفظ یاد کرانے کے نامناسب طریقہ پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے مثالاً بیان کیا:۔

" میں مفصلۂ ذیل سوال کو بطور نظیر کے پیش کرتا ہوں جو ایف اے کے امتحان ۱۹۰۱ء میں ہوا تھا اور جو الہ آباد یونیورسٹی کے کلنڈر میں بصفحہ ۵۱۲ درج ہے اور تاریخ کے پرچہ کا پانچواں سوال ہے " وارن ہیسٹنگز کے زمانہ کے بڑے واقعات بالترتیب وبتاریخ شمار کرو" جب اس طرح پر طلبہ کو ایک ایک وائسرائے ہند کے پورے زمانہ وائسرائیلٹی کی بابت ہر ایک واقعہ کو نہ صرف بہ ترتیب بلکہ بقید تاریخ بیان کرنا ضرور ہوگا تو خواہ نخواہ اُن کو تاریخ کو صفحہ بصفحہ حفظ یاد کرنے ہی کی ترغیب پیدا ہوگی۔"

پھر انھوں نے ریاضی کے کورس میں تخفیف کی رائے دی ہے، اور انٹرنس پاس کرنے کے لیئے ۱۶ برس کی عمر کی شرط کو نامناسب اور باعثِ مضرت قرار دیا ہے۔

اس کے بعد انھوں نے علی گڑھ کالج کو مسلم یونیورسٹی بنانے کی ضرورت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"یہ کہا گیا ہے کہ اگر ایسا ہو تو شاید دوسرے گروہ رعایا بھی اپنے لئے خاص خاص یونیورسٹیوں کا مطالبہ کریں، اس کے لحاظ سے میں یہ کہتا ہوں کہ بہت مناسب ہوگا اگر تمام ہندوستان میں چند یونیورسٹیاں ایسی بھی موجود ہوں جو سلیف ہیلپ کے اُصول پر قایم ہوں، مثلاً بنارس کالج جس میں زیادہ زور سنسکرت کی تعلیم پر دیا جاتا ہے اگر ترقی کرتے کرتے ایک یونیورسٹی بن جانے کی منزلت پیدا کرلے تو اس عزت کے بخشنے سے اس کے ساتھ دریغ نہ ہونا چاہیئے۔"

اس کے بعد اُنھوں نے یہ بتایا ہے کہ فیس کی زیادتی طلبہ کی اعلیٰ تعلیم میں ہارج ہے، وہ کہتے ہیں کہ:۔

"جو طلبہ کہ بورڈر کی حیثیت سے تعلیم پاتے ہیں اُن کے لئے فیس تعلیم کی موجودہ مقدار زیادہ تکلیف دہ ہے اور بورڈنگ ہوسوں میں بھی خاص کر ایم اے او کالج کے بورڈر جہاں بورڈروں کو مکانوں کا کرایہ بھی دینا پڑتا ہے اور دوسرے مصارف بھی کسی قدر بڑے اسکیل میں ادا کرنے ہوتے ہیں اُن کو فیس تعلیم کی سختی اور بھی زیادہ محسوس ہوتی ہے اور مجھ کو ذاتی علم ہے کہ بہت سے شریف طالب علم تعلیمی اخراجات کی ترقی کی وجہ سے دوسروں سے مدد چاہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔"

اسی سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

"گورنمنٹ نے فی صدی ۵ طالب علموں کو بہ معافی فیس داخل ہونے کی اجازت دی ہے اور فی صدی ۵ کو نصف فیس پر، جس کا مطلب یہ ہے کہ گورنمنٹ ملک کے دولت مندوں اور مفلسوں میں فی صدی ۹۰ اور ۱۰ کی نسبت تجویز کرتی ہے، حالانکہ یہ بداہتہً غلط ہے۔"

اس موقع پر وہ ایک شبہ کا ازالہ کرتے ہیں کہ:۔

"ہمارے بعض فرماں رواؤں کو کبھی کبھی یہ شبہ ناشی ہوتا ہے کہ جو طلبہ ایسے نادار ہیں کہ تعلیم کی فیس بھی ادا نہیں کرسکتے، اُن کو درحقیقت اعلیٰ تعلیم

کی ضرورت بھی ہی یا ہنیں؟ یہ شبہ اُن کو زیادہ تر اس لیئے پڑتا ہی کہ وہ اس کلاسفکیشن سے اچھی طرح واقف ہنیں ہیں جو ہندوستان کی تمام شریف قوموں میں برتا جاتا ہی عام ازیں کہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔

ہمارے ملک میں دولت کے لحاظ سے کوئی کلاسفکیشن نہیں ہی دولت اور افلاس کے لحاظ سے یہاں اگر کچھ فرق برتا جاتا ہی تو وہ محض پرائیوٹ طور پر نہ کہ پبلک طور پر۔ مثلاً کسی بیاہ شادی یا دوسری کسی عام تقریب میں کسی قوم کا ایک دولتمند اور ایک مفلس شخص دونوں برابر ممبر سمجھے جاتے ہیں اور اُن کے باہم رشتہ مندیاں بھی ہوتی ہیں"۔

اس کے بعد اُنھوں نے یہ مشورہ دیا ہی کہ سررشتہ تعلیم کے ڈائرکٹروں کی مدد کے لیئے غیر سرکاری اشخاص کی ایک کمیٹی مقرر ہونا چاہیئے جو انتظامی امور کو چھوڑ کر صرف اُن معاملات میں جن کا اثر عام رعایا پر پڑتا ہی مشورہ دیا کرے، مثلاً فیس کی مقدار و نصاب تعلیم وغیرہ۔

سب کے آخر میں مذہبی تعلیم پر زور دیا ہی اور اسی سلسلہ میں مذہبی تعلیم کے متعلق اپنی اسکیم اور اُس پر گورنمنٹ کے احکام کمیشن کے سامنے پیش کیئے ہیں۔

گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی پر نکتہ چینی

تعلیم کی توسیع و اشاعت کے سلسلہ میں گورنمنٹ نے جو کچھ کیا ہی اور جس حد تک کیا ہی، نواب صاحب اُس کے معترف تھے اور جب موقع ملتا تھا اظہار شکر گزاری میں تامل ہنیں کرتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی گورنمنٹ کی غلط پالیسی پر مدلل و صحیح نکتہ چینی کرنے میں بھی اُن کو تکلف نہ تھا، ایسے موقع پر وہ نہایت دلیری سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے اور جو کچھ کہتے تھے ایک آزاد ہندوستانی کے نقطہ نظر سے کہتے تھے۔

لارڈ کرزن کے آخر عہد میں جو بے چینی ملک میں پھیلی ہوئی تھی اور خیالات میں جو ہیجان پیدا ہو رہا تھا وہ مختلف اسباب و علل سے وابستہ تھا، لیکن اکثر بلند رتبہ حکام نے اس کو مغربی تعلیم کا نتیجہ

خیال کیا، اور اس بنا پر ایک خاص پالیسی تعلیم کے متعلق اختیار کی گئی۔

۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن کی گورنمنٹ نے تعلیمی معاملات پر غور کیا جس کا نتیجہ یونیورسٹی بل کی صورت میں نمایاں ہوا، جس کا ملک پر بہت خراب اثر پڑا، پبلک نے خیال کیا کہ گورنمنٹ تعلیم کو محدود کرنا چاہتی ہے، اور چونکہ سرسید کی وفات کے بعد ہی سے مسلم یونیورسٹی کی تحریک نشوونما حاصل کر رہی تھی اس لئے مسلمانوں کو یہ بدگمانی پیدا ہوئی کہ گورنمنٹ مختص القوم یونیورسٹیوں کی مخالف ہے اس بدگمانی نے ایک گونہ مایوسی لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دی۔

یہ خیالات لوگوں کے دلوں میں موجود تھے کہ فروری ۱۹۰۹ء میں ہز آنر سر جان ہیوٹ کالج کے معائنہ کے لئے آئے تو ایک معرکۃ الآرا تقریر کی جس میں بعض ایسے خیالات ظاہر کئے جن سے مسلمانوں کو بدگمانی پیدا ہوئی، اور انھوں نے خیال کیا کہ گورنمنٹ کالج کے دائرۂ اثر کو محدود کرنا چاہتی ہے، چنانچہ بعض اسلامی اخبارات نے ہز آنر کی تقریر پر زبردست نکتہ چینی کی، اور اس کو خطرناک قرار دیا، یہی زمانہ تھا جب کہ نواب وقار الملک نے، "گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی پر عام بدگمانی" کے عنوان سے ایک پر مغز مضمون شائع کیا۔

اس مضمون میں پہلے انھوں نے وہ اسباب بیان کئے ہیں جن کی وجہ سے مشکلات پیش آتی ہیں، لیکن ان مشکلات کا حل کرنا انھوں نے نیشنل کانگرس اور مسلم لیگ کے ذمہ رکھا ہے اور ان کا یہ فرض قرار دیا ہے کہ وہ تمام معاملات پر غور کریں، جہاں لوگوں کی بدگمانی بیجا ہو، وہاں ان کے خیالات کی اصلاح کریں اور جس موقع پر گورنمنٹ کی غلطی ہو تو مناسب طریقہ سے گورنمنٹ کو بتائیں، لیکن جہاں تک اس بدگمانی کو گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی سے تعلق ہے اس کی نسبت وہ اپنا یہ فرض خیال کرتے ہیں کہ اپنے خیالات آزادی سے ظاہر کریں۔

اس تمہید کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔

> یہ داستان تو بہت پرانی ہوئی اور بار بار اس کا دہرانا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ابتدائی عملداری میں رعایا کی تعلیم کے متعلق جو پالیسی گورنمنٹ

نے اختیار کی تھی، وہ کہاں تک واجبی تھی اور آگے چل کر رعایا کو اُس سے نفع پہنچتا تھا، یا نقصان؛ لیکن بہرحال وہ ایک ایسی پالسی تھی، جو اُس زمانے میں رعایا کے خیالات کے مناسب تھی اور اسی لیئے اُس زمانے میں رعایا نے اُس پر کسی بدگمانی کا اظہار نہیں کیا اور ہر ایک پالسی اُسی وقت تک ایک عمدہ پالسی ہو کہ وہ گروہ جس کے ساتھ اُس پالسی کا برتاؤ کیا جائے، اُس کو اپنے حق میں غیر مفید نہ سمجھتا ہو؛ لیکن وہ دن اب بہت دُور جا چکے ہیں، جب کہ رعایا اپنے نیک وبد میں تمیز نہیں کرتی تھی۔ کانگرس کے قایم ہو جانے کے بعد سے جب کہ جدید تعلیم یافتوں کا ایک کثیر گروہ ملک میں موجود ہو گیا ہو، گورنمنٹ کی کارروائیوں پر بہت زیادہ عمیق نگاہیں پڑنی شروع ہو گئی ہیں۔ ایسے وقت میں گورنمنٹ سے ذراسی غلطی کا بھی سرزد ہونا بدگمانی اور ناراضامندی کی آگ مشتعل کر دینے کے لیئے کافی ہو۔ اس کی مثال میں ہم اُس غلطی کو یاد دلاتے ہیں جو لارڈ کرزن سے اُس وقت سرزد ہوئی، جب کہ حضور ممدوح نے یونیورسٹی کمیشن قایم کرنے سے پہلے شملہ میں ہندوستان کے تعلیمی مسائل پر غور کرنے کے لیئے ایک مجلس شوریٰ منعقد کی تھی۔ اس مجلس میں اگرچہ مختلف اقطاع کے تجربہ کاران صیغۂ تعلیم شملہ پر مدعو ہوئے تھے، جنھوں نے تقریباً ایک ہفتے تک نشست کی تھی اور خود حضور وایسرائے بھی اُن جلسوں میں شریک ہوئے تھے؛ لیکن ہندوستانیوں میں سے ایک ہندو، یا مسلمان بھی اُس مجلس شورائے میں شریک نہیں کیا گیا۔ یہ ایک ایسی غلطی تھی، جس سے ہندوستانیوں کی بدگمانیوں کا بھڑک اُٹھنا بالکل واجبی تھا۔ ہمارا ہی ملک، ہماری ہی تعلیم، ہمارا ہی آئندہ کا نفع اور نقصان اور پھر ہمیں سے چھپا چھپا کر کارروائیاں کرنا اور پھر اس بات کی بھی توقع رکھنا کہ ملک میں اُس کی وجہ سے بدگمانی پیدا نہ ہوگی؛

"جو کاشتن و چشمِ گندم داشتن" کے سوا اور کچھ معنی نہیں رکھتا۔ بلا شبہ اُس مجلس شوریٰ کے متعلق بعض بڑی بڑی اسپیچیں شائع ہوئیں؛ لیکن ہم کو کیا معلوم کہ اُن اسپیچوں میں اصلی کارروائیوں اور پالیسیوں کا کس قدر حصہ ظاہر کیا گیا اور کس قدر ہم سے مخفی رکھا گیا جس طرح ہمیشہ ہوتا رہا ہے کہ اول ایک پالیسی قرار دے لی جاتی ہے، اُس کے بعد ایک کمیشن قایم ہوتی ہے، پھر قانون نافذ ہوتا ہے جو قریب قریب اُسی پالیسی پر مبنی ہوتا ہے، جو کمیشن کی کارروائی سے پہلے طے ہو جاتی ہے، وہی طریقہ بالکل اس موقع پر بھی برتا گیا اور رعایا کی بدگمانی بڑھتے بڑھتے نارضامندی کی حد تک ترقی کر گئی۔ یونیورسٹیوں کے قانون کے مسودہ کا مشتہر ہونا اور پھر اُس کا پاس ہونا تھا (جس کے ذریعے سے بہت سی جدید مشکلات ملک پر عاید ہوتی تھیں) کہ اُن نارضامندیوں پر ہمیشگی کی مہر ثبت ہو گئی۔ اب اس بات کو چھپانا مناسب نہیں ہے کہ ملک میں عام خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ بنگالیوں اور مرہٹوں کی تعلیمی ترقی کے نتایج کو دیکھ کر گورنمنٹ اس فکر میں پڑ گئی ہے کہ کہیں مسلمان بھی تعلیم میں ترقی کر کے آیندہ گورنمنٹ کے لیے ویسے ہی تکلیف دہ ثابت نہ ہوں؛ اس لیے وہ مسلمانوں کی تعلیم کو بھی روکتی ہے۔ حالانکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی قلت تعداد اُن کو دُور از کار خیالات میں مبتلا ہونے سے ہمیشہ روکے گی اور کبھی اُن کو پریشان خواب نہ دیکھنے دیگی؛ کیونکہ مسلمانوں کا بقا و فنا اس ملک میں انگلش حکومت کے بقا و فنا کے ساتھ وابستہ ہے۔ لارڈ کرزن بالقابہ کو اہل ملک کی ناراضی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اُن کی پالیسی، جیسا کہ لارڈ مارلے نے بہت صحیح طور پر فرمایا، یہ تھی کہ ملک کا انتظام نہایت مستحکم اور مضبوط کر دیا جائے، جس کو دوسرے لفظوں میں ہم صاف صاف یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ اپنے نزدیک مناسب ہو، وہ کرو اور اپنی سنگینوں کو تیز اور بارود کو خشک رکھو اور ملک کی نارضامندی کو

نظرِ حقارت سے دیکھو، مگر ایک ایسے وسیع ملک میں، جہاں تعلیم ترقی کرتی جاتی ہے اور محکوموں اور حاکموں کی تعداد میں کوئی مناسبت نہیں ہے اور ایک بڑا حصّہ جنگی فوج کا خود رعایا کے گروہ میں سے ہے اور پولیس کی کل جمعیت تقریباً اسی ملک کے لوگوں سے مرکب ہے اور ناراضی ظاہر کرنے والے باشندگان ملک میں تعلیم یافتہ اشخاص کا بہت اہم جزبھی شامل ہے، نیز دریدہ دہن اخبارات اُنکی مدد پر تُلے بیٹھے ہیں، رعایا کی نفرت اور نارضامندی کو نظرِ حقارت سے دیکھنے کی پالیسی زیادہ عرصے تک قایم نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ بہت جلد گورنمنٹ کو اپنی غلطی محسوس ہوئی اور لارڈ مارلے کو سرِ دربار یہ کہنا پڑا کہ انتظام کو مضبوط رکھنے کے ساتھ رعایا کو کچھ دینا بھی چاہیئے۔ لارڈ مارلے نے جو کچھ اِس موقع پر ماقل ودل ارشاد فرمایا ہے، وہ بلاشبہ واقعات پر مبنی ہے اور وہ ایک دن ضرور ہو کر رہے گا، زمانے کی ترقی کی رفتار کو روکنا گورنمنٹ کے قابو سے باہر ہے۔ گورنمنٹ ہی کو زمانے کا ساتھ دینا ہوگا۔ کنسرویٹو خیالات اب رخصت ہو رہے ہیں اور آیندہ ہندوستان کی آب وہوا کنسرویٹو پودوں کے نشوونما کے لیئے موافق آب وہوا ثابت نہ ہوگی۔

مجھ کو اپنے مضمون کے موضوع سے اب زیادہ دور نہ جانا چاہیئے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ لارڈ کرزن بالقابہ کی کارروائیوں نے گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی کی نسبت ملک میں ایک عام بدگمانی پیدا کردی ہے اور جیسا کہ ایسی حالت میں ہمیشہ ہوا کرتا ہے، گورنمنٹ کے وہ کام بھی بدگمانی کی عینک سے دیکھے جا رہے ہیں، جو کامل غور وخوض کے بعد ملک کے حق میں کچھ مُضر نہیں بلکہ سرتاسر مفید معلوم ہوتے ہیں۔ اس کا تدارک اگر کچھ ہو سکتا ہے، تو وہ یہی ہے کہ اب گورنمنٹ اس میدان میں پھونک پھونک کر قدم رکھے۔"

خاتمہ پر لکھتے ہیں :-

" آخر میں مجھے پھر ایک بار یہ کہنا ہے کہ اگر گورنمنٹ اُن اہم ملکی مسائل کے طے کرنے کے وقت، جن کا تعلق اہل ملک سے ہو، لائق اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو شریک مشورہ کرتی رہے اور ملک کے روشن خیال تعلیم یافتہ باشندے اُن اہم مسائل پر کافی غور کر کے اپنی رائے قایم کیا کریں اور گورنمنٹ کو اپنی رائے سے مودبانہ طور پر آگاہ کیا کریں اور عوام الناس کو ہمیشہ صحیح رستے پر چلنے کی ہدایت کرتے رہیں اور غلط فہمیوں کو دور کرنے میں کوشش اور سرگرمی سے کام لیتے رہیں، تو حاکم اور محکوم کے درمیان عمدہ تعلقات قایم رہ سکتے ہیں اور طرفین میں جو بدگمانیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں، اُن کا دفعیہ ہو سکتا ہے۔"

تعلیمی بلند نظری

نواب وقار الملک کو ابتدا سے جس تعلیمی تحریک سے تعلق تھا، وہ علیگڑھ کی تعلیمی تحریک تھی اس بنا پر وہ ہمیشہ محمدن کالج کی ترقی و استحکام اور اس کی مرکزی حیثیت قایم رکھنے میں مصروف رہے، لیکن با ایں ہمہ وہ تنگ نظر نہ تھے، اُن کی یہ آرزو تھی کہ ملک میں جابجا اسلامی درس گاہیں کھلیں اور مسلمان بچے اُن میں تعلیم حاصل کریں - البتہ وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ کالج کی مرکزی اہمیت بدستور قایم رہے - لیکن بعض اصحاب ایسے بھی تھے جو کسی دوسرے صوبہ میں اسلامی کالج قایم ہونے کی تحریک کو کالج کی مرکزی حیثیت کے لئے مضر سمجھتے تھے -

چنانچہ ۱۹۰۹ء میں جب ہز آنر نے اپنی تقریر میں یہ خیال ظاہر کیا کہ علی گڑھ پوسٹ گریجویٹ تعلیم کا مرکز ہو، اور اسی نمونہ پر ملک میں دوسری تعلیم گاہیں جاری کی جائیں، تو لوگوں نے اس رائے کو خطرناک سمجھا، اخبارات نے اس پر سختی سے نکتہ چینی کی، اس موقع پر نواب صاحب نے متعدد مضامین لکھ کر لوگوں کی غلط فہمی دور کی، اور یہ بتایا کہ ہر صوبہ میں اسلامیہ کالج قایم کرنے کی ضرورت ہے -

اُنھوں نے لکھا:۔

"جو امر بہت زیادہ قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ علی گڑھ میں کھانوں کی جو میز چُنی گئی ہے اُس کی ضرورت سے دوسرے صوبوں کے گرسنہ لوگوں کو گرسنہ رکھنا کہاں تک جائز سمجھا جائیگا، ہمارا کام یہ ہونا چاہیئے کہ اُن کی قوت لایموت کا بھی خیال رکھیں اور اپنے کالج کی بھی خیر منائیں۔"

اسی سلسلہ میں آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"ان کالجوں کے قایم ہونے کے بعد اُن سے بہت سے ایسے نوجوان گریجوئٹ بنکر نکلینگے جو دوسری صورت میں نہ علی گڑھ آسکتے ہیں نہ یونیورسٹی سے ڈگری لے سکتے ہیں حالانکہ آج کل اس بات کی ضرورت ہے کہ جس تدبیر سے بھی ممکن ہو ہر ایک صوبہ میں غول کے غول مُسلمان گریجوئٹوں کے پیدا کیئے جائیں، اور اس میں اب دیر لگانے کا وقت نہیں ہے۔"

اِسی طرح ۱۹۱۱ء جب بنگال میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے قائم ہونے کی تحریک ہوئی تو بعض مُسلمانوں نے اس کو بھی شُبہ کی نظر سے دیکھا جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں:۔

"ایک دھیمی دھیمی آواز ہمارے کانوں میں یہ بھی آرہی ہے کہ ڈھاکہ یونیورسٹی سے ہماری مجوزہ مسلم یونیورسٹی کو نقصان پہنچیگا یا اُس کے فوائد کے کم ہوجانے کا اندیشہ ہے، لیکن یہ خیال بالکل صحیح نہیں، جس طرح اور گورنمنٹ کی یونیورسٹیاں ہیں ایک ڈھاکہ یونیورسٹی بھی ہوگی، اور چونکہ وہ مسلمانوں کی کثیر التعداد آبادی کے وسط میں واقع ہوگی، قدرتی طور پر اُس سے مسلمانوں کو بہت زیادہ فائدہ پہنچیگا، مسلم یونیورسٹی کو اس سے کسی نقصان کے پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہے۔"

اِس کے بعد لکھتے ہیں:۔

"اگر ہر ایک صوبہ میں ایک ایک یونیورسٹی کی جگہ چند چند یونیورسٹیاں

گورنمنٹ کی فیاضی اور مہربانی سے قایم ہو جائیں تو چشم ما روشن دلِ ما شاد "۔

اسی سلسلہ میں وہ مسلمانوں کی غلط فہمی رفع کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"جس تحریک کو علی گڑھ تحریک کہا جاتا ہے اُس سے یہ مراد نہیں ہے کہ جو کچھ بھی ہو علی گڑھ کی ہی زمین میں اور علی گڑھ کے اینٹ پتھر اور چونہ کی بنی ہوئی عمارتوں کے اندر اور علی گڑھ کی آب و ہوا میں ہو، بلکہ علی گڑھ کی تحریک میں ہر ایک وہ کام شامل ہے جو حقیقی و کامل و اکمل طور پر مسلمانوں کے حق میں مفید ہو، خواہ کسی صوبہ کے مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچتا ہو"۔

اِس کے بعد کہتے ہیں :۔

"اِس قسم کے کالجوں کا ہر ایک صوبہ میں قایم ہو جانا ہم مسلمانوں کے واسطے بہت زیادہ فائدہ بخش ہے ایک علی گڑھ کالج یا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے درد کی دوا نہیں ہو سکتی، لہٰذا تعلیمی ذرائع جس قدر زیادہ ملک میں وسعت اختیار کریں اور مسلمان اُن سے متمتع ہونے کے اسباب مہیّا کریں اُسی قدر مُسلمانوں کے حق میں مفید ہے"۔

اِس کے بعد اُنھوں نے مُسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ ہندو بنگالی ڈھاکہ یونیورسٹی کے خلاف جو ایجیٹیشن برپا کر رہے ہیں اس پر وہ غور کریں، ظاہر ہے کہ یہ ایجیٹیشن محض اس بنیاد پر تھا کہ جدید یونیورسٹی سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچیگا اور وہ تعلیم میں ترقی کرینگے



زنانہ تعلیم کی حمایت

اب سے ایک ربع صدی پہلے مسلمان لیڈروں کی نگاہ میں عورتوں کی تعلیم کو زیادہ اہمیت نہیں تھی، تمام تر کوشش مردوں کی تعلیم کے لیئے کی جاتی تھی، لیکن نواب صاحب ابتدا سے عورتوں کی تعلیم ضروری سمجھتے تھے، خود اُن کے خاندان اور برادری میں معمولی مذہبی تعلیم کا رواج تھا، اور اُنھوں نے اپنی لڑکیوں کو بھی گھر کے اندر اچھی خاصی تعلیم دلائی تھی، اُنھوں نے

اپنے مشہور انعامی رسالہ میں بھی عورتوں کی تعلیم پر بھی مفصل بحث کی تھی، حالانکہ اُس زمانہ میں حالت یہ تھی کہ کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم نے اپنی رپورٹ میں عورتوں کی تعلیم پر کوئی بحث نہیں کی۔

ابتدا میں وہ اِس کے مخالف تھے کہ لڑکیاں عام مدارس میں تعلیم حاصل کریں، چنانچہ اب سے قریب پچاس برس پہلے حیدرآباد کے ایک مشہور رسالہ میں اُنھوں نے عورتوں کی تعلیم کے متعلق جو دلچسپ اور طویل مضمون لکھا اُس میں کہتے ہیں :-

"میری یہ رائے نہیں ہے کہ عام مدارس لڑکیوں کے واسطے کھولے جائیں اور اس میں لڑکیاں روزمرہ حاضر ہو کر تعلیم پائیں انگریزی سرکار میں جو مدارس اس قسم کے جاری ہوئے ہیں ان میں شمالی مغربی اضلاع کے مدارس کی کارروائی سے جہاں کا میں رہنے والا ہوں اور جہاں نو دس برس تک میں نے انجمن تعلیم و تربیت کے ایک رکن ہونے کی حیثیت سے سرکاری سررشتہ ہائے تعلیم کو ہمیشہ نہایت غور اور احتیاط اور شوق کے ساتھ دیکھا ہے میں بخوبی واقف ہوں اِس ملک میں ان مدارس نسواں نے آنریبل سر ولیم میور صاحب اس وقت کے لفٹننٹ گورنر کے زمانہ میں بہت ترقی پائی ہر سال سررشتہ تعلیم کی رپورٹوں میں ایسے مدارس اور ان میں لڑکیوں کی تعداد ہر گزشتہ سال سے زیادہ دکھلائی گئی لیکن حقیقت میں وہ صرف ایک دھوکا تھا اور بعض ایسے لوگوں کے لگائے ہوئے سبز باغ تھے جنھوں نے ان کو حکام وقت اور خصوصاً آنریبل سر ولیم میور صاحب کی رضامندی اور عمدہ خطابوں اور خلعتوں اور جاگیر و منصب حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیا تھا۔

میری رائے ان لڑکیوں کی نسبت جن کی تعداد اس قسم کے مدارس میں بیان ہوئی ہمیشہ یہ تھی کہ وہ جھانسہ کی چڑیاں ہیں جو ابھی ہیں اور ابھی نہیں۔ چنانچہ بارہا بعض مدارس کی نسبت گورنمنٹ کے افسروں کو بھی یہ تجربہ ہو گیا

کہ جن مدارس کی نسبت بہت سی کارگزاریوں کا اظہار ہوتا تھا اور بہت سا روپیہ اُن کے خرچ کے واسطے دیا جاتا تھا جب معلوم ہوا تو ان مدارس کی شہرت خالی ڈھولوں کی آواز سے کچھ زیادہ باوقعت ثابت نہوئی لیکن ہر ایسے موقع پر ان افسروں نے ان خرابیوں کو جہاں تک ان سے ممکن ہوا چھپایا تاکہ ان کی بے بنیاد نیک نامی میں داغ نہ لگنے۔

بااین ہمہ مسلمانوں کو اس طریقہ تعلیم سے بہت کم سروکار رہا کثرت سے ایسے مدارس کی کتب اخلاد اونی درجہ اور غریب ہندؤوں کے ناموں سے رنگی گئیں! ورخدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ مسلمانوں کو اُس سے بہت کم تعلق رہا اس لئے اشراف خاندانوں کی لڑکیوں کا اپنی موجودہ حالتِ جہالت میں رہنا ان مدارس کے ذریعہ سے تعلیم و تربیت پانے سے لاکھوں کروڑوں درجے بہتر ہے۔

میں نے ان مدارس کے قبلہ گاہ یعنی اس مدرسے کی کارروائی کو بھی بہت برسوں تک نہایت افسوس کے ساتھ دیکھا ہے جہاں جوان عورتیں مدارس نسواں کی مدرسی کے واسطے تیار ہوتی ہیں اس مدرسہ دستور التعلیم میں ہندوستانی اراکین مجلس سے تو پردہ ہوتا ہے لیکن علم کے دیوتا یعنی افسران سررشتہ تعلیم خواہ وہ دیسی ہوں یا پردیسی ہندوستانی ہوں یا انگریز نوجوان ہوں یا بڈھے بلا کسی قید اور پردے کے بے تکلف داخل دفتر ہوتے ہیں۔ پھر جو جو مقدمات اس مدرسے کی کارروائی کے متعلق دائر ہوئے ان میں سے بھی بہتوں کی مفصل کیفیت مجکو معلوم ہے۔

بعض نوجوان علم کے دیوتا کچھ متہم بھی ہوئے اور بعد ثبوت کے ایک نہایت مخفی اور پولیٹیکل طور سے وہاں سے بدلے سدلے گئے اور چھوٹے سے لیکر بڑے افسر تک سب نے اِس آگ پر پانی ڈالا۔ غرض جو جو باتیں نہونی چاہئیں وہ ہوئیں۔ "نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیّاٰت اعمالنا"۔

اور اب چونکہ اس قسم کی کارروائیاں گویا میری آنکھوں کے سامنے گزر چکی ہیں تو

میری رائے اس معاملہ میں نہایت سخت ہوگئی ہے اور میں ہرگز اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ عام مدارس میں شرفا کی لڑکیوں کی تعلیم ہو میری رائے صرف اس قدر ہے کہ بھائی اپنی بہنوں کو بیٹے اپنی ماؤں کو خاوند اپنی بیبیوں کو باپ اپنی بیٹیوں کو اسی طرح قریب رشتہ دار اپنی آلِ سِن والیوں کو پڑھانے کے قابل ہو جائینگی یا اگر ضرورت معلوم ہو تو وہ استانیاں جن کے چال و چلن پر خود گھر والوں کو اطمینان ہو گھروں میں آئیں اور لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا اور سینا پرونا وغیرہ سکھائیں اور اگر پاس پاس ہوں تو اس کا بھی مضائقہ نہیں کہ چند گھروں کی لڑکیاں اپنے کسی ایک اہل خاندان اور رشتہ ناتے والے گھر میں یا ایسے گھر میں جو مثل رشتے ناتے کے ہو جمع ہوں اور وہاں پڑھیں اور سب کام جو لڑکیوں کے کرنے کے ہیں سیکھیں اور وہی مرد ان کی تعلیم کی نگرانی کریں جو خود ان کے باپ بھائی یا اور رشتہ دار اور عزیز ہوں لیکن جدا امکان میں مدرسہ قایم کرنا اور اس کی نگرانی بیگانہ مردوں کو سپرد کرنا، یہ وہ ایسی بڑی بھاری غلطیاں ہیں جن سے لوگوں کو ہمیشہ کے واسطے ایک دستور العمل کے طور پر بچنا چاہیئے۔"

امتداد زمانہ سے نواب صاحب کی رائے میں تبدیلی پیدا ہو گئی تھی، اور اب وہ محسوس کرتے تھے کہ اگر محفوظ و محتاط طریقہ پر عورتوں کی تعلیم کے لیئے قومی مدارس قائم کیئے جائیں جن کی اندرونی نگرانی اور تعلیم عورتوں کے ہاتھ میں ہو تو وہ مسلمانوں کے لیئے مفید ہونگے۔ علی گڑھ کے مدرسہ تعلیم نسواں کے (جو شیخ محمد عبد اللہ صاحب بی اے ایل ایل بی نے قایم کیا) وہ زبردست حامی تھے، تاہم وہاں کی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت میں مسلمان شرفار کے آداب اور اسلامی تعلیم و پابندی دین کے ملحوظ رکھنے پر زور دیتے رہے اس کے علاوہ انھوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی میں مسلمان لڑکیوں کے لیئے مخصوص مدارس قایم کرنے کی ضرورت پر بہت زور دیا تھا، اور اس کے علاوہ بھی جب کبھی اُن کو موقع ملا وہ تعلیم نسواں کی ضرورت کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرتے رہے۔

اسلامیہ ہائی اسکول ہوشیارپور کا سنگ بنیاد نصب کرنا

دسمبر ۱۹۰۸ء میں جب کہ امرتسر میں ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس منعقد ہونے والا تھا، ہوشیارپور کے مسلمانوں کی درخواست پر نواب صاحب نے

اسلامیہ اسکول کا سنگِ بنیاد رکھنا منظور فرمایا، چنانچہ اس ارادہ سے آپ ۲۳ دسمبر کو مع چند معزز اصحاب کے جالندھر پہونچے، جہاں نہایت شاندار طریقہ پر استقبال کیا گیا، اور ہر طرف سے پھولوں کا مینھ برسنے لگا، مجمع کی کثرت سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ سارا شہر استقبال کے لیئے اُمنڈ آیا ہی، اسٹیشن سے روانہ ہوکر قیام گاہ پہنچے، جہاں ایک باغ میں شامیانے استادہ تھے اور دعوت کا انتظام کیا گیا تھا، علاوہ دعوت کے شہر کے معزز مسلمانوں نے نواب صاحب کی خدمت میں ۵۲۵ روپیہ محسن الملک میموریل فنڈ کے لیئے پیش کیئے۔

نماز ظہر کے بعد یہ قافلہ جس میں لاہور کے ممتاز مسلمان عمائد بھی آکر شامل ہوگئے تھے گاڑیوں پر ہوشیار پور روانہ ہوا، یہاں بڑے پیمانہ پر مہمانوں کے استقبال کا انتظام کیا گیا تھا، شہر کے اندر دُور تک تمام راستہ جھنڈیوں اور خوبصورت کمانوں سے آراستہ تھا، شام کو مدرسہ اسلامیہ کا سالانہ جلسہ تھا، جہاں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے مسلمانوں کی تعلیمی ضرورت پر زبردست تقریر کی، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب نے بھی مدارس کی تعلیمی حالت، اور اس کے نقائص و اصلاح کی ضرورت پر لکچر دیا۔

دوسرے روز ۲۴ دسمبر کو نواب صاحب کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا، شہر کے تمام معزز مسلمان اور بعض یورپین حکام اس موقع پر موجود تھے، سپاسنامہ کے آخر میں اسکول کا سنگ بنیاد نصب کرنے کی درخواست کی گئی تھی اور یہ اجازت چاہی گئی تھی کہ:۔

"ہم اپنے بورڈنگ ہاؤس کو حضور والا کے نام نامی سے منسوب کرکے "وقار منزل" کے پیارے اور معزز نام سے موسوم کریں۔"

نواب صاحب نے اڈیرس کے جواب میں مسلمانان ہوشیار پور کا شکریہ ادا کیا، اسکولوں میں مذہبی تعلیم کی ضرورت پر زور دیا۔ پھر اسی سلسلہ میں فرمایا کہ:۔

"یونیورسٹی کے نئے ضوابط کی رو سے اب اسکولوں کے لیئے زیادہ روپیہ کی ضرورت ہی اور ہر ضلع میں ایسے اسلامی اسکولوں کا قایم کرنا مشکل ہی جن کا سرمایہ کافی ہو، لہٰذا سب سے بہتر طریقہ یہ ہی کہ جو مسلمان طلبہ سرکاری مدرسوں یا اور مدرسوں میں تعلیم پاتے

ہیں اُن کی بود و باش کے لئے جداگانہ بورڈنگ ہاؤس قایم کئے جائیں، اور وہیں مذہبی تعلیم اور اخلاقی تربیت کا اہتمام کیا جائے، جس کی ایک مثال الہ آباد کا محمدن بورڈنگ ہاؤس اس وقت موجود ہے"۔

اِس کے بعد آپ نے تعلیمی وظائف کی ضرورت پر زور دیا اور نہایت موثر الفاظ میں تبایا کہ شریف خاندانوں کے کیسے کیسے ہونہار بچے محض افلاس کی وجہ سے تعلیم سے محروم ہیں، آخر میں آپ نے بورڈنگ ہاؤس کا نام "وقار منزل" رکھنے میں عذر کیا اور فرمایا کہ :۔

"یہ بہت اہم معاملہ ہے اس کو سرسری طور پر جلدی میں طے نہیں کرنا چاہیئے۔

اور ہمارا تو یہ حال ہے کہ ؎

فقیرانہ آئے صدا کر چلے میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے"

لیکن آخرکار لوگوں کے اصرار سے آپ کو یہ نام منظور کرنا پڑا، اس موقع پر چند اصحاب نے بورڈنگ کی تعمیر کے لئے معقول چندہ بھی دیا اس کے بعد نواب صاحب نے بسم اللہ کہہ کر سنگ بنیاد نصب کیا، اور ہر طرف سے خوشی و مسرت کے نعرے بلند ہوئے، اس رسم سے فارغ ہو کر نواب صاحب جالندھر چھاؤنی تشریف لائے اور وہاں مسلم کلب کی دعوت چائے سے فارغ ہو کر امرتسر روانہ ہو گئے۔

۱؎ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۸ء لکھتا ہے کہ :۔

"اسی اثنار میں ایک درویش صاحب نے جن کا نام امیر علی شاہ ہے تشریف لاکر کچھ سوال کیا جواب دیا گیا کہ ہم سائل ہیں، اُن بزرگ نے پوچھا "کتنے کا سوال ہے" جواب دیا گیا "چھ لاکھ کا" اس پر وہ وہاں سے چلے گئے اور تھوڑی دیر میں آکر چھ پیسے لاکر نواب صاحب کو دیئے، جو بہت زیادہ شکریہ کے ساتھ قبول کئے گئے، خدا میں سب قدرت ہے ممکن ہے کہ وہ ان چھ پیسوں کی برکت سے چھ لاکھ روپیہ کا سامان کر دے"۔

ہم اس پر اس قدر اور اضافہ کرتے ہیں کہ خدا تعالےٰ نے ایسا ہی کیا، اور نواب صاحب کے زمانہ میں کالج کو چھ لاکھ ملا، جیسا کہ ہم پہلے کسی موقع پر لکھ چکے ہیں۔

پراونشل محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس صوبۂ بمبئی کی صدارت

اکتوبر ۱۹۰۴ء میں احمد آباد میں پراونشل کانفرنس کا جو تھا سالانہ اجلاس تھا، نواب زادہ نصر اللہ خاں بیرسٹر ایٹ لا نے جن کی کوشش سے یہ کانفرنس قایم ہوئی تھی، اجلاس کی صدارت کے لیئے نواب صاحب سے درخواست کی، اُنھوں نے عذر کیا، مگر قبول نہوا اس لیئے مجبوراً منظور کرنا پڑا، لیکن وہ صدارت کے کام کو محض اعزازی طور پر انجام دینا نہیں چاہتے تھے بلکہ اُن کا مقصد یہ تھا کہ صوبۂ بمبئی کے متعلق صحیح و مستند معلومات حاصل کر کے اور مقامی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر مناسب طریقہ سے وہاں کے مسلمانوں کی رہنمائی کر سکیں، اس بنا پر وہ اجلاس سے دو ہفتہ پہلے سفر پر روانہ ہو گئے۔ پہلے پونا گئے پھر احمد آباد آئے، اس کے بعد بمبئی، نوساری، سورت، بھڑوچ، بڑودہ اور ان کے علاوہ اور چھوٹے چھوٹے مقامات کا دورہ کیا، واقفیت حاصل کی، اور اب اُنھوں نے اپنے کو اس قابل سمجھا کہ وہ پراونشل کانفرنس کی صدارت کر سکیں۔

کانفرنس کا اجلاس ۱۵ سے ۱۰ اکتوبر تک جاری رہا، روزانہ دو وقت اجلاس ہوتا تھا، قریباً دو ہزار مسلمان اجلاس میں شریک تھے، مسلمانوں کے علاوہ ہندو، پارسی، عیسائی اور یہودی بھی آئے تھے، نواب صاحب کا خطبۂ صدارت نہایت پُر مغز تھا، اُس میں تمام تر مفید و قابل عمل تدابیر بتائی گئی تھیں، نہ تو اُس میں غیر ضروری جوش تھا نہ جذبات کی نمایش، صرف کام کی باتیں تھیں، مختصر تمہید شکریہ کے بعد اُنھوں نے صاف الفاظ میں سامعین سے کہہ دیا تھا کہ:۔

"میں کوئی عالم ہوں جو اپنے مؤثر وعظ سے جماعت کے دلوں کو ہلا دوں، اور نہ کوئی لکچرار ہوں جو اپنی فصیح و بلیغ اور جادو بھری تقریر سے دوسروں کے دلوں کو تسخیر کر دوں، نہ میں بہت بڑی بڑی اور لمبی چوڑی اُمیدیں دلانے والا آدمی ہوں البتہ اپنے ابتدائے سنِ شعور سے اس ۶۵ برس کے سن تک جہاں جہاں بھی آب و دانہ مجکو لے گیا اپنے ملک اور قوم کے تعلیمی مسائل کے ساتھ ہمیشہ مجکو دلچسپی رہی اور شاید کہ یہی رَوشنیِ طبع مجھ کو کشاں کشاں یہاں تک بھی لائی ہے"۔

اپنے خطبہ کی نوعیت کے متعلق بھی اُنھوں نے ابتدا ہی میں بتا دیا کہ:۔

بغیر اس کے کہ میں مسلمانوں کے گزشتہ عروج کے قومی کارناموں اور اُن کے زوال اور اسباب زوال بیان کر کر کہیں آپ کو سناؤں اور کہیں آپ کو رُلاؤں اور اس طرح پر مسلمہ اُمور پر جن کی نسبت بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہی آپ کا کچھ اور وقت لوں، میں آپ کی توجہ زیادہ تر اس امر کی نسبت چاہتا ہوں کہ اب واقعات کی حالت کیا ہی، اور اُس کے لحاظ سے آیندہ ہم کو کیا کرنا چاہیئے، خلاصہ یہ کہ میں ماضی کو چھوڑتا ہوں اور حال و مستقبل سے بحث کرنا کافی سمجھتا ہوں"۔

اِس کے بعد اُنھوں نے نہایت تفصیل و وضاحت کے ساتھ یہ بتایا ہی کہ کوئی تعلیمی پروگرام ایسا نہیں ہو سکتا جو قوم کے ہر طبقہ کے لیئے یکساں طور پر مفید و قابل عمل ہو کیونکہ ہر طبقہ کے اغراض و مقاصد اور ضروریات جداگانہ ہیں، اِس بنا پر اُنھوں نے ادنیٰ پیشہ وروں سے لے کر اُمرا تک قوم کے پانچ گروہ تجویز کیئے ہیں اور ہر گروہ کی مخصوص ضروریات اور طریقہ تعلیم پر بحث کی ہی، ہم بخوفِ طوالت ان تمام مباحث کو نظر انداز کرتے ہیں، البتہ اس بحث کے بعض فقرے جن سے اُن کے اندرونی خیالات کا پتہ چلتا ہی یہاں نقل کیئے جاتے ہیں، ایک موقع پر وہ یتیم بچوں کے مشنریوں کے قبضہ میں جاکر عیسائی مذہب قبول کر لینے کا تذکرہ کرنے کے بعد کہتے ہیں:۔

"تغلق کی اولاد آج دہلی میں گھاس بیچتی ہی، اور تیمور کی اولاد میں جس کے نام سے اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کو شرف و عزت حاصل ہی، خدا جانے کتنے اس حالت کو پہنچ گئے کہ ؎

بس گرسنہ خفت و کس ندانست کہ کیست
بس جاں بلب آمد کہ بر و کس نگریست

لہذا اللہ تعالیٰ نے آج ہم میں سے جس کسی کو اپنے فضل و کرم سے کچھ ثروت اور اُس کے ساتھ اولاد بھی بخشی ہی وہ ذرا اپنے کلیجہ پر ہاتھ رکھ کر غور کرے کہ آیا اس کو اس بات کا کافی اطمینان ہی کہ کل کو انقلاب زمانہ سے ہماری یا ہماری اولاد کی حالت

بھی یہی نہو جاویگی، اللہ تعالیٰ ہر ایک شخص کو اس قسم کے حوادث سے ہمیشہ محفوظ رکھے لیکن اگر ایسا کوئی اطمینان نہیں ہے تو عقل مندی اسی میں ہے کہ آج ہم اپنے ہاتھوں سے ایسا انتظام کر دیں کہ ہماری قوم کے یتیم ولا وارث بچے ایک قابل اطمینان حالت میں پرورش پا سکیں۔"

اسی سلسلہ بیان میں دیہات کے زراعت پیشہ گروہ کی تعلیم پر بحث کرنے کے بعد کہتے ہیں :-

"دیہات کی تعلیم کا منشا یہ ہونا چاہیئے کہ اُس سے ایک تعلیم یافتہ کاشتکار تعلیم یافتہ لوہار، تعلیم یافتہ بڑھئی، تعلیم یافتہ مزدور ہم پہنچے نہ یہ کہ وہ تعلیم اُن کو اُن کے آبائی پیشے سے علیحدہ کر کے ملازمت کا اُمیدوار بنادے، اور آزادی کی حالت سے نکال کر غلامی کا طوق اُن کی گردن میں ڈالے۔"

دنیوی تعلیم کے سلسلہ میں جہاں اُنھوں نے مذہبی تعلیم کی ضرورت پر مدلل بحث کی ہے آخر میں ایک ایسا قیمتی نکتہ بیان کیا جو ہر مسلمان کے لیئے قابل توجہ ہے اُن کی یہ بحث درحقیقت ایک شبہ کا جواب ہے کہ جب دوسرے مذاہب کے طلبہ کے لیئے جو عام طور پر سرکاری تعلیم گاہوں میں پڑھتے ہیں مذہبی تعلیم کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تو مسلمانوں کو خاص طور پر کیوں ضرورت ہے، وہ کہتے ہیں :-

"دوسری وجہ اس بات کی کہ مسلمان بہ نسبت اور اہل مذاہب کے کیوں مذہبی تعلیم پر زیادہ زور دیتے ہیں یہ ہے کہ مسلمانوں کو جو تعلیم رسول خدا صلّی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہوئی اُس نے عبد کا تعلق معبود سے براہِ راست قایم کر دیا اور اُس تعلق کو درست حالت میں رکھنے کے لیئے ہر ایک مسلمان کو بقدر ضرورت مذہبی احکام پر مطلع ہونا ضروریات سے ہے دو مسلمان اگر ایک ساتھ سفر کر رہے ہیں تو نماز کا وقت آجانے کی حالت میں ایک امام بن جاویگا اور دوسرا مقتدی۔ کسی مسلمان کے انتقال کر جانے پر جو مسلمان بھی اُس وقت حاضر ہونگے وہ فوراً اُس کی تجہیز و تکفین کا اہتمام کرینگے اور جنازہ کی نماز پڑھ کر اُس کو دفن کر دینگے شادی کے موقع پر کوئی

مسلمان ہی نکاح پڑھا دیگا باقی رہا قاضی صاحب کا دفتر وغیرہ یہ صرف احتیاطی کارروائی ہیں کہ اگر آئندہ اُس نکاح کے متعلق کوئی نزاع پیش آوے تو قابلِ اطمینان شہادت واقعات کی نسبت حاصل ہو سکے لیکن عقد نکاح جس سے مراد ہو وہ قاضی صاحب کا محتاج نہیں ہے اور علیٰ ہذا القیاس دوسرے تمام مراسم و ضروریات کے پیش آجانے کی صورت میں مسلمانوں کو جو اُس وقت موجود ہوں کام کرنا چاہیئے لہٰذا ہر ایک مسلمان کو ضرور ہے کہ وہ ضروری مسائل مذہبی سے واقفیت رکھتا ہو تاکہ حسبِ وقت جو ضرورت پیش آوے اُس کے مطابق وہ کام کر سکے، برخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوؤں میں ہر ایک ایسے موقع پر ایک پنڈت جی صاحب کی ضرورت ہے اور عیسائیوں میں ایک پورنڈ پادری صاحب کی کہ جن کے بدون نہ موت کا کوئی کام انجام پا سکتا ہے نہ شادی کا اور اس قسم کا عمل درآمد ہم پارسی صاحبان میں بھی دیکھتے ہیں اور دوسرے مذاہب میں بھی لہٰذا اُن مذاہب والوں کو اپنے مذہبی مسائل کی واقفیت کی ایسی ضرورت نہیں ہے جیسے کہ مسلمانوں کو ہم کو اپنے مذہبی مسائل اور مذہبی احکام سے بطور سوسائٹی کے آدابِ اخلاق کے (ایٹیکیٹ) واقف رہنا ضرور ہے اور اگر کسی ضرورت کے وقت ہم میں سے کوئی اُس سے ناواقف پایا جاوے تو اُس کے لیئے وہ ناواقفیت سوسائٹی میں ندامت کا موجب ہوتی ہے"۔

یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم کے متعلق اُن کا خیال یہ ہے کہ بجز مستثنیٰ صورتوں کے

"ہماری یونیورسٹیاں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کرتیں کہ اپنے گریجوئٹوں کے لباس میں انتظامی باربرداری کے واسطے تعلیم یافتہ قلیوں کا گروہ پیدا کریں"۔

اسی سلسلہ میں (مستثنیٰ اشخاص کو چھوڑ کر) وہ عام تعلیم یافتہ مسلمانوں کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"یونیورسٹی ہال میں ان گریجوئٹوں کی چاہے کچھ ہی عزت اور منزلت کی جاتی ہو مگر اُس کے باہر ملک میں وہ اُس سے دسواں حصہ وقعت کی نگاہ سے بھی نہیں دیکھے جاتے، اور دیکھے بھی کیونکر جائیں جب کہ اُن کی حالت یہ ہے کہ اپنی مذہبی تعلیم سے بہت

کچھ محروم، اپنی قومی تاریخ سے بہت کچھ ناواقف، اور اپنے قومی مذہبی اخلاق کا اُن میں بہت کم اثر ہے، اور جن کا کل مایۂ ناز انگریزی زبان کے وہ چند سبق ہیں جو اُنھوں نے اسکول و کالج میں پڑھے ہیں۔

اعلیٰ تعلیم سے جو تعلیم مُراد ہے وہ وہ تعلیم ہے جس سے انسان کا دماغ روشن ہو، اور تمام قوائے ظاہری و باطنی میں شگفتگی اور خیالات میں وسعت پیدا ہو اور اپنی مذہبی تعلیم اور قومی تاریخ کے اثر سے اخلاقِ حسنہ طبیعت ثانیہ بن گئے ہوں۔"

اس کے بعد تجارت پیشہ طبقہ کے لئے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

"اعلیٰ تعلیم دولت سے شامل ہو کر ٹاٹا جیسے وسیع خیال ہمدردانِ قوم و فدائیانِ ملک پیدا کرتی ہے۔ ورنہ بدون اعلیٰ تعلیم کے جس طرح اس وقت ہمارے تجار صرف گجراتی، مرہٹی، ہندی، کچھی وغیرہ حروف کی مدد سے تجارت کرتے ہیں، تو جو نفع کہ وہ اس کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں خواہ وہ ہزاروں کی تعداد میں ہو یا لاکھوں کی تعداد میں۔ اُس کی نسبت میں تو بہت ادب سے یہی کہنے کی جرأت کروں گا کہ وہ صرف ایک حق المحنت ہے۔ اِس خدمت کے صلہ میں کہ اپنے ملک کی گاڑھی کمائی کا روپیہ دوسرے ملکوں میں بھیجیں اور اُن دوسرے ملکوں سے اپنے ملک میں وہ چیزیں لادیں جو اس ملک کے واسطے کم تر مفید اور اکثر صرف فضول خرچی اور کاہلی و عیش و نشاط اور ظاہری رونق اور بہار پر فریفتہ کرنے والی ہیں، اور یہ فرق انھیں اُسی وقت محسوس ہو گا جب کہ اعلیٰ تعلیم سے ان میں روشن ضمیری

پیدا ہوگی۔"

مختلف گروہوں کی تعلیم پر بحث کرنے کے بعد وہ عورتوں کی تعلیم پر بحث کرتے ہیں، اُن کے نزدیک مقدم ترین ضرورت لایق اُستانیوں کا بہم پہونچانا ہے غیر مذہب کی اُستانیوں کو مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے لئے وہ موزوں نہیں خیال کرتے، تعلیم کے سلسلہ میں وہ عورتوں کے لئے کھانا پکانا، سینا پرونا، اور حفظ صحت کے متعلق معلومات حاصل کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اُن کا خیال ہے کہ جب ایک دفعہ تعلیم یافتہ ماؤں کا تسلط گھروں میں ہوجائے گا تو لڑکیوں کی گھریلو تعلیم میں بہت مدد ملے گی، بحث کا خاتمہ وہ ان الفاظ پر کرتے ہیں:۔

"ہر ایک شریف شخص عصمت کی حفاظت کو تعلیم سے مقدم سمجھتا ہے اور ساتھ ہی اس امر کے قبول کرنے میں بھی مجھکو کچھ عذر نہیں ہی کہ تعلیم محافظِ عصمت ہی۔ لیکن یہ نتیجہ تعلیم کی تکمیل کے بعد حاصل ہوگا، اور ہم کو آج اُس زمانہ کی بابت فکر ہے جو اس وقت سے پہلے پہلے واقعہ ہوگا۔ اور اِس لئے مسلمانوں کی یہ احتیاط کہ وہ لڑکیوں کی تعلیم میں پردہ کو مقدم رکھتے ہیں۔ نہایت واجبی ہی۔"

آخر میں انھوں نے کانفرنس کو کام کرنے کے عملی طریقے بتا کر شکریہ پر اپنی تقریر کو ختم کردیا ہی، آخری اجلاس میں اختتامی تقریر میں انھوں نے کانفرنس کی تجاویز پر معقول تبصرہ کرتے ہوئے صوبہ بمبئی کے مسلمانوں کو اُردو سیکھنے کی ترغیب دی ہی اس کے علاوہ لٹریری سوسائٹیاں قایم کرنے اور اصلاح معاشرت کے لئے سعی کرنے کا

مشورہ دیا ہے پھر مذہبی تعلیم پر خصوصیت سے زور دیا ہے، اس کے بعد سلسلۂ کلام میں
محمڈن کالج، اور **دارالعلوم ندوۃ العلما**، اور آل انڈیا **محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس**
کے مقاصد بیان کر کے مسلمانوں کو ان قومی کاموں پر توجہ کرنے کا مشورہ دے کر شکریہ
اور دعا پر اپنی تقریر کو ختم کر دیا ہے۔



علمی خدمات

از مولٰنا عبدالسلام صاحب ندوی

اُردو لٹریچر | سرسید کی مشن نے مسلمانوں کو جو فائدے پہونچائے اُن میں ایک اہم فائدہ یہ ہی کہ اُس نے ملک و قوم کے سامنے ایک ایسا لٹریچر فراہم کر دیا جس نے اُردو زبان کو اصلاحی، علمی، مذہبی، سیاسی، تمدنی غرض ہر قسم کے مطالب و مقاصد کے ظاہر کرنے کے قابل بنا دیا۔ نواب صاحب[1] مرحوم بھی اُن عناصر خمسہ (شبلی، حالی، نذیر احمد، محسن الملک) میں شامل تھے جو سرسید کی مشن کا لازمی جزو تھے اِس لئے اُنھوں نے بھی اپنے اقران و اماثل کی طرح اس لٹریچر کی اشاعت میں کافی حصہ لیا۔ اگرچہ مختلف قومی اور سیاسی خدمات نے اُن کو کسی مستقل تصنیف کی طرف متوجہ ہونے نہیں دیا تاہم اُن کے مضامین جو تہذیب الاخلاق، انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور دوسرے قومی اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں اُن کے پڑھنے سے صاف ثابت ہوتا ہی کہ اگر وہ اس میدان میں آئے ہوتے تو اُن کا پایہ بھی کسی اپنے دوسرے معاصرین سے کم نہیں ہوتا۔

تصنیفی دماغ | تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا ہر شخص جانتا ہی لیکن صرف کچھ لکھ لینے سے کوئی شخص مصنف نہیں کہا جاسکتا۔ تصنیف کے لئے ایک خاص قسم کا دماغ ہوتا ہی جو ہمیشہ اسی فکر میں مصروف رہتا ہی اور اُس کو خفیف سے خفیف اشارات سے کسی مضمون یا کسی تصنیف کا مواد مل جاتا ہی۔ جو لوگ تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے ہیں اُن کو اِس کا بارہا تجربہ ہوا ہو گا کہ کسی کتاب کے پڑھتے وقت آدمی کی نگاہ سے ایک سطر گذر جاتی ہی اور اُس سے ایک پورے مضمون کا خاکہ قایم ہو جاتا ہے لیکن اس قسم کے موتی ہر لکھنے پڑھنے والے شخص کو نہیں مل سکتے۔ ان کو صرف وہی شخص پا سکتا ہی جو تصنیفی دماغ

---

[1] نواب صاحب کی تالیف و مضامین نگاری کا زمانہ مولانا شبلی و مولانا حالی وغیرہ سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا اور ۱۸۷۰ء میں تو انھوں نے ایک ضخیم رسالہ سرسید کے سوالات کے جواب میں لکھا تھا جس پر انعام بھی ملا تھا۔ ندوی

رکھتا ہی۔ نواب صاحب مرحوم نے فطرۃً تصنیفی دماغ پایا تھا اس لئے اُنھوں نے اسی قسم کے اشارات سے بعض مضامین مُرتّب کئے ہیں۔ چنانچہ مولوی عبدالقادر صاحب دہلوی نے اپنے ترجمہ قرآن میں کُلٌّ فِی فَلَکٍ یَّسبَحُونَ کا یہ لفظی ترجمہ تحریر فرمایا تھا:۔

"ہر کوئی ایک ایک گھیرے میں پیرتے ہیں"

اور حاشیے پر یہ لکھا تھا:۔

"ستارہ ایک ایک گھیرا رکھتا ہی اُسی راہ پر تیرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ستارے آپ چلتے ہیں یہ نہیں کہ آسمانوں میں گڑے ہیں اور آسمان چلتا ہی نہیں تو پیرنا نہ فرماتے"

ان اشارات پر نواب صاحب نے ایک مستقل مضمون کی بنیاد قایم کر دی جس کی سُرخی ہی "ہیئت جدیدہ اور معجزہ قرآنی" جس میں اُنھوں نے ثابت کیا ہی کہ ہیئت جدیدہ نے ستاروں کی حرکت کے متعلق جو اُصول قایم کئے ہیں وہ بالکل قرآن مجید کے مطابق ہیں اور یہ قرآن مجید کا بہت بڑا معجزہ ہی۔

طرز تحریر عدالتوں اور سرکاری محکموں کا ایک خاص طرز تحریر ہی جو نہ صرف تصنیف و تالیف بلکہ معمولی خط و کتابت کے لئے بھی ناموزوں ہی۔ نواب صاحب نے اگرچہ اپنی عمر کا ایک کثیر حصہ سرکاری اور عدالتی کاروبار میں صرف کیا لیکن تصنیفی حیثیت سے اُن کا طرز تحریر عدالتی زبان سے بالکل غیر متاثر رہا۔ اُن کی تحریر کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں۔

(۱) سلاست و روانی اور سادگی الفاظ۔

(۲) غیر ضروری تمہید اور غیر ضروری اطناب سے احتراز۔

(۳) جامعیت و استقرار۔ یعنی مضمون کے تمام ماله و ماعلیہ اور اُس کے ہر پہلو پر بحث۔

انشاپردازی باوجود اس سادگی کے اُن کی تحریریں انشاپردازانہ جملوں، انشاپردازانہ فقروں اور انشاپردازانہ ترکیبوں سے خالی نہیں ہوتیں۔ مثلاً ایک مضمون میں جس میں یہ دکھایا ہے کہ ہندوستانی ہر کام میں گورنمنٹ کی امداد کے متوقع ہوتے ہیں گورنمنٹ کو وحدۃ الوجود سی تشبیہ

دے کر لکھتے ہیں :۔

"ہندوستان میں ہمہ اوست وہمہ ازوست کا مصداق لوگوں نے ٹھیک ٹھیک اور بلا تشبیہ گورنمنٹ کو قرار دے رکھا ہے"

اسی مضمون میں لکھتے ہیں :۔

(۱) "گورنمنٹ کوئی سونے کی کان نہیں ہے وہاں تو گِنی ہوئی بوٹیاں اور نپا شوربا ہے، روز کا کنواں کھودنا اور روز کا پانی پینا اور انھیں تلوں میں سے تیل نکالا جاتا ہے"

(۲) "اگر گورنمنٹ نے اپنی معمولی رحمدلی سے اُس وقت میں دو قطرہ آب سے اُس نیم بسمل کام کی کچھ مدد کی"

(۳) لیکن جو جان تازہ اُس وقت میں گورنمنٹ سے کسی کام کو عنایت ہوتی ہے وہ دائم المریض کے مانند بے حلاوت ہوتی ہے"

جا بجا مناسب مصرعے اور مناسب اشعار بھی اپنے مضامین میں لاتے ہیں اور اُن کو اس قدر برمحل چسپاں کرتے ہیں گویا انگوٹھی میں نگینہ جڑ دیا ہے۔ مثلاً ایک مضمون میں لکھتے ہیں :۔

"مگر الحمد للہ کہ نہ ہمارا خدا ایسا بے وقوف ہے اور نہ ہمارے شریعت غرّہ مصطفویہ ایسی مہمل شریعت ہے"

ہر چہ ہست از قامتِ ناسازیِ اندام ماست
ورنہ تشریفِ تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

ایک مضمون میں لکھتے ہیں :۔

"مسلمانوں کو ہر ایک ترقی اختیار کرتے وقت اپنے مذہبی ارکان کی طرف سے بہت ہشیار رہنا چاہیئے۔

سمجھ کے رکھیو قدم دشت خار پر مجنوں کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

جابجا فارسی ترکیبیں بھی (جو مولانا شبلی کی سب سے بڑی خصوصیت سمجھی جاتی ہے) اپنی تحریروں میں لاتے ہیں۔ مثلاً

(۱) "بعض دفعہ ایسے نامناسب لفظ اُن کی زبان اور قلم سے سرزد ہو جاتے ہیں

جن پر عام لوگ پے نہیں لے جا سکتے (پے بُرون خاص فارسی کا محاورہ ہی)

(۲) اور اس حیلہ و نیرنگ سے باہم عداوت کرا دیتا ہی۔

(۳) کسب حلال جس کی نسبت یہ کہنا چاہیئے کہ وہ ایک زمانہ میں مسلمانوں کا

خمیر تھا۔

(۴) صاحبانِ دُوَل کے دلوں میں جو اُن کے مایۂ توکل ہیں۔

(۵) جس خانہ برانداز مصلحت نے"

کہیں کہیں اُردو کے ٹھیٹھ محاورے بھی اُن کی تحریر میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً

"حقیر اور تھوڑے تھوڑے ہونے لگتے ہیں۔"

"ایک متنفس بھی ایسا نہیں دکھلائی دیتا جو خدا لگتی ہوئی کہے۔"

"خاں صاحب کا کہنا نیچے نہ ڈالئے۔"

تخیل | سرسیّد کے زمانے میں نواب محسن الملک وغیرہ نے تخیلی مضامین کی بنیاد ڈالی تھی جو تمامتر انشاپردازانہ قوّت کا مظہر ہوتے تھے۔ نواب صاحب مرحوم کے مضامین کی تمامتر بنیاد اگرچہ واقعات پر ہوتی ہی تاہم اُن کے بعض مضامین سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ اس میدان میں بھی اپنے حریفوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ ایک مضمون میں انسان کے خیالات کی ترقی کے مدارج قایم کئی ہیں اور اُن کے چھ زینے مقرر کئے ہیں چنانچہ جہاں انسان کے چھٹے زینہ پر پہونچنے کا ذکر کیا ہی وہاں خاص طور پر اپنی قوّت تخیل کا زور دکھایا ہی اور لکھا ہی۔

"اب وہ دیکھتا ہی کہ اُس نہایت ہی دلکش میدان میں جا بجا صاف اور شیریں چشمے

اور نہریں جاری ہیں۔ سبزہ نے تمام میدان پر فرش زمردیں بچھا دیا ہی۔ مختلف قسم کے پھول

اور پودے اور درخت جدا لطف دکھا رہے ہیں۔ مرغانِ خوش الحان اپنی اپنی بولیوں میں اپنے پروردگار کی یاد میں مصروف ہیں۔ وہاں اگر کوئی ناہموار مقام بھی ہے تو نہایت ہی دلچسپ دکھلائی دیتا ہی اور وسط میں ایک چشمہ کے کنارے پر نہایت خوبصورت ایک مینار ہے اور اُس پر موٹے موٹے طلائی حرفوں میں عربی خط سے یہ عبارت لکھی ہوئی ہی۔ دنیا میں خدا کی رحمت خاص اُن مسلمانوں کے واسطے ہی جو چھیوں سیڑھیاں طے کرکے یہاں تک پہونچ جائیں"۔

زورِ بیان | نواب صاحب کی تحریریں تصنّع اور آورد سے بالکل خالی ہوتی ہیں اس لئے اُن میں مصنوعی جوشش پایا نہیں جاتا۔ اُن کی تحریر کا زور صرف دلائل کی قوت میں محدود رہتا ہے تاہم جا بجا وہ ایسے فقرے بھی لکھ جاتے ہیں جن پر خاص طور پر انشا پردازانہ زور پایا جاتا ہے مثلاً ایک موقع پر غیر قوموں کی نسبت لکھتے ہیں۔

"ہم کو اپنے مذہب کی رُو سے لازم ہی کہ جہاں ہم غیر قوموں پر حاکم ہوں وہاں اپنے محکوموں کی واجبی رعایت کریں۔ اُن کی شراب کی ایسی ہی حفاظت کریں جیسے اپنے سرکہ کی اور اُن کے سؤروں کی ایسی ہی نگہداشت کریں جیسے اپنے دُنبوں کی"۔

شیریں زبانی | سرسیّد کی پارٹی مخالفین کے ہجوم میں گھری ہوئی تھی۔ یہ لوگ ہر قسم کی اصلاحات نیک نیتی سے کرنا چاہتے تھے لیکن لوگ ان میں رُکاوٹیں پیدا کرتے تھے۔ اِس لئے لازمی طور پر ان لوگوں کو غصّہ آتا تھا اور اُن کا طرزِ تحریر تیز و تند ہو جاتا تھا۔ چنانچہ سرسیّد کی تحریروں میں عام طور پر طعن و تشنیع پایا جاتا ہی۔ نواب محسن الملک بھی ظرافت آمیز لب و لہجہ میں چوٹیں کرتے جاتے ہیں۔ مولانا شبلی کی تحریریں بھی تندی سے خالی نہیں ہوتیں لیکن نواب صاحب مرحوم کی ایک خاص امتیازی خصوصیت یہ ہی کہ وہ کسی مضمون میں سخت لب و لہجہ نہیں اختیار کرتے۔ الفاظ نہایت نرم و شیریں ہوتے ہیں، مخالفین تک کا نام نہایت ادب سے لیتے ہیں اور کسی پر ہلکی سی چوٹ بھی نہیں

کرتے، اُنھوں نے "شیریں زبانی" کے عنوان سے ایک مستقل مضمون لکھا ہی اور اُس میں جو کچھ لکھّا ہی اُس کا مصداق اُن کی تحریر کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا۔

وسعتِ معلومات ان لفظی خوبیوں کے علاوہ نواب صاحب کا لٹریچر معنوی خوبیوں سے بھی لبریز ہی وہ اگرچہ وسیع المعلومات عالم نہیں تھے تاہم اُن کی تحریروں میں قرآن مجید کی آیات، احادیث کے حوالے، تاریخی واقعات، نہایت کثرت کے ساتھ اور نہایت صحت کے ساتھ پائے جاتے ہیں غیر مذہب والوں کے ساتھ محبّت اور دوستی پر اُنھوں نے جو مضمون لکھا ہی وہ تمامتر تفسیر کبیر کا خلاصہ ہی۔ غرض وہ اگرچہ عام طور پر لٹریری آدمی مشہور نہیں ہیں تاہم اُن کی جو تحریریں آج موجود ہیں اُن سے ثابت ہوتا ہی کہ اگر وہ اپنی زندگی لٹریری خدمات پر وقف کرتے تو موجودہ زمانہ کی مُصلحین اُردو میں اُن کا شمار ہوتا۔

خوش طبعی و لطیفہ سنجی یہ عنصر بھی ہمیشہ نواب صاحب کی تحریر میں رہا ہے شاید ہی کوئی تحریر اس سے خالی ہو۔

فارسی لٹریچر نواب صاحب کی تعلیم و تربیت کے زمانہ میں اگرچہ تعلیمی حیثیت سے فارسی زبان ایک زندہ زبان تھی تاہم فارسیت کی اصلی رُوح پر موت کی افسردگی طاری ہو چکی تھی۔ دفاتر میں عملی طور پر جو فارسی زبان عام طور پر رائج تھی وہ وہی کائستھوں کی فارسی تھی جس کا ذکر اب بھی کبھی گرمی محفل کیلئے کیا جاتا ہی اور جو لوگ انشا پردازانہ فارسی لکھتے تھے اُن میں ابو الفضل اور ظہوری کا اغلاق، پیچیدگی اور تصنع پایا جاتا تھا۔ خاص سادہ فارسی طرز تحریر جو تمام مطالب و مقاصد کو وضاحت کے ساتھ ادا کر دے بالکل مفقود ہو چکا تھا۔ لیکن نواب صاحب کی فطرت سلیمہ نے فارسی تحریروں میں ان دونوں سے الگ روش اختیار کی۔ اُنھوں نے قیام حیدرآباد کے زمانہ میں نہایت مطول تحریریں فارسی زبان میں لکھی ہیں اور اُن میں ہر قسم کے انتظامی معاملات پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہی لیکن ان تحریروں میں نہ کہیں اغلاق و ابہام پایا جاتا نہ کائستھوں کی طرح وہ اُردو زبان کا لفظی ترجمہ ہوتیں بلکہ ایک ایرانی جس طرح اپنے مطالب کو بلا تصنّع و تکلّف اپنے سادہ الفاظ میں بیان کر دیتا ہی اُسی طرح اُن میں ہر مطلب کو

متین و سادہ الفاظ میں بیان کر دیا ہی۔

بعض خاص خاص الفاظ اور خاص خاص ترکیبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر مفہوم کو اُن ہی الفاظ اور اُن ہی ترکیبوں سے ادا کرتے ہیں جو اہلِ زبان نے مقرر کر رکھے ہیں مثلاً اس مفہوم کو کہ دُنیا قابل کام کرنے والوں سے خالی نہیں اس طرح ادا کرتے ہیں :۔

"زمانہ ہنوز از کار آگاہان خالی نیست"

اس فقرے میں کار آگاہان ایک خاص لفظ ہی جس کو صرف وہی شخص لکھ سکتا ہی جو فارسی لٹریچر سے کامل واقفیت رکھتا ہو۔

ایک موقع پر لکھتے ہیں :۔

"بر کُنہہ آن اگر مکر رغور شود جا دارد"

"جا دارد" خاص محاورہ ہی جو اِس موقع پر نہایت سادگی سے ادا ہوا ہی۔

ایک موقع پر لکھتے ہیں :۔

"و آنکہ ایمائے رفتہ است"

ایک موقع پر لکھتے ہیں :۔

"و از دیگر اُمور عظام و انتظام ہائے سترگ باز داشتہ"

ان فقروں میں "ایماء رفتن" خاص محاورہ ہی اور "سترگ" کا لفظ ایک ایسا مخصوص لفظ ہی جس کو صرف فارسی انشا پرداز ہی لکھ سکتا ہی۔

ایک موقع پر لکھتے ہیں :۔

"آں مجلس مثل مجلس بڑدہ خندہ بیش نخواہد بود"

اگر کوئی ناواقف شخص ہوتا تو از خندہ بیش نخواہد بود لکھتا اور اس وقت یہ عبارت اُصول انشاپردازی سے گر جاتی۔

غرض نواب صاحب اپنے تمام معاصرین میں اس حیثیت سے ممتاز ہیں کہ اُنھوں نے اُردو لٹریچر کے ساتھ اپنی فارسی تحریروں کا بھی ایک ایسا بیش بہا ذخیرہ اپنی یادگار میں چھوڑا ہی جو دوسروں کے یہاں نہیں مل سکتا۔



سیاسی خدمات

اس سے پہلے کہ ہم نواب وقار الملک کی سیاسی خدمات کا تذکرہ کریں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نہایت اختصار کے ساتھ ہندوستان میں سیاسی تحریک کے آغاز اور اُس کے تدریجی ارتقا کی مختصر کیفیت بیان کر دیں جو سیاسی مسائل انگریزی عہد حکومت میں مسلمانوں کے سامنے آئے، اسلامی سلطنت کے زمانہ میں اُن کا وجود بھی نہ تھا، مسلمان بھی اگرچہ اس ملک کے اصلی باشندے نہ تھے بلکہ فاتحانہ حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے، لیکن آخر کار ہندوستان کو انھوں نے اپنا وطن بنا لیا تھا، اِس لئے اسلامی حکومت صحیح معنی میں ایک ملکی حکومت تھی، ہندو مسلمانوں کا کوئی سوال اُس زمانہ میں نہ تھا جس طرح مسلمان اپنی صلاحیت و قابلیت کے لحاظ سے اعلیٰ عہدے و منصب حاصل کرتے تھے اِسی طرح ہندو، ترقی کا دروازہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے لئے یکساں کھلا ہوا تھا اور جب تک اسلامی حکومت مضبوط و مستحکم رہی ان حالات میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہوئی۔

لیکن دولت مغلیہ کے آخری عہد حکومت میں ہندوؤں میں ایک خاص جذبہ پیدا ہو گیا تھا، جا بجا بغاوت اور سرکشی کی علامتیں نمایاں اور فتنہ و فساد کی آگ مشتعل تھی، مرہٹوں کا عروج و اقتدار روز افزوں تھا، جو انقلاب حکومت کا تہیّہ کر چکے تھے، ایک عام طوائف الملوکی تمام ملک میں پیدا ہو گئی تھی، مرکزی قوّت کمزور ہو چکی تھی، مسلمان اُمرا اور صوبہ دار ذاتی منفعت اور حصول جاہ و حکومت کے لئے مصروف کشمکش تھے، یہی زمانہ تھا جب کہ یورپ کی مختلف اقوام نے آہستہ آہستہ ہندوستان میں داخل ہو کر عجیب و غریب تدابیر سے ہندوستان کی سیاست اور ہنگامہ آرائی میں حصہ لینا شروع کیا، اور آخر کار انگریز اپنی حُسن تدبیر سے سب پر غالب آئے اور عملاً ہندوستان کے فرمانروا بن گئے اور دولت مغلیہ کا آخری تاجدار یعنی اکبر و جہانگیر کا جانشین صرف دہلی کے لال قلعہ کا

بادشاہ رہ گیا۔

یہ حالت کچھ مدّت سے قایم تھی کہ ۱۸۵۷ء کے خوفناک ہنگامہ نے تمام ہندوستان کو تہ و بالا کردیا، یوں تو اس شورش نے تمام ملک کو متزلزل کردیا تھا لیکن مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ اس انقلاب سے جو صدمہ پہونچا وہ ناقابل بیان ہے، عام تباہی و بربادی کے علاوہ جو اس انقلاب کا لازمی نتیجہ تھی، سب سے بڑی مصیبت یہ پیش آئی اس فتنہ و فساد اور بغاوت کے بانی و محرک مسلمان قرار دیئے گئے چنانچہ سرسیّد لکھتے ہیں:۔

"یہ بدبختی کا زمانہ وہ ہے جو ۱۸۵۷ء و ۱۸۵۸ء میں ہندوستان کے مسلمانوں پر گزرا کوئی آفت ایسی نہیں ہے جو اُس زمانہ میں ہوئی ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی گو وہ رام دین اور ماتا دین ہی نے کی ہو کوئی بلا آسمان پر سے نہیں چلی جس نے زمین پر پہونچنے سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈا ہو۔"

درحقیقت یہ زمانہ مسلمانوں کے لئے نہایت نازک تھا، چوں کہ موجودہ دَورِ حکومت سے پہلے مسلمان ہندوستان کے فرمانروا تھے اِس لئے قدرتاً یہ شبہ کیا جاتا تھا کہ اپنے ازدست رفتہ عروج اور حصُول حکومت کے لئے مسلمانوں کی یہ آخری ناکام کوشش تھی، غرض مسلمانوں کو اس شبہ و بدگمانی کا خمیازہ اُٹھانا پڑا اور وہ اچھی طرح پامال کئے گئے۔

اس زمانہ میں سرسیّد سے جہاں تک ہوسکا اِس بدگمانی کے دفع کرنے کی کوشش کی مثلاً ایک خاص سلسلہ رسائل کا وفادار مسلمانوں کے حالات میں شائع کیا، اور "اسباب بغاوت ہند" کے نام سے ایک معرکتہ الآراء رسالہ لکھکر بغاوت کے اصلی اسباب وعلل پر بحث کی جس سے مسلمانوں کی برأت بھی ثابت ہوتی تھی، سرسیّد کی یہ کوشش ضائع تو نہیں گئی تاہم پورا فائدہ حاصل نہیں ہوا۔

انگریزی عہد حکومت کی ابتدا میں اگرچہ مسلمانوں کی سیاسی قوّت باقی نہ تھی، لیکن جو اعلیٰ عہدے و مناصب اُس زمانہ میں ایک ہندوستانی کو مل سکتے تھے مسلمان اُس سے پورے طور پر مستفید ہوتے تھے، دفاتر میں فارسی اور اردو زبان مُروّج تھی انگریزی تعلیم نے ملک میں رواج نہیں پایا تھا،

مشرقی علوم خصوصاً فارسی مسلمانوں کی خاص چیز تھی اور اُس میں قابلیت پیدا کرنا خاص کمال سمجھا جاتا تھا، اس کے علاوہ مسلمان حکومت کے خوگر تھے، ان سب وجوہ سے بہ نسبت دوسرے لوگوں کے وہ حکومت کے عہدوں کے لئے زیادہ موزوں تھے، اس بنا پر مختلف معزز عہدوں پر مسلمان ہی مسلمان نظر آتے تھے، بعض عہدے جیسے سب ججی وغیرہ تو گویا مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہو گئے تھے اُس وقت تک گورنمنٹ کی پالیسی یہ نہ تھی کہ ہندوستان میں مغربی علوم کو رواج دیا جائے، لیکن جب لارڈ میکالے کی سعی و تحریک سے گورنمنٹ نے مغربی علوم کی تعلیم دینا منظور کیا تو سب سے پہلے بنگال کے ہندوؤں نے اس کا خیر مقدم کیا اور بنگالی ہندو تعلیم میں سب سے آگے بڑھ گئے، اِس کے بعد جیسے جیسے شمالی ہند میں حکومت کو استحکام ہوتا گیا تعلیم کا دائرہ بھی وسعت اختیار کرتا گیا، اور ہندو جدید علوم سے متمتع ہوتے رہے، لیکن مسلمان اپنی نا عاقبت اندیشی اور غفلت کی وجہ سے اِن علوم کی طرف متوجہ نہیں ہوئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تعلیم میں ہندوؤں سے اِس قدر پیچھے رہ گئے کہ اب تک اُس کی تلافی نہیں کر سکے۔

جب ملک میں ایک حد تک تعلیم پھیل گئی تو گورنمنٹ نے سرکاری ملازمت کے لئے انگریزی دانی کی شرط کر دی، اب ہندو تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے گورنمنٹ کے تمام محکموں پر حاوی ہو گئے یہاں تک کہ بنگالی ہندو اپنے صوبہ سے نکل کر رفتہ رفتہ تمام شمالی ہند میں پھیل گئے اور ہر جگہ اسٹیشنوں پر نظر آنے لگے، برخلاف اس کے مسلمان آہستہ آہستہ ہر صیغہ و ہر محکمہ سے اپنی نا قابلیت اور برادران وطن کے بے مہری کی وجہ سے خارج ہونے لگے۔

جدید تعلیم نے ہندوؤں میں حق طلبی کا ایک زبردست جذبہ پیدا کر دیا، اب اُن کی آنکھیں کھلیں اور انھوں نے محسوس کیا کہ دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کے مقابلہ میں ہم کیسی پست حالت میں ہیں، چوں کہ جدید تعلیم سے سب سے زیادہ بنگالی متمتع ہوئے تھے اِس لئے حریت و حق طلبی کے جذبات نے بھی سب سے زیادہ بنگال میں نشو و نما حاصل کیا، مہاراشٹر بھی ان جذبات

سے خالی نہ تھا۔

ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے متعلق سرکاری مدارس میں جو کتابیں مُروّج تھیں وہ یورپین مصنّفین کی تھیں، اِن کتابوں میں عموماً اسلامی عہد حکومت کا تاریک رُخ دکھایا گیا تھا، جس سے شاید یہ مقصد تھا کہ جب لوگ گزشتہ پُرآشوب زمانہ کا موجودہ دورِ امن وعافیت سے مقابلہ کریں تو انگریزی حکومت کو اپنے حق میں خدا کی رحمت سمجھیں یہ مقصد حاصل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ کتابیں پڑھ پڑھ کر ہندوؤں کو مسلمانوں سے ایک گونہ نفرت پیدا ہوگئی عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جہالت مذہبی تعصبات کو برانگیختہ کرتی ہی، لیکن یہاں معاملہ برعکس تھا، جیسے جیسے تعلیم پھیلتی گئی ہندو مسلمانوں کی باہمی منافرت بھی ترقی کرتی رہی یہاں تک کہ ہندوؤں کو ہر ایسی چیز سے نفرت ہوگئی جو اسلامی عہد حکومت کی یادگار ہو، چنانچہ اسی جذبہ نے ان کو اُردو زبان سے نفرت کرنے پر مجبور کیا، غرض تعلیم نے ایک طرف تو ان کو مسلمانوں سے متنفر کر دیا، دوسری طرف اُن میں یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ موجودہ حکومت ایک غیر ملکی حکومت ہی جو ہندوستان کے تمام قدرتی ذرائع ووسائل پر قابض ہوگئی ہی اس لئے وہ ناقابل برداشت ہی۔ لیکن ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ نے حکومت کی ہیبت دلوں پر قایم کر دی تھی اور خود ہزار سالہ غلامی نے بھی اُن کی جنگی اسپرٹ فنا کر دی تھی اس کے علاوہ ہندوؤں میں سب سے پہلے جس قوم نے جدید تعلیم حاصل کی تھی وہ سپاہیانہ اوصاف سے مُعرّیٰ تھی اس بنا پر گورنمنٹ کے خلاف کسی جارحانہ کارروائی کا تو اُن کو حوصلہ نہ تھا، لیکن زبان وقلم سے ہنگامہ آرائی کرنے میں اُن کو کچھ باک نہ تھا، چنانچہ دلوں کے خیالات لکچروں اور اخباروں کے ذریعہ سے منظر عام پر آنے لگے۔



۱۸۷۴ء میں بنگال کے مشہور اسپیکر بابو سریندر وناتھ بنرجی نے ہندوستان کے مختلف مقامات کا ایک دورہ اِس غرض سے کیا کہ تعلیم یافتہ لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ

گورنمنٹ نے جو سول سروس کے اُمیدواروں کی عمر ۲۱ سے گھٹا کر ۱۹ قرار دی ہے اس کے متعلق گورنمنٹ سے درخواست کیجائے کہ جو قاعدہ پہلے ۲۱ سال کی عمر کا تھا وہی اب دوبارہ جاری کیا جائے نیز یہ کہ تمام ہندوستانی باہمی چندہ سے ایک فنڈ بنام نیشنل فنڈ قایم کریں تاکہ ملکی اغراض کے سلسلہ میں جب ان کو گورنمنٹ ہند یا گورنمنٹ انگلستان سے کوئی مطالبہ کرنا ہو تو مصارف اس فنڈ سے ادا کئے جایا کریں۔

جب بابو سریندرو ناتھ اس دورہ کے سلسلہ میں علی گڑھ آئے تو یہاں بھی ایک جلسہ منعقد ہوا جس کے صدر سرسیّد تھے جو خود بھی اس تحریک کے حامی تھے۔

نیشنل فنڈ قایم کرنے کی تحریک گویا نیشنل کانگرس کی بنیاد تھی اور اب وہ وقت قریب آتا جاتا تھا کہ انفرادی کوششیں ایک اجتماعی صورت اختیار کریں اور ملک میں ایک ایسی پولٹیکل انجمن قایم ہو جائے جس کے پلیٹ فارم پر سیاسی مسائل پر بحث و گفتگو ہو اور گورنمنٹ سے مطالبات کئے جائیں، چنانچہ دوسرے سال ۱۸۸۵ء میں یہ انجمن، نیشنل کانگرس کے نام سے قایم ہوگئی، اور اس کا پہلا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا، جس میں قریباً ۷۰ ڈیلی گیٹ شریک تھے، اگرچہ یہ پہلی سیاسی انجمن نہیں تھی کیوں کہ نیشنل کانگرس قایم ہونے سے قریباً ۲۰ سال پہلے مئی ۱۸۶۶ء میں سرسیّد نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے نام سے ایک انجمن سیاسی اغراض اور گورنمنٹ سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے علی گڑھ میں قایم کی تھی جو کچھ زمانہ تک کام بھی کرتی رہی، لیکن اُس کے بعد تعلیمی معاملات میں سرسیّد کی مشغولیت نے ان کو ادھر توجہ کرنے کا موقع نہ دیا، اور جب وہ علی گڑھ سے بنارس تبدیل ہوئے تو اس انجمن کا خاتمہ ہوگیا، اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ نیشنل کانگرس ۱۸۸۵ء میں واحد سیاسی مجلس تھی۔

انڈین نیشنل کانگرس کے متعلق ابتدا ہی سے یہ دعوی کیا گیا تھا کہ وہ کسی خاص مذہب و ملت کی مجلس نہیں بلکہ پوری ہندوستانی قوم کی مرکزی مجلس ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُس کے پہلے اجلاس میں صرف دو مسلمان ڈیلی گیٹ شریک تھے، البتہ یہ اندیشہ کیا جاتا تھا کہ اگر اس تحریک نے ترقی

حاصل کی تو مسلمان بھی باوجود اپنی تعلیمی بسماندگی کے گرد وپیش کے حالات اور مذہبی جذبات سے مغلوب ہو کر اس میں حصہ لیں گے لیکن ابھی اس کی نوبت نہیں آئی تھی کہ سرسید نے کانگرس کے خلاف اپنی مخالفت کا اعلان کر دیا۔

سرسید کی مخالفت نے اکثر لوگوں کو متحیر کر دیا کیوں کہ اُن کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ آزاد خیالات رکھتے ہیں اس لئے جو تحریک ہندوستان کی فلاح وبہبود اور ترقی کے لئے ہو گی اُس کی حمایت کریں گے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے سرسید کی یہ مخالفت بیجا نہ تھی، مسلمان تعلیم میں پس ماندہ تھے اور عادات واطوار کے لحاظ سے تند خو ومشتعل مزاج، اس لئے سرسید کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے لئے سیاسی معاملات میں حصہ لینا ابھی قبل از وقت ہی اگر اُن میں یہ تحریکیں ابھی سے پھیل گئیں تو اس کا نتیجہ فتنہ وفساد ہو گا جس کا نقصان براہ راست صرف مسلمانوں کو پہونچے گا، چنانچہ انھوں نے اُسی زمانہ میں بدرالدین طیب جی کو جو کانگرس میں شریک تھے یہ لکھا تھا کہ

"غدر میں کیا ہوا؟ ہندوؤں نے شروع کیا، مسلمان دل چلے تھے وہ بیچ میں کود پڑے ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ وبرباد ہو گئے۔"

اِس کے علاوہ مخالفت کے اور اسباب بھی تھے جو انھوں نے اپنے لکچروں میں تفصیل سے بیان کئے ہیں، انھوں نے سب سے پہلے دسمبر ۱۸۸۷ء میں انڈین نیشنل کانگرس کے خلاف ایک پُرزور لکچر لکھنؤ میں دیا، اس وقت کانگرس کا تیسرا سالانہ اجلاس مدراس میں ہو رہا تھا، اس کے بعد دوسرا لکچر ۱۶ر مارچ ۱۸۸۸ء کو بمقام میرٹھ دیا، یہ دونوں لکچر عام طور پر شائع ہو چکے ہیں۔

ان لکچروں کے بعد اگست ۱۸۸۸ء میں سرسید نے علی گڑھ میں "پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" قایم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ جو اُمرأ وارباب وجاہت کانگرس میں شریک نہیں اُن کے خیالات ومراسلات پمفلٹ کے طور پر انگریزی میں شائع کئے جائیں اور اخبارات کے ذریعہ سے ہندوستان

وانگلستان میں مشتہر کئے جائیں ہندوستان کے اکثر سرآوردہ لوگوں نے جس میں ہندو مسلمان دونوں شریک تھے ایسوسی ایشن کی تائید کی اور جو کارروائیاں کانگرس کے خلاف ملک میں ہوئیں اور جو جلسے مخالفت میں منعقد ہوئے اُن کی کیفیت ہندوستان وانگلستان میں مشتہر کی گئی اور پارلیمنٹ کے ممبروں کو یہ باور کرایا گیا کہ ہندوستان کی اکثر قومیں اور خصوصاً مسلمان کانگرس کے ہم خیال نہیں ہیں۔

غرض اُس زمانہ میں سرسیّد کی تحریک ورہنمائی سے مسلمانوں کی پالیٹکس یہ قرار پائی کہ

(۱) مسلمان سیاست میں حصہ لینے سے قطعاً اجتناب کریں۔

(۲) کانگریس میں شریک نہ ہوں اور ہر قسم کے ایجی ٹیشن سے علیحدہ رہیں۔

(۳) گورنمنٹ کے ساتھ اتحادِ عمل رکھیں کیوں کہ ہندوستان میں اُن کی فلاح وترقی بلکہ ہستی گورنمنٹ کے وجود اوراس کے استحکام پر مبنی ہی۔

مسلمانوں کی یہ محتاط سیاست اس بنا پر تھی کہ سرسیّد کا یہ خیال تھا کہ اگر مسلمان کسی قسم کے ایجی ٹیشن میں حصہ لیں گے تو گورنمنٹ اُن سے چشم پوشی نہیں کرے گی اور اُن کا یہ خیال صحیح تھا خود گورنر مدراس نے اپنی ایک تقریر میں اس طرف اشارہ کیا تھا اور کہا تھا کہ

"عقاب چڑیوں کی چائیں چائیں کی کچھ پروا نہیں کرتا لیکن اگر باز یا جرہ اُس کے آگے چوں بھی کرتا ہی تو فوراً اُس کی گردن توڑ ڈالتا ہی"۔

سرسیّد کا یہ خیال[1] بھی تھا کہ ۱۸۵۷ء کی شورش نے ہندوستانیوں کے اعتبار کو سو برس پیچھے ہٹا دیا ہی وہ کہتے تھے کہ

"اگر یہ واقعہ ظہور میں نہ آتا تو آج ہمارے سینکڑوں جوان والنیٹر ہوتے ایکٹ اسلحہ وجود میں نہ آتا اور ہم میں بہت سے لوگ فوج کے کپتان اور کرنیل وجرنیل نظر آتے"۔

غرض سرسیّد کا خیال تھا کہ مسلمان گورنمنٹ سے بے نیاز ہو کر یا مخالفت کر کے ترقی نہیں کرسکتے

---

[1] حیات جاوید مصنفہ مولانا حالی

اس لئے وہ لازمی طور پر گورنمنٹ سے اتحادِ عمل کی ضرورت محسوس کرتے تھے لیکن اسی کے ساتھ باوجود نیشنل کانگرس کی مخالفت کے ہندوؤں سے مخالفت کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

ابتدا میں سرسید ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے، اور اُن کا پختہ خیال تھا کہ جب تک ہندو مسلمان باہم مل کر ہندوستان کی فلاح اور بہبودی کے لئے کوشش نہ کریں گے ہندوستان ترقی نہ کرے گا۔

انھوں نے اپنی تحریروں اور لیکچروں میں جابجا اتحاد کی ضرورت پر زور دیا اور اپنے طرزِ عمل سے بھی ثابت کر دیا کہ وہ ایک بے تعصب اور فراخ حوصلہ مسلمان ہیں لیکن ایک زمانہ ایسا آیا کہ وہ ہندو مسلم اتحاد سے مایوس ہو گئے۔

شمس العلماء مولانا حالی مرحوم لکھتے ہیں۔

"۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں اردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اُس کے بھاشا زبان رائج ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔

سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔"

سرسید بیان کرتے تھے کہ

اُن ہی دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شکسپیر سے جو اُس وقت بنارس میں کمشنر تھے میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سُن رہے تھے آخر انھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سُنا ہے اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں

کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے، میں نے کہا اب مجھے یقین ہو گیا ہی کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی ابھی تو بہت کم ہی آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد اُن لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہیگا وہ دیکھے گا، انھوں نے کہا اگر آپ کی پیشین گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہی میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہی مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہی"

ہندو مسلم اتحاد سے مایوس ہو جانے کے بعد اب سرسید کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو پالیٹکس سے علٰحدہ رہنے اور گورنمنٹ سے اتحاد عمل رکھنے کا مشورہ دیں، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔

اس زمانہ میں سیاست خارجیہ سے مسلمانوں کا کچھ تعلق نہ تھا، نہ خلافت کی بحث تھی، نہ مصر کی آزادی کا مسئلہ، نہ حجاز و مقامات مقدسہ کی حفاظت کا سوال تھا، نہ افغانستان یا ایران کی خودمختاری کا معاملہ، نہ موصل کا قصہ تھا نہ ریف کا ہنگامہ، پس مسلمانوں کی سیاست تمام تر ہندوستان میں محدود تھی، اور وہ صرف یہ تھی کہ مسلمان گورنمنٹ پر اعتماد کریں، اور پالیٹکس سے محترز رہیں، گورنمنٹ خود اُن کی ضروریات کا احساس رکھتی ہی۔ ع

کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند

اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں بھی کبھی کبھی ایسے معاملات پیش آتے تھے کہ گورنمنٹ سے کچھ کہنے کی ضرورت ہوتی تھی تو اس کی صورت یہ تھی کہ سرسید اور اُن کے بعض رُفقا باہم جمع ہو کر اور ایک رائے قایم کر کے گورنمنٹ سے درخواست کرتے تھے یا سوسائٹی کے اخبار میں اپنی خیالات شائع کر دیتے تھے، عام مسلمان اور علما اگرچہ سرسید کے مذہبی خیالات کی وجہ سے برگشتہ رہتے تھے لیکن سیاسی معاملات میں ان کی اصابت رائے اور طرز عمل کے اکثر لوگ معترف تھے اس لئے سرسید کی رائے مسلمانوں کی عام رائے سمجھی جاتی تھی اور گورنمنٹ بھی اسی حیثیت سے اُن کی رائے پر

توجہ کرتی تھی، یہی طریقہ ملکی معاملات اور مسلمانوں کے مطالبات کے متعلق مدت تک جاری رہا اور تمام مسلمان (باستثنائے چند) سر سید کی پیروی میں من حیث القوم کانگرس سے علیحدہ رہی۔

کچھ مدت بعد جب آہستہ آہستہ مسلمانوں میں تعلیم نے کسی قدر ترقی کی اور کانگرس کا دائرہ اقتدار وسعت اختیار کرتا گیا اور اخبارات بھی عام طور پر سیاسی مضامین لکھنے لگے تو مسلمان نوجوان بھی ان حالات سے متاثر ہوئے اور اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ مسلمانوں کو بھی ملکی سیاست میں حصّہ لینا چاہیئے۔ سر سید اور اُن کے ہندوستانی اور یورپین رفقانے بھی اس حالت کو محسوس کیا، چنانچہ ۳۰ دسمبر ۱۸۹۳ء کو ان معاملات پر غور کرنے کے لئے سر سید کے مکان پر ایک مختصر جلسہ[1] منعقد ہوا، جس میں مسٹر بک پرنسپل بھی شریک تھے، بلکہ اُنھیں کی شخصیت سب سے زیادہ نمایاں تھی، جلسہ کا آغاز بھی مسٹر بک کے ایڈرس سے ہوا، انھوں نے اپنی طویل تقریر میں چار طریقے کارروائی کے بیان کئے جن کو مُسلمان اختیار کر سکتے ہیں، یعنی

(۱) ہندوؤں کے ایجی ٹیشن میں شریک ہونا۔

(۲) ہندوؤں کے مخالف ایجی ٹیشن کرنا۔

(۳) کچھ نہ کرنا بلکہ اپنی کوششوں کو صرف تعلیم کی جانب مصروف رکھنا۔

(۴) پولٹیکل مستعدی کا ایک ترمیم شدہ طریقہ اختیار کرنا، یعنی نہ تو بالکل خاموش رہنا نہ ایجی ٹیشن کرنا۔

مسٹر بک نے ان میں سے ہر طریقہ پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد مسلمانوں کو آخر الذکر طریقہ اختیار کرنے کی رائے دی، اور یہ رائے بھی انھوں نے اس مجبوری سے دی کہ اُن کے خیال میں اب یہ ناممکن ہو گیا تھا کہ مسلمان نوجوانوں کو پالیٹکس میں حصّہ لینے سے باز رکھا جائے کیوں کہ

"جس حالت میں کہ اخبار نویس صدہا پولٹیکل آرٹکل لکھ رہے ہیں، تو ممکن ہے کہ ہمارے

---

[1] سر سید کے علاوہ اس جلسہ میں نواب محسن الملک، مسٹر سید محمد محمود، خان بہادر برکت علی خاں، خان بہادر مولوی فرید الدین، خان بہادر مولوی زین العابدین، خان بہادر مرزا عابد علی بیگ، خان بہادر شمس العلماء مولوی ذکار اللہ، خان بہادر شیخ الٰہی بخش، اور حاجی محمد اسمٰعیل خاں وغیرہ بھی شریک تھے ۱۲ ندوی

نوجوان تعلیم یافتہ مسلمان اُن تجاویز کی تائید یا مخالفت کے واسطے جو تجویز کی گئی ہیں سیلاب میں پھنس جائیں، وہ خاموش بیٹھے رہنے اور اس پولیٹیکل جوش میں کسی توجہ کے ظاہر کرنے سے باز نہیں رہیں گے، میں خیال کرتا ہوں کہ اُن کو بغیر رہنمائی کے چھوڑنا غلطی ہے اور ہندوستان کے پولیٹیکل معاملات میں مسلمانوں کی شرکت صرف ایک چند روزہ معاملہ ہے، اور اندیشہ یہ ہے کہ اگر قوم کے سرگروہ خاموش رہیں گے تو جو شخص اُن میں زیادہ تر ناواقف ہیں وہ نہایت بیجا طریقہ کارروائی کا اختیار کریں گے۔"

ایسوسی ایشن کا قیام | اسی تقریر میں انھوں نے تفصیل کے ساتھ کام کرنے کا طریقہ بھی بتایا، تقریر کے خاتمہ پر مباحثہ و گفتگو کے بعد سر سیّد کی تحریک اور نواب محسن الملک کی تائید سے یہ رزولیوشن پاس ہوا کہ

"ایک ایسوسی ایشن محمڈن اینگلو اورنیٹل ڈفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا کے نام سے قایم کیجائے۔"

یہ انجمن قایم تو ہوگئی لیکن کچھ کام نہ کر سکی، سر سیّد کی توجہ تمام تر تعلیمی اُمور پر تھی اور انحطاط عمر کا زمانہ تھا، اور کوئی کام کرنے والا نہ تھا، اس لئے یہ کوشش بھی بے نیتجہ رہی۔

سر سیّد کی وفات کے بعد اس صوبہ میں اردو ہندی کا جھگڑا پیش آیا، اور ہندوؤں کی کوشش سے عدالتوں میں اُردو زبان رائج ہوگئی، اس واقعہ کا مسلمانوں کے دل پر نہایت گہرا اثر پڑا، وہ محسوس کرنے لگے کہ پولیٹیکل معاملات سے علٰحدگی اور خاموشی اب موت کے مرادف ہے نوجوانوں میں یہ جذبہ دیکھکر علی گڑھ کے ارباب حل وعقد از سرِنو اس طرف متوجہ ہوئے، یہ نواب محسن الملک کا زمانہ تھا۔

مسٹر ماریسن کی تجویز | اس موقع پر مسٹر ماریسن نے جو اُب کالج کے پرنسپل تھے مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کا منصب اختیار کیا، اور ایک طویل الذیل مضمون لکھکر یہ بتایا کہ مسلمانوں کو اپنے پولیٹیکل حقوق کی حفاظت کے لئے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے، انھوں نے کسی ایسوسی ایشن کے قیام کو ناممکن العمل اور فضول

بتایا، البتہ ایک مختصر سی کونسل قایم کرنے کی رائے دی جس کا سکرٹری ایک تنخواہ دار شخص ہو اور جو لوگ سیاسی معاملات سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ کبھی کبھی باہم جمع ہو کر بحث و گفتگو کیا کریں، کونسل کا ایک ریڈنگ روم ہو اور اس کے پولٹیکل خیالات رسالوں کے ذریعہ سے نیز اخبار آبزرور اور البشیر کے ذریعہ سے باداے معاوضہ شایع کئے جائیں، مسٹر ماریسن کا اندازہ تھا کہ اگر مسلمان پانسو روپیہ ماہوار کا بندوبست کر سکیں تو یہ کام بخوبی چل سکے گا، مگر اُن کو شُبہ تھا کہ مسلمان اس قدر روپیہ کا انتظام نہ کر سکیں گے۔

نواب محسن الملک کی رائے | مسٹر ماریسن کے علاوہ نواب محسن الملک نے بھی متعدد مضامین لکھکر مسلمانوں کو کانگرس کی شرکت اور ایجی ٹیشن کے نتایج سے ڈرایا اور یہ رائے دی کہ مخصوص اصحاب کی جو ایسوسی ایشن ۱۸۹۳ء میں سرسید نے قایم کی تھی اُسی کو زندہ کیا جائے اُن کا خیال تھا کہ

"اگر بجائے اس کے مسلمان عام ایجی ٹیشن کا خیال کریں گے اور نیشنل کانگرس میں شریک ہونے یا اپنی جُداگانہ کانگرس قایم کرنے سے اپنے پولیٹکل حقوق کی حفاظت چاہیں گے تو وہ اپنے ہاتھ سے اپنے آپ کو برباد کریں گے اور آیندہ سخت نقصان اُٹھائیں گے اور کبھی کامیابی کی صورت نہ دیکھیں گے۔"

ایک دوسرے مضمون میں ایجی ٹیشن کے خطرات پر متنبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں

"ایجی ٹیشن پھیلانا ہنسی کھیل نہیں ہی اُس کا شروع کر دینا آسان ہی مگر نباہنا اور سنبھالنا مشکل ہی، جو لوگ ایسا ارادہ کرتے ہیں اُن کو چاہیئے کہ زمانہ کی حالت اپنی قوم کی حالت، ملک کی حالت، خود اپنی حالت کا خوب صحیح اور ٹھیک اندازہ کرلیں تب اس سانپ کی بانبی میں ہاتھ ڈالیں، ایسا نہ ہو کہ ع عشق آساں نمود اوّل ولے اُفتاد مشکلہا، کا مقولہ صادق آئے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔"

اِن بیانات سے ناظرین نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ اُس زمانہ میں مسلمان لیڈروں کا سیاسی نصب العین کیا تھا، اور وہ مسلمانوں کو کس راستہ پر چلانا چاہتے تھے۔

نواب وقار الملک بھی سر سید کے حلقہ کے ایک رکن تھے، اس لئے اُن کے پولیٹکل خیالات بھی قریباً وہی تھے جو سر سید اور اُن کے دوسرے رُفقاء کے تھے، لیکن ابتدا میں سرکاری ملازمت اور اُس کے بعد حیدر آباد چلے جانے کی وجہ سے اُن کو عملی طور پر سیاست میں حصہ لینے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا، البتہ سر سید اپنی شخصی حیثیت میں جب کبھی ضرورت پیش آتی تھی پولیٹکل امور میں مداخلت کرتے رہتے تھے، ۱۸۶۶ء میں سر سید نے جو برٹش انڈین ایسوسی ایشن قایم کی تھی مولوی مشتاق حسین بھی اُس میں شریک تھے لیکن نہ تو ان کو اس زمانہ میں کام کرنے کا موقع ملا نہ ایسوسی ایشن ایک سال سے زیادہ چل سکی۔

حیدر آباد میں نواب وقار الملک کو جس پالیٹکس میں حصہ لینا پڑا وہ وہاں کی مقامی پالیٹکس تھی، البتہ اس زمانہ میں صرف ایک دفعہ ۱۸۸۸ء میں جب کہ وہ کسی ضرورت سے بمبئی آئے ہوئے تھے، ایک مختصر سا مضمون ٹائمز آف انڈیا میں لکھا، جس میں علاوہ اور باتوں کے مسلمانوں کو کانگرس سے باز رہنے کی ہدایت کی تھی، ٹھیک یہی زمانہ تھا جب کہ سر سید شمالی ہند میں کانگرس کے برخلاف تبلیغ و اشاعت میں مصروف تھے۔

اردو ہندی کا جھگڑا حیدر آباد سے واپس آنے کے بعد وہ خانگی مشکلات میں مبتلا ہو گئے، اس کے علاوہ اسکولوں میں مذہبی تعلیم کے رائج کرنے اور اپنی برادری میں اصلاح رسوم پر اُن کی توجہ رہی اور کالج کے معاملات میں سر سید سے اختلاف کی نوبت آئی اور چوں کہ سر سید جو سالار قافلہ تھے ابھی زندہ تھے اس لئے وہ اُن سے علیحدہ ہو کر اور کوئی مستقل جماعت بنا کر پولیٹکل کام کرنا نہیں چاہتے تھے، سر سید کی وفات کے بعد کالج میں مسلسل طور پر جو واقعات پیش آئے اُن کو اُس میں مبتلا ہونا پڑا، یہاں تک کہ سنہ ۱۹۰۰ء میں اُردو ہندی کا جھگڑا اس صوبہ میں شروع ہوا، اور اس صوبہ کی گورنمنٹ نے عدالتوں میں ہندی زبان رائج کرنے کا حکم جاری کر دیا تو مسلمانوں میں ایک عام بے چینی پھیل گئی اور علی گڑھ میں بھی اس کا خاص اثر محسوس ہوا، نواب وقار الملک اور محسن الملک بھی اس واقعہ سے بے حد متاثر ہوئے، قطع نظر معاملہ کی اہمیت کے سر سید کے جانشین

ہونے کی حیثیت سے بھی اُن کا یہ فرض تھا کہ وہ اُردو کی حمایت کریں کیوں کہ ایک دفعہ جب سرسید کے زمانہ میں یہ فتنہ برپا ہوا تھا تو انھوں نے اُردو کی پرزور حمایت کی تھی، وہ دیوناگری) حروف کے رواج کو یہاں تک خطرناک سمجھتے تھے کہ انھوں نے صاف کہدیا تھا کہ

"درحقیقت جس قدر نقصان کہ مسلمانوں کو ہونا ممکن ہے وہ ہوگا کہ اُس سے بڑھ کر بجز دین سے محروم کردینے کے نقصان کے اور کوئی نقصان نہیں ہوسکتا"

غرض سب سے پہلی مئی ۱۹۰۰ء میں علی گڑھ میں گورنمنٹ کے اِس رزولیوشن کے خلاف جلسہ ہوا جس میں نواب وقار الملک نے پورا حصہ لیا، اس کے بعد ۱۸-۱۹ اگست ۱۹۰۰ء کو لکھنؤ کے قیصر باغ میں ایک شاندار جلسہ منعقد ہوا جو درحقیقت تمام مسلمانوں کا جلسہ تھا اس جلسہ کے صدر نواب محسن الملک تھے نواب وقار الملک بھی اس جلسہ میں شریک ہوئے اور ایک زبردست تقریر کی جس میں صراحت کے ساتھ مثالیں دیکر بیان کیا کہ دیوناگری حروف کے رواج دینے کے لئے برادرانِ وطن کیسی سازشیں اور ناپاک تدبیریں کر رہے ہیں، انھوں نے لوگوں کو حوصلہ دلایا کہ وہ استقلال کے ساتھ اپنی کوشش اس رزولیوشن کی تنسیخ کے متعلق جاری رکھیں، اور تقریر کے خاتمہ پر کہا

"مجھکو اُمید ہے کہ ہماری کوششوں سے ملک کو اُس دن کے دیکھنے کا موقع نہ ملے گا، جب کہ اُردو کا جنازہ سرکاری دفتروں سے اُٹھایا جاتا ہو"

نواب وقار الملک کی سیاسی زندگی کا آغاز

یہ جلسہ درحقیقت نواب وقار الملک کی سیاسی زندگی کا باقاعدہ آغاز تھا، اس جلسہ کے بعد انھوں نے اور دوسرے مسلمان لیڈروں نے یہ محسوس کیا کہ اب خاموشی کا وقت نہیں ہے اگر مسلمان آیندہ بھی یہ طریقہ جاری رکھیں گے تو اُن کو روز بد دیکھنا نصیب ہوگا، اس واقعہ کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ بقول البشیر

"مسلمانوں میں جو لوگ ہر قسم کی پولیٹکل کارروائیوں سے اجتناب کرنا اور صرف گورنمنٹ کی معدلت گستری اور مہربانی پر بھروسہ کرنے کی پالیسی کے حامی اور ساعی تھے خود ان ہی لوگوں میں گورنمنٹ ممالک متحدہ کی کارروائیوں سے

یہ خیال پیدا ہوا کہ جب تک مسلمانوں کی پولٹیکل ایسوسی ایشن نہ ہوگی، مسلمانوں کو نقصان پہونچے گا۔"

غرض تمام اسلامی اخبارات میں یہی بحث چھڑ گئی بکثرت مضامین اس موضوع پر شائع ہوئے، جن میں نواب محسن الملک، نواب فتح نواز جنگ، اور مسٹر ماریسن کے مضامین خاص طور پر قابل ذکر ہیں اسلامی اخبارات میں سب سے زیادہ البشیر نے اس موضوع پر مضامین شائع کئے۔

پولٹیکل ایسوسی ایشن کا آغاز ان مباحث و مضامین کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان امور پر غور کرنے کے لئے سر آوردہ مسلمانوں کا ایک جلسہ ۲۱ و ۲۲ راکتوبر ۱۹۰۱ء کو مسٹر حامد علی خاں بیرسٹر کی کوٹھی پر لکھنؤ میں منعقد ہوا، نواب وقار الملک کی تحریک سے سیّد محمد شرف الدین صاحب بیرسٹر ایٹ لا اس جلسہ کے صدر قرار پائے، صدر نے نواب صاحب سے خواہش کی کہ وہ جلسہ کے اغراض و مقاصد بیان کریں نواب صاحب نے اپنی طویل تقریر میں اس بات کو ظاہر کرنے کے بعد کہ تمام ہندوستان میں کچھ عرصہ سے مسلمانوں کا درجہ کس طرح روز بروز تنزل کرتا جاتا ہے، اور خاص خاص صوبوں میں بھی اُن کے پولٹیکل حقوق پر حملہ ہو رہا ہے، اور اردو ناگری کے مسئلہ اور سرکاری عہدوں پر مسلمانوں کی قلّت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی بیان کیا کہ مسلمان وائسرائے کی قانونی کونسل اور صوبہ کی کونسلوں میں اپنے انتخاب سے ممبر نہیں بھیج سکتے، پھر اسی طرح اور قابل توجّہ مسائل بیان کرکے اپنی اسکیم بیان کی۔

(یہ اسکیم بعد کسی قدر ترمیم کے دوسرے روز کے اجلاس میں بصورت رزولیوشن پیش ہوئی)

نواب صاحب کی اسکیم پر ۱۲ بجے دوپہر تک مباحثہ جاری رہا اور اس کے بعد سہ پہر کو بھی ساڑھے پانچ بجے تک اس مسئلہ پر لوگ تقریریں کرتے رہے، دوسرے روز پھر ۹ بجے صبح کے نواب وقار الملک کے زیر صدارت جلسہ منعقد ہوا، آج کے اجلاس میں قطع نظر اُن تجاویز کے جو مباحثہ و اختلاف کے بعد مسترد ہو گئیں، حسب ذیل تجاویز منظور ہوئیں۔

تجویز نمبر ا "اس جلسہ کی یہ رائے ہے کہ مسلمانان ہندوستان کو ایک ایسی آرگنیزیشن (یعنی کمیٹی)

قایم کرنی چاہیے جو اپنے سوشل اور پولیٹکل معاملات اور ضروریات میں متفقہ طور پر
کارروائی کر سکے۔"

اِس کے بعد نواب وقار الملک نے اپنی پوری اسکیم رزولیوشن کی صورت میں پیش کی اور کہا کہ کل جو اسکیم میں نے جلسہ کے شروع میں پیش کی تھی، اس کے بعد جو تقریریں جلسہ میں ہوئیں اُن سے متاثر ہو کر میں نے متعدد مقامات پر اسکیم میں ترمیم کر دی ہے۔

محمد صدیق صاحب بیرسٹر نے اسکیم کو سُن کر کہا کہ جس صورت میں کہ اسکیم پیش کی گئی تھی وہ ایک طولانی رزولیوشن کی سی صورت ہے اس پر کسی ترمیم کا پیش کرنا بہت دشوار ہے اسکیم کا ہر ایک پارہ جُدا جُدا پیش ہونا چاہیے تاکہ اس پر کافی طور پر غور ہو سکے۔

نواب وقار الملک نے فرمایا کہ جب کوئی اسکیم پیش ہوگی تو یہ ضروری ہے کہ پہلے اس کو من اولہ الی آخرہ جلسہ کے سامنے پیش کر دیا جائے، جو اسکیم کل میں نے پیش کی تھی تبادلۂ خیالات کے بعد اُس میں جابجا ترمیم کر دی ہے، اب میں اُس کا ہر پارہ علیحدہ علیحدہ تجویز (رزولیوشن) کی صورت میں پیش کرتا ہوں۔

اِس گفتگو کے بعد انھوں نے حسب ذیل تجاویز پیش کیں۔

تجویز نمبر ۲۔ اس جلسہ کی رائے ہے کہ اس آرگنیزیشن یعنی کمیٹی کا ایک مقصد یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی تقریبات وغیرہ میں مصارف بے جا روکنے اور تہذیب اخلاق اور دیگر امور معاشرت قابلِ اصلاح کی درستی میں کوشش کرے۔

تجویز نمبر ۳۔ اِس جلسہ کی رائے ہے کہ اس کمیٹی کا ایک مقصد یہ ہوگا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اس عقیدہ کو ذہن نشین کیا جائے کہ اُن کی سود و بہبود صرف اس پر منحصر ہے کہ ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کو دوام و استحکام حاصل رہے۔

تجویز نمبر ۴۔ اِس جلسہ کی رائے ہے کہ کمیٹی کا ایک مقصد یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی ضروریات کو اعتدال اور ادب کے ساتھ گورنمنٹ میں پیش کرے اور اس بات کی کوشش کرے کہ گورنمنٹ کا جو اصل منشا

کسی حکم سے ہو اس کے سمجھنے میں مسلمان پبلک کو کوئی غلط فہمی واقع نہ ہو۔

تجویز نمبر۵ - اس جلسہ کی رائے ہے کہ مقاصد متذکرہ بالا کو محفوظ رکھکر کمیٹی کو دوسرے قوموں کی نسبت معاندانہ برتاؤ سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

تجویز نمبر۶ - اس جلسہ کی رائے ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس میں چوں کہ دو بہت بڑے اصول ایک اُس کا مطالبہ ریپریزنیٹو گورنمنٹ کا اور دوسرا گورنمنٹ کے عہدوں پر اُمیدواروں کا تقرر امتحان مقابلہ کے ذریعہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں بداہتہً مضر ہیں اور اس کے علاوہ کانگرس میں بعض اوقات اور بھی ایسے رزولیوشن پیش ہوتے ہیں جن پر اگر عملدرآمد ہو تو ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کے قیام واستحکام میں یقیناً اس سے ضعف پیدا ہونے کا خطرہ ہوگا، جس سے مسلمان اتفاق نہیں کر سکتے، اور کانگرس میں مجاریٹی ایسے رزولیوشنوں کی تائید میں ہمیشہ موجود ہوتی ہے اور موجود ہوتی رہے گی، لہذا مسلمانوں کا انڈین نیشنل کانگرس کی شرکت سے اجتناب کرنا ایک ضروری امر ہے۔

نواب صاحب کی یہ سب تجاویز اجلاس میں پاس ہوئیں، اس کے بعد نواب صاحب نے فرمایا کہ

> "میری باقی اسکیم میں جو جلسہ میں پیش ہو چکی ہے، صرف یہ ہے کہ کس طرح اضلاع سے ریپریزنیٹو ممبر منتخب ہوں گے اور اُن ممبروں سے ایک حصہ صوبہ کی کمیٹی کے لئے نامزد کیا جائے گا، اور ہر صوبہ کی کمیٹی و سنٹرل کمیٹی میں کونسل ہائے کارپرداز مقرر کیے جائیں گے، اور کمیٹیوں کی کارروائی کے لئے قواعد بنائے جائیں گے اور بقدر ضرورت فنڈ مہیا کیا جائے گا۔"

یہ سن کر اجلاس نے حسب ذیل تجویز منظور کی۔

تجویز نمبر۷ - یہ جلسہ اس کو منظور کرتا ہے کہ اس اسکیم کے لحاظ سے جو نواب وقار الملک نے پیش کی ہے محمد حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا اور منشی احتشام علی صاحب اور نواب وقار الملک بہادر ایک عام جلسہ ریپریزنیٹو ممبروں کا آیندہ کسی مناسب وقت پر جمع کریں اور ہر سہ ممبران کمیٹی جس طرح مناسب

سمجھیں اس کے واسطے کارروائی کریں، اور مقاصد مذکورۂ بالا کے واسطے چندہ محمدؐ حامد علی خاں صاحب کے نام آنا چاہیئے اور بنگال بنک لکھنؤ اس کا خزانچی قرار پاوے۔

اور یہ کل کارروائی جس قدر کہ اوپر کے رزولیوشن میں بیان ہوئی ہے اس وقت تک نافذ رہی گی جب تک کہ صوبہ کی کمیٹی کا ریپرزنٹیٹو جلسہ آکر اپنا کام شروع کرے، جس کے بعد اُس جلسہ کو اختیار ہوگا کہ اپنے لیئے جس قسم کے قواعد چاہے بناوے، اور بالفعل نواب وقار الملک کی اسکیم کے حسب ذیل آخری حصہ کے بموجب ریپرزنٹیٹو ممبروں کے انتخاب کی کارروائی ہوگی۔

(الف) ہر ایک ضلع میں عام اشتہار کے ذریعہ سے ایک جلسہ منعقد ہونا، جس میں عام طور پر مسلمان پبلک کو شریک ہونے کا موقع دیا جاوے اور اشتہار میں بتا دینا چاہیئے کہ مسلمانان ضلع کی سوشل اصلاح اور پولیٹکل حقوق کی حفاظت کی غرض سے جلسہ میں ریپرزنٹیٹو ممبر منتخب کیئے جاویں گے اور جلسہ میں مجارٹی سے ممبروں کا انتخاب کیا جاوے جن کی تعداد کم از کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ بارہ ہوگی ان ممبروں سے ضلع کمیٹی بنائی جاوے گی جس کا ہیڈکوارٹر ہوگا ضلع کا ہیڈکوارٹر اور جائز ہوگا کہ ایک ضلع میں ایسی چند کمیٹیاں جداگانہ انتخاب کے ذریعہ سے قایم ہوں، شرائط انتخاب یہ ہوں گی کہ منتخب شدہ ممبر تعلیم یافتہ مسلمان ہو اور کم از کم ۵۰۰ روپیہ سالانہ کی آمدنی رکھتا ہو اور یہ کہ وہ سرکاری ملازم نہ ہو۔

ممبران کمیٹی ہائے اضلاع مجاز ہوں گے کہ اور جس کو چاہیں اپنے ضلع کی ریپرزنٹیٹو کے طور پر تعداد مذکورہ کی حد تک شامل کر لیویں۔

(ب) ہر ایک صوبہ میں ایک لوکل کمیٹی قایم کی جاوے گی جس کے واسطے ہر ایک کمیٹی ضلع اپنے میں سے کم از کم ایک اور زیادہ سے زیادہ پانچ ممبر نامزد کرے گی اور اُن کے علاوہ اس شہر سے جو لوکل کمیٹی کا ہیڈکوارٹر ہو۔ اس طریقہ انتخاب سے جس کا ذکر ضمن الف میں ہوا ہے، پبلک رائے سے ریپرزنٹیٹو ممبر منتخب کیئے جاسکیں گے جن کی تعداد کا معین کرنا صوبہ کی لوکل کمیٹی پر منحصر ہوگا، ممالک مغربی شمالی و اودھ کے متحدہ صوبہ کے لیئے ایک ہی لوکل کمیٹی ہوگی اور اُس کا ہیڈکوارٹر لکھنؤ میں ہوگا۔ اور آیندہ

حسب اقتضائے رائے کمیٹی صوبہ وہ مقام تبدیل بھی ہو سکے گا۔ صوبہ کی کمیٹی میں ایک کونسل کارپرداز مقرر کی جاوے گی، اور لوکل کمیٹی اضلاع کی کمیٹیوں کے لئے اور اپنی کارروائی کے واسطے بمشورہ سنٹرل کمیٹی قواعد بنادے گی۔

(ج) صوبہ کی کمیٹی اپنے میں سے کم از کم ایک چہارم اور زیادہ سے زیادہ ایک نصف ممبروں کو صوبہ کے ریپریزینیٹو کے طور پر سنٹرل کمیٹی میں شامل کرنے کے لئے نامزد کرے گی، مختلف صوبوں کے نامزد شدہ ممبروں سے سنٹرل کمیٹی بنے گی، اور وہ سہولت کارروائی کی غرض سے اپنے ممبروں میں سے ایک کونسل کارپرداز اپنے ماتحت قایم کرے گی، اور اپنی کارروائی کے لیے قواعد بناوے گی، اور قوم کے جن مطالب و مقاصد کو وہ گورنمنٹ کے سامنے پیش کرنا مناسب سمجھے اس طرح پر اُن مطالب و مقاصد کو گورنمنٹ کے سامنے پیش کرے گی۔

جب تک کہ اور صوبوں کی طرف سے سنٹرل کمیٹی کے لئے ممبر نامزد ہوں اور روپیہ کی مدد حاصل ہو اس وقت تک صوبجات متحدہ کی لوکل کمیٹی جہاں تک کہ اس سے ہو سکے گا سنٹرل کمیٹی کے بھی فرائض کو انجام دے گی اور اس کا ہیڈ کوارٹر لکھنؤ میں رہیگا۔

ہر ایک صوبہ کی کمیٹی کو بحسب ضرورت چندہ وغیرہ کے ذریعہ سے فنڈ فراہم کرنا ہوگا جس میں سے بقدر گنجایش ایک مناسب حصہ سنٹرل کمیٹی کو بھی دیا جایا کرے گا۔

اس کے بعد پریسیڈنٹ صاحب نے کہا کہ سب سے اہم کام یہ باقی ہے کہ کارروائی کے لئے کچھ چندہ اسی وقت ہونا چاہیئے، چنانچہ فہرست چندہ کھولی گئی اور اُسی وقت صما ؎ کا چندہ لکھا گیا اور صدر انجمن کے شکریہ کے بعد اجلاس برخاست ہوا۔

اس اجلاس کے بعد نواب صاحب نے **ممالک متحدہ** کے مختلف اضلاع میں دورہ کر کے **پولیٹکل ایسوسی ایشن** کے اغراض و مقاصد لوگوں کو سمجھائے اور جا بجا جلسے منعقد کر کے تقریریں کیں ممبر منتخب کرائے جہاں وہ خود نہ پہونچ سکے وہاں بھی مقامی معززین کے ذریعہ سے جلسوں کا انتظام کیا، اس کے

علاوہ مختلف طریقوں سے اُنھوں نے ایک پولیٹیکل الیوسی ایشن کی ضرورت لوگوں کے ذہن نشین کی اور خاموشی کے نقصانات بتائے، مسلمانوں نے بھی عام طور پر ہر ضلع میں اُن کی تحریک کا خیر مقدم کیا، البتہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کو اس تحریک کے متعلق شکوک و شبہات تھے۔ نواب صاحب نے اپنے مضامین اور تقریروں کے ذریعہ سے یہ غلط فہمیاں دُور کیں، گرم موسم اور رمضان کے زمانہ میں بھی انھوں نے اپنا کام جاری رکھا، اس کے بعد اوائل ۱۹۰۶ء میں وہ حج کو چلے گئے جہاں سے واپسی پر از سر نو کام کا سلسلہ جاری کیا، ان کی مساعی جمیلہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں میں عام طور پر پولیٹیکل معاملات میں حصہ لینے کا خیال پیدا ہو گیا، قلت گنجائش کی وجہ سے ہم نواب صاحب کے اس زمانہ کے کام اور دَوروں کی تفصیلی کیفیت لکھنے سے احتراز کرتے ہیں۔

شملہ ڈپوٹیشن

اسی زمانہ میں گورنمنٹ نے ہندوستانی کونسلوں کو از سر نو ترتیب دینے کا ارادہ کیا، اور رعایا کے مختلف گروہوں کے حقوق کا معاملہ زیر بحث آیا تو مسلمانوں کے تعلیمی مرکز علی گڑھ میں بھی جنبش ہوئی۔ کالج کے پرنسپل مسٹر آرچ بولڈ اس وقت شملہ پر تھے اور نواب محسن الملک کالج کے آنریری سکرٹری تھے۔ مسٹر آرچ بولڈ کے ذریعہ سے پرائیوٹ طور پر گورنمنٹ سے یہ طے ہو گیا کہ ہز اکسیلنسی ویسرائے مسلمانوں کے ڈپوٹیشن کو شرف باریابی عطا کریں گے۔

اس موقع پر نواب محسن الملک نے ہندوستان کے تمام مسلمان لیڈروں خصوصاً نواب وقار الملک سے مراسلت شروع کی اور یہ دریافت کیا کہ کون کون سے مطالبات گورنمنٹ کے سامنے پیش کئے جائیں نواب وقار الملک نے ایک مفصل یادداشت مرتب کر کے نواب محسن الملک کو بھیجدی اور ڈپوٹیشن کی ترتیب و تنظیم کے متعلق بھی مفید مشورے دیئے۔ نواب محسن الملک نے بھی اس وقت حیرت انگیز چستی و مستعدی سے کام کیا اور قلیل وقت میں ایک ڈپوٹیشن مرتب کر لیا، ایڈرس کا مسودہ نواب عماد الملک نے لکھا، یکم اکتوبر کو ڈپوٹیشن ہز اکسلنسی ویسرائے کی خدمت میں پیش ہوا اور حوصلہ افزا جواب پایا۔ نواب وقار الملک بھی اس ڈپوٹیشن

میں شریک تھے، یہ ڈپوٹیشن مختلف صوبجات ہند کے سربرآوردہ مسلمانوں پر مشتمل تھا جس میں ہز ہائینس سر آغا خان جیسے بلند رتبہ لوگ بھی شامل تھے، جب یہ لوگ باہم جمع ہوئے تو مختلف سیاسی مسائل پر گفتگو ہوئی اور سب نے یہ ضرورت محسوس کی کہ پولیٹیکل معاملات سے بے تعلقی مسلمانوں کے لئے مضر ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ جلد سے جلد ایک پولیٹیکل ایسوسی ایشن تمام ہندوستان کے لئے قایم کی جائے اور مسلمان اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے کوئی مستقل انتظام کریں۔

مسلم لیگ کا قیام

نواب وقار الملک چونکہ پہلے سے سیاسی جدّوجہد میں مصروف تھے لہٰذا اس موقع پر بھی عملی طور پر انھوں نے آگے قدم بڑھایا، اُس زمانہ میں آج کل کی طرح آئے دن جلسے نہیں ہوا کرتے تھے، نہ لوگوں کو جمع کرنا اور کسی جلسہ کا انتظام کرنا آسان تھا، اس لئے نواب وقار الملک نے یہ چاہا کہ ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے متصل پولیٹیکل ایسوسی ایشن کا جلسہ منعقد کریں، شملہ پر بھی جب ایک سنٹرل پولیٹیکل ایسوسی ایشن کی ضرورت پر بحث ہوئی تو لوگوں نے یہی رائے دی تھی کہ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے موقع پر اس کا تصفیہ کیا جائے اُس سال ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ڈھاکہ میں ہونے والا تھا، نواب صاحب نے آنریبل سیّد نواب علی چودھری سے برقی مراسلت شروع کی اور یہ خواہش کی کہ کانفرنس کے اجلاس کے بعد ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کا دن پولیٹیکل آرگنائزیشن کے واسطے مخصوص کر دیا جائے، ابھی قطعی فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ کانفرنس کے آنریری سکرٹری نواب محسن الملک کی طرف سے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں حسب ذیل اعلان شائع ہوا۔

"محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے قواعد میں یہ امر داخل ہے کہ اسے پالیٹکس سے کچھ تعلق نہ ہوگا نہ اُس میں کوئی ایسا مسئلہ جو پولیٹیکل معاملات سے متعلق ہو پیش ہو سکیگا نہ اس پر کسی قسم کی کانفرنس میں بحث کرنے کی اجازت ہوگی، یہ اُصول کانفرنس کی جب بنیاد پڑ رہی تھی اُس وقت قرار دیا گیا تھا جو اب تک بدستور قایم ہے اور آیندہ بھی قایم رہیگا۔ ڈھاکہ کی کانفرنس کے موقع پر اگر پولیٹیکل ایسوسی ایشن قایم کرنیکی

کوئی تجویز ہوگی تو اُس کو کانفرنس سے کچھ تعلق نہ ہوگا نہ کانفرنس کے کسی اجلاس میں اس کا تذکرہ ہوگا، اگر پولیٹکل ایسوسی ایشن قایم کرنے کے لئے وہاں کوئی تحریک ہوگی تو بعد ختم ہونے کانفرنس کے۔

مسلمانوں کو جو پولیٹکل ایسوسی ایشن سے دلچسپی رکھتے ہوں اختیار ہوگا کہ بطور خود اُس کا انتظام علیحدہ کریں' اور اُس کے لئے علیحدہ جلسہ کریں' ممبران کانفرنس جو کانفرنس کے اجلاس میں شریک ہوں مجاز نہ ہوں گے کہ کوئی رزولیوشن جس کا تعلق پالیٹکس سے ہو کانفرنس کے اجلاس میں پیش کریں' یا کوئی لکچر یا اسپیچ اس کے متعلق دیں' یا کسی تقریر و تحریر میں جو کانفرنس کے جلسہ میں پیش کی جائے اُس کا تذکرہ کریں"

یہ اعلان جو محض بے ضرورت اور فضول تھا نواب صاحب کو ناگوار گزرا، انھوں نے اِس بارہ میں کانفرنس سے کوئی اعانت نہیں طلب کی تھی البتہ اُس کی اسٹینڈنگ کمیٹی سے یہ خواہش کی تھی کہ وہ کانفرنس کی کارروائی کے لئے حسب معمول پہلے تین دن کافی سمجھے' اور اسی لحاظ سے اپنا پروگرام مُرتّب کرے تاکہ چوتھا دن پولیٹکل ایسوسی ایشن کے لئے مل جائے۔

بہرحال کسی قدر مراسلت کے بعد ڈھاکہ میں ایسوسی ایشن کے جلسہ کا انتظام ہوگیا' اور ۳۰ دسمبر کی تاریخ اس کے لئے تجویز کی گئی۔ نواب صاحب ڈھاکہ نے پہلے سے ایک اسکیم پولیٹکل ایسوسی ایشن کے متعلق مُرتّب کرلی تھی' اس جلسہ کا بہت سے لوگوں کو خاص طور پر اشتیاق تھا، غرض ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو جلسہ شروع ہوا، اور نواب صاحب ڈھاکہ کی تحریک سے نواب وقار الملک اِس جلسہ کے صدر تجویز ہوئے۔

جناب صدر نے اپنے خطبہ میں پہلے یہ بتایا کہ یہ پولیٹکل جلسہ ہے سرکاری ملازمین اس میں شریک نہیں ہوسکتے ہیں' اُس کے بعد طلبہ کو یہ بتایا کہ وہ اس جلسہ میں کوئی عملی حصّہ نہ لیں نہ تقریر کریں نہ کسی معاملہ پر رائے دیں' اِس کے بعد آپ نے حاضرین مجلس کو حسب ذیل الفاظ میں خطاب کیا:

"آنریبل نواب خواجہ سلیم اللہ خاں بہادر اور دیگر حضرات

آج جس غرض سے کہ ہم لوگ یہاں جمع ہوئے ہیں وہ کوئی نئی ضرورت نہیں ہی۔ ہندوستان میں جس وقت سے کہ انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد پڑی اُس وقت سے وہ ضرورت بھی پیدا ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ جناب سر سید مرحوم ومغفور نے جن کی عاقبت اندیشی اور عاقلانہ پالیسی کے مسلمان ہمیشہ مشکور وممنون ہیں نیشنل کانگرس کے بڑھتے ہوئے اثر سے متاثر ہو کر نہایت زور کے ساتھ اِس بات کی کوشش کی کہ مسلمانوں کی بہتری اور اُن کی حفاظت اسی میں ہی کہ وہ اپنے آپ کو کانگرس میں شریک ہونے سے باز رکھیں اور یہ رائے اس قدر صائب تھی کہ گو جناب مرحوم آج ہم میں نہیں ہیں، لیکن مسلمانوں کی عام رائے اس وقت تک وہی ہے اور جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے ہم کو اس بات کی ضرورت زیادہ محسوس ہوتی جاتی ہے کہ مسلمان اپنے پولٹیکل حقوق کی حفاظت میں بیش از بیش اہتمام کریں اب سے پانچ برس پہلے اکتوبر ۱۹۰۱ء میں مختلف صوبجات کے بعض مسلمان لکھنؤ میں جمع ہوئے اور کافی غور کے بعد اُنھوں نے یہ رائے قرار دی کہ اب وہ وقت آگیا ہی جو مسلمان اپنے پولٹیکل حقوق کی حفاظت کی غرض سے ایک علٰحدہ پولٹیکل ایسوسی ایشن قایم کریں۔ چنانچہ یہ ایک صوبہ متحدہ آگرہ واودھ میں جہاں پہلے سے کوئی ایسی انجمن موجود نہ تھی جو مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرتی۔ مگر بنگالہ میں نئے نئے واقعات پیش آئے۔ صوبہ بنگالہ کی جدید تقسیم سے جس قسم کا جوش کہ کانگرس کے داخلی وخارجی اثر میں پیدا ہو گیا، اُس سے متاثر ہو کر اور یہ دیکھ کر کہ گورنمنٹ اپنی قانونی کونسلوں میں توسیع کرنے والی ہی، گزشتہ اکتوبر میں مسلمان بحیثیت ایک ڈیپوٹیشن کی حضور وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی ضروریات کو اور جو نقصانات کہ مسلمانوں کو

بحیثیت قوم پہونچ رہے تھے اُن کو ادب کے ساتھ حضور ممدوح میں پیش کیا وہ تمام کارروائی بھی حضور ممدوح کے جواب کی عام طور پر اخباروں میں مشتہر ہو چکی ہی اُس موقع پر جو بزرگانِ قوم بحیثیت ممبران ڈپوٹیشن شملہ میں جمع ہوئے تھے اُنھوں نے اس بات پر غور کرنے کے بعد کہ وہ کیا تدبیریں اختیار کی جاویں جن سے مسلمانوں کے پولیٹکل حقوق کی حفاظت کا انتظام مستقل طور سے ہو جاوے قرار دیا تھا کہ آخر دسمبر میں مختلف صوبوں کے ڈیلیگیٹ بمقام ڈھاکہ جمع ہو کر اس مسٔلہ کا تصفیہ کریں اُسی عرصہ میں **نواب صاحب** ڈھاکہ نے بھی اپنی ایک اسکیم اسی مسٔلہ کے متعلق قوم کے غور اور توجہ کی غرض سے مشتہر کی۔ اور آج ہم سب یہاں اسی غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ اس مسٔلہ کو جو اب تک ملتوی رہتا چلا آیا ہی آیندہ کے واسطے جلد فیصل کریں۔

اور اب قبل اس کے کہ اس مسٔلہ کے متعلق میں کسی عملی کارروائی کا ذکر کروں یہ کہنا ضرور چاہتا ہوں کہ برٹش گورنمنٹ کے عام اُصول سلطنت چاہے کچھ ہوں اور برٹش نیشن کی لبرٹی اور انصاف پسندی چاہی رعایا کو کیسی ہی حقوق کا مستحق بناتی ہو، لیکن ہم لوگوں کو جو اپنی تاریخی روایتوں کو ابھی بھولے نہیں ہیں اور سلطنت و رعایا کے باہمی تعلقات سے بخوبی واقف ہیں۔ بطور ایک اُصول کے یہ بخوبی سمجھ لینا چاہیے کہ رعایا کے پولٹیکل حقوق کا پودہ صرف وفاداری کی سرزمین میں نشو ونما پا سکتا ہی۔ لہٰذا مسلمانوں کو قبل اس کے کہ وہ اپنے کسی حق کا مطالبہ گورنمنٹ سے کریں، اپنی گورنمنٹ کا سچا وفادار گروہ ثابت کرنا چاہیئے۔

مسلمان ہندوستان میں اپنی دوسری ہمسایہ قوموں سے ایک خمس کے قریب ہیں اور اس لئے یہ ایک بہت صاف مضمون ہی کہ اگر خدانخواستہ کسی وقت

برٹش حکومت ہندوستان میں قایم نہ رہے تو اُس وقت وہی قوم ملک پر حکمراں
ہوگی جو تعداد میں ہم سے چار حصّہ زیادہ ہی اور اب صاحبو ہر ایک شخص کو چاہیئے
کہ اپنے دل میں اس بات پر غور کرے کہ اُس وقت ہماری حالت کیا ہو جاوی گی
اُس وقت ہماری حالت یہ ہوگی کہ ہماری جان ہمارا مال ہماری آبرو اور ہمارا
مذہب سب خطرہ میں ہوگا۔ آج جب کہ برٹش کی زبردست سلطنت اپنی رعایا
کی محافظ ہی جس قسم کی مشکلات بسا اوقات ہم کو اپنے ہمسایہ دوستوں سی پیش
آتی رہتی ہیں اُس کی نظائر کم و بیش ہر صوبہ میں موجود ہیں۔ تو والئے اُس وقت پر
جب کہ ہم کو اُن لوگوں کا محکوم ہو کر رہنا پڑے جو اورنگ زیب کا بدلا
صدہا برس بعد آج ہم سے لینا چاہتے ہوں اور اس خطرہ سے بچنے کے واسطے
جب کہ خدانخواستہ وہ کسی وقت پیش آجاوے۔ دوسرا اور کوئی راستہ مسلمانوں
کے پاس اس کے سوا نہ ہوگا کہ برٹش جھنڈے کے نیچے اور اُس کی حفاظت میں
اپنے مالوں اور اپنی جانوں کو وقف کر دیں۔ اور ہمارا ایسا کرنا کچھ برٹش لوگوں کے
واسطے نہ ہوگا بلکہ خود اپنی جان و مال و آبرو اور مذہب کی حفاظت کی غرض سے
ہم کو ایسا کرنا ناگزیر ہوگا۔ لہذا جس وفاداری کا اظہار ہماری طرف سے اپنی
گورنمنٹ کی نسبت اِس وقت کیا جا رہا ہی اُس کی یہ بہترین ضمانت ہی کہ ہمارا
خود نفع اُسی میں ہی۔ میں اخیر شخص ہوں گا اگر اپنے ہمسایوں کی نیت کی نسبت
بدگمانی کروں۔ لیکن بااینہمہ میں اس واقعی امر کے کہنے میں مطلق پس و پیش کرنا نہیں
چاہتا کہ اگر کانگرس کے لیڈروں نے اُس دشمنی اور عداوت کے جوش کے فرو
کرنے میں آیندہ جلد توجّہ نہ کی جو اُن کے گروہوں میں اب روز بروز انگریزی حکومت
اور انگریزی قوم کے برخلاف ترقی پر ہی تو یہ یقینی امر سمجھنا چاہیئے کہ یہ جو کچھ اب
آج کل ہو رہا ہی اُس سے رعایا کے بڑے گروہ کے دلوں میں بغاوت کا بیج بویا

جارہا ہی اور مسلمانوں کو برٹش فوج کے ساتھ اُس بغاوت کے فرو کرنے کا نہایت ضروری فرض ایک نہ ایک دن ادا کرنا پڑے گا۔

البتہ ہمارا یہ فرض بھی ضروری ہی کہ جہاں تک ہمارا انفلوئنس کام دے وہاں تک ہم اپنے دوستوں کو غلط راستہ پر جانے سے روکیں اور بحیثیت اُن کے ہمسایہ ہونے کے اُن کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آویں اور اپنے حقوق و مقاصد کو محفوظ رکھکر سوشل طور پر اُن کے ساتھ اپنی ہمدردی کو قایم رکھیں اور کسی معاندانہ برتاؤ سے اُن کے ساتھ اجتناب کریں۔ نیز یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ہم کو کانگرس اور اہلِ کانگرس کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہی۔ نہ اُن کی جملہ کارروائیوں سے ہم کو اختلاف ہی ہے ہم اُن کی اُس جدوجہد کے درحقیقت مشکور بھی ہیں جن سے ملک کو بعض وہ منافع پہونچے ہیں۔ جن میں مسلمان بھی برابر کے شریک ہیں اور ممکن ہی کہ آیندہ بھی ہم کانگرس کی کارروائی کے کسی حصّہ کو واجبی سمجھیں ہم کو جو کچھ کانگرس سے اب اختلاف ہی یا آیندہ اختلاف ہوگا وہ تین قسم کے امور ہیں۔ اوّل اُن کے وہ مطالبات جن سے ہندوستان میں انگریزی سلطنت کو خطرہ ہو۔ دوم وہ امور جن سے ہمارے واجبی حقوق معرض تلف میں ہوں۔ سوم اُن کی سخت کلامی جو رعایا کی طرف سے سلطنت کی نسبت مسلمان کبھی پسند نہ کریں گے۔ اور میں بہت زور کے ساتھ آپ صاحبوں سے ضرور یہ عرض کروں گا کہ ہم کو اپنی پولٹیکل ایسوسی ایشن کی کارروائی میں اعتدال اور ادب کو ہمیشہ اپنا شعار رکھنا چاہیے۔ مجھکو شملہ ڈپوٹیشن میں شریک ہونے کی عزت حاصل تھی۔ اور مجھکو درحقیقت اُس وقت بہت ہی خوشی ہوئی تھی جب ہم لوگوں نے حضور وائسرائے کی زبان سے شرقی بنگالہ کے مسلمانوں کے اُس برتاؤ کی تعریف سُنی جو اُنھوں نے گزشتہ موقع پر برتا اور تحمّل اور

اعتدال سے کام لیا اور ہیں آنریبل نواب خواجہ سلیم اللہ خاں بہادر نواب
آف ڈھاکہ اور آنریبل سید نواب علی صاحب چودھری کو مبارکبا د دیتا
ہوں کہ یہ جو کچھ ہوا اُن کے انفلوئنس کا نیتجہ تھا اور مجھکو اُمید ہے کہ آیندہ بھی
وہ اپنی نسبت گورنمنٹ کے ایسے ہی عمدہ خیالات کو قایم رکھیں گے اور یہی
صرف ایک کنجی اُن کی کامیابی کی ہے اور اب میں اجازت دیتا ہوں کہ پروگرام
کے مطابق آج کی کارروائی شروع کی جائے ۔

نواب صاحب کی تقریر کے بعد نواب ڈھاکہ نے ایک طویل اسپیچ کے ساتھ اپنی اسکیم
پیش کی جس پر لوگوں نے بعض ترمیمیں پیش کیں جو اس وقت تک کے لئے ملتوی کردی گیئں جب کہ
دوسرا جلسہ آخری مرتبہ ان امور پر غور کرنے کے لئے منعقد ہو اس کے بعد حسب ذیل تجویزیں منظور ہوئیں

(۱) یہ جلسہ جس میں ہندوستان کے ہر حصہ کے مسلمان بمقام ڈھاکہ شریک ہیں فیصلہ کرتا
ہے کہ ایک پولیٹکل ایسوسی ایشن بنام آل انڈیا مسلم لیگ حسب ذیل مقاصد کے لئے قایم ہونی چاہیئے۔

(الف) مسلمانان ہند کے دل میں برٹش گورنمنٹ کی نسبت وفادارانہ خیالات کو ترقی دینا
اور گورنمنٹ کی کسی کارروائی کے متعلق اُن میں جو غلط فہمی ہو اُسے دُور کرنا ۔

(ب) مسلمانان ہند کے پولٹیکل حقوق و فوائد کی نگہداشت اور اُن کی ضروریات و خواہشوں کو
مؤدبانہ طریقہ سے گورنمنٹ میں پیش کرنا ۔

(ج) لیگ کے دیگر مقاصد کو نقصان پہونچائے بغیر مسلمانان ہند میں ایسے خیالات پیدا
نہونے دینا جو دوسرے فرقوں کی نسبت معاندانہ ہوں ۔

(۲) اس جلسہ کی رائے میں تقسیم بنگال مسلمانان بنگال کے لئے جو آبادی کا بڑا حصہ ہیں یقیناً
مفید ہے اور اس قسم کی تمام کارروائیوں کو جیسے ایجی ٹیشن بائیکاٹ سختی سے روکنا چاہیئے ۔

اسی جلسہ میں ایک کمیٹی لیگ کے قواعد و قوانین کا مسودہ تیار کرنے کے لئے بھی مقرر ہوئی
اور یہ طے پایا کہ آیندہ کسی مناسب موقع مسلمانان ہند کا ایک جلسہ طلب کرکے یہ قواعد پیش کئے جائیں

مسلم لیگ کے اجلاس کے بعد نواب صاحب لیگ کے متعلق کام میں مصروف رہے، چنانچہ اسی سلسلہ میں انھوں نے ۲۳ مارچ ۱۹۰۷ء کو علی گڑھ کالج میں طلبہ کے سامنے مسلمانانِ ہند کی پالٹیکس پر ایک پرمغز اسپیچ دی، جس میں انھوں نے مسلمانان ہند کی صحیح پوزیشن طلبہ کو سمجھائی، پھر اسی سلسلہ میں کانگرس میں شریک ہونے کی مضرتیں بیان کرکے اب تک خاموش رہنے کی پالیسی پر بحث کرتے ہوئے فرمایا۔

"حقیقت یہ ہے کہ اب تک ہمارا خاموش رہنا، اور اپنی پولیٹیکل مجلس نہ بنانا اور اپنے قومی نفع ونقصان پر غور نہ کرنا اور تعلیم یافتوں کو آزادی کے ساتھ اُن مسائل پر بحث کرنے کا موقع نہ دینا جن پر اُن کی قوم کی بقاو ثبات کا دارومدار ہے، ایک ایسی حالت تھی جس کی وجہ سے ہم کو بہت کچھ نقصان اُٹھانا پڑا ہے، اور بدقسمتی سے اس خاموش پالیسی نے ہمارے بہت سے حقوق تلف کرڈالے ہیں، مگر میں اس وقت اس امر کے بیان کرنے سے نہایت خوش ہوں کہ آیندہ یہ نقصان ہم کو اُٹھانے نہیں پڑیں گے، اور اس طرح افسوس کرنے کا ہم کو موقع نہیں ملے گا کیوں کہ اب ہم مسلمانوں کی ایک خاص پولیٹیکل مجلس قایم ہوگئی ہے جس کا نام ہے "آل انڈیا مسلم لیگ" گو کہ یہ مجلس دیر سے قایم ہوئی اور اس مجلس کے قایم کرنے میں بہت غفلت کی گئی ہے، مگر اب ہم خدا کا شکر کرتے ہیں کہ اس کی بُنیاد مستحکم رکھی گئی ہے، اور کوشش ہو رہی ہے کہ اس کی شاخیں تمام ہندوستان میں پھیلائی جائیں"۔

اس کے بعد چند اور معاملات پر بحث کرکے مسلمانوں کی حالت کو ایک خاص انداز سے بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں۔

"نوجوان دوستو ہماری اور اُن کی (ہندوؤں کی) حالت اس وقت بالکل ایک ڈھلوان سطح کی ہے جس کے بالائی حصہ میں مسلمانوں کو جگہ ملی ہے جب اُس پر

پانی برستا ہی تو سارا پانی بہ کر نیچے چلا جاتا ہی اور اوپر کچھ نہیں رہتا اسی طرح گورنمنٹ جو حقوق رعایا کو بخشتی ہے اُس میں چوں کہ کوئی حفاظت مسلمانوں کی نہیں ہوتی لہٰذا وہ بھی سب ہمارے دوسرے ابنائے وطن کے حصہ میں چلے جاتے ہیں اور ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔"

اسپیچ کے خاتمہ پر دوبارہ کانگرس کی شرکت پر بحث کرتے ہوئے کہا:

"آج جب کہ انگریزی حکومت کا زبردست ہاتھ اپنی مختلف رعایا کے حقوق کی یکساں حفاظت کر رہا ہی، جو حالت ہماری ہو رہی ہے وہ ظاہر ہی کہیں ہمارے ساتھ ممبریوں کا جھگڑا ہی کہیں گاؤکشی کا قصہ ہی کسی طرح ہم کو چین ہی نہیں ملتا، تو خدانخواستہ کسی دن ہم اپنے ان ابنائے وطن کے محکوم ہو جائیں، تو اُس وقت جو کچھ ہماری حالت ہو سکتی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہی۔"

اسپیچ کے خاتمہ پر اُنھوں نے طلبہ کو نصیحت کی ہی کہ وہ ہمیشہ و ہر حالت میں گورنمنٹ کے وفادار رہیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ کی تکمیل | جب دسمبر ۱۹۰۷ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس کراچی میں قرار پایا تو لیگ کا دوسرا سالانہ اجلاس بھی کراچی ہی میں تجویز کیا گیا، جو سر آدم جی پیر بھائی کے زیر صدارت منعقد ہوا، اس اجلاس میں ممبروں کا انتخاب ہوا اور لیگ کا دستور العمل بحث و مباحثہ کے بعد منظور ہوا۔

مسلم لیگ کے بانی و آنریری سکرٹری نواب وقار الملک بہادر نے اس خیال سے کہ اب وہ علی گڑھ کالج کے آنریری سکرٹری مقرر ہو چکے ہیں، لیگ کا سکرٹری رہنے سے انکار کیا مگر یہ قرار پایا کہ اس کا فیصلہ آیندہ مارچ میں لیگ کے اُس جلسہ میں ہوگا جو علی گڑھ میں منعقد کیا جائیگا۔

لیگ کا دستور العمل | کراچی کے اجلاس کے بعد نواب وقار الملک نے بحیثیت آنریری سکرٹری

آل انڈیا مسلم لیگ کے قواعد وضوابط جو کراچی میں منظور ہوئے تھے مع ایک مختصر تمہید کی ایک رسالہ کی صورت میں شائع کر دیے، اِس میں سے صرف تمہید و مقاصد ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں

تمہید | جب یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو شملہ پر مسلمانان ہندوستان کا مشہور ڈپوٹیشن حضور وائسرائے وگورنر جنرل ہند بالقابہ کے حضور میں اپنا میموریل لے کر حاضر ہوا تو اس موقع پر اُن سر برآوردگان قوم نے باہم اس بات پر بہت کچھ غور اور مشورہ کیا کہ آیندہ وہ کیا تدابیر اختیار کی جائیں، جن سے اس ملک میں مسلمانوں کے پولیٹکل حقوق کی ایک باقاعدہ اور مستقل حفاظت ہو جائے جس کی تحریک صوبہ آگرہ و اودھ میں بہت مدّت پیشتر اکتوبر ۱۹۰۱ء سے شروع ہو چکی تھی اس وقت سرسری طور پر یہ خیال کیا گیا کہ اس غرض کے واسطے ہر ایک صوبہ میں مقامی لوکل جماعتیں قایم ہوں اور اس کے علاوہ ایک ذی وقعت جماعت تمام ہندوستان کے واسطے قایم ہو، جس میں مختلف صوبوں سے سر برآوردہ اور اصحاب الرائے بزرگوار شریک ہوں اور ان انجمنوں کے ذریعہ سے اپنے حقوق کی حفاظت کا مستقل انتظام کیا جائے اور چوں کہ اسی قریب عرصہ میں بمقام ڈھاکہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہونے والا تھا، لہذا ایک عام اطلاع جاری کی گئی کہ ڈھاکہ میں ایجوکیشنل کانفرنس کی کارروائی ختم ہونے کے بعد اس مسئلہ پر پوری طرح غور کیا جائے گا جن صاحبوں کو اس سے دلچسپی ہو وہ ڈھاکہ میں تشریف لا کر اس مشورہ میں شریک ہوں، چنانچہ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء وہ یادگار تاریخ ہی جب کہ کافی غور و بحث کے بعد بمقام ڈھاکہ "آل انڈیا مسلم لیگ" کی بنیاد اس کے پہلے سالانہ جلسہ میں قایم ہوئی، اس کارروائی کی روداد مشتہر ہو چکی ہی۔

مذکورۂ بالا سالانہ جلسہ میں بموجب رزولیوشن نمبر ۲ ایک پرویزنل کمیٹی جس کے ممبروں کی تعداد ساٹھ کے قریب تھی اس غرض سے قایم ہوئی کہ وہ لیگ کا مسودہ تیار کرے، چنانچہ مسودہ تیار ہوا اور بہت بڑی تعداد میں مزید غور اور اصلاح کی غرض سے تقسیم کیا گیا اور اخباروں میں بھی عام طور پر مشتہر ہوا، اور مختلف مقامات سے اس پر رائیں موصول ہوئیں، جن پر غور کرنے کے بعد اس مسودہ میں بہت کچھ اصلاح ہو گئی۔ تیسرا رزولیوشن ڈھاکہ کے سالانہ جلسہ کا یہ تھا کہ جب مسودہ

مُرتّب ہو جائے تو مختلف صوبوں سے صائب الرائے حضرات قایم مقامان صوبجات کے طور پر ایک جلسہ میں جمع ہو کر اس مسودہ پر مزید غور فرمائیں اور اس کو پاس کریں، چنانچہ اس مقصد کے واسطے چند ماہ پیشتر بانکی پور کا مقام جلسہ کے لئے تجویز ہوا تھا۔ لیکن جب مختلف صوبوں سے اس کل پر رائے طلب کی گئی تو بالآخر قرار پایا کہ کراچی میں "آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" کی کارروائی ختم ہونے کے بعد "آل انڈیا مسلم لیگ" کا جلسہ بھی منعقد ہو، چنانچہ اس کا انتظام کیا گیا، اور عام طور پر اس کو مشتہر کر دیا گیا اور بعد اس کے کہ ۲۸ دسمبر ۱۹۰۷ء تک ایجوکیشنل کانفرنس کی کارروائی ختم ہو گئی ۲۹ و ۳۰ دسمبر ۱۹۰۷ء کو خاص "آل انڈیا مسلم لیگ" کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا، پہلے دن یعنی ۲۹ دسمبر ۱۹۰۷ء کو سر آدم جی پیر بھائی صاحب جنھوں نے تمام مسلمانوں کی درخواست کو مہربانی سے قبول فرما کر اس پیرانہ سالی میں محض بہ نظر ہمدردی قوم بمبئی سے کراچی تشریف لانے کی تکلیف گوارا فرمائی تھی عام جلسہ میں جس میں شریک ہونے کے لئے کوئی فیس نہ تھی اور پریس کے رپورٹر بھی موجود تھے، پریسیڈنٹ مقرر ہوئے اور اپنی نہایت ہی معتدل اور جامع اور مانع اسپیچ سے قوم کو ممنون فرمایا، پھر معمولی ضابطہ کی کارروائیوں اور جناب پریسیڈنٹ صاحب کا شکریہ ادا ہونے کے بعد عام جلسہ کی کارروائی ختم کر دی گئی اور قرار پایا کہ ممبران پراویزنل کمیٹی مندرجہ رزولیوشن نمبر ۲ روئداد ڈھاکہ میں سے جن میں شرکائے شملہ ڈپوٹیشن بھی شریک ہیں جس قدر اصحاب اس وقت موجود ہیں وہ بشرکت بعض اور حضرات کے جو بطور ڈیلی گیٹ تشریف لائے ہیں، سب سے پہلے آل انڈیا مسلم لیگ کے قواعد و ضوابط پر بطور ایک کمیٹی کے غور کر کے اُن کو پاس کریں۔

اس قرارداد کے مطابق ۲۹ و ۳۰ دسمبر ۱۹۰۷ء کو کامل دو دن تک صاحبان موصوف نے جن کے اسمائے گرامی جداگانہ روداد جلسہ میں مندرج ہیں، مسودہ قواعد و ضوابط کی ہر ایک دفعہ اور ضمن پر کامل طور سے غور کیا اور پورے مباحثہ اور باہمی تبادلہ آرائے کے بعد بہت کچھ ترمیموں اور اصلاح کے ساتھ اُس مسودہ کو پاس کیا جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

لیگ کے اغراض | دفعہ ۲۔ اس لیگ کے اغراض حسب ذیل ہوں گے۔

(الف) مسلمانانِ ہند میں برٹش گورنمنٹ کے ساتھ وفاداری کے خیالات کو ترقی دینا اور اُن غلط فہمیوں کو دُور کرنا جو گورنمنٹ کی کسی کارروائی کے متعلق گورنمنٹ کے ارادہ کی نسبت پیدا ہوسکتی ہیں۔

(ب) مسلمانانِ ہندوستان کے پولیٹکل و دیگر حقوق کی حفاظت کرنا اور اُن کی ضرورتوں اور خواہشوں کو اعتدال کے ساتھ گورنمنٹ میں پیش کرنا۔

(ج) اغراض الف اور ب متذکرہ دفعہ ہذا کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسلمان ہند اور ملک کے دوسرے فرقوں کے درمیان دوستانہ خیالات کو ترقی دینا۔

اس کے بعد نواب صاحب نے پورا مسودہ دفعہ وار پیش کیا ہے۔

سالانہ اجلاس کے بعد ۱۸ مارچ کو آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس خان بہادر محمد مزمل اللہ خاں صاحب کی کوٹھی پر زیرِ صدارت مسٹر شاہ دین بیرسٹر ایٹ لا (لاہور) منعقد ہوا۔ سب سے پہلے نواب وقار الملک بہادر آنریری سکرٹری مسلم لیگ نے گزشتہ اجلاس کراچی کی رپورٹ پڑھ کر سُنائی جو منظور کی گئی، پھر ۲۰ جدید ممبروں کا انتخاب ہوا، اُس کے بعد نواب وقار الملک کے شکریہ کا رزولیوشن اُن خدمات کی بنا پر پاس کیا گیا جو اُنھوں نے لیگ کو قایم کرنے اور استحکام کے درجہ تک پہونچانے میں انجام دیں۔

اب چوں کہ نواب صاحب کالج کے آنریری سکرٹری ہو گئے تھے، اس لئے لیگ کی سکرٹری شپ سے استعفا دیدیا لیکن بحیثیت ایک ممبر کے اپنا تعلق قایم رکھا اور مدت تک عملی خدمات انجام دیتے رہے جن کی تفصیل ہم بخوف طوالت نظر انداز کرتے ہیں۔

مشترکہ انتخاب سے اختلاف | ۱۹۰۹ء میں رفارم اسکیم کے سلسلہ میں مشترکہ انتخاب کا مسئلہ ایک معرکۃ الآرا مسئلہ تھا، خود مسلمانوں میں بعض آزاد اور تعلیم یافتہ مسلمان مشترکہ انتخاب کے حامی تھے، لیکن نواب صاحب

کو معقول وجوہ کی بنا پر اس سے اختلاف تھا چنانچہ انھوں نے دو طویل مضمون اسی زمانہ میں مشترکہ انتخاب کی مخالفت میں لکھے، جن میں سے ایک حسب ذیل ہی۔

"میرے پاس مختلف دوستوں کے پاس سے خطوط آئے ہیں جن میں اُنھوں نے میری رائے اس باب میں دریافت کی ہی کہ مسلمانوں کو مشترک انتخاب میں شریک ہونا اور اُس میں ممبریوں کے لئے اُمیدوار کے طور پر کھڑا ہونا مناسب ہے، یا نہیں میں نے مناسب سمجھا ہی کہ میں پبلک طور پر اپنی رائے ظاہر کروں تاکہ میں بہت سے جوابوں کے لکھنے سے بچ جاؤں اور اگر میری رائے میں کوئی غلطی ہو تو ممکن ہی کہ دوسرے کوئی صاحب اُس کی تصحیح کر دیں۔

بات یہ ہی کہ مذکورۂ بالا مسئلہ کے متعلق اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کی دو رائیں ہو رہی ہیں غلبہ رائے جس کو سواد اعظم کہنا چاہیئے یہ ہی کہ مسلمانوں کو مشترک انتخاب میں شریک نہ ہونا چاہیئے اور ایک چھوٹے سے گروہ کی رائے جن میں بہت کم حضرات شامل ہیں اور جن میں ہمارے معزز اور محترم دوست سیّد علی امام صاحب بھی شریک ہیں یہ ہی کہ مسلمانوں کو مشترک انتخاب سے بھی فائدہ حاصل کرنا چاہیئے جو معزز حضرات یہ رائے رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو مشترک انتخاب میں شریک ہونا چاہیئے وہ خیال کرتے ہیں کہ ایسا کرنے سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں اتفاق اور یکجہتی باقی رہی گی اور مسلمانوں کا کلیتہً مشترک انتخاب سے علیحدہ رہنا اُن کو اپنے ایک بہت بڑے معزز اور مقتدر ہندو گروہ سے بالکل علیحدہ کر دے گا اور دونوں گروہوں میں بجای محبت کے کشیدگی اور رفتہ رفتہ دشمنی پیدا ہو جائے گی میں بھی اس کے متعلق یہ ضرور کہوں گا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ہمیشہ اپنی یہ پالیسی رکھنی چاہیے کہ جس طرح ہمیشہ سے مسلمانوں اور ہندوؤں کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہی ویسا ہی آیندہ بھی

برقرار رہنا چاہیئے اور بدون اپنے پولٹیکل حقوق کو صدمہ پہونچائے ہوئے جہاں تک ممکن ہی یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ دونوں گروہ باہم شیر و شکر رہیں۔

مسلمانوں میں اپنے ہمسایوں کے ساتھ جس شد و مد سے حسن سلوک کی تاکید ہی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ کسی اور مذہب و ملت میں ایسی تاکید نہیں ہی ہمارے ہندو دوست ہمارے ہمسایہ ہیں اور ہم کو اپنے مذہب کے مطابق اُن کے ساتھ کامل ہمدردی اور سلوک کے ساتھ بسر کرنا چاہیئے۔ اور چوں کہ میری ذاتی رائے یہ ہی کہ مسلمان اگر مشترک انتخاب میں شریک ہوں گے تو ان میں اور ہندوؤں میں جھگڑے اور قضیئے پیدا ہوں گے اور ہمارے قدیمی تعلقات میں اُن کی وجہ سے خرابی پیدا ہو گی لہذا میں مشترک انتخاب میں مسلمانوں کو شریک ہونے کی صلاح نہیں دے سکتا۔

مسلمانوں کا **مشترک انتخاب** میں شریک ہونا مسلمانوں کے لئے ضرور مضر ہو گا ہمارے لئے صلاح وقت یہی ہے کہ مشترک انتخاب سے علحدہ رہیں اور جو کچھ ہم کو گورنمنٹ علحدہ ہمارے اپنے انتخاب کے ذریعہ سے دے اُسی پر قانع رہیں اور اگر سمجھیں کہ اُس میں ہماری پوری دادرسی نہیں ہوئی ہی تو لگاتار اپنے عذرات کو ادب اور اعتدال کے ساتھ گورنمنٹ میں پیش کرتے رہیں اور یقین رکھنا چاہیئے کہ اگر ہماری معروضات واجبی ہوں گی تو آج نہیں کل، اور کل نہیں، پرسوں ایک نہ ایک دن ضرور ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے اور جدید ریفارم اسکیم جاری ہوتے وقت اگر ہمارا پورا حق ہم کو نہ ملے اور اس میں کسی قدر کسر رہ جاوے تو اس سے بددل اور مایوس نہ ہونا چاہیئے اور مؤدبانہ کوششوں کو جاری رکھنا چاہیئے مگر ان تمام کوششوں کے ساتھ اِس اُصول کو کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود برٹش گورنمنٹ کے قایم رہنے

کے ساتھ وابستہ ہو اگر برٹش گورنمنٹ ہندوستان میں ہی تو ہم بھی ہیں اور اگر وہ نہیں ہے تو ہم بھی نہیں۔

اب اس مسئلہ کو ایک دوسری نگاہ سے بھی دیکھنا چاہیئے اور وہ یہ کہ اگر ہم نے کسی جھگڑے اور ٹنٹے کی پروا نہ کی اور اپنے ہی حلوے مانڈے سے غرض رکھی اور مشترک انتخاب میں ہم نے اپنے آپ کو شریک کیا تو آیا ہم کو اُس میں کوئی کامیابی ہوگی؟ میں نہایت زور کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہرگز کامیابی نہ ہوگی ناکامیابی یقینی ہی اور ذلت و رسوائی مزید بر آں۔ مشترک انتخاب کے وقت ظاہر ہی اور اس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ مجارٹی ہندوؤں کی ہوگی ہم کتنی ہی دوڑ دھوپ کریں اور جن کے سامنے ہم کبھی اپنی ذاتی حاجت پیش کرنا نہ چاہتے تھے اُن کے دروازے پر بار بار دوڑے جاویں اور ہمارے کارندے اور عزیز اُن کی منت و خوشامد کریں مگر ہم ہندوؤں کی مجارٹی پر غالب نہ آسکیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم ناکامیاب ہوں گے اور دستِ گدائی دراز کرنے کی ذلت و رسوائی جو حاصل ہوگی وہ اس پر مستزاد۔

اور اگر کسی مقام پر کوئی کامیابی ہوئی بھی تو وہ ہماری کوششوں کی وجہ سے نہ ہوگی بلکہ وہ دوسرے غالب گروہ کی محض مہربانی کی وجہ سے ہوگی جس کی نسبت کیا خوب کہا گیا ہی ؎

حقا کہ با عقوبتِ دوزخ برابر است
رفتن بپائے مردیِ ہمسایہ در بہشت

اور پھر وہ مہربانی معلوم نہیں کہ کس قسم کے معاوضوں اور اقراروں پر مبنی ہوگی اور اُس کے بدل میں کس کس مضمون کے خطوطِ غلامی تحریر ہوں گے۔ اور کس کس قسم کے اقرار کیے جاویں گے اب بھی ہم دیکھتے ہیں کہ نیشنل کانگریس بعض مسلمانوں کو جو اپنی

پریسیڈنٹی کے عہدہ تک سے سرفراز فرماتی ہی لیکن پھر کیا وہ مسلمان بزرگوار مسلمانوں کے کسی کام کے ہوتے ہیں؟ ہمارے وہ ایک دفتری کے کام کے بھی نہیں ہوتے اس طرح اگر اپنی قوم کی اور اپنے قومی حقوق کی قربانی کر کے کسی نے کوئی ممبری حاصل بھی کی تو ایسی ممبری اُنھیں کو مبارک رہی قوم کو اُن سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ بلکہ ایسے ممبر قوم کے حق میں بعض اوقات سخت مضرت کا موجب ہوں گے۔ کیونکہ جب وہ ظاہر میں مسلمانوں کے ناموں کے ساتھ کونسل میں نشست کریں اور ووٹ وہ دیں جو مسلمانوں کے قومی حقوق کو پامال کرنے والا ہو تو ایسے ووٹوں سے مسلمانوں کو بہ نسبت خالص ہندو صاحبوں کے بہت زیادہ نقصان پہونچ جائے گا۔

جن مقامات میں مردم شماری میں مسلمان بہ نسبت ہندوؤں کے زیادہ ہیں کیا وہاں ہم ہندوؤں سے بازی لے جاویں گے آج کے زمانہ میں تو یہ خیال بھی قریباً قریباً صحیح ثابت ہونا مشکل ہی معلوم ہوتا ہی۔ اِس زمانہ میں کوئی فوج اپنی کثرت تعداد کے لحاظ سے غلبہ نہیں پا سکتی آج فتح حاصل کرنے کے لئے عمدہ ترین اسلحہ اور سامان کی ضرورت ہوتی ہی اور اس زمانہ کے سلاح جنگ میں اعلیٰ تعلیم ہی۔ دولت ہی، پولٹیکل قوت اور اتحاد ہے اور جد وجہد ہی اور ان سب باتوں میں ہم اپنے دوسرے گروہ سے بہت زیادہ کم ہیں لہٰذا کوئی اُمید نہیں کہ صرف ہماری مردم شماری اُن مقامات میں بھی ہم کو کچھ مدد دے سکے، مجھ سے صوبہ شرقی بنگالہ کے ایک نہایت اعلیٰ درجہ کے مسلمان رئیس جو اس وقت ایک قانونی کونسل کے ممبر بھی ہیں ناقل تھے کہ وہاں ایک موضع کا زمیندار مسلمان تھا اور رعایا میں بھی مسلمانوں کی تعداد غالب تھی۔ وہاں ایک ممبری کے لئے ایک مسلمان اور ایک ہندو اُمیدوار میں مقابلہ ہوا۔ اُن زمیندار

صاحب کی حالت یہ تھی کہ اُن کا وکیل ہندو تھا مہاجن ہندو تھا۔ اُن کا ذاتی خزانچی ہندو تھا ڈاکٹر ہندو تھا۔ یہ سب مل کر زمیندار کے پاس گئے اور ان پر دباؤ ڈالا کہ آپ اپنا آدمی ہمارے ساتھ کر دیں تاکہ وہ آپ کی طرف سے تاکید کر کے آپ کی مسلمان رعایا کے ووٹ ہندو اُمیدوار کو دلا دے اور مسلمان زمیندار سے اُس وقت کچھ بن نہ پڑا اور اپنے وکیل و مہاجن و ڈاکٹر کی فرمائش کی تعمیل کرنی پڑی اور ہندو اُمیدوار کامیاب ہو گیا یہ اُس صوبہ شرقی کی حالت ہے جہاں مسلمان کل آبادی میں تین ربع کے قریب ہیں۔ تا دیگراں چہ رسد۔

آخر میں میں پھر بہت زور سے یہی کہتا ہوں کہ مشترک انتخاب کے اکھاڑے میں مسلمانوں کو اُترنا نہیں چاہیئے جہاں سوائے ناکامی اور ذلت و رسوائی کے کچھ حاصل نہ ہوگا اور مسلمانوں کو خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم کو اسی ملک میں رہنا ہی یہیں جینا ہے اور یہیں مرنا ہی ہندوؤں سے بگاڑ کر ہم کو راتوں کو آرام کی نیند سونا بھی مُیسّر نہ آسکے گا شرقی بنگالہ ہی میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جہاں ہندو زمینداروں نے اپنی مسلمان رعایا کو جھوٹے مقدمات میں گرفتار مصیبت کرایا اور جب ناکردہ گناہ رعایا جیلخانہ میں گئی تو وہاں بنگالی جیلر نے اُن کی خبر لی یہ سب مظالم ہوتے رہے اور پولیس اُن کا کوئی تدارک نہ کر سکی۔ ہمارے اس ملک کی حالت ابھی خدانخواستہ اُس حد تک نہیں پہونچی اور اس پر خدا کا شکر کرنا چاہیئے اور ایسی غلطیاں نہ کرنی چاہئیں جس میں ہمارے اور ہمارے ابنائے وطن ہندوؤں کے باہم رنج اور فساد کی آگ ہمیشہ مشتعل رہے اور ایک دوسرے کے دشمن بن جاویں۔"

تقسیم بنگال کی منسوخی اور اسلامی سیاست کا دور جدید

۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن کے عہد میں بنگال کا وسیع صوبہ دو صوبوں پر منقسم کر دیا گیا، اور مشرقی بنگالہ ایک علٰحدہ صوبہ قرار پایا جہاں

مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی، یہ تقسیم عام طور پر مسلمانوں کے لئے مفید سمجھی گئی اور یہ خیال کیا گیا کہ اس جدید صوبہ میں مسلمانوں کو اپنی حالت سنبھالنے اور تعلیم میں ترقی کرنے کا موقع ملے گا، لیکن ہندو بنگالی اس تقسیم کے سخت مخالف تھے، انھوں نے تمام صوبہ میں مخالفت کا ایک طوفان برپا کر رکھا تھا، اس ایجی ٹیشن میں ہر ادنیٰ و اعلیٰ بنگالی شریک تھا، سالہا سال تک یہ طوفان برپا رہا لیکن گورنمنٹ کو بظاہر جنبش نہیں ہوئی مسلمانوں نے اس موقع پر گورنمنٹ کی بے حد مدد کی خطرات کا مقابلہ کیا، قربانیاں کیں مگر وفادارانہ طرز عمل نہ چھوڑا، مسلمانوں کو جس طرح گورنمنٹ کے انصاف پر اعتماد تھا اسی طرح گورنمنٹ کی قوت و طاقت پر بھی اعتماد تھا وہ سمجھتے تھے کہ گورنمنٹ نے جو فیصلہ کر دیا ہی وہ قطعی ہے اور بنگالیوں کا شور و شغب محض بے فائدہ، خود بعض ذمہ دار وزراء نے بھی یہ اعلان کر دیا تھا کہ یہ فیصلہ قطعی ہی اور اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

یہ ایجی ٹیشن ایک حد تک جاری تھا کہ ۱۹۱۱ء میں دہلی کا دربار تاج پوشی منعقد ہوا، اور ملک معظم انگلستان سے تشریف لائے، دربار میں ملک معظم قیصر ہند نے تقسیم بنگال کی تنسیخ کا بھی اعلان فرمایا، اس اعلان نے مسلمانوں کو حیرت زدہ کر دیا، اور وہ تعجب کرنے لگے کہ ناممکن چیز کیوں کر ممکن ہو گئی، چند روز تک مایوسی و غصہ نے مسلمانوں کو اپنی حالت اور پوزیشن پر غور کرنے کا موقع نہ دیا، لیکن اُس کے بعد وہ سنبھلے اور غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے کہ ان کو خاموشی کی بدولت یہ روز بد دیکھنا نصیب ہوا، اور ہندو بنگالی شورش و ہنگامہ آرائی اور ایجی ٹیشن کی بدولت کامیاب ہوئے۔

نواب صاحب بھی اِس اعلان سے بے حد متاثر ہوئے اور سمجھ گئے کہ ہوا کا رُخ اب کس طرف ہی، چوں کہ وہ مسلمانوں کے مسلمہ لیڈر تھے اس لئے اُن کا فرض تھا کہ اس موقع پر صحیح طریقہ سے مسلمانوں کی رہ نمائی کرتے اور بتاتے کہ آیندہ اُن کو کیا کرنا چاہیئے چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور دربار سے واپس آتے ہی ایک معرکۃ الآرا مضمون انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع کیا، یہ مضمون مسلمانان ہند کی سیاسی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہی، کیوں کہ عام طور پر یہ یقین کیا جاتا ہی

کہ مسلمانوں کی سیاست کا دور جدید ۱۹۱۲ء سے اسی مضمون کے بعد شروع ہوا، اس بنا پر ہم اس یادگار مضمون کو تمام وکمال ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

ہندوستان میں آیندہ مسلمانوں کی حالت

آج کل سب سے زیادہ پولٹیکل بحث جو ہندوستان میں ہو رہی ہے' وہ شرقی اور غربی بنگالہ کے الحاق اور بہار کے جُداگانہ صوبہ قرار دیئے جانے اور ہندوستان کا پایہ تخت کلکتہ سے دہلی کو منتقل کئے جانے سے متعلق ہے، بہار کے جداگانہ صوبہ قرار دیئے جانے کے متعلق ہم سمجھتے ہیں کہ کسی کو بہت کم اختلاف ہوگا، اگر کچھ اختلاف ہوگا بھی تو غربی بنگالہ کے بنگالیوں کو ہوگا، مگر اس سے ان کو بھی کوئی نقصان نہیں پہونچتا، بلحاظ مردم شماری اس نئے صوبہ میں ہندو باشندوں اور بنگالی زبان بولنے والوں کی تعداد اب بھی زیادہ رہے گی اور مسلمانوں کو (جو گو بلحاظ مردم شماری کم ہیں لیکن ان کی پوزیشن بلحاظ صاحب جائداد اور بااثر ہونے کے زیادہ ہے) ان جدید انتظاموں سے یقیناً زیادہ فائدہ پہونچے گا پایہ تخت کی تبدیلی بنگالہ والوں کو (خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان) نقصان رساں ثابت ہوگی' جن کے مکانات اور اراضیات اور تجارت کلکتہ میں زیادہ ہے' اور جن کو اعلیٰ گورنمنٹ کی قربت کی وجہ سے اس کے دفتروں میں زیادہ تعداد کے اعلیٰ عہدے اور ملازمتیں ملتی رہی ہیں' لہذا شرقی اور غربی بنگالہ کے الحاق کی خوشی کا جوش فرو ہوگا، ہم کو کلکتہ سے ایک دوسرے ایجی ٹیشن کا منتظر رہنا چاہیئے، ساتھ ہی دہلی اور نواح دہلی کے مسلمان اور ہندو دونوں کو جو عظیم برکتیں پایہ تخت کی اس تبدیلی سے پہونچنے والی ہیں وہ اس خطہ کی رعایا کے ایک کثیر گروہ کو بے حد مشکور کرنے والی ہیں' مع ہذا یہ اسکیم کوئی جدید اسکیم نہیں ہے، ہم کو یاد ہے کہ ایک زمانہ میں لارڈ کرزن نے دہلی میونسپلٹی کے ایڈرس کے جواب میں یہ فرمایا تھا کہ پایہ تخت کا کلکتہ سے دہلی میں منتقل ہونا صرف ایک وقت کا سوال باقی رہ گیا ہے' اور اس حالت میں درحقیقت اس سے بہتر دوسرا وقت اس تبدیلی کے واسطے نہیں ہوسکتا تھا جب ایک طرف حضور شہنشاہ معظم کا جشن اور دربار تاجپوشی دہلی میں ہو رہا تھا، اور دوسری طرف بنگالیوں کی ایک بہت بڑی ضد الحاق بنگالین کی نسبت پوری کی جا رہی تھی علی گڑھ کالج کو بھی (اور اگر مسلمانوں

کی قسمت میں ہی تو آیندہ مسلم یونیورسٹی کو بھی اس تبدیلی سے بے انتہا فوائد پہونچیں گے اب یہ کالج اور یونیورسٹی گویا پایہ تخت کی ناف میں سمجھنے چاہئیں دہلی اور علی گڑھ میں صرف ۸۰ میل کا فاصلہ ہی اور تیز رفتار ٹرینوں کے لئے دو گھنٹہ کا راستہ ہی اور آیندہ جب بجلی سے کام لیا جاویگا تو یہ فاصلہ صرف ایک گھنٹہ کا رہ جاویگا اور حضور ویسراے بحیثیت چانسلر یونیورسٹی بسہولت تمام ضرورت کے وقت یونیورسٹی کے جلسوں میں رونق افروز ہو سکیں گے علی گڑھ کے قرب میں قابل سے قابل اور لایق سے لایق ایسے مسلمان اور دیگر اصحاب دستیاب ہو سکیں گے جو مسلم یونیورسٹی کے چلانے میں اپنے قیمتی مشوروں سے مدد دے سکیں۔

سب سے زیادہ معرکۃ الآرا مضمون دونوں بنگالوں کے الحاق کا ہی جہاں تک مسلمانوں کو تعلق ہی یہ عام رائے سمجھنی چاہیے کہ یہ الحاق عام طور پر ناپسند کیا جاتا ہی اور بعد اس کے کہ وزراے سلطنت یکے بعد دیگرے الحاق کے خلاف اُمیدیں دلا چکے تھے الحاق کا عمل میں آنا گورنمنٹ کی کمزوری اور آیندہ اُس کے قول و فعل کی بے اعتباری کی ایک وجہ قرار دی جاوے گی اور اس لئے اگر ایسا نہ ہوتا تو بہتر تھا۔ لیکن جب کہ بدقسمتی سے ایسا ہو گیا ہی تو اب سوال یہ ہی کہ آیندہ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟ بات یہ ہی کہ اب جو کچھ ہو گیا اور شہنشاہ معظم کی زبان مبارک سے نکل گیا اُس کے خلاف ایجی ٹیشن کا جاری رکھنا نہ مفید ہوگا اور نہ مناسب۔ اب جس بات کی ضرورت ہی اسی کی طرف ہم کو بھی اور گورنمنٹ کو بھی کوشش کرنی چاہیے اور وہ یہ ہی کہ جو فوائد مسلمانوں کو مشرقی بنگالہ کی علیحدگی سے حاصل ہوئے تھے (اور حاصل ہو رہے تھے) اُن میں کوئی فرق نہ آنے پاوے اور ایسا ہونا اگر گورنمنٹ چاہے تو مطلق دشوار نہیں ہی اور گورنمنٹ جس قدر جلد اس قسم کے انتظاموں کا اعلان کرے گی اسی قدر ملک میں عام اطمینان کا موجب ہوگا اور ایجی ٹیشن رک جاوے گا اور مسلمانوں میں عام ناراضگی پیدا نہ ہونے پاوے گی ان اعلانوں کا ہونا عین اسی وقت میں ضروری ہے جب کہ شہنشاہ معظم ہندوستان میں تشریف رکھتے ہیں ورنہ ایجی ٹیشن بہت کچھ ترقی کر جاوے گا اور مسلمان جو طرابلس اور ایران کے معاملات سے پہلے سے شکستہ خاطر ہو رہے ہیں اُن کے خیالات اور بھی زیادہ مایوسانہ ہو جاویں گے

ہماری دلی خواہش اب یہی ہی کہ حضور شہنشاہ معظم اس ملک سے رخصت ہوتے وقت اپنے پیچھے نعرہائے مسرت اور شکر گزاری کے سوا اور کچھ نہ چھوڑیں۔

ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ دونوں صوبوں کے الحاق کی کارروائی سے گورنمنٹ کے ضعف کا ضرور ثبوت ملتا ہی لیکن اگر اس قسم کا خیال بہت زیادہ رکھا جاوے تو ملکی انتظاموں میں کبھی کوئی بہت بڑی اور مفید اصلاح نہو سکے مع ہذا رعایا بمنزلہ اولاد کے ہوتی ہی اور سلطنت بمنزلہ ماں اور باپ کے اور بسا اوقات والدین کو اپنے بچوں کی ضد پوری کرنی پڑتی ہے' اسی طرح اگر گورنمنٹ نے یہ دیکھ کر کہ اس کی رعایا کے ایک گروہ کثیر نے خواہ مخواہ بھی قسم کھالی ہی اور وہ دونوں صوبوں کے الحاق کے بدون اپنے اظہارات رنج وغم سے دست بردار ہونا نہیں چاہتے' اُن کی ایک ضد کو پورا کر دیا ہی، تو اب شرقی بنگالہ کے مسلمانوں کو بھی اس کے خلاف زیادہ اصرار نہ کرنا چاہیئے۔ بشرطیکہ گورنمنٹ ان تدابیر کو بغیر ایک لمحہ ضائع کئے ہوئے عمل میں لائے جن سے شرقی بنگالہ کے مسلمانوں کے حقوق کافی اور قطعی طور پر محفوظ ہو جاویں اور ہم سمجھتے ہیں کہ ضرور وہ تدبیریں پہلے سے گورنمنٹ کے پیش نظر ہوں گی' اور شرقی بنگالہ کے مسلمان لیڈروں سے مشورہ کرنے کے بعد بہت جلد اُن کا اعلان گورنمنٹ کی طرف سے عمل میں آئے گا' کیوں کہ یہ امر گورنمنٹ کے نزدیک بھی اب مسلم ہی کہ شرقی صوبہ کی علٰحدگی سے قبل وہاں کے کثیر التعداد مسلمانوں کی حالت غلامی کی سی ہو رہی تھی اور صوبہ کی علٰحدگی کے بعد وہ غلامی کا طوق ان کی گردن سے نکلتا جا رہا تھا، آخر میں شرقی بنگالہ کے مسلمانوں کے ساتھ ہم اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں جس ہمدردی سے کہ اس وقت کسی مسلمان کا بھی دل خالی نہو گا، دونوں صوبوں کی علٰحدگی جس وقت ہوئی تو گورنمنٹ کی مصلحتیں اُس میں کچھ ہی مد نظر رہی ہوں لیکن مسلمانوں کے حق میں وہ علٰحدگی خدا کی طرف سے ایک رحمت ثابت ہوئی اور ۶۶ فی صدی آبادی کے جو حقوق اُس سے پہلے گورنمنٹ کی نگاہوں سے اور عام نگاہوں سے مخفی رہتے تھے، وہ روز روشن کی طرح سامنے آگئے' اور روز بروز مسلمانوں کی حالت اس صوبہ میں ترقی کرنے لگی ایسی حالت میں دفعتاً پھر دونوں صوبوں کا الحاق بغیر کسی ایسے اطمینان

دلانے کے مسلمانوں کی حفاظت آیندہ کس طرح ہوگی، ایک سخت پولٹیکل غلطی گورنمنٹ کی طرف سے
تھی، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کارروائی سے گورنمنٹ نے مسلمانوں کی طرف سے نامناسب بے پروائی
برتی اور اس کا اثر یہ ہوا کہ بعض تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بھی انہی تھوڑے دنوں میں یہ فیلنگ پیدا
ہو چلی ہے کہ ہندوؤں سے علٰحدہ رہنے میں مسلمانوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے مسلم لیگ کو اب خیرباد
کہنا چاہیئے اور ہم کو نیشنل کانگرس کے ساتھ مل جانا چاہیئے جس کے واسطے کانگرس مدتوں سے کوشش
کرتی چلی آ رہی ہے، ہم اس سے تو متفق ہیں کہ گورنمنٹ کی طرف سے ضرور ایسی کارروائی ہوئی ہے جس سے
مسلمانوں کے دلوں کو واجبی طور پر صدمہ پہونچا ہے لیکن اس سے ہم کو قطعی اختلاف ہے کہ اپنے قومی
شیرازہ کو منتشر کر کے ہم دوسرے زبردست گروہ کے ساتھ اسی طرح شامل ہو جائیں جس طرح کوئی
دریا سمندر میں شامل ہو کر اپنی ہستی کو معدوم کر دیتا ہے، ہماری علٰحدگی کانگرس وغیرہ سے اس بنا پر
نہیں ہے کہ ہم کو گورنمنٹ کے ساتھ وفادار رہنا چاہیئے، وفاداری خود غرض ہے وہ جوہر نہیں ہے۔
اس کی بنیاد بھی کسی اور چیز پر قایم ہوتی ہے اور جس قدر اس بنیاد میں تزلزل ہوگا، وفاداری بھی لامحالہ
متزلزل ہوگی پس مسلمان جو من حیث القوم نیشنل کانگرس سے اب تک علٰحدہ رہے ہیں اس کی بنیاد
یہ ہے کہ کانگرس کے بعض اہم دعاوی مسلمانوں کے حق میں مضرت بخش ہیں۔ اُن کا سوا اِس مسلمانوں
کے حق میں تباہ کن ہے، برٹش گورنمنٹ کا سایہ ہندوستان سے اُٹھنا یا اس کا اثر بہت زیادہ کم ہو جانا
مسلمانوں کے حق میں بربادی بخش ثابت ہوگا ایسی ایک ہی چیز جو ہمارے ابنائے وطن کی حق میں
خوش قسمتی سمجھی جا سکتی ہے، مسلمانوں کے حق میں (جن کا شمار اس ملک میں کم ہے) وہ سم قاتل ہے
شرقی و غربی بنگال کے الحاق کا جو نتیجہ بھی نکلے اُس سے مذکورہ بالا کلیہ باطل نہیں ہوتا۔ اگر ہمیں
ہندوستان میں رہنا ہے تو برٹش گورنمنٹ سے بگاڑ کر رہنا یہ ہمارے لئے ٹھیک نہ ہوگا، گورنمنٹ کے
استحکام میں کوشش کرنا اور اس کے ساتھ شریک رہنا یہ خود ہم کو اپنے استحکام میں کوشش کرنا ہے لہذا
اس قسم کے خیالات سے ہم کو احتراز کرنا چاہیئے، یہ سچ ہے کہ بسا اوقات مایوسیاں انسان کو خودکشی پر
آمادہ کر دیتی ہیں، اور یہ خیال کہ اب ہم کو کانگرس کے ساتھ شامل ہو جانا چاہیئے، اسی قسم کی مایوسی کا

نتیجہ ہی، جس کی خاص ذمہ دار موجودہ گورنمنٹ ہی۔ لیکن خودکشی کی صلاح کسی وقت میں بھی نہیں دی جا سکتی، لامحالہ ہم کو سوچنا پڑتا ہے کہ آیندہ ہم کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔

یہ تو آفتاب نصف النہار کی طرح اب روشن ہی کہ ان واقعات کے دیکھنے کے بعد جو اس وقت مشاہدہ میں آئے یہ مشورہ دینا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ پر بھروسہ کرنا چاہیئے لاحاصل مشورہ ہے، اب زمانہ اس قسم کے بھروسوں کا نہیں رہا، خدا کے فضل و کرم کے بعد جس پر ہم کو بھروسہ کرنا چاہیئے وہ ہماری اپنی قوتِ بازو ہی اور اس کی نظیر جو ہمارے قابل احترام ابنائے وطن نے پیش کی ہی ہمارے سامنے موجود ہی۔

مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو سب سے پہلے چند کوششیں ضرور جاری رکھنی چاہئیں (اوّل) اپنے صوبہ میں ان کو "پراونشیل ایجوکیشنل کانفرنس" کے اجلاس نہ صرف سال میں ایک مرتبہ بلکہ متعدد مرتبہ کرنے چاہئیں، اور ہر ضلع میں اپنی لوکل ایجوکیشنل کانفرنس قایم کرنی چاہیئے، جو پراونشل ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ ملحق ہو، اور پراونشیل کانفرنس کا دفتر ایک وسیع پیمانہ پر قایم ہو جس میں سب قسم کی انتظامی رپورٹیں اور اخبار اور اطلاعیں موجود رہیں۔ اور یہ پراونشل کمیٹی اپنی ضرورتوں سے متواتر گورنمنٹ کو اطلاع دیتی رہی اور اخباروں میں بھی اپنی آواز بلند رکھے اور اگر ایک دفعہ عرض کرنے پر گورنمنٹ توجہ نہ کرے تو بار بار اس کو دُہرا کر گورنمنٹ کا دم ناک میں کر دے، اور جہاں تک امکان میں ہی اپنے صوبہ میں عام تعلیم اور اعلی تعلیم کو ترقی دے، اور اپنا تعلق آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سے بہت مستحکم طور پر قایم کرے اور جن باتوں کی سماعت گورنمنٹ نے نہ کی ہو اُن کو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں پیش کرتی رہے (دوم) اسی طرح صوبہ میں ایک پراونشل مسلم لیگ قایم رکھیں جس کے ماتحت ہر ضلع میں ایک ایک اُسی قسم کی کمیٹی ہو اور آل انڈیا مسلم لیگ سے اِس سلسلہ کو وابستہ رکھیں اور اپنے مختلف اجلاسوں اور مراسلات کے ذریعہ سے مسلمانان صوبہ کے حقوق اور ضروریات کو گورنمنٹ تک پہونچاتے رہیں اور اِس بات کی کوشش کی جائے کہ گورنر صوبجات متحدہ کے پاس جو کونسل قایم ہوتی ہی اُس میں مسلمانوں کی آواز کمزور نہ ہو جائے پراونشل مسلم لیگ بہت کچھ کر سکتی ہے۔

(سوم) ایجوکیشنل کانفرنس اور مسلم لیگ۔ ان مجالس کی کارروائیوں کے نتائج ابھی دیر میں نکلیں گے لہذا فوری ضرورت یہ ہی کہ شرقی بنگال کے مسلمان لیڈر (جو بدقسمتی سے اپنے صوبہ کی عظمت قایم رکھنے میں گورنمنٹ کی بے التفاتیوں اور کمزوریوں کے سبب سے ناکام ثابت ہوئے ہیں) وہ بلا تاخیر گورنمنٹ میں اُن تدابیر کو پیش کریں جن کے ذریعہ سے وہ اپنی ترقی پذیر حالات کو اور اپنے حقوق کو محفوظ رکھ سکتے ہیں اور زور دیں کہ "شہنشاہ معظم" کے ہندوستان میں تشریف رکھنے کے زمانہ ہی میں اُن تدابیر کے اختیار کرنے کا اعلان گورنمنٹ کی طرف سے ہو جائے، جب تک کسی چوٹ کی وجہ سے درد باقی ہی وہ قابل اصلاح ہی اس کے بعد اصلاح ناممکن ہو جاتی ہی۔



نواب صاحب کے مضمون کا اثر اینگلو انڈین اخبارات نے اس مضمون کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا چنانچہ پانیر نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ کالج کے آنریری سکرٹری نے اپنے سیاسی خیالات کی اشاعت کے لئے ایک ایسے اخبار کو پسند کیا جو طالب علموں کا پرچہ ہی اور ایک کانگرسی اخبار نے اس مضمون کے بعض فقروں کی بنا پر یہ لکھا کہ یہ گورنمنٹ کو ایک قسم کی دھمکی ہے، جب اس قسم کے متعدد مضامین شایع ہوئے تو نواب صاحب نے بھی جواب میں ایک طویل مضمون لکھا۔

اس مضمون میں اعتراضات کا جواب دینے کے بعد انھوں نے مسلمانوں کو علم و ہنر کے ہر شعبہ میں داخل ہونے کی صلاح دیتے ہوئے پارسیوں کی مثال دے کر بتایا کہ

"وہ تعداد کے لحاظ سے کس قدر اقل قلیل ہیں، لیکن آج وہ اس ملک میں جو اعلیٰ منزلت رکھتے ہیں، اور ہندوستان کے مسلمان اب بھی خواب غفلت سے ہوشیار ہوں تو کچھ زیادہ زمانہ نہ گزرے گا کہ وہ باوجود اپنی مردم شماری کی کمی کے دنیا کی ایک ممتاز قوم شمار ہونے لگیں گے، اور گورنمنٹ بھی (جس کو آج یہ جرأت ہوئی کہ مسلمانوں کو کافی اطمینان دلائے بغیر اُس نے زبردست گروہ ملیا کو خوش رکھنا کافی سمجھا) آیندہ کسی کارروائی کے وقت لازمی طور پر ہمارے حقوق اور ہماری

فیلنگوں کا بھی کافی خیال رکھنے پر مجبور ہو گی، اس وقت گورمنٹ نے جو پالیسی اختیار کی ہی ممکن ہے کہ مسلمانوں کو غفلت سے ہوشیار کرنے کی غرض سے ایک تازیانہ کا کام دے۔ لعل اللہ یحدث بعد ذٰلک امرا۔

اس کے بعد شرقی بنگالہ کے مسلمانوں کے حقوق پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"وزرائے سلطنت کو چاہیئے تھا کہ وہ حضرت شہنشاہ معظم کو یہ بھی مشورہ دیتے کہ ایک بڑی قوم کی ضد اور ہٹ پوری کرتے وقت کم ازکم اُس قوم کی اشک شوئی کے طور پر جس کے مُنہ سے نوالہ چھینا جا رہا تھا، چند لفظ اُن کی حقوق کی حفاظت کی غرض سے زبان مُبارک سے ارشاد فرماتے جاتے مگر "خیر برگزشتہ صلوٰۃ" جو کچھ ہو سو ہوا، لیکن اب گورمنٹ کو ایک منٹ بھی ضائع نہ کرنا چاہیئے کہ مسلمان صوبہ شرقی کے سرگروہوں سے مشورہ کرکے جو کچھ تجویزیں مسلمانوں کے مفید مطلب گورمنٹ کے نزدیک واجبی ہوں اُن کا تمام و کمال اعلان عین اسی وقت میں کر دیا جائے جب کہ حضور شہنشاہ معظم ہندوستان میں تشریف رکھتے ہیں۔"

نواب صاحب کے ان مضامین کا تمام ملک پر اثر پڑا، اور اسی زمانہ سے مسلمانوں کے سیاسی خیالات میں زبردست انقلاب پیدا ہوا، یہاں تک کہ چند روز بعد آل انڈیا مسلم لیگ نے بھی سیلف گورمنٹ کو اپنا نصب العین قرار دے لیا، اور بڑے بڑے لوگ اپنی قدیم سیاسی خیالات سے متزلزل[1] ہو گئے۔

---

[1] علامہ شبلی نعمانی نے ایک نظم میں سیاسی خیالات کی اس تبدیلی کو نہایت دلچسپ انداز سے بیان کیا ہے، اس میں سے چند منتخب اشعار ذیل میں لکھے جاتے ہیں ؎

وہ دن گئے کہ شانِ غلامی کے ساتھ بھی | ہر بوالہوس خمارِ سیاست میں چور تھا
اب معترف ہیں دیدہ ورانِ قدیم بھی | اِس نقشِ سیمیا میں نظر کا قصور تھا

بقیہ نوٹ صفحہ آئندہ پر

اسلامی سیاست کے متعلق نواب صاحب کا ایک خط

نواب صاحب کے ان مضامین کو جہاں بہت سے لوگوں نے پسند کیا، وہاں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو بحیثیت کالج کے آنریری سکرٹری کی پولیٹکل معاملات میں نواب صاحب کی عملی مداخلت کو پسند نہیں کرتے تھے، چنانچہ متعدد اصحاب نے خطوط و اخبارات کے ذریعہ سے اِس قسم کے خیالات ظاہر کئے اسی زمانہ میں کانپور کے ایک قابل اور معزز مسلمان وکیل نے بھی نواب صاحب کو ایک خط لکھکر اپنے شبہات ظاہر کئے نواب صاحب نے اِس کے جواب میں ایک مفصّل خط لکھا، جس میں وضاحت وصفائی سے اسلامی سیاست کے متعلق اپنے خیالات بیان کئے ہیں چوں کہ یہ خط اُن کے سیاسی خیالات کا صحیح ترجمان ہے اس لئے ہم اِس کو بجنسہٖ ذیل میں نقل کرتے ہیں، نواب صاحب لکھتے ہیں۔

"جناب سید صاحب مرحوم مغفور نے خود اپنے وقت میں آخر الامر رفتار زمانہ سے مجبور ہو کر ایک پولیٹکل ایسوسی ایشن قایم کی تھی جس کا نام انھوں نے ڈیفنس ایسوسی ایشن رکھا تھا نواب محسن الملک مرحوم ان کے بعد برابر پالیٹکس میں حصہ لیتے رہے ہیں جب آنریری سکرٹری کالج کے عہدہ پر مقرر ہوا تو اس وقت آل انڈیا مسلم لیگ اور کالج دونوں میرے ہاتھ میں رہی مگر چوں کہ یہ دونوں کام میں انجام نہیں دے سکتا تھا اور مقتضائے مصلحت بھی نہ تھا کہ یہ دونوں خدمتیں ایک شخص سے متعلق رہیں لہٰذا میں نے لیگ سے معافی چاہی لیکن

نظم از ظفر علی خاں

اس دستِ مرتعش میں نہ تھی قوتِ عمل — ایک کاسہ تہی یہ سرپُر غرور تھا
یہ لمعۂ سراب نہ تھا چشمۂ بقا — یہ تیرگی تھی جس کو سمجھتے تھے نور تھا
آئینِ بندگی میں تملق کی شان تھی — اخلاص وصدق نا شائبۂ مکر و زور تھا
اُن کی دکان کی وہ ہوا اب اُکھڑ چلی — جن کے گھروں میں جنسِ وفا کا وفور تھا
اب یہ کھلا کہ واقفِ سِر تھا اُسی قدر — جو جس قدر مقامِ تقرب سے دور تھا
سب مٹ گیا سیاستِ سی سالہ کا طلسم — ایک ٹھیس سی لگی تھی کہ شیشہ یہ چور تھا

ایسا کرنے سے میں نے اپنی پرائیوٹ حالت کو ہمیشہ محفوظ رکھا اور جب ضرورت
ہوئی اپنی پرائیوٹ حالت میں پالیٹکس میں برابر شریک رہا ہوں البتہ بحیثیت
آنزیری سکرٹری کالج میرے لئے مناسب یہی ہے کہ میں آنزیری سکرٹری کے نام سے
پولٹیکل مباحث میں مبتلا نہوں میرے جس تازہ مضمون کی طرف جناب نے اشارہ
فرمایا ہی اس پر بھی میں نے اپنی پرائیوٹ حالت سے دستخط کئے ہیں آنزیری
سکرٹری کا اس میں کہیں ذکر نہیں ہی اور گورمنٹ نے کبھی مجھ سے اس قسم کی
کارروائی پر تعرض نہیں کیا۔ طلبائے کالج کو بحیثیت آنزیری سکرٹری البتہ
میں اس قسم کے مباحث سے علیحدہ رکھتا چلا آتا ہوں گو یہ ناممکن ہے کہ جو آندھی
چل رہی ہے اس کے اثر سے ہمارے طلبا کلیتہً محفوظ رہتے ہوں کوئی اخبار
بھی جو ان کے مطالعہ سے گزرتا ہی وہ پولٹیکل مباحث سے خالی نہیں ہوتا اور
کئی کئی مہینہ طلبا جب کالج سے باہر ہوتے ہیں تو اس وقت وہ ہماری نگرانی
سے بالکل بری ہوتے ہیں با ایں ہمہ جب تک طلبا کو یہ اطمینان ہے کہ ان کے
آنزیری سکرٹری نے ان کو گمراہ کرنے والی پالیسی اختیار نہیں کی ہے اس
وقت تک وہ آنزیری سکرٹری کے مشوروں کو بسمع قبول سنتے ہیں اور مجھکو
یہ عرض کرنے سے بہت خوشی ہے کہ جب کبھی میں نے طلبائے کالج کو جس قسم کا
مشورہ دیا ہی انھوں نے سعادت مندانہ اس پر عمل کیا ہی اور اس کی وجہ سے
بورڈنگ ہاؤس کی اندرونی حالت ہر طرح قابل اطمینان اور خاموش رہتی چلی
آئی ہی ہمارے طلبا نے مجروحان و یتیمان و بیوگان ٹرکی کے واسطے ضرور چندہ
کیا اور اپنے پرنسپل اور برٹش سفیر متعینہ قسطنطنیہ کے ذریعہ سے وہ چندہ ٹرکی
وزیر اعظم کے پاس بھیجا ہی اور بھیج رہے ہیں لیکن یہ اس قسم کا پالیٹکس ہے
جس سے ان کو روکا نہیں جا سکتا اور بحیثیت اپنے عہدہ آنزیری سکرٹری

کالج کے بھی میں نے اپنی شرکت ان کے ساتھ ضروری سمجھی ہے۔

مخدومی پالیٹکس کی جب تک دو قسمیں قرار نہ دی جاویں پالیٹکس ممنوعہ و پالیٹکس مجاز، تب تک ہم کوئی کارروائی معتدل طور پر انجام نہیں دے سکتے۔ ممنوعہ پالیٹکس میں ایک سخت و شدید قسم وہ بھی ہے جس کو بغاوت کہنا چاہیے اور اس سے پرائیوٹ طور پر بھی ہم کو علیحدہ بلکہ اس کا دشمن رہنا چاہیے اور جائز پالیٹکس میں بسا اوقات ہم کو بحیثیت منتظم تعلیم بھی شرکت کرنی لازم ہے اور اگر ہم ایسا نہ کریں تو ہمارے طلبا اپنی قومی ضروریات کے سمجھنے سے بالکل کورے رہ جائیں گے اور بالکل ممکن ہوگا کہ کالج کے احاطہ کے باہر جب کبھی ہمارے دوسرے ابنائے وطن اپنے پالیٹکس کے جال میں ان کو پھانسنا چاہیں تو وہ آسانی سے ان کے دام تزویر میں پھنس جاویں گے خلاصہ یہ کہ پالیٹکس کے صرف نام سے ہم کو ڈرنا نہ چاہیے اور خذ ما صفا و دع ما کدر پر عمل کرنا ضروری ہے

میں نے جو اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ بعض تعلیم یافتہ مسلمانوں کو میں نے گورنمنٹ کی جدید پالیسی سے اس درجہ بد دل پایا کہ وہ مسلم لیگ کو چھوڑ کر کانگریس میں شامل ہونا چاہتے ہیں، میرا یہ بیان واقعات پر مبنی ہے ابھی دہلی کے موقع پر ایسی متعدد مثالیں مجھکو مل چکی ہیں اور یہ گورنمنٹ کی خیرخواہی نہیں ہے کہ اصلی واقعات کو گورنمنٹ پر ظاہر نہ کیا جاوے بلکہ وہ غلط خوشامد میں داخل ہوگا اور اس لئے میں نے واقعات کے اظہار ہی کو اپنی قوم اور گورنمنٹ دونوں کی خیرخواہی سمجھا ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک جلسہ ۲۲ کو بمقام لکھنؤ ہونے والا تھا لیگ نے اس میں ظاہر کیا ہوگا کہ وہ کیا کرتی ہے میرے نزدیک تو بالفعل اور بہت جلد جو کچھ کرنا چاہیے تھا وہ صوبہ شرقی کے مسلمانوں سے متعلق ہے

اور اپنے مضمون کے آخر میں اس کی تصریح میں نے کافی طور پر کر دی ہے۔

لوکل بورڈوں کی نسبت گورنمنٹ میں رائیں سب پیش ہو چکی ہیں اور نتیجہ معلوم ہوگا، لیکن اب یہ بالکل صاف ہے کہ گورنمنٹ نے مسلمانوں کو ایسا ہی بودا سمجھ لیا جیسا کہ غربی و شرقی بنگال کے الحاق کے موقع پر سمجھا تو لوکل بورڈوں کے مسئلہ کا بھی خدا ہی حافظ ہے کم از کم مسلمانوں کا یہ کام تو ضرور ہے کہ ایک مضبوط کوشش کے ساتھ بتلا دیں کہ گورنمنٹ کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ یہ بے اعتنائی مسلمانوں میں نہایت مایوسانہ خیالات کے ساتھ دیکھی گئی ہے کہ دونوں بنگالہ کے الحاق کے اعلان کے ساتھ گورنمنٹ نے مطلق بھی اس کی ضرورت نہ سمجھی کہ ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کو اطمینان دلایا جاتا کہ ان کی ترقی پذیر حالت اور حقوق کی حفاظت فلاں فلاں ذریعہ سے کی جاوے گورنمنٹ کی یہ پالیسی منزلہ ایک توپ خانہ کے تھی جو مسلمانوں کی مُردہ لاشوں پر سے گذر گیا بدون اس احساس کے کہ ان غریب لاشوں میں سے کسی میں کچھ جان بھی ہے اور ان کو اس سے کوئی تکلیف محسوس ہوگی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

کس کا مراکو اور کس کا ٹریپولی اور کہاں کا ایران یہاں سرے سے اسلام کا ہی قلع قمع ہوا جاتا ہے "لعل اللّٰہ یحدث بعد ذٰلک امرا"۔

طلبہ کو سیاسی تعلیم جب کہ آزاد اور پختہ عمر کے مسلمانوں کا سیاسی مباحث میں حصہ لینا ایک مدت تک[1] ناجائز سمجھا گیا، تو طلبہ کو کس طرح یہ اجازت دی جا سکتی تھی کہ وہ ان مسائل پر گفتگو کریں، لیکن نواب صاحب کا یہ بھی ایک سیاسی کارنامہ ہے کہ انھوں نے کالج کا آنریری سکرٹری ہونے کے چند ماہ بعد اس دیرینہ قاعدہ کو توڑ دیا چنانچہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے یہ اطلاع حسب ذیل الفاظ میں شائع کی۔

---

[1] استاد مرحوم علامہ شبلی نعمانی فرماتے ہیں ؎

مدتوں بحث سیاست کی اجازت ہی نہ تھی
کہ وفاداریِ مسلم کا تھا یہ خاص شعار

"ہمارے کالج کے طلبہ کو اب سے پیشتر پولیٹیکل مسائل پر گفتگو کرنے اور بحث و مباحثہ کرنے کی اجازت نہیں تھی اور کالج کے ارکان منتظمہ کو اس امر کا مطلق خیال نہیں تھا کہ اس ممانعت سے اُن پر بیرونی اثر کس قدر گہرا پڑتا ہے اور اُن کے دلوں میں کس قسم کے شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں چونکہ اس بے پروائی کا نتیجہ اچھا نہیں ہو سکتا تھا اس لئے نواب وقار الملک بہادر نے مثل دیگر معاملات کالج کے اب اس طرف بھی اپنی خاص توجہ مبذول کی ہے۔ انھوں نے ہدایت کی ہے کہ اگر یونین میں کوئی پولیٹیکل مضمون بحث و مباحثہ کے لئے پیش کیا جائے تو اس مضمون کے موئید اور مخالف طلبہ حسب معمول فرضی طور پر اس کی تائید و تردید نہ کریں بلکہ اپنے اصلی خیالات کے لحاظ سے پیش شدہ تحریک کے موئید و مخالف ہوں اور ہر پہلو پر اپنے اصلی خیالات کا اظہار کریں نیز انھوں نے بہ نفس نفیس متعدد طلبہ کو اپنے پاس بلا کر اُن کے اصلی خیالات معلوم کرنے اور اُن کے شبہات و اعتراضات کو بہ سہولت و متانت سے رفع کرنے کی کوشش شروع کی ہے اور اُن کو اجازت دی ہے کہ وہ آزادی سے اُن کے سامنے اپنے اصلی پولیٹیکل خیالات کا اظہار کریں۔"

نواب صاحب نے خود بھی اس موضوع پر ایک طویل مضمون لکھ کر بتایا کہ طلبہ کو سیاسی خیالات سے محفوظ رکھنا ممکن نہیں جو ہوا چاروں طرف چل رہی ہے کیوں کر ممکن ہے کہ جسم کو نہ لگے۔ انھوں نے بتایا کہ اس طرح طلبہ کو آزادانہ اظہار خیال کا موقع دینے سے یہ فائدہ ہوگا کہ ہم اُن کے غلط خیالات کی اصلاح کر سکیں گے۔

وہ کہتے ہیں:

"اب غور کرنا چاہیے کہ یہ مقصد کہ ہمارے طلبہ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں کس طریقہ سے حاصل ہو سکتا ہے؟ سب سے اول ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ طلبہ کی زبانوں پر مُہر سکوت لگا دینا کچھ مفید ہے؟ اس کی نسبت میں بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ

نہیں اور ہرگز نہیں! اگر کانوں اور آنکھوں پر مہر کی جا سکتی ہی تو زبانوں پر بھی
مہر لگانا شاید جائز ہو سکتا ہی، لیکن جب کان کھُلے ہوئے ہیں اور آنکھیں کھلی ہوئی
ہیں اور اُن کے ذریعہ سے مختلف خیالات دماغ میں پہونچتے ہیں تو زبانوں کو بند
رکھنا سخت مضر ہوگا، طلبہ کی زبان ہی سے ہم کو معلوم کر سکتے ہیں کہ اُن کے دل کی
کیا حالت ہی"

اِس کے بعد انھوں نے نہایت تفصیل سے مسلمانوں کی سیاست پر بحث کی ہی اور اسی سلسلہ میں یہ بتایا ہی کہ انھوں نے کس طرح طلبہ کے سیاسی خیالات معلوم کئے اور کس طرح اُن کی اصلاح کی۔



اسی زمانہ میں جب کہ نواب صاحب نے طلبہ کو سیاسی مسائل پر گفتگو کرنے کی آزادی دی لندن میں ایم اے او کالج کا سالانہ ڈنر زیر صدارت سر جیمس ڈگلس لاٹوش منعقد ہوا، اس موقع پر ایک اسپیکر نے نواب صاحب کے اِس طریق عمل پر بحث کرتے ہوئے کہا۔

"ہمارے موجودہ سکرٹری نواب وقار الملک بہادر ہیں، وہ کالج کی اصلاح میں برابر جانکاہ کوشش فرما رہی ہیں، اور علی گڑھ والوں میں مذہبی رُوح پھونکنے کے لئے انھوں نے جدید تجویز اختیار کی ہے (قہقہے) لیکن اس امر کو میں نہایت مسرت سے بیان کرنا چاہتا ہوں کہ جناب ممدوح جبری پالیسی کے حامی نہیں معلوم ہوتے، انھوں نے اپنے زمانہ میں نہایت دانشمندی کے ساتھ اِس امر کی اجازت دیدی ہی کہ علی گڑھ کے یونین کلب میں ملکی معاملات پر آزادانہ مباحثہ ہو"



سیاست خارجیہ مسلمانانِ ہند کو اسلامی اُخوت کی بنا پر تمام دنیا کے مسلمانوں سے تعلق ہے اور جب تک اسلامی تعلیم کا اثر اُن کے دلوں میں باقی ہی یہ تعلق بھی قایم رہے گا، مسلمان اگرچہ اب ہتگئے ہیں اور دوسری قوموں کے لئے مرقع عبرت و بصیرت بن گئے ہیں، لیکن وہ ہمیشہ سے ایسے نہ تھے

ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے کہ دنیا کی اولوالعزم سے اولوالعزم قوم مسلمانوں کے طوق غلامی کو اپنے لئے باعث عزت سمجھتی تھی' وہ نہ صرف خود صاحب تخت و تاج تھے بلکہ اُن کے غلام بھی جہانگیری و جہانبانی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اور دنیا کی بڑی بڑی باجبروت قومیں ان غلاموں کے درِ دولت پر ناصیہ فرسائی کرتی تھیں' مسلمانوں نے نہ صرف خود اپنے زورِ بازو سے اورنگ شاہی پر قبضہ کیا بلکہ سینکڑوں خاندانوں کو خاک مذلت سے اٹھا کر تخت شاہی پر بٹھا دیا' یہ مسلمان ہی تھے جن کی ہیبت و دبدبہ سے قیصر و کسریٰ بھی اپنے قصر شاہی کے اندر لرزہ براندام تھے' اور دنیا کی جنگجو اور سرکش قوموں کا سرِ پُرغرور ادب و تعظیم سے اُن کے سامنے جھکا ہوا تھا لیکن اب تاریخ کا یہ زریں صفحہ الٹ گیا اور گردش لیل و نہار نے مسلمانوں کو اس حالت پر پہنچا دیا جو آج ہم دیکھ رہے ہیں' سچ ہے۔ وتلک الایام نداولہا بین الناس ؀

اب بھی کچھ مسلمانوں کی چند سلطنتیں رہ گئی ہیں چونکہ مسلمان بہت کچھ کھو چکے ہیں اس لئے اپنے عہد گزشتہ کی یادگاریں اُن کو بہت عزیز ہیں اور فطرتاً اُن کی یہ آرزو ہے کہ اب جو کچھ رہ گیا ہے وہ دستبرد حوادث سے محفوظ رہے' اس بنا پر جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان اسلامی ممالک پر اعدائے ملت کا ہجوم ہے تو وہ بے چین ہو جاتے ہیں' یوں تو دنیائے اسلام ایک زمانہ سے مصائب میں مبتلا ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ ۱۹۱۱ء سے جب کہ اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا' اسلامی ممالک مسلسل طور پر یورپ کی حرص و آز کا شکار رہیں' جنگ طرابلس کے بعد جنگ بلقان چھڑی اور ابھی ترکوں کو اس سے نجات نہیں ملی تھی کہ یورپ کی عالمگیر جنگ میں اُن کو مبتلا ہونا پڑا' جس کا سلسلہ نواب وقار الملک کے آخر ایام حیات تک جاری رہا۔

نواب صاحب دُنیائے اسلام کے ان مصائب سے بے حد متاثر تھے' اگرچہ اس زمانہ میں مسلم یونیورسٹی کی تحریک شباب پر تھی اور وہ بہت زیادہ مشغول تھے' لیکن باوجود اس کے انھوں نے ترکوں کی حمایت میں متعدد مضامین لکھے' اور نہایت جوش سے مسلمانوں کو چندہ دینے کے لئے آمادہ کیا' یہاں تک کہ انھوں نے علی الاعلان یہ رائے ظاہر کی کہ جن لوگوں نے یونیورسٹی کے واسطے چندہ کا وعدہ کیا ہو

وہ تو ادا کر دیں لیکن اس کے علاوہ اور لوگوں سے میں چندہ کی اپیل نہ کروں گا۔

"اس وقت تو جو کچھ جس سے بن پڑے وہ ہلال احمر کے فنڈ میں جمع کر دے

جس سے زیادہ شدید ضرورت بالفعل مسلمانوں کی نہیں ہوسکتی"۔

اُن کا یہ جوش بے سبب نہ تھا، اُن کی دُور بیں نظروں نے دیکھ لیا تھا کہ اگر ترکی حکومت کو زوال ہوا تو اس کا انجام مسلمانوں کے لئے خطرناک ہوگا، اس بنا پر انھوں نے صاف صاف لکھ دیا کہ

"جو مصیبت ترکوں پر نازل ہو رہی ہے، وہ ترکوں پر ہی نہیں ہے بلکہ اسلام

پر ہے، اور اگر ترکی قوت کمزور ہو گئی، اور اس قابل نہ رہی کہ اپنے اماکن متبرکہ،

مکہ معظمہ و مدینہ منورہ زادهما الله شرفاً و تعظیماً اور اسی طرح دیگر اماکن مقدسہ

کی حفاظت کر سکے تو مسلمانوں کو وہ دن دیکھنے کے لئے تیار رہنا چاہیے کہ ایک دن

بلادِ عرب و شام پر کسی نہ کسی یورپین سلطنت کا جھنڈا لہراتا ہوگا"۔

افسوس کہ اس دَور بیں مدبر کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی، اور دُنیائے اسلام پر جو کچھ گزرنا تھا وہ ہماری شامتِ اعمال سے گزر گیا، عراق عرب اور شام کا جو حشر ہوا اُس سے کون مسلمان بے خبر ہے۔

ایک دوسرے مضمون میں انھوں نے ترکوں کی حمایت پر مسلمانوں کو آمادہ کرتے ہوئے لکھا

"تاریخ ہمیشہ ہماری آیندہ آنے والی نسلوں کو اس بات پر شرمندہ کرتی رہیگی

کہ ہم نے اسلام کو ایسے شدید مصائب میں مبتلا دیکھا اور ہم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ

جن جوانمردوں نے ہر قسم کی سختیاں اپنے اوپر برداشت کیں، اور اپنے مال اور

اپنی جان تک کی پروانہ کی، جن کی بیویوں اور جن کے بچوں تک نے ایثار کا کوئی

درجہ اُٹھا نہیں رکھا، جن کی عصمت دری تک نوبت پہونچ گئی اُن کے حق میں ہم

جو بڑے فخر کے ساتھ اپنے آپ کو مسلمان کہتے اور سمجھتے ہیں، ان کی مالی مدد بھی

نہ کرسکے، ایک دن ہم کو خدا کے سامنے بھی جانا ہی، اُس دن ہم اِس غفلت کا کیا
جواب دیں گے، ہرگز اب تاخیر کا وقت نہیں ہی، ہم کو جو کچھ کرنا ہی آج کرنا
چاہیے، معلوم نہیں کل کو زندہ بھی رہیں گے یا نہیں؛"

ٹرکی کی حمایت کا جذبہ یہاں تک ترقی کر گیا کہ آخر میں نواب صاحب نے صاف طور پر یہ رائے ظاہر کی کہ مسلم یونیورسٹی کے لیے جو سرمایہ جمع ہوا ہی وہ قرضہ کے طور پر ترکوں کو دیدیا جائے۔

نواب صاحب کی یہ ہمدردی صرف ٹرکی ہی سے مخصوص نہ تھی، بلکہ دوسرے اسلامی ممالک کے لئے بھی اُن کے دل میں یہی جذبات تھے چنانچہ جب رُوس نے مشہد مقدس پر گولہ باری کی تو اُس وقت بھی انھوں نے ایک زبردست مضمون انسٹیٹیوٹ گزٹ میں لکھا، جس میں علاوہ اور باتوں کے گورنمنٹ کو بھی ایران کی تباہی سے محترز رہنے پر متوجہ کیا۔



سنہ ۱۹۰۱ء سے قریباً سنہ ۱۹۱۴ء تک نواب صاحب مسلسل طور پر اُن سیاسی معاملات میں حصہ لیتے رہی جو مسلمانوں کے متعلق ہندوستان کے اندر یا باہر پیش آئے، ہندوستان کی سیاست کے سلسلہ میں انھوں نے مسجد کانپور کے معاملہ میں حصہ لیا، اور وزرائے انگلستان نے جب ہندوستان کے مسلمان نمایندوں کی ملاقات سے انکار کیا تو اِس پر بھی انھوں نے صدائے احتجاج بلند کی، اسی طرح اور تمام معاملات کے متعلق وہ آخر زمانہ تک مسلمانوں کی سیاسی خدمت کرتے رہی، ہم نے بخوف طوالت اُن کی سیاسی خدمات اختصار سے بیان کی ہیں، لیکن تاہم ناظرین نے اِس قدر اندازہ کرلیا ہوگا کہ نواب صاحب کے سیاسی خیالات میں تدریجاً ترقی ہوتی رہی جس کا سلسلہ سنہ ۱۹۱۲ء تک جاری رہا۔

نواب صاحب اگرچہ سیاسیات میں ابتدا سے سرسیّد مرحوم و مغفور کے متبع تھی لیکن سرسیّد کی وفات کے بعد انھوں نے کافی زمانہ پایا یہ زمانہ نہایت پر آشوب تھا، حالات میں جلد جلد تبدیلیاں ہورہی تھیں اور مختلف جدید مسائل ملک کے سامنے آگئے تھے، بنگال کی تقسیم نے ہندوؤں کو اور تنسیخ نے مسلمانوں کو جدید حالات میں مبتلا کر دیا تھا، نواب صاحب کے بھی گردوپیش کی ان

واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی، سیاست ہمیشہ واقعات کے تابع ہوتی ہی، واقعات ہی نے نواب صاحب کو مجبور کیا کہ وہ اعتماد کی پالیسی چھوڑ کر مسلمانوں کو اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرنے کی ترغیب دیں، اگر خود سرسید مرحوم بھی اس زمانہ کو پاتے تو وہی کہتے اور کرتے، جو نواب صاحب نے کہا اور کیا۔

غرض نواب صاحب سرسید کی جماعت کے پہلے شخص ہیں جو اپنی صف سے کسی قدر آگے بڑھ کر سیاسی میدان میں آئے اور اُن نوجوانوں کی رہنمائی کے لئے تیار ہوگئے، جو پولیٹکل امور میں حصہ لینے کے لئے بے چین تھے، انھوں نے ایک طرف تو مسلمان نوجوانوں کو پولیٹکل اُمور میں حصہ لینے کی عام اجازت دے کر مسلمانوں کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا، دوسری طرف مسلم لیگ کی بنیاد رکھکر مسلمانوں کی سیاسی اہمیت ملک اور گورنمنٹ پر واضح کردی، اگر مسلم لیگ قایم نہ ہوتی تو یقیناً مسلمان کانگرس میں شریک ہوجاتے، اور وہاں ابنائے وطن کے مقابلہ میں اُن کی آواز کی جو اہمیت ہوسکتی تھی وہ ظاہر ہی، واقعات نے ثابت کردیا ہی کہ مسلمانوں کے مخصوص حقوق کا مطالبہ کانگرس کے پلیٹ فارم سے نہیں کیا جاسکتا۔

نواب صاحب کلیتہً کانگرس کے مخالف نہ تھے، انھوں نے اپنے مضامین میں کانگرس کی بعض مفید خدمات کا ہمیشہ اعتراف کیا ہی، لیکن اُن کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو اپنی مستقل ہستی قائم رکھنے اور اپنے مخصوص حقوق کی حفاظت کے لئے، ایک علٰحدہ مجلس کی ضرورت ہی، واقعات شاہد ہیں کہ اُن کا یہ خیال صحیح تھا۔

بہرحال نواب صاحب مسلمانوں کی قدیم وجدید سیاست کی ایک درمیانی کڑی تھے اور سب سے پہلے اُن ہی نے مسلمانوں میں مستقل طور پر سیاست کا مذاق پیدا کیا، اور یہ بتایا کہ صرف خدا پر اعتماد کرو، اور جو کچھ کرو اپنی قوّتِ بازو کے بل پر کرو، کیوں کہ

خدا انھیں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔

علالت و وفات، مصائب و افکار اور خانگی حالات

اگرچہ نواب صاحب کی صحت کالج کی خدمت ہی کے زمانہ میں جادۂ اعتدال سے منحرف ہو چکی تھی اور یہی سبب ترک خدمت کا تھا لیکن کالج سے ترک تعلق کے بعد روز بروز انحطاط ہوتا گیا، وہ ۱۹۱۲ء میں کالج سے مستعفی ہو کر وطن آ گئے تھے، لیکن کبھی کبھی تبدیل آب و ہوا اور بحالی صحت کے خیال سے منصوری اور دیرہ دون بھی چلے جاتے تھے، حالت اس کو مقتضی تھی کہ وہ تمام افکار و معاملات سے یکسو ہو کر سکون و آرام سے اپنے زندگی کے بقیہ ایام پورے کریں لیکن جو شخص نصف صدی سے زیادہ تک محنت شاقہ میں مصروف رہا ہو اور از سر تا پا "پیکر عمل" ہو وہ آرام و سکون کو کیوں کر گوارا کر سکتا ہے، اگرچہ وہ باضابطہ طور پر کالج کی خدمت اور دوسرے قومی معاملات سے دستکش ہو گئے تھے اور ایک معمولی قصبہ (امروہہ) میں خانہ نشین تھے، لیکن اب بھی وہ تمام مسلمانانِ ہند کی اُمیدوں کا مرکز تھے، اب بھی قوم کی آنکھیں اُن کی طرف لگی ہوئی تھیں، اب بھی یہ حالت تھی کہ قومی معاملات کے متعلق جو لفظ اُن کے لب و دہن سے نکلتا تھا اُس کی صدائے بازگشت تمام ہندوستان میں سنی جاتی تھی، سر سید کی برہم شدہ بزم کی یہ آخری شمع بھی اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہونے والی تھی، لیکن اس جھلملاتی ہوئی حالت میں بھی نوجوانوں کے لئے رہ نما تھی اور قوم اُس کی دھندلی روشنی میں اپنا راستہ تلاش کر سکتی تھی۔

یہ زمانہ مسلمانوں کے لئے پر آشوب و نازک تھا، مسلم یونیورسٹی کا معاملہ روز بروز پیچیدہ ہوتا جاتا تھا، کالج میں پارٹیاں پیدا ہو چکی تھیں، جدید آنریری سکرٹری اور مقامی ٹرسٹی باہم سرگرم پیکار تھے، بلکہ جدید سکرٹری نے ایک معمولی سے واقعہ پر نواب صاحب سے بھی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی، اور اخبارات میں مضامین شائع کئے جا رہے تھے، اسی زمانہ میں مسجد کانپور کی شہادت کا المناک اور روح فرسا واقعہ پیش آیا، جس نے تمام مسلمانان ہند کو مضطرب بنا دیا اور خود نواب صاحب پر اس کا

گہرا اثر پڑا، بیرون ہند کے مسلمانوں کی حالت بھی الم افزا تھی جنگ بلقان کے بعد عالمگیر جنگ شروع ہوچکی تھی مقامات مقدسہ خطرہ میں تھے، سب سے بڑھ کر یہ کہ خود ہندوستان کے اندر مختلف سیاسی پارٹیاں پیدا ہوگئی تھیں اور شیرازۂ اتحاد بکھر چکا تھا، غرض تمام دنیائے اسلام کا مرقع زیر و زبر ہو رہا تھا، اور امید کی کوئی جھلک بھی کہیں نظر نہ آتی تھی۔

نواب صاحب نہایت متاثر طبیعت کے مسلمان تھے، اُن کا سینہ سوز و گداز سے لبریز تھا ان حالات نے اُن کی صحت پر بُرا اثر ڈالا۔ شدید رُوح فرسا خانگی مصائب و افکار نے اور زیادہ شکستہ دل کر دیا، غرض پے در پے مرض[۱] کے حملے شروع ہوگئے، چند مرتبہ فالج کا اثر ظاہر ہوا، طاقت روز بروز گھٹنے لگی، علاج و پرہیز سے عارضی طور پر کچھ سکون و آرام ہوجاتا تھا، لیکن چوں کہ بتقاضائے عمر قویٰ اضمحل ہوتے جاتے تھے، اس لئے ہر دفعہ جب مرض کا حملہ ہوتا تھا تو پہلے سے زیادہ سخت ہوتا تھا، یہاں تک کہ ۱۹۱۶ء میں فالج کا سخت حملہ منصوری میں ہوا، اور اب طاقت نے بالکل جواب دیدیا، مُرادآباد کے سول سرجن، ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری اور حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب کا علاج ہوتا رہا۔ لیکن موت کا کیا علاج! غرض ایک سال کی پیہم اور سخت علالت کے بعد ساعتِ موعودہ آپہونچی ۲۴ و ۲۵ جنوری کی درمیانی شب میں ایک بجے کے بعد قے ہوئی اور لرزہ آیا، بخار ۱۰۴ ڈگری تک ترقی کر گیا، فوراً صاحبزادہ مشتاق احمد کو جو دہرہ دون میں تھے تار دیا گیا، وہ ۲۶ کو امروہہ آگئے، جس وقت انھوں نے "ابا جان" کہہ کر پکارا تو آنکھیں کھول دیں، اور محبت کے لہجہ میں کہا "آگئے" اس کے بعد پھر غفلت طاری ہوگئی اور یہ حالت ۲۷ تک قایم رہی، لیکن ۲۷ و ۲۸ جنوری کی شب میں پونے دس بجے کے وقت بخار اُتر گیا، لیکن بخار کے اُترتے ہی شمع حیات بھی گل ہوگئی۔

ہر آنکہ زاد بنا چار بایدش نوشید　　ز جام دہر مئے کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ

---

[۱] آنریبل نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب بیان فرماتے ہیں کہ اخیر علالت میں مولوی محمد یعقوب صاحب وکیل مُرادآباد مزاج پُرسی کو تشریف لے گئے تھے، حاضر ہو کر مزاج پوچھا تو جواب میں یہ شعر پڑھا ؎

نہ ڈول ہاتھ سے چھوٹا نہ مشک سینہ سے　　قسم ہے خواجہ کی باز آئے ایسے جینے سے

دن کو جنازہ اُٹھا اور یہ جوہر گرانمایہ امروہہ میں سپرد خاک کیا گیا، نماز جنازہ میں صدہا مسلمان شریک تھے اور جنازہ کی مشایعت میں آبادی کے ہر طبقہ نے حصہ لیا' اس حادثہ نے نہ صرف اُن کے خاندان میں بلکہ تمام اسلامی ہند میں ماتم برپا کردیا، اور ان مفلس خاندانوں اور محتاج و بیکس عورتوں کی گریہ وزاری کا تو کچھ ذکر ہی نہیں کیا جاسکتا، جن کی وہ خفیہ طور پر اعانت کرتے تھے'

علی گڑھ میں ماتم | یہ خبر بڑی سُرعت کے ساتھ علی گڑھ پہونچی اور بقول انسٹی ٹیوٹ گزٹ عین اُس وقت موصول ہوئی جب کہ ٹرسٹی صرف امور مندرجہ ایجنڈا پر غور کرنے کے لئے جمع ہو رہے تھے اور اس جانکاہ سانحہ کے سُننے کے لئے بالکل تیار نہ تھے' اِس خبر وحشت اثر نے تمام سُننے والوں پر کم از کم تھوڑی دیر کے لئے موت کے سکتہ کا عالم طاری کردیا جس سے افاقہ ہونے کے بعد پہلا خیال جس نے بالتواتر تمام دماغوں میں گردش کی یہ تھا کہ مرحوم کا جنازہ علی گڑھ لانے کی کوشش کی جائے چنانچہ امروہہ کو اس مضمون کا تار دیا گیا، اور امروہہ جانے والی سب سے پہلی ٹرین میں طلبہ کی ایک جماعت ادھر روانہ ہوئی تاکہ یہ فدائے قوم اُسی خاک کے سپرد کیا جائے جس کی خدمت میں اُس نے اپنی عمر اور قوی کا بہترین حصہ صرف کیا تھا، لیکن یہ تمام منصوبے اور تمام انتظامات بالکل بعد از وقت تھے (کیوں کہ مرحوم دفن ہوچکے تھے)"

ٹرسٹی صاحبان نے اپنے اجلاس میں تعزیت کا رزولیوشن پاس کیا، دوسرے روز جو سالانہ تقسیم انعام کا جلسہ ہونے والا تھا وہ ملتوی کیا گیا، اسکول اور کالج میں تعطیل دی گئی' تیسرے روز مسجد میں سوم خوانی اور اسٹریچی ہال میں ٹرسٹی' اسٹاف اور طلبہ کا جلسہ تعزیت زیر صدارت پرنسپل صاحب منعقد ہوا۔

صاحب آنریری سکرٹری بہادر نے تعزیت کا رزولیوشن پیش کیا، جس کی تائید صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے کی اور مرحوم و مغفور کی خدمات اور اوصاف حمیدہ کا شمار کرایا اور بتایا کہ :-

علاوہ چند اخلاق فاضلہ کے مرحوم نے خاص طور پر (۱) صداقت (۲) انہماک

اور (۳) ضبط کے اوصاف اپنی پس ماندہ اور ماتم کناں قوم کے لئے بطور ایک مقدس ورثہ کے چھوڑے ہیں"

مسٹر ٹول نے منجانب اسٹاف رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے اُن غیر معمولی صفات کا ذکر کیا جو اُن کے تجربہ میں بہت کم انسانوں میں پائی جاتی ہیں۔

اگرچہ نواب صاحب کی مُسلسل علالت اور مقتضائے عمر کے لحاظ سے یہ خبر غیر متوقع نہ تھی لیکن بااین ہمہ جب یہ خبر شائع ہوئی تو تمام اطراف ہند میں جہاں جہاں مسلمان آبادی ہی اُن کا ماتم کیا گیا اور تعزیت کے جلسے منعقد ہوئے۔

عُلیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال، ہز ہائینس نواب صاحب رامپور، آنریبل پریسیڈنٹ کونسل بھاولپور، پرنس حمید اللہ خاں صاحب بہادر سی ایس آئی نواب صاحب ڈھاکہ، نواب عماد الملک اور اسی طرح ہندوستان کے تمام مشہور سربرآوردہ مسلمانوں نے ہندوستان کے ہر حصہ سے تعزیت اور ہمدردی کے تار اور خطوط صاحبزادہ مشتاق احمدؐ صاحب کے نام بھیجے۔

ہز آنر سر (لارڈ) جیمس مسٹن لفٹنٹ گورنر صوبجات متحدہ نے تعزیت نامہ لکھا کہ:-

"مجھکو آپ کے والد ماجد کی وفات کا حال سُن کر بہت صدمہ ہوا اُنکی زندگی بہت مہتم بالشان تھی، اور اپنی قوم کے لئے اُنھوں نے عظیم جدوجہد کی اور اب عمر طبعی پر پہونچکر اور بڑی عزّت حاصل کرکے وفات پائی، آپ اور آپ کا خاندان میری مخلصانہ تعزیت قبول کیجئے"

ہندوستان کے تمام قومی اخبارات ورسائل نے اس حادثہ پر رنج والم ظاہر کیا اور مرحوم کی عدیم المثال سیرت اور قومی خدمات کے متعلق آرٹکل شائع کئے، ہندوستان کے مشہور علمی رسالہ "معارف" نے جو دار المصنفین اعظم گڑھ سے زیر ادارت مولانا سیّد سلیمان ندوی شائع ہوتا ہی حسب ذیل نوٹ لکھا۔

قافلہ کا آخری مسافر

علم والے علم کا دریا بہا کر چل دیئے | واعظانِ قوم سوتوں کو جگا کر چل دیئے
کچھ سخنور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیئے | کچھ مسیحا تھے کہ مُردوں کو جلا کر چل دیئے

نواب محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبیر و سیاست کا ماتم کیا، مولانا نذیر احمدؒ کے مرنے پر سحر نگاری اور بزم آرائی کا مرثیہ پڑھا، مولانا شبلی کی موت پر ہم نے علم کے فقدان پر نوحہ کیا، مولانا حالی کو رخصت کرتے ہوئے ہم نے سخنوری اور دقیقہ سنجی پر نالہ کیا، لیکن نواب وقار الملک کی رحلت پر ہم قوم کا ماتم کرتے ہیں اور اولوالعزمانہ اخلاق کی گمشدگی پر فریاد!

یہ ہستی گرانمایہ جس نے ہماری دُنیا کو، ۲؍ جنوری ۱۹۱۷ء میں الوداع کہا، ہمارے کارفرما قافلہ کا آخری مُسافر تھا، اِس کے بعد وہ دور جو انقلاب ہند کے بعد شروع ہوا تھا ختم ہو گیا! وہ دَور جو انگریزی کالجوں کی کائنات نہیں بلکہ بوریا نشین مدارس کا نتیجہ تھا منتہی ہو گیا، وہ دور جو قدیم تعلیم اور قدیم اخلاق کے نمونوں کو پیش کرتا تھا منقطع ہو گیا، یعنی آئندہ ہماری قسمت کے مالک عربی مدارس کے شملے نہ ہوں گے بلکہ انگریزی درسگاہوں کے ہیٹ اور جھبے ہوں گے، اب مشرق مشرق کی قومیت پر حکومت نہیں کرے گا بلکہ مغرب، اب لیڈری اور رہبری جمہور کے لئے جوش دل اور اخلاص عمل ضروری نہ ہوگا بلکہ صرف ایک کامیاب عہدہ اور ایک عمدہ سُوٹ!

فیا ویلاہ علیٰ فقد الاسلام ویا خیباہ للمسلمین۔

۲؍ فروری ۱۹۱۷ء کو مرحوم کے ماتم میں دار المصنفین بند رہا، شب کو تمام اہلِ شہر نے دار المصنفین کے ہال میں جلسہ تعزیت کیا، اور دیر تک مقرروں نے اُن کے محاسن و فضائل بیان کئے تمام مجمع سرتاپا اثر تھا، اور اس فقدان عظیم پر متاثر۔

شیعہ جماعت کے آرگن اخبار اثنا عشری دہلی نے لکھا۔

نواب وقار الملک مغفور | "خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"۔

یوں تو جو ہستی بھی تیرِ قضا کا نشانہ بنتی ہے، اس پر ایک نہ ایک آنسو کسی نہ کسی آنکھ سے نکل ہی پڑتا ہے

یہ تو زندے کی ہی خوبی جو کہیں اس کو برا
مرنے والے کے تو سب عیب ہی ڈھک جاتے ہیں

مگر بعض اموات اور وفات ہائے حسرت آیات ایک ملک کو ماتم کدہ اور اہلِ ملک کو سوگوار بنا کر چھوڑتی ہیں موخر الذکر اموات کا زیادہ افسوس اس بنا پر ہوتا ہے کہ موجودہ قحط الرجال میں اگر کوئی بھی قابلِ فخر جگہ خالی ہو جاتی ہی تو اس کو بھرنے والی کوئی شخصیت نظر نہیں آتی ازمنہ حاضرہ میں نواب وقار الملک بہادر کی وفات بھی حادثہ جانکاہ اور واقعہ ہائلہ سے کم نہیں کیوں کہ جن لامثال اوصاف کے لئے آج درجنوں مرثئے تصنیف ہو رہی ہیں اور اخبارات کے صفحے کے صفحے افسوناک الفاظ سے سیاہ پوش نظر آرہی ہیں مرحوم انھیں بھی اپنے ساتھ ہی ایک ایسے عالم اور قبر کے اس تنگ و تاریک گوشے میں لے گئے جہاں جان دیئے بغیر کوئی نہیں جا سکتا۔

مرحوم نے فرایضِ ملیہ اور خدمات اسلام کو بغیر کسی اثر تصنع کے نہایت خلوص کے ساتھ بے لوث انجام دیا، آپ قوم و ملک کے حقیقی اور صمیم قلب سے بہی خواہ تھے انھوں نے ہمیشہ ذاتی سود و بہبود، اغراض و مفاد، نمود و نمائش، خوشامد درآمد کو اپنی سیر چشمی، علو ہمتی، حقیقی عزت و خودداری کی بدولت کبھی پاس بھی نہیں پھٹکنے دیا، اور یہی وہ زریں سبق آموز مثالیں تھیں، جن کے گہرے نقش پا، آج پسماندگان کے قلوب میں آہ سوزاں بن بن کر ابھر رہے ہیں کیوں کہ اب یہ اوصاف کسی دوسرے قومی لیڈر میں مشکل نظر آئیں گے۔

بیشک امروہہ کو اپنے لایق صد فخر نگیں سے بچھڑنے اور علی گڑھ کالج کو اپنے سر سید ثانی کے گم کرنے پر جتنا صدمہ ہو کم ہی، اہلِ امروہہ اور فرزندان مدرسۃ العلوم کو اس امر کا اچھی طرح احساس ہوگا کہ ان کی چشمانِ بصیرت جس صدمۂ جانکاہ میں اشک خونیں بہا رہی ہیں اسی غم سے لاانتہا قلوب متاثر ہیں اور قصبۂ نامرضیہ میں ایک عالم کی ہمدردی اُن کے دامنِ غم سے وابستہ ہی۔ ۔ ۔ ۔ اس قحط الرجال کی گھٹا ٹوپ

تاریکی میں وقارالملک بہادر مغفور کی حیات اگرچہ ایک شمع سحری کا حکم رکھتی تھی مگر افسوس ؎

ظلمت کدہ میں میری شب غم کا جوش ہی
ایک شمع تھی دلیل سحر سو خموش ہی

حیدرآباد کے اخبارات نے بھی اس حادثہ پر دردانگیز مضامین لکھے جن سے معلوم ہوتا ہی کہ باوجودیکہ اُن کو حیدرآباد چھوڑدئے ہوئے چوتھائی صدی گذرچکی تھی لیکن اُن کی بیریا اور مخلصانہ خدمات حیدرآباد کو اب تک یاد تھیں، ہندوستان کے اکثر ہندو اخبارات نے بھی نہایت بہتر الفاظ میں مرحوم کے محاسن و خدمات ملکی کا تذکرہ کیا، لکھنؤ کے مشہور کانگریسی اخبار ہندوستانی نے لکھا کہ

"سر سید احمد صاحب کے بعد کسی مسلمان لیڈر کو مسلمانان ہند کی جانب سے خالص اعتماد، بھروسہ اور تعظیم حاصل کرنے کا وہ فخر حاصل نہیں تھا جو مرحوم کے حصہ میں آیا تھا........

مرحوم کا شمار اُن مسلمانوں میں بھی اوّل تھا جنھوں نے اپنے قومی حقوق کی حفاظت اور نگہداشت کے واسطے جداگانہ مسلم سیاسی جلسہ کی ضرورت محسوس کی تھی اور یہ مرحوم کی تحریک و سرگرمی کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۰۶ء میں بمقام ڈھاکہ مسلم لیڈروں کی کانفرنس منعقد ہونے کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ ظہور میں آئی"

ہندوستان کے قریباً تمام اخبارات نے اُن کے متعلق جو کچھ لکھا اُس کا مشترک ماحصل یہ تھا کہ

(۱) مرحوم مسلمانوں کے سب سے بڑے لیڈر تھے، جو اعتماد قوم کو اُن پر تھا کسی دوسرے پر نہ تھا

(۲) باوجود علالت و ناتوانی اور طبی ممانعت کے آخر تک کام کرتے رہی۔

(۳) ان کی اخلاقی برتری اور کیرکٹر کی خصوصیات۔

اخبارات کے علاوہ قومی مجالس و مدارس[1] نے تعزیت کے رزولیوشن پاس کئے، اور ہندوستان

---

[1] ندوۃ العلما، لکھنؤ کے دارالعلوم میں بھی طلبہ اور اسٹاف نے تعزیت کا رزولیوشن پاس کیا اور دارالعلوم

کے مختلف شہروں میں جلسے منعقد کرکے مسلمانوں نے رنج والم کا اظہار کیا۔

چنانچہ ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے سالانہ اجلاس میں حسب ذیل رزولیوشن پاس کیا،

"یہ کانفرنس مسلمانان ہند کے مسلمہ لیڈر اور واجب الاحترام بزرگ نواب وقار الدولہ وقار الملک مولوی مشتاق حسین مرحوم ومغفور کے ارتحال پُرملال کو ایک قومی مصیبت تصوّر کرتی ہی اور بہ لحاظ اُن بیش بہا اسلامی اور قومی خدمات کے جو مدّت العمر جناب مرحوم نے نہایت خلوص او صداقت اور بے مثال اخلاقی جرأت کے ساتھ اپنی درماندہ قوم کی فلاح وبہبود کے لئے انجام دیں' اور بہ اعتبار ان اسلامی اعلیٰ اوصاف اور خصائل حسنہ اور کیرکٹر کی عدیم المثال خوبیوں کے جن کی وجہ سے مرحوم موجودہ قحط الرّجال میں سلف صالحین کا قابل تقلید نمونہ تھے ان کی رحلت کو ناقابل تلافی نقصان سمجھتی اور مرحوم کے پس ماندگان کے ساتھ دلی ہمدردی ظاہر کرتی ہے"

مسلم لیگ کا رزولیوشن | "آل انڈیا مسلم لیگ مسلمانان ہند کے عظیم الشان اور قابل احترام رہنما نواب وقار الملک بہادر کی موت پر اظہار تاسف کرتی ہی' جو کہ اس لیگ کے اوّلین سکرٹری تھے اور جنھوں نے کہ اپنی تمام زندگی اپنی قوم کی بے غرض خدمت میں وقف کردی تھی اور جن کی مسلمانوں کے حقوق اور مقاصد کی مردانہ وار تحفظ کی کوششوں نے اپنے ہم مذہبوں کے دلوں میں محبت کی ایک پائدار جگہ قایم کردی"۔

شعراء نے بھی اُن کی وفات پر بہت کچھ لکھا، اگر وہ تمام مرثیے قطعات اور رُباعیاں جمع کیجائیں تو ایک رسالہ مُرتب ہو سکتا ہی، ہم اِس موقع پر جناب عزیز لکھنوی کا ایک تاریخی قطعہ اور نواب عزیز جنگ[1] بہادر کے چند اشعار نقل کرتے ہیں۔

بقیہ نوٹ صفحہ ۷۱۲۔ ایک دن کے لئے بند کیا گیا، انجمن حمایت اسلام لاہور کی جنرل کونسل نے بھی اپنے اجلاس میں تعزیت کا رزولیوشن پاس کیا۔ [1] نواب عزیز جنگ کے اشعار میں شاعری کے لحاظ سے بعض کمزوریاں ہیں لیکن مرحوم نے یہ قطعہ مجھکو حیدرآباد میں عنایت کیا تھا اور اس کو کتاب میں شایع کرنے کی خواہش کی تھی اس لئے منتخب اشعار شایع کئے جاتے ہیں۔ ندوی

(تاریخ وفات نوب وقارِ الملک مرحوم)

اے وقار الملک اے مشتاق اقلیم بقا — خادمانِ قوم تیرے میکدہ کے جرعہ نوش
یادگارِ رفتگانِ بانگ درائے کارواں — ہستیِ پُر جوش سرسیّد کی موجِ پُر خروش
مقطعِ اقبال قوم اے انجمن افروز ہند — جانتے تھے تجھ کو فردِ منتخب ارباب ہوش
کشتیِ ہندوستاں کا ناخدا اک تو بھی تھا — بحرِ ہستی میں تری فقدان سے ہے اک خروش
تیرے دم سے مطمئن تھی قوم کے افراد سب — مبتلائے فکرِ فردا اور نہ محوِ رنجِ دوش
تیرے مرتے ہی زمانہ بن گیا ماتم کدہ — سازِ ہستی سے صدا ہوتی ہے اللہ ری خروش
تھی بھری کانوں میں اتنک تیرے نغموں کی صدا — انجمن میں آجتک ہے پُرنوا ہر سازِ گوش
حیف اب اس عہد میں جنسِ وفا نایاب ہے — یوں تو ملتی ہیں بہت گندم نما و جو فروش
یوں تو دیکھی ہیں بہت اس تنگنائے دہر میں — لیڈرانِ فیشن ایبل واعظانِ خرقہ پوش
ہاں مگر اس آئینہ خانہ میں تم کم پاؤ گے — حق پسند و حق شناس و حق پژوہ و حق نیوش
اے ہوائے بزم ساقی آئے ہم اُس دَور میں — ہوگئے رندانِ مے آشام جب ہستی فروش
یادگار ہستی پیرِ مغاں کوئی نہیں — میکدہ ویران بے رونق ہے بزمِ نا و نوش
جس قدر تھے گوش بر آوازِ حیوااللہ رحیل — ہوگئے اس انجمن سے آج وہ سب چشم پوش
دم غنیمت تھا زمانہ میں وقار الملک کا — ہر صدا کو جس کی سمجھے لوگ آوازِ سروش

دل سے نکلا اک دھواں پڑھتے ہی تاریخِ عزیز
ہے جہاں میں آج شمعِ بزم سرسیّد خموش
۱۹۱۷

نواب عزیز جنگ کا قطعہ — نواب عزیز جنگ نے جو اُن کے ساختہ و پرداختہ تھے ایک طویل قطعہ لکھا اس کے منتخب اشعار حسب ذیل ہیں:-

وقار الملک آخر چل بسے افسوس دُنیا سے — ودیعت تھیں صفاتِ نیک بختی جنکی فطرت میں
زکوٰۃ و حج و صلوٰۃ و صوم و اشراق و تہجد سے — بڑے محتاط تھے پابندیِ حکمِ شریعت میں

امارت میں فقیرانہ بسر تھی زندگی اُن کی
نظر آتی تھی اُن کی سادگی طرزِ معیشت میں

صداقت نقش ہی اُن کی قلوبِ اہلِ ایمان پر
قسم کھاتے ہیں اُن کے نام کی عرضِ دیانت میں

کیا کرتے تھے وہ اربابِ حاجت کی خبر گیری
لیا کرتے تھے حصہ بیکسوں کے رنج و راحت میں

عدیل اُن کا نہیں مجموعۂ اوصاف میں کوئی
تحمل انکسار و بُردباری میں متانت میں

بڑے ثابت قدم تھے حادثاتِ دورِ گردوں پر
رہی وہ مستقل اولاد کے غم کی مصیبت میں

زباں سے اُف نہ کی جب مر گیا اُن کا جواں بیٹا
کہا مجھکو نہیں کچھ دخل خالق کی مشیت میں

نہ ہوتا تھا مخاطب کی وجاہت کا اثر اُن پر
بہت مضبوط تھی اسلام کے جوشِ حمیت میں

بھروسہ قوم کو تھا اُن کے قول و فعل پر ہر دم
فدائے قوم تھے ایثار تھا اُن کی طبیعت میں

بُری وقتوں میں ہمدردِ خلائق ذات تھی اُن کی
کیا کرتے تھے دشمن کی مدد وقتِ مصیبت میں

اِس کے بعد درجہ بدرجہ حیدرآباد میں اُن کے مختلف عہدوں پر پہونچنے کا تذکرہ کرکے لکھتے ہیں:

مددگارِ وزیرِ اعظمِ دولت لقب پایا
مددگار اُن کے تھے ہم بھی اسی دورِ حکومت میں

رسائی اور حکومت اُن کی تھی دولت میں لاثانی
وہ مستثنیٰ تھا ساری عہدہ دارانِ ریاست میں

کیا قربان اپنے آپ کو دو بار دولت پر
وفائے سلطنت اعیانِ دولت کی اعانت میں

ندا آئی ولادوقتِ سحر رضوانِ جنت سے
جگہ پائی وقار الملک نے لاریب جنت میں
۱۳۴۵ھ

اہل و عیال ابتدا میں بیان کیا جاچکا ہی کہ نواب صاحب کی شادی اُن کے پھوپا منشی امام الدین صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی تھی' ان بیوی سے نواب صاحب کو خدا نے چار بچے عطا کئے تھے تین لڑکیاں اور ایک لڑکا جن کا نام محمد احمد تھا، ابتدا میں انھوں نے سر سید کے زیر نگرانی علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی اُس کے بعد بیرسٹری کی غرض سے انگلستان بھیجدیئے گئے' وہاں انھوں نے ایک انگلش لیڈی سے نکاح کرلیا، اس کے بعد حیدرآباد واپس آئے اور نواب سر آسمان جاہ کے ایڈی کانگ مقرر ہوئے' پھر مدراس جاکر بیرسٹری شروع کردی' اور نواب صاحب حیدرآباد سے علٰحدہ ہوکر امروہہ آگئے۔

۱۸۹۶ء م ۱۳۱۴ھ میں وہ سخت بیمار ہوئے، نواب صاحب علالت کی خبر پاکر مدراس گئے علاج میں پوری کوشش کی گئی لیکن قضا و قدر کا فیصلہ کیوں کر ٹل سکتا تھا، ۲۰ اگست ۱۸۹۶ء کو بوڑھے باپ کو یکہ و تنہا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور عالمِ غربت میں دفن ہوئے اور نواب صاحب اپنی بیوہ بہو (شارلی) اور پوتی کو لے کر با حسرت و یاس امروہہ چلے آئے۔ مسز محمد احمدؒ شریف طینت اور تعلیم یافتہ لیڈی تھیں، ہمیشہ اپنی نورِ نظر کی تربیت و نگہداشت میں مصروف رہتی تھیں، مذہبی تربیت نواب صاحب کے ذمہ تھی، انھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے بسم اللہ کی تقریب کی، اور تمام کنبہ و برادری کو اس میں مدعو کیا، لیکن ابھی اس تقریب پر چند ماہ سے زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ پانچ سال کی عمر میں یہ بچی بھی ۱۵ ر نومبر ۱۸۹۶ء کو اپنے باپ کے پاس چلی گئی، تخمہ میں مبتلا ہوئی بہت کچھ علاج ہوا، مرادآباد سے سول سرجن بھی بلایا گیا، لیکن لاحاصل۔

اب مسز محمد احمدؒ کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہو گئی، ہندوستان میں رہ کر کیا کرتیں، با دلِ غمزدہ انگلستان روانہ ہوئیں اور ۳۱ دسمبر کو اپنے عزیزوں میں پہونچ گئیں، نواب صاحب صاحب بمبئی تک جاکر رخصت کر آئے۔

بیوی نے پوتی سے قریباً دو ماہ پہلے نواب صاحب کی خانہ ویرانی کی، برسات کا موسم تھا نواب صاحب مع اپنی بہو اور پوتی کے منصوری میں مقیم تھے، دفعتاً بیوی کی علالت کی اطلاع ملی فوراً وطن روانہ ہوئے، اور ۲۰ ستمبر ۱۸۹۶ء کی صبح کو پہونچ گئے، اُسی روز سہ پہر کو بیوی نے انتقال کیا۔ مگر

---

[1] نواب صاحب کی یہ بیوی نہایت نیک و پرہیزگار تھیں، اخبار نیّرِ اعظم مُرادآباد نے ان کی علالت و وفات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:-

"دوری تپ کا دورہ جو انتقال سے ایک دن پیشتر ہوا تھا وہ بہت ہی سخت تھا جس سے ۳ بجے شب کو افاقہ ہوا، اور اس وقت مرحومہ نے کچھ ہوش کی باتیں کیں، لیکن پھر چند لمحوں کے بعد ان لوگوں سے جو ان کے تیماردار تھے کہا کہ "آج میں اپنے گھر کو جانے والی ہوں"، سامعین نے کہا کہ "آپ کا گھر تو یہی ہے" یہ سُن کر مرحومہ نے اِدھر اُدھر گھر کو خوب

(نیّر اعظم ۹ ستمبر ۱۸۹۷ء)

نواب صاحب نے یہ تمام مصائب صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کیے، لیکن اُن کے مصائب کا اسی پر خاتمہ نہیں ہوا، بلکہ یکے بعد دیگرے تینوں لڑکیوں نے بھی انتقال کیا، اور اب وہ بالکل یکہ و تنہا رہ گئے

نواب صاحب خانگی زندگی کے خوگر تھے، اور زمانہ ملازمت میں اہل و عیال کو ساتھ رکھتے تھے اس لئے اِن پیہم حوادث نے اُن کی زندگی بالکل تلخ کر دی، آخر کار انھوں نے اپنے کنبہ کے ایک غریب خاندان میں دوسرا عقد کر لیا، ان بیوی سے دو بچے خدا نے عطا کیے، ایک لڑکا (صاحبزادہ مشتاق احمد)[۱] اور ایک لڑکی، لیکن دست قضا و قدر نے ماں کو اولاد کی پرورش کا موقع نہ دیا، ۱۹۰۶ء میں وہ بھی

غور سے دیکھا اور کہا ''یہ گھر میرا نہیں ہے یہاں تو سب چیزیں بکھری ہوئی پڑی ہیں، تم لوگوں نے میرا گھر کہاں دیکھا ہے دیکھو تو حیران رہ جاؤ وہ گھر بہت ہی اچھا ہے آج میں ضرور اپنے گھر کو جاؤں گی''

پانچ بجے صبح کے دریافت کیا کہ کیا وقت ہے؟ جب معلوم ہوا کہ پانچ بجے ہیں تو کہا کہ ''صبح کی نماز پڑھوں گی'' جواب دیا گیا کہ بہتر ہے تیمم کر لیجئے فرمایا ''میں نے تیمم کر لیا ہے''، یہ کہکر نماز کی نیت باندھی، اور لیٹے لیٹے نماز پڑھی (اس زمانہ علالت میں تمام اوقات کی نماز پڑھی) اس کے بعد کچھ وظیفہ پڑھا پھر کہا کہ ''لوگو کیا اچھا وقت ہے تمام نور پھیلا ہوا ہے، میرا دل نماز پڑھ کر کبھی اس قدر خوش نہیں ہوا تھا جیسا کہ اس وقت خوش ہوا ہے'' اور پھر اس وقت کی بہت کچھ ثنا و صفت کرتی رہیں، اور پورے ہوش میں آگئی تھیں، اور تا طلوع آفتاب اسی طرح ہوش میں رہیں کہ یقین ہو گیا کہ طبیعت صحت کی طرف ترقی کر رہی ہے، لیکن یہ سنبھالا تھا، جیسے دن چڑھتا جاتا تھا، تپ دوری ترقی کرتی جاتی تھی، ۸ بجے دن کے حرارت ۱۰۱ ڈگری پر اور ۳ بجے دن کے ۱۰۴ ڈگری پر تھی ۳½ انتقال ہوا''۔ ۱۲

(نقوش زندگی، ص ۱۸۰)

[۱] صاحبزادہ مشتاق احمد ۶ ار نومبر ۱۹۰۰ء یوم جمعہ کو پیدا ہوئے اور نواب صاحب کی وفات کے بعد حصول تعلیم کے لئے انگلستان چلے گئے جہاں سے بی اے، اور بیرسٹر ہو کر ہندوستان واپس آئے، یہ امر باعث مسرت ہے کہ نواب صاحب کی تربیت کا پورا اثر اُن کی عادات و زندگی میں ہے خدا کرے وہ اپنے نامور باپ کے صحیح جانشین ثابت ہوں۔ ندوی

دنیا سے رخصت ہوگئیں اور دو خورد سال بچوں کی پرورش نے نواب صاحب کو اور زیادہ خانگی مشکلات میں مبتلا کردیا۔

۱۹۱۰ء میں نواب صاحب نے اپنی برادری کے ایک عسیر الحال خاندان میں تیسرا نکاح میرٹھ میں کیا، ان مطلقہ بیوی کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں پہلے شوہر سے موجود تھیں، اس نکاح نے نواب صاحب کو بہت سی مشکلات اور گرانبار مصارف میں مبتلا کردیا، اور اُن کی زندگی جہاں تک معلوم ہے اطمینان سے نہیں گزری، ان بیوی سے کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی، وفات کے وقت اُنھوں نے صرف دوسری بیوی کے دو بچے چھوڑے۔



ترکہ وجائداد | مسلسل علالت نے نواب صاحب کو زندگی سے مایوس کردیا تھا، اس لئے انھوں نے بہ نظر احتیاط رفع نزاع کے خیال سے جون ۱۹۱۵ء میں اپنی جائداد شرعی طور پر تقسیم کردی، جو جائداد اُن کو ترکہ میں ملی تھی وہ زیادہ آمدنی کی نہ تھی، لیکن انھوں نے حیدرآباد کی ملازمت کے زمانہ میں پہلی بیوی کے زرمہر سے جو رفتہ رفتہ ادا کیا تھا، کچھ جائداد بیوی کے نام سے خریدی تھی، اُن کے انتقال کے بعد نواب صاحب اپنے حصہ سے (جو ان کو پہونچتا تھا، اپنی دو لڑکیوں عزیز فاطمہ اور اشتیاق فاطمہ کے حق میں دست بردار ہوگئے، اس کے بعد منجھلی لڑکی عزیز فاطمہ کا انتقال ہوا، تو اپنا حصہ نواسی کو دیدیا اور اشتیاق فاطمہ کو علیحدہ جائداد دی کیوں کہ وہ زیادہ ضرورت مند تھیں، بڑی لڑکی مشتاق فاطمہ کی اولاد میں ایک لڑکی اور ایک لڑکا تھا، نواب صاحب نے ان کو بھی محروم نہیں رکھا، لیکن بعض وجوہ سے جو جائداد نواب صاحب نواسہ کو دینا چاہتے تھے وہ نواسہ کی بیوی کو دی۔

اب جو جائداد اُن کے پاس رہ گئی اُس کی سالانہ آمدنی بعد منہا کرنے مال گزاری اور دیگر مصارف کے [illegible] تھی اور قیمت تخمیناً [illegible] یہ جائداد نواب صاحب نے وقف علی الاولاد کردی، اور اُس کی آمدنی کا مستحق مطابق حصہ شرعی بعد وضع مصارف خیر (جس کی تفصیل دستاویز میں لکھدی تھی) اپنے لڑکے اور لڑکی کو قرار دیا، اور اُن کے بعد اُن کی اولاد کو، اور اپنی وفات کے بعد اپنے منجھلے داماد

مولوی محمد صبغۃ اللہ بی اے کو متولّی قرار دیا، بشرطیکہ مشتاق احمدؐ اُس وقت ۲۲ سال سے کم عمر ہوں یا یورپ کی تعلیم سے فارغ نہ ہوئے ہوں۔

موجودہ بیوی کا مہر نکاح کے وقت صمہ سہ تھا جس میں انھوں نے اضافہ کرکے دس ہزار کردیا تھا، جو بتدریج ۲۵ فروری ۱۹۱۵ء تک ادا ہوچکا تھا، لیکن اُن کے مرنے کے بعد جو آٹھواں حصّہ بیوی کو پہونچنے والا تھا اس کے لئے لعہ ماصہ علیحدہ تجویز کردیا تھا تاکہ اس کی جائداد بیوی کے لئے خرید دی جائے اور جائداد موقوفہ سے بیوی کو کچھ تعلق نہ رہے۔

انھوں نے حیدرآباد کے مکانات سرکار نظام کے ہاتھ فروخت کردیئے تھے، منجملہ اس کی قیمت[1] کے قریباً صہ الہ آباد بنک کی شاخ مُرادآباد میں جمع تھا اس میں سے ۳۰ ہزار روپیہ انھوں نے اسی دستاویز کی رُو سے وقف کا جز قرار دیا، تاکہ اس کی جائداد زرعی خرید کر شامل وقف کی جائے اور لعہ ماصہ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا بیوی کے لئے مخصوص کردیا، باقی ماندہ ادائے قرضہ اور دوسری ضروریات کے لئے محفوظ رکھا۔

جائداد کے علاوہ جو مکانات رہ گئے وہ صاحبزادہ مشتاق احمدؐ کو ہبہ کردیئے اور اُس میں بیٹی کو جو حصّہ پہونچتا تھا اس کے معاوضہ میں اُن کو صما نقد دیدیا، اسی وقف نامہ میں صاحبزادہ مشتاق احمدؐ کے بغرض تعلیم یورپ بھیجنے کا انتظام بھی تجویز کردیا تھا اور اس کے لئے ایک کمیٹی بناکر اُس کے ممبر بھی نامزد کردیئے گئے تھے۔

وقف نامہ کی تکمیل کے بعد نواب صاحب نے اس کو مع ایک تمہید کے جو بعنوان گزارش لکھی گئی تھی ایک رسالہ کی صورت میں شائع کیا، گزارش میں لکھتے ہیں۔

> "میں نے حال میں اپنی جائداد واقع امروہہ ضلع مُرادآباد کا انتظام بموجب قانون وقف علی الاولاد کیا ہے اور اس کی رجسٹری بھی قانون کی رُو سے ہوگئی ہے اب میں اس کو اپنے عزیزوں اور دوستوں اور عامۂ اہلِ اسلام کی اطلاع اور توجہ

---

[1] جو مکان اعلیٰ حضرت کا عطیّہ تھا وہ سرکار نظام نے ۲۰ ہزار کلدار میں خرید لیا تھا۔

کی غرض سے چھاپتا ہوں۔

مسلمانوں کی بہت سی جائدادیں تلف ہو چکی ہیں اور جو گھر کسی زمانہ میں دولتمند کہلاتے تھے آج نہایت غربت اور افلاس کی حالت میں ہیں اور ان میں سی کتنے ہی اس وقت نان شبینہ کو محتاج ہیں اور اگر یہی حالت خدانخواستہ چندے باقی رہی تو معلوم نہیں کہ مسلمانوں کا انجام کیا ہوگا لیکن خدا کا شکر ہی کہ لارڈ ہارڈنگ بہادر بالقابہ کی گورنمنٹ کی مُربیانہ توجہ اور بعض دیگر بزرگان قوم کی حسن سعی سے جن میں جناب مولانا **شبلی** مرحوم و مغفور کا نام نامی ہمیشہ یادگار رہیگا، حال میں وقف علی الاولاد کا قانون جو جاری ہوا ہی وہی صرف ایک ایسی تجویز ہی جس سے اگر مسلمان مستفیض ہوں تو آیندہ کے لئے اس تباہی سے محفوظ رہ سکتے ہیں ورنہ دوسری کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اور اس میں جس قدر ممکن ہو نہایت جلدی سے کام لینا چاہیئے۔ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہی معلوم نہیں کہ کس وقت ہم اس دُنیا سے رخصت ہو جائیں۔ لہذا جو کچھ انتظام کرنا ہی اس کو اپنے سامنے تکمل کرنا چاہیئے۔ میری اپنی حالت مسودۂ وقف نامہ کی تیاری کے اثنا میں یہ تھی کہ جس وقت سے مجھ کو اس کا خیال پیدا ہوا، اس وقت کے بعد سے میرا ایک دن بھی اس فکر اور اندیشہ سے خالی نہ جاتا تھا کہ اگر آج ہی میرا وقت آخر آ پہونچے تو یہ سب خیال دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ اور وہ تمام خطرات اصلی واقعات کی صورت میں رُونما ہوں گے جن سے گھروں کی تباہیاں یقینی ہوتی ہیں۔ اولاد کم سن اور ناتجربہ کار، اور خود غرض لوگوں کی فتنہ پردازیاں چاروں طرف میرے پس ماندگان کو گھیرے ہوئے ہوں گی۔ مقدمہ بازیاں ایک دم میں گھر کا صفایا کر دیں گی۔ یہ خیالات مجھ کو بہت زیادہ پریشان کرتے تھے اور اتفاق وقت سے ایسے واقعات پیش آتے چلے جاتے تھے جو کارروائیوں

میں یکے بعد دیگرے حارج ہوتے جاتے تھے۔ دوسری طرف میری شدید بیماریاں مجھ کو اور بھی سخت کمزور کئے دیتی تھیں۔ کوئی چیز اگر اس مصیبت کے وقت میں میرے دل کو قوی کرنے والی تھی تو وہ صرف اپنے خدا پر بھروسہ تھا کہ وہی ان مصیبتوں سے نجات دینے والا اور **وقف نامہ** کو تکمیل کی حالت میں پہونچانے والا ہی بارے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہی بلکہ اس کا شکر ادا ہی نہیں ہو سکتا ہے کہ اس نے ان تمام مشکلات کو بحسن وخوبی رفع کر دیا اور وقف نامہ کی رجسٹری سب رجسٹرار امروہہ کے دفتر میں بتاریخ ۹ رجون ۱۹۱۵ء مطابق ۲۵ رجب ۱۳۳۳ھ نبوی صلعم کو معہ اس کے ضمیموں کے جو اس وقف نامہ کے ساتھ چھاپے جاتے ہیں۔ عمل میں آگئی اور ایک بڑے مرحلہ سے مجھ کو سبکدوشی حاصل ہوئی۔ اور اب میری دعا یہ ہی کہ جس طرح خدا نے میرے دل میں اس ارادہ کو ڈالا اور اس کا انتظام میرے ضعیف ہاتھوں سے کرا دیا اسی طرح خداوند تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہر مسلمان کے دل میں اس خیال کو پیدا کرے اور اس کو انجام پر پہونچانے کی توفیق بخشے۔

میری جائداد جس کا میں نے یہ انتظام کیا ہی تقریباً دو سو روپیہ ماہوار منافع سے زیادہ کی نہیں ہی اور آیندہ جو اضافہ اس میں اور متوقع ہی وہ سب ملا کر پونے تین سو روپیہ ماہوار منافع کا تخمینہ کیا جاتا ہی۔ میری پنشن جو قریباً چھ سو روپیہ سکہ کلدار ماہانہ کے ہی، وہ بالکل ناپائیدار چیز ہے ان حالات میں اس وقف نامہ کا خیال بسا اوقات میری ہمت کو توڑ دیتا تھا حقیقت میں اس قسم کے انتظامات ان مواقع پر زیادہ زیبا ہیں جہاں منافع کی تعداد بہت زیادہ ہو۔ پھر بھی میں نے خیال کیا کہ جب ایک دفعہ اس ارادہ کا اظہار میری طرف سے ہو چکا ہی تو اس کو چھوڑ دینا بھی ہمت کے خلاف ہی، اگر یہ بہت قلیل مقدار منافع کی اس قسم کے انتظاموں کے لئے موزوں نہیں تو ممکن ہی کہ دوسرے خدا کے بندے جن کو اللہ جل شانہٗ نے اپنے فضل وکرم

سے کافی دولت مندیاں دی ہیں اس نمونہ کی تقلید کریں اور اپنے گھروں کو تباہیوں
سے بچانے میں کوشش کریں"

اعلیٰحضرت آصفجاہ سابع کے حضور میں ایک عرضداشت

نواب وقار الملک نے اپنا تمام زمانہ ملازمت نہایت دیانتداری سے بسر کیا، تنخواہ کے علاوہ اُن کی کوئی بالائی آمدنی نہ تھی، اس لئے حیدرآباد میں بھی وہ عسرت کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے، ایسی حالت میں اُن کے پاس اس قدر روپیہ کہاں پس انداز ہو سکتا تھا کہ وہ کوئی جائداد خریدتے یا آمدنی کے وسائل کو ترقی دیتے، جو کچھ وہ خرید سکے وہ بھی اس وجہ سے کہ ان کو بعض اوقات غیر معمولی طور پر کافی روپیہ مل گیا مثلاً پہلی برخاستگی کے بعد جب دوبارہ حیدرآباد گئے تو چند سال کی دفتری کارروائیوں کے بعد ان کو تین سال کی تنخواہ زمانہ خانہ نشینی کی مل گئی یا جب وہ حیدرآباد سے استعفادے کر واپس آئے تو نواب سر آسمانجاہ نے اُن کے مکان کا فرنیچر اصلی قیمت پر خرید لیا اور یہ فرنیچر بھی اعلیٰحضرت کا عطا کیا ہوا تھا، آخر میں انھوں نے اپنے مکانات فروخت کر دیئے، لیکن باوجود اس کے اُن کی جائداد کی آمدنی اس قدر نہ تھی جو صاحبزادہ **مشتاق احمدؒ** کی یورپ کی تعلیم کے لئے کافی ہو۔

ان حالات سے متاثر ہو کر انھوں نے **اعلیٰحضرت نظام خلد اللہ ملکہ** کے حضور میں ایک مفصّل درخواست پیش کی جس میں اپنے تمام خانگی حالات، آمدنی کی کیفیت اور علالت وغیرہ کا تذکرہ کرنے کے بعد دولت آصفیہ کے احسانات کا تذکرہ کیا ہے، پھر مشتاق احمدؒ کی تعلیم کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ

"ایک وہ زمانہ تھا کہ اپنے بڑے فرزند محمد احمدؒ مرحوم کی تعلیم یورپ اور بیرسٹری وغیرہ کے اخراجات کے واسطے جب کہ سرکار عالی کے متعدد عہدہ داروں کو تعلیمی وظائف دیئے جارہے تھے اپنی بیش قرار تنخواہ کے لحاظ سے اس قسم کی کسی درخواست کے پیش کرنے کی جرأت نہ کی اور میں نے باوجود اپنے دوستوں کے مشورہ کے جو کچھ خرچ ہوا اپنی ذات سے کیا، اس وقت کی حالت کے لحاظ سے سوائے اس کے کہ سرکار عالی سے امداد کی درخواست کی جائے اور کوئی چارہ نظر نہیں آتا اور یہ امر کہ وہ امداد کیا ہوگی

یہ سب سرکارِ عالی کی غریب پروری اور شاہانہ فیاضی پر منحصر ہے
عرض کرنے کی حاجت نہیں کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند۔"

یہ درخواست سر فریدون الملک بہادر کے ذریعہ سے بارگاہِ خسروی میں پیش ہوئی اور اعلیٰ حضرت نے اپنی ضرب المثل شاہانہ فیاضی اور قدردانی سے صاحبزادہ مشتاق احمد کی تعلیم ہندوستان کے لئے سو روپیہ اور تعلیم یورپ کے لئے ڈھائی سو روپیہ ماہوار منظور[1] فرمائے اور اپنے وفادار اور دیرینہ سال ملازم کو زندگی کی آخری گھڑیوں میں مایوس نہیں کیا، سلاطینِ دولتِ آصفیہ کی یہی شاہانہ فیاضیاں ہیں جو لوگوں میں وفاداری بلکہ جاں نثاری کا جذبہ پیدا کر دیتی ہیں یہ واقعات دیکھ دیکھ کر بے اختیار اسلام کے عہدِ گزشتہ کی تاریخ کا مرقع ہمارے سامنے آجاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ تاریخ اپنے صفحات الٹ الٹ کر ہمارے سامنے لا رہی ہے۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس وفادار ملازم نے اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں میں اپنے محبوب آقا کو کیسی دُعائیں دی ہوں گی اور شکرگزاری کے کیسے کیسے جذبات اُس کے دل میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

عقائد نواب وقار الملک اگرچہ آغازِ شباب سے سرسیّد کے شریکِ کار تھے اور تعلیمی تحریک میں اُن کے سرگرم ہم آہنگ تھے اور ہمیشہ خلوت و جلوت میں اُن کا نیازمندانہ ادب ملحوظ رکھتے تھے لیکن باوجود ان تعلقات کے وہ کسی مذہبی مسئلہ میں بھی سرسیّد کے ہم خیال نہ تھے اور سرسیّد کو خود بھی یہ بات معلوم تھی، غرض جہاں تک مذہب کا تعلق تھا وہ جدید روشنی سے قطعاً متاثر نہ تھے، عقائد و اعمال دونوں کے لحاظ سے وہ حنفی المذہب تھے اور حنفی عقائد میں اس درجہ پختگی تھی کہ انھوں نے وقف نامہ میں یہ شرط لکھدی تھی کہ متولی حنفی المذہب ہو اور اگر حنفی مذہب ترک کر دے تو وہ تولیت سے برطرف کر دیا جائے۔

البتہ اُن کو بدعادت سے اجتناب تھا تاہم مذہبی چیزوں کی معتقدانہ حیثیت سے عزت کرتے تھے،

---

[1] زمانہ جنگ میں اس وظیفہ میں اضافہ بھی فرمایا گیا، اس کے علاوہ مرحوم کے دو نواسوں کا وظیفہ بھی مقرر ہوا اور سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ اعلیٰ حضرت نے اُن کی بیگم صاحبہ کو مرحمت فرمایا۔ ندوی

ایک دفعہ نواب محمد اسحٰق خاں صاحب پر جب وہ کالج آنریری سکریٹری مقرر ہونے والے تھے کسی نے اعتراض کیا کہ وہ ضعیف الاعتقاد ہیں کیونکہ ایک موقع پر جب کسی چالاک شخص نے بعض چیزوں کو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کیا تو نواب صاحب نے ان چیزوں کی بہت تعظیم و تکریم کی اور بعد کو معلوم ہوا کہ اُس شخص نے فریب دیا تھا۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

"تبرکات اور بزرگان دین کے ساتھ حسن عقیدت کی نسبت یہ ہے کہ کون مسلمان ہے جو اس کی دل سے قدر نہیں کرتا۔ جو لوگ میرے خیالات اور عقائد پر زیادہ تفصیل سے مطلع ہیں ان میں بعض حضرات مجھ کو وہابی سمجھتے ہیں لیکن مجھ تبرکات کے متعلق مجھکو بھی اس قسم کی اطلاع ملتی تو میرا طرز عمل بھی ایسا ہی ہوتا جیسا کہ نواب صاحب ممدوح کی شکایت کی جاتی ہے اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی مسلمان کیسے اس کے خلاف کچھ کر سکتا ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ ان چیزوں کے تبرکات ظاہر کرنے میں کسی شخص نے فریب دیا ہو تو یہ بالکل علیحدہ امر ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ نواب صاحب ممدوح کے سامنے وہ مقدمہ ہوتا اور نواب صاحب کو ثابت ہو جاتا کہ اس میں فریب کیا گیا ہے تو غالباً وہ خود مجرم کو نہایت سخت سزا دیتے۔

اور ان معاملات میں غلو کا ہونا، یہ ایک عشق کا مرتبہ ہے، اس کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ اس کے دل میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا عشق نہ ہو۔ اتباع سنت میں جو غلو کیا جاتا ہو وہ کیا ہے؟ وہ بھی ایک عشق کا درجہ ہے اس زمانہ میں اگر کسی مسلمان میں یہ اوصاف موجود ہوں تو اس کی قدر کرنی چاہیے۔"

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کا مسلک کیا تھا۔ بے شبہ وہ حنفی تھے لیکن بدعات سے مجتنب رہتے تھے اور مروجہ رسوم مثلاً سوم و چہلم اور برسی وغیرہ کے معتقد نہ تھے۔ وہ وسیع خیال اور فراخ دل تھے مگر شرعی مسائل میں نہایت محتاط تھے۔ اُن کا روپیہ بنک میں رہتا تھا مگر سود نہیں لیتے تھے بلکہ وقف نامہ میں بھی اس کی ممانعت کر دی تھی۔ بزرگان دین کی عظمت کرتے تھے اور وہ خائف

واورادکے بھی قائل تھے، پنجاب کے ایک بزرگ سے اُن کو عقیدت تھی، انھوں نے ایک وظیفہ اسم اعظم کے نام سے بتایا تھا جس کو نماز کے بعد پڑھتے تھے، اُن بزرگ نے ۱۸۸۹ء میں جب یہ اسم اعظم بتایا تو اسی سلسلہ میں لکھا۔

"حرام سے پرہیز اور اکل حلال سے بسر کرنا ضرور ہی، گو کہ ہمارے خاندان میں بلا ادخال خاندان کوئی چیز عطا نہیں کی جاتی مگر تمہاری تقدیر یاور ۔۔۔۔۔ با اعتقاد نماز پنجگانہ میں موافق کتاب معظمہ متبرکہ کے پڑھنا، چند روز میں درجہ اعلیٰ پر پہونچ جاؤ گے اگر اعتقاد نہ ہو فوراً واپس بھیج دو۔"

نواب صاحب نے جواب میں جو طویل خط لکھا اُس میں لکھتے ہیں۔

"میں نے اس کو موکلوں کے سلسلہ سے الگ کر کر رحمانی طریقہ میں شروع کیا ہی جس میں جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک کا دخل ہی، مجھ کو یہی طریقہ پسند ہی اور حضرت کی توجہ اور خدا کی مہربانی سے اس طریقہ میں کامیابی دارین کی اُمید کرتا ہوں۔"

غرض نواب صاحب ایک پختہ عقیدہ حنفی المذہب اور پابند سنت مسلمان تھے، اور اُن کے مذہبی عقائد شکوک و شبہات سے بالاتر تھے، اور جزو زندگی۔



عبادات | **نواب صاحب** تمام مذہبی احکام اور فرائض کے سختی سے پابند تھے، اور بچپن سے وفات تک برابر پابند رہے، وہ کسی مشکل سے مشکل وقت میں بھی مذہبی فرایض کے ادا کرنے سے قاصر نہیں رہتے تھے، ہم اس موقع پر اختصار کے ساتھ اُن کی مذہبی پابندی کا تذکرہ کریں گے۔

نماز کی پابندی | نماز کے وہ ایسے پابند تھے کہ کوئی بڑے سے بڑا دین دار عالم بھی اس سے زیادہ پابند نہیں ہو سکتا، وہ کیسے ہی ضروری اور اہم کام میں مصروف ہوں جہاں نماز کا وقت آتا پورے اطمینان کے ساتھ نماز میں مصروف ہو جاتے، سفر میں ہمیشہ جانماز ساتھ رہتی تھی، اُن کے ہموطن

مولوی سید احمد حسین صاحب زینبی جو ابتدا میں بہت زمانہ تک حیدرآباد میں اُن کے ساتھ رہے بیان فرماتے ہیں کہ :۔

"اتنی مدت کی یکجائی میں اُن کے کاروبار اور پابندی اوقات کو بھی دیکھا، اُن کا معمول تھا کہ اکثر باوضو رہتے تھے، مگر ہر نماز کے وقت تازہ وضو بھی کرتے تھے نماز کے وقت ہر ایک ضروری کام کو چھوڑ کر نماز ادا کرتے تھے، اوقات کی تقسیم اس طرح تھی کہ شب کو ۲ بجے اُٹھ کر اپنے ہاتھ سے لیمپ روشن کرتے تھے، روشنی کا سامان پہلے سے میز پر مہیا رہتا تھا، اُس کے بعد وضو کر کے نماز تہجد ادا کرتے تھے، پھر کسی قدر وظیفہ پڑھ کر قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے، پھر صبح صادق نمودار ہوتے ہی اوّل وقت نماز صبح ادا کرتے، اُس کے بعد پھر وظیفہ میں مشغول ہو جاتے، آفتاب طلوع ہونے پر نماز اشراق ادا کرتے پھر کچھ کاغذات لے کر کچہری چلے جاتے وہاں سے اکثر ۱۲ بجے تشریف لاتے، فوراً کھانا کھا کر قیلولہ فرماتے پھر اوّل وقت نماز ظہر پڑھ کر کچہری چلے جاتے، اور قریب غروب وہاں سے تشریف لاتے نماز مغرب میں چند منٹ باقی رہتے تھے، اتنی دیر مکان کی چھت پر چہل قدمی کرتے، غروب کے بعد ہم سب کے ساتھ نماز مغرب باجماعت ادا کرتے، پھر سب لوگوں کے ساتھ دستر خوان پر کھانا کھاتے اُس کے بعد اُن لوگوں سے جو ملاقات کے لئے آتے ملاقات کرتے، پھر ۸ و ۹ بجے کے درمیان نماز عشا پڑھ کر فوراً سو جاتے۔ ۔ ۔ ۔ میں نے آٹھ مہینے کی مدت میں کبھی اس التزام میں فرق نہیں پایا مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ سات وقت کی نمازیں کبھی اُن کی کوئی نماز قضا ہوئی ہو۔"

حیدرآباد کے آخری زمانہ کے حالات مولوی محمد عبداللطیف خاں صاحب (نواب لطیف یار جنگ) ناظم آبکاری ممالک سرکار نظام اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ :۔

"اکثر اوقات رات کے ۱۱ بجے تک سرکاری کام کرتے تھے، اور پھر صبح
کے چار بجے کے اندر اُٹھ کر تہجدّ اور نماز صبح پڑھ کر لیمپ کی روشنی میں تلاوت
قرآن کرتے تھے۔ دن نکلے تازہ وضو سے نماز اشراق وچاشت پڑھتے تھے
یہ اُن کا نظام الاوقات تھا، بحالت سخت علالت پلنگ پر لیٹے بیٹھے بھی یہی عمل تھا
۱۰۴ درجہ کے بخار میں بھی یہی حالت تھی۔"

جماعت کا بھی حتی الامکان اہتمام رکھتے تھے یہاں تک کہ لوگوں نے اعلیٰحضرت کے سفر میں اسپیشل ٹرین ٹھیراکر ان کو جماعت سے نماز پڑھتے دیکھا ہی، کبھی ایسا ہوتا کہ وہ اعلیٰحضرت کے حضور میں ہوتے اور نماز کا وقت آجاتا تو فوراً اجازت لے کر باہر چلے جاتے اور نماز سے فارغ ہو کر واپس آتے۔

وہ نماز میں حضور قلب کے متمنّی تھے چنانچہ ۱۲۹۳ھ میں ایک بزرگ کو لکھتے ہیں۔

"ایک بات میں، میں حضرت کی توجہ اور چاہتا ہوں ایسی توجہ فرمایئے کہ
میری نماز حضور قلب سے ادا ہو سکے اور اس میں ذائقہ معلوم ہونے لگے یہ بات
اب تک مجھ کو حاصل نہیں ہی۔"

ہمارا خیال ہی کہ خدا نے ان کو یہ نعمت عطا کی ہوگی۔

آخری زمانہ میں جب کہ ہوش وحواس قریباً رخصت ہو چکے تھے، نماز کا خیال اُن کو بے چین کر دیتا تھا، غلبہ مرض کی حالت میں جب وضو کرنے سے معذور ہو گئے تھے، تیمم کر کے بیٹھ کر نماز پڑھتے سجدہ کے لئے سامنے تکیہ رکھ دیا جاتا، جب اس کی طاقت بھی نہ رہی تو لیٹے لیٹے اشارہ سے پڑھتے اور کمر سے تکیہ لگا دیا جاتا، غفلت کی حالت میں جب ہوش آتا وقت ہو یا نہو اشارہ سے نماز ادا کرتے، اور اس نیم بیہوشی بلکہ غفلت کی حالت میں اَلاَ بِذِکرِ اللّٰہِ تَطمَئِنُّ القُلُوب وردزبان رہتا تھا
اللہ! اللہ! کیسے پاک اور برگزیدہ بزرگ تھے کہ جو کام بچپن میں شروع کیا اُس کو بستر مرگ تک نباہا، کیا ہمارے زمانہ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے اِس میں کوئی سبق ہی؟

یہ بھی ایک واقعہ ہی کہ جو لوگ اُن کی صحبت میں زیادہ رہی وہ بھی ہمیشہ کے لئے پابند نماز ہوگئے

نواب عزیز جنگ (مرحوم) جو برسوں تک اُن کے ساتھ رہے مجھ سے فرماتے تھے کہ

"وہ (نواب صاحب) جہاں جس محکمہ میں رہے تمام ماتحت حتیٰ کہ چپراسی بھی نمازی ہو گئے، نماز عموماً جماعت سے پڑھتے اور چپراسیوں کو اپنے ساتھ صفِ اولین میں شامل کرتے"

روزہ | رمضان المبارک کے روزوں کے سختی سے پابند تھے، خواہ کیسا ہی گرم اور تکلیف دہ موسم ہو روزہ ترک نہیں کرتے تھے، نواب عزیز جنگ کا بیان ہے کہ

"جب تک حیدرآباد میں رہے کوئی رمضان بغیر تراویح اور قرآن مجید کے خالی نہ گیا"

زکوٰۃ | زکوٰۃ کے پورے پابند تھے، اور ہمیشہ مقررہ وقت پر ادا کرتے تھے، لیکن چوں کہ اُن کے مصارف قریباً آمدنی کے برابر تھے اور برابر اپنے وطن اور کنبہ کے حاجتمند لوگوں کی خفیہ طور پر مدد کرتے رہتے تھے اور بعض طلبہ کی بھی امداد کرتے تھے اس لئے اُن کے پاس کوئی زیادہ رقم سال بھر نہیں رہتی تھی، لہٰذا زکوٰۃ کی مقدار قلیل ہوتی تھی وہ عموماً اس رقم سے موسم سرما میں رضائیاں بنوا کر حاجتمندوں کو تقسیم کرتے تھے۔

حج | کثرتِ مصارف اور دوسری مجبوریوں کی وجہ سے اُن کو زمانہ ملازمت میں "حج" کا موقع نہ ملا، سبکدوش ہونے کے بعد بھی وہ باوجود کوشش چند سال تک اس ارادہ میں کامیاب نہیں ہوئے، نواب عزیز جنگ (مرحوم) جن سے اُن کے تعلقات آخر وقت تک رہے، فرماتے تھے کہ مجبور ہو کر انھوں نے حیدرآباد والا چھوٹا سا مکان میری معرفت خاص اسی ضرورت سے فروخت کیا اور کچھ روپیہ اپنے پاس تھا، جب اس طرح کافی روپیہ فراہم ہو گیا تو حج کو گئے، نواب عزیز جنگ پورے یقین کے ساتھ یہ بھی بیان کرتے تھے کہ اس سفر میں انھوں نے ۳۰ ہزار روپیہ صرف کیا جس کو بڑا حصہ مقاماتِ مقدسہ میں امورِ خیر پر خرچ ہوا معلوم نہیں نواب عزیز جنگ کا یہ بیان کس ذریعہ پر مبنی تھا، لیکن اس

میں شک نہیں کہ اس سفر میں انھوں نے پوری فیاضی سے روپیہ صرف کیا، تین شخص (ملازمین وغیرہ) اُن کے ہمسفر تھے جن کا کرایہ اُنھوں نے ادا کیا، اور اپنا ٹکٹ فرسٹ کلاس کا لیا۔

نواب صاحب ۲۸ شوال ۱۳۲۴ھ م ۲۴ دسمبر ۱۹۰۳ء کو بقصد حج و زیارت امروہہ سے روانہ ہوئے اور علی گڑھ قیام کرتے ہوئے ۲۷ دسمبر کو بمبئی پہونچے یہاں ۲۸ سے کانفرنس کا سالانہ اجلاس شروع ہونے والا تھا، نواب محسن الملک بمبئی میں موجود تھے انھوں نے عمدہ طریقہ سے استقبال کیا نواب صاحب نے روزانہ اجلاس میں شرکت کی اور اُس کے بعد بعض احباب کے یہاں ڈنر اور دعوت وغیرہ میں شریک ہوئے، اِس کے بعد دس روز تک کسی قدر تکلیف سے قرنطینہ میں رہنا پڑا، ۱۷ جنوری ۱۹۰۴ء کو جہاز "گلف" پر روانہ ہوئے، ۲۵ کو "عدن" اور ۲۸ کو "کامران" پہونچے یہاں پھر قرنطینہ میں داخل ہوئے جس سے ۶ فروری کو نجات ملی، ۹ فروری کو جدہ پہونچے اور یہاں سے ۱۴ کو روانہ ہوکر ۱۵ فروری م ۲۷ ذیقعدہ کو عصر کے وقت مکہ معظمہ میں داخل ہوئے، مکہ معظمہ سے جو پہلا خط اپنے گھر بھیجا اُس میں لکھتے ہیں:-

"الحمد للہ کہ پرسوں بوقت عصر میں بخیریت تمام مکہ معظمہ پہونچ گیا، اُسی وقت پہونچتے ہی طواف خانۂ کعبہ اور سعی صفا مروہ سے قبل از نماز مغرب فراغت حاصل ہوئی اور اُسی شب میں حجامت بنواکر احرام کھول دیا۔"

ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"۱۸ فروری کو ایک اور مکان میں آگیا ہوں جو حرم شریف سے بالکل ہی متصل ہے اور جہاں سے خانہ کعبہ ہر وقت نظر آتا ہے، اور یہ بہت آرام کا مکان ہے باب الزیارہ سے باہر آتے ہوئے داہنے ہاتھ کو سب سے پہلا مکان اور دیوار حرم سے بالکل پیوستہ ہے۔"

دوسری ذی الحجہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"آج نماز جمعہ میں ایک لاکھ آدمیوں کو تخمینہ کیا جاتا ہے، کبھی اس قدر کثیر التعداد مسلمانوں کی جماعت دیکھنے میں نہیں آئی اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ سب ایک ہی

قصد اور ایک ہی ارادہ سے مختلف بلاد سے آکر یہاں جمع ہوتے ہیں تو ایک خاص
اثر اس منظر سے دل پر ہوتا ہے۔"

۸ ذی الحجہ م ۲۵ فروری کو مکہ معظمہ سے روانہ ہو کر مقام منیٰ میں قیام کیا ۹ تاریخ کو جمعہ اور یوم الحج تھا شام تک عرفات میں قیام رہا، مغرب کے وقت وہاں سے روانہ ہو کر مزدلفہ پہنچے اس کے بعد دو روز منیٰ میں قیام کیا، پھر ۲۹ فروری سے ۸ مارچ تک مکہ معظمہ میں مقیم رہے، رات کو وہاں سے روانہ ہو کر ۹ مارچ کی شام کو جدہ پہونچے، یہاں سے ۱۰ کو جہاز الفقرہ (الجموعہ) پر سوار ہو کر ۱۱ کو ینبوع آئے، یہاں چند روز قیام کر کے ۱۶ مارچ کو قافلہ کے ساتھ مدینہ منورہ روانہ ہوئے، راستہ میں بیر سعید، بیر عباس، بیر درویش وغیرہ منازل پر قیام کرتے ہوئے ۲۳ مارچ کو بوقت مغرب مدینہ منورہ پہونچے، یہاں آخر مارچ تک قیام رہا، یہاں سے یکم اپریل کو براہ ینبوع روانہ ہو کر ۹ اپریل کو جدہ آئے اور ۱۱ کو جہاز "مظفری" پر سوار ہو کر عدن اور مکلا ہوتے ہوئے ۲۲ اپریل کو کراچی پہونچے اور ۲۳ کو کراچی سے براہ بھٹنڈہ اور دہلی سفر اختیار کر کے ۲۵ اپریل م ۹ صفر یوم دوشنبہ ۲ بجے دن کے مع الخیر امروہہ پہونچے غرض بعد مدت ان کی دیرینہ تمنا پوری ہوئی اور انھوں نے اس مذہبی فرض کے ادا کرنے کی سعادت حاصل کی۔



حلیہ وضع قطع اور اندرونی معاشرت

حلیہ | قد کسی قدر پستہ، جسم دوہرا، رنگ گندمی قریباً سانولہ، اعضا مضبوط، جسم ورزش کی عادت کی وجہ سے گٹھا ہوا، سر منڈا ہوا جس پر اکثر مکھن کی مالش بھی کراتے تھے، باوجود فربہی، عادات واطوار میں چستی۔



نواب صاحب کی وضع، قطع، لباس، غذا، اور طریقہ بود و باش میں سادگی تھی، قیمتی لباس، اعلیٰ درجہ کی غذائیں، شاندار مکان اور عمدہ فرنیچر، ان میں سے کسی چیز کا بھی اُن کو ذوق نہ تھا، انھوں نے اپنی سادہ معاشرت[1] کو حیدرآباد جیسے مقام میں بھی قایم رکھا۔

لباس | عموماً سادہ، کم قیمت، اور مضبوط قسم کا کپڑا استعمال کرتے تھے، اور یہی لباس میں بڑے بڑے اُمرا اور حکام سے ملاقات کرتے تھے، گھر میں عموماً لٹھے اور ململ کا کرتہ اور شرعی پاجامہ پہنتے تھے اور جاڑوں کے موسم میں رُوئی کا لبادہ اور مرزئی بھی استعمال کرتے تھے، عام لباس گھر کے باہر کا صرف شیروانی تھی جو عموماً کسی معمولی کپڑے کی ہوتی تھی، خاص حالات میں سرج یا بانات کی شیروانی اور پتلون بھی استعمال کرتے تھے، حیدرآباد میں کبھی کبھی اپنے عہدہ و مرتبہ کے لحاظ سے کسی قیمتی لباس استعمال کرنے پر بھی مجبور ہوتے تھے، لیکن عام طور پر اس کو پسند نہیں کرتے تھے۔

نواب لطیف یار جنگ بہادر فرماتے ہیں کہ:۔

---

[1] نواب صدر یار جنگ بہادر فرماتے ہیں کہ:۔

"سر سید مرحوم اُن کی دیانت کے معتقد تھے، ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ مولوی مشتاق حسین کی پتلون میں عروج حیدرآباد کے زمانہ میں پیوند لگے رہتے تھے، اور اُن کے معاصر ...... نے اپنی کوٹھی کے لئے ستر ہزار کا فرنیچر ولایت سے منگوایا تھا، لیمپوں پر اُن کا مونوگرام بنا ہوا تھا، نواب وقار الملک مرحوم جب نواب سر آسمان جاہ بہادر کے ساتھ شملہ سے علی گڑھ تشریف لائے تو مولوی محمد عبد الشکور خاں صاحب رئیس بھیکم پور سے ملنے تشریف لائے، جناب ممدوح نے مجھ سے بیان فرمایا تھا کہ پتلون ٹخنوں سے اُونچا تھا" ۱۲

"ان کی زندگی بالکل سادہ تھی ان کا لباس بہت سادہ تھا کوئی ان کو دیکھ کر یہ
کوئی شخص ان کو نواب وقار الملک نہ خیال کرتا تھا۔"

غذا: غذا بھی عموماً معمولی اور سادہ قسم کی استعمال کرتے تھے گھر میں بجائے چینی کے
مٹی کے برتنوں میں کھانا کھاتے تھے جو ان کو مرغوب تھے کھانا عموماً ہوتا تھا بعض وقت کی
میں نکال لیتے مہمانوں کے ساتھ تو کبھی دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے کبھی جو بھی چیز ہوتی
سادہ اور قیمہ بہت شوق سے کھاتے تھے اور احباب مہمانوں کو بھی کھلاتے تھے مہمانوں کی تواضع
مدارات میں ان کو خاص مسرت ہوتی تھی اور بسا اوقات وہ مہمانوں کے لئے کھانے کا خوان اور پانی کی
کشتی خود گھر میں سے لے کر آتے تھے معمولی کاموں کے لئے نوکروں کو تکلیف نہیں دیتے تھے اپنا کام
خود اپنے ہاتھ سے کر لیتے تھے۔

نواب **لطیف یار جنگ** بہادر کا بیان ہے کہ:-

"غذا بالکل سادہ تھی کبھی دو وقت فرمائش نہ کرتے تھے بجز اس صورت کے کہ کوئی
مہمان آجائے یا کسی دوست کی دعوت ہو ان کے طبقے میں کوئی عمدہ غذا نہ تھی
اکثر اپنے قدیم طرز پر سادہ کھانوں کو پسند کرتے تھے۔"

نواب **صدر یار جنگ** مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی فرماتے ہیں کہ:-

"رحلت سے چند ماہ پہلے میں عیادت کے لئے علی گڑھ حاضر ہوا تھا
کھانا کھلایا بعض شہر کے معززین کو بھی مدعو فرمایا زینہ اونچا تھا اس کی سیڑھیاں بھی اونچی
تھیں نواب صاحب کو اترنے اور چڑھنے میں تکلیف ہوتی تھی
تھا کھانے کے بعد جب نیچے تشریف لائے تو میں نے کہا کہ اس قدر تکلیف اٹھا
کر اوپر کے کمرہ میں کھانا کھلانے کی کیا ضرورت تھی نیچے ہی کھانا ہو سکتا تھا جواب
میں بے تکلف فرمایا انسان کو اس قدر تکلیف کا عادی رہنا چاہیے۔"

خانگی معاشرت | اعلیٰ درجہ کی کوٹھیوں اور بنگلوں میں رہنے کی اُن کو تمنا نہ تھی، خود سر سید نے ایک خط میں اُن کے مکان کی خستگی کی طرف اشارہ کیا تھا، حیدرآباد میں کرایہ کے معمولی مکانات میں رہتے تھے، اکثر عہدہ داروں نے ذاتی مکانات خرید لئے تھے، مگر اُن کے پاس اس قدر روپیہ کہاں تھا! جب اُن کے صاحبزادے محمد احمد مع بیوی کے انگلستان سے آنے لگے تو نواب سر آسمان جاہ کی درخواست پر اعلیٰحضرت نے فتح میدان کے قریب ایک مکان اُن کو عطا کیا اور فرنیچر بھی سرکار سے ملا، لیکن اس پر بھی انھوں نے اپنی معاشرت میں کوئی تبدیلی نہیں کی، مکان کے احاطہ میں ایک چھپر بنا رکھا تھا زیادہ تر اُسی میں نشست رہتی تھی۔

نواب لطیف یار جنگ فرماتے ہیں کہ:-

"صبح کی عام ملاقات ۸ بجے کے بعد کرتے تھے، اور دیہاتیوں سے صبح کے ۶ و ۷ کے اندر، متوسطین و غربا سے عمدہ کوچ پر ملاقات ہوتی تھی، اور جو اعلیٰ عہدہ دار ہوتے تھے اُن سے چھپر میں جہاں کا تکلف یہ تھا، بوریئے کا فرش، سادہ میز اس پر معمولی مارکین کی چادر، بے دستی کرسیاں، اس کا نام تکیہ تھا یہ خلوت صوبہ داروں اور بڑے بڑے اشخاص سے ملنے کی جگہہ تھی، تاکہ اُن متکبرین کی عادت اس سادگی اور ملنساری سے درست ہو، بڑے بڑے اشخاص سے فرماتے تھے کہ "میں آپ سے تکیہ میں ملوں گا وہاں تشریف رکھیے، چنانچہ اُس میں جاکر اُن سے ملاقات کرتے تھے، یہ فقیرانہ آفس روم تھا"

وطن میں بھی انھوں نے کوئی کوٹھی نہیں بنوائی نہ اپنے محلہ کی سکونت چھوڑی، البتہ قدیم مکان میں ترمیم و اضافہ کر کے اُس کو ضرورت کے مطابق بنا لیا، اگر وہ چاہتے تو شہر کے باہر کوٹھی یا بنگلہ بنا سکتے تھے، لیکن اپنے اہل محلہ سے اس قسم کی بیگانگی اور دورباشی اُن کو پسند نہ تھی۔

ضروری فرنیچر اُن کے مکان میں موجود رہتا تھا، جو زیادہ تر دوسروں کی خاطر سے تھا، وہ خود سادہ اور مضبوط فرنیچر پسند کرتے تھے جو کسی قدر قیمتی تھا وہ محمد احمد مرحوم کی یادگار

تھا وہ اپنے یہاں ضرورت کی تمام چیزیں سلیقہ کے ساتھ مہیا رکھتے تھے، لیکن سب سادہ ہوتی تھیں اور کفایت شعاری کا پہلو ہمیشہ مدِّ نظر رہتا تھا، لیکن اُن کی یہ کفایت بر بنائے بخل و تنگدلی نہ تھی، اس طریقہ سے وہ جو کچھ پس انداز کر سکتے تھے، اِس سے اُن کے کنبہ اور وطن کے حاجتمند متمتع ہوتے تھے، جن کی وہ برابر خفیہ طور پر اعانت کرتے رہتے تھے۔

غذا و لباس کے علاوہ اور چیزوں میں بھی کفایت شعاری کا لحاظ رکھتے تھے، مثلاً اُن کے لکھنے پڑھنے کا سامان نہایت معمولی ہوتا تھا، عمدہ کاغذ اور قیمتی لفافے جیسا کہ آج کل دستور ہے وہ استعمال نہیں کرتے تھے، عموماً ڈاک خانہ کے معمولی لفافوں سے کام لیتے تھے، کاغذ بھی معمولی ہوتا تھا۔ اور قلم دوات بھی بہت معمولی، کاغذ کے سادہ ٹکڑوں اور پرزوں کو ضائع نہیں کرتے تھے، اُن کے کاغذات میں جو مسودے ملتے ہیں وہ عموماً اسی قسم کے ٹکڑوں اور معمولی کاغذ پر ہیں، خطوط میں بھی جب تک دوسرے ورق کی ضرورت نہو، ایک ہی ورق استعمال کرتے لیتے۔

سرکاری معاملات میں بھی اُن کی یہ جزورسی قایم تھی، نواب **لطیف یار جنگ** فرماتے ہیں کہ:-

"سرکار کی خیر خواہی میں اس قدر جزورس تھے کہ جو کاغذ ردی ہوتا تھا
اُس کا لکھا ہوا حصّہ چاک کر دیتے اور سادہ حصّہ نکال کر سرکاری کاموں میں
رسید کا کام لیتے تھے، اِس کو ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔"



اُن کا نظام اوقات بتانا مشکل ہے، اُن پر ہمیشہ کام کا ہجوم رہا، حیدرآباد کے آخری زمانہ قیام میں کام اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اکثر اوقات بمشکل ۱۱-۱۲ بجے شب کو اُن کو آرام کا موقع ملتا

تھا، کالج کی خدمت کے زمانہ میں اُن کے پاس کام کی کثرت تھی اور اسی سلسلہ میں اُن کو مختلف قسم کے ملاقاتیوں سے ملنا پڑتا تھا، بعض اوقات وہ رات کو بستر سے اُٹھ کر ملاقات کرنے پر مجبور ہوتے تھے، تاہم وہ نماز معین وقت پر پڑھتے تھے اور دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ ضرور کرتے تھے خواہ وہ چند منٹ کے لئے ہو۔

یہ عجیب بات تھی کہ دن ہو یا رات، جب سونے کا ارادہ کرتے تھے فوراً نیند آجاتی تھی مولوی سید احمد حسین صاحب جو حیدر آباد میں مدت تک اُن کے ساتھ رہے کہتے ہیں کہ:۔

"اُن کو فوراً لیٹتے" ہی نیند آجاتی تھی، ہم نے چند مرتبہ آزمایا اور لیٹنے سے دو منٹ کے بعد آواز دی تو سوتا ہی پایا"

نواب لطیف یار جنگ بہادر کا بیان ہے۔

"دوپہر کو بعد ۱۲ بجے ایام گرما میں آدھ گھنٹہ اور جاڑوں میں ۱۵ منٹ قیلولہ کرتے تھے، بسا اوقات بے تکلف دوستوں کو اگر ۱۲ بجے آئیں (یا اثنائے گفتگو میں) ٹھیرا کر جاتے تھے اور ۱۵ منٹ کے بعد واپس آتے تھے، میں بچشم خود دیکھتا تھا کہ وہ قیلولہ کر کے بلکہ اچھی طرح سو کر آئے ہیں جہاں اُنھوں نے چادر اُوڑھی ایسا معلوم ہوا کہ نیند اُس میں رکھی تھی، پورے خرانٹے لئے، جب پندرہ منٹ گزرے خود اُٹھ گئے نیند پوری ہوگئی۔

لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کہ نیند جو غیر اختیاری ہے اُس پر کس قدر قدرت ہے حالاں کہ اُن کا بچھونا بھی تکلف کا نہ تھا محض سادہ تھا بسا اوقات اُس کے کھٹملوں پر بھی اعتراض ہوا جو اُس میں بعض دفعہ پائے جاتے تھے لیکن مولوی صاحب (نواب صاحب) نے ان موذیوں کی ضرورت کو بھی تسلیم کرادیا کہ وقت پر اُٹھاتے ہیں، اور ضروری نیند سے زیادہ نہیں

سونے دیتے ہیں، چنانچہ انھوں نے لوگوں کے جواب میں فرمایا تھا کہ مجھے نہیں کاٹتے ہیں جب کہ میں ضروری نیند میں ہوتا ہوں، اور ضرورت سے زیادہ نیند میں کاٹتے ہیں (یہ انھوں نے مسکراکر فرمایا تھا) اس سے مُراد احساس اذیت تھا جو ضروری نیند اور غفلت میں نہیں ہوتا ہے اور غیر ضروری آرام میں ہوتا ہی۔

انھوں نے اس موذی جانور کے فرایض بیان کیے اور خداوندعالم کا شکریہ ادا کیا کہ کن کن ذرائع سے وہ ہم کو مدد دیتا ہی اور ہمارے کاموں کی تکمیل کے وقت پر تنبیہ کرتا ہی، مگر انسان غافل ہے۔"

اخلاقی محاسن عام عادات و اطوار اور حسنِ معاشرت

نواب صاحب کے عام حالات زندگی ولادت سے وفات تک بیان کیے جا چکے ہیں۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اُن کی زندگی کے تمام حالات معرض تحریر میں آگئے ہیں کیونکہ نہ تو اس کی ضرورت ہی اور نہ ایسا ممکن تھا، تاہم جو کچھ لکھا گیا نمونہ زندگی نمایاں کرنے کے لیے وہ بالکل کافی ہی۔ اور اُس کے مطالعہ سے ہر شخص اُن کی پوری زندگی کے متعلق اجمالی واقفیت حاصل حاصل کر سکتا ہی۔

اُن کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں وہ ایک ادنیٰ درجہ کی محرری سے ترقی کر کے قریبًا وزارت کے درجہ تک پہنچے۔ اور جس عہدہ و مرتبہ بھی پہنچے اُس کے لیے اس طرح موزوں ثابت ہوئے کہ گویا وہ اسی کام کے لیے پیدا کیے گئے تھے۔

سرکاری خدمات سے قطع نظر کر کے جب ہم اُن کی عام ملکی و قومی خدمات پر توجہ کرتے ہیں تو یہ نظر آتا ہے کہ وہ علی گڑھ کی تعلیمی کمیٹی اور خزانۃ البضاعۃ کی ممبری سے ترقی کر کے ایم اے او کالج اور آل انڈیا مسلم لیگ کے آنریری سکرٹری ہوئے، سرسید کے جانشین اور مسلمانان ہند کے مسلمہ لیڈر قرار پائے، اور لیڈر بھی اس درجہ کے کہ اُن کے عہد میں قوم کو اُن سے زیادہ کسی پر اعتماد نہ تھا، اور نہ کوئی شخص اُن کا حریف مقابل تھا، بلکہ لیڈری کی حیثیت سے جو ہر دلعزیزی اُن کو حاصل ہوئی وہ سرسید کو بھی نصیب نہیں تھی کیوں کہ مذہبی مباحث کی وجہ سے سرسید علماء و صوفیائے کرام کے طبقہ میں ہر دلعزیز نہ رہے تھے، البتہ سیاسی رہبری بے شبہ اُن کو حاصل تھی۔

اب سوال یہ ہی کہ نواب وقار الملک کو یہ جاہ و منصب کیونکر حاصل ہوا، نہ تو وہ علماء یا مشایخ کے خاندان سے تھے جن کے معتقدین کا سلسلہ پہلے سے موجود ہوتا ہے، نہ کسی دولتمند

اور حکمراں گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، نہ اُنھوں نے یورپ میں تعلیم حاصل کی تھی نہ کسی خاص علم وفن میں کمال پیدا کیا تھا، نہ ہندوستان کے کسی اسکول و کالج کے تعلیم یافتہ تھے، نہ انگریزی سے آشنا تھے۔ مکتب میں اُردو فارسی اور حساب کتاب کی معمولی تعلیم حاصل کی تھی، عربی تعلیم نامکمل وناقص تھی، اُن کو مطالعہ کا بھی موقع نہیں ملا۔ عنفوانِ شباب تھا کہ فکر معاش میں نکلے اور مختلف دفاتر میں محرریاں کرنے لگے۔ اس زمانہ میں وہ ہم کو کبھی بدایون میں نظر آتے ہیں کبھی بجنور میں اور کبھی مرادآباد میں، اب چند سال گزرجاتے ہیں زمانہ کچھ آگے بڑھ جاتا ہے، اس وقت وہ ہم کو نظام الملک آصفجاہ سادس فرمانروائے حیدرآباد کے دربار میں نظر آتے ہیں، اب وہ وزیرِاعظم کے دستِ راست ہیں اور اعلیٰ حضرت نظام کے معتمد خاص عام لوگ اسکو یاوری بخت پر محمول کرتے ہیں اور خاموش ہوجاتے ہیں۔

اس عروج کے بعد وہ دوبارہ ہم کو پھر ہندوستان میں نظر آتے ہیں، لیکن اس شان سے کہ اُن کے ایک ہاتھ میں سات کروڑ مسلمانوں کی تعلیمی رہنمائی کی باگ ہے اور دوسرے ہاتھ میں سیاست کی، اور وہ اپنے پُرزور بازو ور بازوئے دل سے دونوں میدانوں میں مسلمانوں کی رہنمائی کررہے ہیں آخر اس عروج واقتدار کا راز کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ جس چیز نے اُن کو اس مرتبہ ومنصب تک پہنچایا وہ صرف اُن کا کیرکٹر اور خالص مذہبی زندگی ہے، بچپن سے شباب تک اور شباب سے آخر ایامِ حیات تک اُنھوں نے جس مضبوط اور پختہ کیرکٹر کا اظہار کیا، اُن کے اقران واماثل میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، اُن کے سوانح وحالات کا مطالعہ کرنے والا سرسری نظر سے معلوم کرسکتا ہے کہ اُن کو اپنی طویل زندگی میں ابتلا وامتحان کے کیسے کیسے نازک مواقع پیش آئے لیکن کبھی اُن کے قدم کو لغزش نہیں ہوئی اور اخلاقی طور پر وہ ہر موقع سے فتح یاب ہوکر نکلے، یہی اخلاقی قوت اور مذہبی زندگی تھی جس نے آگے بڑھنے کی تمام راہیں اُن کے لیے کھولدیں اور وہ مضبوط دل، اور غیر متزلزل عقیدے کے ساتھ برابر آگے بڑھتے چلے گئے، جو حالات اب تک لکھے گئے ہیں وہ اُن کے اخلاقی محاسن وکمالات کا اندازہ

کرنے کے لیے کافی ہیں لیکن بایں ابھی یہ مرقع کسی قدر دُھندلا نظر آتا ہی، اس لیے ضرورت ہی کہ اُن کے فضائل اخلاق و حسنِ معاشرت پر کسی قدر تفصیل سے لکھا جائے تاکہ اُن کی معاشرت اور زندگی کے عام اصول سے ناظرین کو واقف ہونے کا موقع ملے، لیکن چونکہ تمام اخلاقی واقعات کا سمیٹنا اور قلمبند کرنا ناممکن ہی اس لیے ایجاز کو مدنظر رکھ کر ہر عنوان کے ماتحت تمثیلاً ایک دو واقعے اُن کے اصول معاشرت بیان کیے جائیں گے۔

خداتعالیٰ پر توکل و اعتماد ایک صحیح العقیدہ مسلمان کی یہ شان ہی کہ اس کو خدائے بزرگ و برتر پر پورا اعتماد ہو کہ وہ جو کچھ کرتا ہی بندہ کے فائدے کے لیے کرتا ہی اگرچہ ہم اس کی حکمت و مصلحت سے ناواقف ہوں کہنے کے لیے تو یہ عقیدہ سب مسلمانوں کا ہی لیکن مصائب و ابتلا کی حالت میں یقین کامل کے ساتھ اس عقیدہ پر قائم رہنا اور حرف شکایت زبان پر نہ لانا ہر شخص کا کام نہیں لیکن نواب صاحب کے مذہبی خیالات و عقائد کی پختگی کی یہ کیفیت تھی کہ کسی مصیبت کی حالت میں بھی اُن کا یقین متزلزل نہیں ہوتا تھا۔

پہلی دفعہ جب وہ حیدرآباد سے بغیر کسی قصور کے برخاست کر دیئے گئے تو بے شبہ ابتدا میں اُن کو اس بے انصافی کا صدمہ ہوا لیکن پھر جلد سنبھل گئے۔ چنانچہ ایک بزرگ کو خط میں لکھتے ہیں۔

> "اصل میں تمام معاملات اس قادر مطلق کے اختیار میں ہیں جس کے ہاں سبب سے اُس کا نتیجہ مقدم ہوتا ہی، باقی یہ اسباب جو ہم کو اس عالم اسباب میں دکھلائی دیتے ہیں یہ صرف ہماری تسکین خاطر کے واسطے ہیں۔

اس کے بعد لکھتے ہیں۔

> "اس وقت کو بھی جبکہ میں ایک بڑے عہدہ سے موقوف ہوگیا ہوں۔ اس کو خدا کا ایک فعل سمجھتا ہوں نہایت پُرحکمت، اسی وقت اس کی نظیر میرے ذہن میں یہ گذری ہی کہ میری یہ ظاہر حالت اُس گھٹا سے مشابہ ہی کہ جس میں بارانِ رحمت بھرا ہوتا ہی اور برستا ہی، میں بلامبالغہ عرض کرتا ہوں کہ اس خدائی حکمت اور ربانی رحمت کے آثار

اس وقت بھی اس قدر جھلک رہے ہیں کہ میں اُن کو اپنی انھیں دونوں آنکھوں سے بھی
متواتر دیکھ رہا ہوں اور جو کچھ کہ آیندہ ہونے والا ہے اُس کا تو خدا ہی کو علم ہے"

اس حُسن عقیدت کا اُن کو جو ثمرہ ملا ناظرین اُس سے واقف ہیں یعنی وہ دوبارہ حیدرآباد پہنچے اور پہلے سے بہت زیادہ عروج و اقتدار اُن کو حاصل ہوا، یہ سب نتیجہ تھا اُس توکل و اعتماد کا جو اُن کو خدا تعالیٰ کی ذات پر تھا۔

حیدرآباد کے زمانہ قیام میں اُن کے عروج و اقتدار کی وجہ سے بہت سے حاسد اور دشمن پیدا ہو گئے تھے، یہاں تک کہ اُن کی جان لینے کی تدبیریں ہو رہی تھیں، لیکن وہ بالکل مطمئن تھے نواب لطیف یار جنگ مجھ سے فرماتے تھے کہ

"اُن سے عرض کیا گیا کہ آپ کی ادویہ کھلی میز پر پڑی رہتی ہیں، جو خلاف احتیاط ہے
تو فرمایا کہ میں فقیر آدمی ہوں، موت وقت پر آئے گی، خدا محافظ ہے، کوئی کچھ نہیں کر سکتا"

مخلوق سے استغنا جب پہلی دفعہ وہ حیدرآباد سے علیحدہ کئے گئے تو بمقتضائے فطرت اُن کو اس کا رنج تھا اور رنج اس بنا پر تھا کہ بے خطا و بے جُرم اُن کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا، وہ سمجھتے تھے کہ اس میں اُن کی بے عزتی ہوئی، اور اب کبھی دوبارہ اُن کو حیدرآباد نہ جانا چاہیے۔ جب اُن کے اس ارادہ کا حال اُن بزرگ کو معلوم ہوا جن کے وہ معتقد تھے تو اُنھوں نے لکھا۔

"تم کو چاہیے کہ سامان سفر اپنا تیار رکھو! اور جس وقت کاغذ تمہارے نام آئے فوراً
چلے جاؤ اور جو ارادہ تمہارے دل میں ہی اُس کو دُور کر دو۔ کچھ ذلت و رسوائی کی بات
نہیں ہے"

اس خط کے جواب میں لکھتے ہیں

"بارہا میرے دل میں یہ خیال گذرا تھا کہ نہایت ناانصافی کی بات ہی کہ اس طور سے میں
بلاقصور برخاست کیا گیا، اور میں خیال کرتا تھا کہ اس کارروائی سے میری ایک قسم کی

رسوائی ہوئی اور اب غیرت وحمیت نہیں چاہتی کہ پھر وہاں جانے کا قصد کیا جائے۔

اب حضرت نے اپنے کشف سے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اس خیال کے ترک کر دینے میں کوئی بے عزتی کی بات نہیں ہے۔

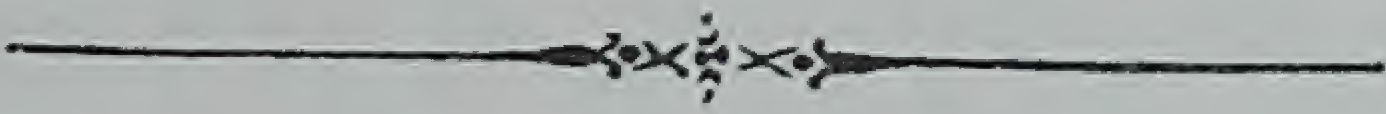
جو نفرت وکراہت میرے دل میں پیدا ہوئی تھی وہ ایک طبعی بات تھی میں نے اپنا کام جس محنت ودیانت سے کیا تھا اُس کو خدا ہی خوب جانتا ہے، میں نے نوکروں کے سے فرائض ادا نہیں کیے تھے، بلکہ یہ سمجھ کر کام کیا تھا کہ ایک اسلامی ریاست ہے جس کو خدا قائم رکھے بس جہاں تک ہوسکے اُس کی خدمت کرنا چاہیے جو عین اسلام کی خدمت تھی، باایں ہمہ یہ سلوک جو میرے ساتھ ہوا وہ مجھکو نہایت ناگوار تھا اور بے شبہ میں اس کو اپنی عزت اور غیرت کے بالکل منافی سمجھتا تھا کہ خدا کے کام کی جزا کا امیدوار میں بندوں سے ہوا۔ اور دوسری غلطی یہ ہے کہ میں نے اس کام کو قابل جزا سمجھا۔

مجھکو خود ایک قسم کا رنج اور بیزاری اس معاملہ میں تھی اس لیے میں خود کوئی خارجی سعی اس باب میں نہیں کرتا تھا، بجز اس کے کہ اس معاملہ کو میں نے خدا کے سپرد کر دیا تھا جو اب بھی اُس کے سپرد ہے۔"

شکر خدائے عزوجل نے اپنے نیک بندوں کی یہ شان بیان فرمائی کہ وہ شکرگذار ہوتے ہیں اور یہ وعدہ بھی فرمایا کہ "ان شکرتم لازیدنکم"، نواب صاحب بھی خدا کے ایک شکرگذار بندے تھے، پنجاب کے جن بزرگ سے اُن کو عقیدت تھی ایک خط میں اُن کو لکھتے ہیں۔

"اب چونکہ مجھکو ایک تعلق حضرت کے آستانہ سے حاصل ہوا ہے، تو اپنا کچھ حال بھی عرض کرنا مناسب ہے دنیا میں مختلف قسم کی قسمتوں کے لوگ ہوتے ہیں میں اس وقت تک بعنایات الٰہی اُن میں ہوں جن پر ہمیشہ خدا کی مہربانی رہتی ہے، ابتدا سے اس وقت تک جس قدر معاملات میرے خدا نے میرے ساتھ کیے وہ سب اُس کے رحم وفضل وکرم پر شامل تھے، جو باتیں بعض وقت طبیعت کو ناگوار بھی معلوم ہوئیں، وہ آخر الامر مفید ہی ثابت ہوئیں، میری

لیاقت سے ہزاروں لاکھوں حصہ زیادہ اُس نے مجھ کو دیا اور میری نالایق حرکتوں سے
قطع نظر کرکے ہمیشہ مجکو اپنے رحم میں شامل رکھا۔
جو کچھ خدا نے مجکو دیا ہیں اُس کا لاکھواں بلکہ کڑوڑواں حصہ بھی کوئی کام نہیں کرسکا اور نہ
کرسکتا ہوں"



صبر | صبر بھی سچے مسلمانوں کی شان ہی اللہ عزوجل نے قرآن مجید میں جابجا مسلمانوں کو صبر کی تاکید کی ہی اور اُس کی فضیلت بیان فرمائی ہی، اسلام کی تاریخ صبر و استقامت کی ہزاروں مثالوں سے لبریز ہی، لیکن صبر کے لیے ایک زبردست قوتِ ایمانی کی ضرورت ہی، اور خدا کے فضل و کرم سے یہ نعمت نواب وقار الملک کو حاصل تھی اس لیے باوجود گوناگوں مصائب میں مبتلا ہونے کے صبر و رضا کا دامن کبھی اُن کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ نواب صاحب کا ایک ہی بیٹا تھا، نوجوان اور تعلیم یافتہ، اُن کی زندگی کا سہارا، اور عصائے پیری، لیکن جب دست قضا و قدر نے اس کو چھین لیا تو اُنھوں نے صبر کے ساتھ اس مصیبت کو برداشت کیا۔

مولوی سید احمد حسین صاحب مجھ سے فرماتے تھے کہ

" اُن کے بڑے صاحبزادے مولوی محمد احمد صاحب مدراس میں بیرسٹر تھے، اُن کو مرض الموت لاحق ہوا اور اطلاع پانے پر نواب صاحب ہاں پہونچے، بجز اُن کے اور کوئی امروہہ کا آدمی وہاں موجود نہ تھا۔ خود ہی اُن کی تیمارداری بھی کرتے تھے اور امروہہ کو روزمرہ کے حالات کی اطلاع بھی بھیجتے تھے، جس ملازم کو ساتھ لے گئے تھے وہ بھی بیمار پڑ گیا، اب دونوں کی تیمارداری اُنھیں کے سر تھی ملازم اچھا ہوگیا مگر صاحبزادہ کی حالت خطرناک ہوچلی۔ جب زندگی سے مایوس ہوگئے تو مولوی مظہر اللہ صاحب کے نام امروہہ کو تار دیا کہ محمد احمد قریب المرگ ہیں اُن کی نعش امروہہ کو لائی جائے یا ہیں دفن کرنا مناسب ہی، جواب دیا گیا کہ وہیں دفن کرنا مناسب ہی۔

جب وہ امروہہ کو واپس آئے اور لوگ تعزیت کے لیے اُن کے پاس گئے تو خیال تھا کہ جوان اور لایق بیٹے کی موت نے ان کو بالکل نڈھال کر دیا ہوگا، اور اُن کی حالت میں بڑا تغیر ہو گیا ہوگا مگر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ اُسی حال پر تھے، اور آنے جانے والوں کی تعظیم کے لیے بدستور سابق کھڑے ہوتے اور اُسی طرح اُن کو رخصت کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ شدنی امر واقع ہو کر رہتا ہے، حکم الٰہی ٹل نہیں سکتا، مشیت ایزدی یوں ہی تھی اب ہماری جزع فزع سے کیا ہوتا ہے۔"

اس کے چند ماہ بعد ساری عمر کی رفیق زندگی بیوی نے انتقال کیا۔ اس حادثہ کو بھی انہوں نے صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کیا، دو ماہ بعد مرحوم فرزند کی یادگار یعنی پوتی نے بھی وفات پائی اس موقع پر بھی وہ ثابت قدم رہے۔ اس بچّی کے انتقال کے دوسرے روز انھوں نے اپنی بہو کو جو خط لکھا اُس سے اُن کے خیالات کا اندازہ ہوتا ہے۔

"ایسے صدمہ کے وقت میں جیسا کہ اس وقت تمہارے اوپر ہے کچھ کہنا حقیقت میں نمک بر جراحت ہے۔ لیکن تاہم مجھے اس قدر کہنے کی اجازت دو کہ جب ایک بات ہو چکی ہے تو سمجھ لو کہ خدا کی مرضی یہی تھی۔ میرے دل میں تو اُسی دن ایک کھٹکا پیدا ہوا تھا، جبکہ سب آئینے ثابت نکلے اور حمیدہ ہی کی تصویر کا شیشہ چور چور تھا، خدا کی مرضی میں دم مارنے کا مقام نہیں ہے۔ یہ وہ مقام ہے۔ جہاں بڑے بڑے نبی اور شہنشاہ بھی عاجز رہے ہیں، اور آخر صبر کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے، رنج بے شک ہے اور وہ تو اب عمر بھر کا رنج ہے لیکن انسان کا کام ہے کہ جہاں تک اُس سے ہو سکے اپنے آپ کو خدا کی مرضی کا تابع رکھے انگلستان کو تار بھیج دیا گیا ہے، جہاں وہ بجلی کا سا اثر پیدا کرے گا۔ مگر پھر آخر صبر کے سوا کوئی چارہ کار کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے۔"

اس کے بعد چوتھے روز ایک اور خط کے خاتمہ پر لکھتے ہیں۔

"آخر میں مجھکو اس قدر اور بھی کہنے کی اجازت دو کہ ڈیر شارلی جو کچھ ہوا اُس کی نسبت

سمجھو کہ خدا کی مرضی یہی تھی، اور کوئی علاج اب اس زخم کا سوائے صبر وشکر کے مرہم کے نہیں ہے مضبوط دل کے ساتھ ہم لوگوں کو خدا کی مرضی پر نہ صرف صبر بلکہ شکر بھی کرنا چاہیے۔ اولاد اس کی ایک پاک امانت ہے، جب تک اُس نے چاہا اپنی امانت کو ہمارے پاس رکھا اور جب چاہا واپس لیا، اور رنج بھی جو ہم کو ایسے موقع پر ہوتا ہے وہ بھی بلاشک اُسی کا بنایا ہوا ہے، اور اُسی کا بھیجا ہوا ہوتا ہے، اور اُس کے ہونے میں بھی اُس نے آخرت میں صابرین وشاکرین کے لیے بہت بڑے مدارج رکھے ہیں اور اصلی رنج و راحت وہی ہے جو آخرت میں پیش آنے والے ہیں، دنیا تو چند روزہ ہے، دعا یہ ہے کہ جس وقت تک وہ دنیا میں رکھنا چاہے ایسی طرح رکھے کہ ہم اُس کے ایک فرماں بردار اور صابر وشاکر بندے ثابت ہوں"

جو اُن کے خیالات تھے وہی اُن کا عمل بھی تھا، اس دردناک حادثہ کے بعد بھی اُن کو اولاد کے صدمہ میں مبتلا ہونا پڑا، اُن کی تین جوان اور پڑھی لکھی لڑکیوں نے جن کی شادی ہو چکی تھی یکے بعد دیگرے انتقال کیا، مگر اس ابتلا و امتحان میں بھی وہ ثابت قدم رہے۔ اس کے بعد جس زمانہ میں کہ وہ کالج کے سکرٹری تھے، اُن کی نواسی نے جس کی شادی ہو چکی تھی انتقال کیا، گھر سے تار آیا اُس وقت کالج کا کام کر رہے تھے، تار پڑھا آیۂ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر بدستور کام میں مصروف ہو گئے۔

تسلیم و رضا اور صبر و استقامت کی یہ دولت بندہ کے اختیار میں نہیں ہے، بلکہ خدا جس کو چاہے دے، ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

رقت قلب مومن کی یہ شان ہے کہ وہ رقیق القلب ہو، خود ہمارے آقا رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام رقیق القلب تھے۔ اور امت کو بھی رحم و شفقت کا حکم دیا ہے، نواب صاحب کا قلب بھی ایک متبع سنت مسلمان کا قلب تھا، دوسروں کی مصیبت پر اُن کا دل بھر آتا تھا اور آنکھیں اشک آلود ہو جاتی تھیں۔

نواب لطیف یار جنگ بہادر کا بیان ہی کہ :-

"ایک دفعہ شدت سے امساک باراں تھا نواب صاحب علالت کی وجہ سے پہاڑ پر تبدیل آب وہوا اور علاج کے لیے گئے تھے، اس حالت میں وہاں سے واپس ہوئے ملک اور اضلاع میں مویشی مر رہے تھے، لوگ واویلا کر رہے تھے، ایک روز جمعہ کی نماز کے بعد ان رپورٹوں کو اپنے چھپر میں بیٹھے ہوئے ملاحظہ کرتے جاتے تھے، اور روتے جاتے یہاں تک روئے کہ آنسوؤں سے رپورٹیں تر ہوگئیں اور اس دو گھنٹہ میں ابر آیا اور اسقدر پانی برسا کہ چھپر ٹپک کر مولوی صاحب بھیگ گئے تب اُٹھے، باللہ اشہد یہ میرا چشم دید واقعہ ہے۔"

ضبط نفس | دنیا کی مختلف اقوام میں جسقدر بڑے بڑے اشخاص گزرے ہیں اُن کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہی کہ وہ ضابط و مستقل مزاج تھے، اور ہجوم مشکلات کی حالت میں بھی اپنے نفس پر قابو رکھتے تھے، نواب صاحب بھی اپنے تمام ہمعصروں میں اس خصوصیت کے لحاظ سے ممتاز تھے، بڑے بڑے نازک مواقع پر بھی اُنھوں نے اپنے نفس و جذبات کو قابو میں رکھا اور کسی موقع پر اُن کے قدم کو لغزش نہیں ہوئی۔

جو لوگ اُن کے ساتھ سالہا سال تک رہے ہیں اور جن کو اُن کی اندرونی زندگی کے مطالعہ کا موقع ملا ہی اُن کا بیان ہی کہ غصہ کی حالت میں کسی نے اُن کی زبان سے کوئی ناشائستہ اور خلاف تہذیب لفظ کبھی نہیں سُنا، بے شبہ اُن کو غصہ آتا تھا لیکن اس حالت میں بھی وہ کبھی مشتعل نہیں ہوتے تھے نہ آواز میں کسی قسم کی بلندی اور جوش پیدا ہوتا تھا، یہاں تک کہ کوئی اجنبی شخص یہ اندازہ بھی نہ کرسکتا کہ وہ اس وقت غصہ کی حالت میں ہیں۔

مولوی سید احمد حسین صاحب کا بیان ہی کہ

"کبھی اُن کو اعتدال سے زیادہ غصہ نہ آتا تھا اُن کا نفس ہر وقت مغلوب عقل رہتا تھا ایک مرتبہ اُن کو اپنے کچہری کے ایک محرر پر غصہ آیا تھا، وہ محرر اپنے حق میں کوئی ایسی عادت

چاہتا تھا جو اُن کے نزدیک مناسب نہ تھی، آپ نے اُس کو آہستہ مناسب لفظوں میں
سمجھا دیا مگر اُس کی سمجھ میں نہ آیا اور آپ کا بہت تعاقب کیا، یہاں تک کہ جب آپ
کچہری سے مکان تشریف لائے اور کھانا کھانے کے لیے تیار ہوئے تو وہ محرر مکان پر
آموجود ہوا اور اپنا مطلب کہنا شروع کیا، اُس وقت اُن کو بہت غصہ آیا، اور اپنے
ملازم سے کہا کہ آپ کو اُٹھا دو، یہ اُن کا انتہائی غصہ تھا؛؛

یہی حالت اُن کی تحریر کی بھی تھی جب کہ وہ کسی شخص کی مخالفت میں کچھ لکھتے تھے تو اُن کا قلم ہمیشہ قابو میں رہتا تھا ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ جوش کی حالت میں اعتدال سے تجاوز کر جائیں یا کوئی دلشکن اور دل آزار فقرہ لکھیں بلکہ وہ اپنے مخالف کا پورا نام و لقب نہایت تہذیب کے ساتھ لکھتے تھے، اُن کی یہ بھی عادت تھی کہ غصہ کی حالت میں عموماً خاموش ہو جاتے تھے اور اس وقت تک خاموش رہتے تھے جب تک کہ غصہ فرو ہو جائے۔

چنانچہ علی گڑھ کے زمانہ سکرٹری شپ کا یہ واقعہ ہے کہ ایک دفعہ علی گڑھ کے کلکٹر کا چپراسی ایک فوری جواب طلب چٹھی لیکر آیا، اور نواب صاحب کے جمعدار کو دیکر چلا گیا، اس نے یہ خیال کر کے کہ نواب صاحب ابھی اندر تشریف لے گئے ہیں، اطلاع نہ کی اور چٹھی نواب صاحب کی نشست کے سامنے میز پر رکھدی، جو کاغذات میں مخلوط ہو کر نظر سے اوجھل ہو گئی، دوسرے روز جب اُن کے اسسٹنٹ نے وہ چٹھی اُن کو سُنائی تو معلوم ہوا کہ جواب کا وقت گزر چکا ہے۔ نواب صاحب کو سخت غصہ آیا اُن کا چہرہ تمتما اُٹھا لیکن وہ بالکل خاموش رہے۔

جمعدار سامنے کھڑا تھا اور طرح طرح کی معذرتیں پیش کر رہا تھا، چند منٹ بعد جب غصہ فرو ہوا تو صرف اسقدر فرمایا، "زیادہ مت بولو نظر سے دور ہو جاؤ؛؛

ثبات واستقامت | جیسا کہ اس کتاب کے پہلے حصہ میں بیان کیا گیا ہے، حیدر آباد میں نواب صاحب پر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا جبکہ بعض بڑی شخصیت کے عہدہ دار اُن کے اور نواب سر آسمانجاہ کے سخت مخالف

ہو گئے تھے، خفیہ سازشیں کی جاتی تھیں، ایک دفعہ جب وہ مہابلیشور پر گئے تو لوگوں کو سازش کا اور موقع ہاتھ آیا، بڑی بڑی تدبیریں کی گئیں، مقصد یہ تھا کہ کسی طرح وہ حیدرآباد سے دور کیے جائیں۔ نواب صاحب بھی ان حالات سے بے خبر نہ تھے، اُن کے بہی خواہ جو کچھ سنتے تھے وہ نواب صاحب تک پہنچا دیتے تھے، رعایا کے طبقہ میں ہزاروں اُن کے خیر طلب تھے اُن میں سے جب کسی کو کچھ پتہ چلتا تو خفیہ طور پر بہ نظر خیر خواہی لکھ بھیجتا، لیکن اس پیکر ثبات و استقلال اور کوہ وقار انسان کو ذرا بھی جنبش نہ ہوتی یہاں تک کہ آخر زمانہ میں یہ خبریں مشہور ہوئیں کہ مخالفین اُن کے قتل کرنے کی فکر میں ہیں اور اس کا انتظام ہو چکا ہے وہ اس پر بھی متاثر نہ ہوئے نہ کوئی خاص احتیاط کی، اسی زمانہ میں ایک حیدرآبادی نے اپنے نام سے اُن کو خط لکھا کہ

"بندہ زبان سے وزیر علی خاں سرکردہ کے تحقیق سنتا ہوں کہ . . . جنگ بہادر آپ کو مارنے کی فکر میں ہیں"

بعض خطوط میں اُن کو سازش کرنے والوں کے نام اور چندہ کی رقم تک سے اطلاع دی گئی بلکہ یہاں تک لکھدیا گیا کہ اس معاملہ کے متعلق جو اقرار نامے اور مُہری کاغذات ہیں وہ فلاں مقام پر موجود ہیں، مگر اس پر بھی نواب صاحب نے کچھ کارروائی نہیں کی، یہاں تک کہ سازش کے ایک خاص رکن کی موت کے چند روز بعد خود بخود یہ سازش کھل گئی۔

ایک سرکاری ملازم جو اس کار خاص پر مامور کیا گیا تھا دفعتاً دیوانہ ہو گیا یا بن گیا اور اپنی چھت پر چلانا شروع کیا کہ "میں ہرگز یہ جرم نہیں کرونگا، مجھ پر سختی کی جا رہی ہے" جب اُن واقعات کی شہرت ہوئی تو کرنل لڈلو انسپکٹر جنرل پولیس (اضلاع) تحقیقات پر مامور ہوئے، سلسلہ تفتیش میں تمام واقعات کھل گئے، اور یہ پتہ چل گیا کہ نواب . . . جنگ بہادر جیسا باہیبت اور ذی اقتدار عہدہ دار اس سازش میں شریک ہے، اور امراء میں سے ایک با اثر امیر اس سازش میں مدد دے رہا ہے۔

نواب صاحب اپنے بنگلہ میں کام کرنے کے کمرہ میں بیٹھے کرنل لڈلو کی رپورٹ سن رہے ہیں سنانے والا رپورٹ کی آخری سطریں ختم کرتا ہے۔ دفعتاً اردلی اندر داخل ہو کر اطلاع کرتا ہے کہ نواب

۔۔۔ جنگ بہادر حاضر ہیں"۔ نواب صاحب کے پاس اس وقت صرف ایک معتمد اہلکار اُن کی پیشی کے ہیں۔ اور دروازہ پر وہ معمر چپراسی، وہ اہلکار اس عجیب و غریب اتفاق سے متاثر ہو جاتے ہیں، لیکن نواب صاحب پورے سکون خاطر کے ساتھ ملاقاتی کو آنے کی اجازت دیتے ہیں۔ نواب ۔۔۔ جنگ بہادر جو ایک قومی ہیکل، مضبوط و توانا، اور حیدرآبادیوں کے نزدیک ایک ہیبت ناک شخص ہیں اندر داخل ہوتے ہیں، نواب صاحب ایک متبسم چہرہ سے اُن کا خیر مقدم کرتے اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہیں، مگر نواب ۔۔۔ جنگ بہادر کی حالت یہ ہے کہ جسم پر لرزہ طاری ہے، ہونٹھ خشک ہو رہے ہیں اور منھ سے بات نہیں نکلتی نواب صاحب نرم لہجہ میں اُن سے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہتے ہیں، وہ ایک ناکام اور خستہ شخص کی طرح بیٹھ جاتے ہیں، اور پھر نہایت ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنی صفائی کے متعلق کچھ کہتے ہیں، ابھی وہ اپنا مافی الضمیر ادا نہیں کر چکے کہ نواب صاحب نہایت مستقل اور پر اخلاق لہجہ میں جو اُن کا خاص طریقہ تھا فرماتے ہیں۔

"جی کچھ نہیں! کچھ بات نہیں! ہاں مجھے بھی معلوم ہے"

اس فیصلہ کُن فقرہ کے بعد گفتگو ختم ہو جاتی ہے اور نواب ۔۔۔ جنگ بہادر پانچ منٹ بعد خاموشی سے اُٹھ کر چلے جاتے ہیں، اور نواب صاحب اس رپورٹ یا اس ملاقات کے متعلق ایک لفظ کہے بغیر فوراً اپنے کام میں مشغول ہو جاتے ہیں، گویا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں گذرا، نواب صاحب نے اس سازش کے انکشاف کے بعد بھی کوئی قانونی کارروائی نہیں کی، اور غالباً اُنہی کی خواہش پر آسمانجاہ نے بھی یہ معاملہ داخل دفتر کر دیا۔

نواب صدر یار جنگ بہادر فرماتے ہیں۔

"کسی واقعہ سے متاثر ہو کر مضطرب ہونا تو شاید جانا ہی نہیں، کالج کے متعلق شدید سے شدید واقعوں میں طبیعت کا سکون بجائے خود قائم رہا، سُنی، شیعہ کی بحث جس وقت پوری قوت پر تھی اور کالج کی بنیاد متزلزل ہونے لگی تھی، میں نے مضطربانہ پوچھا کہ آخر اس کا انجام کیا ہوگا؟ پورے اطمینان سے فرمایا "اصول پر قائم رہنا چاہیے

بالآخر اصول ہی کامیاب ہوتا ہے۔"

نواب لطیف یار جنگ بہادر ناظم آبکاری فرماتے تھے کہ

"باوجود اخلاق و فروتنی کے اُن کی ہیبت حق سب پر غالب تھی، اگرچہ بڑے بڑے منکرین وقت کھر فقار اُن کو قتل کی دھمکی دلاتے تھے، مگر کبھی بھی خلوت و جلوت میں اُنہوں نے ان اشخاص کی ملاقات سے احتراز نہیں کیا، فرماتے تھے' واللہ مُتم نورہ و لو کرہ المجرمون" —— کبھی اُن پر انسان کا خوف طاری نہیں ہوتا تھا کیسا ہی اہم معاملہ ہو وہ کبھی پریشان نہیں ہوتے تھے۔"

اخلاقی جرأت نواب صاحب کے جو اوصاف ضرب المثل ہیں، اُن میں اخلاقی جرأت کو خاص شہرت حاصل ہے، اُن کی عمر کا بڑا حصہ سرکاری ملازمت میں گذرا، جہاں اخلاقی جرأت کی مثالیں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں، لیکن حیرت ہے کہ اُن کی اخلاقی جرأت کے واقعات زیادہ تر حیدرآباد میں پیش آئے، جہاں اُس زمانہ میں حکومت کا شخصی اقتدار عروج و کمال پر تھا۔ اور تعجب ہے کہ یہ معاملات زیادہ تر وزرا کے ساتھ پیش آئے اور یہ وزرا درحقیقت خود مختار اُمرا رہتے، اور اپنی سطوت و شوکت کے لحاظ سے ہندوستان کے والیان مُلک کا مقابلہ کرتے تھے، جیسے سر سالار جنگ اول و ثانی اور نواب سر آسمانجاہ بہادر، یہ امرا اس کے خوگر ہی نہ تھے کہ اپنی رائے کے خلاف کوئی بات سُنیں، لیکن نواب صاحب نے نہ صرف اُن کی رائے سے اختلاف کیا، بلکہ ضرورت کے وقت ان وزرا کے طرز عمل پر نہایت زبردست نکتہ چینی کی، یہاں تک کہ متعدد بار یہ وزرا اپنی غلطی اور طرز عمل کی ناواجبیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے۔ چنانچہ ایک دفعہ جب سر سالار جنگ اعظم نے ایک معاملہ کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی، اور یہ کہا کہ یہی رائے تم اپنی رائے کے طور پر بھی نواب بشیر الدولہ سے کہدینا، تو نواب صاحب نے صاف کہدیا کہ "میری یہ رائے نہیں ہے" اور اُن کو یہ امر یہاں تک ناگوار گزرا کہ دربار سے اُٹھ کر فوراً استعفا دیدیا اور حیدرآباد سے روانگی کے لیے تیار ہو گئے، آخر کار وزیر اعظم نے ان کو بلا کر گفتگو

کی اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور کہا کہ درحقیقت مجکو کوئی حق نہ تھا کہ میں تمکو اسپر آمادہ کرتا کہ تم میری رائے کو اپنی رائے کے طور پر نواب بشیرالدولہ کے سامنے بیان کرو۔

سر سالار جنگ ثانی کا زمانہ ایک حد تک اُن کے لیے قابل احتیاط تھا، اس زمانہ میں وہ صوبہ دار تھے اور دربار میں اُن کو کوئی خاص رسوخ حاصل نہیں تھا بلکہ مخالف اثر قوی تھا لیکن اس عہد میں بھی اُنہوں نے اپنا طرزِ عمل نہیں بدلا، اپنی رپورٹوں اور یادداشتوں میں حکومت کی لغزشوں پر برابر نکتہ چینیاں کرتے رہے، اور ہر معاملہ کے متعلق آزادی سے اپنی رائے ظاہر کی

سر آسمان جاہ کے زمانہ میں اگرچہ اُن کو مدارالمہام کے دربار میں رسوخ حاصل تھا لیکن عام فضا مناسب حال نہ تھی، یہی رسوخ اور اقتدار اُن کے لیے خطرہ بن گیا تھا، اور اُن کے زوال کے لیے برابر سازشیں ہوتی رہتی تھیں، گویا وہ ہر وقت خطرہ کی حالت میں تھے، ان سازشوں کی اہمیت یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ ایک زمانہ میں نواب سر آسمان جاہ بھی کسی قدر متاثر ہو گئے تھے (جیسا کہ استعفےٰ کے واقعات سے ظاہر ہی، جس کا تذکرہ حصۂ اول میں کیا گیا ہی) لیکن با ایں ہمہ اُن کی اخلاقی جرأت اور حریت رائے اب بھی قائم رہی وذراسی لغزش پر بے تامل سر آسمان جاہ کو ٹوک دیتے تھے، چنانچہ ۱۸۹۰ء میں ایک موقع پر جب اُنہوں نے وظیفہ کی درخواست پیش کی اور نواب سر آسمان جاہ اُسکی واپسی پر اصرار کر رہے تھے، اُنہوں نے وزیر ممدوح کے بعض معاملات کا تذکرہ کر کے جو اُنکے معیار کے مطابق قابل اعتراض تھے صاف صاف لکھدیا کہ

"سرکار عالی کے دیانت بالمقابلہ مقصود ہی، یا دیانت اصلی، اگر اصلی مقصود ہی تو یہ باتیں اُس کے خلاف ہیں اور اگر میں رہا تو ان میں سے کچھ بھی نہیں ہونے دونگا اگر مجھکو رکھنا ہی تو یہ سمجھ کر رکھنا چاہیے۔"

اسی سلسلہ میں اُنہوں نے بعض اخلاقی کمزوریوں پر توجہ دلاتے ہوئے لکھا:

"جن کو چور اور دشمن سمجھتے ہیں اُن کو بھی خدمتوں پر رکھا جاتا ہی، یہ اعلیٰ درجہ کی کریم النفسی تو ہی یا یہ کہ ان کی خوشامدوں پر خیال کیا جاتا ہی، یا اُنکہ طبیعت کی کمزوری ہی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہی کہ (۱) قوت وانتظام ضعیف ہوتا ہے (۲) انٹریگ بڑھتی ہی (۳) دوسرے عہدہ داروں پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ اور ایک غلط طرز حکومت ہے اور انصاف کے خلاف ہی۔"

اسی طرح تمام معاملات میں وہ اخلاقی جرأت سے کام لیکر آزادانہ طور پر اظہارِ خیالات کرتے رہے، اور وزرا کے علاوہ رزیڈنٹوں کے معاملہ میں بھی اُن کا طرزِ عمل یہی ہوگا۔

قومی معاملات میں بھی اُن کی اخلاقی جرأت کی بکثرت مثالیں موجود ہیں سرسید کا وہ جسقدر ادب کرتے تھے، موجودہ زمانہ میں اُس کا صحیح اندازہ کرنا لوگوں کو مشکل ہی، وہ ہمیشہ ازراہ ادب سرسید کو سرکار کے لفظ سے مخاطب کیا کرتے تھے، اور خطوط میں "قبلہ و کعبہ" لکھتے تھے، ملک میں اور گورنمنٹ کے نزدیک سرسید کی جو پوزیشن تھی وہ بھی اُن سے مخفی نہ تھی، لیکن سید محمود مرحوم کی جانشینی کے معاملہ میں اُنھوں نے ایسے پُرزور اور آزادانہ طریقہ سے اختلاف کیا کہ سرسید حیرت زدہ رہ گئے اور نواب صاحب کو لکھا کہ

"میں خود حیران ہوں کہ آپ کو کس چیز نے برانگیختہ کیا ہی، جو یہ طریقہ اظہارِ رائے کا اختیار کیا" پھر اسی سلسلہ میں دوسری جگہ لکھا،

"اس وقت تک آپنے جو کیا نہ مجھ کو یہ یقین ہی کہ آپ نے مولوی سمیع اللہ خاں کے سبب سے کیا، اور یہ کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے میرے ساتھ کوئی کینہ دیرینہ نکالا ہے، بجز غلطی، اور ناعاقبت اندیشی، اور غلط دینداری کے اور کوئی سبب نہیں ہے"

سرسید کی یہ حیرت کچھ بیجا نہ تھی، خود نواب وقارالملک کے اکثر دوستوں کو باوجود اُن کی "اخلاقی جرأت" سے واقف ہونے کے یہ یقین نہ تھا کہ وہ اس جرأت و آزادی کے ساتھ سرسید کی مخالفت کریں گے، اس لیے اُن کے اختلاف سے ہر شخص کو تعجب ہوا۔

اسی اختلاف کے زمانہ میں ایک خط میں سرسید کو لکھتے ہیں:

"آپ فرماتے ہیں کہ لوگ قوم قوم پکارتے ہیں، قوم کا نام اُنھوں نے کس سے سیکھا ہی؟ میں کہتا ہوں کہ آپ ہی سے یہ نام بھی سیکھا ہی، اور آپ ہی سے یہ آزادی بھی سیکھی ہی۔ جو اتفاق وقت سے آپ ہی کے خلاف کام میں لائی جارہی ہے، اور چونکہ وہ راستبازی کے ساتھ کام میں لائی جارہی ہے تو آپ کو خوش ہونا چاہیے، یا کم از کم یہ کہ اس کی شکایت

تو نہ کرنی چاہیے"

اس کے بعد لکھتے ہیں

"آپ کی فرمائش یہ ہے کہ تم حالات سے لاعلم بھی رہو اور رائے بھی دو، اور جو ہم کہتے ہیں اُس کو مان لو، یہ تو صرف نبی کا درجہ، مذہبی معاملات میں ہے، اور آپ جو شرک فی النبوۃ کے ہمیشہ خلاف رہے ہیں، خدا کے لیے مجکو سمجھائیے کہ یہ شرک فی النبوۃ نہیں ہے تو اور کیا ہے"

پھر لکھتے ہیں:

"خیر آپ جانیں اور آپ کا کام جانے ہر ایک کو اپنی قبر میں علیحدہ علیحدہ جانا ہے۔ اگر آج میں آپ کی ناراضی کے خوف سے وہ رائے دیدوں جس کو میں سمجھتا ہوں کہ وہ قوم کا گناہ ہے، تو کل کو خدا کے سامنے آپ میرا گناہ نہ بخشوائیں گے"

اسی سلسلہ میں وہ نہایت جرأت کے ساتھ سرسید کو ایک غلط فہمی پر توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک غلط فہمی نے اور بھی آپ پر اثر کیا ہے، کئی دفع آپ کے قلم سے نکلا ہے کہ قوم میں وہ کون کون افراد ہیں جن کے بھروسہ پر مدرسہ کی آیندہ قسمت کا فیصلہ منحصر کیا جائے اور اُن کے بھروسہ پر اپنے سامنے میں کوئی انتظام نہ کروں، یہاں تک پہنچنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ آپ خدا سے لڑنا چاہتے ہیں (گو کہ کچھ شک نہیں کہ آپ ایسا نہیں چاہتے) مگر نتیجہ اُسی قسم کا نکلتا ہے۔

حضور اب تو بُرے ہیں یا بھلے ہیں یہی لوگ ہیں۔

چہ تواں کرد مردماں اینند   باہمی مردماں بباید ساخت

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جب رحلت فرمائی تو اُن کا سا کوئی بھی باقی نہیں تھا مگر چلانے والوں نے آخر چلایا ہے، جیسا کچھ بھی چلا سکے، یہی کیفیت آپ کے مدرسہ کی ہے"

اسی طرح وہ اور معاملات میں (جیسا کہ ناظرین حصہ اول میں پڑھ چکے ہیں) نہایت جرأت سے سر سید کی رائے اختلاف کرتے رہے۔

آزادی رائے | نواب صاحب کی آزادی رائے ضرب المثل ہی، اظہار رائے کے معاملہ میں وہ نہ قوم کے سر برآوردہ لیڈروں سے مرعوب ہوتے تھے نہ حکومت سے، حیدرآباد اور ہندوستان میں بہت سے مواقع پر اُن کی رائے کی آزادی کا لوگوں نے تجربہ کیا، اور بارہا اُن کی جرأت کا امتحان کیا گیا، سر سید اور سالار جنگ جیسے مدبّر اور بلند رتبہ اشخاص بھی اُن کی رائے کو کبھی مغلوب نہ کر سکے قومی و ملکی معاملات میں بھی وہ اکثر عام خیالات اور جمہور کی رائے سے بے پروا ہو کر صداقت کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کرتے تھے، کبھی لوگوں کی ناراضمندی یا ہر دلعزیزی جاتے رہنے کے خوف سے مخالف رائے کے ظاہر کرنے میں کچھ تامل نہیں کیا اور جب ایک دفعہ رائے قائم کر لی تو استقلال سے اس پر قائم رہے، چنانچہ سر سید ایک موقع پر ناراض ہو کر لکھتے ہیں۔

"مجھکو یقین تھا کہ آپ خدا کے الہام پر بھی اپنی رائے سے منحرف ہونے والے نہیں ہیں، جیسا کہ میں نے خود آپ کو لکھا تھا کوئی توقع برخلاف اُس کے اگر میں کرتا تو میری حماقت تھی۔"

جب مسلم لیگ کے نصب العین اور قواعد کی ترمیم کا مسئلہ پیش تھا، تو اُنہوں نے لکھنؤ کے اجلاس میں علی الاعلان سیلف گورنمنٹ کی مخالفت کی (جس کو وہ خاص وجوہ سے اپنی قوم کے لیے مضر سمجھتے تھے) حالانکہ اُس وقت عام رجحان پبلک کا سیلف گورنمنٹ کی تائید میں تھا۔

اسی طرح اُنہوں نے تقسیم بنگال کی منسوخی، اور ایران و طرابلس کے معاملات اور واقعات کانپور کے متعلق آزادانہ مضامین لکھے جن میں بعض گورنمنٹ کے مخالف تھے اور بعض عام خیالات کے مخالف زمانہ علالت میں جبکہ وہ کالج کی خدمت سے دستکش ہو گئے تھے، ہز آنر جیمس مسٹن عیادت کے لیے امروہہ میں اُن کے مکان پر آئے اسی سلسلہ میں ہز آنر نے تخلیہ میں سیاسی معاملات پر بھی گفتگو کی۔ اُس زمانہ میں مسلمانوں میں احرار و مستبدین کے نام سے دو پارٹیاں بن گئی تھیں اور باہم کشمکش جاری

تھی، سر جیمس نے نواب صاحب کی توجہ ان امور کی طرف مبذول کی اور یہ درخواست کی کہ اپنے اثر سے کام لیکر غیر معتدل جوش کو روکیں۔ نواب صاحب نے مضامین لکھنے کا وعدہ کیا، مگر مسلسل علالت کی وجہ سے مجبور رہے، لیکن جو کچھ وہ لکھنے والے تھے، اور جس طریقے سے لکھنے والے تھے اُس کا اندازہ خود نواب صاحب کے ایک خط سے ہوتا ہے، جس میں وہ کہتے ہیں:

"گزشتہ ہز آنر کی رونق افروزی امروہہ کے موقع پر جو ارشاد ہز آنر نے مہربانی سے مجھ سے فرمایا تھا کہ مسلمانوں میں جو چند گروہ ہو رہے ہیں اُس سے اُن کو بہت نقصان پہنچ رہا ہے، اور اُس کی وجہ سے خاص کر ایک فریق کا دوسرے فریق والوں کی نسبت سخت الفاظ کا استعمال کرنا ہے،

کسی کو ایمان فروش کہنا ضرور اس کو مشتعل کریگا، جس کو روکنا چاہیے، نیز گورنمنٹ کی نسبت جس آزادانہ طور پر اخباروں میں نکتہ چینی کی جاتی ہے اُس کے متعلق نہ ہز آنر کسی نکتہ چینی کو روکنا چاہتے ہیں اور نہ کسی کی آزادی پر مزاحمت قائم کرنا مناسب سمجھتے ہیں، لیکن الفاظ کی سختی اور خلاف واقعہ بیانات سے البتہ تکلیف ہوتی ہے۔

میں نے اُس وقت بھی حضور ممدوح کے ان خیالات سے اپنا دلی اتفاق ظاہر کیا تھا۔ اور یہ بھی یقین دلایا تھا کہ ہر ایک شریف سوسائٹی کے ممبر کا یہی خیال ہے اور اُسی وقت میرا قصد ہو گیا تھا کہ ہز آنر کے متذکرہ بالا ارشادات کا حوالہ دیکر میں خود بھی ایک مفصل مضمون ان امور کے متعلق مسلمان پبلک کی توجہ کی غرض سے کثیر الاشاعت در نکلیر اخبار میں درج کراؤں، اور اس مضمون میں اپنے بعض خیالات گورنمنٹ افسروں کے طرز کارروائی کے متعلق بھی لکھنے والا تھا۔"

علو نفس | نواب صاحب اگرچہ نہایت مُنکسر مزاج و متواضع تھے، لیکن باایں ہمہ غیور طبیعت رکھتے تھے اور عزت نفس کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کر سکتے تھے، بلکہ ایسے موقع پر ہر قسم کی

قربانی کے لیے آمادہ ہوجاتے تھے سر سالار جنگ اعظم کی وفات کے بعد جب اُن کے فرزند سر سالار جنگ ثانی کا دور شروع ہوا تو کچھ مدت بعد لوگوں نے وزیر موصوف کو نواب صاحب سے کسی قدر بدگمان کرادیا، نواب صاحب کو جب ان واقعات کی اطلاع ہوئی تو بدگمانی رفع کردی لیکن دو ماہ بعد پھر اُن کو ایک موقع پر وزیر کی بدگمانی کا پتہ چلا، تو بہت صدمہ ہوا، اور ایک عرضداشت مدار المہام کی خدمت میں پیش کی، جس میں لکھتے ہیں:

"گزارشے کہ تخمیناً قبل از دو ماہ روزے ہنگام شب بموجودی رائے گردھاری پرشاد صاحب بودم وارشادے کہ سرکار از غایت خاوندی فرمودند بر آں، آں قدر مطمئن خاطر بودم کہ شب بہ جلسہ دعوت باغ عامہ ہرگاہ رائے صاحب موصوف از شبہات و خدشات خاطر اقدس، نسبت عقیدت کیش ذکرے فرمودند، حیرتم درگرفت و اگر زبان دیگر شنیدے دفعتاً باور نداشتمے، ہر آنچہ تا بہ سرکار رسانیدند بہتانے است صریح، و بجز آنکہ علانیہ تحقیقات آں فرمودہ شود دیگر چہ عرض نمایم،

خوش بود گر محک تجربہ آید بمیاں
تا سیہ روئے شود ہر کہ در وغش باشد

بہر حال آنچہ حقیقت الامر بود عرض داشتم واین از خوش قسمتی ام بود کہ قبل از اختتام جلسہ آں ہمہ معروضات را سرکار بسمع قبول فرمودند"

آقائے نعمت! داستان طویل است، مگر سخن مختصر، از نسل شرفا ام و کافر نعمت نیستم۔ کارروائی ہشت و نہ سالہ ام بابت زمانہ ملازمت سرکار عالی شاہد است بریں کہ دامن عصمتم از مکروہات رذیلہ ہمیشہ پاک ماندہ است۔ بے شک گاہے در تفکرات مبتلا شدہ ام، و وقتے صدمات ہم برداشتہ ام مگر دیدہ حقیقت بیں دیدن مے تواند کہ آں ہمہ غیر از نتیجہ شدت راستبازی و شدت روش شریفانہ ام کہ مزاج ضدی موجودہ باوے مناسبتے کمتر داشتہ است دیگر ہم نہ بود۔

سرکار از کمال امارت و غایت صفائے باطن صاف صاف و مکرر ارشاد فرمودہ اند کہ از وابستگان دامن دولت، ہر کہ بہ خلوص باطن پیش آید باید کہ در حالت خود مطمئن باشد، و فدوی ہم صاف صاف عرض می نماید کہ تا آنکہ اعتبار و اعتماد سرکار بر عقیدت مندان راسخ باشد ما ہم تا جاں در تن داریم، بہ وفاداری و خلوص تمام کمر خدمت مستحکم بستہ بے دریغ خود را فدائے خیر خواہی و خیر سگالی سرکار خواہیم نمود، و الّا بحالتِ بے اعتمادی آقا اگر ملک سلیمان ہم زیر نگیں باشد در نگاہ ہیچ مدنے ہیچ میرزخارے بیش نیست تا بہ معتمدی چہ رسد"

آقائے من مکرر معافی ایں عرض مکرر میخواہم کہ وفاداری و عقیدت مندی ہم چو ما نیاز مندان بہ کلی در قبضہ اقتدار آقایان نعمت مے باشد اگر بہ اعتماد خداوندی پیش آیند از ملازمان ہم جز از خلوص و وفا دیگر ہم نہ بینند،

بندۂ حلقہ بگوش ار ننوازی برود
لُطف کُن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

و اگر ایں چنیں نیست، و بنیاد اعتماد و اعتبار صرف بر روایت بعضے از حضور رساں باشد نہ یک روز اطمینانے بکدام ملازم میسر شدنی است و نہ یک لمحہ راحتے و آرامے با آقا۔

. . . .

"چوں از شب دریں بے اطمینانی بودم بفحوائے الا بذکر اللہ تطمئن القلوب، فالے از قرآن مجید جستم ہر آنچہ یافتم قولے فیصل است از رب العزۃ، وہو ہذا،

ویقولون طاعۃ فاذا برزوا من عندک بیت طائفۃ منہم غیر الذی تقول واللہ یکتب ما یبیتون، فاعرض عنہم وتوکل علی اللہ ط وکفی باللہ وکیلا

انکسار | نواب صاحب کو خدائے تعالیٰ نے جو عزت و مرتبہ دیا تھا اور جو شاندار خدمات اُنھوں نے

انجام دیں وہ محتاجِ تذکرہ نہیں، لیکن باوجود اس کے وہ ہمیشہ اپنے کو ایک ادنیٰ درجہ کا شخص سمجھتے تھے، غرور و تکبر، خود بینی و خود نمائی کا اُن میں شائبہ بھی نہ تھا۔

ایک دفعہ منشی فیض احمد صاحب مارہروی نے کمبوہوں کے حالات میں ایک کتاب (المشاہیر) لکھنے کا ارادہ کیا اور اس سلسلہ میں نواب صاحب سے بھی اُن کے مفصل حالات کتاب میں لکھنے کے لیے دریافت کئے، نواب صاحب نے جواب میں لکھا:

"جو کچھ مہربانی سے میرے نامۂ اعمال کی نسبت ارشاد ہوا ہے، اُس کی شرح میرے قلم سے مشکل ہے، اس لیے کہ اپنے معائب سے جس قدر مجکو وسیع اطلاع ہے ایسی کسی دوسرے کو نہیں ہے، اور وہ اس قدر زیادہ ہیں کہ محاسن کو بالکل اپنے میں ڈھکے ہوئے ہیں، یہ نہ میرے لیے انصاف کی بات ہوگی، اور نہ ایک مورخ کے لیے کہ وہ حسنات کو تو بتلائے اور سیئات سے درگزر کرے، پس اگر شرح احوال مُراختلال میرے ذمہ ہو تو وہ سرتاسر خراباتی دفتر ہوگا۔"

سنہ ۱۹۱۰ء میں مولوی بشیر الدین صاحب اڈیٹر البشیر نے اُن سے درخواست کی کہ اسلامیہ سکول اٹاوہ میں آویزاں کرنے کے لیے اپنی ایک تصویر عنایت کریں، اس کے جواب میں لکھا،

"میری تصویر کی نسبت یہ ہے کہ جب تک کوئی آدمی زندہ ہے، اُس کی نسبت کوئی رائے قائم کرنی قبل از وقت ہے، آپ کو یا خود مجکو ہی کیا معلوم کہ کل ہی کو مجھ سے کس قسم کے افعال سرزد ہوں اور پھر اُس وقت آپ ہی میری تصویر کو اُس جگہ سے اُٹھاتے پھریں جہاں آج لگانا چاہتے ہیں۔ ...... تو آپ کے واسطے میں خیال رکھونگا اور اگر کوئی تصویر کبھی ملی تو میں بہت خوشی سے تمہاری ذات کے واسطے بھیجدونگا، اگر جیتے جی کوئی ایسا استحقاق رکھتا ہے تو وہ بھائی بشیر الدین ہو سکتے ہیں نہ کہ مشتاق حسین، خفیفت یہ ہے کہ جو کچھ بھائی تم نے باوجود

لے نان کواپریشن کی تحریک کے سلسلہ میں اس قسم کے واقعات پیش آچکے ہیں کہ جن لوگوں کی تصویریں پہلے بڑی عزت وشان کے ساتھ آویزاں کی گئی تھیں، بعد کو اُتار لی گئیں۔

اس عسرت کے کیا ہی، وہ مجھسے کافی فلاح کے وقتوں میں نہیں ہو سکا۔"

نواب لطیف یار جنگ بہادر فرماتے تھے کہ

"وہ (نواب صاحب) ادنی درجہ کے آدمی کی بھی بے حد تعظیم کرتے تھے، اور کسی درجہ کا منشی ہو اسکو اپنے برابر کا بھائی خیال کرتے تھے، بڑے آدمی اور چھوٹے آدمی میں کوئی فرق نہ کرتے تھے اور یہ اُن کی عام عادت تھی، چنانچہ بعض خود غرض اُن کی اس اسلامی عادت کو تصنع پر محمول کرتے تھے، حالانکہ اُن کے اقتدار اور قوت کو کبھی کسی مکر کی ضرورت نہ تھی، باوجود اس قدر اخلاق اور انکسار کے اُن کی ہیبت حق سرکشوں پر غالب تھی۔"

نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمن خانصاحب شروانی فرماتے ہیں۔

"اخیر قیام منصوری کے زمانہ میں رام پُریا ہاؤس میں نواب صاحب مقیم تھے، ایک حصہ اپنے لڑکوں کے لیے میں نے نواب صاحب سے کرایہ پر لے رکھا تھا، لڑکے اوپر کی منزل میں تھے میرا لڑکا پیارے میاں اُس زمانہ میں چند سال کا تھا، میں نے بارہا دیکھا کہ نواب صاحب میز پر کام میں مصروف ہیں، پیارے میاں دوڑتے ہوئے اوپر سے آکر نواب صاحب کے پاس سے گزرے، نواب صاحب معاً کھڑے ہو گئے، حیدرآبادی سلام کر کے فرمایا "آئیے پیارے میاں صاحب" یہ کہکر بیٹھے اور کام میں مصروف تھے۔"

پہلی مرتبہ اس قیام کے دوران میں منصوری میں گیا تو کوٹھی دیر میں ملی اور مقررہ وقت سے تاخیر سے پہنچا ہوا، جب میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ نواب صاحب باوجود ضعف اور پاؤں کی زحمت کے پریشان کوٹھی سے باہر انتظار میں کھڑے ہوئے تھے پہنچے، پر تاخیر کی وجہ دریافت فرمائی، اندر لیجا کر کھانا کھلایا، اُس کے بعد آرام کیا۔"

مولوی بشیر الدین صاحب اپنے سلسلہ مضامین میں لکھتے ہیں :-

"جس طرح وہ (نواب صاحب) ایک معزز و مقتدر شخص کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوتے تھے اُسی طرح ایک غریب و خستہ شخص کی تعظیم کو کھڑے ہوتے تھے، جس طرح وہ اپنے بزرگوں کی تعظیم کو کھڑے ہوتے اسی طرح وہ چھوٹوں کی اور مفلوک الحال اشخاص کی تعظیم کرتے تھے، یہی حالت اُن کی گفتگو اور بات چیت میں تھی وہ لڑکوں اور عام آدمیوں سے بھی جب گفتگو کرتے تھے تو "آپ" کا لفظ استعمال کرتے تھے ۔ — غرضکہ وہ نمونہ تھے اس امر کا کہ اگر تم دوسروں سے اپنی عزت کرانا چاہتے ہو، تو پہلے خود اُن کی عزت کرو"

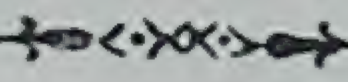
مولوی سید طفیل احمد صاحب کا بیان ہے کہ وہ اپنے بیٹے محمد احمد (مرحوم) کو جو اسکول میں پڑھتا تھا اور ۱۳-۱۴ سال کا تھا ہمیشہ لفظ "آپ" سے مخاطب کرتے تھے ۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں ندوہ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہونے والا تھا۔ صدارت کے لیے علامہ سید رشید رضا مصر سے آ رہے تھے، مولانا شبلی نعمانی نے طلبہ کے چھوٹے چھوٹے ڈپوٹیشن مختلف مقامات پر روانہ کیے، خاکسار سوانح نگار اُس زمانہ میں ندوہ کا طالب علم تھا، وفد کے سلسلہ میں بریلی جانا ہوا، وہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ نواب وقار الملک بہادر بھی آجکل حسنِ اتفاق سے بریلی میں مقیم ہیں، مسلم یونیورسٹی کے چندہ کے سلسلہ میں آئے ہیں، ہم لوگ یہ سُنکر قیام گاہ پر پہنچے، نواب صاحب کمرہ میں عصر کی نماز پڑھ رہے تھے، ہم برآمدہ میں ٹھہر گئے، جب نماز سے فارغ ہوئے تو آدمی نے اطلاع دی کہ دو صاحب ملاقات کے لیے آئے ہیں، نواب صاحب یہ سُنکر فوراً باہر آئے، ہم مصافحہ کرنا چاہا اُنھوں نے معانقہ کے لیے ہاتھ پھیلائے، اندر جا کر اپنے ہاتھ سے کرسیاں ٹھیک طریقہ سے رکھیں، بیٹھنے کے بعد ہم نے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی اور چندہ ممبری کا ذکر کیا، اُنھوں نے بڑی مسرت ظاہر کی، شکریہ ادا کیا، اور فرمایا یہ تو میرے لیے عین سعادت ہی، پھر آدمی سے کچھ کہا اُس نے پانچ روپیہ لا کر اُن کو دیئے،

نواب صاحب کرسی سے اُٹھے دو تین قدم چل کر میرے قریب تشریف لائے اور جس طرح نذر پیش کرتے ہیں روپیہ دونوں ہاتھوں پر رکھ سامنے جھک گئے اور فرمایا کہ "یہ حاضر ہے قبول فرمائیے"

میں تعظیماً کھڑا ہوگیا اور آداب بجالایا، اُنھوں نے دوبارہ شکریہ ادا کیا کہ ایسے مفید و نیک کام میں ہماری وجہ سے اُن کو شرکت کی سعادت حاصل ہوئی،

اُن کے اس انکسار اور فروتنی کا ہمارے قلب پر جو اثر پڑا وہ آج تک باقی ہی، حالانکہ یہ پہلی ملاقات تھی پہلے سے کوئی تعارف بھی نہ تھا۔



حیدرآباد میں کسی مسجد کے ایک نابینا کا کھانا اُن کے یہاں مقرر تھا، ایک دفعہ رات کو شدت سے بارش ہو رہی تھی خادمہ نے نابینا کا کھانا نوکر کو دیا اُس نے ایسی بارش اور تاریک رات میں جانے سے انکار کیا۔ نواب صاحب کو معلوم ہوا تو خود کھانا لیکر چپکے سے چلے گئے نابینا بھوکا بیٹھا تھا، بہت بڑبڑایا اور غصہ ہوا کہ آدھی رات کو روٹی لیکر آیا ہی، لیجا جا ہم نے نہیں لیتے، نواب صاحب نے بہت کچھ خوشامد اور منت سماجت کے بعد اس کو راضی کیا اور کھانا دیکر واپس آئے، اسی طرح امروہہ میں ایک درویش چھپرا شاہ کا کھانا اُن کے گھر سے مقرر تھا، جو نواب صاحب کے مکان سے زیادہ فاصلہ پر رہتے تھے، ایک رات سوء اتفاق سے نوکروں کی غفلت سے کھانا نہیں گیا، نواب صاحب کو خبر ہوئی تو خود لیکر گئے۔



خودداری | باوجود انکسار اور فروتنی کے نواب صاحب نہایت ذکی الحس تھے، اور ہر موقع پر خودداری اور عزت نفس کا پورا لحاظ رکھتے تھے ایک موقع پر نواب مکرم الدولہ نے جو ایک مدرسہ کی مجلس کے میر مجلس تھے نواب صاحب کا نام مجلس کی رکنیت سے خارج کر دیا۔ اس کے متعلق ایک خط میں جو غالباً مدرسے کے مہتمم یا منیجر کے نام ہی لکھتے ہیں

"کل دوپہر کو جناب خداوند نعمت نواب مکرم الدو بہادر نے مجھسے ارشاد فرمایا کہ تیرا نام مجلس مدرسہ سے مصلحتاً خارج کر دیا گیا ہی، جس کا صاف یہ مطلب ہی کہ میری بدمذہبی سے چونکہ یہاں کے عام لوگ اور اعزہ ناراض ہیں تو کہیں ایسا نہو کہ میری شرکت کی وجہ سے

وہ صاحب مدرسہ کی طرف سے متنفر ہو جائیں، اور مدرسہ کی کامیابی میں خلل پڑے۔

جناب خداوند نعمت اس ریاست کے ایک رُکن رکین ہیں، اور یہاں کے عام خیالات اور اس قسم کی مصلحتوں سے بہت زیادہ واقف ہیں، پس جس بات کو جناب ممدوح نے ایک اہم معاملہ خیال کیا ہے، ضرور ہے کہ میں بھی اُسی کی تائید کروں، اور اسی نیت سے میں نے آج سے بندہ زادہ کا مدرسہ میں جانا موقوف کر دیا ہے، کیونکہ یہ ضرور ہے کہ اگر یہاں کے اعزہ میری بدمذہبی کی وجہ سے اور میرے خراب چال چلن کی وجہ سے مجھسے متنفر ہیں، تو میرے بیٹے کا بھی اپنے بچوں کی صحبت میں رہنا فساد سے خالی نہ سمجھیں گے اور گو جناب ممدوح نے ابتداءً شاید (بلکہ غالباً) میری خاطر سے بندہ زادہ کے داخل مدرسہ ہونے پر اعتراض نہیں فرمایا اور میں اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں، لیکن مجھکو خود نہیں چاہیے کہ خود غرضی سے کوئی ایسا کام کروں جو اس ریاست کی عام مصلحت کے برخلاف ہو۔

اب آپ کو اختیار ہے کہ مدرسہ کی کتاب داخل طلبہ میں اس معاملہ کی کیفیت جو مناسب ہو وہ لکھوا دیں اور میں یہاں تک بھی راضی ہوں کہ اگر مدرسہ کی کامیابی کے واسطے مفید ہو تو یہی لکھدینا چاہیے کہ فلاں طالب علم کے باپ کے فساد عقیدت کی وجہ سے اس طالب علم کا نام خارج کیا گیا، سرکاری جریدہ میں تو ایسی واہیات باتوں کا اشتہار بالکل ہی نامناسب ہے، لیکن میں بخوشی اجازت دیتا ہوں کہ اگر اس کا اشتہار اخباروں میں مدرسہ کی کامیابی کے واسطے مفید ہے تو جناب میر مجلس اس کو اخباروں میں مشتہر کر سکتے ہیں"

سنہ ۱۳۰۳ھ میں مدار المہام (سالار جنگ ثانی)، کا ایک حکم سرکاری جریدہ میں شائع ہوا جس میں معتمد مالگذاری کی ایک کارروائی پر جو ایک حد تک صوبہ داروں سے تعلق رکھتی تھی اعتراض کیا گیا تھا، نواب صاحب اس زمانہ میں صوبہ دار تھے، اور چونکہ اس حکم میں کسی حد تک صوبہ داروں پر بے اعتمادی کا اظہار

کیا گیا تھا، نواب صاحب کو ناگوار گذرا اور اُنھوں نے نواب محسن الملک کو جو اس زمانہ میں معتمد پولیٹیکل وفنانس تھے ایک باضابطہ تحریر بھیجی جس کے بعض فقرے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

"اس حکم کا وہ حصہ جہاں سرکار مدارالمہام نے معتمد صاحب مالگذاری کی اس کارروائی کو کہ اُنھوں نے ایک دلکار کا نقل صوبہ داروں کے پاس بھیجدیا، ناپسند فرمایا ہے، صوبہ داروں کی نسبت سرکار کی بے اعتمادی کو ظاہر کرتا ہے، لہٰذا میں اس تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں کہ میری اس گزارش کو آپ مہربانی سے سرکار میں پیش فرما کر اُس سے مجکو ممنون فرمائیں گے،

سرکار کے اس حکم میں صوبہ داروں کا درجہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اگر سرکار سے کوئی غلطی ہوجائے، تو چاہیے کہ صوبہ دار اُس پر مطلع نہ ہونے پائیں، اور اگر ہم لوگ اُن غلطیوں پر مطلع ہوں تو سرکار عالی اُس میں اپنی بدنامی سمجھتی ہے، مجکو پورا یقین ہے کہ کبھی نواب مدارالمہام سرکار عالی کا دل سے یہ منشا نہ ہوگا کہ سرکار عالی اور صوبہ داروں کے درمیان اس قدر مغائرت قائم رکھیں گے"

اس کے بعد اُنھوں نے صوبہ داروں کی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"بلحاظ اس اعتماد اور اعتبار کے جو کہ سرکار عالی نے نہایت الطاف اور خاوندی سے ہم کو بخشا ہے اور جس کا اظہار وقتاً فوقتاً عمل میں آیا ہے ہم لوگ شاید اس کے ناقابل بھی نہیں ہیں کہ اُن رازوں کی کماحقہ حفاظت کریں، تا بہ اطلاع چند غلطی ہائے دفتر چہ رسد، پھر وہ کون دفتر ہے جو غلطی نہیں کرتا، اور کیا سرکار عالی کا یہ خیال ہے کہ صوبہ دار کبھی سرکار عالی کے دفاتر کی غلطی پر مطلع نہیں ہونے پاتے"

یہ تحریر بہت طویل ہے آگے چل کر اُنھوں نے نواب مدارالمہام کے حکم کو نامناسب قرار دیا ہے۔ اور معتمد مالگذاری کے طرز عمل کی حمایت کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ نواب مدارالمہام کے اس حکم سے

صوبہ داروں کی خودداری کو صدمہ پہنچا ہے۔

استغنا | **نواب صاحب** کثیر المصارف شخص تھے اس لیے اُن کو ہمیشہ روپیہ کی ضرورت رہتی تھی مگر بایں ہمہ مزاج میں استغنا تھا، اس لیے اُنہوں نے وہ جائز فائدے بھی شاذونادر حاصل کئے، جو اُن کے ہم رتبہ عہدہ دار اکثر حاصل کرتے تھے، مثلاً اکثر رسوخ یافتہ عہدہ دار اپنی اولاد کی تعلیم کے لیے، شاہی وظائف سے مستفید ہوتے ہیں، یہاں تک کہ یورپ کی تعلیم کے لیے وظائف حاصل کرتے ہیں، نواب صاحب نے بھی اپنے فرزند محمد احمد کو انگلستان بھیجا، لیکن گورنمنٹ نظام سے وظیفہ نہیں لیا، بلکہ اپنے پاس سے قریباً پانچ سو ماہوار صرف کرتے رہے، حالانکہ وہ عسرت کے ساتھ گذر کرتے تھے۔

نواب صاحب ایک دفعہ حُسن اتفاق سے شاہی عطیہ سے سرفراز ہوئے، ایوان شاہی میں حاضر تھے اور میز کے پاس کام میں مصروف، دفعتاً **اعلیٰ حضرت** برآمد ہوئے، نواب صاحب نے فوراً چشمہ اُتار کر تعظیم دی، اعلیٰ حضرت کی نظر چشمہ پر پڑی، اُٹھاکر فرمایا:

"مولوی صاحب چشمہ کا فریم تو بہت خراب ہے"

عرض کیا

"پیرومرشد اگر اتفاق سے یہ چشمہ کہیں رہ جائے، تو لوگ اس کو لاکر دیدیں گے،

کیونکہ اس کی قیمت تو صرف چھ آنے ہے، اور یہ مشتاق حسین کی آنکھیں ہیں"

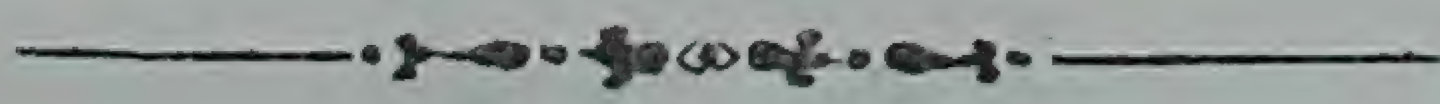
اعلیٰ حضرت نے چشمہ رکھدیا، اور ایک نہایت قیمتی و اعلیٰ درجہ کا فریم مرحمت فرمایا، جس کو نواب صاحب نے ہمیشہ ایک عزیز یادگار کے طور پر محفوظ رکھا۔

آخری زمانہ میں نواب صاحب کو **اعلیٰ حضرت** نے ایک مکان عطا فرمایا، لیکن اُس کے لیے سرآسماں جاہ بہادر نے تحریک کی تھی، خود نواب صاحب کی درخواست نہیں تھی اسی طرح خطاب بھی بلاسعی وطلب ملا، حالانکہ لوگ اس کے لیے خاص طور پر کوشش کرتے ہیں۔

غیبت سے احتراز | آج کل ہماری سوسائٹی کے قریباً ہر طبقہ میں ایک بڑا عیب یہ پیدا ہو گیا ہے کہ جب آپس میں جمع ہو کر بیٹھتے ہیں تو لطف صحبت اور گرمی مجلس کے لیے غیبت شروع کر دیتے ہیں، مختلف لوگوں کی عادات واطوار، اور وضع قطع پر نکتہ چینیاں ہوتی ہیں اور مضحکہ انگیز واقعات بیان کیے جاتے ہیں، یہ واقعات اس قدر عام ہیں کہ ہماری سوسائٹی کا ہر شخص اس کمزوری سے واقف ہے، چنانچہ ایک صاحب کا واقعہ ہے کہ وہ روزانہ شب کو ایک صحبت میں شریک ہوا کرتے، لیکن سب سے آخر میں اُٹھتے تھے، لوگوں نے اس کو محسوس کیا، آخر کسی نے ایک دن پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ آپ سب کے چلے جانے کے بعد اُٹھتے ہیں؟ کہا بات یہ ہے کہ میں روزانہ دیکھتا ہوں کہ جب کوئی شخص مجلس سے اُٹھکر چلا جاتا ہے تو فوراً اُس کی غیبت شروع ہو جاتی ہے اور حاضرین مجلس اُس کی عادات و اطوار پر رائے زنی اور نکتہ چینی کرنے لگتے ہیں، اسی طرح یکے بعد دیگرے ہر شخص کے ساتھ یہ سلوک کیا جاتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ میرے متعلق یہ نوبت نہ آئے اس لیے جب میدان صاف ہو جاتا ہے اور کوئی گفتگو کرنے والا نہیں رہتا تو اُٹھتا ہوں کہ اب کوئی اندیشہ نہیں۔

لیکن **نواب وقار الملک** اُن چند بزرگوں میں تھے جن کی صحبت اس عیب سے پاک تھی وہ نہ غیبت کرتے تھے نہ سُنتے تھے اور کسی کو یہ جرأت بھی نہ ہوتی تھی کہ اُن کے سامنے غیبت کرے، اور کبھی اتفاق سے ایسا ہو جاتا تھا تو جو بُرائی کسی کی اُن کے سامنے بیان کی جاتی تھی وہ اس کی کوئی ایسی توجیہ یا تاویل کر دیتے تھے کہ وہ بُرائی لوگوں کی نظر میں بُرائی نہ رہے۔

مولوی بشیر الدین صاحب لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص غیبت کرتا تو وہ اس انداز سے گفتگو کا سلسلہ بند کر دیتے تھے کہ گفتگو کرنے والے کو محسوس نہ ہوتا تھا۔



پارٹی فیلنگ سے اجتناب | **نواب صاحب** کے حالات پڑھنے سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کو **پارٹی فیلنگ** سے سخت نفرت تھی وہ ہر معاملہ پر صرف اس معاملہ کی حیثیت سے غور کرتے تھے اُن کو اس سے کچھ بحث نہیں ہوتی تھی کہ دوسروں کی اس معاملہ کے متعلق کیا رائے ہے، اس لیے

اکثر اوقات ان کو اپنے احباب و معتقدین سے اختلاف کرنا پڑتا تھا، اور اُن کے بعض دوستوں کو، جو ہمیشہ اس کے متمنی رہتے تھے کہ نواب صاحب ہر معاملہ میں اُن کے ہم آہنگ ہوں بڑی مایوسی ہوتی تھی، لیکن جب رفتہ رفتہ لوگوں کو اُن کی یہ عادت معلوم ہوگئی کہ کسی شخص سے اُن کا اختلاف محض صداقت پر مبنی ہوتا ہے نہ کہ مخالفت پر، تو پھر کوئی شخص بھی اُن پہ بدگمانی نہیں کرتا تھا، اور نہ کوئی شخص اُن کو اپنی پارٹی کا مخالف سمجھتا تھا۔

بے شبہ دیانت اور راستبازی کا یہی طریقہ ہے، جو نواب صاحب کا تھا، لیکن اس پر عمل کرنا سہل نہیں، کیوں کہ جس شخص کا یہ اصول ہو وہ کسی جماعت کو بھی خوش نہیں رکھ سکتا، اور حیدرآباد کی تو خاص طور پر یہ حالت تھی کہ جس کی کوئی پارٹی نہ ہو وہ ہمیشہ خطرہ کی حالت میں رہتا تھا، اور مصیبت کے وقت کسی سے بھی اعانت کی توقع نہیں کرسکتا تھا، وہ خود بھی اس حقیقت سے ناآشنا نہ تھے، لیکن بااین ہمہ کبھی اُنھوں نے اپنا طرزِ عمل نہیں بدلا، نہ گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوکر کسی خاص پارٹی میں شامل ہوئے۔

سر سالار جنگ اعظم کے بعد حیدرآباد میں جو دور شروع ہوا، وہ نہایت عجیب و غریب تھا، بڑے بڑے تجربہ کار جہاں دیدہ اور ذی اقتدار عہدہ دار اس وقت حیدرآباد میں موجود تھے جو اپنا اثر و اقتدار بڑھانے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کررہے تھے، ہر شخص دوسرے کو دھکیل کر آگے بڑھنا چاہتا تھا، نواب صاحب اس ڈھب کے نہ تھے، اس لیے وہ باہر ٹالے گئے، یعنی صوبہ دار بنا کر ورنگل بھیج دئے گئے، لیکن جب سر آسماں جاہ بہادر مدارالمہام ہوئے تو اُنھوں نے حیدرآباد بُلا لیا یہاں آکر پھر اُن کو مشکلات میں مبتلا ہونا پڑا، اس زمانہ میں نواب محسن الملک نواب فتح نواز جنگ، نواب سرور جنگ وغیرہ عہدہ دار موجود تھے جن کی طباعی کو حیدرآباد کی سیاسی تاریخ میں خاص شہرت حاصل ہے، یہ لوگ کبھی باہم دوست ہوجاتے تھے اور کبھی مخالف، ایک زمانہ میں نواب فتح نواز جنگ اور نواب محسن الملک کے درمیان گہرے تعلقات تھے، چند روز بعد ایک دوسرے کے سخت مخالف ہوگئے اور دو جداگانہ پارٹیاں قائم ہوگئیں اور مدت تک کشمکش

رہی، لیکن نواب صاحب کے تعلقات دونوں سے دوستانہ تھے، اگرچہ نواب محسن الملک نے ابتدا میں چند مرتبہ خفا ہو کر اُن کو لکھا کہ آپ نے فتح نواز جنگ کی محبت میں مجکو چھوڑ دیا، لیکن آخر میں اُن کو اعتراف کرنا پڑا کہ نواب وقار الملک کا طرزِ عمل شکوک و شبہات سے بالاتر تھا۔

نواب وقار الملک کے آخری زمانہ میں تو متعدد پارٹیاں قائم ہو گئیں تھیں، اور بڑا طوفان برپا تھا مگر اس موقع پر بھی وہ ثابت قدم رہے۔

خود نواب صاحب ایک خط میں حاجی محمد اسمٰعیل خاں کو لکھتے ہیں:

"مولوی محمد سمیع اللہ خاں کی نسبت آپ نے پھر اس عنایت نامہ میں تحریر فرمایا ہے میں اس سے پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ ہرگز بھی میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ میں اُن کی مخالفانہ کارروائی کو پسند کرتا ہوں اور نہ مجکو آپ اُن کی پارٹی کا ایک ممبر سمجھیں، میں تو سرے سے پارٹی فیلنگ ہی کا دشمن ہوں، میں نے حیدرآباد سی جگہ میں کبھی اپنی کوئی پارٹی نہ بنائی، جو لوگ عرف عام میں (نہ کہ میرے نزدیک) میرے مخالف سمجھے جاتے تھے، بسا اوقات میں بمقابلہ اُن کے جو میرے دوست اور دلی دوست سمجھے جاتے تھے، اُنھیں مخالفین کی کارروائی کی تائید کرتا ہوا پایا جاتا تھا، ایک دن مجھسے ایک دوست نے کہا کہ سلطنتی معاملات میں تمہارا یہ طریقہ فائدہ بخش نہیں ہے، آخر کسی کو بھی اپنا ایسا دوست رکھو گے جو ہر حالت میں تمہارا طرفدار رہے، میں نے کہا کہ ہاں ایک شخص کو اور وہ "خدا" ہے"

اسی سلسلہ میں ٹرسٹیز بل کے معاملہ پر بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اگر مولوی سمیع اللہ خاں صاحب بھی جناب سید صاحب کی طرح پارٹی فیلنگ میں ایسے ہی مستغرق سمجھے جائیں کہ ہمارے بچوں کی تعلیم و تربیت کے انتظاموں کے کرتے وقت ہمیشہ اُن کو یہ ایک اور خیال و خبط بھی رہے کہ سر سید کی پارٹی کو غلبہ نہ ہونے پائے جس سے سیدھا کام بھی خواہ نخواہ ٹیڑھا ہوگا، تو ہم نہ ایک کے بندے ہیں نہ دوسرے

کے، دونوں اپنے اپنے گھر خوش رہیں، کالج کا بار کسی تیسرے کے اوپر رکھنا چاہیے جس کو ٹرسٹی بالاتفاق یا بغلبۂ آرا ر پسند کریں"

حیدرآباد سے آنے کے بعد اُن کو کالج کے معاملات میں حصہ لینے کا زیادہ موقع ملا، یہاں بھی پارٹیاں قائم تھیں لیکن وہ سب سے علیحدہ رہے نواب محسن الملک کے آخر زمانہ میں جبکہ بعض سربرآوردہ ٹرسٹیوں کی یہ خواہش تھی کہ نواب وقار الملک علی گڑھ آکر رہیں اور کالج کے کاروبار میں نواب محسن الملک کو مدد دیں انہوں نے صاف صاف لکھ دیا کہ

"واقعہ یہ ہے کہ میرے نزدیک میرا علی گڑھ میں جاکر رہنا گو کہ وہ آنریری سکرٹری کو مدد دینے ہی کی غرض سے ہو، بجائے مفید ہونے کے کالج کے حق میں مضر ہے"

اس کی وجہ اُنھوں نے یہ بیان کی ہے کہ میں کالج کے تمام معاملات اور نقائص پر نظر رکھونگا اور بہت سے معاملات میں آنریری سکرٹری سے اختلاف ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ

"پھر ایک سلسلہ ناگوار نکتہ چینی کا قائم ہو جائیگا، اور میرا گھر ایک زبردست مورچہ آنریری سکرٹری کے خلاف سمجھا جانے لگے گا، جہاں وہ تمام لوگ جمع ہوا کرین گے جو میری رائے سے متفق ہوں گے اور مجاری یقیناً میری طرف ہوگی، اور اس طرح پر پارٹی فیلنگ کا خاصہ نقشہ جم جائیگا، جو کالج کے حق میں بے انتہا مضرت بخش ہوگا"

اس کے بعد جب وہ کالج کے آنریری سکرٹری ہوئے اُس وقت بھی اُن کا طرزِ عمل آزاد اور بے لوث تھا جیسا کہ خود انہوں نے ایک موقع پر ظاہر کیا تھا اور ہم کسی مقام پر اس کا تذکرہ کر چکے ہیں، یعنی

"میرا طرز کارروائی یہ ہوگا کہ جس وقت میں نے آنریری سکرٹری کی حیثیت سے کالج میں قدم رکھا، میں نے بالاعلان اس کو ظاہر کر دیا کہ میں پارٹی فیلنگ کو پسند نہیں کرتا اور نہ صرف ٹرسٹیوں کی پارٹی میں اس فیلنگ کے پھیلنے کو میں روکوں گا بلکہ اولڈ بوائز کی پارٹی فیلنگ کو بھی میں حتی الامکان کمزور کرنے کی کوشش کرونگا"

"میں نے یہ بھی صاف کہدیا کہ میں اپنے گرد وپیش ہیڈ کوارٹر میں کوئی پارٹی قایم کرنا نہیں چاہتا"

مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں جب لکھنؤ میں ڈیپوٹیشن کے ممبروں کا انتخاب عمل میں آیا، اور اس انتخاب میں بعض کارروائیاں ایسی کی گئیں جن میں صاف طور پر پارٹی فیلنگ کا اثر پایا جاتا تھا تو انہوں نے پبلک طور پر اس طرز عمل پر نکتہ چینی کی، اور باوجود ذاتی تعلقات کے آنریبل سر راجہ محمود آباد اور مسٹر محمد علی آکسن بھی اس سے نہ بچ سکے، حالانکہ اُس زمانہ میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ مسٹر محمد علی کا اُن پر بہت کچھ اثر ہے۔

اسی طرح اور متعدد واقعات ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُن کی ذات اس قسم کی کمزوریوں سے بالاتر تھی کہ قومی معاملات میں ہمیشہ کے لیے کسی شخص یا جماعت کی رائے کے پابند ہو جائیں، یہی سبب ہے کہ کبھی وہ ایک پارٹی کے ساتھ نظر آتے ہیں اور کبھی دوسری کے ساتھ، اور نہ حیدرآباد میں اُنہوں نے کوئی پارٹی بنائی نہ علی گڑھ میں۔

مولوی بشیرالدین اڈیٹر البشیر لکھتے ہیں:

"جو کچھ واقعات پچھلے زمانہ میں ہوئے اور جس طرح ٹرسٹیوں میں متضاد پارٹیاں قائم ہوئیں جو لوگ اس پارٹی بندی کے نتائج سے واقف ہیں، وہ تصدیق کریں گے کہ نواب وقارالملک بہادر کی رائے اس معاملہ میں بالکل صحیح تھی اور جبکہ ہر شخص قوم کی سب سے بڑی خدمت یہ خیال کرتا ہے، کہ وہ علی گڑھ میں مکان بنا کر رہے، نواب وقارالملک نے کالج اور قوم کی محبت کی وجہ سے علی گڑھ سے باہر رہنا قوم اور کالج کے لیے زیادہ مفید خیال کیا"

نکتہ چینی کا اثر اور اعتراف خطا | **نواب صاحب** طویل زمانہ تک با اقتدار سرکاری عہدوں پر مامور رہے اُس کے بعد اُن کو مہتم بالشان پبلک خدمات میں مصروف ہونا پڑا، جو شخص اس پوزیشن میں ہو وہ کبھی نکتہ چینی اور اعتراض سے محفوظ نہیں رہ سکتا، حیدرآباد کے زمانہ قیام میں اُن کی مخالف پارٹی کے اخبارات جب موقع ملتا تھا اُن پر نکتہ چینیاں کیا کرتے تھے، کبھی کبھی مخالف عہدہ دار بھی ایسا

گرگذرتے تھے چنانچہ ایک دفعہ ایک بڑے عہدہ دار دستور تن جی نے برسر مجلس (جس میں بڑے بڑے سرکاری عہدہ دار موجود تھے) ایک تقریر کی اور نواب صاحب پر یہ الزام لگایا کہ وہ ملکی لوگوں کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کو ترجیح دیتے ہیں، اور اُن کو نفع پہنچاتے ہیں، الزام سخت تھا اور خلاف واقعہ اس لیے نواب صاحب نے جواب میں ایک نہایت پرزور، مدلل؛ اور معرکۃ الآرا تقریر کی ایک ایک کرکے تمام اعتراضات کا جواب دیا اور ثابت کردیا کہ اُنہوں نے سب سے زیادہ ملکیوں کو فائدہ پہنچایا، سرآسمانجاہ کے زمانہ میں جبکہ اُن کا اقتدار بہت بڑھ گیا تھا اور زیادہ نکتہ چینیاں ہوتی تھیں، یہاں تک کہ ایک مشہور انگریزی اخبار نے ایک دفعہ یہ لکھدیا کہ سرآسمانجاہ تو زنان خانہ میں رہتے ہیں سب کام مشتاق حسین کرتے ہیں یہاں تک کہ کاغذات پر جعلی طور پر اُن کی طرف سے دستخط بھی کردیتے ہیں۔

حیدرآباد سے آنے کے بعد جب وہ پبلک خدمات میں مصروف ہوئے، جب بھی نکتہ چینی سے محفوظ نہ رہے، خصوصاً مسٹر آرچبولڈ کے معاملہ اور مسلم یونیورسٹی کے قضیہ میں بعض لوگوں نے اُن پر سخت نکتہ چینیاں کیں، لیکن اُن کا ہمیشہ یہ طریقہ رہا کہ وہ ہر نکتہ چینی کو نہایت اطمینان اور ٹھنڈے دل سے سُنتے تھے، اگر نکتہ چیں ادنیٰ درجہ کا شخص ہوتا جب بھی وہ اس کو اپنے سے کم رتبہ سمجھکر ناقابل خطاب نہیں سمجھتے تھے، نہ اخبارات میں جواب لکھنا اپنے مرتبہ کے خلاف جانتے تھے، اور خواہ کیسے ہی سخت الفاظ میں نکتہ چینی کی جائے وہ کبھی مشتعل نہیں ہوتے تھے، جواب ایسے نرم اور مہذب الفاظ میں ہوتا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ مخالف کی درشت کلامی کا اُن کے دل پر ذرا بھی اثر نہیں ہے، جواب میں وہ کبھی معترض کی نیت پر حملہ نہیں کرتے بلکہ نکتہ چینی کو خلوص اور نیک نیتی پر محمول کرتے تھے اور معترض کا نام عزت سے لیتے تھے، اور یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ ہمیشہ جواب ہی دینے کی کوشش کریں بلکہ جب اعتراض صحیح ہوتا بلا تامل قبول کرلیتے اور پبلک طور پر اپنی خطا کا اعتراف کرلیتے تھے۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں جب مسلم یونیورسٹی کا معاملہ زور و شور سے چھڑا ہوا تھا، خواجہ غلام الثقلین مرحوم

نے نواب صاحب کے خلاف چند مضامین لکھے، ایک مضمون کا عنوان تھا "نواب وقار الملک اور محمدن یونیورسٹی کا ڈراما"، اس مضمون میں وہ اعتدال سے تجاوز کر گئے تھے، اور بعض الفاظ سے صاف طور پر ذاتی ناخوشی کی جھلک نمایاں تھی، واقعہ یہ تھا کہ خواجہ صاحب کچھ مدت سے کالج کے بعض ارباب حل و عقد سے ناخوش تھے، خصوصاً صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب سے اُن کو زیادہ شکایت تھی، اور نواب صاحب کے متعلق یہ بدگمانی تھی کہ وہ اُن کی مخالف پارٹی کے زیرِ اثر ہیں، اس بنا پر اُن کے مضمون میں ایک قسم کا جوش اور تلخی پیدا ہو گئی تھی۔

مضمون کے خاتمہ پر خواجہ صاحب نے لکھا تھا:

> آخر میں، میں نہایت ادب سے ان تمام حضرات سے معافی مانگنا چاہتا ہوں جن کے جذبات یا خیالات کو اس مضمون سے صدمہ پہنچے، اور امید کرتا ہوں کہ کم از کم وہ اس بات کا یقین کریں گے کہ روشنی لانے کے لیے تمام دریچوں کا بند کرنا مفید نہیں، نیز نواب وقار الملک بہادر قبلہ کا دلی احترام تاریک کمرہ میں مجکو ایسے مضمون لکھنے پر جس سے شاید وہ ناخوش ہوں خود متأسف کرتا ہے"،

مضمون درحقیقت ایسا تھا کہ جس شخص کے خلاف بھی لکھا جاتا وہ سخت مشتعل ہوتا، اور سختی سے جواب دیتا لیکن نواب صاحب نے یہ نہیں کیا، بلکہ اُنھوں نے اسی آخری فقرہ کے جواب سے مضمون کی ابتدا کی اور لکھا،

> "میں سب سے پہلے خواجہ صاحب کے اس فقرہ کے لحاظ سے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں ہرگز اُن کے مضمون سے ناخوش نہیں ہوا، بلکہ میں نے اسکو نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ خواجہ صاحب نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے، نہایت ہی نیک نیتی سے لکھا ہے، اور جو المؤمن مرآۃ المؤمن کا مصداق ہے، اور میں جو یہ چند سطریں لکھنے کی جرأت کرتا ہوں، اس سے میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ اس مضمون کی تحریر کے وقت وہ کاغذات جن میں سے بعض خیالات اخذ کیے گئے ہیں، غالباً جناب ممدوح کے

سامنے میز پر موجود نہ تھے، اور صرف یاد کے بھروسہ پر جو بعض نکتہ چینیاں اس مضمون میں قلم بند ہوئی ہیں اُن کی اصلاح ہو جائے، ورنہ ہر ایک شخص جو پبلک کاموں میں مصروف ہو، اس کے واسطے اس سے زیادہ کوئی مدد نہیں ہو سکتی کہ اس کو اسکی غلطیوں پر مطلع کیا جاتا رہے، اور اگر کوئی شخص ان نکتہ چینیوں سے ناخوش ہوتا ہو تو اُس کے لیے بہترین صلاح یہ ہو گی کہ وہ ان کاموں سے دستکش ہو اور گوشہ عافیت اختیار کرے۔"

عام اشخاص کی نکتہ چینی کے علاوہ اخبارات کی نکتہ چینی کو بھی وہ ناپسند نہیں کرتے تھے، اُن کے نزدیک اخبارات کی زبان بند کرنے کی کوشش کرنا کوئی عمدہ پالیسی نہ تھی۔ سنہ ۱۹۰۷ء میں جب طلبہ نے اسٹرائک کی اور تحقیقات کے لیے کمیشن بیٹھا تو اُس کے بعض ممبروں نے اسباب شورش میں ایک سبب اخبارات کی نکتہ چینی کو بھی قرار دیا مگر نواب صاحب نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا:

"مسٹر محمد علی صاحب اولڈ بوائے نے جو مضامین انگریزی اخبارات میں اس شورش سے قبل لکھے ہیں اور جن کو انھوں نے کمیشن کے سامنے اس بیان سے پیش کیا ہے کہ وہ ایک عرصہ دراز سے کالج کے ٹرسٹیوں اور اسٹاف کو موجودہ خرابیوں پر مطلع و متنبہ کرتے چلے آتے تھے، میں اُن کو اسباب شورش میں شامل کرنے سے قطعاً اجتناب کروں گا،

مسٹر محمد علی صاحب اس کالج کے پرانے طلبہ میں نہایت لائق اور نامی طالبعلم ہیں، انھوں نے بی اے کی ڈگری آکسفورڈ سے آنرز کے ساتھ حاصل کی ہے اور ابھی کچھ عرصہ پیشتر تک یہ کوشش ہو رہی تھی کہ اُن کی نہایت قیمتی خدمات کالج کے واسطے حاصل کی جائیں، اُن کو اپنے کالج سے حد سے زیادہ ہمدردی و محبت ہے ان کے ان مضامین کو اسباب شورش میں شامل کرنے کے صرف یہ معنی ہوں گے

کہ ہم لوگ اپنے خلاف کسی نکتہ چینی کو ٹھنڈے دل سے سننا نہیں چاہتے، یہ نکتہ چینیاں اگر غلط تھیں تو سب سے آسان طریقہ یہ تھا کہ معقول دلائل کے ساتھ اخباروں میں ان کی تردید کر دی جاتی تاکہ ناظرین اخبارات کو کوئی غلط فہمی نہ ہونے پاتی، اور اگر بدون اس طرف توجہ کیے ہوئے کہ وہ نکتہ چینیاں صحیح تھیں یا غلط محض اس بنیاد پر اُن مضامین کو اسباب شورش میں شامل کیا جانا جائز ہو کہ طلبہ کے دلوں میں ان کی وجہ سے کالج کے انتظاموں کے متعلق نارضامندی کا پیدا ہونا ممکن تھا تو اسباب شورش میں ایک "مد" ہم کو اس ترک فعل کے لیے اضافہ کرنی چاہیے کہ کیوں ہم نے اُن نکتہ چینیوں کی تردید مناسب وقتوں پر نہ کی،

اُن کی مضبوطی کے ساتھ یہ رائے تھی کہ

"ہم کو اپنا انتظام درست رکھنا چاہیے، اس کے بعد کسی نکتہ چینی سے ہم کو ڈرنا نہیں چاہیے، جس کے جو جی میں آئے وہ کہے، اور جس کے جو جی میں آئے لکھے، ہمارے لیے صرف یہ کافی ہو گا کہ اگر ہمارے انتظام پر کوئی غلط حملہ کیا جائے، تو ہم نہایت ٹھنڈے دل سے اس کے جواب میں اصلی واقعات پبلک کے سامنے ظاہر کر دیں اور فیصلہ کو پبلک پر چھوڑ دیں"،

جو کچھ اُنہوں نے لکھا اسی پر اُن کا عمل بھی تھا، کالج وغیرہ کے معاملات کے متعلق جب کوئی غلط اطلاع اور خلاف واقعہ اعتراض اخبار میں شائع ہو جاتا تو وہ فوراً اخبار ہی کے ذریعہ تردید کر کے اصل واقعہ ظاہر کر دیتے تھے، اس طرز عمل کا یہ فائدہ تھا کہ غلط فہمی رفع ہو جاتی تھی، غرض وہ سکوت کی پالیسی کے مخالف تھے، ایک دفعہ ۱۹۰۹ء میں جب مولوی سید طفیل احمد صاحب (ٹرسٹی) نے اخبارات کے متعلق اسی قسم کے خیالات ظاہر کیے تو اُنہوں نے پھر یہی لکھا کہ

"اگر کوئی خراب اثر اُس وقت اخباروں سے پہنچا تو وہ منتظمان کالج کے سکوت کی وجہ سے تھا، جنہوں نے اخباروں کے مضامین کی طرف سے نہایت بے پروائی برتی ــــــ حالانکہ ہم کو اس بات کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے کہ اگر کوئی

نقص ہمارے انتظاموں میں ہے، تو اُس کا اعتراف کریں اور اس کی اصلاح کریں اگر اگر کسی دوسرے کی غلط فہمی ہے تو اُس کو رفع کرنے کی کوشش کریں اور یہ کسی طرح ٹھیک نہیں کہ خود تو ہم کچھ نہ کریں اور معترضین کے اعتراضات سے بُرا مانیں"

لیکن باوجود اس اصول کے وہ یہ بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ اخبارات میں بدنیتی کے ساتھ قومی کاموں پر نکتہ چینی کی جائے ایک دفعہ کسی گمنام ٹرسٹی نے اخبار میں ایک خطرناک مضمون لکھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ کالج میں لڑکپن ہی سے انگریزوں سے نفرت کرنا سکھایا جاتا ہے" نواب صاحب نے اس کا معقول جواب دیا، پیسہ اخبار نے اس جواب پر نکتہ چینی کی اور ایک گونہ گمنام ٹرسٹی کی حمایت کی نواب صاحب نے پھر ایک مفصل و مدلل مضمون لکھا، جس میں یہ خیال ظاہر کیا کہ

"بلاشبہ پیسہ اخبار کی اس تحریر سے کوئی ٹرسٹی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ ہر ایک ٹرسٹی کو اختیار ہے کہ جس رائے کو وہ کالج کے حق میں بہتر سمجھے ظاہر کرے، لیکن اس سے بھی آپ کو غالباً انکار نہ ہوگا کہ یہ اختیار کسی ٹرسٹی کو نہیں ہے کہ محض جھوٹے واقعات کو کالج سے منسوب کرے، اور غلط بیانی بھی اس حد کی ہو جس سے کالج کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، آپ ایک ایسے ٹرسٹی کو کیا کہیں گے جو اپنی جماعت کے سامنے آنے میں تو جھجکتا ہے۔ لیکن گمنام ٹرسٹی کے طور پر وہ کالج کی طرف سے پبلک کو بددل کرنے میں اس قدر غلط بیانیوں سے کام لیتا ہے"

اس کے بعد لکھتے ہیں،

"رائے کی آزادی کی قدر ہم سے زیادہ کم کوئی اور کرتا ہوگا، لیکن رائے کی آزادی اور چیز ہے اور بہتان و افترا پردازی اور چیز ہے"

حقیقت یہ ہے کہ چونکہ اس قسم کی گمنام نکتہ چینی اور غلط بیانی، اخلاقی پستی کی دلیل ہے اس لیے وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ قوم میں اس طرح کی اخلاقی خرابیاں پیدا ہوں، بے شبہ

وہ اخبارات کی معقول نکتہ چینی کی قدر کرتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی چاہتے تھے کہ اخبارات اپنی عزت و وقار کے خلاف کوئی حرکت نہ کریں تاکہ اس بلند معیار کو حاصل کرسکیں جو ترقی یافتہ ممالک میں اخبارات کو حاصل ہے اس بنا پر وہ کبھی کبھی اخبارات کو بھی اُن کی لغزش پر متنبہ کر دیا کرتے تھے،

چنانچہ ایک دفعہ مخبر دکن مدراس نے اُن کے برخلاف کسی حیدرآبادی نامہ نگار کا ایک مضمون شائع کیا جس میں سخت غلط بیانی اور افترا پردازی سے کام لیا گیا تھا، نواب صاحب نے اس کا جواب لکھا اور نہایت مدلل طریقہ سے اس افترا پردازی کی حقیقت ظاہر کردی، اور آخر میں ایڈیٹر کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا،

"تھوڑی دیر کے لیے مہربانی سے آپ اپنی قانونی ذمہ داری پر بھی غور کریں "دیتھر اور ایک لکڑی کی کل کے ذریعہ سے یہ منصب کسی کو حاصل نہیں ہوسکتا کہ اناپ شناپ جس شخص کی نسبت جو جی میں آئے لکھ مارے، نہ کھائی دیکھے اور نہ خندق اور کسی اخبار کے مالک کی ذمہ داری کبھی اس سے کم نہیں ہوتی کہ مضمون مابہ البحث اُس کا اپنا لکھا ہوا نہیں ہے، یا اور کسی نامہ نگار کا ہے، اور اب مجکو دیکھنا ہے کہ آپ اپنی حفاظت کا کون طریقہ کام میں لانا مناسب سمجھتے ہیں"

یہ امر بھی لائق تذکرہ ہے کہ وہ اخبارات کی مخالفت سے کبھی مرعوب و متزلزل نہیں ہوتے تھے، جب اُن کو یقین ہوتا تھا کہ وہ صحیح راستہ پر ہیں تو اخباری مضامین کی کچھ بھی پروا نہیں کرتے تھے خواہ اُن کا لکھنے والا کسی پوزیشن کا شخص ہو، ۱۸۸۹ء میں جب سید محمود مرحوم کی جانشینی کا مسئلہ چھڑا ہوا تھا اور وہ اس معاملہ میں سرسید سے اختلاف رکھتے تھے تو سرسید نے اخبار میں اُن کے خلاف بھی بہت کچھ لکھا اُس کے بعد ایک خط میں نواب محسن الملک سے دریافت کیا کہ مشتاق حسین ان مضامین پر ناخوش اور رنجیدہ تو نہیں، اور کیا وہ چاہتے ہیں کہ اخبار میں اُن کے خلاف کچھ نہ لکھا جائے،؟ اُس کے جواب میں سرسید کو لکھتے ہیں،

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ حیدرآباد کی نوکری نے جس میں ہمیشہ اخباروں کی گالیاں پڑی ہیں، ہم لوگوں کو ایسا پاک بیحیا بنادیا ہی، کہ جو اخبار ملک میں کچھ اثر رکھتے ہیں اُن کے لکھنے کی بھی یہاں کچھ پروا نہیں ہوتی، اور آپنے تو کچھ بھی نہیں لکھا، اور آپ ضرور وہ سب کچھ لکھیئے، جس سے آپ سمجھتے ہوں کہ پبلک سے کسی غلط فہمی کو آپ رفع کرسکیں گے آپکا حق ہو کہ ایسا ہی اسی خط میں لکھتے ہیں۔

"بہت سے مضامین اس عرصہ میں اسی بحث کے متعلق مشتہر ہوئے ہیں اور جو کوئی مضمون بھی میری نگاہ سے گذرا ہیں نے اُس کو پورا پڑھ لیا ہے، مگر کسی مضمون نے بھی (جس میں ایسے ایسے بڑے لکھنے والے بھی تھے، جیسے مولوی الطاف حسین صاحب حالی مولوی نذیر احمد صاحب (دہلوی) مولوی محمد خاں صاحب اور سب سے بڑھکر خود آپ) مگر خدا شاہد ہے جو میرے دل پر اُن کا اتنا بھی اثر ہوا ہو جیسے کہ کان پر جوں رینگتی ہی"

اختلاف رائے کی حالت میں نواب صاحب کا طرز عمل

نواب صاحب ضرورت کے موقع پر بڑی شدت سے اختلاف کرتے تھے، لیکن اس اختلاف کا معاملات پر کچھ اثر نہیں پڑتا تھا۔ اختلاف اور مخالفت کے مابین جو فرق ہے اس کو وہ اچھی طرح سمجھتے تھے، ۱۸۸۹ء میں جب ٹرسٹیز بل کے معاملہ میں سرسید اور مولوی سمیع اللہ خاں کا اختلاف ہوا، تو دو پارٹیاں ہوگئیں، فریقین نے ایک دوسرے کے خلاف مضامین اور پمفلٹ لکھے، نواب وقار الملک نے اس موقع پر سرسید سے زبردست اختلاف کیا لیکن عین اس اختلاف کی حالت میں بھی کالج کی مدد سے غافل نہیں رہے۔

۲۷ اکتوبر ۱۸۸۹ء کو انہوں نے سرسید کو ایک طویل خط لکھا اور اُن پر سخت حملے کئے لیکن آخر میں صاف صاف لکھدیا کہ

"ہاں مدرسہ کے چندہ کی نسبت اطمینان رکھیے ان کارروائیوں کا اگر کچھ اثر اُس پر پڑا ہے، تو وہ یہی ہے کہ پہلے کی بہ نسبت مجھکو زیادہ خیال ہوگیا ہے، اور بے شک میں

ایسی کوشش کرونگا جو آسماں منزل کا چندہ مسٹر دو ساجی کی مدد سے پورا ہو جائے، اور اگر یہ جلد ہو جاوے تو اس کے بعد میں ایک اور چندہ کھولنا چاہتا ہوں، ان تمام جھگڑوں کی وجہ سے ہماری سب کی جن سے آپ بھی مستثنیٰ نہیں ہیں بہت ہی بدنامی ہو گئی ہے، مگر جہاں تک میں نے غور کیا ہے، مدرسہ کو ابتک اُس سے نقصان نہیں پہنچا ہے، بلکہ یہ بہت ہی خلاف توقع بات ہے، اور صرف آپ کا اقبال کہیئے یا آپ کی تعلیم کا اثر ہے کہ باوجود اس سب جھگڑے بکھیڑے کے مدرسہ کی نسبت کسی کا خیال بُرا نہیں ہوا۔"

"عمدہ اثر قائم رکھنے کے لیے ضرور ہے کہ اس کو عملاً ثابت کیا جائے، پس میرا خیال یہ ہے کہ مدرسہ کے مکانات میں سے جن کی ضرورت ہو، ایک کسی مکان کو خاص کیا جائے، اور اُس کے لیے ایک چندہ اس اختلاف کی یادگار میں کھولا جائے، کہ باوجود ایسے شدید اختلاف کے ہر ایک فریق کی توجہ مدرسہ کی بہبودی کی نسبت یکساں تھی، چندہ کا نام اور اُس مکان کا نام آپ عمدہ طور سے تجویز کر سکیں گے اس قدر میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اس کام کے لیے کس عمارت کو پسند کرتے ہیں، اُس کا کیا تخمینہ ہو گا، ہر ایک شخص کو جو اس مقدمہ میں موافق یا مخالف رائے رکھتا ہو، کچھ نہ کچھ علیٰ قدر حیثیت چندہ دینا چاہیے، میرے نزدیک کوئی ایک کمرہ اس کے لیے تجویز کیجیے، جس کا خرچ تعمیر تخمیناً صمنننہ کے قریب ہو، یہ رقم آجائے گی، اور اُسکو آسمان منزل کے چندہ سے، کچھ زیادہ تعلق بھی نہیں ہے، اس کے ساتھ وہ چندہ جاری رہ سکتا ہے، آپ کا ایک کمرہ مفت میں بن جائیگا۔ اور بہت زیادہ فائدہ جو اُس سے ہوگا وہ یہ ہوگا کہ غیر لوگوں میں ہم اپنی عزت قائم رکھ سکیں گے ورنہ آج کل بہت بُری حالت ہو گئی ہے، اور اُس پہلی عزت میں بہت فرق آتا جاتا ہے، پبلک کی نگاہ میں بھی فرق آرہا ہے، اور یقیناً گورنمنٹ

پر بھی اس کا کوئی اچھا اثر نہ ہوگا۔"

سر سید اس زمانہ میں نواب صاحب سے سخت برہم تھے، اور اس خط کے ابتدائی حصہ کو پڑھ کر جس میں اُن پر نکتہ چینی کی گئی تھی اور زیادہ ناراض ہوئے تھے چنانچہ نہایت تلخ لہجہ میں جواب دیا اور آخر میں لکھا تھا کہ

"اس خط میں بھی آپ نے بے فائدہ بحث کی ہے، میں اُس کا کچھ جواب دینا نہیں چاہتا، بجز اس کے کہ آپ کی رائے غلط، اور آپ کی پیشین گوئیاں سب غلط، آپ کے خیالات غلط، جو کچھ آپ نے فرض کر لیا ہے سب غلط"

لیکن باوجود اس خفگی کے کالج کی محبت کی یہ کیفیت تھی کہ اُنھوں نے نواب صاحب کی اُس تجویز سے جو یادگار کے متعلق تھی اتفاق کیا اور لکھا:

"اس واقعہ کی یادگار میں مکان بنانے کی تجویز مجھ کو بھی نہایت پسند ہے، آپ ضرور کوشش کیجیے گا"

یہ تو مخالفت کے زمانہ کی حالت تھی، لیکن جب قانون باوجود نواب صاحب کے شدید اختلاف کے پاس ہوگیا تو اُنھوں نے فوراً ہتیار ڈال دیے، اور اس فیصلہ کو تسلیم کر لیا (حالانکہ مولوی محمد سمیع اللہ خانصاحب خواجہ محمد یوسف اور ضلع علی گڑھ و بلند شہر کے قریباً کل رؤسا اس قانون کے پاس ہونے کے بعد کالج سے علیٰحدہ ہو گئے اور بالکل قطع تعلق کر لیا) بلکہ اور زیادہ مستعدی سے کالج کی خدمت میں مصروف ہو گئے، اور اس واقعہ کے کچھ مدت جب سر سید ڈیپوٹیشن لیکر حیدر آباد گیے تو محض نواب وقار الملک کی بدولت پوری کامیابی ہوئی اور گرانٹ میں اضافہ ہوا۔

نواب صاحب کا یہ خیال تھا کہ

"جب تک کوئی قانون بل کی شکایت میں ہو، اُس وقت تک ہر شخص آزادی کے

ساتھ رائے دینے کا اور اس بل کی مخالفت کرنے کا مجاز ہے، لیکن بل نے جب

قانون کی صورت اختیار کرلی، اوس کے بعد تمام مخالفت ترک ہونا چاہیے"

وہ کہتے تھے کہ

"سرسید نے کالج کے نفع کے خیال سے جو صورت مناسب سمجھی وہ ممبران کمیٹی کے سامنے پیش کی، اور ہم کو جو کچھ اس بل سے کالج کے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، اسکو ہم نے ظاہر کردیا، اور چونکہ کثرت رائے سے قانون پاس ہوگیا، اب اس کی مخالفت کرنا کالج کے نقصان کا باعث ہوگا، بلکہ احسن طریقہ یہ ہے کہ قانون میں جو خرابیاں ہیں، کثرت رائے حاصل کی جائے اور قانون میں ترمیم کرائی جائے"

اُن کی یہ رائے تھی کہ

"سرسید کی یا کسی دوسرے شخص کی مخالفت سے کالج کو چھوڑنا اخلاقی کمزوری ہے، کالج سرسید کا نہیں ہے، بلکہ قوم کا ہے، لہذا کالج کی امداد اس وجہ سے نہ کرنا کہ وہاں ہماری رائے کے خلاف کارروائیاں ہوتی ہیں قوم کے ساتھ دوستی نہیں بلکہ دشمنی ہے"

"اگر ہم سرسید کی وجہ سے یا سرسید کی ذات کے لیے چندہ دیتے تو بیشک ہم کو اختیار تھا کہ ہم ناراض ہو کر چندہ دینا بند کردیتے، لیکن جب کہ ہم چندہ دیتے ہیں قوم کی بھلائی کے خیال سے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ آج ہم سرسید سے ناراض ہوکر قوم کی بھلائی ترک کردیں"

جب سرسید نے قانون ٹرسٹیان کی ایک بحث طلب دفعہ کے مطابق باختیار خود چند ٹرسٹیوں کو منتخب کرلیا، تو نواب صاحب نے اس پر سخت اعتراض کیا، سرسید کو بہت ناگوار

گذرا، اور مرزا عابد علی بیگ صاحب ٹرسٹی کی تحریک سے نواب صاحب کے خلاف نارضامندی کا ووٹ پاس ہوا، لیکن باوجود اس کے وہ مرزا صاحب سے ذرا بھی کبیدہ نہ تھے، چنانچہ ایک دفعہ جب مولوی بشیر الدین صاحب نے مرزا صاحب کے متعلق اپنے بعض خیالات کا اظہار کیا، تو نواب صاحب نے جواب میں لکھا،

"مرزا صاحب کی نسبت جن وجوہ سے آپ نے اپنی بزاری کا اظہار کیا ہے، مجھکو ان وجوہ پر مطلق علم نہیں ہے، اور جب تک علم اور اس کی تحقیق کا موقع نہو، معاف کیجیے کہ میں اس بیزاری میں شریک نہیں ہوسکتا، حالانکہ آپ واقف ہیں کہ انہیں مرزا صاحب نے میری نسبت ٹرسٹیز کمیٹی میں ملامت کا ووٹ پاس کرایا تھا، مگر اُس وقت بھی اس کا اثر میرے اوپر اتنا بھی نہ ہوا جس قدر کہ اُردو پر سفیدی اور میں اپنے اس عقیدہ پر قایم رہا کہ یہ سب ان ووٹ پاس کرنے والوں کی خطا ہے، میں خطا سے بری ہوں، اور ان حضرات کی وجہ سے میں کالج کو نہیں چھوڑ سکتا، جو گویا خود ہمارا کالج ہے۔"

مرزا صاحب کے ساتھ نواب صاحب کے حُسن تعلقات کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوگا، کہ سر سید کی وفات کے بعد اُنھوں نے مرزا صاحب کے ساتھ شریک ہوکر، ترمیم قانون کی کمیٹی میں کام کیا، اور آخر میں اُن کے لیے شکریہ کی تحریک کی۔

نواب صدر یار جنگ بہادر فرماتے ہیں

"میں نے کبھی نواب صاحب کی زبان سے خودستائی یا مخالفین کی شکایت نہیں سُنی ہر شخص کا نام ادب اور تہذیب کے ساتھ لیتے تھے، اپنے کارناموں کا کبھی ذکر نہیں فرماتے تھے"

بے تعصبی | **نواب صاحب** بلحاظ عقائد و اعمال نہایت راسخ العقیدہ اور پختہ مسلمان تھے، لیکن بااین ہمہ فراخ دل تھے اور اُن کا سینہ تعصب و مذہبی کینہ سے خالی تھا، بے شبہ وہ مسلمانوں

کی ہر موقع پر حمایت کرتے تھے، لیکن جہاں تک حقوق اور معاملات کا تعلق ہے۔ اُن کا طرزِ عمل سب کے ساتھ یکساں تھا، حیدرآباد کے طویل زمانہ قیام میں اُن کا برتاؤ ہندو اور مسلمان رعایا کے ساتھ مساوی تھا یہاں تک کہ محتاج خانہ کے انتظام میں بھی اُنھوں نے ہندوؤں کے مذہبی خیالات و اوہام کا لحاظ رکھا، اسی وجہ سے کبھی اُن پر تعصب کا الزام نہیں لگایا گیا۔

کالج کی خدمت کے زمانہ میں، وہ شیعہ، سُنّی، مقلّد، غیر مقلد، اور ہندو طلبہ و اساتذہ کے ساتھ معاملات میں یکساں برتاؤ کرتے تھے اُن کے کسی فعل سے یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ اُن کا رجحان کسی خاص گروہ کی طرف ہے، حیدرآباد میں اور نیز اپنے وطن میں متعدد ہندوؤں سے ان کے نہایت عمدہ تعلقات تھے، اور بہت سے ہندو اپنے ذاتی معاملات میں اُن سے مشورہ و اعانت حاصل کرتے تھے، اور شادی و غم کے مواقع پر بھی وہ ہندوؤں کے یہاں بے تکلفی سے شریک ہوتے تھے،

"ایک دفعہ بستی کے ایک ہندو وکیل نے اُن کو گائے کی قربانی کے معاملہ پر ایک خط لکھا کہ

"میں ہندوؤں کی جانب سے بعاجزی التماس کرتا ہوں کہ اجودھیا میں گائے کی قربانی کے معاملہ میں مسلمان، ہندوؤں پر احسان کریں، ہندوستان بھر میں اس کا روکنا قطعی غیر ممکن ہے، اور یہ درخواست بھی غالباً بہت بڑی ہے، لیکن اجودھیا ہمارا کعبہ ہے، اگر آپ کی کوشش سے ممکن ہو تو اجودھیا میں ہمارے مسلمان بھائی دوسرے جانور سے اپنا فرض ادا کریں۔"

اس کے بعد یہ درخواست کی تھی کہ

"مسٹر مظہر الحق بیرسٹر بانکی پور ملزمان اجودھیا کے لئے ایک اپیل شائع کرنے والے ہیں آپ بھی مدد کریں۔"

نواب صاحب نے اس خط کے جواب میں لکھا،

"جس خاموش طریقہ سے آپ نے اجودھیا میں قربانی کے مسئلہ کے متعلق کوشش

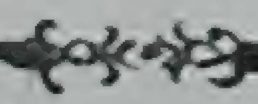
شروع فرمائی ہے وہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ جناب عام مخلوق میں امن وراحت پھیلانا چاہتے ہیں اور مذہبی تعصبات کا جس نے ملک کو نقصان پہنچایا ہے آپ کی تحریک میں کوئی شائبہ بھی نہیں ہے، اور اس نیک نیتی کے ساتھ جب کوئی کوشش ہوتی ہے تو خدا اُس میں مدد کرتا ہے، اپنی نسبت میں اس موقع پر مجبوراً عرض کرتا ہوں ورنہ یہ الفاظ کبھی میری زبان پر بھی نہ آتے کہ جس وقت سے میں نے ہوش سنبھالا ہی، میرے ہاں سوائے بکریوں، بکروں اور مینڈھوں کے کبھی کسی دوسری قسم کی قربانی نہیں ہوئی ہے۔ لیکن عام طور پر اس بحث کو اُٹھانا یہ علماء کا کام ہے اور بدقسمتی سے میرا شمار اس زمرہ میں نہیں ہے، تاہم میں دل سے اس کا خواہشمند ہوں کہ جہاں تک ممکن ہو ہندوستان کی ان دو بڑی قوموں میں صلح واتحاد قائم رہے۔

آنریبل مسٹر مظہر الحق کا اپیل جس وقت شائع ہوگا میں اس پر دل سے غور کرونگا۔ اور اس اپیل کا اس وقت میں شائع ہونا، جبکہ مسلمانوں کے دل اپنے ہندو بھائیوں کی اس ہمدردی سے لبریز ہو رہے ہیں جو کانپور کی مسجد کے معاملہ میں خاص کر اُن کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ ظہور میں آئی، بہت ہی موزوں اور برمحل ہوگا، اور جو کچھ اس اپیل کی تائید میں مجھ سے ممکن ہوگا، اس میں میری طرف سے انشاء اللہ تعالیٰ مطلق دریغ نہ ہوگا، نیز قیدیان مقدمہ اجودھیا کی رہائی کے واسطے اگر کوئی تحریک ہوگی تو میں بہت خوشی سے اس میں شریک ہونگا، اس موقع پر مجکو یہ بھی عرض کر دینا ضرور ہے کہ میری عمر اس وقت ۷۷ سال کی ہے اور تکلیف وعوارض نے مجکو اس قدر کمزور کر دیا ہے، کہ کسی مفید سے مفید تحریک کا محرک ہونے سے میں قاصر رہتا ہوں، اور اسی معذوری سے میں نے علی گڑھ کالج کی آنریری سکرٹری شپ سے علیحدگی اختیار کی اور ایک ایسی مفید ترین قومی خدمت سے مجھ کو دستکش ہونا پڑا۔ لیکن میں ہر ایک مفید

تحریک کی تائید کرنے کے واسطے البتہ بخوشی تمام حاضر ہوں"

مسٹر فٹز پیٹرک (لفٹنٹ گورنر پنجاب) جن کو نواب صاحب کے متعلق اُس زمانہ میں خاص طور پر اندازہ کرنے کا موقع ملا تھا جبکہ وہ حیدرآباد کے رزیڈنٹ تھے، ایک خط میں (جو تعارف کے طور پر لفٹنٹ گورنر صوبجات متحدہ کو بھیجا تھا) لکھتے ہیں:

"میں یہ بھی کہونگا کہ حالانکہ مذہبی پہلو سے وہ ایک سچے مسلمان ہیں لیکن غیر مذہب والوں کے ساتھ برتاؤ میں فراخ دل اور آزاد خیالات رکھتے ہیں"



مذہبی امور میں دوسروں کے احساس کا لحاظ

نواب صاحب خود پختہ عقیدے کے حنفی المذہب مسلمان تھے لیکن مذہبی مباحثہ و مناقشہ سے ہمیشہ علٰحدہ رہتے تھے۔ یہاں تک کہ اُن کی زبان و قلم سے کبھی کوئی ایسا لفظ نہیں نکلتا تھا جو دوسرے لوگوں کے مذہبی احساسات کو صدمہ پہنچائے، بلکہ وہ نہایت احتیاط کے ساتھ ہمیشہ اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ اُن کے کسی طرزعمل سے دوسرے لوگوں کے عقائد و خیالات کی تحقیر و تنقیص نہ ظاہر ہو، جس زمانہ میں سرسید نے اپنی تعلیمی تحریک کی بنیاد رکھی، تو علماء سے مذہبی چھیڑ چھاڑ شروع ہوگئی، سرسید نے بھی نہایت جوش کے ساتھ مذہبی مباحثات کا دروازہ کھول دیا، اور جو کچھ علماء کے متعلق لکھ سکتے تھے لکھا، نواب صاحب تعلیمی تحریک میں سرسید کے پورے ہم آہنگ تھے، اور زبان و قلم سے برابر اُن کی تائید میں مصروف رہتے تھے، لیکن باوجود اس کے اُنہوں نے سرسید کی تائید میں کبھی اُن کے مخالفین پر مذہبی حیثیت سے حملے نہیں کیے، اور اپنی کسی تقریر یا تحریر سے مخالفین کے مذہبی احساس کو صدمہ نہیں پہنچایا، اس زمانہ کے بعد بھی اُن کو مختلف العقائد لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا مگر کسی کو اُن سے شکایت نہیں پیدا ہوئی، کالج کے انتظامی معاملات کے سلسلہ میں بھی اپنے عہد میں اُنہوں نے ان امور کا لحاظ رکھا،

ایک دفعہ اُن کے زمانہ میں مولوی عبدالباری صاحب (فرنگی محل لکھنؤ) نے اپنے

بعض عزیزوں کو کالج میں داخل کرانا چاہا مگر یہ خواہش کی کہ

(۱) یہ طلبہ کالج کے دستور اور قاعدہ کے مطابق میز کرسی پر کھانا کھانے کے لیے مجبور نہ کیے جائیں۔

(۲) نیز یہ کہ وہاں یہ گروہ ٹخنوں سے نیچا پاجامہ پہننے پر مجبور نہ ہوں،

بہت سے ارباب حل و عقد اصولاً، ان شرائط کو قبول کرنا پسند نہیں کرتے تھے، لیکن نواب صاحب نے صاف طور پر اپنی رائے ظاہر کر دی کہ

"جناب مولانا کی یہ فرمائشیں خاص طور پر منظور کر لی جائیں، اور ان کی مرضی کے خلاف ان پر جبر نہ کیا جائے اس رعایت کی ضرورت اس لیے ہے کہ معزز گروہ علما اپنی اولاد کو بلا اکراہ اس کالج میں بھیج سکیں اور عامہ اہل اسلام کا اعتماد کالج کی نسبت حاصل ہو، یہ خواہش مذہبی خیالات کی بنا پر شامل ہے اور کالج کی مصلحت کے یہ بالکل خلاف ہو گا کہ ان سے انکار کرکے ایک عام ہلچل مسلمانوں میں پیدا کی جائے اور جناب ممدوح اور ان کے ہمخیال اور لوگوں کو اس شکایت کا موقع دیا جائے کہ علی گڑھ کالج جو ایک مسلمانوں کا کالج ہے، خواہ مخواہ ایسے ایسے امور پر زور دیتا ہے، جس سے مذہبی آدمیوں کی دل شکنی ہو۔"

دوسروں کے احساس و جذبات کا خیال

نواب صاحب عام طور پر بھی کتابت و خطابت میں کامل تہذیب و شائستگی کا لحاظ رکھتے تھے، کوئی لفظ اُن کی زبان سے ایسا نہیں نکلتا تھا جو مخاطب کی عزت و مرتبہ سے کم ہو، یا اُس کی آزردگی خاطر کا باعث ہو، اور اسی مہذب طرز عمل کے وہ دوسروں سے بھی متوقع رہتے تھے۔

ایک بار کالج میں تقسیم انعام کا جلسہ تھا، علی گڑھ کے سشن جج جلسہ کے صدر تھے، اُنہوں نے اپنی تقریر میں طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا

"تم گو سب کے سب نوبلز (شریف) نہیں ہو سکتے لیکن اپنی جفاکشی اور محنت و قابلیت سے اپنے آپ کو اس درجہ کا مستحق ثابت کر سکتے ہو"

انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اس تقریر کا ترجمہ شائع ہوا، اُردو میں اس لفظ کا ترجمہ عموماً شریف کیا جاتا ہے، یہی عام ترجمہ اخبار میں بھی شائع ہوا، یعنی "تم سب شریف نہیں ہو سکتے"، جب نواب صاحب کی نظر سے یہ مضمون گذرا تو بہت رنجیدہ و برافروختہ ہوئے، فوراً جج صاحب کے بنگلہ پر جا کر اُن سے ملاقات کی اور کہا۔

"ہر مسلمان شریف ہے، لہٰذا اس ترجمہ سے مسلمانوں کے دلوں کو تکلیف ہو گی"

جج صاحب نے معذرت کی اور اس فقرہ سے اُن کا جو مقصد تھا وہ اپنے قلم سے لکھدیا، دوسرے پرچہ میں نواب صاحب نے یہ معذرت اور اس جملہ کا صحیح مطلب شائع کردیا،

مولوی بشیر الدین صاحب لکھتے ہیں کہ وہ (نواب صاحب) دوسروں کے محسوسات کا خیال رکھتے تھے اور اس انداز سے گفتگو کرتے تھے کہ دوسروں کو ناگوار نہو، وہ کسی پر بدگمانی نہ کرتے تھے اور نہ کبھی سوءظن سے کام لیتے تھے، یہ صفت اُن میں اس قدر زیادہ بڑھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے اکثر وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے تھے۔

انصاف پسندی | آجکل بڑے بڑے لوگوں میں بھی یہ عام مرض پھیلا ہوا ہے کہ جو کچھ وہ اپنے لیے جائز رکھتے ہیں، دوسروں کے لیے جائز نہیں رکھتے، لیکن نواب صاحب اس سے مستثنیٰ تھے، اُن کی زندگی میں بکثرت ایسے واقعات موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے معاملات میں بھی ہمیشہ انصاف سے کام لیتے تھے،

سنہ ۱۹۱۱ء میں جبکہ یونیورسٹی کی تحریک کا غلغلہ تھا، اور لوگوں نے بڑے بڑے چندوں کے وعدے کیئے تھے اُس وقت سب سے بڑا کام یہ تھا کہ لوگوں کو چندہ ادا کرنے کے لیے یاددہانی کی جائے لیکن بعض مشکلات کی وجہ سے ابھی تک نواب صاحب نے اپنا چندہ ادا نہیں کیا تھا، اس لیے اُنہوں نے یہ جائز نہیں رکھا کہ دوسروں سے تقاضا کریں، البتہ جب اپنا چندہ ادا کردیا، تو لوگوں کو یاددہانی کے خطوط لکھے، اور ایک مضمون شائع کرکے ایفائے عہد پر توجہ دلائی۔

نواب صاحب اگرچہ اپنے ملازمین کے حق میں نہایت مہربان تھے لیکن اس خیال سے کہ وہ حد اعتدال نہ تجاوز کرجائیں، کبھی کبھی کسی سخت غلطی یا شرارت پر تنبیہ یا جرمانہ بھی کردیتے تھے، چنانچہ ایک دفعہ کسی نوکر پر جرمانہ کیا بعد کو محسوس ہوا کہ یہ جرمانہ بیجا تھا تو نوکر سے معافی چاہی، اور اپنے اوپر جرمانہ کیا، اور اُس کو اپنے قلم سے اور اپنے جرمانہ کے نام سے حساب میں درج کیا، اور جرمانہ کی رقم ملازم کو دی۔

نواب لطیف یار جنگ بہادر فرماتے ہیں۔

"جو شخص حق پر ہوتا اُس کی پوری مدد کرتے تھے، جو ناحق پر ہو اگرچہ اُن کا دوست ہی کیوں نہو، اس کے حق میں انصاف مثل غیر کرتے تھے"

مخلوق سے ہمدردی

اُن کی تمام زندگی کسی نہ کسی حیثیت سے نوعِ انسان کی خدمت میں گزری، خصوصاً غریب و بیکس اور بے یار و مددگار بندوں کی مدد کرنا وہ اپنی زندگی کا ایک فرض سمجھتے تھے۔ زمانۂ ملازمت میں تلنگانہ کے دورہ میں جب انھوں نے یہ دیکھا کہ رعایا پر ظلم ہو رہا ہے تو نہایت پُر درد و پُر اثر الفاظ میں مظلوم رعایا کی حالت وزیر اعظم کو لکھی اور پوری کوشش کی کہ رعایا اس مصیبت سے نجات پائے۔ بیگار کے سلسلے میں رعایا پر جو جبر کیا جاتا تھا اس کی اصلاح کی، حکام کے دورہ کے وقت رعایا پر جو ظلم ہوتا تھا اور جس طرح بلا قیمت یا برائے نام قیمت پر غریب رعایا کا مال چھینا جاتا تھا، اس کا تذکرہ حصّۂ اول میں ہو چکا ہے۔ یہ انھیں کا کام تھا کہ اس ظلم کا خاتمہ کیا۔ صوبہ داری کے زمانہ میں اُنھوں نے رعایا کی راحت و آسائش کے لئے جو کچھ کیا وہ آج بھی وہاں ہر شخص کی زبان پر ہے۔ اُنھوں نے اپنے ایام ملازمت میں رعایا کے حقوق حاصل کرنے اور اُن کو مظالم سے نجات دلانے کے لئے اعلیٰ حکام سے جو کشمکش کی حقیقت تو یہ ہے کہ رعایا کا کوئی قائم مقام اور وکیل بھی اس سے زیادہ نہیں کر سکتا۔

ذاتی طور پر بھی جہاں تک اُن سے ممکن ہوتا ہمدردی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے، اُن کی زندگی میں اس قسم کے سیکڑوں واقعات ہیں جن کا استقصا ناممکن ہے مثالاً چند واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔

نواب عزیز جنگ مجھ سے فرماتے تھے کہ:

"نواب صاحب کی یہ عادت تھی کہ اپنے ماتحت ملازمین کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے، جب کوئی مرجاتا تو اُس کے متعلق مفصل معلومات حاصل کرتے اگر وہ قرضدار ہوتا تو قرضہ کے ادا کرنے کا کوئی مناسب بندوبست کرتے بلکہ بعض اوقات اس کی اولاد ذکور کے لئے وسائل معاش بہم پہنچاتے، ناکتخدا لڑکیوں کی شادی کا انتظام کرتے بلکہ بعض اوقات اُن کے شوہروں کے لئے ملازمت کا بندوبست کرتے اور بیوہ عورتوں کے لئے وظیفہ جاری کرانے کی کوشش کرتے۔"

نواب عزیز جنگ بہادر یہ بھی کہتے تھے کہ :

" جب کوئی شریف آدمی یا اس کی اولاد کسی جرم یا غلطی کی پاداش میں قید و سزا یاب ہوجاتی تھی تو اس کی ایک مفصل فہرست اپنے پاس محفوظ رکھتے اور جب کوئی موقع یا تقریب اس قسم کی ہوتی جس میں قیدی چھوڑے جاتے ہیں تو وہ مدار المہام کے سامنے یہ فہرست پیش کرتے اور ان لوگوں کو رہا کرنے کی سفارش کرتے ۔"

ایک با اقتدار عہدہ دار کے لئے اس قسم کی جزئیات کا لحاظ رکھنا جس قدر دشوار ہے اسی قدر قابل ستائش بھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے ہمعصر عہدہ داروں میں بھی بعض لوگ ایسے تھے جو عام طور پر نہ سہی لیکن اپنے ماتحت ملازمین کو ضرور فائدہ پہنچانے اور خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن عموماً یہ ہمدردی خاص اسباب پر مبنی ہوتی تھی اور بعض اوقات اس میں جائز و ناجائز کا لحاظ بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ فائدہ رسانی کا یہ تعلق اسی وقت تک رہتا تھا جب تک کہ وہ لوگ ان عہدہ داروں کے ماتحت رہتے تھے، لیکن نواب صاحب کی حالت اس سے مختلف تھی۔ نواب عزیز جنگ بہادر بیان کرتے تھے کہ :

" جب ان کے دفتر کے ملازمین میں سے کوئی شخص بحساب ثلث یا نصف وظیفہ (پنشن) حاصل کرتا تھا، اور اس کی وجہ سے اس کی آمدنی کم ہوجاتی تھی تو اس کمی کی تلافی کرنے کی کوشش کرتے، یعنی اس کے کسی قریب تر عزیز یا پیش کردہ شخص کو حتی الامکان حسب لیاقت کوئی ملازمت دلوا دیتے ۔"

جب بڑے بڑے عہدہ دار کسی مقام کا دورہ کرتے ہیں تو عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ رعایا زحمت و آفت میں مبتلا ہوجاتی ہے، ان واقعات کو نواب صاحب نے اپنے دورہ کی رپورٹ میں خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے، لیکن خود ان کا دورہ اکثر اوقات رعایا کے لئے باعث رحمت ہوتا تھا۔ نواب عزیز جنگ بہادر بیان کرتے تھے کہ :

" ایک دفعہ نواب صاحب دورہ کر رہے تھے تو ایک مقام پر تحصیلدار نے تعلقہ دار کو

اطلاع دی کہ اس موضع میں ہیضہ پھیلا ہوا ہے یہاں سے جلد گزر جائیے، تعلقہ دار نے نواب صاحب سے عرض کیا، اُنھوں نے یہ سنکر فوراً گھوڑے روک لئے، کہاروں کو پالکی لے کر آگے بھیجدیا، اور لوگوں کو اجازت دی جس کا جی چاہے وہ آگے چلا جائے، چنانچہ ڈاکٹر مظہر حسین اور چند اہلکار رہ گئے، صبح ۷ بجے کا وقت تھا نواب صاحب موضع میں داخل ہوئے، مریضوں کی دیکھ بھال اور انتظام شروع کیا۔ اور اُن کی تیمارداری اور علاج کا پورا انتظام کر کے ۳ ½ بجے واپس آئے غسل کیا اور ڈاکٹر کی رائے سے دن بھر فاقہ کیا۔

" اسی طرح سرارم ضلع نلگنڈہ میں جب کہ وہاں بحیثیت صوبہ دار دورہ کر رہے تھے، طوفان باد و باراں آیا تمام خیمے اُکھڑ گئے، گاڑیاں اُلٹ گئیں، ہر شخص شرابور ہو گیا، ۹ بجے طوفان ختم ہوا اور ایک دوسرے موضع کو روانہ ہوئے، اُن کے کپڑوں کا ایک بکس محفوظ تھا، نواب صاحب نے اُس کے کپڑے تمام لوگوں کو تقسیم کر دیئے، یہاں تک کہ چپراسیوں کو بھی دیئے۔"

نواب عزیز جنگ بہادر بیان کرتے تھے کہ وہ خود بھی اس دورہ میں اُن کے ہمراہ تھے وہ ایک اور سفر کا واقعہ بھی بیان کرتے تھے کہ:

" ایک اہلکار جو شریک سفر تھا کسی مقام پر گم ہو گیا۔ جب دس بجے تک منزل پر نہ پہنچا تو نواب صاحب کو تشویش ہوئی، پولس اور سواروں کو تلاش میں چاروں طرف روانہ کیا، اور چار بجے تک جب تک وہ نہ آیا نہ خود کھانا کھایا نہ اور کسی نے کھایا، اُنھوں نے سواروں کو صراحیاں دے کر روانہ کیا تھا کہ شاید گمشدہ کسی جنگل میں پیاسا ہو اور اُس کو پانی کی ضرورت ہو۔"

نواب لطیف یار جنگ مجھ سے فرماتے تھے کہ:

" صبح کی تلاوت اور نماز کے بعد نواب صاحب باہر آتے تھے، اور ایک خاص

بے تکلف مقام پر غریب اور دیہاتی رعایا کے ہر شخص سے الگ الگ ملاقات اور بات کرتے تھے، اور بالکل بے تکلف ہو کر باتیں کرتے تھے تاکہ وہ سب دکھ درد اپنا اُن سے کہدیں۔ اُس کے بعد مکان پر اور دفتر میں بقدر ضرورت اُن کی چارہ جوئی کرتے تھے اور ضابطہ کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ اگر اُن کے پاس اسٹامپ کی قیمت نہ ہوتی اور اُن کا معاملہ واجبی ہوتا تو اکثر غریب اشخاص کو اپنے پاس سے روپیہ دے کر اسٹامپ منگا کر اُس پر کارروائی فرماتے، مگر کسی عذر پر بھی کارروائی نہ چھوڑتے ؛؛

احسان شناسی

شرافت اور حسن طینت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ طبیعت میں احسان شناسی ہو اور انسان محسن کے حسن سلوک کو نہ صرف یاد رکھے بلکہ وفاداری اور خوش اسلوبی سے اُس کا معاوضہ ادا کرنے کی کوشش کرے، نواب صاحب میں جذبہ احسان شناسی بہت زیادہ تھا۔ سر سالار جنگ اول نواب صاحب کے خاص محسن تھے، اس لئے وہ ہمیشہ اُن کا ادب ملحوظ رکھتے تھے اور وفات کے بعد بھی نواب مرحوم کی یاد اُن کو بے چین کر دیتی تھی اور جب اُن کا ذکر کرتے تھے تو ایک ایک لفظ سے جوشِ محبت ٹپکتا تھا۔

سالار جنگ ثانی کے عہد میں جب کہ نواب صاحب صوبہ مشرقی کے صوبہ دار تھے، نواب بہرام الدولہ (داماد سر سالار جنگ اول) کو کسی سرکاری خدمت پر مقرر کرنے کا معاملہ زیر بحث تھا لیکن کوئی معزز عہدہ اُن کے مناسب حال خالی نہ تھا، جب نواب صاحب کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو اُنھوں نے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں ایک درخواست پیش کی اور لکھا کہ :

”فدوی نہایت خوشی اور دلی تمنا کے ساتھ اس بات پر آمادہ ہے کہ اگر نواب بہرام الدولہ بہادر صوبہ دار مقرر فرمائے جائیں تو فدوی اُن کے پاس بحیثیت معتمد کام کرے ؛؛

اس کے بعد یہ خیال کرکے کہ شاید اتنے بڑے ذمہ داری کے عہدہ پر نواب بہرام الدولہ کا ابتدائی تقرر نامناسب سمجھا جائے یہ بھی لکھدیا کہ :

"اس تمام ذمہ داری کو فدوی اپنے اوپر بدستور قبول کرتا ہے"

البتہ یہ شرط لکھدی کہ اگر میری اور نواب ممدوح کی رائے میں اختلاف ہو تو معاملہ سرکار کے سامنے پیش کردیا جائے۔ لیکن اُنھوں نے اُمید ظاہر کی کہ اس قسم کے اختلافات پیش نہیں آئیں گے۔

اس درخواست کا مقصد صاف طور پر یہ تھا کہ بجائے افسری کے وہ ماتحتی قبول کرنے پر آمادہ ہیں۔ رہا یہ سوال کہ وہ اس ایثار اور قربانی پر کیوں آمادہ ہوگئے، اس کا جواب خود درخواست کے آخر میں موجود ہے، وہ لکھتے ہیں :

"اور اس امر کے متعلق کہ کیوں خانہ زاد ایسی درخواست پیش کرتا ہے کچھ زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے: وہ ایک بہت صاف سی بات ہے، نواب مختار الملک مرحوم ...... کے احسانات میرے اوپر اس قدر ہیں کہ اگر اس سے کچھ زیادہ بھی کرنا پڑے، تو بھی اس بار سے سبکدوشی نہیں ہوسکتی اور اس معتمدی کو میں اپنے لئے ہزار درجہ موجب افتخار سمجھوں گا۔"

فیاضی

نواب صاحب اگرچہ حیدرآباد میں جلیل القدر عہدوں پر ممتاز رہے اور اُن کی تنخواہ بھی معقول تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کو کبھی فارغ البالی نصیب نہیں ہوئی حیدرآباد کی ابتدائی ملازمت کے زمانہ میں جب کہ وہ پانسو روپیہ ماہوار پاتے تھے اُن کی حالت اور بھی زیادہ سقیم تھی، اس زمانہ کی حالت کے متعلق ہم اُن کی ایک نہایت ہی پرائیویٹ تحریر سے چند فقرے نقل کرتے ہیں، یہ ایک خط ہے جو خاص ضرورت سے سر آسمان جاہ کے نام لکھا گیا تھا، نواب صاحب لکھتے ہیں :

"از ظاہر ترین ضروریات معاملہ مکان وسواری ست، لیکن بسبب ہمیں تہی دستی

برآں قادر شدن نتوانستم ... ... بلحاظ تعلق خدمت بعض اصحاب ازاعزہ عہدہ داران سترگ قدم رنجہ فرمایند ازاں گزیرے ہم ندارم کہ ایں اتفاق اکثر پیش می آید و برہمچو مواقع چوں می بینم کہ نہ مکانے دارم و نہ سامانے کہ باحضرات موصوف بہ غرت ملاقات کنم، خود را درچشم خودم آں قدر حقیر می شوم کہ بسا اوقات عرق عرق شدہ ام۔"

اسی سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"درچندہ مجلس مجروحان ٹرکی وقتیکہ دیگر ہم پیشہ ہائے من سالم سالم تنخواہ نوشتند و ضرور بود کہ من ہم کم از یک تنخواہ پیش کش نہ کنم، چوں خویشتن را بالکل مجبور یافتم زائد از یک صد و پنجاہ[۱۵۰] روپیہ نوشتن نتوانستم، اہل مجلس شاید خیال کردہ باشند کہ ایں نیچریاں دریں کار خیر چرا صرف ہمت خواہند نمود مگر بے خبر ازیں کہ اثرِ آں یک صد و پنجاہ بر من واہل وعیال من تا چند ماہ بود۔"

اور اسی طرح اُن کی متعدد پرائیوٹ تحریریں دیکھنے کا موقع ملا، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدر آباد کے تمام زمانۂ قیام میں اُن کو کبھی فارغ البالی حاصل نہیں ہوئی، یہاں تک کہ آخری مرتبہ حیدر آباد چھوڑتے وقت اُنھوں نے بمشکل مصارفِ سفر کا انتظام کیا۔

اس تنگ دستی کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ ایک کنبہ پرور شخص تھے، اور حقوق العباد کا خاص طور پر لحاظ رکھتے تھے، اس لئے جو اعزہ و اقارب ضرورت مند تھے اُن کی تنخواہیں مقرر کردی تھیں، اس کے علاوہ خفیہ طور پر طَلَبہ کی مدد کرتے تھے، متعدد طَلَبہ کو سالہاسال تک وظائف دیتے رہے، اور اس اعانت کو ہمیشہ مخفی رکھا، البتہ جن طَلَبہ کو سرسید کی تحریک سے وظیفہ دیا، اُن کے حالات خطوط و کاغذات میں ملتے ہیں، اپنے فرزند محمد احمد کو انگلستان بھیجا توکم وبیش پانسو ماہوار اُن کو بھیجتے رہے۔ سرسید نے ایک خط میں اُن کو رائے دی تھی کہ زیادہ خرچ بھیجا کریں، اسی طرح حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں اور ذاتی مصارف بھی زیادہ

تھے اور وہ عہدہ کی پوزیشن کے لحاظ سے ان مصارف کے لئے مجبور تھے اور ان سب وجوہ سے کبھی اُن کے پاس اس قدر روپیہ پس انداز نہیں ہوتا تھا کہ وہ قومی کاموں میں بے دریغ چندہ دیں، لیکن باوجود ان مشکلات اور موانع کے اُنھوں نے ہمیشہ تمام مفید کاموں میں کافی چندہ دیا۔ خصوصاً کالج کے سلسلہ میں تو کوئی مد ایسی نہیں ہے جس میں نواب صاحب نے چندہ نہ دیا ہو۔ مثلاً یادگار سرسید، نظام میوزیم، محمود منزل، آسمان منزل، سالار منزل، اسٹریچی ہال، سٹڈنس یونین کلب، لارنس گیٹ، چاہ اخوان الصفا وغیرہ کی مدمیں ہزارہا روپیہ چندہ دیا، اس کے علاوہ عام تعمیرات، وظائف، انعام دینیات، اور لا کلاس وغیرہ کے لئے یک مشت و ماہانہ چندہ دیتے رہے، جب سرسید حیدرآباد تشریف لے گئے تو ایک ہزار الگ چندہ دیا اور پانسو دعوت کی تقریب سے پیش کیا، ان سب چندوں کے علاوہ ایک عام طریقہ یہ بھی تھا کہ مختلف اوقات میں جو چھوٹی چھوٹی ہنگامی ضرورتیں پیش آتیں تو سرسید اُن کو چندہ کے لئے لکھتے تھے اور وہ ہمیشہ اس کی تعمیل کرتے تھے، ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی کام کے لئے سرسید اُن کے نام چندہ کی ایک رقم لکھ دیتے اور اُن کو اطلاع کرتے کہ اس قدر چندہ تمھارے نام لکھا گیا ہے بھیجدو چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"میں مدرسۃ العلوم کا بجٹ بنا رہا ہوں، اس میں اب کی سال بھی آپ کی طرف سے اسکالرشپ دینی ہوگی، جس تعداد سے کہ ضرورت ہوگی، صرف اطلاعاً لکھا گیا ہے، کچھ اجازت لینے کی ضرورت نہ تھی۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"مولوی محمد اکبر صاحب کے انتقال کا جو رنج ہے بیان نہیں ہو سکتا۔ پانچ لڑکے اُن کے یہاں تعلیم پاتے ہیں۔ اُن کے خاندان میں اس قدر طاقت نہیں کہ وہ کالج میں رکھ کر تعلیم دلا سکیں، میں نے اور سید محمود نے بندوبست کیا ہے، اگر آپ کو گنجائش ہو تو ایک خاص اسکالرشپ چھ روپیہ کی ......

اُن کے بیٹے کی مقرر کر دیجئے، یہ بھی اپریل سے شروع ہوگی۔ اس صورت میں بیس[۲۰] روپیہ آپ کو دونوں اسکالرشپوں کی بابت دینا پڑے گا۔"

ایک دفعہ ۱۸۹۰ء میں سرسید نے ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "فیاضی نواب انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین" اس میں لکھتے ہیں:

"ہم دوستوں میں باہم یہ معاہدہ تھا کہ جب کبھی جس دوست کی تنخواہ میں کسی وجہ سے اضافہ ہو تو اُس کو لازم ہے کہ پہلا اضافہ جو ملے وہ مدرسۃ العلوم کو دیدے اس بیس برس کے عرصہ میں بہت سے دوستوں کی تنخواہ میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوا مگر اس وعدہ کا ایفا بہت ہی کم ہوا، ہم کو اس بات کے بیان کرنے سے نہایت خوشی ہے کہ نواب انتصار جنگ بہادر نے اس وعدہ کو پورا کیا ہے۔ حال میں جو اُن کی تنخواہ میں پانسو[۵۰۰] ماہواری کا اضافہ ہوا ہے، تو اُنھوں نے پہلے مہینہ کی تنخواہ کا اضافہ بہ تعداد پانسو روپیہ کے ہمارے پاس بھیجدیا ہے۔ الکریم اذا وعد وفا کو اپنے عمل سے پورا کر کے اپنے آپ کو کریم ثابت کیا ہے جزاہ اللہ خیر الجزاء خدا کرے اُن کی تنخواہ میں اور اضافہ ہو تاکہ مدرسۃ العلوم کو بھی اُس سے نفع پہنچے۔

علاوہ اس عطیہ کے نواب انتصار جنگ بہادر نے ایک سو پچاس روپیہ بجٹ کی کمی پورا کرنے کے فنڈ میں عطا فرمایا ہے اور جو نقصان کہ مدرسۃ العلوم کو راجہ امیر حسن خان کی امداد بند ہونے سے ہوا ہے اور جس کے پورا کرنے کو ہمارے حیدر آباد کے دوستوں نے ایک فنڈ قائم کیا ہے، ایک سو بیس[۱۲۰] روپیہ اس فنڈ میں عنایت کیا ہے، علاوہ اس کے انھوں نے ایک اور بڑی فیاضی کی ہے، سب لوگ جانتے ہیں کہ طبقات ابن سعد کاتب الواقدی ایک معتبر و مشہور قدیم کتاب ہے آں حضرت صلعم کے حالات اور اُس کے زمانہ کے واقعات کو بطور محدثانہ تاریخ

کے لکھا ہی .... یہ کتاب نہایت کمیاب ہی ....''

''اس کتاب میں ایک باب ہی جس میں ان فرامین اور عہد ناموں کا ذکر ہے، جو آنحضرت صلعم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں اور قوموں اور والیان ملک کو تحریر فرمائے تھے، بعض کی پوری عبارت ہی اور بعض کا خلاصہ ہی، اس سے بھی زیادہ عمدہ چیز اس باب میں یہ ہی کہ جس قدر وفود قوموں اور ملکوں کی جانب سے آنحضرت صلعم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئے اور قوموں کی قومیں اور ملک کے ملک اور والیانِ ملک اسلام لائے، اُن سب کا حال نہایت خوبی سے اُس باب میں لکھا ہی''

''اس باب کا ایک جرمن عالم نے یہ ترجمہ کرکے چھاپا ہی اور اُس ترجمہ کے ساتھ اصلی باب کو بعینہ عربی میں بھی چھاپ دیا ہی اور اس قدر ٹکڑا اصل عربی کا ہم کو دستیاب ہوگیا ہی چونکہ مدرسۃ العلوم کی تعلیم مذہبی میں ہم اپنے خیالات کو کچھ دخل نہیں دیتے اس لئے ہم نے ارادہ کیا ہی کہ وہ باب بعینہ و بجنسہ مدرسۃ العلوم کی تعلیم میں داخل ہو جائے، جن طالب علموں کی سکنڈ لینگوج عربی ہی، وہ اس اصل عربی کو پڑھیں اور جن طالب علموں کی سکینڈ لینگوج فارسی ہی اُن کے لئے اُس کا ترجمہ فارسی میں کوئی لائق شخص کردے تاکہ فارسی خواں طالب علموں کی خواندگی میں داخل ہو اور نیز بہ نظر فائدہ عام کے اُس کا اُردو ترجمہ بھی تیار کیا جائے مگر جب تک کہ وہ کتاب تینوں زبانوں میں چھاپہ نہ ہو، درس میں داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ نواب انتصار جنگ بہادر نے اپنی فیاضی سے اُس کتاب کے تینوں زبانوں میں چھاپنے کا خرچ اپنے ذمہ قبول فرمایا ہی اور یہ لکھا کہ وہ سب کتابیں چھاپہ ہونے کے بعد مدرسۃ العلوم کو دیدی جائیں اور اُن کے فروخت سے جو آمدنی ہو وہ مدرسۃ العلوم میں جمع کی جائے، صرف ہر ایک کتاب کے ۲۰-۲۰ نسخے اُن کو دیدئے جائیں یہ بھی ایک بہت بڑی فیاضی ہی''

غرض کہ اس فنڈ میں بالفعل انھوں نے ایک سو پچاس ۱۵۰ روپیہ بھیج دیا ہے،

پچاس روپیہ چندہ سابق باقی تھے، وہ بھی ارسال فرمائے ہیں، پس مجموع ان عطیات کا بحساب سکۂ انگریزی بقدر آٹھ سو پچانوے روپیہ کے ہوتا ہے، پورے نوسو ہونے میں پانچ کی کسر تھی، وہ پانچ روپیہ اُنھوں نے اس پر اور اضافہ کیے اور از راہ مہربانی و اخلاق کے لکھا کہ:

"یہ پانچ روپیہ خاص سید احمدؒ کی نذر سے موسوم کیے جائیں۔"

ہم ان کی عنایت و اخلاق کا شکریہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اُن کی نذر نہایت فخر سے قبول کرتے ہیں مگر ہم تو ہر طرح پر خواہ نذر ہو یا نیاز، خیرات ہو، زکوٰۃ ہو، صدقہ ہو، منت ہو، جس طرح پر ہو اور جو دے، بجز اہبعض نورانی رحمۃ اللہ علیہ ہو لینے کو تیار ہیں۔"

اس زمانہ کے بعد بھی جب کہ کالج ترقی پزیر حالت میں تھا، وہ ہمیشہ مالی اعانت کرتے رہے، مسلم یونیورسٹی کی تحریک کے زمانہ میں بھی اگرچہ اُن کی مالی حالت اچھی نہ تھی چھ سو روپیہ اپنی طرف سے اور دو سو صاحبزادہ مشتاق احمد کی طرف سے دیئے، یہ تو وہ چندے ہیں جو علی گڑھ کالج سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے علاوہ وہ دوسرے قومی کاموں میں بھی کبھی چندہ سے دریغ نہ کرتے تھے۔

جنگ طرابلس و جنگ بلقان کے زمانہ میں مظلوم مسلمانوں کی مصیبت کا اُن کے دل پر نہایت گہرا اثر تھا۔ اُنھوں نے کوشش کر کے اپنی ضرورتوں میں تخفیف کی اور معقول چندہ اس فنڈ میں دیا، ان چندوں کی قدر و قیمت اُس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب کہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اُن کی مالی حالت قابل اطمینان نہ تھی اور متعدد کم استطاعت عزیزوں اور اہل وطن کی امداد بھی اُن کے ذمہ تھی، ایسی حالت میں وہ جو کچھ دیتے تھے درحقیقت اپنے نفس پر تکلیف اُٹھا کر دیتے تھے اور یہی اصلی فیاضی ہے۔ ولو کان بھم خصاصۃ

دیانت | ہندوستان کی دیسی ریاستوں کی ایک خاص حالت ہے۔ بڑے بڑے با اقتدار حکام بھی

ہمیشہ اُمید و بیم کی حالت میں رہتے ہیں، ایسے خوش نصیب عہدے دار بہت کم ہیں جو مخالفت سے محفوظ ہوں اور جن کے خلاف کوئی چھوٹی یا بڑی جماعت سازش میں مصروف نہ ہو۔ غیر ملکی عہدہ داروں کی حالت اور بھی زیادہ غیر محفوظ ہوتی ہے۔ ملکی عموماً اُن کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے ان حالات کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیرونی عہدہ دار اپنی متزلزل حالت کو محسوس کرکے یہ ارادہ کر لیتے ہیں کہ اپنے غیر معین زمانۂ قیام میں جس قدر فائدہ وہ اُٹھا سکتے ہیں اُس میں تامل نہ کریں۔ اس کے علاوہ جہاں تک ممکن ہوتا ہے وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو بھی فائدہ پہنچاتے ہیں اس سے ایک مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنی ہوا خواہ اور رہینِ منّت جماعت کی تعداد بڑھا کر اپنی پارٹی کو مضبوط بنائیں۔ لیکن نواب صاحب کی ذات ان چیزوں سے بالاتر تھی، یہی سبب ہے کہ حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں کسی نے اُن کو بددیانت نہیں سمجھا۔

مسٹر فٹزپٹرک اپنی ایک چٹھی میں لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ کو اُن کی حیدرآبادی زندگی کے متعلق لکھتے ہیں:

> "میں نے اُن (نواب صاحب) کے بڑے سے بڑے اور سخت سے سخت دشمن کو اس کے علاوہ کچھ اور کہتے ہوئے نہیں سُنا کہ وہ انتہا درجہ کے پاکباز ہیں، مجھے اس ملک کے دیسی لوگوں میں ان جیسا متدین کام کرنے والا نظر نہیں پڑا۔"

ایک ذمہ دار پوزیشن رکھنے والے جلیل القدر افسر کا یہ بیان جس قدر اہمیت رکھتا ہے محتاجِ بیان نہیں۔ اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ کیسے نازک اور اہم فرائض اُن کے متعلق تھے اور کس قدر اختیارات اُن کو حاصل تھے تو اس دیانت کی قدر و قیمت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

نواب صاحب کے زمانہ میں غیر ملکی عہدہ داروں کے متعلق عموماً یہ بدگمانی تھی کہ وہ ملکی رعایا کے حقوق کو نظر انداز کرتے ہیں، لیکن نواب صاحب کی ذات اس بدگمانی سے بری تھی اور ایسا ہونا بھی چاہیئے، کیوں کہ اُنھوں نے اپنے اقتدار کے زمانہ میں ہمیشہ یہ کوشش کی کہ اہلِ ملک صلاحیت و قابلیت پیدا کرکے سرکاری عہدے حاصل کریں۔ چنانچہ اُن کو جب موقع ملا ادنیٰ و اعلیٰ

عہدوں پر ملکیوں کا تقرر کیا، یہاں تک کہ خود ملکی اُن کو اپنا ہمدرد اور بہی خواہ سمجھتے تھے، ایک خاص بحث کے موقع پر نواب صاحب نے اُن ملکی ملازمین کی ایک فہرست بھی پیش کی تھی جو اُن کی تجویز یا اختیار سے مقرر ہوئے تھے۔

ایک سرکاری مجلس میں دستور رتن جی معتمد (سکرٹری) مدار المہام نے جب اُن پر یہ الزام لگایا کہ وہ اپنے عزیزوں اور غیر ملکیوں کو اہل ملک پر ترجیح دیتے ہیں، تو اُس کے جواب میں انھوں نے جو زبردست اور معرکتہ الآرا تقریر کی اُس میں نہایت جوش سے سکرٹری مدار المہام کو مخاطب کر کے کہا:

"جناب دستور رتن جی صاحب یاد کریں کہ جب وہ معتمدی صدر المہامی مالگزاری کی کرسی سے دامن جھٹک کر کھڑے ہوئے تو انھوں نے اپنے کس قدر قرابت دار اور ہم قوم مالگزاری کے صیغے میں چھوڑے تھے اور پھر ذرا میری طرف مہربانی کی نگاہ سے دیکھیں کہ جب میں عدالت کی معتمدی کی کرسی سے دامن جھٹک کر اٹھا تو اپنے بعد اُس صیغہ میں نہ اپنا کوئی رشتہ دار چھوڑا نہ ذات برادری کا۔"

ایک موقع پر سر سالار جنگ اعظم نے نواب صاحب کی ستائش کی اور اُن خدمات کا اعتراف کیا جو انھوں نے اہل ملک کی حفاظت حقوق کے سلسلہ میں انجام دی تھیں، نواب صاحب نے دوسرے روز بطور اظہار شکر گزاری سر سالار جنگ کی خدمت میں ایک عریضہ بھیجا جس میں شکریہ ادا کرنے کے بعد لکھا:

"ہر انچہ دریں جزو زماں بہ نسبت رضا جوئی و حفاظت حقوق، و حفظ مراتب اہل ایں ملک ازیں مور ضعیف ممکن شد، فرض منصبی عہدۂ خودم بود، و اگر دہ چند ازاں ہم بوقوع رسیدے، نتواں گفت کہ زائد از فرض خدمت خود کردہ ام مگر البتہ مسرتے کہ بریں موقع بہ فدوی حاصل شد، آنرا ہم مخفی داشتن ضرور نمیدانم، یعنی در زمانے کہ جماعتے از تنگ نظری بر توجہات سرکار درخصوص

عہدہ دارانے چند از ممالک غیر معترض بودہ است، و رہماں طلب شدگان ایں قسم نظائر ہم موجود بودہ اند کہ فرق رعایاے سرکار عالی با ایشاں ہمدردی می نمایند''

اہم معاملات کے علاوہ روزمرہ کے کاروبار اور جزئیات میں بھی وہ دیانت کو ملحوظ رکھتے تھے، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ دیانت اُن کی فطرت میں داخل ہے۔ مثلاً زمانہ ملازمت اور کالج کی خدمت کے زمانہ میں وہ ہمیشہ اس کی احتیاط رکھتے تھے کہ سرکاری کاغذ یا لفافہ پر اپنی کوئی ذاتی تحریر نہ لکھیں، اگر سہواً اُن کا کوئی ماتحت ایسا کر گزرتا تھا تو وہ اپنے کاغذات میں سے ایک کاغذ اس کے بدلہ میں سرکاری کاغذات میں شامل کر دیتے تھے، اُن کی یہ عادت لوگوں کو عام طور پر معلوم تھی، اس لئے سب احتیاط رکھتے تھے۔

جس زمانہ میں وہ معتمد مال گزاری تھے، نواب شہاب جنگ بہادر معین المہام نے جو گورنمنٹ نظام کے ایک مقتدر عہدہ دار تھے نواب صاحب کو ایک ذاتی مقدمہ کے متعلق چند خطوط جو سرکاری مونوگرام والے کاغذ پر تھے لکھے، اس کے بعد دفعتاً اُن کو نواب صاحب کی دیانت و احتیاط کا خیال آیا کہ کہیں اس پر اعتراض نہ کریں اس لئے ایک خط میں اس کی توجیہہ کی اور لکھا:

"یک عرض دیگر دارم و آں این ست کہ جناب می بینند کہ بندہ ازیں مقدمہ تحریرات کہ می کنم ہم بر کاغذ مُہری سرکاری می باشد، مگر ایں بے احتیاطی کہ از بندہ می شود، بہ دو وجہ است۔ اوّل ایں کہ مقدمہ را بطور سرکاری دائر کردہ وجہ دوم ایں عمل کہ یقیناً در راہ جناب نیز لائق عفو خواہد بود۔ این ست کہ ایں کاغذ از رقم ذاتی بندہ تیار شدہ اند و بر کار سرکاری ہم ہمیشہ ہمیں کاغذ را صرف می کنم، و در دفتر ہم از صادر کاغذ کہ تیار شدہ اند، تا ایندم یک پرچہ نہ گرفتہ ام چوں جناب را ناصح فدوی میدانم لہٰذا از اصل حال ایں امر خود بندہ را ضرور

نمود کہ جناب را مطلع دارم"

غور تو کرو کہ اُن کی اخلاقی قوّت اور دیانت کا اثر کیسا زبردست اور عمیق تھا کہ اُن کے ہم رتبہ افسر بھی ذرا سی لغزش پر معذرت پر مجبور ہو جاتے تھے۔

احتیاط

نواب صاحب تمام معاملات میں نہایت محتاط تھے، خصوصاً خط و کتابت اور مضامین کی تحریر و اشاعت کے معاملہ میں بہت سی احتیاطیں برتا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر کسی مسودہ کی دس نقلیں ہوتی تھیں تو ہر ایک نقل کو علیٰحدہ علیٰحدہ پڑھ کر دستخط کیا کرتے تھے ذاتی خطوط کو بھی لکھنے کے بعد بہ نظرِ احتیاط دوبارہ پڑھتے تھے، اگر کبھی عجلت یا مصروفیت کی وجہ سے دوبارہ پڑھنے کا موقع نہیں ملتا تھا تو خط کی پیشانی کے ایک گوشہ پر لکھ دیتے تھے کہ "دوبارہ نہیں پڑھا" اس طرح کے متعدد خطوط اُن کے دیکھنے میں آئے۔

جب اہم خطوط کا جواب لکھتے تھے، تو جواب کی ایک نقل بھی اپنے پاس رکھ لیتے تھے جو عموماً موصولہ خط کے ساتھ رہتی تھی، اگر کسی معاملہ کے متعلق زیادہ خط و کتابت رہتی تھی، تو ایک پوری مسل مرتب ہو جاتی تھی۔

قریباً تمام خطوط جو اُن کے پاس آتے تھے اُن پر پتہ کی جانب عموماً بائیں طرف تاریخ موصولہ و جواب دینے کی تاریخ لکھدیتے تھے، عام خطوط پر بھی اکثر جواب کا خلاصہ یا یادداشت کے طور پر لکھدیا کرتے تھے۔ کسی خط، درخواست یا مضمون کو جب تک غور سے پڑھ کر اچھی طرح سمجھ نہیں لیتے جواب نہیں لکھتے تھے، خواہ اس کی وجہ سے جواب میں تاخیر ہو جائے۔

بعض بڑے لوگوں کی طرح سفارش کرنے میں بخیل نہیں تھے، ہر حاجت مند کی سفارش کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ لیکن بایں ہمہ پوری احتیاط سے کام لیتے تھے، جب تک براہ راست کسی شخص کی حالت ولیاقت سے واقفیت نہ ہو سفارش کے لئے آمادہ نہیں ہوتے تھے اور سفارشی تحریروں میں عموماً جچے تلے الفاظ جو واقعہ کے مطابق ہوں لکھتے تھے۔

راز داری

نواب صاحب کا سینہ سیکڑوں پُر اسرار واقعات کا مخزن تھا۔ حیدر آباد کے آخری زمانہ قیام میں، وہ مدار المہام اور اعلیٰ حضرت کے معتمد تھے اور سلطنت کے تمام اہم راز اُن کو معلوم تھے، جا بجا ملک میں جو خفیہ سازشیں ہوتی رہتی تھیں اُن سے بھی بے خبر نہ تھے جس طرح دوستوں کے راز ان کو معلوم تھے، اسی طرح دشمنوں کے بھی، لیکن کسی حالت میں بھی اُنھوں نے ایک شخص کا راز دوسرے پر ظاہر نہیں کیا، گویا ان کا سینہ راز کا مدفن تھا کہ جو راز وہاں پہنچا ہمیشہ کے لئے دفن ہوگیا۔

سلطنت کے معاملات میں راز داری ایک خاص چیز ہے، بہت سے معاملات ایسے ہوتے ہیں کہ اگر قبل از وقت ظاہر ہو جائیں تو فتنہ و فساد کا باعث ہوں، اس لیے حیدر آباد میں اُنھوں نے اپنے اقتدار کے زمانہ میں ایک صیغۂ راز قائم کر رکھا تھا۔ اس صیغہ کے ذریعہ سے جو کام ہوتا تھا، بجز اُن کے ایک دو معتمد ماتحتوں کے کسی کو اُس کی اطلاع نہیں ہوتی تھی، ایک زمانہ میں مولوی ابوالحسن صاحب صدیقی بدایونی اور نواب عزیز جنگ اُن کے خاص معتمدوں میں تھے۔

قومی معاملات میں وہ راز داری کو صرف اُسی حد تک جائز رکھتے تھے جہاں تک قومی اغراض و مقاصد کے لئے مضر نہ ہو، ورنہ اُن کا عام طریقہ یہ تھا کہ وہ تمام معاملات کو پبلک پر ظاہر کر کے لوگوں کی نکتہ چینی اور مشورہ سے فائدہ اُٹھاتے تھے، مسلم یونیورسٹی کے معاملات میں بھی اُنھوں نے یہی طریقہ اختیار کیا۔ ابتدا میں جب تک معاملات غیر منفصل اور پیچیدہ تھے پبلک کو تشویش میں مبتلا کرنا مناسب نہیں سمجھا، لیکن جب یہ دیکھا کہ اب واقعات کا مخفی رکھنا بجائے مفید ہونے کے مضر ہے، تو تمام واقعات شائع کر دیئے، حالانکہ چند با اقتدار اصحاب کی یہ خواہش تھی کہ تمام معاملات آخر تک صیغۂ راز میں رکھے جائیں۔

البتہ جب قومی معاملات میں سے کسی خاص معاملہ کے متعلق اُن سے راز داری کی خواہش کی جاتی تھی تو وہ حتی الامکان اس کا لحاظ رکھتے تھے، لیکن خاص خاص حالات میں خود قومی

مفاد کی خاطر بعض مخصوص احباب کو ان معاملات پر مطلع بھی کر دیتے تھے، چنانچہ اسی طرح کے ایک معاملہ کے متعلق مولوی بشیر الدین صاحب کو لکھتے ہیں :

"مسٹر ماریسن کی چٹھی چونکہ پرایا کاغذ ہے اور آنریری سکرٹری صاحب نے اس کو کانفڈنشل طور پر جاری کیا ہے، لہذا اس کے بھیجنے سے قاصر ہوں، البتہ خود اپنے دو خطوں کو میں آج کی ڈاک سے آپ کے پاس بھیج رہا ہوں وہ اگرچہ کانفڈنشل ہیں لیکن میں نے نواب محسن الملک بہادر کی خدمت میں عرض کر دیا ہے کہ با ایں ہمہ میں اُن لوگوں سے اپنی کارروائی کو مخفی رکھنا مناسب نہیں سمجھتا ہوں جن کو مجھ سے زیادہ کالج کے ساتھ ہمدردی ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی اُمید ہے کہ آپ بھی ان کاغذات کو کانفڈنشل طور پر دیکھیں گے اور اخبار میں ان کے نوٹس نہ لیں گے اور اسی اعتقاد پر میں نے آپ کے پاس ان کاغذات کے بھیجنے کی جرأت کی ہے۔"

اصول و قواعد کی پابندی

نواب صاحب اگرچہ نہایت نرم مزاج اور رقیق القلب تھے، انکسار و تواضع اُن کی نمایاں خصوصیت تھی، لیکن باوجود اس کے وہ قاعدہ کے خلاف کبھی نہیں کرتے تھے، اگر کوئی شخص اُن سے ایسی خواہش کرتا تھا جو قاعدہ کے خلاف ہو تو باوجود اس وسعت اخلاق و مروت کے جو ضرب المثل تھی وہ اس خواہش کے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیتے تھے۔

نواب لطیف یار جنگ بہادر فرماتے ہیں :

"اپنے ملک و مالک کے سچے خیر خواہ تھے، جو صحیح اصول اُن کے مقرر تھے، اُن میں کبھی فرق نہیں آنے دیتے تھے"

سر سید کی وفات کے بعد آنریری سکرٹری کے عہدہ کے لئے کسی ٹرسٹی کے انتخاب کا مسئلہ درپیش تھا۔ اسی زمانہ میں مسٹر بک پرنسپل نے جو نواب محسن الملک کو سکرٹری بنانا چاہتے تھے، ٹرسٹیوں کے نام ایک خط جاری کیا اور یہ استفسار کیا کہ کیا آپ کا نام بھی نواب محسن الملک کے مؤیدین میں درج کیا جائے؟

نواب صاحب نے اس طرز عمل کو بے قاعدہ قرار دیا اور نواب محسن الملک کو لکھا :

"آج ہی میں نے بیک صاحب کی ایک چھٹی اپنے نام دیکھی ہی، جس میں وہ آپ کی سکرٹری شپ کی نسبت میری رائے دریافت کرتے ہیں، لیکن اپنے نام کے ساتھ اُنھوں نے یہ کچھ نہیں تبلایا کہ اُن کی یہ کارروائی کس حیثیت سے ہی، اگر رجسٹرار کی حیثیت سے ہی تو لائف آنریری سکرٹری صاحب نے اب تک اُن کی رجسٹراری کی وہ اطلاع جو قانوناً اُن کو ٹرسٹیوں کے نام جاری کرنی چاہیئے تھی، جاری نہیں کی ہی، اور اس لئے اُن کی حیثیت رجسٹراری کے تسلیم کرنے میں قانوناً مجکو محل تامل ہی اور اگر بحیثیت پرنسپل کالج ہی تو اس سے تو مجکو سخت اختلاف ہوگا، کیونکہ پرنسپل کا یہ کام نہ ہونا چاہیئے۔ اُن کی خیر خواہی کالج کی نسبت تسلیم اور سو مرتبہ تسلیم، اور اس کے لحاظ سے جس قدر ضرورت ہو اُس سے بھی سو حصہ زیادہ اُس کا شکریہ ادا کرنے کو حاضر ہیں۔ لیکن اُن کی یہ مداخلت ایک بے جا مداخلت ہمارے کاموں میں ہی، پھر اس مرادآباد کے سفر میں مجکو متعدد اشخاص سے جو ملنے کا اتفاق ہوا، جو علی گڑھ سے آئے ہوئے تھے اور اُن سے معلوم ہوا کہ اُن کی یہ چھٹی کئی ہفتہ سے ٹرسٹیوں میں گشت کر رہی ہی، اول معدودے چند کی نبض پر انھوں نے ہاتھ رکھا پھر اُس کے بعد اُس حلقہ کو اور وسعت دی اور اب اس کو اور وسیع کیا ہی، اگر یہ سب سچ ہی (اور مجھ سے تو یہی کہا گیا ہی کہ سچ ہی) **تو ناقابل برداشت ہی**، گو یہ میں جانتا ہوں کہ ایک میرے ناقابل برداشت کہنے سے کچھ نہ ہو جائے گا اور اس لئے میری گزارش کا مطلب صرف اس قدر ہوگا کہ میں اپنا فرض ادا کروں گا، دوسروں کو اختیار ہی کہ وہ جو چاہیں اس کو سمجھیں اور جو چاہیں وہ کریں۔"

نواب صاحب کی اس تحریر سے اندازہ ہوتا ہی کہ وہ کسی حالت میں بھی اصول و قواعد کی خلاف ورزی کو جائز نہیں رکھتے تھے۔

احساس فرض

نواب صاحب کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ اپنے فرض اور ذمہ داری کو پورے طور پر محسوس کرتے تھے، اُنھوں نے معمولی محرری سے وزیراعظم کے سکرٹری کے عہدہ تک ترقی کی، لیکن احساس فرض کے لحاظ سے یہ تمام زمانہ اُن کے لئے یکساں تھا، جس طرح وہ محرری کے زمانہ میں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو محسوس کرتے تھے اسی طرح معتمدی وزارت کی حالت میں، بلکہ معتمدی کے زمانہ میں اُن کے فرائض کی ہمہ گیری ایسی حیرت انگیز تھی کہ آج تک حیدرآباد میں اس عہد کے افسانے مشہور ہیں۔

معتمدی کے زمانہ میں اُن کو اپنے عہدہ کے علاوہ دوسری سرکاری خدمات میں بھی مصروف رہنا پڑتا تھا، ریاست کے فائدے اور اُس زمانے کے لحاظ سے وہ ان خدمات کے انجام دینے پر مجبور تھے، یہ کام بھی درحقیقت سرکاری تھے۔ لیکن اُن کے صیغے کے نہیں تھے، وہ اس کو کیونکر جائز رکھتے کہ ان خدمات کی وجہ سے اپنے صیغہ کے کام کو نظرانداز کردیں۔ اس لئے اپنے مخصوص فرائض انجام دینے کے لئے اُن کو مزید وقت صرف کرنا پڑتا تھا، ایک موقع پر خود لکھتے ہیں:

”گو میرا کیسا ہی بڑا وقت میرے عہدہ کے کاموں کے علاوہ صرف ہوتا ہو لیکن اگر میرے عہدے کا کام کسی وقت رُک گیا تو اُس کی بدنامی سے میں کسی طرح یہ کہہ کر اپنے کو نہ بچا سکوں گا کہ میرا وقت دوسرے کاموں میں بہت کچھ صرف ہوا تھا، مع ہذا خلائق کی تکلیف کی بھی حتی الامکان مجھ سے برداشت نہ ہو سکی، اور یہی وجہ تھی کہ اکثر ان دنوں میں بھی جب کہ میں دن کا ایک بڑا حصہ اپنے عہدہ سے غیر متعلقہ کاموں میں صرف کرکے تھک تھک گیا ہوں، اور نو نو بجے بلکہ دس دس بجے رات تک کچہری میں بیٹھکر اپنے عہدہ کے کام کو انجام دیا۔“

یہ تو اُن خدمات کا ذکر ہی جو اُنھوں نے ملازمت کے سلسلہ میں انجام دیں، آنرری خدمات میں وہ اپنی ذمہ داریوں کو اور زیادہ محسوس کرتے تھے۔ وہ کوئی آنرری عہدہ محض اعزاز کے لئے اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتے تھے، اسی بنا پر جب اُن کی صحت قابل اطمینان نہیں رہی تو وہ

کالج کے آنریری سکریٹری کے عہدہ اور مسلم لیگ وغیرہ کی ممبری سے دستکش ہو گئے، حالاں کہ اُن کے لئے سہولتیں بہم پہنچائی گئیں اور یہ انتظام کیا گیا کہ کام اور لوگ کریں اور وہ اعزازی طور پر اپنے عہدہ پر قائم رہیں، مگر فرض کا احساس اُن کو اس پر آمادہ نہ کر سکا۔

۱۹۱۳ء میں اُن کو انجمن خدام کعبہ کی طرف سے ایک عہدہ پیش کیا گیا، مگر انھوں نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ وہ اس کے فرائض انجام نہیں دے سکتے۔ انھوں نے لکھا۔

"میری حالت صحت جب یہ ہے کہ امروہہ بلکہ اپنے محلہ میں بھی عملاً کام کرنے کے قابل نہیں ہوں تو گویا جس عہدہ سے مجکو سرفرازی بخشی جاتی ہے، وہ محض میرے لئے ایک اعزازی خطاب ہوگا اور اس کی میں ضرورت نہیں سمجھتا"

ادائے فرض میں محنت

احساس فرض نے نواب صاحب میں ایک عجیب قوتِ عمل پیدا کر دی تھی، اُن میں کام کرنے کا جذبہ اتنا زبردست تھا اور وہ ہر محنت کو برداشت کرنے کے لئے ایسی مستعدی سے طیار رہتے تھے کہ نہ صرف اُن کے دوستوں بلکہ دشمنوں کو بھی اعتراف تھا کہ وہ بڑے کام کرنے والے ہیں، کام میں ان کا انہماک دیکھ کر یہ کہنا پڑتا تھا کہ قدرت نے اُن کو درحقیقت کام کرنے کے لئے پیدا کیا ہے آغاز پیری تک روزانہ ۱۵ - ۱۶ گھنٹہ کام کرنا اُن کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔

گورنمنٹ انگریزی کی ملازمت میں اُنھوں نے محرری سے تحصیلداری تک ترقی کی اور ہر عہدہ پر پہنچکر ایسی محنت سے کام کیا کہ ہر افسر نے اُن کی محنت کا اعتراف کیا اور اُن کو سارٹیفکٹ دیئے۔ مسٹر کالون کلکٹر سے نماز پر جھگڑا ہو گیا جو یہاں تک بڑھا کہ وہ ایک طویل رخصت لینے پر (جو درحقیقت استعفیٰ تھا) مجبور ہوئے، مگر اس ناگوار حالت کے باوجود جب چلتے وقت مسٹر کالون نے ان کو سارٹیفکٹ دیا تو لکھا کہ:

"میں نے چار مہینے اُن کا کام دیکھا ہے اور میں اُن کے کام سے بالکل مطمئن ہوں یہ فرائض میں چست اور ذہین ہیں"

حیدرآباد میں ناظم عدالت کے عہدہ سے معتمد مدار المہام کے درجہ تک ترقی کی، یہاں بھی ہر مدار المہام نے اُن کی محنت و مستعدی کا اعتراف کیا۔ خصوصاً سر سالار جنگ اعظم کا اعتراف کوئی معمولی بات نہیں، جن کا تدبر اور مردم شناسی ضرب المثل ہے۔ سر آسمان جاہ کو تو خاص طور پر اُن کا کام دیکھنے کا موقع ملا۔ اس لئے وہی سب سے زیادہ نواب صاحب کے معترف تھے چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"چند کاغذات آپ کے دفتر کے بھیج دیئے گئے ہیں ... جس قدر آپ محنت کرتے ہیں، میں گواہ ہوں کہ کوئی اور اس قدر نہیں کر سکتا .... خدا تعالیٰ سب معتمدین کو اسی قدر قوت عطا کرے تاکہ ہم چشموں میں سرفراز رہیں اور کار سرکار بھی اچھی طرح سے ہوتا رہے"۔

جس زمانہ میں وہ برداشتہ خاطر ہو کر سر آسمان جاہ کو استعفا دے رہے تھے تو ضرورتاً ایک عرضی میں سر آسمان جاہ کو اپنے کام کی کیفیت بھی لکھی ہے ورنہ عموماً وہ کبھی اپنی کارگزاری کے متعلق کچھ کہنا پسند نہیں کرتے تھے، لکھتے ہیں:

"میں نے سرکاری کام کے سامنے کبھی اپنی جان کو جان نہیں سمجھا اور اپنی تندرستی کی حفاظت سرکاری کام کے مقابلہ میں ہمیشہ میری عزت و غیرت کے خلاف تھی"

اس کے بعد لکھتے ہیں:

"مہابلیشر پر جو میں اچھا ہوا کر پھر گور کے کنارہ تک پہنچ گیا، تو اُس کا سبب بھی صرف یہی تھا، آج میں نے سرکار کی خدمت سے واپس آکر دفتر والوں سے دریافت کیا تھا تو معلوم ہوا کہ بارہ ۱۲۰۰ سو مثلوں کے قریب وہاں سے تجویز کر کے میں نے صرف اپنے دفتر بھیجیں اور اس کے علاوہ جو اور بہت سا وقت دوسرے کاموں اور دوسری سرکاری خط و کتابت میں صرف کرنا پڑا، اُس کا کوئی حساب نہیں"

پھر یہ لکھنے کے بعد کہ اب میرے کرنے کے لائق ایک دو ہفتہ کا کام رہ گیا ہے اس کے بعد

مجکو آزاد کیا جائے کہتے ہیں :

"میرے دفتر والے جب کسی کام کو میرے کرنے کے لئے ہفتہ یا دو ہفتہ کے لائق سمجھتے ہیں تو اُس سے معمولی طور سے ایک ہفتہ یا دو ہفتہ کا کام نہیں سمجھنا چاہیئے وہ یہ تخمینہ کرتے ہیں میرے طرز محنت کے لحاظ سے کہ جب مجکو دفتر میں بیٹھ کر کام کرنے کی کبھی فرصت ملی، تو صبح سے شام تک اور شام سے آٹھ آٹھ نو نو بجے شب تک برابر کام میں وقت گزرا ہی - اور وہ بھی اس قدر چستی اور جلدی اور تیزی کے ساتھ، جس کے اعادہ کی یہاں کچھ ضرورت نہیں ہی تو ایسے ایک دو ہفتہ کو ایک دو مہینہ بلکہ کچھ اُس سے زیادہ ہی سمجھنا چاہیئے"

اس سے اندازہ ہو سکتا ہی کہ اُن کی محنت و مستعدی کی کیا حالت تھی، دیکھنے والے کہتے ہیں کہ وہ اپنے دفتر میں بیٹھ کر اتنا لکھتے تھے کہ دو کلارک دن بھر میں اُس کی نقل بھی نہیں کر سکتے تھے، کبھی کبھی اُن کے دوست اس محنت پر اُن کے ساتھ ہمدردی کرنے پر مجبور ہوتے ہوتے تھے۔ چنانچہ نواب شہاب جنگ بہادر معین المہام کوتوالی ایک خط میں لکھتے ہیں :

"بہر حال جناب را خود توجہ بر صحت خود ضرور ست کہ ایں احتیاط جناب ہم کمتر از عبادت نیست"

نواب فریدون الملک بہادر جن کو نواب صاحب کے کام سے واقف ہونے کے خاص مواقع حاصل تھے، ایک خط میں مولوی محمدؐ امین صاحب کو لکھتے ہیں :

"قدرت نے اُن کو کام کرنے کی ان تھک قوت دی تھی اور وہ روزانہ مسلسل ۱۵- ۱۶ گھنٹے کام کرنے کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے"

یہی حالت اُن کی محنت کی قومی کاموں میں تھی، مولوی ادریس احمد صاحب ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول شاہجہان پور جو کالج میں اُن کی ماتحتی میں مدت تک کام کر چکے ہیں لکھتے ہیں

"کام کے لحاظ سے آپ کی خصوصیت یہ تھی کہ کسی کام سے آپ کسی وقت اور

کسی حالت میں گھبراتے نہ تھے، صبح کو ورد و وظائف سے فارغ ہو کر آپ آٹھ بجے دفتر کی میز پر تشریف لے آتے تھے اور ڈاک دیکھنے کے سلسلہ ہی میں کام شروع ہو جاتا تھا اور یہ سلسلہ دو ڈھائی بجے سہ پہر کے ختم ہو جاتا تھا، اس وقت جب آپ محل میں تشریف لے جاتے تھے تو عموماً باہر برآمدہ میں نکل کر چاروں طرف خوب غور سے یہ دیکھا کرتے تھے کہ آپ سے ملنے کوئی شخص یا طالب علم تو نہیں آ رہا ہے اگر کوئی طالب علم بھی آتا ہوا نظر آ جاتا تو آپ وہیں کھڑے ہو کر انتظار کرتے تھے، اگر وہ کچھ کہنا چاہتا تو بلا اظہار تکان اس کی باتیں اس قدر توجہ اور کشادہ پیشانی سے سنتے تھے کہ گویا نواب صاحب نے اسی وقت کام کرنا شروع کیا ہے،

"ایک بار دورانِ سر ہو کر بے ہوشی طاری ہو گئی سول سرجن نے سخت ممانعت کر دی کہ آپ ایک ہفتہ تک مطلق کام نہ کریں اور ملاقات کا سلسلہ بالکل بند ہونا چاہیے، چنانچہ میں نے کارڈ بورڈ کی تختیاں لکھکر بنگلہ کے چاروں طرف لٹکا دیں کہ حسب ہدایت سول سرجن ملاقات کا سلسلہ بند ہے، مگر اہل غرض کب مانتے تھے، اس قدر زور زور سے باتیں کرنا شروع کرتے کہ نواب صاحب آواز پہچان کر کمرہ کے اندر بلا لیتے تھے اور اس طرح کام کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ایک بار میں نے بہ منت عرض کیا کہ اس حالت میں حضور کی جان کا خطرہ ہے، تو فرمایا کہ کام ہی میری زندگی کا باعث ہے، جس وقت مجھ سے کام چھوٹ جائے اُس وقت سمجھ لینا کہ میرا آخری وقت آ پہنچا"

"کالج کے کام سے سبکدوش ہونے کے بعد آپ نے مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں ایک پمفلٹ لکھا تھا، جس کا مسودہ بمقام وہرہ دون میں نے تحریر کیا تھا۔ نواب صاحب بتلاتے جاتے تھے اور میں لکھتا جاتا تھا ...... اس کا ایک حصہ لکھنے سے باقی رہ گیا تھا، نواب صاحب علی گڑھ تشریف لے گئے اور محمد عامر مصطفےٰ خاں

صاحب ٹرسٹی کالج کے مکان پر مقیم ہوئے، میں روزمرہ بہت سویرے خدمت میں پہنچ جایا کرتا تھا، ایک صبح آپ نے فرمایا کہ لقوہ نے مجھ پر حملہ کیا ہی اور چہرہ قریب لاکر دکھلایا اور کلّی کرکے دکھائی جو بالکل ٹیڑھی نکلی، فرمایا کہ "ابھی اس کا چرچا مت کرو۔ ورنہ سول سرجن کی قید میں مبتلا ہو جاؤں گا اور مضمون رہ جائے گا" مضمون لکھانے بیٹھ گئے اور دس بجے تک مضمون ختم کرا دیا۔

"اس کے بعد اپنی علالت کی اطلاع کی ڈاکٹر صاحبان آئے اور ملاقات سے پرہیز شروع ہو گیا، خلاصہ یہ کہ ایسے خطرناک مرض کی حالت میں چار گھنٹے دماغی کام کرتے رہے۔"

اُن کے دماغ کی یہ عجیب خصوصیت تھی کہ فکر و تردد اور پریشانی کی حالت میں بھی وہ نہایت اطمینان اور سکون خاطر کے ساتھ کام کرتے تھے اور ہر معاملہ پر پوری احتیاط و غور فکر سے توجہ کرتے تھے، جس زمانہ میں وہ حیدرآباد چھوڑنے کے لئے سخت مضطرب تھے اور ایک ایک گھڑی اُن پر بھاری تھی، نہایت جمعیت خاطر کے ساتھ اپنا کام انجام دیتے تھے، اُن کے چہرہ سے یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی فکر و تردد میں مبتلا ہیں، چنانچہ انھوں نے سر آسمان جاہ کی غلط فہمی رفع کرنے کے لئے لکھا:

"ایک اور امر بھی ہی کہ جس سے شاید سرکار کو کچھ شبہ ہوتا ہو، یعنی سرکار میں بار یابی یا سرکاری کاموں میں مصروف ہونے اور بات چیت کے وقت کسی ایسی اوداسی اور ملال کا میرے حرکات و سکنات سے ظاہر نہ ہونا جیسی کہ ان عرائض سے ظاہر ہوتی ہی، اُس کی نسبت فدوی صرف اس قدر عرض کرنا کافی سمجھتا ہی کہ یہ حالت میری طبیعت کی شاید میری روح کے پرواز کرنے کے چند منٹ پہلے تک بھی قائم رہے گی۔"

مولوی سید احمد حسین صاحب زینبی بیان کرتے ہیں:

"نواب صاحب (مرحوم) زمانۂ ملازمت میں اپنے فرائض منصبی ادا

کرنے میں، نہایت چست، جفاکش اور دیانت دار تھے اور یہی ایک امر اُن کی ترقی اور شہرت کا راز تھا، اُن کی حسن کارگزاری نے تمام حکام اور رعایا کو گرویدہ بنا رکھا تھا۔ خصوصاً جناب مختار الملک بہادر تو بالکل اُن کے معتقد تھے۔"



حسن معاشرت

کسی شخص کی اخلاقی حالت کا اندازہ کرنے کے لئے بہترین معیار یہ ہے کہ اس کا برتاؤ اور طرزِ عمل اپنے عزیزوں، دوستوں اور عام لوگوں کے ساتھ کیسا ہے؟ بہت سے مشہور اور تعلیم یافتہ اشخاص بلکہ قوم کے لیڈر تک ایسے موجود ہیں جو عام مجامع میں تو نہایت خوش اخلاق اور متواضع نظر آتے ہیں لیکن جب اُن کی اندرونی معاشرت دیکھو تو حیرت ہوتی ہے، نہ احباب کے ساتھ اخلاص، نہ عزیزوں کے ساتھ حسن سلوک، نہ عام طرزِ عمل شریفانہ، مگر نواب صاحب کی یہ حالت تھی کہ وہ خلوت و جلوت میں یکساں تھے، اُن کی اندرونی معاشرت خلوص و محبت اور حسنِ عمل کی ایک تصویر تھی اس لئے جو شخص جس قدر زیادہ اُن سے قریب ہوتا۔ اُسی قدر زیادہ اُن کے حسن اخلاق کا معترف ہوتا۔ یہی سبب ہے کہ نواب صاحب کے سب سے زیادہ مداح وہ لوگ ہیں جو مدت تک اُن کے ساتھ رہے یا کام کر چکے ہیں۔

نواب صاحب کا حسن اخلاق کسی خاص درجہ یا رتبہ کے لوگوں کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ سے اس طرح ملتے اور ایسے اخلاق و محبت سے پیش آتے تھے کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی، اُن کو اپنے ہم رتبہ اور جلیل القدر اشخاص کے مجمع میں بھی کسی ادنیٰ شخص کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جانے میں ذرا بھی تکلف و تامل نہ ہوتا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ اُن سے ملنے والے سب قسم کے لوگ تھے، بعض ایسے بھی تھے جن کو وہ ناپسند کرتے تھے اور اُن کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے تھے، لیکن ملاقات اور ظاہری تعلقات میں اس ناپسندیدگی کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا تھا، بلکہ وہ اپنے مخالفین سے بھی ملاقات کے وقت تہذیب و شائستگی کے ساتھ پیش آتے اور انبساط و فراخ دلی کے ساتھ گفتگو کرتے تھے، ہر آنے والے کی تعظیم کے لئے سرو قد کھڑے ہو جانا، پوری توجہ سے گفتگو کرنا، نرمی و

شائستگی سے ہر بات کا جواب دینا، اُن کی معمولی عادتیں تھیں جن میں کبھی فرق نہیں آتا تھا۔
نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی فرماتے ہیں کہ:

”شائستگی اور تہذیب جزو زندگی ہوگئی تھی اور یہ عام تھی، آنے والوں کی آنے کے وقت تعظیم کرنا، رخصت کے وقت سواری تک پہنچانا لازم تھا، کوئی اصرار، کوئی تکلیف یا مصروفیت اس سے باز نہیں رکھ سکتی تھی، نشست میں صدر جگہ مہمان کے لئے تھی، بائیں نواب صاحب کے لئے۔ گاڑی میں دائیں جانب دوسروں کے لئے گویا مخصوص تھی، بائیں نواب صاحب کے لئے، بلحاظ نواب صاحب کی عظمت کے دائیں جانب بیٹھنے میں نہ تکلف بلکہ تکلیف ہوتی تھی، لیکن انکار کو بے کار سمجھ کر کہنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس میں عمر کی قید بھی نہ تھی۔“

ماتحت ملازمین کے ساتھ نواب صاحب کا طرز عمل

کام کے اوقات کے علاوہ جب کہ وہ مصروف و منہمک ہوتے تھے، عام طور پر اپنے ماتحت کام کرنے والوں کے ساتھ، محبت، بے تکلفی اور خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آتے تھے اور اُن پر اعتماد کرتے تھے۔ اکثر ماتحتوں کے ساتھ اُن کے تعلقات دوستانہ تھے، پرائیوٹ ملاقاتوں میں ماتحتوں کو اُن کے طرز عمل میں افسری کی کوئی جھلک محسوس نہیں ہوتی تھی۔

مولوی ابوالحسن صاحب صدیقی بدایونی، سید عبدالمجید صاحب دہلوی، نواب عزیز جنگ اور اسی طرح کے اور معزز عہدہ دار اُن کے ماتحت بھی تھے اور دوست بھی، جو عہدہ دار اُن کی ماتحتی میں کام کر چکے ہیں وہ آج تک اُن کے اخلاق سے متأثر ہیں، اُن میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ جب نواب صاحب کا تذکرہ کرتے ہیں تو اُن کے لفظ لفظ سے جوش محبت ٹپکتا ہے اور وہ نہایت حسرت و یاس کے ساتھ باچشم نم اُس زمانہ کو یاد کرتے ہیں جب کہ وہ مرحوم کی ماتحتی میں کام کرتے تھے۔

حیدر آباد میں مولوی محمد عبداللطیف خاں صاحب (ناظم آبکاری) نواب صاحب کے

پیش کار تھے، اب اس پر ۴۲ سال سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے لیکن آج بھی وہ اس جوشِ محبت بلکہ عقیدت کے ساتھ نواب صاحب کا ذکر کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں کے دل پر اپنے طرزِ عمل کا کیسا گہرا نقش چھوڑ گئے ہیں۔

حیدرآباد سے جو عہدہ دار معتوب ہو کر یا کسی اور سبب سے علحدہ ہو جاتے ہیں ماتحتوں سے اُن کا تعلق بالکل قطع ہو جاتا ہے اور بہ نظر احتیاط لوگ اُن سے مراسلت و ملاقات کرنے میں تامّل کرتے ہیں، لیکن نواب صاحب کے ماتحت عہدے دار حیدرآباد سے قطع تعلق کے بعد بھی اُن سے خط و کتابت کرتے رہے، یہاں تک کہ بعض عہدہ دار اُن سے ملنے کے لئے امروہہ آئے بعض (نواب عزیز جنگ) اُن کے ذاتی مکانات اور دوسرے معاملات کی حیدرآباد میں نگرانی کرتے تھے، حالانکہ عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ افسروں اور ماتحتوں کا تعلق بس اُسی وقت تک رہتا ہے جب تک افسر، افسر ہے۔

حیدرآباد میں اُن کے جس ماتحت کو معلوم ہوا کہ نواب صاحب کی سوانح عمری لکھی جارہی ہے اُس نے مسرت ظاہر کی، صوبہ ورنگل میں ایک معزز سرکاری عہدہ دار نے محض اس بنا پر مجھے میٹریل فراہم کرنے میں بیش قیمت مدد دی اور سہولت بہم پہنچائی کہ اُن کے نانا صاحب اور نواب صاحب سے سر سالار جنگ اول کے عہد میں تعلقات تھے، حالانکہ یہ عہدہ دار خاص حیدرآباد کے ایک معزز خاندان سے تھے اور نواب صاحب غیر ملکی تھے۔

نواب صاحب نے اپنے ماتحت کام کرنے والوں کے دل پر جو گہرا نقش چھوڑا ہے، اُس کا ایک بڑا راز یہ بھی تھا کہ اُن کے تعلقات ماتحتوں سے صرف دفتر تک محدود نہیں تھے، جس میں ہمیشہ افسر و ماتحت کے درمیان ایک قسم کی اجنبیت قائم رہتی ہے، جو خلوص و محبت سے مانع ہے۔ نواب صاحب کی حالت یہ تھی کہ وہ افسرانہ تعلقات صرف دفتر کے کمرہ تک رکھتے تھے اور گھر پر ایک خوش مزاج، ملنسار اور ہمدرد دوست کی صورت میں نظر آتے تھے ہر ادنیٰ ماتحت بے تامّل اُن کے مکان پر جاسکتا تھا، وہ تعظیم دے کر اُس کو بٹھاتے، مزاج پرسی کرتے اور اہل و عیال کی خیریت دریافت

کرتے، ماتحت بعض اوقات اپنی ذاتی ضرورتیں اُن سے بیان کرتے، خانگی امور میں مشورہ لیتے اور وہ ان کی مدد و رہنمائی کرتے۔

ہم نے کسی موقع پر اس کتاب میں نواب عزیز جنگ کی روایت سے بعض واقعات بیان کئے ہیں، جن سے ناظرین کو اندازہ ہوا ہوگا کہ وہ ماتحتوں کے ساتھ کیسی ہمدردی سے پیش آتے تھے، نواب عزیز جنگ یہ بھی بیان کرتے تھے کہ بعض اوقات جب اُن کے ماتحت مالی مشکلات میں مبتلا ہو جاتے تھے، تو وہ اپنے اثر سے اُن کو بغیر سود کے روپیہ قرض دلا دیتے تھے جو آہستہ آہستہ تنخواہ میں سے قسط وار ادا ہوتا رہتا تھا۔

حیدرآباد میں ایک اہلکار جواب پنشن پائے ہیں مجھ سے بیان کرتے تھے کہ وہ خاص حیدرآباد میں ملازم تھے، نواب صاحب نے اُن کی تبدیلی مفصلات میں کردی، لیکن تبدیل مقام کے لئے مصارف کی ضرورت تھی اور اُن کا ہاتھ خالی تھا، مجبور ہو کر نواب صاحب سے عرض کیا اور یہ کہا کہ "مجھے جانے میں کچھ عذر نہیں، اگر میرا ٹانگہ اور گھوڑا فروخت ہو جائے تو مشکلات رفع ہو سکتی ہیں"، نواب صاحب نے قیمت دریافت کی اُنھوں نے شاید ..۳ تبائی، سُن کر خاموش ہو گئے، دوسرے روز صبح کو ایک شخص اُن اہلکار کے مکان پر پہنچا، ٹانگہ کا سودا کیا اور پوری قیمت دے کر لے گیا، بعد کو معلوم ہوا کہ نواب صاحب کا بھیجا ہوا تھا، مگر خود نواب صاحب نے کبھی کچھ ذکر نہیں کیا۔

بعض افسر ایسے تنگ دل اور خود غرض ہوتے ہیں کہ وہ اپنے ماتحت اہلکاروں کے کام کو نمایاں کرنا اور اپنے بالا دست افسروں کے کان تک پہنچانا بوجہ اپنی بدباطنی کے کبھی پسند نہیں کرتے، وہ چاہتے ہیں کہ ہر کارگزاری صرف اُن کی ذات سے منسوب ہو، البتہ اگر کوئی غلطی واقع ہو تو وہ ماتحتوں کے سر تھوپی جائے، لیکن نواب صاحب کا انداز اور تھا، وہ اپنے ماتحتوں کی کارگزاری نمایاں کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، اور اگر کوئی بڑے سے بڑا شخص بھی اُن کے کسی ماتحت پر خواہ مخواہ الزام لگاتا تھا تو خود سینہ سپر ہو کر

سامنے آجاتے اور تمام ذمہ داری اپنے سر لے لیتے تھے، البتہ جب خود اُن کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ اُن کا ماتحت کسی غلط راستہ پر جارہا ہے تو وہ پہلے ایک دو مرتبہ پرائیوٹ طور پر اس کو متنبہ کرتے، اگر اصلاح پذیر ہوجاتا تو خیر ورنہ پھر ضابطہ سے کام لیتے کیونکہ سلطنت کی وفاداری کا یہی اقتضا تھا۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ جب مدارالمہام یا معین المہام نے اُن کی کسی کارگزاری پر تحسین وستائش کی تو اُنھوں نے صاف طور پر ظاہر کردیا کہ یہ میری کارگزاری نہیں بلکہ درحقیقت میرے فلاں ماتحت کی کارگزاری ہے، میرا حصہ تو اس میں بہت تھوڑا ہے۔ اس قسم کے تمام واقعات کی مثالیں بیان کرنا طوالت سے خالی نہیں۔ البتہ اختصار کے ساتھ ماتحتوں کی حوصلہ افزائی کی بعض مثالیں بیان کی جاتی ہیں۔

صوبہ ورنگل کے نظم ونسق کی جو سالانہ رپورٹ اُنھوں نے ۱۲۹۴ف کی بابت مدارالمہام کی خدمت میں پیش کی ہے۔ اس کے آخری حصہ میں اپنے ماتحت عہدہ داروں کے متعلق مفصل رائیں ظاہر کی ہیں۔ اس رپورٹ سے بعض ضروری حصے نقل کئے جاتے ہیں۔

ایک دوم تعلقہ دار کی نسبت لکھتے ہیں:

"جس قدر تجربہ مجھکو اُن کے کام کی نسبت ہوا، میں پورے اطمینان سے کہہ سکتا ہوں کہ نہایت قابل اطمینان اور محنتی شخص ہیں اور اپنا کام نہایت ایمانداری اور سچائی سے کرتے ہیں، اُن مواقع پر بھی جہاں ضرورتاً کچھ اعتبار پر بھی کام کرنا جائز ہے وہ کبھی اپنے سمجھے بغیر دستخط نہیں کرتے"

مولوی محمد عبدالقادر صاحب مددگار صوبہ دار کے متعلق لکھتے ہیں:

"میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ ایسا لائق مددگار[1] مجھکو مل گیا، وہ انگریزی بھی

---

[1] کالج کی آنریری سکریٹری شپ کے زمانہ میں بھی اُن کا طرزعمل اپنے ماتحت عہدہ داروں کے ساتھ نہایت عمدہ تھا اور وہ ہمیشہ ماتحتوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، مسٹر ابوالحسن صاحب اس زمانہ میں اُن کے اسسٹنٹ تھے۔ اپنے

جانتے ہیں اور سرکار عالی کے انجنیرنگ کالج کے تعلیم یافتہ ہیں، نہایت لائق اور مہذب شخص ہیں، اور مجکو اپنے کام میں اُن سے پوری مدد ملتی ہی، قوانین و قواعد کے بنانے میں اُن کو ایک خاص مذاق ہی۔ اور اس کام کو وہ مجھ سے بہتر انجام دیتے ہیں، ان میں وہ پورا "مادّہ" موجود ہی کہ جس قدر اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر اُن کو ترقی دی جائے، یہ بخوبی اُس کے لائق ثابت ہوتے چلے جائیں گے "۔

(بقیہ صفحہ ۲۹)
اپنے عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد نواب صاحب نے اُن کے متعلق جو مفصل رائے ظاہر کی ہی وہ پڑھنے کے قابل ہی جس کے چند فقرے یہ ہیں :

"میں نے مولوی ابوالحسن صاحب کو کیا بلحاظ اُن کی بہت سی اعلیٰ قابلیتوں کے اور کیا بلحاظ اُن کے اعلیٰ اخلاق اور ذمہ داری کے، کالج کے کاموں کے علاوہ اور دوسری بہت سی مختلف الاقسام خدمات کے واسطے (جن میں مجکو اُن سے بہت بڑی مدد ملی) ہر طرح موزوں پایا"

پھر اسی مضمون میں لکھتے ہیں :

"حیدر آباد کے طویل زمانہ ملازمت میں اور مختلف صیغوں کے سکرٹری کی حیثیت سے مجکو ہزار ہزار، بارہ بارہ سو روپیہ کے تنخواہ کے اسسٹنٹ سکرٹریوں سے کام لینے کا موقع ملا ہی اور میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بیش قرار تنخواہ کے عہدہ داروں سے مولوی ابوالحسن صاحب کو کسی بات میں کم نہیں پایا بلکہ بعض سے زیادہ اور بہت سے مواقع ایسے بھی مجکو پیش آئے جن میں اُن کی رائے کو میں نے اپنی رائے سے بہتر پاکر اپنی رائے کو بدل دیا"

ایک دفعہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے بحیثیت کانفرنس کے جائنٹ سکرٹری کے کانفرنس کے ایک عہدہ دار مولوی انوار احمد صاحب مارہروی کے لئے حسن کارگزاری کے صلہ میں پُر زور الفاظ میں سو روپیہ انعام کی سفارش کی، نواب صاحب نے اس تجویز کو نہایت پسند کیا اور بہت عمدہ الفاظ میں مولوی انوار احمد صاحب کی بعض کارگزاریاں بیان کر کے لکھا :

"اُن کا وجود کانفرنس کے حق میں بہت زیادہ مفید ہی اور کانفرنس کی خوش قسمتی ہی جو منشی انوار احمد صاحب اس کے ہاتھ لگ گئے ہیں اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی یہ کارروائی بھی بہت زیادہ لائق شکر گزاری ہی کہ وہ اپنے ماتحتوں کی کارروائی کو بہت عمدہ طور سے جانچتے ہیں اور اُن کی دل افزائی فرماتے ہیں" ۔ ۱۲

نواب صاحب کا خیال صحیح نکلا مولوی محمد عبدالقادر صاحب ترقی کرکے صوبہ دار ہوئے اور اس عہدہ کے لئے موزوں ثابت ہوئے اور بعد اختتام مدت، وظیفہ حاصل کیا، جب میں حیدرآباد میں اُن سے ملا تو وہ مہتمم محلات شاہی کے عہدہ پر ممتاز تھے، اب وہ نواب قادر نواز جنگ کے خطاب سے مشہور ہیں۔

خواجہ محمد جان دوم تعلقہ دار بندوبست کی قابلیت ولیاقت کی تعریف کرنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں:

"خواجہ محمد جان صاحب ایک ایسے عہدہ دار ہیں کہ اگر اُن کی ترقی کی رفتار میں کوئی مزاحمت نہ ہو تو جس قدر یہ ترقی کرتے جائیں گے، اُسی قدر رعایا اور سرکار دونوں کے لئے مفید تر ثابت ہوتے جائیں گے، اُن میں ایک "درد" ہے جس سے وہ رعایا کے ساتھ بہت ہی ہمدردی کرتے ہیں اور ایک "سلیقہ" ہے جس سے وہ سرکار کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور پہنچاتے رہے ہیں۔"

اپنے سررشتہ دار کی ترقی کی سفارش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میر طالب الحق نہایت درجہ محنتی ہیں، نہایت لائق، نہایت ایماندار، نہایت اشراف شخص ہیں، مجکو فخر ہے کہ میرے محکمہ کا سررشتہ دار ایسا شخص ہے، اُس ضلع کی خوش قسمتی ہوگی، جہاں یہ سوم تعلقہ دار ہوں۔"

اسی طرح انھوں نے متعدد عہدے داروں کے متعلق حوصلہ افزا الفاظ لکھ کر اُن کی کارگزاری کو نمایاں کیا ہے، جس کو ہم بخیال طوالت نظر انداز کرتے ہیں، البتہ اپنے ایک "مرحوم ماتحت" کے متعلق اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے، باوجود طوالت ہم اس کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مرزا قادر بیگ صاحب کا ذکر کرنا ناگزیر ہے، یہ بیدر کے خوش آب وہوا ضلع میں اپنی زندگی بسر کرتے تھے، سرکاری ضرورتوں سے اس تلنگانہ میں بلائے گئے

دورہ ہی میں بیمار ہوئے اور قضا کی، اُن کی رحلت سے سرکار عالی کے سلسلہ ملازمت میں سے ایک نہایت عمدہ شخص جاتا رہا۔"

"مرزا قادر بیگ صاحب نہایت محنتی اور نہایت لائق شخص تھے، ہر ایک معاملہ کو گو وہ کیسا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، جب تک خود نہ سمجھ لیتے تھے، تب تک اُس کے متعلق نہ کوئی تجویز کرتے تھے، نہ کسی تحریر پر دستخط کرتے تھے، اُن کے چھوٹے سے دستخط "قادر بیگ" اس بات کی کافی دلیل تھے کہ جس افسر کے یہ دستخط ہیں اُس نے اُس کے تمام مالہ وما علیہ پر غور کر لیا ہے۔ رعایا پر ماں باپ کی طرح شفیق تھے کسی مظلوم غریب رعایا کو ستم رسیدہ دیکھ کر اُن کے دل پر چوٹ لگ جاتی تھی، اسی طرح وہ ظالموں اور بدمعاشوں کے لئے نہایت سخت تھے، تھوڑے عرصہ میں اُنھوں نے نلگنڈہ کے اُس مجمع بدمعاشان کو بالکل منتشر کر دیا، جس میں مختلف سررشتوں کے سرکاری ملازم، اور غیر ملازم شریک ہو گئے تھے اور ہر ایک سررشتہ پر ناجائز دباؤ ڈالتے تھے، اور ہر ایک مقدمہ میں، گو وہ کسی سررشتہ کا ہو وہ بدمعاش دخل دے کر اپنی مٹھی گرم کرتے تھے،

" اپنے ماتحت عہدہ داروں کے ساتھ مرزا قادر بیگ کا برتاؤ نہایت دوستانہ تھا، اُن کے ماتحت اپنے افسر کے گھر کو اپنا گھر سمجھتے تھے، ساتھ ہی وہ بہت بے مروت تھے جب کہ اُن کو معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے کسی ماتحت کی کارروائی اچھی نہیں ہوئی، دیانت کا ذکر کرنا اُن کے درجہ اور عہدہ کے مناسب نہیں ہے، لیکن اب چونکہ وہ نہیں ہیں اور موقع ہے، تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ نہایت متدین شخص تھے، اور نہایت آزادانہ کام کرتے تھے اور ان سب صفات کے ساتھ اُن میں کام کی نمائش کا خیال مطلق نہیں تھا،

" محنت کا یہ حال تھا کہ صبح کے ۶-۷ بجے سے رات کے نو نو، دس دس، گیارہ گیارہ بجے تک وہ عزیز کچہری میں رہتا تھا، میں نے بہت منع کیا کہ اس قدر شدید

محنت کر کے اپنے آپ کو خطرہ میں نہ ڈالیں ـــــ ، مگر وہ کہتے تھے کہ میں مجبور ہوں کہ اس قدر وقت صرف کئے بغیر کام انجام نہیں پا سکتا، حاصل یہ کہ اُس نہایت لائق افسر نے اپنے فرائض خدمت کو بے انتہا محنت سے انجام دینے کی وجہ سے اپنی جان سے ہاتھ دھویا، جس کا قلق مجکو اپنی زندگی بھر رہے گا، اور اگر کچھ تسکین اس افسوس ناک حادثہ کے بعد ہو سکتی ہے، تو وہ صرف اس سے ہو سکتی ہے کہ اُن کے یتیم بچوں کی دستگیری فرمائی جائے۔ جس کے واسطے علیٰحدہ سرکار میں میری طرف سے گزارش پیش ہے"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کو اپنے ماتحتوں کے ساتھ کیا تعلق تھا کہ وہ مرنے کے بعد بھی اُن کو نہیں بھولتے تھے۔ خوش قسمت ہیں وہ ماتحت جن کو ایسا افسر نصیب ہو۔

ایک خاص قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اس رپورٹ میں اُنھوں نے جس طرح اپنے مسلمان ماتحتوں کی کارگزاریاں بیان کی ہیں اسی طرح ہندو اور پارسی عہدہ داروں کی بھی، اور جن عہدہ داروں میں اُنھوں نے کمزوریاں پائی ہیں اُن کا تذکرہ بھی صاف صاف کر دیا ہے، خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں، اُنھوں نے یہ کمزوریاں بڑے اچھے پیرایہ میں بیان کی ہیں، مثلاً ایک نوجوان عہدہ دار کے متعلق لکھتے ہیں:

"دوم تعلقہ داری کا کام بہت خوش سلیقگی کے ساتھ انجام دیتے ہیں میں نہیں کہتا کہ محنتی نہیں مگر اُن کا سن ہے کہ بہت زیادہ محنت کریں"

ایک پارسی عہدہ دار کی نسبت اُن کی لیاقت اور قانونی قابلیت کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"لیکن جس وقت اُس پہلی منصرمی (قائم مقامی) سے لوٹے، تو اُن کی زبان سے اُس وقت ایک فقرہ میرے سامنے نکلا جس میں اُنھوں نے کہا کہ "جہاں میں نے حکومت کی (یعنی نلگنڈہ میں)، وہاں میں حکومت کے بغیر قیام نہیں کر سکتا تھا، لہٰذا باوجودیکہ مرزا قادر بیگ مجکو روکتے تھے میں نے رہنا گوارا نہیں کیا" اس فقرہ کے

سننے کے بعد میں نے اس خیال کو آیندہ اپنے صوبہ میں اُن کو کوئی جگہ دوں، دل سے نکال ڈالا، بالآخر بہت مدت کے بعد جب کہ مسٹر جمشید جی نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اُن کے لئے کسی خدمت کی سفارش کروں تو میں نے اپنا وہ خیال اُن پر ظاہر کیا، میں نے اُن سے صاف کہا کہ میں ایسے افسروں کو پسند کرتا ہوں جو رعایا کے ساتھ اپنے زمانہ حکومت میں اس طرح بسر کریں کہ بعد زمانہ حکومت کے بھی عزت کے ساتھ اُن میں رہ سکیں۔

"اس پر مسٹر جمشید جی نے معذرت کی اور مجھ سے واثق اقرار کیا کہ آیندہ میں ایسا خیال کبھی دل میں نہ لاؤں گا، مجھکو اُن کے وعدہ کا پورا بھروسہ ہے، لہذا میں نے سفارش کی اور پھر اُن کو اُسی جگہ اُسی خدمت پر مقرر کرایا اور میں پسند کرتا ہوں کہ وہ میرے صوبہ میں سوم تعلقہ داری کے عہدہ پر مقرر ہوں، وہ بہت جلد تجربہ حاصل کریں گے"

اس میں شبہ نہیں کہ نواب صاحب کے ماتحتوں کو کام بہت زیادہ کرنا پڑتا تھا، لیکن دو چیزیں ایسی تھیں کہ جن کی وجہ سے اُن کے ماتحت کام کی کثرت سے پریشان خاطر نہیں ہوتے تھے، ایک یہ کہ نواب صاحب خود بڑے کام کرنے والے تھے، اور عموماً اپنے ماتحتوں سے زیادہ کام کرتے تھے اس لئے اوروں کو شکایت کا موقع نہ تھا، دوسرے یہ کہ وہ اپنے ماتحتوں کے کام کی قدر کرتے اور اس کا صلہ دیتے تھے، یعنی اپنے بالادست افسروں پر اُن کی کارگزاریاں ظاہر کرتے اور تنخواہ اور عہدے کی ترقی کے لئے سفارش کرتے تھے، اور جن لوگوں پر اُن کی نظر کیمیا اثر پڑ جاتی تھی وہ کچھ سے کچھ ہو جاتے تھے۔ مثلاً احمد عبدالعزیز ایک معمولی محرر تھے، لیکن کارگزار اور محنتی تھے، غالباً نواب محسن الملک کی سفارش سے نواب صاحب تک پہنچے اور اپنی اطاعت و کارگزاری کی بدولت نواب صاحب کا اعتماد و حسنِ ظن حاصل کیا۔ آخر بڑے بڑے عہدوں پر ترقی کی۔ حیدرآباد کے متعلق ایک کثیر المقدار قانونی لٹریچر تیار کیا، برٹش گورنمنٹ اور دولتِ آصفیہ

سے خطابات حاصل کئے۔ چنانچہ جب ہم نے حیدر آباد میں اُن سے ملاقات کی تو وہ احمد عبد العزیز نہیں تھے، بلکہ شمس العلما، نواب عزیز جنگ بہادر تھے۔ اسی طرح اور متعدد عہدہ دار ہیں جنھوں نے ابتدا میں نواب صاحب کے دامن تربیت میں قابلیت و استعداد حاصل کی اور پھر بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز ہو کر بڑی بڑی خدمتیں انجام دیں اور جنگی و دولائی کے خطاب حاصل کئے۔

نواب صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے ماتحتوں کی دماغی تربیت اور اخلاقی اصلاح پر بھی توجہ کرتے تھے، اور خود اُن کے اخلاقی محاسن اور مذہبی زندگی کا اثر بھی ماتحتوں پر پڑتا تھا اور وہ اُن کے فیض صحبت سے متاثر ہوتے تھے، لیکن ہر شخص بقدر صلاحیت فائدہ اُٹھاتا تھا، مثلاً اُن کے ساتھ کام کرنے والوں میں نواب لطیف یار جنگ بہادر ناظم آبکاری بھی ہیں جو اپنی امانت و دیانت، محنت و مستعدی، احساس فرض و مذہبی زندگی کے لحاظ سے حیدر آباد میں ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں۔

نواب صاحب جو سرکاری خدمات میں جاں کاہ محنت کرتے تھے، اس کا سبب جیسا کہ انھوں نے ایک موقع پر خود بیان کیا ہے ایک مذہبی جذبہ تھا، یعنی ایک اسلامی سلطنت کی ترقی و بہبودی کا خیال، اسی جذبہ نے اُن میں ایک وفاداری کا جوش پیدا کر دیا تھا، اس جذبہ اور جوش سے اُن کے ماتحت بھی متاثر ہوتے تھے، چنانچہ اُن کے ساتھ کام کرنے والوں میں عام طور پر یہ جذبہ پایا جاتا ہے، درحقیقت سلطنت کی یہ ایک بڑی خدمت تھی جو اُنھوں نے انجام دی۔

عورتوں کی عزت شریعت میں عورتوں کے خاص حقوق ہیں، لیکن آج کل عام مسلمان اُن حقوق سے بے خبر ہیں، اس لئے عام طور پر شریف گھرانوں میں بھی، عورتوں کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جاتا جس کی وہ شریعت کے لحاظ سے مستحق ہیں، لیکن نواب صاحب کا طرز عمل، عام رواج سے مختلف تھا، وہ اپنے خاندان کی تمام عورتوں مثلاً ماں، بیوی، بیٹیوں سب کے ساتھ علیٰ قدرِ مراتب عزت و آبرو کا برتاؤ کرتے تھے، خصوصاً اپنی ماں کے

نہایت اطاعت گزار فرزند تھے اور تمام خانگی معاملات میں اُن کی خوشنودی اور رضا کو مقدم رکھا کرتے تھے۔

اُن کے دل میں عورتوں کی عزت کا جو معیار تھا اُس کا اندازہ ایک خط سے ہوگا جو انھوں نے اپنے ایک ماتحت عہدہ دار کو لکھا ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں:

"جناب اپنے محل کی نسبت ہمیشہ واحد کا صیغہ استعمال کرتے ہیں اور ضمیر واحد سے کام لیتے ہیں یہ کیوں؟ آپ ہی پر منحصر نہیں، میں نے بعض اور بڑے بڑے مہذب حضرات کو بھی اس غلطی میں مبتلا پایا ہے، بیوی اور شوہر کے تعلقات دو دوستوں کے سے ہیں، اور اسلام میں، جو بیوی کی قدر و منزلت ہے، وہ کسی طرح اس سلوک کی مستحق نہیں ہے لیکن خدا جانے یہ مکروہ رسم ہم لوگوں میں کیوں جاری ہو گئی ہے، مجھکو اُمید ہے کہ آیندہ آپ اس کا بہت ہی خیال رکھیں گے۔ میری نگاہ سے جب ایسی تحریر گزرتی ہے یا اس قسم کے ضمائر کے ساتھ کوئی آواز میرے کان میں پڑتی ہے تو بہت تکلیف ہوتی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ جمع کی ضمیر کام میں نہ لائی جائے۔

میری اس صاف صاف گزارش کو یقین ہے کہ مہربانی سے معاف کریں گے، بلکہ کسی اخبار میں اپنی طرف سے اس کے متعلق مضمون لکھ کر، اس مغالطہ کی اصلاح فرمائیں گے جو بسا اوقات عامۃ الورود ہے۔"

اعزا کے ساتھ حسن سلوک اور محبت

"صلہ رحم" اور عزیزوں کے ساتھ حسن سلوک ایک سچے مسلمان کا خاص وصف ہے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مسلمان کو اس کی تاکید فرمائی ہے۔ نواب صاحب فطرۃً ایک دردمند دل پہلو میں رکھتے تھے اور رحم و شفقت کا جذبہ اُن میں فطری طور پر موجود تھا، اس لئے وہ اپنے عزیزوں کو افلاس و ناداری کی مصیبت میں مبتلا دیکھکر بے چین ہو جاتے تھے اور جہاں تک اُن سے ہو سکتا تھا خود تکلیف اُٹھا کر اُن کی مدد کرتے تھے، یہی سبب ہے کہ وہ اپنے خانگی مصارف میں کفایت شعاری کا لحاظ رکھنے پر مجبور تھے اور قومی تحریکوں میں

اُن کے چندہ کی مقدار زیادہ نہیں ہوئی تھی اور اسی وجہ سے باوجود معقول تنخواہ کے وہ اپنے ہم عصروں کی طرح کافی روپیہ پس انداز نہ کرسکے۔

نواب صاحب کے ایک نہایت پرائیوٹ خط سے چند فقرے اس موقع پر نقل کئے جاتے ہیں۔ جن سے اُن کی حالت کا اندازہ ہوگا، لکھتے ہیں :

"میری مالی حالت حیدرآباد میں اس قسم کی تھی کہ روز کا کنواں کھودنا اور روز پانی پینا تنخواہ کے ملنے میں اگر اتفاق سے کبھی چند روز کی دیر ہو جاتی تھی، تو اس کی تکلیف محسوس ہونے لگتی تھی۔"

"جس وقت حیدرآباد سے روانہ ہونے کو تھا تو اس وقت اتنا روپیہ بھی نہ تھا کہ میں اور میرے اہل و عیال بلا مدد غیرے وطن پہنچ سکتے، عالی جناب نواب سر آسمان جاہ بہادر دام اقبالہم نے اس وقت میرے ساتھ گویا بہت بڑی نوازش فرمائی کہ میرے دو مکانوں کا سامان اصلی قیمت پر خرید لیا جس کی مقدار پندرہ ہزار روپیہ حالی کی تھی۔"

اس روپیہ کے مصارف بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

"اور وہ کل رقم اس طرح صرف ہوگئی اور ایک طویل مدت تک سرکار عالی کی معزز اور بیش قرار ماہوار کی خدمات انجام دینے کے بعد جب وطن میں آکر رہنے کا اتفاق ہوا تو معلوم ہوا کہ محض افلاس کی حالت ہے۔"

"میری یہ حالت کچھ میری فضول خرچیوں کی وجہ سے نہ تھی بلکہ بڑی وجہیں اس کی دو تھیں، ایک محمد احمد کی تعلیم وغیرہ کے متعلق معمولی و غیر معمولی مصارف انگلستان جن کی مقدار میری حیدرآبادی پوزیشن کے مناسب رہنی ضرور تھی اور دوسرے اپنے اکثر اہل خاندان اور اہل وطن کا افلاس جس سے اب اس زمانہ میں شاید بہت ہی کم کوئی شریف خاندان بچا ہوگا اور خصوصاً ان ممالک میں۔"

اس کے بعد وظیفہ یاب ہو کر آنے اور محمد احمد مرحوم کے اخراجات وغیرہ کا تذکرہ کر کے

لکھتے ہیں:

"دوسرا خرچ جو اپنے مفلس اور واجب الرحم اہل خاندان اور بعض اہل وطن کا اور جس میں میری تنخواہ کا ہمیشہ معتدبہ حصہ صرف ہوتا رہتا تھا اس کی فہرست میں جہاں تک ممکن تھا فدوی نے اس عرصہ میں تخفیف کی، لیکن تاہم اس کی تعداد ڈھائی سو روپیہ ماہوار کلدار یا تین سو حالی کے قریب ہوتی ہے۔ اور اس خرچ سے صرف اسی وقت سبکدوشی ہوسکتی ہے جب کہ میں اپنا دل بالکل پتھر کا بنا لوں، بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت، تاکہ بچوں اور بوڑھوں اور بیواؤں کو بے در، بے پر اور بھوکا، ننگا، بیمار اور مرتا ہوا دیکھوں اور کچھ پروا نہ کروں"

"میرے اسی وطن امروہہ میں ابھی چند سال قبل ایک نہایت لائق طبیب گزرے ہیں، حکیم نثار علی صاحب مرحوم، حکیم صاحب مرحوم صرف طبیب ہی نہ تھے بلکہ درحقیقت ایک بڑے دانا اور حکیم اور ایک بڑی منش کے شخص تھے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ:

"روپیہ بغیر مہرِ شقاوت کے جمع نہیں ہوسکتا"

پس اگر میں بھی اپنے روپیہ پر مہر شقاوت ثبت نہ کرسکا اور اس لئے مفلس رہا تو مجھکو کوئی افسوس اپنی اس مفلسی پر نہیں ہے"

مستقل اعانت کے علاوہ بعض عزیزوں کی ضرورت کے وقت یا کسی تقریب کے موقع پر مدد کیا کرتے تھے، یہ حالت تو عام اعزہ کے ساتھ تھی۔ خاص اہل خاندان کے ساتھ جو تعلق تھا، اُس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ بعض خاص رشتہ داروں کے پورے اخراجات اُن کے متعلق تھے چنانچہ تیسری شادی کے بعد اُن کو بیوی کی پہلی اولاد کے مصارف بھی برداشت کرنے پڑے یہ بیگم مطلقہ تھیں اور صاحب اولاد۔

اُن کے فرزند اکبر محمدؐ احمدؐ مرحوم کی بیوی ایک انگلش لیڈی تھیں اور اگرچہ یہ شادی

اُن کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی، تاہم جب یہ انگلش بہو ہندوستان آئیں تو اُنھوں نے بڑی مسرت سے خیر مقدم کیا اور ایسے لطف و مہربانی سے پیش آئے کہ گویا یہ بہو خاص اُن کے کنبہ د برادری کی ہے، محمد احمدؒ کی وفات کے بعد بھی اُنھوں نے دل جوئی میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی اور ایسی محبت و یگانگت کا برتاؤ کیا کہ یہ مطلق محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس خاندان میں کسی لحاظ سے بھی اجنبی ہیں، شوہر کے انتقال کے بعد مسز محمد احمدؒ نہایت افسردہ خاطر تھیں اور اب ہندوستان میں رہنا اُن کے لئے تکلیف دہ تھا اور وہ انگلستان جانا چاہتی ہیں لیکن مرحوم کی یادگار ایک چھوٹی بچّی موجود تھی، اس لئے وہ ہندوستان میں پابہ زنجیر تھیں، نہ رہتے بنتا تھا نہ جاتے، یہاں تک کہ لڑکی کا انتقال ہوگیا، اب مسز محمد احمدؒ کے لئے ہندوستان میں دل چسپی کا کوئی سامان نہ تھا، اس لئے وہ غمگین رہتی تھیں، اور اگرچہ نواب صاحب نے اُن سے صاف کہدیا تھا کہ وہ مدت العمر اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر رہ سکتی ہیں، لیکن وہ اس پر آمادہ نہ ہوسکیں آخر کار انگلستان روانہ ہوگئیں اور نواب صاحب اُن کو بمبئی جاکر پُہنچا آئے، گھر سے روانگی کے وقت نواب صاحب نے مسز محمد احمدؒ کو یہ عام اجازت دیدی تھی کہ وہ گھر کے اور محمد احمدؒ مرحوم کے سامان میں سے جو کچھ پسند کریں بے تکلف اپنے ساتھ لے جائیں، نواب صاحب نے صرف اسی حسن سلوک پر قناعت نہیں کی، بلکہ بہو کے مصارف کے لئے ایک ماہانہ رقم بھی مقرر کردی تھی جو برابر اُن کو انگلستان پُہنچتی رہتی تھی

مسز محمد احمدؒ سے نواب صاحب کا جو رشتہ تھا وہ گویا اپنے مرحوم فرزند اور پوتی کی وجہ سے تھا جو اَب باقی نہ رہا تھا، لیکن نواب صاحب جو قدیم شرفا کی وضع داری کا ایک نمونہ تھے اپنا یہ فرض خیال کرتے تھے کہ اپنے مرحوم فرزند کی بیوی کی بھی خواہی سے غافل نہ رہیں، چنانچہ مسز محمد احمدؒ کے انگلستان جانے کے کچھ مدت بعد اُنھوں نے ایک محبت آمیز خط لکھا اور اُن کو نکاح ثانی کی ترغیب دی اور یہ اطمینان دلایا کہ جدید خاندان سے بھی وہ محبت کے تعلقات قائم رکھیں گے اور اپنی رائے کو موثر بنانے کے لئے لکھا کہ:

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، کہ اگر ایسی حالت آپ کی یہاں کسی بہن کی یعنی میری لڑکیوں میں سے کسی کی ہوتی تو اُن کو بھی میں یہی مشورہ دیتا، اور کوشش کرتا کہ میرے مشورہ کے مطابق عمل کیا جائے"

آخر میں لکھتے ہیں:

"اور سب سے بڑی بات جو مجھکو اپنے مشورہ پر عمل ہوتا ہوا دیکھنے سے حاصل ہوگی، وہ یہ ہوگی کہ اپنے دم واپسیں کے وقت مجھکو آپ کی ناکامیوں کے رنج وخیال سے کوئی تکلیف نہ ہوگی اور میں اطمینان کے ساتھ اس دنیا سے کوچ کرسکوں گا"

ان حالات سے اندازہ ہوتا ہی کہ وہ کس طرح اپنے متعلقین وخاندان کی فلاح وبہبودی کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔

اہل وطن سے تعلقات نواب صاحب کا وطن امروہہ شرفا کی ایک نہایت قدیم بستی ہی، ہندو مسلمانوں کے بہت سے پرانے خاندان یہاں آباد ہیں (ابن بطوطہ نے بھی اپنے سفرنامہ میں اس قصبہ کا ذکر کیا ہی جو اُس زمانہ میں شہر تھا) شیعہ مسلمانوں کی بھی یہاں خاصی آبادی ہی، نواب صاحب بھی یہاں کے ایک معزز خاندان سے تھے، لیکن باایں ہمہ اُن کا خاندان دولت مند نہ تھا، نواب صاحب کو خدا تعالیٰ نے عروج دیا اور بڑے رتبہ پر پہنچایا، مگر اہل وطن کے ساتھ کبھی اُنھوں نے اپنا طرز عمل نہیں بدلا، عین اُس زمانہ میں جب کہ اُن کا آفتاب اقبال نصف النہار پر تھا اور حیدرآباد اُن کے کارناموں سے گونج رہا تھا جب وہ امروہہ آتے تھے، تو ہر ادنیٰ واعلیٰ کے گھر بے تکلف پیدل جاتے تھے اور تمام تقریبات میں شریک ہوتے تھے، قصبہ کے تمام فرقوں اور خاندانوں کے ساتھ اُن کے تعلقات دوستانہ بلکہ نیازمندانہ تھے، انھوں نے کبھی کسی ادنیٰ شخص کو بھی یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ اپنے بلند منصب ورتبہ کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسروں سے بلند وبرتر

سمجھتے ہیں، خود نمائی کا تو ذکر ہی کیا ہے، یہ اُن کی عالی ظرفی اور بلند حوصلگی تھی کہ باوجود اس جاہ و منصب کے اپنے اہل وطن سے جھک کر ملتے تھے اور اس وضعداری کو اُنھوں نے آخر تک نباہ دیا، سچ ہے ع

نہد شاخ پُر میوہ سر بر زمیں

بعض تنگ حوصلہ اور کم ظرف جب کسی بلند مرتبہ پر پہنچتے ہیں تو اُن کو شوق ہوتا ہے کہ اہل وطن کے سامنے اپنے جاہ و جلال کی نمائش کریں اور اگر ممکن ہو تو اُن پر حکومت کریں، لیکن نواب صاحب کی ذات ان باتوں سے بالاتر تھی، وہ اس قدر محتاط تھے کہ کسی ایسے اعزازی عہدہ کو بھی قبول کرنا نہیں چاہتے تھے جس سے اُن کو اہل وطن پر کوئی برتری حاصل ہو یا دوسروں سے کش مکش میں مبتلا ہونا پڑے۔

حیدرآباد سے واپس آکر جب اُنھوں نے وطن میں قیام کیا تو بعض اخبارات نے یہ تحریک کی کہ وہ امروہہ کے آنریری مجسٹریٹ مقرر کئے جائیں، لیکن نواب صاحب نے اس تحریک کو پسند نہیں کیا اور اس کے متعلق طویل مضمون شائع کیا جس میں بڑی خوبی سے بتایا ہے کہ لوگ ان اعزازی عہدوں کو زیادہ تر کن اغراض و مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں اور ان وسائل سے کس طرح اپنے ذاتی مقاصد میں حاصل کرتے ہیں یا بعض صورتوں میں کس طرح ملک و وطن کی خدمات انجام دیتے ہیں، نیز یہ کہ بعض ارباب نظر کیوں ان عہدوں سے پہلو تہی کرتے ہیں ہم اس مضمون کے جستہ جستہ حصے نقل کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

”ایک وکیل، ایک ساہوکار، ایک تاجر، ایک زمیندار و جاگیردار، ایک چھاپہ خانہ کا مالک، وغیرہ اس آنریری عہدہ کو اپنے پیشہ کی ترقی کا ایک غیر صریحی مگر مؤثر آلہ سمجھتا ہے اور اس لئے وہ اس کے حصول کی غرض سے اکثر اوقات جائز و ناجائز سعی و کوشش بھی عمل میں لانے سے مضائقہ نہیں کرتا،

دوسرا گروہ ان عہدوں کو اس دلیل سے جائز قرار دیتا ہے کہ یہ بھی اپنے وطن

کی ایک خدمت ہے اور ایک دیسی آنریری عہدہ دار جو اپنے شہر کے حالات اور لوگوں کی طبائع سے واقف ہے، بہت سے مواقع پر سرکاری ملازموں کی بہ نسبت اپنے شہر کے معاملات کو بہت زیادہ حسن وخوبی سے فیصل کر سکتا ہے، اس گروہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اِن عہدوں کو اپنے قومی گروہ کی عزت قائم رکھنے کے لئے حاصل کرنا چاہتے ہیں، کبھی ایک مسلمان اس لئے کوشش کرتا ہے کہ ہندوؤں کے مقابلہ میں اپنے گروہ کی عزت قائم رکھنے کے واسطے ایسے عہدوں کے متمنی ہوتے ہیں۔"

اس کے بعد اعزازی عہدوں کے لئے خود مسلمانوں کے باہمی تصادم کا تذکرہ کرتے لکھتے ہیں:

"تیسرا گروہ ان لوگوں سے علیٰحدہ رائے رکھتا ہے، اس کی یہ رائے ہے کہ حکومت اور خصوصاً ایک ایسی حکومت میں جس میں کسی کو سزا دینے کی ضرورت ہو سرکاری ملازمت کو بھی وہ صرف اُسی وقت تک جائز رکھتا ہے۔ جب تک کہ اُس کی مالی حالت اور ذاتی ضرورت اُس کو اس پر مجبور نہ کرے، اس گروہ والے کہتے ہیں کہ جس قدر اشخاص ان آنریری عہدہ داروں کے سامنے آتے ہیں، اُس میں سب چور اور بدمعاش اور بُری خصلت ہی کے لوگ نہیں ہوتے بلکہ اکثر شہر کے غریب اور شریف آدمی بھی ہوتے ہیں جو اتفاقاً کسی وجہ سے کسی مصیبت میں پھنس جاتے ہیں۔ لیکن سیاستِ سلطنت مجوزین کو اس امر پر مجبور کرتی ہے کہ ان کو سزا دی جائے پس اگر خدا کسی کو یہ توفیق دے کہ وہ اپنی عمر اپنے وطن، اور اہل وطن کی خدمات میں صرف کرنا چاہے تو بغیر اس کے بھی وہ اپنے اہل وطن کو جو کل اس کے جنازہ کے ساتھ ہونے چاہئیں، اپنے آخری سانس چلنے تک جیل میں بھیجا کرے اور اُن پر جرمانہ کیا کرے اور ربیدلگایا کرے، دوسری اور کوئی معقول خدمت

بھی وہ ان کے فائدہ کی غرض سے اختیار کر سکتا ہے"۔

اس کے بعد اُنھوں نے ہر گروہ کے حالات پر بحث کی، اور اپنے کو تیسرے گروہ میں داخل کرکے، آنریری مجسٹریٹی کی بحث کو اپنے لئے دور از کار بتایا ہے۔

نواب صاحب کے احباب اور دوستانہ تعلقات

نواب صاحب کے احباب اور اُن کے دوستانہ تعلقات کی خصوصیات کے متعلق کچھ لکھنا مشکل ہے، اُن کی ابتدائی زندگی انگریزی گورنمنٹ کی ملازمت میں گزری، اُس زمانہ میں اُن کے جو احباب ہوں گے وہ اب موجود نہیں، لیکن اتنا معلوم ہے کہ اس زمانہ میں جن لوگوں سے اُن کے دوستانہ مراسم تھے، وہ آخر عمر تک اُن کی اولاد کے ساتھ بزرگانہ شفقت و محبت کے ساتھ پیش آتے اور حتی الامکان اُن کی فلاح اور بہبودی کے لئے کوشش کرتے تھے،

انگریزی ملازمت سے دستکش ہوکر وہ حیدر آباد پہنچے اور درجہ بدرجہ مختلف عہدوں پر ترقی کی، اپنے منصب اور عہدے کی وجہ سے سیکڑوں اشخاص سے اُن کے تعلقات قائم ہوگئے، لیکن یہ تعلقات سرکاری حیثیت رکھتے تھے نہ کہ دوستانہ، جن لوگوں سے اُن کے تعلقات تھے وہ یا تو اُن کے افسر تھے یا ماتحت، یا ہم عصر عہدہ دار، اور اپنے فرائض منصبی کے لحاظ سے ان سب سے تعلقات رکھنا ضروری تھا، اپنے افسروں سے وہ باادب پیش آتے تھے، ہم عصر عہدہ داروں سے اُن کے تعلقات خوشگوار تھے، ماتحتوں کے ساتھ جو طرز عمل تھا، اس کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔

حیدر آباد میں غالباً صرف نواب محسن الملک ایک ایسے شخص تھے جن سے پہلے سے اُن کے دوستانہ تعلقات تھے، نواب مہدی حسن اور شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی سے بھی وہ واقف تھے، شمالی ہند کے ان دو چار عہدہ داروں سے اُن کی واقفیت و ملاقات سر سید کے سلسلہ سے تھی، حیدر آباد کے زمانہ قیام میں بعض عہدہ داروں اور ماتحتوں سے

اُن کے ذاتی تعلقات بھی قائم ہو گئے تھے۔

حیدر آباد سے قطع نظر ہندوستان میں اُن کے تعلقات سب سے زیادہ سر سید سے تھے لیکن درحقیقت یہ مربیانہ و نیازمند تعلق تھا۔ وہ ہمیشہ خطوط میں سر سید کو قبلہ و کعبہ لکھا کرتے تھے اور سر سید ان کو عزیزی لکھتے تھے، البتہ ۱۸۸۹ء میں جب خفا ہو گئے تو چند روز کے لئے عزیزی لکھنا چھوڑ دیا تھا، سر سید کے علاوہ مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب سے بھی اُن کے زیادہ تعلقات تھے جو آخر تک قائم رہے، حاجی محمد اسمٰعیل خاں، مولانا خواجہ الطاف حسین حالیؔ خلیفہ محمد حسین وزیر پٹیالہ اور علامہ شبلی نعمانی سے بھی اُن کے اچھے خاصے تعلقات تھے، زمانہ آخر میں نواب محمد مزمل اللہ خاں صاحب، مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب، حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب اور سر سید علی امام وغیرہ سے اُن کے تعلقات زیادہ بڑھ گئے تھے، ان اصحاب کے علاوہ قومی خدمات کے سلسلہ میں ہندوستان کے سیکڑوں سر برآوردہ اصحاب اور قومی کام کرنے والوں سے اُن کے تعلقات تھے، لیکن با ایں ہمہ یہ اندازہ کرنا مشکل ہی کہ کس شخص سے کس درجہ کے دوستانہ تعلقات تھے، کیونکہ اُن کا عام اخلاق اور لطف و مدارات کا برتاؤ سب کے ساتھ یکساں تھا، وہ جس انبساط و مسرت کے ساتھ ایک اجنبی کی مہمان نوازی کرتے تھے۔ اسی طرح ایک دوست کی، اور جس طرح وہ روز مرّہ ملنے والوں کے ساتھ اخلاص و محبت سے پیش آتے تھے اسی طرح کبھی کبھی ملنے والوں سے زبان و قلم سے خلوص و محبت کا اظہار اُن کو نہیں آتا تھا اُن کا طریقہ آج کل کے اکثر بڑے لوگوں اور لیڈروں جیسا نہ تھا کہ ظاہر میں بڑی گرم جوشی سے ملتے ہیں اور جوش و خروش سے ہاتھ ملاتے ہیں لیکن درپردہ ایک دوسرے کی تخریب کے درپے اور اثر زائل کرنے کی فکر میں رہتے ہیں،

اُن کی ملاقات و معاملات میں ایک قسم کی پختگی اور وفاداری تھی، جس سے ایک دفعہ تعلقات ہو گئے بس ہمیشہ کے لئے ہو گئے، یہ نہیں تھا کہ جب تک غرض متعلق ہی اُس وقت تک

ملاقات ہے، اور جب کچھ مطلب نہیں رہا تو پھر صورت آشنا بھی نہیں، دوستوں اور ملنے والوں سے اُن کی خط و کتابت وسیع پیمانہ پر تھی لیکن خطوط سے یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ کس سے اُن کے تعلقات زیادہ تھے، کیونکہ عام طور پر وہ خطوط کی ابتدا "مخدومی و مکرمی" سے کیا کرتے اور عموماً سب کے لئے تعظیمی و تکریمی الفاظ استعمال کرتے تھے، البتہ اُن عزیزوں کو جو رشتے میں چھوٹے ہیں "عزیزی" یا "عزیز القدر" لکھا کرتے تھے۔

دوستانہ تعلقات میں اُن کی پختگی کی یہ کیفیت تھی کہ وہ کبھی اپنے دوستوں سے بدگمان نہیں ہوتے تھے، حیدر آباد میں نواب فتح نواز جنگ کے خلاف بڑا طوفان برپا ہوا اور ایک زمانہ اُن کا مخالف ہوگیا مگر نواب صاحب نے آخر تک ساتھ نہ چھوڑا، اسی طرح ایک موقع پر نواب محسن الملک کے زمانہ میں مولوی محمد سمیع اللہ خاں پر ایک واقعہ کی بنا پر کالج کی بدخواہی کا الزام لگایا گیا اور متعدد ذمہ دار اصحاب نے اس الزام کو صحیح تسلیم کرلیا۔ لیکن نواب صاحب مطلق بدگمان نہ ہوئے، نہ اُن سے تعلقات ترک کئے۔

نواب صاحب کے دوستوں میں مختلف وجوہ سے نواب محسن الملک کو خاص امتیاز حاصل ہے، ان دونوں بزرگوں کے باہمی تعلقات اور سوانح حیات کچھ ایسے واقع ہوئے ہیں کہ جب ایک کا خیال آتا ہے تو بے اختیار دوسرے کی طرف بھی ذہن منتقل ہو جاتا ہے، دونوں کی زندگی میں باہم بہت کچھ مناسبت ہے، دونوں کی زندگی دس دس روپیہ ماہوار کی سرکاری ملازمت سے شروع ہوتی ہے، دونوں اپنی قابلیت اور حسن کارگزاری کی بدولت ترقی کرتے ہیں؛ دونوں کو یکے بعد دیگرے سرسید کی دوستی کی عزت حاصل ہوتی ہے اور پھر دونوں سرسید کی سفارش سے حیدر آباد پہنچتے ہیں اور وہاں بڑی ترقی اور شہرت حاصل کرتے ہیں، ایک تو سر سالار جنگ ثانی کے دربار میں رسوخ و شہرت حاصل کرتا ہے، اور دوسرے کا آفتاب اقبال سر آسمان جاہ کے عہد میں نصف النہار پہ پہنچ جاتا ہے، اس کے بعد دونوں سرسید کی زندگی ہی میں معتوب ہو کر حیدر آباد سے ہندوستان واپس آتے ہیں اور اُن کی وفات کے بعد یکے بعد

دیگرے اُن کے جانشین ہوتے ہیں، یعنی کالج کے آنریری سکرٹری اور مسلمانوں کے پولیٹیکل لیڈر بنتے ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ باوجود اس مشابہت کے دونوں کے عادات و اطوار اور طریق کار میں بڑا اختلاف تھا، چنانچہ حیدرآباد میں سرکاری معاملات میں اکثر اختلاف رائے رہتا تھا جو بعض اوقات بہت بڑھ جاتا تھا، وہاں سے واپس آنے کے بعد یہاں بھی قومی معاملات کے سلسلہ میں بارہا سخت اختلاف ہوا جو مرتے دم تک جاری رہا، لیکن بااین ہمہ ایک کو بغیر دوسرے کے چین بھی نہیں تھا۔ لڑتے تھے، مگر شریفانہ طور پر، کبھی کبھی یہ جنگ پبلک طور پر اخبارات میں چھڑ جاتی تھی، مگر بااین ہمہ دونوں باہم دوست تھے اور آخر تک دوست رہے اور نواب محسن الملک کو جو بدگمانیاں پیدا ہوگئی تھیں وہ رفع ہوگئیں، چنانچہ ایک دفعہ جب انگلستان میں زیادہ علیل ہوگئے تو اُن کو لکھا:

"اتنا یقین ہے کہ کوئی حقیقی بھائی بھی میرے ساتھ ایسا سلوک نہ کرے گا جیسا کہ تم کروگے، رائے کی غلطی کچھ ہی ہو اور سرکاری کام میں کچھ ہی جھگڑا ہو جائے مگر اس میں شبہ نہیں ہے کہ آپ اشراف ہیں اور مجھ سے دلی محبت رکھتے ہیں۔ اور حیدرآباد کی دنیا میں کوئی دوست تم سے بڑھ کر میرا نہیں ہے، اس لئے میرے خاندان کی حفاظت کرنا اور اپنی محبت اور سرکار کے حوصلہ کے موافق اُن سے پیش آنا، آپ میرے وصی ہیں اور آپ میرے بھائی ہیں۔ میں اپنی بی بی، اپنے بھائی اور اپنے تمام خاندان کو تمھارے سپرد کرتا ہوں۔"

اسی طرح متعدد خطوط میں نواب صاحب کی دوستی کا اعتراف کیا ہے چنانچہ ایک اور خط میں لکھتے ہیں:-

"مولوی صاحب سچ جانو تم پر پورا بھروسہ ہے تم سے زیادہ کسی کو میں حیدرآباد میں اپنا دوست نہیں سمجھتا، تم نے شروع سے اب تک جو کچھ محبت اور دوستی میرے ساتھ کی ہے۔ اُس کا میں شکرگزار ہوں، خدا کے سامنے اس کی تعریف کروں گا اور جو کچھ سرکاری کام میں کبھی اختلاف ہوا وہ رحمت تھا۔"

حیدرآباد سے واپسی کے بعد بھی نواب محسن الملک تمام اہم قومی معاملات میں اُن سے مشورہ لیتے تھے

طلبہ کے ساتھ نواب صاحب کا طرزِ عمل

نواب صاحب کی ہمیشہ سے یہ خصوصیت تھی کہ وہ طلبہ کو نہایت عزیز رکھتے تھے، اور اُن کی فلاح وبہبودی اور اخلاقی اصلاح کے لیئے ہمیشہ مستعد رہتے تھے، طلبہ کے ساتھ اُن کی مہربانی محض ظاہری طرزِ عمل تک محدود نہ تھی، بلکہ وہ دل سے طلبہ کی عزت کرتے تھے اور نہایت فراخ دلی سے غیر مستطیع طلبہ کی مالی اعانت بھی کیا کرتے تھے، یہ اعانت عموماً خفیہ ہوتی تھی، اور وہ کبھی کسی کے سامنے اس کا ذکر نہیں کرتے تھے، ہم کو بذاتِ خود ایسے متعدد تعلیم یافتہ اصحاب سے واقفیت ہے جنھوں نے نواب صاحب کے وظیفہ سے تعلیم حاصل کی اور معزز عہدوں پر پہنچے زمانہ قیام حیدرآباد میں وہ متعدد طلبہ کو سرسید کی تحریک سے وظیفہ دیتے تھے، اور اُن مستقل وظائف کے علاوہ بطور خود بھی براہ راست طلبہ کی مدد کرتے تھے۔

نواب صاحب کا زمانہ سکرٹری شپ اس لحاظ سے بھی یادگار رہے گا کہ اُنھوں نے وظائف کی مد میں بے دریغ روپیہ خرچ کیا، اور انجمن الفرض سے اصرار کرکے دلایا، وظائف کا اہتمام بجائے پرنسپل کے اُنھوں نے خود اپنے ہاتھ میں رکھا، جو صیغۂ راز میں تھا، وہ حتی الامکان یہ کوشش کرتے تھے کہ کسی کو یہ معلوم نہو کہ کون کون طالب علم وظیفہ خوار ہیں۔

۱۹۰۸ء میں جب اُن کو گورنمنٹ سے نواب کا خطاب ملا، تو حسب دستور ہندوستان کے ہر گوشہ سے مبارکباد کے تار پہونچے، نواب صاحب نے شکریہ کے طور پر جو خطوط لکھے اُن کا مضمون یہ تھا کہ :۔

> "میں اپنا شکریہ بذریعہ تار ادا کرنا چاہتا تھا، لیکن جب میں نے خیال کیا کہ یہ روپیہ جو اس طرح صرف ہوگا، بہتر ہے کہ قوم کے شریف اور ہونہار مفلس طلبہ کی امداد خاص میں صرف ہو جس کی اس وقت کالج میں بے حد ضرورت ہے، تو میں نے اس ارادہ کو ملتوی کردیا، اور حساب سے جس قدر رقم تاروں پر صرف ہوتی وہ میں نے نادار طلبہ کی امداد خاص میں جمع کردی۔"

نواب صاحب کی یہ محبت طلبہ کے ساتھ اس بنا پر تھی کہ قوم کی آئندہ ترقی کا دار و مدار طلبہ ہی

ہی کی ذات پر ہی، اُن کا خیال تھا کہ

"کوئی قوم صرف اپنے دولتمندوں کی اولاد کو تعلیم دینے کے ذریعہ سے ترقی نہیں کر سکتی، یہی ہونہار نوجوان جن کے ماں باپ اُن کی تعلیم کے مصارف برداشت نہیں کر سکتے، قومی جسم میں ریڑھ کی ہڈی سمجھنے جانے کے قابل ہیں، یہی ہونہار اور شریف نوجوان جو اس وقت افلاس کی مصیبت میں مبتلا ہیں، اگر اعلیٰ تعلیم پاکر اپنے پیروں پر کھڑے ہو جانے کے قابل ہو جائیں تو انہی سے قوم کی ترقی ہو سکتی ہے"

غرض نواب صاحب جس طرح طلبہ کی مالی اعانت اور اُن کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، اس کے متعدد واقعات ہم کو معلوم ہیں لیکن قلت گنجایش تفصیل سے مانع ہی۔

نواب صاحب طلبہ کی خاص طور پر عزت کرتے تھے اور چھوٹے چھوٹے اسکول کے بچوں کو بھی ہمیشہ لفظ "آپ" سے مخاطب کرتے تھے، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب اُس زمانہ کا تذکرہ لکھتے ہوئے جب کہ وہ اسکول میں پڑھتے تھے فرماتے ہیں کہ

"گو ہم بہت چھوٹے چھوٹے تھے، لیکن ہم کو اور خود اپنے بیٹے کو نواب صاحب مرحوم ہمیشہ "آپ" اور "جناب" کہہ کر خطاب کیا کرتے تھے، اور اُس زمانہ میں غریب طلبہ کے ساتھ جو ہمدردی نواب صاحب فرمایا کرتے تھے وہ بھی مجھ کو خوب معلوم ہی"

مسٹر کارنا کے تقرر کی مخالفت نواب صاحب نے زیادہ تر اسی وجہ سے کی تھی کہ وہ طلبہ کی عزت نہیں کرتے تھے، ایک دفعہ نواب محسن الملک کی ایک لغزش پر اُنھوں نے صاف لکھ دیا تھا کہ:-

"پہلے آپ خود اپنے بچوں کی عزت کیجیے اس کے بعد دوسروں سے اُمید کیجیے کہ وہ بھی اُن کی عزت کرینگے"

وہ چاہتے تھے کہ طلبہ میں عزت نفس اور خودداری کا احساس پیدا ہو اور ظاہری طور پر بھی وہ

ایسے شکستہ حال نہ نظر آئیں کہ اپنا وقار قایم نہ رکھ سکیں ایک دفعہ کسی شخص نے طنزاً اُن کے سامنے کہا کہ بعض ایسے طلبہ بھی وظیفہ مانگنے آتے ہیں جو سوٹ اور بوٹ سے آراستہ ہوتے ہیں اُن کو مدد نہ دیجائے، نواب صاحب کو یہ گفتگو ناگوار گزری، فرمایا

"کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ ایسے طالب علم ہمارے سامنے ننگے سر یا چیتھڑے لگائے ہوئے آکر مدد مانگیں"

نواب صاحب کا دروازہ طلبہ کے لیے ہر وقت کھلا رہتا تھا، کسی وقت روک ٹوک نہ تھی، وہ خواہ کیسے ہی ضروری کام میں مصروف ہوں، اور کیسے ہی ذی رتبہ شخص ملاقات کر رہے ہوں اگر کوئی طالبعلم آجاتا تھا تو وہ فوراً اُس سے ملاقات کرتے تھے، اور بڑے اطمینان اور خوش دلی سے اُس کے آنے کی غرض سُنکر اُس کا انتظام کر دیتے تھے، وہ طلبہ سے عموماً تخلیہ میں ملاقات کرتے تھے تاکہ طلبہ آزادی و بے تکلفی سے اپنی ضرورتیں بیان کر سکیں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ طلبہ رات کو بیوقت آتے، اطلاع پاکر نواب صاحب بستر استراحت سے اُٹھ کر فوراً باہر آجاتے اور نہایت خندہ جبینی کے ساتھ ملاقات کرتے تھے، حالانکہ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ جس غرض سے یہ طلبہ آتے تھے وہ ایسا نہوتا تھا کہ صبح تک ملتوی نہو سکے لیکن با این ہمہ، نواب صاحب کو طلبہ کی یہ بے وقت آمد ذرا بھی ناگوار نہ گزرتی تھی۔

جب وہ صبح سے دوپہر تک کام سے تھک کر زنانہ مکان میں کھانا کھانے یا کچھ دیر آرام کرنے کے لیے جانا چاہتے تھے تو برآمدہ میں آکر چاروں طرف خوب غور سے دیکھ لیا کرتے تھے کہ کوئی طالب علم تو نہیں آرہا ہے، اگر کسی کو آتا دیکھتے تو فوراً رُک جاتے تھے، اور پھر اس طرح اطمینان و سکون سے اُس آنے والے سے گفتگو کرتے تھے کہ گویا ابھی کام کے لیے برآمد ہوئے ہیں۔

لیکن باوجود اس محبت و شفقت کے جو نواب صاحب کو طلبہ کے ساتھ تھی، وہ ڈسپلن کا قائم رکھنا نہایت ضروری سمجھتے تھے، اور یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ طلبہ اپنی حدود اور منصب سے

تجاوز کریں، ۱۹۰۷ء میں اسٹرائک کی تحقیقات کرنے والے کمیشن کے ایک ممبر کی حیثیت سے اُنھوں نے جو نوٹ لکھا تھا، اُس میں کہتے ہیں:

"مجھ کو یہ بھی بیان کر دینا ضرور ہے کہ بہت عرصہ ہم سنتے چلے آتے ہیں کہ فلاں معاملہ پر اس لیئے زور دینا مناسب نہیں ہے کہ کہیں یورپین اسٹاف بددل ہو کر کالج نہ چھوڑ دے اور اب طلبہ کی اس حال کی شورش سے ہمارے لیے ایک تازہ دھمکی یہ پیدا ہوئی ہے کہ کہیں طلبہ اسٹرائک نہ کر دیں، اس قسم کے حالات کے لحاظ سے میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم کو اپنا انتظام کافی احتیاط اور غور کے ساتھ منصفانہ اور صحیح اصولوں پر قائم کرنا چاہیے اور ہر ایک نقصان کو برداشت کرنے کے واسطے جو ڈسپلن قائم رکھنے کی غرض سے عائد ہو ہم کو تیار رہنا چاہیے، عام ازیں کہ طلبہ کی طرف سے ایسی کوئی دھمکی ہو، یا اسٹاف کی طرف سے میں انتظام کو ضعیف اور کمزور دیکھنے کی بہ نسبت کالج اور بورڈنگ ہاؤس کے کمروں کا خالی دیکھنا مناسب سمجھتا ہوں۔"

اسی کمیشن میں مسٹر گارڈنر براؤن پروفیسر کی نسبت بعض الزامات لگائے گئے تھے، اور پھر انہی معاملات کے سلسلہ میں (جن کی تفصیل اس موقع پر ضروری نہیں) ٹرسٹیوں نے جنوری ۱۹۰۷ء میں اُن کو کالج کی خدمات سے سبکدوش کرنے کا فیصلہ کیا، اس خبر کے شائع ہونے پر طلبہ نے مسٹر آرچبولڈ پرنسپل کالج کے توسط سے نواب صاحب کی خدمت میں ایک درخواست بھیجی جس میں مسٹر براؤن کو علیحدہ نہ کرنے کی التجا کی تھی اور اس حکم کو مبنی بر ناانصافی قرار دیا تھا۔

نواب صاحب نے جواب میں طلبہ کے اس شریفانہ طرز عمل پر تو اظہار مسرت کیا کہ وہ اپنے اساتذہ کا اس قدر احترام کرتے ہیں اُس کے بعد اُن کے موجودہ رویہ پر تنبیہ کرتے ہوئے لکھا:

"طلبہ کو اپنے دلوں میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ کالج کے ٹرسٹیوں کی جماعت اخیر جماعت ہوگی، اگر وہ استادوں کے عزل و نصب کے مسئلہ کو طلبہ کی خوشی یا ناخوشی کے حوالہ کر دیگی، ٹرسٹیوں نے جو فیصلہ اس وقت مسٹر گارڈنر براؤن کی نسبت

کیا ہے، وہ کالج کے بہترین مقاصد اور فوائد کے لحاظ سے کیا گیا ہے، طلبہ کو اس
میں کسی دخل در معقولات کی تکلیف برداشت کرنی ضرور نہیں تھی اور نہ اُن کو اپنے
حدود سے باہر نکل کر ٹرسٹیوں کے معاملات میں دخل دینے کی ضرورت تھی، طلبہ کی
درخواست کا یہ خاص فقرہ کہ "ہم کو سچا یقین ہے کہ اس کالج سے مسٹر براؤن کا علحدہ
کرنا اس وقت جبکہ وہ بہت نقصانات پیشتر اُٹھا چکے ہیں ان کے ساتھ ایک ناانصافی
کا فعل ہوگا" نہایت قابل اعتراض ہے اس فقرہ کو لکھ کر طلبہ اپنے منصب اور دائرہ
سے متجاوز ہو گئے ہیں۔ بہرکیف امید ہے کہ آیندہ ہمارے کالج کے طلبہ اپنے حدود
کا بہت زیادہ لحاظ رکھیں گے اور ان سے تجاوز نہ کریں گے"۔

نواب صاحب اولڈ بوائز (طلبائے قدیم) سے بھی یہی توقع رکھتے تھے کہ وہ کالج کے اساتذہ
اور اپنے بزرگوں کا احترام ملحوظ رکھیں۔ کمیشن تحقیقات کے سامنے بعض طلبائے قدیم نے بھی
شہادت دی تھی اُس کے متعلق نواب صاحب اپنے اختلافی نوٹ میں حسب ذیل ریمارک کرتے ہیں:

"دو گواہوں کے طرز بیان کی نسبت جن سے میری مراد مسٹر محمد علی صاحب
اور سید مصطفیٰ حسین صاحب رضوی ہیں، میں اس قدر تسلیم کرونگا کہ بعض مقامات
پر اُن کے بیان میں وہ مودبانہ اخلاق ملحوظ نہیں رہا، جو نہ صرف طلبائے وقت
کو اپنے کالج کے اسٹاف کے ساتھ ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے، اور جو مسلمان کا ایک قومی
شیوہ ہے بلکہ پُرانے طلبہ کو بھی، اور گو شہادت سے ثابت ہو چکا ہے کہ ان دونوں
کی نسبت بھی کالج کی طرف سے خلاف اخلاق برتاؤ ہوا جس نے اُن کی طبائع
میں قطرتاً جوش پیدا کر دیا، لیکن با ایں ہمہ اُن کو اپنا جوش ضبط کرنا چاہیے تھا جس سے
اُن کی قدر و منزلت دلوں میں اور بھی زیادہ ہو جاتی۔"

اسی طرح کے اور متعدد واقعات ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مذہبی و انتظامی معاملات
میں طلبہ کی بے پروائی و بے قاعدگی گوارا نہیں کرتے تھے۔

سب سے زیادہ نواب صاحب کا تعلق طلبہ سے اُس زمانہ میں رہا جبکہ وہ حیدرآباد سے پہلی دفعہ آکر قریباً تین سال تک بورڈنگ کے نگراں رہے۔ یہ زمانہ ہر حیثیت سے کالج کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ اُنھوں نے جس قابلیت، محنت اور دیانت سے نگرانی کے پرخطر فرائض انجام دیئے سرسید اور دوسرے سربرآوردہ ٹرسٹیوں نے اس کا باربار شکرگذاری کے ساتھ اعتراف کیا، اور خود پبلک کو بھی اُن کی نگرانی کی وجہ سے کالج کی مذہبی واخلاقی حالت پر پورا اطمینان تھا، لیکن جیسا کہ ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے طلبہ اس نگرانی سے خوش نہ تھے، سنگ آمد و سخت آمد کا معاملہ تھا، طالبعلمی و آزادی کا زمانہ، نوجوانی کی عمر اور شرارت اور کھیل کود کے دن، اور اس پر مولوی مشتاق حسین صاحب کی یہ خواہش کہ طلبہ ہمیشہ مہذب، متین، و ثقہ بنے رہیں، یہ کیونکر ممکن تھا۔ لڑکے شرارت کرتے تھے اور نواب صاحب سزا دیتے تھے، اور طرح طرح کے دلچسپ واقعات پیش آتے تھے، لیکن اس پر بھی کسی کو اُن سے نفرت یا عداوت نہ تھی، دل سے سب اُن کی عزت کرتے تھے، شرارتیں جو کچھ تھیں وہ مقتضائے عمر کے لحاظ سے تھیں۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب، مولوی سید طفیل احمد صاحب، میر ولایت حسین صاحب بی اے اور دوسرے لوگ جو اُس زمانہ میں طالبعلم تھے اس عہد کے دلچسپ واقعات آج تک لطف کے ساتھ بیان کرتے ہیں، اور بہت سے واقعات قدیم روایات کے طور پر اب تک محفوظ چلے آتے ہیں، لیکن قلت گنجائش کے خیال سے صرف چند واقعات کا تذکرہ کرتے ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ مولوی مشتاق حسین صاحب کا ایک طریقہ اس زمانہ میں یہ بھی تھا کہ چاندنی راتوں میں وہ ہمیشہ ٹوپی سے لیکر جوتے تک سفید پوش ہوتے تھے، اور اندھیری راتوں میں اُن کا پورا لباس سیاہ ہوتا تھا تاکہ رات کے وقت طلبہ کو اُن کی اچانک آمد کی خبر نہ ہو اور وہ ان کو موقع پر گرفتار کرلیں۔ اکثر اوقات بارش کی تیرہ و تار راتوں میں جبکہ لڑکے اُن کی آمد سے بے خوف ہوکر تاش کھیلنے یا کسی اور شرارت میں مصروف ہوتے تھے، مولوی مشتاق حسین دفعتاً اس تاریکی میں نمایاں ہوتے اور اُن کی "السلام علیکم" کی آواز طلبہ کو وحشت زدہ کردیتی تھی۔

اُنہوں نے لڑکوں کو تاش کھیلنے کی ممانعت کردی تھی۔ ایک دفعہ رات کو ایک کمرہ میں چند لڑکے بیٹھے ہوئے خفیہ طور پر تاش کھیل رہے تھے کھیلتے کھیلتے کسی کی زبان سے بے ساختہ نکلا "کہیں پھر گُھٹّا مُلّا (مشتاق حسین) نہ آجائے"۔ دفعتاً دروازہ کُھلا دیکھا تو مولوی مشتاق حسین پوری متانت و سنجیدگی سے یہ کہتے ہوئے کہ

"السلام علیکم! بندہ حاضر ہے"

سامنے آگئے، سب کے چہرے فق ہوگئے مگر اُنہوں نے کسی سے ایک لفظ نہیں کہا اور سب کے ہاتھوں سے تاش لیکر چلے گئے۔

ایک اولڈ بوائے کا بیان ہے کہ مولوی مشتاق حسین صاحب نرم و ملائم جوتا پہن کر رات کو بورڈنگ میں گشت لگایا کرتے تھے تاکہ کسی کو پاؤں کی آہٹ سے اُن کے آنے کی خبر ہو، اور عین موقع پر اچانک پہنچکر لڑکوں کو تاش یا شطرنج کھیلتے ہوئے پکڑ لیتے تھے، ایک بار اُن کو اطلاع ملی کہ طلبہ شطرنج کھیل رہے ہیں، فوراً پہنچے مگر وہاں کچھ نہ تھا، سب کے صندوق کُھلوا کر کپڑے نکلوا ڈالے مگر کچھ نہ ملا، کیوں کہ لڑکوں نے شطرنج کو گریل میں راکھ کے نیچے داب دیا تھا۔

چونکہ وہ بہت زیادہ لڑکوں کی تاک جھانک کرتے تھے اس لیے لڑکوں کو بھی ضد پیدا ہوگئی تھی اور وہ جان بوجھ کر شرارت کرتے تھے، مثلاً چند لڑکے جمع ہو کر بیٹھ جاتے ایک گاتا، دوسرا ناک سے ستار بجاتا، تیسرا مُنہ سے ڈھولک بجاتا، خوب شور ہوتا، مولوی صاحب کو خبر ہوتی تو فوراً موقع پر پہنچتے، تلاشی لیتے مگر وہاں کچھ نہ ملتا۔

سر سید کے ایک نواسہ سید محمد نصیر تھے وہ بیباک تھے، ایک دفعہ پختہ بارگ کی غربی ونگ لائن میں جس میں کمرے کی درمیانی دیواروں میں دروازے لگے ہوئے تھے، لڑکے ٹھیٹر کر رہے تھے، محمد نصیر راجہ اندر بنے بیٹھے تھے، مولوی صاحب کو خبر پہنچی، فوراً آئے دروازہ کھٹکھٹایا،

سب لڑکے اندر ہی اندر اپنے اپنے کمروں میں بھاگ گئے صرف اُس کمرے میں رہنے والا لڑکا اور محمد نصیر رہ گئے، اُس لڑکے نے مجبور ہو کر دروازہ کھولدیا، مولوی صاحب اندر داخل ہوئے، محمد نصیر کو دیکھا کہ وہ عمدہ لباس پہنے ہوئے کرسی پر بیٹھے ہیں، جب وہ اُٹھے نہیں، تو پوچھا، کون؟ محمد نصیر نے جواب دیا:

راجہ ہوں میں قوم کا اندر میرا نام!

خام بارگ میں مولوی صاحب نے ہر کواڑ میں ایک ایک بڑا سوراخ اگلے اور پچھلے دروازہ میں بنوا دیا تھا، رات کو بروقت ضرورت وہ ان سوراخوں سے جھانکتے تھے، اور دروازوں میں بلیاں اس طرح لگوائی تھیں کہ باہر سے ایک کُنجی کی مدد سے اندر کی بلّی ریل گاڑی کی کھڑکی کی طرح کھل جاتی تھی، اُس کی کُنجی وہ اپنے پاس رکھا کرتے تھے۔

مولوی مشتاق حسین کے زمانہ نگرانی میں نماز کے لیئے طلبہ پر بڑی سختی تھی، ترک نماز ایک ایسا جرم تھا جس کو وہ کبھی معاف نہیں کرتے تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ اُس زمانہ کے شریر و آزاد لڑکے جو نماز کی سختی سے تنگ آگئے تھے، سجدہ میں "سبحان ربی الاعلیٰ، مشتاق حسین کا مُنہ کالا" پڑھا کرتے تھے۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب جو اُس زمانہ میں اسکول کے طالب علم تھے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں

"جس انہماک اور محنت اور ہمدردی کے ساتھ نواب صاحب مرحوم بورڈنگ ہاؤس کا انتظام اُس زمانہ میں کرتے تھے وہ کبھی فراموش نہیں ہو سکتا، ڈائننگ ہال اور باورچی خانہ کی نگرانی وہ کرتے تھے، طلبہ کی خواندگی کی دیکھ بھال وہ کرتے تھے، اُن کے

امتحانات کے نتائج میں وہ دلچسپی لیتے تھے، کھیلوں میں وہ شریک ہوتے تھے، اور نماز کی پابندی کے لیے جو تنبیہ اُن کے زمانہ میں ہوتی تھی وہ بھی کبھی نہ ہوئی۔

اُس زمانہ میں جو طالب علم نماز سے غیر حاضر ہوتے تھے، اُن کے لیے علاوہ اور سزاؤں کے ایک سزا یہ بھی تھی کہ ڈائننگ ہال کے دروازہ میں جہاں کہ جوتیاں اُتاری جاتی تھیں وہاں بٹھا کر اُن کو کھانا کھلایا جاتا تھا، اُس زمانہ میں ڈائننگ ہال میں نشست فرش پر ہوتی تھی، اور اس لیے اس قسم کی سزا دی جا سکتی تھی، غرضکہ نماز کے متعلق باقاعدہ پابندی نواب صاحب مرحوم ہی کے زمانہ سے شروع ہوئی تھی۔

مولوی مشتاق حسین صاحب نگرانی کے زمانہ میں طلبہ کے حلقہ میں ہردلعزیز نہ تھے لیکن اپنے سکریٹری شپ کے زمانہ میں وہ اس قدر ہردلعزیز تھے کہ جب اُنھوں نے اپنے عہدہ سے استعفا دیا تو طلبہ بے حد مضطرب اور غمگین ہوئے اور اُنھوں یونین کلب کے رامپور حامد ہال میں جمع ہو کر نواب صاحب کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا، اور نہایت پراثر و پردرد الفاظ میں التجا کی کہ وہ اُن سے جُدا نہوں، نواب صاحب اس کارروائی سے بے حد متاثر ہوئے طلبہ کو محبت آمیز جواب دیا، اپنی مجبوریاں بیان کیں اور بیش قیمت نصیحتیں کیں، اور طلبہ کے دلوں کو مسخر کر کے رخصت ہو گئے۔

نواب صاحب کی اخلاقی کمزوریاں

نواب صاحب کے اخلاقی محاسن تمام قوم میں ضرب المثل ہیں۔ وہ درحقیقت اس زمانہ میں سلف صالحین کا نمونہ تھے، لیکن انبیا علیہم السلام کے سوا کوئی معصوم نہیں ہے، بشری کمزوریاں سب میں پائی جاتی ہیں، نواب صاحب بھی ان کمزوریوں سے خالی نہ تھے، البتہ یہ ضرور ہے کہ اُن کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ اپنی کمزوریوں کی اصلاح کریں، اور اس طریقہ سے اُنھوں نے بہت سی چیزوں کی اصلاح کر لی تھی، مثلاً فطرتاً اُن کی طبیعت میں غصہ اور جوش زیادہ تھا، جو بات ذرا بھی مزاج کے خلاف ہوتی تھی اُس سے وہ مشتعل ہو جاتے تھے۔ لیکن اُنھوں نے اس جذبہ کو پورے طور پر مغلوب کر لیا تھا، غصہ آتا تھا لیکن وہ اس کو پی جاتے تھے، اس لیے بظاہر وہ حلیم و بردبار نظر آتے تھے، حالانکہ اُن کے دوستوں کا بیان ہے کہ بعض اوقات اُن کا چہرہ غصہ سے تمتما اُٹھتا تھا تاہم باوجود اس کے کوئی ناشائستہ لفظ اُن کی زبان سے نہیں نکلتا تھا، چند منٹ کی کشمکش کے بعد وہ غصہ پر فتح پا لیتے تھے اور چہرہ اصلی حالت پر آجاتا تھا، اسی طرح اُنھوں نے اپنی اکثر کمزوریوں کی اصلاح کی تھی اور اُن پر فتح پاتی تھی، لیکن با این ہمہ بعض کمزوریاں اُن میں آخر عمر تک باقی رہیں۔

(۱) مثلاً وہ بچپن کے زمانہ سے ایک ضدی طبیعت کے شخص تھے، اور یہ عادت اُن کی آخر عمر تک رہی، وہ خود بھی اپنی اس کمزوری سے واقف تھے یا کم سے کم یہ جانتے تھے کہ لوگ اُن کو ضدی سمجھتے ہیں، لیکن باوجود اس کے وہ اس عیب کی اصلاح نہ کر سکے، جو بات ایک دفعہ اُن کی زبان سے نکل جاتی تھی اس کی اس قدر پیچ اُن کو ہوتی تھی کہ خواہ سارا زمانہ مخالف ہو جائے، اور خواہ کسی قسم کا نقصان اُن کو اُٹھانا پڑے وہ اس میں ذرا بھی تبدیلی نہیں کرتے تھے۔

سرسید اُن کے محسن تھے، اور قومی خدمات کی وجہ سے بھی وہ سب سے زیادہ

سرسید کا ادب کرتے تھے، یہاں تک کہ حیدرآباد کے زمانہ عروج و اقبال میں بھی وہ سرسید کو خلوت و جلوت میں "سرکار" کے لفظ سے مخاطب کرتے تھے، لیکن جب سید محمود مرحوم کی جانشینی کے معاملہ میں سرسید سے اختلاف ہوا تو باوجود اُن کی شدید ناراضمندی کے نواب صاحب نے ذرہ برابر اپنی رائے میں تبدیلی نہیں کی، بلکہ اس استقلال و مضبوطی سے سرسید پر حملہ کیا کہ وہ حیرت زدہ رہ گئے، اور نہایت رنج و غصہ کی حالت میں اُن کو ایک خط میں لکھا کہ

"میں کامل یقین کرتا ہوں اور پورے ایمان سے کہتا ہوں کہ تم نے غلطی کی، قیامت میں خدا کے سامنے کہونگا کہ اے میرے دادا رسول اللہ میں نے بغیر کسی غرض دینی و دنیاوی کے تیری امت کی بھلائی کی کوشش میں کوئی درجہ باقی نہیں رکھا تھا، جن لوگوں نے اس کو برباد کرنا چاہا منجملہ اُن کے ایک یہ نواب انتصار جنگ ہیں آپ کہیں گے میں نے نہایت نیک نیتی سے کیا تھا، خدا یقینی آپ کو معاف کریگا گو میری اور میرے دادا کی تشفی نہ ہوگی، باللہ نہوگی، تاللہ نہوگی، ثم باللہ نہوگی، یہ میری رائے ہے آپ کی نسبت!"

لیکن سرسید کی اس تحریر کا اُن پر کچھ بھی اثر نہوا۔

سرسید کے آخری زمانہ میں بھی بعض معمولی باتوں پر اُن سے اختلاف پیدا ہوگیا۔ اس موقع پر بھی اُنھوں نے اپنی رائے پر اس قدر اصرار کیا کہ سرسید نے بھی غضبناک ہوکر سختی سے جواب دیا۔ یہ اختلاف سرسید کی وفات تک قائم رہا۔

نواب محسن الملک سے اگرچہ اُن کے خاص تعلقات تھے لیکن جب وہ دوبارہ حیدرآباد گئے تو چند روز بعد سرکاری معاملات میں باہم اختلاف ہوگیا اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ قریب تھا کہ باہمی تعلقات ہمیشہ کے لیے منقطع ہوجائیں لیکن کچھ تو سرسید کی کوشش سے اور کچھ نواب محسن الملک کی صلح پسندی سے اس کی نوبت نہیں آئی، تاہم یہ اختلاف ہمیشہ قایم رہا۔

حیدرآباد کے بعد کالج کے معاملات میں بھی باہم مخالفت ہوئی، جس کا سلسلہ نواب محسن الملک کی وفات تک جاری رہا، اور نواب وقارالملک نے کسی موقع پر بھی نہ تو اپنی رائے میں تبدیلی کی نہ اظہار خیالات میں مداہنت یا نرمی سے کام لیا۔

حیدرآباد میں اُنھوں نے تین وزرا کے ماتحت کام کیا، یعنی سر سالار جنگ اعظم، سر سالار جنگ ثانی، نواب سر آسمان جاہ، ہر وزیر اُن کی دیانت و قابلیت کا معترف تھا اور اُن پر اعتماد کرتا تھا، لیکن باوجود اس کے، ان تمام وزرا سے سرکاری معاملات میں اختلاف کی نوبت آئی اور ہر موقع پر اُنھوں نے استعفے کی دھمکی دی اور جب تک اپنی رائے تسلیم نہیں کرالی باز نہیں آئے۔ اگر بجائے نواب وقارالملک کے کوئی دوسرا شخص ہوتا تو ایسی حالت میں ایک لمحہ کے لیے بھی حیدرآباد میں نہیں رہ سکتا تھا، لیکن اُن کی حالت خاص تھی وزرا کو اُن کے حسن کارگذاری اور وفاداری پر اعتماد تھا اور اُنھوں نے سلطنت کی بیش بہا خدمات انجام دی تھیں اس لیے تمام وزرا اُن کی ناز برداری کرتے تھے۔

ایک دفعہ ذرا سی بات پر سر سالار جنگ اوّل سے ناخوش ہو گئے اور ان کو لکھا

"میدانم کہ فیصلہ شد، وقتیکہ سرکار بعد ملاحظہ روبکارات تفصیلی بر روبکار دستخط فرمودند و حالا ہم گذارش کمترین قابل التفات متصور نہ شد، در پے اعتبار ایں ہیچمدانی لم نکے باقی نماند و نمی خواہم کہ با ایں ہمہ بے اعتمادی ہا بر خدمت معتمدی باشم.....

بہ ادب تمام گذارش است کہ اکنوں ہیچ راہے برائے بقائے آبروئے خود غیر ازیں نمے بینم کہ استعفا خود پیش نمایم"

سر سالار جنگ نے اپنے ہاتھ سے اس کا طویل جواب لکھا اور اُن کو بہت کچھ سمجھایا اسی جواب میں لکھتے ہیں:

"آں مہربان خواہ مخواہ ناخوشی را جا میدہند، ایں معاملات اندر و دراں تکرارات وقوع مے یابند لیکن مناسب نیست کہ ہیچ تکرارات جاری بمانند،

بعضے اوقات از محکمہ آں مہربان تکرارات بے سبب و فائدہ برپا میشوند"

اس کے بعد معاملہ زیر بحث کو تفصیل سے بیان کر کے آخر میں لکھا:

"حالا آں مہربان بر جنگجوئی کہ از محکمہ آں مہربان مے شود خیال کنند کہ آں مہربان بطور خانگی کو اغذ نزد اینجانب فرستادند و بدون اینکہ از رائے اینجانب مطلع شوند و بکار مدار المہام را بازیچہ اطفال گفتند"

اس واقع کے کچھ زمانہ بعد ایک اور معاملہ میں سر سالار جنگ سے اختلاف رائے ہوا تو مولوی مشتاق حسین نے پھر وزیر ممدوح کو لکھا

"چوں بہ یکے از اہم ترین معاملات ملکی فی مابین رائے سرکار و رائے احقر اختلاف واقع شدہ موجب ملال خاطر سرکار شدہ است، لہذا مرا غیر از پیش نمودن استعفار چارہ دیگر باقی نیست، عام ازیں کہ نتیجہ اختلاف مذکورہ خلاف مرضی سرکار بر می آید یا نے، و اکنوں ازیں امر ہم بحث نماندہ است کہ رائے من چہ بود، وصلاح من چہ، پس بعد از غور کافی بہ ادب تمام استعفا پیش مے نمایم و امیدوار منظوری آں بودہ ام و بعد از منظوری استعفا بہر قدر زودی کہ ممکن است راہی وطن خواہم شد مگر ناممکن است کہ رائے خویش را تبدیل نمایم"

اسی طرح ایک دفعہ سر سالار جنگ ثانی کے طرز عمل سے ناراض ہوگئے تو ایک طویل عرضداشت بھیجی جس میں صاف صاف لکھدیا:

"بحالت بے اعتمادی آقا اگر ملک سلیمان ہم زیر نگیں باشد در نگاہ ہمچو من ہیچ میرزا ..... بیش نیست تا بہ یک معتمدی چہ رسد"

اسی عرضداشت کے آخر میں پھر لکھا:

"ازیں معتمدی نامعتمدی معاف داشتہ شوم

سر آسماں جاہ کے ساتھ جو اختلاف ہوا اور جس طرح اُنھوں نے اپنی ضد پوری کی

اُس کا حال ناظرین کتاب کے پہلے حصہ میں پڑھ چکے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے مزاج میں کس قدر ضد تھی، اس اختلاف کے موقع پر سرسید نے بھی ایک مضمون میں لکھا تھا کہ اُن میں ضرورت سے زیادہ ضد اور ہٹ ہے۔ اور اختلاف کے زمانہ میں ایک خط میں بھی لکھا کہ

"مجکو یقین تھا کہ آپ خدا کے الہام پر بھی اپنی رائے سے منحرف ہونے والے نہیں ہیں، جیسا کہ میں نے خود آپ کو لکھا تھا، کوئی توقع برخلاف اس کے اگر میں کرتا تو میری حماقت تھی"

(۲) ایک خاص کمزوری نواب صاحب میں یہ تھی کہ وہ "مردم شناس" نہ تھے، حیرت ہوتی ہے کہ ایسا تجربہ کار اور جہاں دیدہ شخص مردم شناسی کے وصف سے محروم ہو، اُن کی یہ کمزوری بہت نمایاں تھی، اور آخر تک رہی، وہ انسان کی ظاہری حالت سے جلد متاثر ہوجاتے تھے، خصوصاً جس شخص کو صوم وصلوٰۃ کا پابند پاتے اُس پر اُن کو پورا اعتماد ہوجاتا تھا، اور اگر کسی کے متعلق یہ معلوم ہو کہ وہ تہجد گزار بھی ہے، تو پھر وہ اُن کی نگاہ میں سب سے زیادہ قابل اعتماد بن جاتا تھا، جن لوگوں کو اُن کی یہ کمزوری معلوم تھی وہ اپنی مصنوعی دینداری سے اُن کے یہاں رسوخ پیدا کرکے فائدہ اُٹھاتے تھے، حیدرآباد اور علیگڑھ میں اس طریقہ سے بہت سے لوگ اُن سے متمتع ہوئے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے کو مصنوعی طور پر اُن کی نگاہ میں وفادار اور کارگزار ثابت کرتا تو وہ بہت جلد اُس کے اثر میں آجاتے تھے، اور پھر اُس کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سُنتے تھے، اس کمزوری کی بدولت اکثر اوقات اُن کو نقصان اُٹھانا پڑا اور ناکامیابی کا سامنا ہوا۔

حیدرآباد میں اُنھوں نے نواب فتح نواز جنگ پر ضرورت سے اعتماد کیا، اُن کی نگاہ میں وہ سلطنت کے نہایت وفادار اور کارگزار عہدے دار تھے، لیکن ایک بڑی

جماعت جس میں نواب محسن الملک، نواب سرور جنگ اور شمس العلما سید علی بلگرامی جیسے جلیل القدر عہدے دار بھی داخل تھے، فتح نواز جنگ کی مخالف ہوگئی تھی، خصوصاً نواب محسن الملک سے اُن کے تعلقات بہت زیادہ خراب تھے اور نواب محسن الملک نے بارہا اُن کی کمزوریاں نواب وقار الملک کو بتائیں، لیکن اُن پر کچھ اثر نہیں ہوا، جس سے نواب محسن الملک کو بہت صدمہ ہوا اور اُنہوں نے متعدد خطوط میں اپنے رنج و غم کا اظہار کیا چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں،

"آپ کی اس حمایت و رعایت کا جو کہ آپ مہدی حسن (فتح نواز جنگ) کو دے رہے ہیں یہ نتیجہ تو ہوا کہ برملا پبلک ڈنر پر مجھے گالیاں پڑنے لگیں، اور پھر آپ اُس پر بھی اُن کو معصوم اور محفوظ سمجھتے ہیں، اگرچہ اس وقت تک آپ کی مہربانی مجھ پر بھی ہے مگر وہ زمانہ اب دُور معلوم نہیں ہوتا کہ آپ مجھ سے علیحدہ ہو جائیں اس لیے کہ اب یہ حالت زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتی اور حسین و یزید دونوں کو ایک آدمی اچھا نہیں سمجھ سکتا آپ نے اُن کی محبت میں ریاست اور سرکار کی نیک نامی اور بدنامی کا خیال بھی چھوڑ دیا، اور درحقیقت آپ کی محبت اُن کے ساتھ درجہ جنون تک پہنچ گئی ہے، اس لیے اگر آپ سرکار کے خیر خواہ ہیں تو خدا کے واسطے رسول کے واسطے، پنجتن پاک کے صدقہ میں مجھے ہنسی خوشی جدا کر دیجیے، اب ریاست کا فائدہ اسی میں ہے، میں لیسے شریفوں کے ساتھ زیادہ گزر نہیں کر سکتا.....

اب وہ زمانہ گزر گیا کہ آپ مہدی حسن کے عاشق بھی بنے رہیں، اور آپ مجھ سے بھی ناراض نہوں،"

نواب وقار الملک پر اس تحریر کا کچھ بھی اثر نہوا اور جو اعتماد اُن کو فتح نواز جنگ پر تھا وہ بدستور قائم رہا اسی زمانہ میں نواب محسن الملک نے تنگ آکر ایک اور خط رنج و غصہ کی حالت میں اُن کو لکھا جس میں کہتے ہیں،

"اب میں وہ دن نہ آنے دونگا کہ تو تو میں میں کروں اگر آپ کو مولوی
مہدی حسن کی محبت نے آمادہ کیا ہے کہ آپ مجھسے لڑیں تو آپ مہربانی سے
کوئی دوسرا شخص تلاش کیجیے اور اُس سے لڑیئے

ملک خدا تنگ نیست، پائے مرا لنگ نیست

"کچھ حیدرآباد ہی میں رزق نہیں ہے، آپ کو حیدرآباد اور حیدرآباد کی گورنمنٹ
مبارک ہو آپ اور آپ کے معشوق، آزادی اور بے تکلفی سے یہاں چین کریں، بندہ
کے لیے اٹاوہ اور آدھ سیر آٹا کافی ہے، خود زندگانی کے دن ہی کتنے باقی ہیں
آپ کو اور آپ کے دوست کو ریاست مبارک رہے"

ان خطوط سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان کو مولوی مہدی حسن پر کس قدر اعتماد تھا لیکن یہ اعتماد آخر کار مضرت کا باعث ہوا، نواب مہدی حسن کے خلاف ایک زبردست سازش کی گئی جو کامیاب ہوئی، نواب مہدی حسن اس پر مجبور کیے گئے کہ اپنی برأت کے لیے عدالت میں جائیں، چنانچہ وہ مشہور مقدمہ عدالت میں پیش ہوا جو پمفلٹ کیس کے نام سے مشہور ہے، نواب سرور جنگ اس مقدمہ میں نواب مہدی حسن کے خلاف زبردست حصہ لے رہے تھے، اور نواب وقار الملک کو یہ کہکر بدنام کیا جارہا تھا کہ وہ نواب مہدی حسن کی حمایت کررہے ہیں، غرض اس اعتماد کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک زبردست پارٹی اُن کی مخالف ہوگئی، اور بدنام کئے گئے،

علی گڑھ کے زمانہ سکرٹری شپ میں بھی اُن کی یہی حالت تھی، بعض ماتحتوں اور کچھ دوسرے لوگوں نے اُن کا زبردست اعتماد حاصل کرلیا تھا۔ یہ اعتماد کبھی تو مصنوعی دینداری کی وجہ سے ہوتا کبھی کارگزاری کی نمائش سے اور بہت کچھ جمہوریت پسندی کے اظہار سے بعض حالتوں میں خوشامد کی وجہ سے، نواب صاحب ان لوگوں سے بہت متاثر تھے، اور اُن کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتے تھے، اور یہ لوگ نواب صاحب کو دھوکہ دیکر اُن کے اثر

واختیارات سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے تھے، یہاں بھی نواب صاحب سے یہ غلطیاں ہوئیں کہ بعض لوگوں کو اُنھوں نے جن کاموں پر مامور کیا وہ اُن کاموں کے اہل نہ تھے، لیکن نواب صاحب کو اُن کی دینداری اور کارگزاری پر بہت کچھ اعتماد تھا،

(۳) ایک طرف تو نواب صاحب کے استقلال کا یہ حال تھا کہ اُن کی رائے کو ذرا بھی جنبش نہیں ہوتی تھی، لیکن دوسری طرف یہ کمزوری بھی تھی کہ وہ اُن لوگوں کی رائے سے جلد متاثر ہوجاتے تھے، جو ہمیشہ اُن کے گرد وپیش رہتے تھے اور بعض اوقات بالکل اُن کے قابو میں آجاتے تھے اگرچہ وہ خود یہی سمجھتے تھے کہ میں دوسروں سے متاثر نہیں، اخیر عمر میں بعض تعلیم یافتہ نوجوان اُن پر بہت کچھ حاوی ہوگئے تھے، اور مسلم یونیورسٹی کے معاملات اور سیاسی امور کے متعلق اُن کو اپنے خیالات سے متاثر کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اکثر کامیاب ہوتے تھے۔

پبلک کے خیالات سے بھی وہ جلد متاثر ہوجاتے تھے، اور اس کی وجہ سے بعض اوقات اُن سے لغزشیں ہوجاتی تھیں کیونکہ پبلک ہمیشہ صحیح راستہ پر نہیں ہوتی، مثلاً جس زمانہ میں جنگ بلقان چھڑی ہوئی تھی اور گورنمنٹ کے طرزِ عمل سے لوگوں کو مسلم یونیورسٹی کی طرف سے بالکل مایوسی ہوگئی تھی، اور یونیورسٹی فنڈ کے طرح طرح کے مصارف تجویز کئے جارہے تھے، اخبارات نے یہ رائے دی کہ یونیورسٹی کا روپیہ ٹرکی کو بطور قرض دیدیا جائے، عام خیالات سے متاثر ہوکر نواب صاحب نے بھی پرزور طریقہ سے اس کی تائید کی۔

(۴) نواب صاحب کی طبیعت طوالت پسند تھی، اگرچہ یہی اعتراض وہ سید محمود مرحوم پر کیا کرتے تھے، لیکن درحقیقت وہ خود بھی اس میں مبتلا تھے، اُن کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی تھی کہ کام کی تمام جزئیات کو اپنے ہاتھ سے انجام دیں یا کم سے کم اُس پر نظر رکھیں، جوانی کے زمانہ میں وہ نہایت مضبوط اور بڑے کام کرنے والے تھے، پندرہ۔ سولہ گھنٹہ روزانہ کام کرتے تھے، اس لیے یہ طریقہ کسی نہ کسی طرح نباہ دیا، لیکن آخر عمر میں اس طریق عمل کی وجہ

سے دشواریاں پیش آئیں، اور جزئیات میں مصروف رہنے کی وجہ سے، اہم معاملات پر توجہ کرنے کا کم وقت ملا، اور کاموں میں تاخیر ہونے لگی، لیکن ساری عمر کا طرز عمل وہ کس طرح بدل سکتے تھے،

(۵) ایک خاص کمزوری نواب صاحب میں یہ تھی کہ خانگی زندگی میں وہ اپنے گھر والوں کی رائے سے عموماً مغلوب ہو جاتے تھے، یہاں تک کہ وہ اکثر اوقات ایسے مصارف پر راضی ہو جاتے اور ایسے مراسم سے چشم پوشی کرتے تھے، جن کو وہ پسند نہیں کرتے تھے، البتہ یہ ضرور تھا کہ جو امور صریح طور پر خلاف شریعت ہیں اُن کو وہ اپنے گھر میں جائز نہیں رکھتے تھے، لیکن معمولی باتوں پر روک ٹوک کرنے سے پہلو تہی کرتے تھے،

وہ خانگی زندگی کے ایسے خوگر تھے کہ حیدرآباد میں بھی اہل وعیال کو ہمیشہ ساتھ رکھا اور جب دوسری بی بی کا بھی انتقال ہوگیا، تو ساٹھ سال سے زیادہ عمر میں اُنھوں نے تیسری شادی کی جس سے ایک مقصد چھوٹے بچوں کی پرورش اور نگہداشت بھی تھی جس کو وہ بذات خود انجام نہیں دے سکتے تھے، ان بیوی کے پہلے شوہر سے اولاد بھی تھی، نواب صاحب نے بیوی کی خاطر اُن کی اولاد کے مصارف بھی برداشت کیے، اور مصارف بھی معمولی نہیں، اس لیے آخر عمر میں ان کو اس لغزش کی وجہ سے بہت کچھ زیر بار ہونا پڑا، اور کچھ ایسے اسباب پیدا ہوگئے کہ آخر میں اُن کی زندگی بہت تلخی سے گزری اسی کے ساتھ خورد سال بچوں کی طرف سے بھی مطمئن نہ رہے۔

ان کمزوریوں کی وجہ سے نواب صاحب کو زندگی میں بعض ناکامیاں بھی ہوئیں لیکن اُن کے محاسن اخلاق کا پلّہ اس قدر بھاری تھا کہ اُن کی خوبیاں تمام کمزوریوں پر غالب آگئی تھیں اس لیے مجموعی حیثیت سے اُن کی زندگی نہایت کامیاب وشاندار رہی، جو صداقت کا ایک نمونہ تھی -

محاسنِ اخلاق پر مختصر تبصرہ

نواب صاحب کی زندگی کے مہتم بالشان واقعات ناظرین کے سامنے ہیں اور اُن کے محاسنِ اخلاق پر بھی ایک حد تک تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ اس لئے نواب صاحب کے اخلاق و عادات پر کسی مفصل تبصرہ کی ضرورت نہیں، تاہم یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب کے متعلق چند مختلف المذاق اصحاب کی رائیں اس موقع پر درج کردی جائیں، جن سے ناظرین کو یہ اندازہ کرنے کا موقع ملے کہ جن اصحاب نے کافی مدت تک نواب صاحب کے ساتھ کام کیا اور اُن کو مختلف حالتوں میں دیکھا۔ اُنھوں نے مرحوم کے متعلق کیا رائے قائم کی، متعدد سربرآوردہ اصحاب کی رائیں ہمارے پیش نظر ہیں لیکن طوالت کے خوف سے صرف چند اصحاب کی رائیں پیش کی جاتی ہیں۔

مسٹر آرچ بولڈ اُن لوگوں میں ہیں جن سے نواب صاحب کا شدید اختلاف ہوا، جس کی وجہ سے آخرکار مسٹر آرچ بولڈ کو استعفا دے کر کالج سے علٰحدہ ہونا پڑا۔ اس لحاظ سے وہ گویا نواب صاحب کے حریف اور اس ہنگامہ میں فریق مخالف تھے، بااین ہمہ اُنھوں نے نواب صاحب کی وفات کے بعد مولوی محمد امین صاحب کے استفسار پر نواب صاحب مرحوم کے متعلق جو رائے ظاہر کی وہ حسب ذیل ہے۔

مسٹر آرچ بولڈ کی رائے

"مرحوم نواب وقار الملک سے مجکو ہمیشہ دلچسپی رہی وہ ایک پُرانے خیال کے آدمی تھے، رائے میں مضبوط، ایماندار اور کامل کیرکٹر کے شخص تھے، موجودہ خیالات اور موجودہ طریقہ سے اُن کو بہت کم مس تھا اور یہی وجہ تھی کہ علی گڑھ کالج جیسے انسٹی ٹیوشن میں اُن کو کسی قدر دقتیں پیش آئیں۔

باوجود امور بالا کے اور باوصف اس کے کہ میری کالج سے علٰحدگی کا زیادہ باعث اُن کے اور میرے درمیان معاملات کالج کا اختلاف ہوا، مگر

میں نے ہمیشہ اُن کی بہت عزت کی، صاف تو یہ ہے کہ میں نے اکثر یہ خیال کیا اور سوچا ہے کہ اُن میں کیرکٹر کی وضعداری بمقابلہ ہر دیگر ہندوستانی کے کہ جس سے میری ملاقات ہوئی بہت زیادہ تھی اور اپنے آرام و آسائش کو ترک کرکے انھوں نے اپنی قوم کی خدمت جس جوش و جذبہ سے کی ہے، وہ نہایت داد کے قابل ہے۔

اگر میں ضرورت سمجھتا تو اُن کے تعلقات کالج کی بابت مفصل بیان کرتا، لیکن ایسے معاملات کو علٰحدہ چھوڑ دینا ہی بہتر ہے، پُرانے خفیف تنازعات کو زندہ کرنے میں مجھ کو افسوس ہوگا، وہ ہر طریقہ سے ایک عمدہ اور شاندار بزرگ تھے اور ہمیشہ اپنے معاملات کے لئے حق بجانب لڑتے تھے، اور میری دلی خواہش ہے کہ ان کی قوم میں آج ایسے چند اور لوگ ہوتے، ان کی بات صحیح ہوتی یا غلط ہوتی، لیکن اُن کی انتہائی ایمانداری کا ہر شخص کو ہمیشہ احساس ہوتا تھا۔"

مسٹر ٹول کی رائے

مسٹر آرچبولڈ کے بعد کالج کے پرنسپل مسٹر ٹول مقرر ہوئے، وہ کالج میں ایک پروفیسر کی حیثیت سے کئی سال رہے اور نواب صاحب سے خوب واقف تھے، انھوں نے مولوی محمد امین صاحب کے استفسار پر یہ لکھا کہ:

"میں محسوس کرتا ہوں کہ اپنے مرحوم دوست وقارالملک نواب مشتاق حسین کی یاد کو پورے پورے طور پر ظاہر نہیں کرسکتا،

میری اُن سے ملاقات جو جلد دوستی میں مبدل ہوگئی ۱۹۰۶ء یا ابتدائے ۱۹۰۷ء شروع ہوکر ۱۹۱۳ء تک رہی، جب کہ وہ آنریری سکرٹری ایم اے او کالج کے عہدے سے مستعفی ہوئے۔ اُن کے ساتھ میرے تعلقات قریبی اور مسلسل رہے، ۱۹۱۳ء کے بعد بھی جب کہ اُن کی حالت اور ضعف عمر نے اُن کو عزلت پر مجبور کیا۔ ہماری خط و کتابت وقتاً فوقتاً جاری رہی اور اُن کے انتقال کی خبر میرے لئے بڑے رنج کا باعث ہوئی کیونکہ میں ایک سچے دوست سے جدا ہوگیا،

نواب وقار الملک نہایت مستحکم کیرکٹر کے سچّے مذہبی آدمی تھے، وہ زندگی اور انسان کا بہت وسیع تجربہ رکھتے تھے، اور اس کی مدد سے وہ تمام اہم مسائل کو جو پیش آتے تھے، خوش اسلوبی سے حل کر لیتے تھے،

ان کی قوت برداشت بہت زبردست تھی وہ اس عمر میں محنت شاقہ کر سکتے تھے، جب کہ دوسرے بالکل کام نہیں کر سکتے،

....

جب وہ گوشۂ تنہائی میں چلے گئے تو قوم نے لیڈر اور کالج نے کام کرنے والا (جس کا نعم البدل ملنا آسان نہیں) کھو دیا "

مسٹر ڈنلاپ کی رائے

مسٹر ڈنلاپ کی شخصیت حیدر آباد میں جس قدر نمایاں تھی محتاج بیان نہیں، وہ نواب صاحب کے زمانہ میں بھی موجود تھے اور اُن کے بعد بھی مدت تک جلیل القدر عہدے پر رہے، وہ ایک خط کے جواب میں اپنا تذکرہ کرنے کے بعد مولوی محمد امین صاحب کو لکھتے ہیں۔

" جس زمانہ میں کہ نواب وقار الملک ریونیو سکرٹری تھے اُس وقت کے وزیر اعظم سر آسمان جاہ بہادر اُن کی بہت عزت کرتے تھے اور فی الحقیقت وہ ریاست کے تمام معاملات میں وزیر اعظم کے مشیر خاص تھے، اور اسی وجہ سے ان کے ذمہ مختلف اقسام کے کام کا اس قدر بار تھا جو ایک عہدہ دار نہیں کر سکتا ہے ....

" لیکن وہ نہایت جفاکش، اعلیٰ اصول کے بے حد پابند، ایمان دار، پبلک کے ہمدرد اور ریاست کے ایک قابل قدر ملازم تھے، ان کے ساتھ میرے تعلقات ۱۸۸۵ء سے شروع ہوئے تھے اور اُن کی واپسی وقت تک جو خوش اسلوبی کے ساتھ عمل میں آئی قائم رہے، اگرچہ ہمیشہ وہ انتظامی تجاویز کو میرے نقطۂ خیال سے نہیں دیکھتے تھے لیکن اس اختلاف رائے سے میرے دوستانہ تعلقات میں کبھی فرق نہ آیا، وہ ہر وقت کل تجاویز کے موافق و مخالف، دلائل سُننے کے لئے تیار رہتے تھے، اور معقول دلائل تسلیم کر لیتے تھے، اور میں یہ بات اُس زمانہ کے متعلق کہتا ہوں جب میں اضلاع تلنگانہ میں بندوبست کرنے کے متعلق قواعد تیار کر رہا تھا، اور اس کام میں نواب وقار الملک بہادر نے میری

بہت کچھ اعانت و تائید کی تھی۔"

ان تمام سربرآوردہ اشخاص کے خیالات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نواب صاحب کی زبردست شخصیت کا اثر سب پر یکساں تھا اور اُن کی دیانت وامانت، محنت و مستعدی اور کیرکٹر کی مضبوطی سب کے نزدیک مسلم تھی۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی رائے

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کو کم و بیش ۳۵ سال کا تجربہ نواب صاحب کے متعلق ہے۔

۱۸۸۰ء میں جب کہ نواب وقار الملک پہلی دفعہ حیدرآباد سے علیحدہ ہو کر علی گڑھ آ گئے تھے اور بورڈنگ کی نگرانی کر رہے تھے، صاحبزادہ صاحب اسکول کے ایک طالب علم تھے اور نواب صاحب کے فرزندِ اکبر محمد احمد مرحوم کے کلاس فیلو، نواب صاحب کی سکرٹری شپ کے زمانہ میں اُن کے شریکِ کار اور ایجوکیشنل کانفرنس کے جائنٹ سکرٹری رہے۔ یہ طویل زمانہ صحیح واقفیت حاصل کرنے کے لئے کچھ کم نہیں ہوتا، اس بنا پر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب مرحوم کے سبق آموز حالات کا خاتمہ صاحبزادہ صاحب کے الفاظ پر ہو، جو اس لحاظ سے بھی مناسب و موزوں ہے کہ اس وقت جناب ممدوح اپنے اعزازی عہدے کی حیثیت سے مرحوم و مغفور کے قائم مقام، مسلم یونیورسٹی کے سب سے اعلیٰ افسر اور علی گڑھ تحریک کے علم بردار ہیں۔

صاحبزادہ صاحب لکھتے ہیں:

" نواب صاحب مرحوم کی پبلک اور قومی خدمات سے قطع نظر کر کے اُن کا ذاتی کیرکٹر اور اُن کی اخلاقی خوبیاں خاص طور پر لائق ذکر اور یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ فی الحقیقت یہ صفات مثل قومی ورثہ کے ہیں جن کو نہایت اہتمام کے ساتھ اپنے طرزِ عمل میں محفوظ رکھنے کے لئے ہم کو کوشش کرنا چاہیے، مثلاً اُن کا ذاتی اخلاق اس قسم کا تھا جس کو میں کبھی بھول نہیں سکتا اُن کی تحریر و تقریر میں سخت کلامی کبھی پاس بھی نہیں آئی اور روزانہ برتاؤ میں جس ادب و دلداری کو وہ ہر وقت اور ہر شخص کے ساتھ ملحوظ رکھتے تھے وہ خاص طور پر قابل تقلید ہے، بڑوں اور چھوٹوں سب کے ساتھ تعظیم و تکریم سے ملتے تھے اور یہ میں کہہ سکتا ہوں کہ اُن کے ذاتی

اخلاق کا ہم سب پر اثر پڑا ہے۔

" دوسری بڑی اخلاقی صفت اُن میں صداقت کی تھی، جو آزادیِ رائے کی شکل میں اکثر ظاہر ہوتی تھی۔ ہر چیز کی اصلیت کا امتحان اُس وقت ہوتا ہے جب باوجود حقیقی اندیشوں کے اُس کا وجود ہو۔"

اس موقع پر صاحبزادہ صاحب نے نماز اور استعفے کا واقعہ بیان کیا ہے جو کتاب کے ابتدائی حصہ میں آچکا ہے، پھر لکھتے ہیں:

" ایک اور واقعہ قابلِ ذکر یہ ہے کہ ۱۸۸۹ء میں جب کہ سرسید نے ٹرسٹیوں کا قانون وضع کیا اور اُس میں سید محمود مرحوم کو اپنا جانشین قرار دیا تو نواب وقار الملک نے پوری آزادی کے ساتھ اُس سے اختلاف کیا، یہ مجھکو علم ہے کہ سرسید کو اُن کے اختلاف سے بہت رنج ہوا اور باوجود اس کے کہ نواب صاحب کو سرسید کا بہت بڑا خیال تھا اور وہ اُن کا بہت ہی ادب کرتے تھے لیکن اپنی رائے کے اظہار میں اُنھوں نے کچھ باک نہیں کیا، اسی کے ساتھ اظہار اختلاف میں ادب اور لحاظ، اور حفظِ مراتب کو وہ کسی طرح ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے، اور اپنے معترض علیہ کے وقار کو ہمیشہ قائم رکھتے تھے،

تیسری اخلاقی صفت جو غیر معمولی مقدار میں نواب صاحب میں تھی وہ قوتِ ضبط تھی، تکالیف اور ناگواریوں کو جس قدر وہ برداشت کرتے تھے، اور جذبات پر جس قدر وہ قادر تھے اُس کی مثال بہت ہی کم دیکھنے میں آئی ہے۔ میرے خیال میں اُن کی زندگی کی کامیابی میں سب سے زیادہ حصہ اسی کمیاب صفت کا تھا، جس کسی نے نواب صاحب کی زندگی کو دیکھا ہے اور جن لوگوں کو اُن سے کام پڑا ہے، وہ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اُن کے اخلاق میں یہ کس قدر بڑا جوہر تھا۔

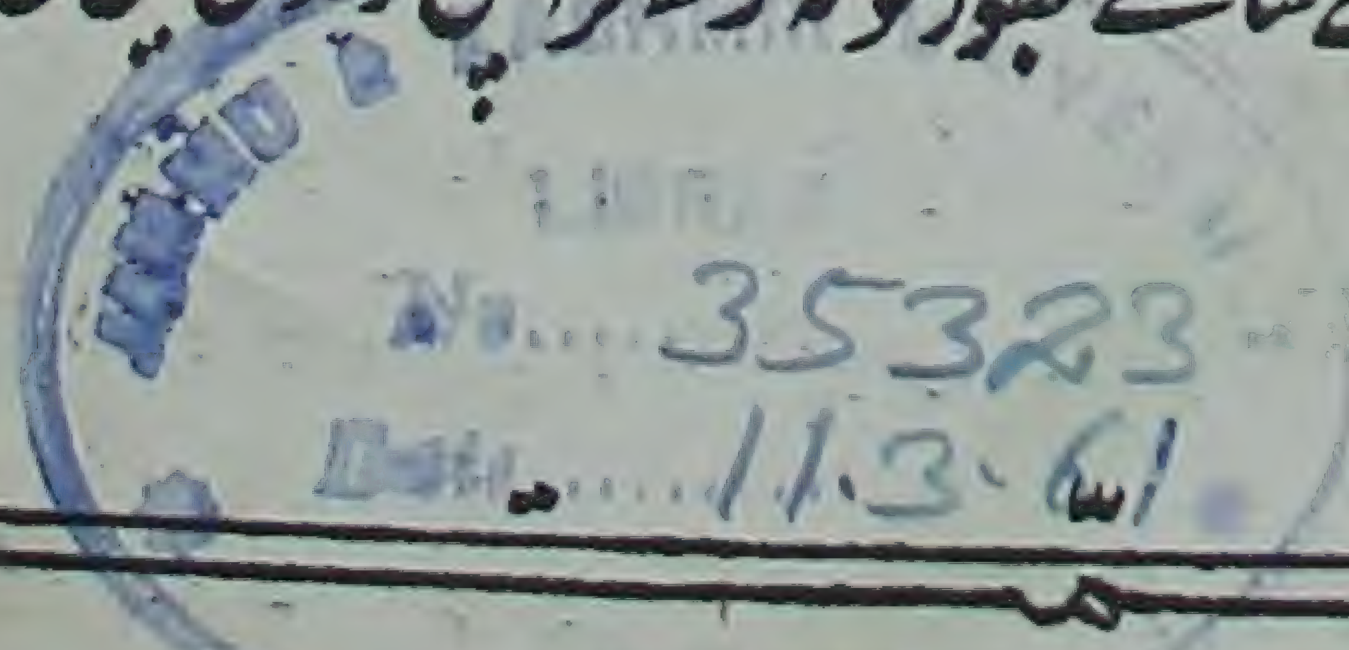
چوتھی اخلاقی صفت قابلِ ذکر نواب صاحب مرحوم کی استقامت اور قوتِ طبع تھی عارضی حالات سے وہ آسانی سے متاثر نہیں ہوتے تھے اس کے متعلق اُن کی سادہ وضع اور سادہ زندگی قابلِ لحاظ ہے اگرچہ ابتدا سے وہ سرسید کے ساتھی، اور اُن کی تحریک کے مؤید اور تعلیمی و قومی امور میں اُن کے پیرو رہے، لیکن ظاہری وضع و لباس میں اُنھوں نے کبھی تقلید نہیں کی، سرسید کے اور اکثر ساتھی نئی زندگی کے رنگ میں رنگ گئے، لباس و طرزِ معاشرت میں اُن کے انقلاب ہوگیا،

مگر نواب وقار الملک کی طرز زندگی میں آخر عمر تک فرق نہ آیا،
نواب صاحب مرحوم کا چال چلن بھی قابل مثال تھا، گو اُنھوں نے اُس زمانہ میں نشو ونما پائی تھی جب کہ رنگین صحبتیں فیشن میں داخل تھیں، اور شرفا میں بھی معیوب نہ تھیں، مگر نواب صاحب کی زندگی جہاں تک کہ مجکو علم ہے، بالکل پاک وصاف اور ایک باخدا مسلمان کی زندگی کا نمونہ رہی، نواب صاحب مرحوم کی دیانت اور ایمانداری ایک زبردست اخلاقی قوت کا ثبوت تھی، اور ریاست حیدرآباد کے محکمہ جات اُن کی اِس اخلاقی صفت کے آج تک ممنونِ احسان ہیں:

نواب صاحب کی محنت اور جفاکشی قابل تقلید ہے، پندرہ برس کی عمر سے ۷۵ برس کی عمر تک یعنی ساٹھ برس تک اُنھوں نے اپنی دماغی وجسمانی قوتوں سے بڑے مردانہ عزم واستقلال کے ساتھ کام لیا، ارکانِ دینی کی پابندی جس قدر اُن میں تھی اُس کا سب کو علم ہے، حکومت اور ثروت اور نہ رُوشنی نے اُن کو کبھی مخمور نہیں کیا، اور وہ اپنے خدا اور مذہب کو کبھی نہیں بھولے اور مرض الموت کی حالت میں بھی اپنے خالقِ اکبر کے حضور میں سربسجود ہوتے رہے، ان تمام اخلاقی خوبیوں اور نیکیوں کا مجموعہ ہماری موجودہ حالت میں ہمارے لئے ایک ایسا بیش بہا سرمایہ ہے جس کو محفوظ رکھنا، اور جس سے مستفید ہونا ہمارے لئے ازبس ضروری ہے،

....

نواب صاحب مرحوم نے جس زندگی کا نمونہ چھوڑا ہے، اور قوم کے دل پر اُن کے ساٹھ سالہ کارناموں کا جو نقش ہے، وہ انشاء اللہ بے نتیجہ نہ رہے گا، اور اس کی یاد مختلف شکلوں میں زندہ رہے گی، بڑی چیز تو یہ ہے کہ ہم سب اُن کی اخلاقی صفات کو اپنے سامنے بطور نمونہ رکھ کر اپنی زندگی میں اُن کی یاد کو تازہ رکھیں "



تمام شد

